انظر كيف نصرف الآيات لعلهم يفقهون

اے مخاطب!

غور کرو کہ ہم آیات کو کسطرح پھیر کر لاتے ہیں تاکہ لوگ
تصریفِ آیات کے ساتھ قرآنِ کریم میں تفقہ کیا کریں

ترجمۃ القرآن بتصریف آیات الفرقان

المعروف بہ

تفسیر القرآن بالقرآن

جلد چہارم

سورۃ الانفال .... تا ... سورۃ الرعد

شائع کردہ

ادارہ بلاغ القرآن ۱۱۰-این سمن آباد لاہور

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آیاتھا ۷۵ (۸) سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ رکوعاتھا ۱۰

یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لاریب فیہ قرآن حکیم کی آٹھویں سورہ مبارکہ ہے اس کے دس رکوع اور ۷۵ آیات ہیں۔

سابقہ سورہ مجیدہ پر ایک طائرانہ نگاہ:۔ سورہ انفال سے ماقبل سورہ اعراف کی ابتدائی آیات کریمات میں **کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ** (۷/۲) کے الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف ایک کتاب نازل ہوئی ہے ایک سے زائد کتب آپؐ پر ہرگز نازل نہیں فرمائی گئیں۔ اور **اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ** (۷/۳) کے الفاظ میں اعلان عام کر دیا گیا ہے کہ واجب الاتباع صرف وہ کتاب ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی ہے اس کتاب کے سوا کوئی اور کتاب واجب الاتباع نہیں۔ پھر جنتی ہموار و متوازن معاشرہ کے قیام و دوام پر زور دیا گیا ہے اور جہنمی معاشرہ کی اس خصوصیت کے اظہار کے بعد کہ اس میں افراد معاشرہ **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ** کی صورت میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں' جنتی معاشرہ کی خصوصیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہیں۔ کہ اے نوع انسانی ! زمین میں تم سب کیلئے حقِ رہائش بھی مسلم ہے اور حق ضروریات زندگی بھی۔ **وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ** (۷/۲۴)

اس کے بعد فرد فرد کی ضروریات زندگی کے مذکورہ بالا حق کی اساس پر قائم کئے جانے والے جنتی معاشرہ کے علمبردار انبیاءؑ نوحؑ ہودؑ صالحؑ شعیب اور موسیٰ و ہارون کے تفصیلی حالات بیان کئے گئے ہیں اور جنتی معاشرہ کے مخالفین قومِ نوحؑ قومِ عاد' قومِ ثمود' اہلِ مدین اور فرعون و قوم فرعون کے تفصیلی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں شرک کی مذمت کیگئی ہے اور صلوٰۃ موقّت کی تاکید پر سورہ مجیدہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔

سورۂ انفال کا سورہ اعراف کیساتھ ربط:۔ سورہ اعراف میں سابقہ انبیاء سلام علیہم کی مہمّوں کے تذکار جلیلہ کے بعد سورہ انفال میں نبی اکرمؐ خاتم النبیین کی ان مہمّات کا تذکرہ ہے جو آپؐ کو اپنے زمانے کے مخالفینِ ربوبیت کے مقابلے میں پیش آئیں' جو باقاعدہ سامانِ حرب کیساتھ میدانی لڑائیوں کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس لیے اس سورتِ مجیدہ میں جنگ سے متعلق احکام و مسائل بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ پوری سورۃ مجیدہ جنگی احکام و مسائل سے معمور ہے۔ جنگ کی صورت میں فتح و شکست دونوں باتیں ممکنات میں سے ہیں لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدد کرکے انہیں فتح و کامرانی سے ہمکنار کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ **كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (۳۰/۴۷) ہمارے اوپر مومنوں کا حق ہے کہ ہم ان کی مدد کرکے انہیں فتح سے ہمکنار کریں اور چونکہ فتح کا اولین لازمی نتیجہ مالِ غنیمت کا میسر آنا ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ نے اس سورت مجیدہ کو مالِ غنیمت الانفال ہی کے ذکر سے بالفاظ ذیل شروع کیا ہے۔ اور یہ سورت مجیدہ سورہ الانفال ہی کے نام سے موسوم ہے:۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ①

(سنئے گا اے رسولؐ) اللہ رحمان و رحیم کے نام کیساتھ لوگ آپ سے الانفال (ہر قسم کے زائد مال) کے متعلق سوال کریں گے آپ کہہ دیجئے گا کہ الانفال (ہر قسم کا زائد مال) خاص اس مرکزی نظام کے لیے ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ قائم کیا ہے۔ تم اللہ کے قانون کی مخالفت سے بچو۔ (انفال کے مال میں خیانت نہ کرنا) اور آپس میں اصلاح کرتے رہنا اور اگر تم واقعی مومن ہو تو اللہ کے رسولؐ کے ذریعہ خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہو۔

○ ۱۔ لفظ انفال نفل کی جمع ہے۔ جس کا معنی ہے زائد۔ ۷۹/۱۷ میں آیا ہے۔ **وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ** اے رسولؐ ! آپ صلوٰۃ کے لیے رات کو سوکر بھی اٹھا کریں۔ یہ آپ کے لیے فرض صلوٰۃ سے زائد ہے۔ یہاں ۱/ الانفال سے زائد مال مراد ہیں اور الف لام استغراق کا ہے' بمعنی ہر قسم کے زائد مال۔ فتح کے بعد جو دشمن کا چھوڑا ہوا مال میسر آتا ہے' جسے مال غنیمت کہتے ہیں' یہ مال چونکہ جنگ کی اصل غرض دشمن پر فتح پانے اور اسے نظام ربوبیت کی راہ سے ہٹانے سے زائد ہوتا ہے۔ اس لیے اس مالِ غنیمت کو بھی الانفال کہا جاتا ہے۔ پھر جو علاقہ فتح کیا جائے اگر اس میں کوئی دفینہ ملے تو یہ بھی زائد مال ہے یہ بھی الانفال میں شامل ہے۔ زمین میں سے جو معدنیات لوہا' کوئلہ' سونا' چاندی' تانبہ' سیسہ' پٹرول' تیل وغیرہ جو کچھ بھی نکلے' سب الانفال ہیں اور ان سب پر مرکزی نظام کا حق ہے۔ کیونکہ مرکزی نظام پورے عوام کی ضروریات زندگی کا ضامن ہے۔

○ صرف اس مال غنیمت میں جو دشمن شکست کھا کر میدان جنگ میں چھوڑ جائے' اور یا اسلامی لشکر کے رعب سے دشمن بلا جنگ کئے جو مال چھوڑ جائے اس میں پانچواں حصہ مرکزی نظام کا ہے جو مجاہدوں کے قریبیوں' بے سہارا لوگوں' جن کا کاروبار کسی وجہ سے ساکن ہوگیا ہو اور مسافروں میں سے مال کے حقدار محتاجوں کو دیا جاتا ہے(۴۱/۸)اور باقی ۴/۵ مجاہدوں میں منصفانہ انداز کے ساتھ تقسیم کیا جاتا ہے' یعنی ہر کسی کو وہ کچھ دیا جاتا ہے' جس کی اسے ضرورت ہو۔

○ ۲۔ **لِلّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ** کے الفاظ سے انفال کے دو حصے مراد نہیں ہیں کہ ایک حصہ اللہ کو دیا جائے اور دوسرا اللہ کے رسولؐ کو ان کے ذاتی مصارف کے لیے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ تو مال کی ضرورت ہی سے بے نیاز ہے۔ وہ ہر قسم کے احتیاج سے مبرا ہے۔ اور رسول اکرمؐ کا کوئی حصہ عوام سے الگ قرآن کریم نے مقرر نہیں کیا۔ نبی اکرمؐ بھی مال غنیمت میں سے باقی مجاہدوں کے ساتھ برابر کا حصہ پاتے تھے۔ اس لیے' جیسے کہ بارہا لکھا گیا ہے کہ اللہ و رسولؐ کے الفاظ اس اجتماعی نظام کے لیے آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کے رسولؐ نے قائم کیا تھا' جس میں صدر و عوام ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے متوازن انداز کے ساتھ ایک ہی سطح کے حقدار تسلیم کیے گئے تھے۔ معاشرہ کا کوئی فرد محروم ضروریاتِ زندگی نہیں تھا۔

○ ۳۔ **فَاتَّقُوا اللّٰہَ** کا معنی سیاقِ کلام کے مطابق یہ ہے کہ مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچتے رہنا۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا اللہ تعالیٰ کی کھلی مخالفت ہے۔ مالِ غنیمت میں سے کسی مجاہد کو اپنے حصہ سے زائد کسی چیز کا حق نہیں بلکہ جو مجاہد شدید زخمی ہو چکنے کی بدولت اگرچہ غنیمت کی فراہمی میں شریک نہیں ہوسکتے' مگر وہ اپنے حصے کے

علاوہ زخموں کی علالت کے مطابق زائد مراعات کے مستحق ہیں۔

○ ۴۔ زخمیوں اور اعضا کٹے مجاہدوں کی انہی خصوصی مراعات کے لیے **اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ** کے الفاظ آئے ہیں کہ تم آپس میں پوری پوری اصلاح کرتے رہنا۔ اصلاح کا معنی ہے درستی پس **اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ** کے الٰہی حکم کے مطابق زخمی مجاہدوں کا حق اپنے عامی حصہ سے زائد ہے۔ بالفاظ دیگر جو کمی ان کے جسموں کے اندر واقع ہو چکی ہو اس کی اصلاح کیا کرو اور ان کے اصل حصے انہیں الگ دیا کرو۔

۵۔ **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ** کا معنی بھی یہ نہیں ہے کہ یہاں دو اطاعتوں کا الگ الگ حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ اکیلے اللہ ہی کی اطاعت کا حکم ہے۔ جو اس مرکزی نظام کے ذریعہ کی جائے گی جو اللہ کے نازل کردہ ضابطے کے مطابق اللہ کے رسول نے قائم کیا ہے۔ اسی سورہ انفال میں آگے چل کر ۸/۲۰ میں ارشاد ہوا ہے۔ **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ** اللہ کی اطاعت کرو اللہ کے رسول کے ذریعہ اور اس اللہ کی اس اکلوتی اطاعت سے روگردانی نہ کرنا۔ دیکھئے ! اگر اللہ اور رسول کی دو الگ الگ اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہوتا تو **وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ** کی ضمیر واحد کی بجائے ضمیر تشنیہ آنی چاہیئے تھی۔ **وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُمَا**۔ واضح رہے کہ اللہ اور رسولؐ کی دو الگ الگ اطاعتوں کا تصور شرک فی الحکم ہے۔ قرآن کہتا ہے **لَا يُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا**" ۱۸/۲۶ اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی ایک کو بھی شریک نہیں کرتا۔ یعنی خود رسول مقبول بھی اللہ کے حکم میں شریک نہیں ہیں۔

○ الختصر۔ **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ** کے حکم میں اکیلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس اجتماعی مرکزی نظام کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کی اساس پر اللہ کے رسول نے قائم کیا تھا۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہوا ہے۔ **وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ** ۹/۳ اور اعلان عام ہے حج اکبر کے دن اللہ کا اپنے رسول کے ذریعہ کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں۔ یہ اللہ و رسولؐ کے دو الگ الگ اعلان نہیں تھے' یہ ایک اکیلے اللہ کا اکلوتا اعلان تھا جو اس نے اپنے رسول کے ذریعہ کرایا تھا۔ فی الحقیقت یہ اعلان اس مرکزی نظام کی طرف سے تھا جو اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کی اساس پر اس کے رسول نے قائم فرمایا تھا۔

○ چونکہ اس نظام کی اساس آیات کتاب اللہ ہیں' اس لیے اگلی آیاتِ مجیدہ میں مومنوں کی تعریف بالفاظ ذیل بیان ہوئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾	سوائے اس کے نہیں کہ مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر (قرآن ۱۵/۹) پیش کیا جائے' تو ان کے اذہان کانپ اٹھتے ہیں۔ اور جب ان پر اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے رب (کے قانون) پر بھروسہ کرتے ہیں۔

○ ۱۔ اللہ کا ذکر یہ ہرگز نہیں کہ اس کے نام کا ورد کیا جائے اللہ' اللہ' اللہ۔ بلکہ ۳/۲۰۰ کے مطابق اللہ کو اس طرح "ایک" یاد رکھنا ہے جس طرح ہر شخص اپنے باپ کو "ایک" یاد رکھتا ہے۔ یہاں ذکر کا معنی قرآن ہے۔ **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (۱۵/۹) بے شک ہم ہی نے اپنے ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے

والے ہیں۔

تَوَکَّلْ عَلَی اللہِ۔ ۲۔ وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ کے الفاظ میں مومنوں کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے قانون پر بھروسہ کرتے ہیں۔ توکل کا یہ معنی مطلقاً" غلط ہے کہ پیش آمدہ مہم کو انجام دینے سے متعلقہ قوانین کو نظر انداز کرکے اور ان کی مخالفت کرتے ہوئے توکل علی اللہ کر دیا جائے جو اللہ نے متعین کئے ہیں۔ توکل کا معنی ہے بھروسہ کرنا۔ اور مطمئن ہو جانا کہ یہ کام بگڑے گا نہیں۔ اگر کوئی شخص کسی ٹہنے پر بیٹھ کر اپنی نشست سے درخت کے تنے کی طرف سے اسی ٹہنے کو توکل علی اللہ کاٹنا شروع کر دے تو لازماً" ٹہنے کے کٹ کر گرنے کے ساتھ ہی وہ بھی گر جائے گا۔ اور اس کا توکل علی اللہ عملاً" غلط ثابت ہوگا۔

○ اسی طرح اگر کوئی عورت ہنڈیا چولہے پر رکھ کر توکل علی اللہ لگاتار آگ جلاتی رہے تو ہنڈیا کی دال' ترکاری جل کر کوئلہ ہو جائے گی اور اس کا توکل عملاً غلط ثابت ہوگا۔ اگر آٹا گوندھنے والی عورت ایک سیر آٹے میں توکل علی اللہ دو سیر پانی ڈال کر گوندھنا شروع کرے تو وہ ہرگز گوندھا نہیں جاسکے گا اور اس کا توکل عملاً" غلط ثابت ہوگا۔ ان مثالوں سے ثابت ہوا کہ جو بھی کام کیا جائے' اس کام کی انجام دہی کے لیے جو قوانین خود اللہ تعالٰی نے اپنی کتاب کائنات میں متعین کر رکھے ہیں۔ ہر قدم ان کے مطابق اٹھانا' توکل علی اللہ ہے۔ سورہ آل عمران میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے ارشاد ہوا ہے:۔

○ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○ (۳/۱۵۹) اے رسول ! آپ پیش آمدہ معاملہ کے لیے صحابہ کے ساتھ مشورہ کیا کریں۔ پھر (باہمی مشورہ کے بعد یعنی کسی نہج پر کام کو انجام دینے کا مشورہ طے ہو چکنے کے بعد) جب آپ اس کام کی انجام دہی کا ارادہ پکا کر لیں تو پھر (پیش آمدہ معاملہ سے متعلقہ) اللہ (کے قوانین) پر بھروسہ کیا کریں۔ بے شک اللہ تعالٰی (اس کے متعینہ قانون پر) بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

○ دیکھیے ! خاتم النبینؐ جیسے متوکل اعظم کو حکم ہوا کہ جو کام کرنا مقصود ہو' اس کی انجام دہی کے طریق کار کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشورہ فرمایا کریں۔ تو گویا پیش آمدہ مہم کے متعلق باہم مشورہ کرنا توکل کی پہلی سیڑھی ہے۔ تو اب ظاہر ہے کہ مشورہ کی غرض ہی یہ ہوسکتی ہے کہ پیش آمدہ معاملہ کے ہر پہلو پر اللہ تعالٰی کے متعینہ قوانین کے مطابق غور کیا جائے اور اس کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالٰی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق لائحہ عمل متعین کیا جائے۔ اور ایسا کرنیوالوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ یہ لوگ متوکل ہیں۔ اللہ تعالٰی ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○ (۳/۱۵۹)

○ آیت زیر بحث ۸/۲ میں صحابۂ رسول کی تعریف کی گئی ہے کہ مومن اور متوکل ہیں۔ انہی کے متعلق اگلی آیات مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ مذکورہ مومن:۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۗ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

یہ وہ لوگ ہیں' جو اللہ کی فرض کردہ صلواۃ پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ یہ مذکورہ لوگ حقے سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند درجے اور ہر خطرہ سے بچاؤ ہے اور ان کے لیے عزت کی روزی ہے۔

○ ا۔ الصلٰوۃ کا معنی فرض منصبی بھی ہے۔ ۴۱/۲۴ نظام ربوبیت پر مبنی مرکزی نظام بھی ہے ۴۱/۲۲ اور صلواۃ موقت بھی ہے ۴/۱۰۳ یہاں چونکہ عام مومنین کی صلواۃ اور انفاق مال کا تذکرہ آیا ہے' اس لیے یہاں الصلواۃ بمعنی صلواۃ موقت ہے' جو نظام ربوبیت پر مبنی مرکزی نظام کے قیام کی پہلی سیڑھی ہے۔

صحابہ رسول حقے سچے مومن تھے:۔ ○ **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا** کے الفاظ' صحابہ رسول کے متعلق آئے ہیں۔ کہ وہ حقے سچے مومن تھے۔ ۸/۷۴ میں بھی صحابہ رسول کے دونوں گروہوں مہاجرین و انصار کے متعلق بالکل یہی خبر دی گئی ہے کہ وہ سب حقے سچے مومن تھے' ان کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے:۔ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ** ۸/۷۴۔ "اور جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں ٹھکانہ دیا۔ وہ سب لوگ حقے سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے ہر خطرہ سے بچاؤ کا سامان ہے اور ان کے لیے عزت کی روزی ہے" نیز فرمایا پہلے پچھلے سب مہاجر و انصار حقے سچے مومن ہیں:۔

○ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ** ۭ ۸/۷۵ "اور وہ لوگ جو بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا وہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔ (وہ بھی حقے سچے مومن ہیں)"۔ سورہ توبہ میں پہلے پچھلے مہاجرین و انصار سب کے متعلق ارشاد فرمایا کہ وہ سب کامیاب و کامران ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے اجر عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اور وہ اللہ تعالیٰ پر راضی ہو چکے ہیں:۔

○ **وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** ۹/۱۰۰

مہاجرین و انصار میں وہ' کہ جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت کی اور جنہوں نے سب سے پہلے مہاجرین کی نصرت کی' اور وہ بھی جنہوں نے (بعد میں) ان کی حسن کارانہ اتباع کی۔ اللہ ان پر راضی ہوگیا اور وہ اللہ پر راضی ہوگئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کئے' جن کی سطح پر نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

پھر صحابہؓ ہی کے متعلق فرمایا:۔ ○ **فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ** ○ (۸/۶۲) پس (اے نبی !) آپ کے لیے اللہ کافی ہے۔ وہ وہی ہے جس نے آپ کی مدد کی اپنی نصرت کیساتھ یعنی مومنین (صحابہ) کے ساتھ پھر فرمایا۔

○ **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ** ○ ۸/۶۴۔ اے نبیؐ ! آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور وہ مومن

کافی ہیں جنھوں نے آپ کا اتباع کیا ہے۔

صحابۂ رسولؐ قرآن کریم کی رو سے واجب التکریم ہیں:۔ واضح رہے کہ صحابہؓ کی تعریف و توصیف سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں کھل کر بتایا گیا ہے کہ:

○ صحابۂ رسول حقے سچے مومن تھے ۴-۷۴/۸ ○ اللہ تعالیٰ کے ہاں صحابۂ رسول کے درجات بہت بلند ہیں ۸/۴ ○ صحابۂ رسول کے پہلے پچھلے دونوں گروہ مجاہد تھے ۷۴-۷۵/۸ ○ صحابۂ رسول کو دنیا میں عزت کی روٹی (آزاد حکومت) میسر تھی ۴-۷۴/۸ ○ صحابۂ رسول کے دونوں گروہ مہاجرین و انصار' ان میں سے پہلے اور پچھلے سب پر اللہ راضی ہوگیا۔ اور وہ اللہ پر راضی ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بہتی نہروں والے باغات تیار کئے۔ ان کے اعمال کا اجر عظیم عطا فرمایا اور وہ دنیا میں کامیاب و کامران ہوئے۔ ۹/۱۰۰

○ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی مدد انہی صحابہؓ کے ساتھ فرمائی تھی۔ جس سے مشکلات کے بادل چھٹ گئے اور کامیابی کا آفتاب طلوع ہوا ۶۲-۶۴/۸

○ صحابۂ رسول آپس میں مہربان اور کافروں پر سخت تھے۔ ان کی یہی تعریف تورات اور انجیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمادی تھی ۴۸/۲۹۔

○ جب صحابہ رسولؐ کو عزت کی روٹی (آزاد حکومت) میسر آئی تو انہوں نے نظام صلواۃ (ربوبیت عامہ) کا اجتماعی نظام قائم کیا اور معاشرہ کے ہر کمزور کو فربہی دی ۴۱/۲۲۔

پس قرآن کریم کے مذکورہ بالا دلائل قاطعہ کے مطابق صحابہ رسول حقے سچے مومن اور واجب التکریم ہیں۔

قرآن کریم کے ان دلائل کے خلاف تاریخ کے کسی منگھڑت واقعہ کی بنا پر صحابہؓ کو ایک دوسرے کا دشمن ایک دوسرے کا قاتل یا خلافت کا غاصب قرار دینا خلاف قرآن ہے۔

۳۔ **لَهُمْ رِزْقٌ كَرِيمٌ** کے الفاظ میں صحابہ کی آزاد طاقتور اسلامی مملکت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی خبر دی گئی ہے۔ کیونکہ عزت کا لقمہ اس وقت تک نصیب نہیں ہوسکتا جب تک کہ کوئی حکومت فوجی' سیاسی اقتصادی اور معاشی لحاظ سے خود کفیل نہ ہو۔ جو حکومت اسلحہ' روپیہ یا خوراک کے لیے غیر حکومتوں کی محتاج ہو' وہ **لَهُمْ رِزْقٌ كَرِيمٌ** کے زمرہ میں نہیں آسکتی' صحابۂ رسول کی حکومت ہر لحاظ سے مضبوط اور غیر محتاج تھی۔

اللہ تعالیٰ کسی کا لحاظ ہرگز نہیں کرتا:۔ ۱ تا ۸/۴ میں صحابہؓ کرام کے ایمان اور توکل کی تعریف کرنے کے بعد اگلی آیتوں کے اندر جنگ بدر میں ان کے ایمان و توکل کا عملی نمونہ پیش کرنے سے پہلے' ان میں سے بعض کی وقتی کمزوری کی بھی خبر دی گئی ہے۔ قرآن کریم کسی کا مطلقاً" لحاظ نہیں کرتا۔ جنگ بدر کے متعلق جب مشورہ ہوا۔ تو اس کے ضمن میں ارشاد ہوا ہے:۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

جیسے کہ (اے رسولؐ) وہ وقت قابل ذکر ہے جب آپ کے رب نے آپ کو حق کے ساتھ آپ کے گھر سے نکالا۔ حالانکہ مومنوں کا ایک فریق (جنگ کیلئے نکلنا) ناپسند کرتا تھا۔ (وہ مشورہ کے وقت) حقیقت ظاہر ہو چکنے کے باوجود آپ سے جھگڑتے تھے۔ گویا کہ وہ ان کے دیکھتے دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔

○ اگلی آیت مجیدہ سے واقعہ یہ نمایاں ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے ہتھیار بند ہوکر اسلحہ اور سازوسامان کیساتھ مدینہ منورہ پر یلغار کر دی' اس وقت انہی کا ایک بے ہتھیار تجارتی قافلہ مدینہ منورہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ صحابہؓ میں سے بعض کا یہ مشورہ تھا کہ دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے اس کے غیر ہتھیار بند قافلے پر حملہ کیا جائے۔ لیکن مجلسِ مشاورت میں یہ طے پایا کہ صرف ہتھیار بند حملہ آوروں کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ اگلی آیات مجیدہ میں اسی چیز کی خبر اور اس کی علت بالفاظ ذیل بالتصریح بیان کی گئی ہے:۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸

اور (اے صحابہؓ!) وہ وقت قابل ذکر ہے جب اللہ نے تمہیں (مشاورتؐ) کے حکم ۳/۱۵۹ پر عمل کے وقت دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ دیا کہ تمہارے لیے وہ ہو۔ حالانکہ تم چاہتے تھے کہ تمہارے لیے بے ہتھیار گروہ ہو۔ لیکن اللہ تعالٰی نے اپنے قانون کے مطابق حق کو حق کر دکھانے اور کافروں کی جڑ کاٹ دینے کا ارادہ کیا۔ تاکہ حق حق اور باطل باطل ہو جائے اور اگرچہ مجرم حملہ آور ناپسند کرتے تھے۔

○ ا۔ **يَعِدُكُمُ اللّٰهُ** کے الفاظ میں مجلس مشاورت کے فیصلے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اس لیے منسوب کیا ہے کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مجلس مشاورت میں طے ہوا تھا۔ قرآن کریم کا اسلوب بیان ہے کہ مومنوں اور نبی اکرمؐ کے ان افعال کو جو اس کے حکم کے مطابق انجام دیئے جائیں۔ اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ جیسے کہ آگے آیت نمبر۱۷ میں اس عمل کو جو مومن صحابہ اللہ کے حکم کے مطابق بجا لائے' یعنی میدان بدر میں کافروں کو قتل کیا۔ اسے بالفاظ ذیل اللہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

○ **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** ۸/۱۷۔ (اے صحابہؓ) انہیں تم نے قتل نہیں کیا تھا' بلکہ اللہ نے قتل کیا تھا۔ نیز اسی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے عمل کو جو اللہ کے حکم کے مطابق تھا' اسے بھی بالفاظ ذیل اللہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

○ **وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** ۸/۱۷۔ اور (اے رسولؐ!) کافروں پر آپ نے تیر نہیں پھینکے تھے' جب آپ ہی نے پھینکے تھے۔ بلکہ اللہ نے پھینکے تھے۔

○ **غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ مسلح حملہ آوروں سے الگ اتفاقیہ طور پر دشمنوں ہی کا ایک غیر

مسلح گروہ تجارتی قافلہ بھی مدینہ منورہ کے قریب پہنچ رہا تھا۔ لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ حملہ آور مجرم گروہ کا مقابلہ کیا جائے۔

○ **وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ** یہ مکی مشرکوں حملہ آوروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ جنہوں نے پہلے تو **مکہ معظمہ** میں مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کرکے انہیں' ہجرت پر مجبور کر دیا اور جب مومن خود مکہ بدر ہو کر مدینہ منورہ چلے آئے۔ تو اتنا عظیم مسلح لشکر لیکر ان پر چڑھ دوڑے' ان کا خیال تھا کہ مسلمان اس یلغار کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکیں گے۔ وہ تکبر و کراہت کے ساتھ یہ ارادہ لے کر آئے تھے کہ مسلمانوں کے لیے شکست کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ لیکن ان کے ارادوں کی کراہت کے خلاف اگلی آیت مجیدہ میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے ارشاد ہوا ہے:۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝٩

(اور ایمان والو !) وہ وقت قابل ذکر ہے' جب تم نے اپنے رب سے مدد طلب کی۔ تو اس نے تمہاری دعا قبول فرمائی کہ بے شک میں پے درپے آنے والی ایک ہزار کائناتی قوتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں۔

○ ملائکہ کے متعلق بلاغ القرآن میں بارہا وضاحت کی جاچکی ہے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ان گنت کائناتی قوتیں ہیں۔ جو خود دکھائی نہیں دیتیں' ان کے کام دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے **جنود السموت والارض** کہہ کر بھی متعارف کرتا ہے جنگ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان لشکروں میں سے آندھی کا لشکر بھیج کر دشمنوں کے خیمے اکھاڑ پھینکے' ان کے گھوڑے خچریں مویشی سب **تتر بتر** ہوگئے۔ ۳۳/۹

○ استقامت و ثبات قدمی وہ طاقتیں ہیں' جو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اندر پیدا کر رکھی ہیں وہ بھی اللہ کے ملائکہ ہیں۔ صحابہؓ پر پے در پے نزول ملائکہ کو اگلی آیت مجیدہ میں ایک خوشخبری قرار دیا گیا ہے۔ جس سے ان کے قلوب مطمئن ہوگئے۔ اطمینان قلب کی بے پناہ طاقت بھی ایک مَلک ہے **أَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ** میں الف مبالغہ کا عدد ہے۔ کیونکہ عربی میں ہزار سے آگے کوئی گنتی نہیں۔ اس کے آگے دس ہزار سو ہزار اور ہزار ہزار کے انداز سے گنا جاتا ہے۔ یعنی صحابہؓ پر اللہ تعالیٰ کی ان گنت قوتوں کا نزول ہوا۔ جن سے ان کے قلوب مطمئن ہوگئے کہ دشمن کی طاقت اگرچہ بے تحاشہ ہے لیکن وہ ہمارے استقلال و ثبات قدمی کی بدولت یقیناً شکست کھا جائیں گے۔ چنانچہ اگلی آیت میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝١٠

اور (ایمان والو' صحابیو) اللہ تعالیٰ نے نزول ملائکہ کی خبر کو نہیں ٹھہرایا مگر ایک خوشخبری' اور تاکہ تمہارے اذہان مطمئن ہوجائیں۔ اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

اللہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں:۔ ○ **وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ** کا یہ انداز ہرگز نہیں کہ اللہ کا جی چاہا تو جنگ بدر میں مومنوں کی مدد کر دی اور نہ جی چاہا تو جنگ احد میں مدد روک دی بلکہ اس کا مستقل قانون ہے کہ وہ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرے **وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ** ○ ۲۲/۴۰ "اور اللہ تعالیٰ ضرور ضرور اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرے" اور اپنی مدد آپ یہ ہے کہ ہر موقعہ اور ہر مقام پر' ہر قدم اللہ کے قانون کے مطابق اٹھایا جائے۔ اسی چیز کی خبر **عَزِيزٌ حَكِيمٌ** کے الفاظ میں دی گئی ہے کہ غلبہ حکمت کے بغیر میسر نہیں آسکتا' کامرانی اور کامیابی ہر اس کام میں نصیب ہوگی جو عقل و حکمت کی اساس پر انجام دیا جائے گا۔

○ اگلی آیت مجیدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہؓ کرام میدان جنگ میں پہنچے تو تھکے ہوئے تھے۔ نیز میدان جنگ کا جو گوشہ انہیں میسر آیا وہاں پانی کا چشمہ بھی نہیں تھا اور زمین بھی ریتلی تھی۔ دشمن کی فوج نے میدان جنگ کے بہتر اور پانی والے گوشے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے بارش برسا کر یہ سارے مسئلے حل کر دیئے۔ میدان کی ریت بیٹھ گئی اور زمین گھوڑوں کے دوڑنے کے قابل ہوگئی۔ نیز آس پاس کے گڑھوں میں پانی کے ذخیرے بھی جمع ہوگئے اور رات بھر بارش ہونے کی بدولت بےخوف نیند آگئی۔ اور صبح کو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے تازہ دم ہوگئے:۔

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾

(ایمان والو!) وہ وقت قابل ذکر ہے جب اس (اللہ) نے تم پر امن کی نیند مسلّط کر دی۔ اس حالت میں کہ تم پر آسمان سے پانی نازل کیا۔ تاکہ تمہیں اس کے ساتھ (تمام وقتی کمزوریوں سے) پاک کر دے اور تم سے نفس شیطان کے وسوسوں کی نجاست دور کر دے اور تمہارے اذہان مربوط کر دے اور اس (پانی) کے ساتھ (ریتلے میدان کو جما کر وہاں) تمہارے قدم جما دے۔

○ **لِيُطَهِّرَكُم بِهِ** کے ضمن میں روایتی تفاسیر میں لکھا ہے کہ میدانِ بدر میں جب صحابہؓ کو نیند آئی تو سب کو احتلام ہوگیا اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا تو سب غسل کرکے پاک ہوئے۔ معاذ اللہ ! استغفراللہ ! میدان جنگ اور احتلام؟ یہاں رجز الشیطٰن سے مراد شیطان کے وہ وسوسے ہیں جو میدان جنگ میں پہنچنے پر، ریتلے میدان اور پانی کی عدم موجودگی کی بدولت نفس نے پیدا کیے، کہ یہاں گھوڑے دوڑ نہیں سکتے، ان کے پاؤں ریت میں دھنستے جا رہے ہیں۔ پانی موجود نہیں۔ بنے گا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے جنود السمٰوات والارض میں سے بارش کی مدد بھیج کر تمام مسئلے حل کر دیئے، امن کی نیند بھی آئی، صبح کو تازہ دم اٹھے۔ ضرورت سے وافر پانی بھی جمع ہو چکا تھا۔ اور ریت بھی جم چکی تھی، یعنی میدان گھوڑے دوڑانے کے قابل ہوچکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مخصوص بروقت مدد کیساتھ لشکر اسلام کو تمام وقتی کمزوریوں سے پاک کر دیا۔ اس طرح ان میں اطمینان قلب اور باہمی ربط مستحکم اور قدم مضبوط ہوگئے۔ اگلی آیت مجیدہ میں دشمنوں کے حملہ کی خبر کے وقت کے متعلق ارشاد ہوا:۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾

(اے رسول!) وہ وقت قابل ذکر ہے۔ جب (دشمن کے حملہ سے عوام میں جو ہراس پیدا ہوا۔ اس کے ضمن میں) آپ کے رب نے مجاہدوں کے جی میں ڈالا کہ بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم انہیں جو نئے ایمان لائے ہیں ثابت رکھو۔ میں ضرور (حملہ آور) کافروں کے اذہان میں رعب ڈال دوں گا۔ پھر تم ان کی گردنوں اور پورپور پر ضرب لگانا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾

(کافروں کی) یہ سزا اس لیے ہے کہ انہوں نے اس نظام کی مخالفت کی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے قائم کیا ہے۔ اور جو کوئی اس نظام کی مخالفت کرے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ قائم کیا ہے۔ تو بیشک اللہ تعالیٰ سزا کے لحاظ سے بہت سخت ہے۔

○ ا۔ ملائکہ کا لفظ فوج کے لیے مجازی طور پر سورہ زخرف میں بھی آیا ہے۔ فرعون نے کہا کہ میرے پاس تو سونے کے کنگن بھی ہیں اور میرے ساتھ فوج بھی پرا باندھے کھڑی ہے' موسٰی علیہ السلام کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں **فَلَوْ لَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ** ○ ۴۳/۵۳۔ "اسے سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے گئے اور اس کے ساتھ حفاظتی فوج کیوں پرا باندھے" نہیں آئی۔ پس آیت بالا ۸/۱۲ میں ملائکہ سے نبی اکرمؐ کی فوج کے مجاہد مراد ہیں۔ جب دشمنوں کے حملے کی خبر پھیلی اور اس سے عوام میں ہراس پیدا ہوا' تو اللہ تعالٰی نے ان کے جی میں ڈالا کہ وہ عوام کو ثابت قدم رکھیں اور میدان میں پہنچ کر نہ صرف دشمنوں کی گردنیں ماریں' بلکہ ان کے پور پور پر ضربیں لگائیں۔ یہاں ۸/۱۲ میں ملائکہ سے فرشتے مراد لینے والوں کو اس چیز پر غور کرنا چاہئے کہ اگر جنگ بدر میں دشمنوں کی گردنیں فرشتوں نے کاٹی تھیں اور ان کے پور پور پر ضربیں فرشتوں نے لگائی تھیں' تو پھر بدری مجاہدوں کی خوبی کیا تھی؟ چونکہ حقیقت یہ ہے کہ دشمنوں کی گردنیں بھی صحابہ ہی نے کاٹی تھیں اور ان کے پور پور پر ضربیں بھی صحابہؓ نے لگائی تھیں۔ اس لیے کھل کر ثابت ہوا کہ یہاں ملائکہ سے مراد فوجی مومن مجاہد ہیں۔

○ وحی کا معنی جی میں ڈالنا بھی ہے۔ یہ وحی نبوت نہیں۔ جیسے **اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ** ۱۶/۶۸۔ وحیِ جبلت ہے' وحیِ نبوت نہیں۔

○ **شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ** میں اللہ سے شقاوت الگ اور رسول سے شقاوت الگ نہیں۔ یہ اس ہموار و متوازن نظام کی ایک ہی شقاوت و مخالفت ہے جو اللہ تعالٰی نے اپنے نبی سے قائم کرایا تھا۔ اسی کو حکومتِ الٰہیہ بھی کہا جاتا ہے اور خلافت علٰی منہاج النبوۃ بھی۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں خلافت علٰی منہاج النبوۃ کے خلاف لشکر کشی کرنے والوں کو براہِ راست مخاطب کرکے ارشاد ہوا ہے:۔

ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ ⑭

(اے نظام ربوبیت کا انکار کرنے والو!) یہ بدترین شکست کا عذاب تمہارے لیے ہے' اسے چکھو' حقیقت یہ ہے کہ بلاشبہ منکرین ربوبیت کے لیے شکست کا عذاب ہے۔

جنگ کے قرآنی قوانین:۔ ○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں دشمنوں کے ساتھ جنگ سے متعلقہ سرفہرست بتایا گیا ہے' ہرگز ہرگز پیٹھ نہ دکھانا:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ⑮

اے ایمان والو! جب تم میدان جنگ میں ان لوگوں کے بالمقابل آؤ جنہوں نے نظام ربوبیت کا انکار کیا ہے تو ان کی طرف پیٹھ نہ موڑنا۔

وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ⑯

اور جو کوئی اس دن (جنگ کے دوران) اپنی پیٹھ پھیرے گا' سوائے اس کے کہ وہ کوئی فوجی کرتب کرتا ہو یا (اپنی فوج کے کسی) دستے میں ملتا ہو۔ پس وہ (ان چیزوں کے بغیر پیٹھ پھیرنے والا) بیشک اللہ کا غضب لے کر پھرا۔ اس کا ٹھکانہ اخروی ناکامی ہے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

مومنوں کا قتال خود اللہ تعالیٰ کا قتال تھا۔ اور نبی اکرمؐ کی تیر اندازی خود اللہ تعالیٰ کی تیر اندازی تھی:۔ جنگِ بدر میں صحابہؓ نے جو بلا پیٹھ دکھائے ثابت قدمی کے ساتھ قتال کیا تھا' اور رسول اللہؐ نے جو تیر اندازی فرمائی تھی۔ چونکہ وہ جملہ اعمال خالصتہ" اللہ کے لیے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں انہیں بالفاظ ذیل اپنی طرف منسوب فرمایا ہے:۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ⑰

○ پس (اے ایمان والو !) ان کافروں کو تم نے قتل نہیں کیا تھا' لیکن انہیں اللہ نے قتل کیا تھا۔ اور (اے رسول !) آپ نے تیر نہیں پھینکے جب آپ نے پھینکے تھے دلیکن وہ اللہ نے پھینکے تھے۔ اور تاکہ مومن نمایاں ہو جائیں' بہتر نمایاں ہونا' بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

ایک عظیم غلطی:۔ ○ **وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** سے بعض حلقے رسولؐ مقبول کے متعلق یہ تصور دیتے ہیں وہؐ ہی اللہ ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے جو تیر پھینکے تھے' ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ اللہ نے پھینکے تھے۔ یہ تصور انتہائی خطرناک ہے۔ اگر **وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** سے یہ اخذ کیا جائے کہ رسول اللہ ہی اللہ ہیں **تو فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** سے لازمی طور پر یہ اخذ ہوتا ہے کہ سب کے سب صحابہؓ اللہ ہیں العیاذ باللہ۔ وحدت الوجودی حضرات یہی معنی لیتے ہیں کہ رسولؐ اللہ اور صحابہؓ سب اللہ ہی تھے بلکہ ہرچیز اللہ ہی ہے' واضح رہے کہ جو کام اللہ کی خالص رضا کے مطابق انجام پاجائے' اسے وہ اپنی طرف منسوب کرکے یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ خالص میری رضا کے مطابق ہے۔ اس میں فاعل کی ہوائے نفس کا مطلقاً" کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کے مذکورہ اعمال کے' خالصتہ" اپنی رضا کے مطابق ہونے کے اظہار کے لیے ان کے اعمال کو اصطلاحاً" اپنے اعمال کہا ہے۔ ورنہ نہ صحابہؓ کرام ہی اللہ تھے اور نہ خود رسول کریم ہی اللہ تھے۔

○۲۔ **لِيُبْلِيَ مادہ ب۔ ل۔ و = بلو** سے ہے۔ اس مادہ کا معنی آزمانا بھی ہے۔ ظاہر اور نمایاں کرنا بھی اور احسان کرنا بھی ہے' یہاں ۸/۱۷ میں صحابہ کرامؓ مومن مجاہدوں کے عزم و استقلال کو نمایاں کرنا مراد ہے جو احسن طور پر نمایاں ہوگئے' کہ قلیل مستقل مزاج مجاہد' دشمن کے کثیر لشکر پر غالب آگئے۔

○ ۳۔ **اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ**= بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا' جاننے والا ہے۔ یہاں یہ جملہ جبکہ جنگ جہاد کے ضمن میں آیا ہے اس لیے' اس سے یہ مراد ہے کہ:۔

تم نے عوام کے حوصلے بندھانے' اور افواہوں کے روکنے کے لیے جو زبانی سعی کی اسے اللہ سننے والا ہے اور دفاع کے لیے جونسے اعمال تم بجا لائے ہو انہیں اللہ خوب جاننے والا ہے۔

○ اس سے اگلی آیت میں کافروں ہی کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ ذلت کی شکست تو تمہارے حالیہ اقدام کی سزا ہے اور سن لو کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا:۔

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

(نظام ربوبیت کا انکار کرنے والو!) یہ ہے تمہارے حالیہ اقدام کی سزا حقیقت یہ ہے کہ اللہ کافروں کی تجویز کو بیکار کرنیوالا ہے' (آئندہ بھی ایسا کریگا)

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

○ اگر تم یہ چاہتے تھے کہ مومن فتح پاکر دکھائیں' تو بیشک مومنوں کی فتح تمہارے سامنے آچکی ہے حقیقت یہ ہے کہ (آئندہ کے لیے) اگر تم باز آجاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم جارحیت کا اعادہ کرو گے تو ہم بھی (اپنے ہی دندان شکن جواب کا) اعادہ کریں گے اور تمہیں تمہارے فوجی جوان کوئی فائدہ نہیں دیں گے' اگرچہ وہ کتنے ہی کثرت میں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

○ اس کے بعد پھر مومنوں کو مخاطب کیا گیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾

○ اے ایمان والو! (اس مرکزی نظام کی) اطاعت کرو جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ قائم کیا ہے۔ اور اس اکلوتی اطاعت سے روگردانی نہ کرنا۔ حالانکہ تم (آیاتِ قرآنیہ) سنتے ہو (کہ مرکزی نظام سے روگردانی کی سزا بہت بری ہے) ۸/۱۴

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور تم ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا' جو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا ہے۔ لیکن (حقیقت میں) وہ سنتے نہیں ان کے قلوب میں منافقت کی بیماری ہے۔

○ اس سے اگلی آیت میں ایسے لوگوں کے متعلق کہ جو بصیرت کے کانوں سے نہیں سنتے اور نہ اسے عقل و بصیرت پر پرکھنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں' ارشاد ہوا ہے:۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

○ بیشک لوگوں میں سے اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ ہیں جو گونگے بہرے ہو رہتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔

انسانوں اور حیوانوں میں فرق صرف عقل و بصیرت کا ہے:۔ آیت بالا میں عقل سے کام نہ لینے والوں کو بدترین خلائق قرار دیا گیا ہے' سورہ اعراف میں جو پیچھے گزر چکی ہے ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

○ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ط اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ** ○ ۷/۱۷۹= ان کے پاس دماغ ہیں مگر وہ ان کے ساتھ سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان کے ساتھ دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان کے ساتھ سنتے نہیں' وہ ڈنگروں جیسے ہیں' بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہی لوگ (حقائق سے) بے خبر ہیں۔

○ اللہ تعالیٰ نے دماغ' آنکھیں اور کان استعمال کرنے کے لیے عطا فرمائے ہیں' جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے انہیں قرآن نے ڈنگروں کی سطح کے انسان نما حیوان قرار دیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں حکم دیا گیا ہے:۔

○ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا

○ ۱۷/۳۶ اور اے مخاطب ! تو اس چیز کے پیچھے نہ پڑنا' جس کا تجھے علم نہیں۔ بیشک (علم کے ذرائع یہ ہیں) کانوں' آنکھوں اور دماغ کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ کیا ان سے کام لیا تھا یا نہیں

اگلی آیت مجیدہ میں ان چیزوں سے کام لینے کو خیر کہا گیا' اور ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۞

اور اگر اللہ ان میں خیر پاتا (یعنی اگر وہ سن کر اس پر غور کریں) تو اللہ تعالیٰ انہیں سناوے (یعنی بات ان کے ذہن میں اتر جائے) لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں سنا بھی دے (یعنی اگر وہ کبھی انسانی سطح پر آکر قرآن سن بھی لیں۔ تو چونکہ اس سے ان کے آبائی عقائد متزلزل ہوتے ہیں اس لیے) وہ اس سے روگردانی کرکے بھاگ جاتے ہیں۔

○ یہ آیت مجیدہ متشابہ ہے جس سے بعض لوگ یہ تاثر دیتے ہیں کہ اللہ ہی سناتا اور نہ سناتا ہے۔ اس کے مقابلہ پر ۷/۱۷۹ محکم ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس دماغ ہیں ان سے خود سوچتے نہیں' ان کے پاس آنکھیں ہیں ان سے خود دیکھتے نہیں' ان کے پاس کان ہیں ان سے خود سنتے نہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا کیا قصور؟

نگاہ بازگشت:۔ آیت نمبر۱ میں الانفال یعنی ہر قسم کے زائد مالوں' غنیمت' دفینے اور ہر قسم معدنیات کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ سب اس حکومتِ الٰہیہ کی ملکیت ہیں جو اللہ کے رسولؐ نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کی تھی۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کی قائم کردہ قرآنی حکومت کا مرکزی نظام پورے عوام کی ضروریات زندگی کا ضامن تھا۔ نیز چونکہ اس نظام کی اساس آیات قرآنیہ پر قائم کی تھی۔ اس لیے آیت نمبر۲ تا ۴ میں آپؐ کے صحابہؓ مومنوں کی شان بیان کی گئی ہے کہ جب ان پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے اذہان کانپ اٹھتے ہیں۔ ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں اللہ کے قانون پر (توکل) بھروسہ کرتے ہیں۔ نیز وہ اللہ تعالیٰ کی فرض کردہ صلوٰۃ موقت پابندی کے ساتھ ادا کرتے' اور جو کچھ ان کے رب نے عطا فرمایا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ حقے سچے مومن ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے بلند درجات ہیں' انہیں ہر قسم کے خطرات سے بچاؤ دیا گیا تھا۔ اور انہیں عزت کی روٹی میسر تھی یعنی انہیں آزاد طاقت ور حکومت میسر آئی تھی۔

○ آیت نمبر۵ تا ۸ میں جنگ بدر کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو دشمنوں کے مقابلے کے لیے اس حالت میں آپ کے گھر سے نکالا کہ آپ راہ حق پر گامزن تھے آپ کا لڑائی کے لیے نکلنا صد فیصد درست تھا۔ کیونکہ دشمن جارحانہ حملہ کرکے چڑھ آیا تھا۔ صحابہؓ کی ایک جماعت لڑائی کے حق میں نہیں تھی اور بعض چاہتے تھے کہ مسلح حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کی بجائے انہی کے غیر مسلح تجارتی قافلے کا رخ کیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ مسلح حملہ آوروں سے مقابلے کا فیصلہ کرایا' تاکہ حق اور باطل کی جنگ میں' باطل مغلوب ہو جائے اور حق کی فتح بصورت نصف النہار عیاں ہو جائے۔

○ آیت نمبر۹ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرکے بتایا ہے کہ جب تم نے دشمنوں کے مقابلے پر اپنے رب سے

مدد کی دعا کی تو اس نے تمہاری دعا قبول فرمائی کہ میں پے در پے آنے والے بیشار (ملائکہ) کائناتی قوتوں کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا۔ اور آیت نمبر۱۰ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نزول ملائکہ کی خبر کو ایک خوشخبری ٹھہرایا تاکہ تمہارے اذہان مطمئن ہو جائیں۔ اور آیت نمبر۱۱ میں اپنے **جُنُودُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** میں سے بروقت بارش بھیجنے کی خبر دی گئی۔ جس سے صحابہ کے ذہن کی تمام پریشانیاں اطمینان میں تبدیل ہوگئیں۔ میدان جنگ میں پانی کے چشمے پر دشمن قابض تھا۔ بارش کی بدولت اسلامی لشکر کے ارد گرد بڑے بڑے گڑھوں میں پانی کے ذخیرے جمع ہوگئے۔ میدان جنگ کی ریتلی زمین جم کر گھوڑوں کے دوڑنے کے قابل ہوگئی۔ رات بھر موسلا دھار بارش کی بدولت دشمن کے شب خون کا خطرہ ٹل گیا' صحابہؓ کو امن کی نیند میسر آئی اور وہ صبح کو دشمن کے مقابلے کے لیے بالکل تازہ دم ہوکر اٹھے۔ اور اس طرح نفس شیطان نے جوان کے اذہان میں وسوسے پیدا کر رکھے تھے کہ پانی پر دشمن کا قبضہ ہے۔ ریتلی زمین گھوڑوں کے دوڑنے کے قابل نہیں۔ یہ تمام وسوسے دور ہوگئے' صحابہؓ کے اذہان کو مکمل اطمینان میسر آیا اور ان کے قدم مضبوط ہوگئے۔

○ آیت نمبر۱۲'۱۳ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن مجاہدوں کے جی میں ڈال دیا گیا کہ تم تو مسلموں کو ثابت رکھو۔ میں حملہ آوروں پر تمہارا رعب ڈال دوں گا۔ پھر تم دشمنوں کی نہ صرف گردنیں کاٹنا بلکہ ان کے پور پور پر ضرب لگانا۔ یہ اس لیے کہ کافروں نے اس متوازن نظام کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا ہے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کی معرفت قائم کیا ہے۔ آیت نمبر۱۴ میں کافروں کو مخاطب کیا گیا ہے کہ اب تم شکست کے عذاب کا مزہ چکھو۔

○ آیت نمبر۱۵-۱۶ میں اہل اسلام کے نام حکم عام جاری کیا گیا ہے کہ جب تم میدان جنگ میں کافروں کے مقابلے پر آؤ تو پیٹھ نہ پھیرنا۔ سوائے اس کے کہ تم جنگی کرتب کر رہے ہو یا اپنے کسی فوجی دستے میں شامل ہو رہے ہو۔ جو کوئی میدان جنگ سے پیٹھ پھیرے' وہ اللہ کا عذاب لے کر لوٹا۔ اس کا ٹھکانہ اخروی ناکامی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ جنگ بدر میں صحابہ نے جو کافروں کو قتل کیا تھا' چونکہ وہ عین اللہ کے حکم کے مطابق تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر۱۷ میں صحابہ کے عمل کو خود اپنا عمل قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح نبی اکرمؐ نے جو تیر اندازی فرمائی تھی' چونکہ وہ بھی عین اللہ کے حکم کے مطابق تھی اس لیے آپؐ کے اس عمل کو اپنا عمل قرار دیا گیا ہے۔

○ اس سے آگے آیت نمبر۱۸'۱۹ میں کافروں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ تمہیں اس لئے شکست ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نظام ربوبیت کا انکار کرنے والوں کی تجویز کو بیکار کرنے والا ہے۔ تم اگر یہ چاہتے تھے کہ مومن اس عظیم لشکر پر فتح پاکر دکھائیں' تو وہ تمہارے سامنے آچکی ہے اور سن لو کہ آئندہ کے لیے اگر تم باز آجاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے جارحیت کا اعادہ کیا تو ہم بھی ایسے ہی دندان شکن جواب کا اعادہ کریں گے اور تمہیں تمہاری فوجی کثرت کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے ساتھ ہے' جو نظام ربوبیت کے قیام کے ذریعہ امن قائم کرنے والے ہیں۔

○ اس سے آگے آیت نمبر ۲۰ تا ۲۳ میں مومنوں کو کہا گیا ہے کہ اس مرکزی نظام کی پوری طرح اطاعت کرتے رہو' جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ قائم کیا ہے' اس سے روگردانی نہ کرنا' اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جو کہتے تو ہیں کہ ہم نے اللہ کا حکم سنا ہے' لیکن وہ سنتے نہیں یعنی سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو گونگے بہرے ہو رہتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے اگر ان میں حقائق کو قبول کرنیکی صلاحیت ہو تو' قرآن کریم کو بغور سنیں۔

لیکن چونکہ قرآن سننے سے ان کے آبائی عقائد متزلزل ہوتے ہیں اس لیے وہ روگردانی کرتے اور بھاگ جاتے ہیں۔

○ کافروں کے متعلق اس وضاحت کے بعد کہ وہ اللہ کے رسول کی دعوت کو نہ بصمیم قلب سنتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں مومنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا۔ رسول کی دعوت قبول کرنا تاکہ وہ تمہیں عزت کے ساتھ جینا سکھائے:۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اے ایمان والو! جب اللہ اپنے رسولؐ کے ذریعہ تمہیں بلائے تاکہ تمہیں زندہ کرے (یعنی باعزت طور پر زندہ رہنے کے انداز سکھائے) تو اس کی پکار کو قبول کیا کرو۔ اور جانے رہو کہ بیشک انسان اور اس کے دماغ کے درمیان اللہ کا قانون حائل ہے (یعنی جو فیصلہ خود انسان کا دماغ کرتا ہے' وہی کام انسان کے اعضاء انجام دیتے ہیں) اور شان یہ ہے کہ سب لوگ (اعمال کی جوابدہی کیلئے) اسی کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

۱۔ **اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ** کے الفاظ میں اللہ اور رسولؐ کی الگ الگ دو دعوتیں نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی مشترک ایک ہی دعوت اللہ تعالٰی کی ہے جو اس نے اپنے رسول کے ذریعہ دی ہے' جب تک نبی اکرمؐ زندہ تھے' اس وقت صحابہؓ کو بنفس نفیس دعوت دیا کرتے تھے جس پر عمل کرنے سے صحابہؓ کو عزت کی زندگی میسر آئی تھی۔ اور آپؐ کی وفات مبارکہ کے بعد مسلمانوں کو آپؐ کی لائی ہوئی کتاب اللہ و رسول کی وہ اکلوتی دعوت قیامت تک دیتی رہے گی' جس پر عمل کرنے سے باعزت زندگی ملتی ہے۔

○ **يُحْيِيْكُمْ** کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں' جن میں زندوں کو زندگی دینے کی خبر دی گئی ہے۔ یہاں بے وقار اور بے عزتی کی زندگی کو موت کے ساتھ تشبیہہ دی گئی اور زندگی اسے قرار دیا ہے جس میں پوری قوم کو عزت کی روزی میسر آئے۔ غیر قوموں سے ضروریات کی بھیک نہ مانگنی پڑے صحابہ رضی اللہ عنہم جو آیت بالا کے اولین مخاطب ہیں' انہیں اللہ و رسول کی دعوت کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے جو عزت کی زندگی میسر آئی تھی اس کی خبر اسی سورہ انفال کی آیت ذیل میں دی گئی ہے:۔

○ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ**○ ۸/۷۴ اور جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا اور وہ لوگ بھی جنہوں نے انہیں جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ سب سچے سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے (داخلی اور خارجی ہر قسم کے خطرات سے) بچاؤ اور عزت کی روزی ہے۔ (وہ آزاد' خود مختار طاقتور اور بے محتاج حکومت کے مالک ہوں گے۔ یعنی انہیں اپنی ضرورتوں کے لیے دوسری حکومتوں سے بھیک مانگنی نہیں پڑے گی)

○ ۲۔ **بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ** میں لفظ **الْمَرْءِ** مطلق انسان کے لیے آیا ہے' جس میں مرد عورتیں سب شامل ہیں۔ کیونکہ یہاں ایک عالمگیر قانون بیان کیا گیا ہے۔

قَلْبِهٖ میں **قلب** کا معنی دل نہیں بلکہ دماغ ہے۔ قرآن مجید میں قلب بمعنی دماغ کی وضاحت سورہ اعراف میں منکرین ربوبیت کی صفات بیان کرتے ہوئے بالفاظ ذیل آئی ہے۔ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا** ۱۷۹/۷ ان کے پاس قلوب ہیں مگر وہ ان کے ساتھ تفقہ نہیں کرتے' سوچتے نہیں' اب غور فرمایئے گا کہ غور و خوض' تفقہ اور سوچ بچار دماغ کا کام ہے۔ دل کا نہیں۔ کیونکہ دل تو جگر کی طرف سے منتقل کردہ خون کو سارے جسم میں پہنچانے کا محض پمپ ہے۔ اس لیے جہاں تدبر' تفکر' تفقہ' غور اور سوچ بچار کے لیے قلب کا لفظ آئے وہاں اس کا معنی دماغ ہوتا ہے' دل نہیں ہوتا۔ لفظ قلب کا سہ حرفی مادہ ق۔ ل۔ ب' قلب ہے۔ جس کا بنیادی معنی ہے الٹنا اسی سے لفظ ہے انقلاب بمعنی الٹ پلٹ کر دینا۔ اب دماغ چونکہ انسانی جسم کا پرزہ ہے جس میں ہر وقت انقلاب برپا رہتا ہے۔ جسم یہاں بیٹھا ہے اور دماغ لندن کی سیر کر رہا ہے' پھر وہاں سے منقلب ہوکر جھٹ نیو یارک پہنچ جاتا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے ملکوں سے ہوتا ہوا مشرق وسطی کی خبر لینے لگتا ہے۔ ان دیکھے مقامات کے نقشے تصور میں بناتا اور پوری دنیا میں منقلب ہوتا رہتا ہے' پس دماغ کی اسی انقلابی حیثیت سے اسے قلب کہا جاتا ہے۔ اس کے سوا دل کو قلب اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اس مادہ کے بنیادی معنوں سے متعلق ہے' یہاں آیت زیر بحث میں قلب بمعنی دماغ ہے جو پورے جسم کا گورنر (حاکم) ہے۔ جو حکم دماغ کی سرکار سے صادر ہوتا ہے' اعضاء اسے بجا لانے میں بلا تاخیر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

○ **اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ** کے جملہ میں اللہ بمعنی اللہ کا وہ قانون ہے جو اس نے نوع انسانی کے اعمال کے متعلق خود متعین کیا ہوا ہے۔ یہاں اللہ بمعنی خود اللہ اس لیے لگ نہیں سکتا کہ اللہ تعالی جو اس وسیع و عریض کائنات پر محیط ہے وہ کسی دو چیزوں کے درمیان محاط (گھرا ہوا) ہو ہی نہیں سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ اللہ بمعنی قانون کس قاعدے کے مطابق لیا جاسکتا ہے اس کے لیے سورہ النحل کی آیت ذیل ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد باری ہے:۔

○ **اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىْ جَوِّ السَّمَآءِ ط مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ط اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** ۷۹/۱۶ کیا لوگوں نے پرندوں کی طرف غور نہیں کیا۔ انہیں غور کرنا چاہیئے کہ فضاءِ آسمانی میں مسخر کئے ہوئے (اڑتے پھرتے) ہیں۔ انہیں نہیں تھامے رکھتا' مگر اللہ (کا قانون) تھامے رکھتا ہے۔ بیشک اس بیان میں اس قوم کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اللہ کے قانون کی محکمیت پر ایمان رکھتی ہے۔

○ دیکھیے ! یہاں **يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ** کے جملہ میں اللہ بمعنی اللہ کا وہ قانون ہے جو اس نے پرندوں کے فضا میں اڑنے کے متعلق خود متعین کر رکھا ہے کہ جب تک پرندے کے پر صحیح حالت میں موجود ہیں۔ اور اس کے جسم میں بھی کوئی سقم واقع نہیں ہوا اس وقت تک وہ اڑتا رہتا ہے۔ مگر جب شکاری کا معمولی سا چھرّہ اس کے پَر کو بیکار کر دیتا ہے یا اس کے جسم کے کسی حصے میں سقم پیدا کر دیتا ہے تو وہ اڑتا ہوا پرندہ معاً نیچے آگرتا ہے۔

○ اب جس طرح **مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ** میں اللہ بمعنی اللہ کا قانون ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث کے جملہ **اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ** میں لفظ اللہ بمعنی اللہ کا قانون ہے' جسے اس نے انسان کے دماغ اور اس کے اعضا کے مابین خود حائل کر رکھا ہے اور جب کوئی اچھا یا برا کام کرنے کا موقع اس کے سامنے آتا ہے تو نفس امارہ اسے برائی کا حکم کرتا ہے' اور نفس لوامہ اس سے منع کرتا اور نیکی کی ترغیب دیتا ہے لیکن فیصلہ کرنا انسان کے اپنے دماغ کا کام ہے'

انسان کے اعضا اور دماغ کے درمیان اللہ تعالیٰ کا یہ قانون حائل ہے کہ جو حکم جسم انسانی کے حاکم (گورنر) دماغ کی طرف سے جس عضو کی طرف صادر ہوتا ہے وہ اس کی تعمیل میں بلا عذرد بلا تاخیر سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اچھے یا برے جیسے بھی عمل انسان بجا لاتا ہے' خود اپنے دماغ کے فیصلے کے مطابق بجا لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ اچھے عمل زبردستی کراتا ہے نہ برے۔

○ اسی مفہوم کی تائید آیتِ مجیدہ کے آخری جملہ **وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ** میں موجود ہے کہ۔ بیشک شان یہ ہے کہ سب لوگ اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے اللہ ہی کے حضور میں جمع کیے جائیں گے ظاہر ہے کہ اعمال کی باز پرس اسی صورت میں انصاف ٹھہر سکتی' جب اچھے یا برے اعمال انسان خود بجا لائے اس پر کسی پہلو بھی کسی قسم کا دباؤ موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ "سورہ حم سجدہ میں اچھے برے اعمال کی بجا آوری انسان کی اپنی مرضی پر چھوڑی گئی ہے۔

○**اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** ۴۱/۴۰ اچھے یا برے' جو عمل تم خود چاہو کرو

○**مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ** ۴۱/۴۶ جو کوئی اچھے کام کرے گا اس کی جزا خود اسی کے لیے ہے۔ اور جو کوئی برے عمل کرے گا' اس کی سزا' خود اسی کو ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (زبردستی برے عمل کروا کر) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اگلی آیت میں ان اعمال کے وبال کی خبر دی گئی ہے' جن کی سزا صرف برے عمل کرنے والوں تک محدود نہیں رہتی' بلکہ بے قصور افراد بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۵

اور (ایمان والو) ایسے فتنے برپا کرنے سے بچو' جن کی سزا تم میں سے صرف ان لوگوں ہی کو مخصوص طور پر نہیں ملتی' جنہوں نے ظلم کیا ہو۔ (بلکہ ساری قوم پر وبال آجاتا ہے اللہ کے قانون میں ہرگز لچک موجود نہیں صحابہ رسول تک کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا) اور جانے رہو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

○ ایسا عمل جس میں قصور وار تو ہوں چند افراد' مگر اس کی سزا صرف انہی کو نہ ملے' بلکہ بے قصور بھی اس کی زد میں آجائیں' اس کی مثال پیچھے سورہ آل عمران میں جنگ احد کے ذکر میں گزر چکی ہے کہ نبی اکرمؐ نے صحابہؓ کے کچھ افراد کو ایک مخصوص اونچے مقام پر متعین کر رکھا تھا۔ تاکہ دشمن پیچھے کی طرف سے حملہ آور نہ ہوسکے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب میدان جنگ میں مسلمانوں کو ابتدائی مقابلے میں کامیابی نصیب ہوئی' دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ نکلا تو صحابہؓ کے مذکورہ گروہ کے کچھ افراد نے یہ سمجھ لیا کہ اب فتح ہو چکی ہے' دشمن راہِ فرار اختیار کر چکا ہے اس لیے اب ہمارا کام ختم ہو چکا ہے۔ کیونکہ پیچھے کی طرف سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب اس مقام کو چھوڑ کر اپنے لشکر میں شامل ہو جانا چاہئے۔

○ اسی دستہ کے چند افراد نے اس مقام کو چھوڑنے کی مخالفت کی مگر' دوسروں کی رائے غالب آئی اور وہ مذکورہ مقام چھوڑ کر لشکر میں آملے۔ لیکن ان چند افراد کی غلطی کا وبال پورے لشکر اسلام پر آیا کہ دشمن کے گشتی دستے نے اسلامی لشکر پر

پیچھے سے حملہ کر دیا اور صحابہؓ کے پورے لشکر کو شکست ہو گئی۔ بالفاظ دیگر چند افراد کی غلطی کا وبال صرف انہی تک محدود نہ رہا بلکہ ان جاں نثاروں پر بھی آگیا جو ابھی ابھی انتہائی جاں فشانی اور پامردی کیساتھ دشمن کو بھگا چکے تھے۔ اس پورے واقعہ اور اپنے قانون کی محکمیت کی خبر ذیل کے چند لفظوں میں دی گئی ہے:۔

○ اَوَلَمَّآ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ○ ۳/۱۶۵ اور کیا جب تمہیں (شکست کی) مصیبت پہنچی' بیشک تم اس سے دگنی (شکست) دے چکے ہو۔ تم نے پوچھا کہ یہ (شکست) کہاں سے آگئی ہے۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجئے گا کہ یہ تمہارے اپنے افراد کی طرف سے آئی ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ فتح و شکست سمیت ہر چیز کے اندازے' پیمانے اور قانون متعین کرنے والا ہے۔ (جب تمہارے کچھ افراد ایسا عمل بجا لائے' جس کی سزا صرف ان تک محدود رہنے والی نہیں تھی' تو پورا لشکر اسلام اس کے وبال کی لپیٹ میں آگیا اور صحابہؓ جیسے اس پاکیزہ لشکر کو شکست ہو گئی جس کے سالارِ لشکر خود رسول مقبول تھے)۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں صحابۂ رسولؐ کو ان کا وہ وقت یاد دلایا جا رہا ہے جب وہ اتنے کمزور تھے کہ انہیں خوف لگا رہتا کہ ان کے راہ چلتے افراد کو لوگ اچک نہ لیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مکہ معظمہ سے ہجرت کروا کر مدینہ منورہ میں مرکزیت عطا فرمائی اور طیّبات سے نوازا:۔

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِيۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰٮكُمۡ وَاَيَّدَكُمۡ بِنَصۡرِهٖ وَرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۞

اور (اے جماعت صحابہ!) اس وقت کو یاد کرو جب تم (مکہ معظمہ میں) تھوڑے تھے اور زمین میں کمزور کر دیئے گئے تھے۔ (اس وقت) تم ڈرتے تھے کہ تمہیں (یعنی تمہارے راہ چلتے افراد کو) لوگ اچک نہ لیں۔ پھر اللہ نے تمہیں (مدینہ منورہ میں ٹھکانہ دیا' تمہاری مرکزیت قائم ہوگئی اور اس نے تمہاری مدد فرمائی اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا' تاکہ تم شکر گزاری کے کام کرو (اپنا دفاع مضبوط کرو)

شکر بمعنی دفاع مضبوط کرنا:۔ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ کا معنی لکھا گیا ہے "دفاع مضبوط کرو"۔ ان مقامی معنوں کی صحت کے ثبوت کے لیے پورے سیاق کلام پر توجہ فرمائیں۔ واضح رہے کو پوری سورہ انفال جنگ جہاد کے مسائل پر مشتمل ہے' جس کی ابتدا ہی مال غنیمت سے کی گئی ہے پیچھے آیت نمبر۴ تا ۱۴ میں جنگ بدر کا ذکر ہے۔ آیت نمبر۱۵' ۱۶ میں جنگ سے پیٹھ نہ موڑنے کا خصوصی حکم دیا گیا ہے۔ آیت نمبر۱۷' ۱۸ میں صحابہؓ اور نبی اکرمؐ کے جنگی اعمال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

○ آیت نمبر۱۹ میں جنگ بدر کے حملہ آوروں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اگر آئندہ کے لیے جارحیت سے باز آجاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ ورنہ آئندہ بھی تمہارا اسی طرح دندان شکن مقابلہ کیا جایا کرے گا۔ اس سے آگے آیت نمبر۲۰' ۲۱ میں جنگ سے متعلقہ ہدایات اور اسلامی مرکز کی اطاعت کاملہ کا حکم دیا گیا ہے۔ آیت نمبر۲۲' ۲۳ میں قرآنی نصائح کو سن ان سنی کرنیوالوں کو بدترین خلائق قرار دیا گیا ہے۔ آیت نمبر۲۴ میں ہر فعلِ انسانی کا ذمہ دار خود انسان کو ٹھہرایا اور آیت نمبر ۲۵ میں ان جنگی فتنوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے جو چند افراد کی غلطی کی بدولت پورے لشکر کی شکست کا باعث بنتے ہیں۔

○ اور اس سے آگے ہے آیت بالا زیر بحث' جس میں صحابہؓ کی مکی زندگی کی کمزوری یاد دلا کر مدنی زندگی میں مرکزیت

کے قیام کے ضمن میں اللہ نے اپنی مدد اور طیّبات کی فراوانی کی غرض بتائی ہے۔ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ**

○ شکر کا مطلق معنی ہے ایسا عمل بجا لانا جس کا بھرپور ثمر بشکل مشہود سامنے آموجود ہو۔ **المشکار** اس دودھ دینے والے مادہ جانور کو کہتے ہیں جس کے تھن دودھ سے بھرے رہیں۔ **شکرۃ الشجرۃ** کا معنی ہے درخت پر ٹہنیاں نکل آئیں، نمودار ہوگئیں۔ **اشتکرت السماء** کا معنی ہے بارش زور سے بری **اشتکر الحرو البرد** کا معنی ہے گرمی اور سردی بھرپور ہوگئی۔ یہ تو ہوا اس مادہ کا مطلق بنیادی معنی۔ اب آیئے اس چیز کی طرف کہ، آیت بالا میں جہاں پورا سیاق کلام جنگ جہاد کے عنوان پر مشتمل ہے، اور آگے ساری سورہ انفال جنگ جہاد کے خصوصی ذکر سے معمور ہے، وہاں مدینہ منورہ کی مرکزیت عطا کرنے کی غرض و غایت کے طور پر جو ارشاد ہوا ہے۔ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ**، وہاں یہ معنی کیوں صحیح ہے۔ "تاکہ تم دفاع مضبوط کرو"

○ سنئے ! داؤدؑ کو بھی حکومت و مرکزیت عطا ہوئی تھی اور پھر حکم ہوا تھا۔ **اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ** ۳۴/۱۱۔ اے داؤد ! تو زرہیں بنایا کر اور ان کے حلقوں کا صحیح صحیح اندازہ کیا کر۔ اور تم (بہترین زرہیں بنا کر) صالح عمل بجا لایا کرو بیشک جو تم عمل کرو گے، میں انہیں دیکھنے والا ہوں۔ داؤدؑ کے بعد جب آپ کے بیٹے سلیمانؑ کو مرکزیت تفویض ہوئی، تو ان کے متعلق ارشاد ہوا، کہ انھوں نے سامان حرب کی تیاری کے لیے بہتے تانبے کی فاونڈریاں قائم کیں۔ ان کے ہاں غیر ملکی کاریگر اپنے بادشاہ کی اجازت سے جنگی ضرورتوں کے لیے ذیل کا سامان تیار کرتے تھے۔ ○ **یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ** ○۳۴/۱۳ اور اس کے لیے بناتے تھے (غیر ملکی ماہرین) فوجی قلعے، اور ہر تیار کی جانیوالی چیز کے نقشے اور (ان قلعوں میں فوجی ضروریات کے لیے پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے) تالابوں جتنی بڑی بڑی ٹینکیاں اور (فوجوں کے لیے بڑی مقدار میں کھانے پکانے کی) ایک ہی جگہ پر پڑی رہنے والی دیگیں (ان چیزوں کی تیاری کا حکم ہم ہی نے دیا تھا کہ) اے اہل داؤد شکر گزاری کا کام کیا کرو۔ (دفاعی امور کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے رہو) ہمارے شکر گزار بندے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ (اکثریت کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں حکومت میسر آتی ہے تو دفاع سے غافل ہوکر عیش و عشرت میں بدمست ہو رہتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ کہ جب دشمن حملہ آور ہوتا ہے تو اس کا دفاع نہیں کر سکتے اور حکومت کھو بیٹھتے ہیں)

دیکھا آپ نے کہ:۔ ○ آیت بالا ۳۴/۱۳ میں سلیمانؑ کو فوجی ضرورتوں کے سامان کی تیاری کا حکم **اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا**" کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ جس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مرکز کی طرف سے ملکی دفاع کو مضبوط کرنا شکر گزاری کا عمل ہے۔ چنانچہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کو مدینہ منورہ میں مرکزیت (آزاد قرآنی حکومت) عطا ہوئی تو اس عطاءِ ربانی کی غرض بتائی گئی ہے۔ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ**۔ تاکہ تم دفاع مضبوط کرو۔ دشمن تمہاری طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی جرات نہ کر سکے اور اگر حملے کی غلطی کر بیٹھے تو دانت تڑوا کر واپس لوٹے۔

○ اسی غرض و غایت کو واضح حکم کی صورت میں اسی سورہ انفال کی آیت نمبر۶۰ میں بالفاظ ذیل اجاگر کیا گیا ہے۔

○ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ** (۸/۶۰) اور دشمنوں کے مقابلہ کے لیے پوری استطاعت بھر فوجی قوت تیار کرتے رہو۔ خصوصاً" تمہارے ہاں ذرائع رسل و رسائل (الخیل) کی بہتات موجود

ہو۔ تم اس فوجی قوت کے ساتھ اللہ کے، اور اپنے دشمنوں کو لرزاتے رہو۔ (یعنی تمہارا دفاع اتنا مضبوط اور فوجی قوت اتنی نمایاں ہو کہ تمہارا دشمن گھر بیٹھے کانپتا رہے)

دفاع میں خیانت نہ کرو: اگلی آیت مجیدہ میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تم الگ الگ اپنی اپنی کوٹھیاں بنگلے، باغات، مربعے اور جائیدادیں بنا کر ملکی دفاع میں خیانت نہ کرنا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾

﴿۲۷﴾ ایمان والو ! اس اسلامی اور قرآنی مرکز کی خیانت نہ کرنا جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ قائم کیا ہے اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کی امانتوں میں خیانت کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم (اس کے برے نتائج کو خوب) جانتے ہو۔

○ اللہ کی خیانت اور اس کے رسولؐ کی خیانت دو الگ الگ خیانتیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں اس مرکزی نظام کی خیانت مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے ذریعہ قائم کیا تھا **فلہٰذا** ہر وہ کام جس سے مرکز کمزور ہو، وہ اللہ اور رسولؐ کی خیانت ہے۔ مرکزی نظام پر جو لوگ قابض ہوتے ہیں، مرکز کی اولین خیانت ان سے شروع ہوتی ہے۔ وہ لوگ عوامی بیت المال کو ذاتی منفعت کے لیے استعمال کرتے، ذاتی جائیدادیں، کوٹھیاں، بنگلے بناتے اور مربعے خریدتے ہیں۔ مدنی مرکزیت کے اولین مقتدر افراد صحابہ رسولؐ تھے، وہی آیت بالا ۸/۲۷ **لا تخونوا اللہ والرسول** کے اولین مخاطب تھے۔ انہوں نے اس آیت مجیدہ پر پورا پورا عمل کیا۔ جیسے کہ اپنے بیگانوں اور دوست دشمن سب کی تاریخوں میں کہیں بھی یہ چیز نہیں ملتی کہ صحابۂ رسولؐ نے کوئی جائیدادیں بنائی تھیں۔ اپنے لیے عوام سے جدا بنگلے اور کوٹھیاں تعمیر کرائی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فتوحات کا سلسلہ چار دانگ عالم میں پھیل گیا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ مرکز کی عدم خیانت کی بدولت نہ صرف یہ کہ انکا دفاع مضبوط تھا۔ بلکہ ان کی فوجی قوت اتنی طاقتور تھی کہ جدھر کو ان کے قدم اٹھتے تھے، فتح ہمرکاب ہوتی تھی دشمن ان کی فوجی طاقت سے ہر آن لرزہ براندام رہتا تھا۔

○ اس کے برعکس جہاں اللہ و رسولؐ کی خیانت کی جاتی ہو، یعنی عوامی بیت المال کو باپ دادا کی جاگیر سمجھ کر اس سے ذاتی منفعت اندوزی ارباب اقتدار کا شعار ہو۔ اور اس طرح جو مال فوجی قوت مہیا کرنے پر صرف ہوتا تھا وہ ذاتی عیش پرستی کی نذر ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ دفاع کی کمزوری اور فوجی قوت کا نقدان ہوتا ہے۔ دشمن پر سے رُعب اٹھ جاتا اور وقت پڑنے پر شکست لازم ہو جاتی ہے۔ چونکہ مندرجہ بالا مالی خیانت اولاد کے لیے کیجاتی ہے اس لیے اگلی آیت مجیدہ میں ایسا کرنے والوں کو مخاطب کرکے متنبہ کیا گیا ہے کہ ایسے مال اور ایسی اولاد فتنہ ہیں:۔

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾

﴿۲۸﴾ اور جانتے رہو کہ تمہارے مالوں اور تمہاری اولادوں (کی وہ غلط محبت، جس سے ملکی دفاع میں خیانت واقع ہوتی ہے) فتنہ ہے۔ اور بیشک اللہ ہی ہے کہ اس کے ہاں (اس خیانت سے بچنے کا) بہت بڑا بدلہ ہے۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں مذکور اجرِ عظیم کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے:۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ
لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ
يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

(۲۹) ایمان والو ! اگر تم اللہ تعالیٰ (کے مذکورہ بالا حکم کی مخالفت) سے بچتے رہے تو اللہ تمہارے لیے فیصلہ مقرر کر دیگا (تمہاری فوجی تیاری (۸:۶۰) اور تمہاری ثابت قدمی (۸:۴۵) کی بدولت تمہارے لیے واضح فتح کا فیصلہ کر دیا جائے گا) اور وہ تم سے تمہاری بد حالیاں دور کر دیگا۔ اور داخلی خارجی ہر قسم کے خطرات سے تمہاری حفاظت کریگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے فضل والا ہے۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں اس وقت کا ذکر کیا گیا ہے' جب کفارِ مکہ نے نبی اکرمؐ کیلئے عمر قید' قتل یا ملک بدر کرنیکا منصوبہ بنایا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کے اس بدترین منصوبے کو اپنے پر امن ہجرت کے بہترین منصوبے پر بروقت عمل کروا کر خاک میں ملا دیا تھا:۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ
يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ
اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

(۳۰) اور (اے رسولؐ) وہ وقت قابل ذکر ہے' جب (مکہ کے) کافروں نے تجویز کی کہ آپ کو عمر قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں۔ اور یا آپ کو ملک بدر کر دیں۔ اور وہ بھی تجویز کر رہے تھے۔ اور اللہ بھی تجویز کر رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر تجویز کرنے والا ہے۔ (کافر تجویز ہی کرتے رہ گئے اور اس نے ہجرت کروا کر آپ کو مدینہ منورہ پہنچا دیا)

○ اگلی آیت مجیدہ میں مکہ کے کافروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا
لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ
اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾
وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ
الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً
مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

اور جب ان (کافروں) پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو وہ کہتے تھے کہ بیشک ہم نے سن لیا ہے۔ اگر چاہیں تو ہم بھی اس جیسا (کلام) کہہ دیں۔ نہیں ہے یہ مگر پرانے لوگوں کی محض کہانیاں ہیں۔
خصوصاً" وہ وقت قابل ذکر ہے جب انہوں نے یہ کہا کہ اے ہمارے اللہ اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے سچا ہے (اور ہم نے اس کا انکار کر دیا ہے تو ہمارے انکار کے بدلے) ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ یا ہم پر درد ناک عذاب لے آ۔ (تاکہ ثابت ہو کہ یہ واقعی تیری طرف سے سچی کتاب ہے۔

کفارِ مکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہیں تھے' انہیں انکار تھا' اکیلے اللہ کی فرمانبرداری کا:۔○

○ دیکھئے ! آیت بالا ۸/۳۲ سے کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ کفار مکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہیں تھے۔ جیسے کہ ان کی دعا نقل کی گئی ہے کہ "اے ہمارے اللہ ! اگر یہ قرآن واقعی تیری طرف سے نازل کردہ سچی کتاب ہے۔ تو اس کے انکار کے عوض ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ یا کوئی اور درد ناک عذاب ہم پر نازل کر دے"۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم قرآن مجید پر غور کرتے ہیں تو کسی بھی نبی کی مقابل قوم اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر ثابت نہیں ہوتی بلکہ وہ سب "اکیلے اللہ" کی فرمانبرداری کی منکر تھیں۔ اور ربوبیت عالمینی کا انکار کرکے' اللہ کے رزق کی تقسیم میں من مانے عدم توازن کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب

گیا کرتی تھیں اور اسی کو اللہ کا دین تصور کیے ہوئے تھیں' اللہ تعالیٰ کی ہستی کی بابت الگ الگ قوموں کے متعلق قرآن مجید میں درج ہے:۔

قوم نوح اللہ کی منکر نہیں تھی ○ سورہ مومنون میں قوم نوح کے سرداروں کا قول درج ہے **فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ**○ ۲۳/۲۴۔ پس قوم نوحؑ کے سرداروں میں سے نوحؑ کا انکار کرنیوالوں نے کہا کہ نہیں ہے یہ مگر تمہارے جیسا بشر ہے۔ وہ (نبوت کا دعویٰ کرکے) تم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ (نبی بھیجنا) چاہتا تو ضرور کوئی فرشتہ نازل کرتا ہم نے تو اپنے بڑوں سے یہ سنا ہی نہیں (کہ بشر نبی ہوا کرتا ہے) دیکھیے ! اس آیت مجیدہ میں قوم نوح کے سرداروں کا جو یہ قول نقل کیا گیا ہے "اگر اللہ چاہتا تو فرشتہ نازل کر دیتا" اس سے کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی ہستی کے منکر ہرگز نہیں تھے۔ انہیں انکار تھا بشر کے نبی ہونے کا۔

قوم عاد بھی اللہ کی منکر نہیں تھی ○ سورہ اعراف میں قوم عاد کے کافروں کا قول بالفاظ ذیل نقل کیا گیا ہے:۔ **قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا** (۷/۷۰) انھوں نے کہا کہ کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی فرمانبرداری کریں اور جن کی فرمانبرداری ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے انہیں چھوڑ دیں؟۔ اس آیت مجیدہ سے ہودؑ کی مقابل قوم کے متعلق اظہر من الشمس ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہیں تھے۔ بلکہ وہ اللہ کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کی فرمانبرداری کے قائل تھے۔

قوم ابراہیمؑ بھی اللہ کی منکر نہیں تھی ○ سورہ انعام میں اپنی قوم کے نام ابراہیمؑ کا خطاب بالفاظ ذیل نقل ہوا ہے۔ **وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا** (۶/۸۱) اور میں کیوں خوف کھاؤں اس سے جو تم نے شرک کیا ہے۔ حالانکہ تم خوف نہیں کرتے' بلا شبہ تم نے اللہ کے ساتھ (بتوں کو ۳۷/۹۵ اور ستاروں کو ۶/۸۰) شریک ٹھہرایا ہوا ہے' جس کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ دیکھیے ! اس آیت میں **اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ** کے الفاظ سے کھل کر عیاں ہوتا ہے کہ قوم ابراہیم اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر نہیں تھی۔ اس نے اللہ کے ساتھ متعدد شریک مقرر کر رکھے تھے۔

قوم فرعون بھی اللہ کی منکر نہیں تھی ○ سورہ **طٰهٰ** میں موسیٰؑ کا قول بالفاظ ذیل درج ہے جو آپؑ نے قوم فرعون سے فرمایا:۔ **قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى** ۲۰/۶۱ اور موسیٰ نے انہیں کہا' خرابی ہے تمہارے لیے' اللہ پر جھوٹ نہ باندھو' ورنہ تمہیں عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیگا حقیقت یہ ہے کہ جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا وہ تباہ ہوگیا۔ دیکھیے ! اس آیت مجیدہ میں موسیٰؑ کے **لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ ان کی مقابل قوم اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر نہیں تھی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے بڑے بزرگوں والے غلط نظریات منسوب کر رکھے تھے۔

○ حقیقت یہ ہے کہ قومیں اللہ کے حکم کے ساتھ غیر اللہ کے حکموں کو واجب الاتباع قرار دے کر' نظام ربوبیت کی

مخالفت میں من مانی طغیانیاں کرتی چلی آئی ہیں۔ اور اللہ کے ذمہ لگا رکھا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے بزرگوں کے احکام کو واجب الاتباع قرار دیا ہے۔ خود رسول اللہ کی مقابل قوم ' یعنی کفار مکہ کا حال بھی سورہ بنی اسرائیل میں یہی بتایا گیا ہے کہ وہ اکیلے اللہ کی فرمانبرداری سے بھاگتے تھے:۔

○ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا○ (۱۷/۴۶) اور اے رسولؐ! جب آپؐ قرآن میں اپنے اکیلے رب کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ پیٹھ موڑ کر بھاگ جاتے ہیں یعنی وہ اکیلے اللہ کے احکام کو واجب الاتباع قرار نہیں دیتے۔ اللہ کے حکم کے ساتھ اپنے بزرگوں کے احکام کو بھی واجب الاتباع منوانا چاہتے ہیں۔

رجوع الی المطلب ○ آیت بالا ۸/۳۲ میں جو کفار مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ: اے ہمارے اللہ اگر یہ قرآن تیری طرف سے سچا ہے تو ہمارے انکار کی بدولت ہم پر آسمان سے پتھر برسا' اور یا پھر ہم پر کوئی اور درد ناک عذاب نازل کر دے ان کے طلب عذاب کا جواب باصواب اگلی آیت مجیدہ (۸:۳۳) میں رسول اللہ کو مخاطب کرکے بالفاظ ذیل دیا گیا ہے:۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝

اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ (اے رسولؐ) وہ ان کو اس حالت میں عذاب کرے کہ جس حالت میں آپ خود ان میں موجود ہیں اور اللہ انہیں اس حالت میں بھی عذاب کرنے والا نہیں کہ وہ(اس کے ضابطے پر ایمان لا کر اس سے) بچاؤ طلب کر رہے ہوں۔

○ **وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ** میں جو کہا گیا ہے کہ جب تک آپ ان کے اندر موجود ہیں اس وقت تک اللہ ان پر عذاب نہیں کرے گا۔ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ مستقل سنت بیان فرمائی ہے کہ نافرمان قوموں پر عذاب نازل کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنے نبیوںؑ اور ان کے صحابہؓ کو اس قوم میں سے نکال لیا کرتا تھا۔ جیسے کہ قوم نوح پر عذاب نازل کرنے سے پہلے نوحؑ سے کشتی بنوا کر انہیں اور ان کے صحابہؓ کو اس میں سوار کرکے قوم میں سے نکال لیا گیا۔ ہودؑ اور صالحؑ کی قوموں پر عذاب نازل کرنے سے پہلے انہیں اور ان کے صحابہؓ کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا۔ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے سے پہلے لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس بستی سے نکال لیا گیا۔ علی ہذا القیاس

○ **وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ** کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے کہ اس کے فیصلے اندھا دھند نہیں ہوتے۔ اگر قوم سرکشی کی انتہاء کے قریب پہنچنے کے بعد ضابطہ ربانی پر ایمان لاکر اس پر عامل ہو جائے' تو اگرچہ ان میں سے نبی رسولؐ نکل بھی گیا ہو تو اللہ تعالیٰ پھر بھی عذاب نہیں کرتا۔ جیسے کہ قوم یونسؑ کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ یونسؑ نے ان کی نافرمانیوں سے یہ اندازہ لگایا کہ اب ان پر عذاب آیا ہی چاہتا ہے۔ اس لیے آپ ان سے نکل گئے۔ لیکن ہوا یہ کہ اگرچہ ان کی نافرمانیاں نزول عذاب کی حدوں کو چھو رہی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے یونسؑ کے تشریف لے جانے کے بعد ضابطہ الٰہی کی طرف رجوع کیا۔ ایمان لائے اور ساتھ ہی اپنی سرکشیوں سے باز آکر اور ضابطہ الٰہی پر عمل کرکے اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہی' یعنی اللہ تعالیٰ سے عملاً" بچاؤ طلب کیا۔ تو چونکہ اس وقت ان کی حالت **هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ** کی تھی' اس لیے اگرچہ ان کا نبی ان کے اندر موجود نہیں تھا مگر عذاب نازل نہ ہوا۔

○ سورہ یونس میں اسی چیز کی خبر بالفاظ ذیل دی گئی ہے:۔

○ **فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ط لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ**

الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ○ ۱۰/۹۸ پس کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی سوائے قوم یونس کی بستی کے کہ اس کے رہنے والے ایمان لائے۔ پھر ان کے ایمان لانے نے انہیں فائدہ دیا۔ جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ان سے دنیا کی زندگی کا رسوا کن عذاب ٹال دیا اور انہیں ایک مدت تک فائدہ دیا۔

○ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے کلمات تو تبدیل ہوتے ہی نہیں ۱۰/۶۴۔ تو پھر قوم یونسؑ کے عذاب کا فیصلہ کیوں بدل دیا گیا۔ کیا قوم یونسؑ سے اللہ تعالیٰ نے کوئی مخصوص رعایت برتی تھی؟ اس سوال کا جواب آیات محکمات ۱۰/۶۴، ۶/۱۱۵، ۵۰/۲۹ کے مطابق کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہرگز ہرگز نہیں بدلتے' یہ ہے کہ قوم یونس ہنوز اللہ تعالیٰ کے ڈھیل کے دائمی فیصلے کی حدود کے اندر تھی' اس کے لیے ابھی نزول عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا دائمی فیصلہ یہ ہے:۔ **وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاُمْلِيْ لَهُمْ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ** ۱۸۲، ۷/۱۸۳ اور جو لوگ ضابطہ ربانی کا انکار کرتے ہیں' ہمارا قانون ان کی طرف بتدریج بڑھتا ہے' اس طرف سے جسے وہ جانتے نہیں ہوتے۔ اور میں انہیں (اتمام حجت کے لیے) مہلت دیتا ہوں۔ بلا شبہ میری۔ تجویز متعین ہے (کتاب کے متن کے عین مطابق ہے۔ اس میں دھاندلی اور ناانصافی کا شائبہ تک موجود نہیں)

○ پس قوم یونس ہنوز **اُمْلِيْ لَهُمْ** (یعنی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت) کی حدود کے اندر تھی۔ اس لیے اس کے لیے عذاب کا فیصلہ ہنوز صادر نہیں ہوا تھا۔ یونس نے "سہوا" جان لیا کہ اب اس قوم پر عذاب آیا ہی چاہتا ہے' اس لیے اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن آپ کی قوم' مہلت کے الٰہی وقفہ کے اندر اندر اللہ کے ضابطہ پر نہ صرف ایمان لے آئی۔ بلکہ اس پر عمل کرکے عذاب سے "عملاً" بچاؤ طلب کیا۔ اگرچہ اس وقت ان کا نبیؑ ان کے اندر موجود نہیں تھا۔ لیکن چونکہ اس وقت ان کی حالت **وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ** کی تھی۔ اس لیے ان کے ایمان نے انہیں فائدہ دیا اور عذاب ٹل گیا۔

بیت الحرام پر کفار کا تسلّط تھا ○ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ مکہ کی مسجد حرام پر کفارِ مکہ کا تسلّط تھا۔ اور انہوں نے مسلمانوں پر بیت الحرام کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ اس لیے بتایا گیا ہے کہ ان پر عذاب تو اس لیے نہ آیا کہ رسول اللہؐ ان کے اندر موجود تھے۔ مگر ان کا مذکورہ جرم ہرگز قابلِ عفو و درگزر نہیں تھا۔ وہ وا قعتہً" عذاب کے مستحق تھے۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۴

اور کیا ہے ان کے لیے کہ اللہ انہیں (یعنی کفار مکہ کو) عذاب نہ کرے۔ جبکہ یہ وہی تو ہیں جو (مومنوں کو) مسجد حرام سے روکتے ہیں یہ اس کے (مسجد حرام کے) متولی نہیں ہوسکتے اس کے متولی صرف وہ ہوسکتے ہیں جو اللہ کے قانون کی نگہداشت کرنے والے ہوں ولیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی۔

○ یہاں اولیاء کا معنی متولی اور منتظم ہیں۔ مسجد حرام چونکہ امن عامہ کا عالمی مرکز ہے ۲/۱۲۵، ۳/۹۷ اس لیے اس کے متولی اور منتظم وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ کے قانون کی صد فیصد نگہداشت کرنے والے اور صلوٰۃ موقت کو اس طرح ادا کرنے والے ہوں جس کی ہدایت خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے ۲/۲۳۹۔ لیکن اگلی آیتِ مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ کفار مکہ نے

صلوٰۃ موقت کی اصلی شکل و صورت کو اس حد تک مسخ کر دیا تھا کہ وہ لوگ مسجد حرام میں تالیاں اور سیٹیاں بجاتے یعنی راگ اور سازوں کے ساتھ صلوٰۃ ادا کیا کرتے تھے:۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾

اور نہیں تھی ان کی صلوٰۃ بیت الحرام (کعبہ مکرمہ) کے پاس سوائے سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے۔ پس (اے کفار مکہ! اب) عذاب کا مزہ چکھو' اس جرم کی پاداش میں جو تم انکار کیا کرتے تھے۔

○۱۔ **مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ وہ لوگ سابقہ انبیاء کی امت کہلاتے تھے صلوٰۃ کے قائل اور اسے ادا بھی کیا کرتے تھے۔ مگر وہ لوگ اس کی اصلی ہیت کو جو انہیں سابقہ انبیاء دے گئے تھے' اس حد تک تبدیل اور مسخ کر چکے تھے کہ قیام رکوع سجدہ اور حمد دعا تسبیح کی بجائے سیٹیاں اور تالیاں بجایا کرتے تھے۔ یعنی صلوۃ جیسے پاکیزہ عمل کو گانے بجانے میں تبدیل کر دیا ہوا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے صلوٰۃ کو اس کی اصلی شکل قیام رکوع سجدہ اور حمد دعا تسبیح کی صورت میں ادا کیا تو مسجد حرام سے روک دیا۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے عوام کو اسلام سے روکنے کے لیے باقاعدہ تنظیم قائم کر لی تھی اور اس پر مال بھی خرچ کیا کرتے تھے۔ اور آئندہ مال خرچ کرنے کے بھی انتظامات کر لیے تھے۔ لیکن ارشاد ہوا ہے کہ وہ بالآخر مغلوب ہوکر شکست کھا جائیں گے:۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾

بیشک جن لوگوں نے اللہ کے ضابطہ کا انکار کیا ہے اور لوگوں کو اللہ کی راہ اسلام سے روکنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں پھر ضرور مزید مال بھی خرچ کریں گے۔ مگر (انجام کار) ان پر حسرت ہوگی وہ مغلوب ہو جائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے ضابطہ کا انکار کیا ہے۔ سب شکست کے عذاب میں جمع کیے جائیں گے۔

○۱۔ جہنم' نار بمعنی شکست کا عذاب' پیچھے آیت نمبر ۱۲-۱۳/۸ میں بھی گزر چکا ہے۔ **سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ○ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ○** (۱۲ تا ۱۴/۸) میں کافروں کے ذہنوں میں تمہارا رعب ڈال دوں گا پھر تم ان کی گردنوں اور پور پور پر ضرب لگانا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اس مرکز کی مخالفت کی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ قائم کیا ہے۔ اور جو کوئی اللہ و رسول کے نظام کی مخالفت کرے تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ اے منکرو! اس عذاب کا مزہ چکھو۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشک منکروں کے لیے آگ کا (گردنوں اور پور پور ضربوں کے ساتھ) شکست کا عذاب ہے

○ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان میں کچھ اچھے لوگ بھی ہیں۔ کفار مکہ کی آخری شکست کی ایک غرض یہ بتائی گئی ہے' تاکہ خبیث اور طیب الگ الگ ہو جائیں' جو لوگ طیب ہیں وہ بطیب خاطر حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں اور جو خبیث ہیں۔ ان کے کشتوں کے پشتے لگا کر ڈھیر کر دیا جائے' وہ ختم کر دیے جائیں:۔

لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۳۷﴾

(کافروں کو شکست دینے کی غرض یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ خبیثوں کو طیب افراد سے متمیز کر دے اور خبیثوں کو ایک دوسرے پر تہہ بہ تہہ ڈھیر کر دے صرف کشتوں کے پشتے لگ جائیں۔ پھر (قیامت کو بھی) انہیں اخروی جہنم میں داخل کر دے یہی لوگ تو گھاٹا پانے والے ہیں۔

○ اس آیت مجیدہ میں کفار مکہ کا انجام بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں گھاٹا پانے والے ہیں دنیا میں انہیں شکست فاش نصیب ہوگی اور اخروی جہنم انکا ٹھکانہ ہوگا اگلی آیت مجیدہ میں اصل عنوان کی طرف رخ کرتے ہوئے۔ جنگ بدر کے شکست خوردہ کافروں کی اتمام حجت کے لیے' انہیں ذیل کے الفاظ میں متنبہ کرنے کا واضح حکم خود رسول اللہ کو دیا گیا ہے:۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

(اے رسولؐ) جن لوگوں نے ضابطہ الٰہی کا انکار کیا ہے انہیں کہہ دیجئے گا کہ اگر وہ آئندہ کے لیے باز آجائیں تو جو کچھ پیچھے ہو چکا ان کے لیے معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ (حملے کا) اعادہ کریں تو (جان لیں کہ) پہلے لوگوں کا طریقہ گزر چکا ہے (جو کچھ ان کے ساتھ ہوا وہی ان کے ساتھ ہوگا۔ وہ بھی مٹ گئے یہ بھی مٹ جائیں گے)

○ **اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ** کے الفاظ میں کفار مکہ کی طرف سے کئے گئے اس حملہ کے متعلق' جو جنگ بدر کے وقوع کا موجب ہوا یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ آئندہ کے لیے حملہ آوری سے باز آجائیں تو ان کے مذکورہ حملہ کے عوض جوابی حملہ نہیں کیا جائے گا۔ درگزر برتا جائے گا۔ لیکن اگر وہ باز نہ آئے اور بار بار حملہ آور ہوئے تو دوران حملہ بھی حملہ آوروں کے دانت توڑے جائیں گی اور بالآخر مکہ معظمہ پر جوابی حملہ کرکے ان کی ان روز روز کی یلغاروں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سورہ فتح میں اس جوابی حملہ کی خبر دی گئی ہے کہ جب رسول اللہ نے صحابہؓ کے لشکر کثیر کے ساتھ مکہ معظمہ کی طرف پیش قدمی فرمائی تو کفارِ مکّہ نے بلا جنگ و جدال شکست قبول کرکے مسجد حرام کی تولیت رسول اللہ کی خدمت میں پیش کر دی:۔

○ **وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا"** ۴۸/۲۴۔ ○ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں مکہ والوں کے ہاتھ تم سے روک دیے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے' پیچھے اس کے کہ (تمہاری عظیم فوجی تیاری ۸/۶۰ کی بدولت) ان پر تمہارا رعب ڈال دیا گیا۔ (کفار مکہ نے بلا جنگ و جدال شکست قبول کر لی اور ایمان والو! تم (جنگی تیاریوں کے ضمن میں) جو جو عمل بجا لا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا تھا۔

○ سورہ فتح میں اس سے آگے ارشاد ہوا ہے:۔

○ **هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا" اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ط** ۴۸/۲۵

وہ وہی (مکہ کے کافر) ہیں جنہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا تھا اور کعبہ کے تحائف کو اپنے پہنچنے کی جگہ پر پہنچنے سے بند کر رکھا

تھا۔

○ المختصر! کفار مکہ نے مدینہ منورہ پر حملوں کی صورت میں جو مسلسل فتنہ' جنگ بدر ۳/۱۲۳ جنگ (احد) ۳/۱۶۵ جنگ احزاب ۳۳/۹ کی صورت میں قائم کر رکھا تھا' اسے رسول اللہؐ نے صحابہؓ کے عظیم لشکر کے ساتھ مکہ کی طرف پیش قدمی کر کے وادی مکہ میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اگلی آیت مجیدہ میں اسی آخری جوابی حملہ کا حکم دیا گیا ہے تاکہ کفار مکہ کا فتنہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے:۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۳۹﴾

اور (ایمان والو!) ان سے (کفار مکہ سے) اس وقت تک لڑتے رہو کہ فتنہ باقی نہ رہے یعنی دشمن کی طاقت کلیتہ" ختم ہو جائے اور قانون سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے۔ (یعنی ہر طرف اللہ کا' قرآن کا قانون جاری ہو جائے) پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایک ایک عمل کو دیکھنے والا ہے جو وہ بجا لاتے ہیں۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۚ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿۴۰﴾

اور اگر رو گردانی کریں (باز نہ آئیں) تو جان لو کہ بلا شبہ اللہ تمہارا کار ساز ہے۔ وہ بہتر کار ساز اور بہتر مددگار ہے۔

○ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کی کار سازی اور مدد اس کے قانون کے ساتھ مشروط ہے یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور وہ ہماری مدد کرے گا۔ جیسے کہ کار سازی (ولایت) کے ضمن میں ارشاد ہوا ہے:۔

اللہ مددگار ہے انسان کے ان عملوں کیساتھ جو وہ حصول مقصد کے لیے خود بجا لاتے ہیں۔ ○ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ○ ۶/۱۲۷۔ اللہ کے ہاں لوگوں کے لیے سلامتی کا گھر ہے۔ اور وہ ان کا ولی' کار ساز ہے ان عملوں کیساتھ جو وہ خود بجا لاتے ہیں۔

یہ تو ہوئی اللہ تعالیٰ کی مشروط کار سازی' کہ وہ حصول مقصد کے لیے کئے گئے ان عملوں کے ساتھ مدد کرتا ہے جو حضرت انسان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دماغ کے ساتھ صحیح سوچ بچار کے بعد اس کے دیئے ہوئے اعضاء آنکھ' کان' زبان اور ہاتھ پیروں کے ساتھ خود بجا لاتا ہے۔ اب اس کی مشروط نصرت کا فیصلہ بھی خود اس کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ سورہ حج میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ ۲۲/۴۰

○ مفہوم۔ اور اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا غالب ہے

دیکھا آپ نے کہ آیت ۶/۱۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت (کار سازی) کو انسان کے اپنے اعمال کے ساتھ مشروط کر رکھا ہے اور یہاں ۲۲/۴۰ میں اپنی نصرت (مدد) کو انسان کی اپنی مدد آپ کرنے کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون یہ ہے کہ وہ اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرے یعنی حصول مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ اوزاروں' دماغ' سمع' بصر اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کے ساتھ ان قوانین پر عمل پیرا ہو جائے جو مطلوبہ مقصد کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود متعین فرما رکھے ہیں اس کے برعکس اللہ ان لوگوں کی مدد ہرگز نہیں کرتا۔ جو عملاً" کچھ نہیں کرتے اور **نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ** کا ورد کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان الفاظ کے بار بار دہرانے سے دشمن پر فتح نصیب ہو جائے گی۔ یعنی زبان سے برسائے ہوئے بموں کیساتھ دشمن کا اسلحہ ناکارہ ہو جائے گا۔ العیاذ باللہ!

○ پس وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ کا قرآنی تصریف آیات کے ساتھ صحیح مفہوم یہ ہے کہ:۔

"اور اگر کفار مکہ حملہ آوری سے باز نہ آئیں روگردانی کریں تو ایمان والو! جان لو کہ تمہاری مکمل فوجی تیاری ۸/۶۰ اور مکمل ثابت قدمی ۸/۶۵ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے۔ اور وہ اپنے نہ دھوکا دینے والے قوانین کے ساتھ بہتر کارساز اور بہتر مددگار ہے۔

نگاہ بازگشت:۔ آیت نمبر ۲۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ ایمان والو! جب اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ تمہیں عزت کی زندگی عطا کرنے کیلئے بلائے تو اس کی پکار کو قبول کیا کرو اور جانے رہو کہ عزت کی زندگی تمہارے اپنے ہی اعمال کی بدولت میسر آئیگی۔ اللہ کا قانون' انسانی اعضاء اور اس کے دماغ کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ اچھے یا برے جس کام کا فیصلہ خود انسانی دماغ کرتا ہے اور اس کے لیے اعضاء کو حکم دیتا ہے' وہی کام اعضاء انجام دیتے ہیں یعنی ہر اچھے یا بُرے کام کا ذمہ دار انسان خود ہے۔

○ آیت نمبر ۲۵ میں بتایا گیا ہے کہ بعض بُرے کام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا وبال صرف بُرے عمل کرنے والے ہی پر نہیں آتا' بلکہ پوری قوم اس کی زد میں آجاتی ہے۔ اللہ کا قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ جیسے کہ جنگ احد میں چند صحابہؓ کی غلطی کا وبال پورے اسلامی لشکر پر آیا تھا۔

○ آیت نمبر ۲۶ میں صحابہؓ کرام کو ارشاد ہوا ہے کہ اس وقت کو یاد کرو کہ جب مکہ معظمہ میں تم اس قدر کمزور تھے کہ تمہیں خوف لگا رہتا تھا کہ تمہارے راہ چلتے افراد کو دشمن اُچک نہ لیں۔ پھر اللہ نے اپنے قانون کے مطابق تمہاری مدد فرمائی اور مدینہ منوّرہ میں تمہاری سرکزیت قائم ہوگئی۔ اس طرح رزق کے سرچشمے تمہارے قبضے میں آئے تاکہ تم شکرگزاری کے کام کرو (یعنی اپنا دفاع مضبوط کرلو تاکہ خوف دُور ہو جائے) شکر بمعنی دفاع استحکام کی تفصیل آیت نمبر ۲۶ کی تفسیر القرآن بالقرآن کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

○ آیت نمبر ۲۷ میں حکم دیا گیا ہے کہ ایمان والو! اللہ و رسول کی خیانت نہ کرنا' یعنی اس سرکز کی خیانت نہ کرنا جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے قائم کیا ہے اور نہ ہی تم آپس میں ایک دوسرے کی خیانت کرنا۔ یعنی نہ اسلامی ریاست کے مجموعی کاموں میں خیانت کرکے قومی نقصان پہنچانا اور نہ آپس میں ایک دوسرے کے مال کھا کر انفرادی نقصان کے مرتکب ہونا۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ اگر خود تمہاری انفرادی خیانت کی جائے تو تم کبھی بھی برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوسکتے۔

○ آیت نمبر ۲۸۔۲۹ میں کہا گیا ہے' جانے رہو' تمہارے مالوں اور اولاد کی غلط محبت جس کی بدولت ملکی دفاعی اور قومی ترقی میں خیانت واقع ہوتی ہے فتنہ ہے اور اس خیانت سے بچنے کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ یعنی ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت سے بچ جاؤ تو وہ تمہاری کامیابی کا فیصلہ کر دے گا اور تمہاری بدحالیاں دور کردیگا اور تمہیں ہر قسم کا بچاؤ عطا فرمائیگا' کیونکہ وہ صاحب فضل عظیم ہے اس کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔

○ آیت نمبر ۳۰ میں جناب رسول مقبولؐ کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ وہ وقت قابل ذکر ہے۔ جب مکّہ کے کافروں نے

تجویز کی کہ وہ یا تو آپ کو عمر قید کر دیں یا قتل کر دیں اور یا ملک بدر کر دیں لیکن ان کے مقابلے پر اللہ تعالیٰ نے بھی تجویز کی۔ اللہ تعالیٰ بہتر تجویز کرنے والا ہے۔ اس نے آپ سے ہجرت کروا کر آپ کو مدینہ منورہ پہنچا دیا۔

○ آیت نمبر۳۱ ، ۳۲ میں مکہ معظمہ کے کافروں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ جب ان پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتیں تو کہتے کہ اگر چاہیں۔

تو ہم بھی ایسا کلام کہہ دیں' یہ محض پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ وہ وقت قابل ذکر ہے جب انہوں نے کہا کہ اے ہمارے اللہ اگر یہ قرآن سچا ہے اور ہم اس پر ایمان نہیں لائے تو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ یا ہم پر کوئی اور دَرد ناک عذاب لے آ۔ اس سے ثابت ہے کہ مکّہ کے کافر اللہ کے منکر نہیں تھے۔ وہ نظام ربوبیت کے منکر تھے۔

○ آیت نمبر۳۳ میں کافروں کے طلب عذاب کا جواب دیا گیا ہے کہ اے رسولؐ ! اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ جب تک آپ ان کے اندر موجود تھے' اللہ انہیں عذاب کرتا۔ اور نہ ہی اللہ ایسا ہے کہ اس حالت میں عذاب کرے کہ وہ ضابطہ الٰہی پر ایمان لا کر عملاً" بچاؤ طلب کر رہے ہوں۔ (جیسے کہ جب یونسؑ کی قوم ایمان لا کر مغفرت یعنی بچاؤ کی طلب گار ہوئی تو انہیں عذاب سے بچا لیا گیا)

○ آیت نمبر۳۴ تا ۳۶ میں مذکورہ مکی کافروں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان پر عذاب ضرور آئے گا۔ کیونکہ وہ وہی تو ہیں جو لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں۔ حالانکہ وہ مسجد حرام کے متولّی نہیں ہوسکتے۔ اس کے متولّی تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانون کی مخالفت سے بچنے والے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی ان مکّی کافروں کی حالت یہ ہے کہ کعبہ معظمہ میں ان کی صلواۃ تالیاں اور سیٹیاں بجانا ہے (انہیں کہا جائے گا کہ عذاب کا مزہ چکھو' اس کے بدلے جو تم انکار کرتے تھے۔ بیشک انکار کرنے والے' اللہ کی راہ سے روکنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں۔ مال تو وہ ضرور خرچ کریں گے۔مگر وہ ان کے لیے باعث حسرت ہوگا۔ کیونکہ وہ انجام کار مغلوب ہو جائیں گے اور ضرور شکست کے جہنم میں اکٹھے کئے جائیں گے۔

○ آیت نمبر۳۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ ایمان والو ! تمہیں اسی حالت میں چھوڑ دے۔ جس میں تم ہو یہاں تک کہ وہ تم میں سے ایک ایک خبیث (منافق) کو ایک ایک طیب (مومن) سے متمیّز نہ کر دے۔ اور سب منافقوں کو ایک دوسرے پر تہہ بہ تہہ ڈھیر نہ کر دے۔ (یعنی ان کے کشتوں کے پشتے نہ لگ جائیں) پھر قیامت کو بھی وہ منافقوں کو اخروی جہنم میں داخل کرے گا۔ یہی لوگ تو گھاٹا پانے والے ہیں۔

○ آیت نمبر۳۸ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ مکی کافروں کو مطلع کر دیجئے کہ اگر وہ آئندہ کے لیے حملہ کرنے سے باز آجائیں تو جو کچھ وہ کر چکے سو کر چکے۔ لیکن اگر دوبارہ حملہ کا اعادہ کیا تو پہلے لوگوں کا حال ان کے سامنے ہے۔ جو انجام سابقہ نافرمانوں کا ہوا تھا وہی ان کا ہوگا۔ وہ بھی مٹا دیئے گئے تھے۔ انہیں بھی مٹا دیا جائے گا۔

○ آیت نمبر۳۹ تا ۴۰ میں ایمان والوں کو حکم ہوا ہے کہ تم ان سے اس وقت تک جنگ جاری رکھنا کہ فتنہ باقی نہ رہے اور ہر طرف اللہ کا قانون جاری و ساری ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو دیکھنے والا ہے اور اگر وہ روگردانی کریں تو ایمان والو ! جان لو کہ بلاشبہ تمہارا کارساز اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی بہتر مددگار اور بہتر کارساز ہے انجام کار فتح تمہاری ہی ہوگی۔

○ اب چونکہ فتح کے ساتھ مال غنیمت کا حصول ایک لازم امر ہے اس لیے اگلی آیت مجیدہ میں مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق وضاحت کی گئی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

پس جانے رہو کہ بلاشبہ (فتح کے بعد میدان جنگ میں) جو زائد مال تم حاصل کرو پس بے شک اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ (یعنی اسلامی مرکز ملت بیت المال) کے لیے ہے۔ یعنی مجاہدوں کے قریبوں کے لیے ہے اور بے سہارا لوگوں کے لیے ہے اور ان کے لیے جن کے کاروبار ساکن ہو جائیں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس حکم پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن نازل کیا جس دن دو جماعتیں آپس میں ٹکرائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے صحیح صحیح قانون متعین کرنے والا ہے۔

مسئلہ خمس:۔ ○ **لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ** کے الفاظ میں غنیمت کے مال میں سے پانچواں حصہ اللہ اور رسول کیلئے مختص کیا گیا ہے اب جیسے کہ بلاغ القرآن کے صفحات میں بارہا وضاحت کر دی گئی ہے کہ اللہ و رسول کی درمیانی واؤ تفسیری ہے معطوف، معطوف علیہ مل کر اصطلاح بن گئی جس سے مراد نبی اکرمؐ کا قائم کردہ نظام ہے۔ یہاں حکم دیا گیا ہے کہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ اسلامی بیت المال کا حق نکال کر باقی ۴/۵ جنگی اور دفاعی ضرورتوں کے لیے محفوظ کر لیا جائے واضح رہے کہ اگر اللہ اور رسول کے الفاظ کو قرآنی اصطلاح کے مقام سے ہٹا کر انہیں مطوف علیہ اور معطوف قرار دیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ اس پانچویں حصے میں اللہ کا حصہ کتنا ہوگا اور اس کے رسول کا کتنا ہوگا؟ پھر رسول کا حصہ تو دیا جائے رسول مقبولؐ کو اللہ کا حصہ کسے دیا جائے گا؟ پس اللہ و رسول ایک قرآنی اصطلاح ہے جو قرآن کریم میں اسلامی مرکز ملت کے لیئے مستعمل ہے۔

○ خمس کا مسئلہ مسلمانوں کے ایک گروہ کا بنیادی مسئلہ ہے کہ مال غنیمت ہو یا کسی بھی طریقے سے اجتماعی یا انفرادی طور پر حاصل ہونے والا کوئی بھی مال ہو، اس میں سے ہر دور میں پانچواں حصہ بنی فاطمہؓ کو قیامت تک دیا جانا قرآنی فریضہ ہے، جس کا انکار کفر اور ترک گناہ عظیم ہے لیکن واضح رہے کہ **لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ** کے قرآنی الفاظ سے بنی فاطمہؓ کو دیا جانے والا خمس ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ عموماً" اس آیت کے مرکب اضافی ذی القربیٰ کو مذکورہ نظریہ کے ثبوت کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اول تو ذی القربیٰ سے جیسے کہ آگے تفصیلاً" آرہا ہے بنی فاطمہ ثابت نہیں ہوتا۔ اور اگر ایک سیکنڈ کے لیے ذی القربیٰ کا معنی بنی فاطمہ لے بھی لیا جائے تو ان کا حصہ خمس کا چھٹا یعنی کل کا تیسواں حصہ بنتا ہے۔ کیونکہ خمس میں اللہ اور رسول ذی القربیٰ، یتمیٰ، مساکین اور ابن السبیل چھ حصے دار موجود ہیں۔ پانچ حصہ داروں کا حق مار کر چھٹے حصہ دار کو دیدینا نہ قران دانی پر مبنی ہے نہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

مال غنیمت لوٹ کا مال نہیں:۔ ○ قرآنی تعلیم کے سوا مال غنیمت کو لوٹ کا مال قرار دیا جاتا ہے اور میدان جنگ سے جو کچھ کسی کے ہاتھ آجائے وہ اسی کا سمجھا جاتا ہے لیکن پھر اس پر بھی صحیح عملدر آمد نہیں ہوتا۔ میدان جنگ کا بڑا افسر

چھوٹے افسر سے اور چھوٹا افسر عام سپاہی سے اچھی چیز چھین لیتا ہے آیت زیر بحث میں پانچواں حصہ نکال کر باقی ۵/۴ مال غنیمت جو میدان جنگ سے حاصل ہوتا ہے وہ جنگی دفاعی ضروریات کی لیے مختص کر دیا گیا ہے' جسے **اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ** کے الفاظ کے ساتھ ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جو کوئی مال غنیمت میں غبن کرے وہ دائرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ جو مجاہد میدان جنگ میں کام آجائیں قتل ہو جائیں ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھیں مرے ہوئے گمان نہ کرو ۳/۱۶۹ جس طرح ان کی زندگی میں ان کے اہل و عیال کو وظیفہ دیا جاتا تھا' اسی طرح انھیں اس وقت وظیفہ دیا جانا ضروری ہے جب تک کہ مقتول مجاہد کے پسماندگاں بے کسی اور بے بسی کی حالت میں موجود ہوں پھر ساتھ ہی تقاضائے انصاف یہ ہے کہ جو مجاہد زخمی ہو جائیں انھیں اس کا الگ وظیفہ دیا جائے اور جن کے اعضاء بازو' ٹانگ آنکھ وغیرہ بے کار ہوگئے ہوں' انھیں تاحین حیات مخصوص وظیفہ (پنشن) دی جائے۔

○ مال غنیمت کے متعلق یہاں تک اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس کا پانچواں حصہ بیت المال کے لیے الگ کرکے باقی یعنی سارے مال کا ۵/۴ حصہ جنگی یعنی دفاعی ضروریات کے لیے محفوظ رکھا جائے گا۔ مگر یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مالِ غنیمت میں مجاہدوں کا کوئی حصہ نہیں ہے مگر ضرورت کے مطابق۔ اللہ کا رسول اپنی صوابدید کے مطابق ضرورت مند مجاہدوں کو جو کچھ دے اس سے زائد کی طلب منع ہے۔ **وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا** ۵۹/۷ اللہ کا رسول تمہیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے منع ہو جاؤ۔

جنگی اور دفاعی ضروریات کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ اس پر مشاہدات گواہ ہیں کہ اٹھارہ برس کا جمع کیا ہوا اسلحہ اٹھارہ دنوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ پھر فوج کو ہرآن جدید سے جدید اسلحہ کے ساتھ مسلح کرنا ضروری ہے پھر مزید فوج بھرتی کرنی ہوتی ہے اور قرآنی ربوبیت کے مطابق فوجیوں کے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے غنیمت کا وہ ۵/۴ حصہ جو جنگی ضروریات کے لیے ہے۔ اس میں سے فوجیوں پر حسبِ ضرورت خرچ کیا جاسکتا ہے لیکن غنیمت کو لوٹ کا مال قرار دینا کہ جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا اس کا ہوگیا' بالکل خلاف قرآن ہے۔ کیونکہ قرآن کریم ہر مقام پر نظم و ضبط کا سبق دیتا ہے' لوٹ کھسوٹ کا کہیں بھی حکم نہیں دیتا۔

○ **لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى** کے جملہ میں لذی القربیٰ سے ماقبل جو واؤ آئی ہے وہ واؤ تفسیری بمعنی "یعنی" ہے قرآن مجید میں واؤ بمعنی یعنی کے ثبوت کے لئے دیکھیے **تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ** ۱۵/۱ میں واؤ تفسیری ہے۔ آیت زیر بحث میں **وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ** میں یہ تینوں واؤیں جمع کی ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے ۵/۱ بیت المال میں جمع کیا جائے گا' جو ذی القربیٰ یتامیٰ' مساکین' اور ابن سبیل پر خرچ ہوگا۔

ذی القربیٰ: ذی القربیٰ سے روایتی تفاسیر میں مراد لیا گیا ہے نبی اکرمؐ کے قریبی صرف بنی فاطمہؓ حالانکہ تاریخ کے مطابق ابولہب وغیرہ کافر بھی آپؐ کے قریبی تھے اور اگر ذی القربیٰ سے مومن قریبی مراد لیے جائیں تو عباسؓ اور ان کی اولاد بھی نبی اکرمؐ کے قریبی تھے۔ پھر قرآنی شہادت ۳۳/۵۹ کے مطابق رسول اللہؐ کی کم از کم تین بیٹیاں تھیں۔ اس طرح وہ تینوں اور ان کی اولاد سب آپؐ کے قریبی تھے۔ اس لیے صرف فاطمہؓ اور آپؓ کی اولاد کو نبی اکرمؐ کے قریبی قرار دینا کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہوسکتا۔

○ اب آیئے ذی القربیٰ کی طرف جس کا معنی ہے قربت والے کس کی قربت والے؟ اس سوال کے جواب کیلئے غور فرمائیں کہ یہاں تک مسلسل ۴۱ آیتوں میں جنگ جہاد کا ذکر جاری ہے۔ حتیٰ کہ سورہ انفال زیر نظر **یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ** ۸/۱ کے الفاظ میں انفال بمعنی مال غنیمت ہی کے ذکر سے شروع ہوئی ہے۔ نیز جنگی کامیابی' مجاہدوں' سپاہیوں کی ہمت مردانہ کی مرہون منت ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگرچہ جنگ اور دفاع کے لیے اسلحہ نہایت ضروری چیز ہے۔ مگر وہ مجاہدوں کے بغیر بیکار محض ہے۔ اسلحہ خود بخود نہیں چلا کرتا۔ جنگ میں اولین اہمیت سپاہیوں مجاہدوں ہی کو حاصل ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ذی القربیٰ سے جاں نثار مجاہدوں کے قرابت والے مراد ہیں۔ یعنی جن خاندانوں کے جوان اور کمانے والے افراد جنگ میں داد شجاعت دے رہے ہوں۔ ان کے قرابتداروں' اہل خانہ کی ضروریات زندگی میں جہاں کمی واقع ہو جائے' خمس کے فنڈ سے اس کمی کو پورا کیا جاتا رہے گا۔ تاکہ مجاہدوں کے اذہان خانگی افکار سے ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے لیے مطمئن رہیں۔

الْیَتٰمٰی ○ اس سے آگے ترتیب الفاظ کے مطابق خمس کے مال میں یَتٰمٰی کا حصہ ہے' یتیم کا ایک معنی ہے بے ٹھکانہ ہوجانا جو **اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی** ۹۳/۶ سے ثابت ہے۔ یعنی جن لوگوں کے مکان' گھر ٹھکانے۔ جنگ کی زد میں آجائیں اور وہ بے ٹھکانہ ہو جائیں' خمس کے مال سے انہیں' ٹھکانہ بنا کر دیا جائے گا۔

المساکین ○ اس کے بعد ارشاد باری کے مطابق خمس میں مساکین کا حصہ ہے۔ یعنی ان لوگوں کا کہ جنگی حالات کی زد میں آکر جن کے چلتے کاروبار ساکن ہوگئے ہیں رک گئے ہوں۔ ان کے رکے ہوئے کاروبار کو خمس کے مال کے ساتھ متحرک کیا جائے گا۔

وَابْنِ السَّبِیْلِ ○ ۔ اور اس کے بعد خمس کے مال میں ابن السبیل' مسافروں کا حصہ ہے۔ جو لوگ جنگ کے خاتمہ پر مسافر کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ میں داخل ہوں۔ نیز ہر قسم کے حقدار مسافر۔ ان لوگوں کی ضروریات بھی خمس کے مال سے پوری کی جائیں گی۔ بالفاظ دیگر خمس' مال غنیمت کا وہ حصہ ہے جو بیت المال کی مذکورہ بالا مدّوں میں جمع ہوگا اور پھر حسب ضرورت ان مدوں پر خرچ ہوتا رہے گا۔ اس کے برعکس مال غنیمت کو لوٹ کا مال قرار دینے ہی سے غیر مسلم اقوام میں یہ تصور قائم ہو چکا ہے کہ مسلمان ابتداء اسلام ہی سے لٹیرے محض ہیں۔ العیاذ باللہ

○ **اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ** کا معنی بلاغ القرآن کے صفحات میں بار بار لکھا جا چکا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ فتح و شکست سمیت ہر چیز کے صحیح صحیح اندازے' پیمانے اور قوانین مقرر کرنے والا ہے۔ اس جملہ میں لفظ قدیر۔ مادہ ق۔د۔ر قدر سے صفت مشبہ ہے۔ پس چونکہ قدر کا معنی اندازہ' پیمانہ اور قانون ہے۔ اس لیے قدیر صفت مشبہ کا معنی اس کے سوا نہیں۔ صحیح صحیح اندازے پیمانے اور قوانین مقرر کرنے والا۔ یہاں آیت زیر نظر کے سیاق میں چونکہ جنگ بدر کی فتح کا ہے اور آیت زیر نظر میں فتح سے متعلقہ مال غنیمت کا تذکرہ ہے اس لیے جملہ مبارکہ **وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ** کا صحیح مقامی معنی یہ ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ (فتح و شکست سمیت) ہر چیز (مال غنیمت کے مصرف تک) کے صحیح اندازے' پیمانے اور قوانین مقرر کرنے والا ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں پھر جنگ بدر کی تفصیلات کا ایک حصہ ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جارہا ہے۔

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

(وہ وقت قابل ذکر ہے) جب تم (میدان جہاد کے) اُرلے کنارے پر تھے۔ اور وہ (تمہارے دشمن) پرلے کنارے پر تھے اور قافلہ تمہاری نچلی طرف تھا اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے (کہ غیر مسلح تجارتی قافلے کا مقابلہ کرنے والوں کی بھی مدد کرو گے) تو تم ضرور وعدہ خلافی کرتے کیونکہ تمہاری تعداد بہت کم تھی۔ دلیکن تمہیں مسلح حملہ آوروں کے بالمقابل اس لیے لایا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے ایک (فیصلہ کن) امر کا جو مقرر ہو چکا تھا۔ تاکہ جو ہلاک ہو' وہ اتمام حجت کے مطابق ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ اتمام حجت کے مطابق زندہ رہے اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

۱۔ **وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ** کے الفاظ میں اسی غیر مسلح تجارتی قافلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر اسی سورۃ کی آیت نمبر ۷/۸ میں **وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ** کے الفاظ میں گزر چکا ہے۔ "تم یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلح تجارتی قافلہ تمہارے لیے ہو۔" یعنی تم غیر ہتھیار بند قافلے کا مقابلہ کرو۔

○۲۔ **وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ** کے الفاظ میں اس امر کی خبر دی گئی ہے کہ ایک طرف تو مسلح لشکر تم پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس طرح اگر تم اپنے مجاہدوں کو تقسیم کرکے بیک وقت دونوں کا مقابلہ کرتے اور ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کرتے تو قلت تعداد کی بدولت تم یقیناً وعدہ خلافی کرتے۔ ایک دوسرے کی مدد کو نہ پہنچ سکتے۔

○۳۔ **وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا** کے الفاظ میں جنگ بدر کے فتح و شکست کے حتمی فیصلہ کی خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ صحابہؓ کو کثیر ہتھیار بند کافروں کے مقابلے پر لاکر میدان جہاد میں اتمام حجت کر دے چنانچہ

قومی زندگی اور موت کا قرآنی فیصلہ ○۴ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ کے

الفاظ میں اسی اتمام حجت کی وضاحت کی گئی ہے کہ باہم دونوں جماعتوں میں سے جو ہلاک ہو وہ مسلح تصادم میں شکست کھا کر ہلاک ہو جائے اور جو قوم زندہ رہے وہ مسلح تصادم میں فتح یاب ہوکر (فوجی قوت کے ساتھ) زندہ رہے۔ واضح رہے کہ قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے میدان جنگ کے مسلح تصادم ہی میں ہوتے ہیں جو قومیں میدان جہاد میں فوجی مہارت' عسکری برتری اور قوت بازو کے ساتھ دشمن پر فتحیاب ہوتی ہیں' قرآن کریم کی رو سے' باعزت و باوقار زندہ رہنے کا حق صرف انہی کو ہے۔

○ آیت مجیدہ کا آخری جملہ انتہائی معنی خیز ہے۔ **إِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ** بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا خوب خوب جاننے والا ہے اس جملے میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ جو قومیں فوجی تیاری کی بجائے لگی تو رہتی ہیں ذاتی عیش پسندیوں میں اور دشمن کو یونہی دھمکیاں دیتی رہتی ہیں کہ ہم دشمن کے دانت توڑ دیں گے۔ اسے ناک چنے چبا دیں گے' اللہ تعالیٰ ان کی ان خالی خولی گیدڑ بھبکیوں کو سننے والا ہے' اور فوجی تیاریوں کی بجائے' جن عیش کوشیوں میں وہ مصروف عمل ہوتی

ہیں' انہیں خوب خوب جاننے والا ہے۔ یعنی ایک مخصوص انداز کے ساتھ اس امر سے متنبہ کیا گیا ہے کہ نہ محض گیدڑ بھبکیوں سے دشمن مرعوب ہوتے ہیں۔ اور نہ فوجی تیاری' عسکری برتری اور ثبات قدمی کے بغیر فتح حاصل ہو سکتی ہے۔

○ پھر اس سہ گانہ عسکری تفوق کی بدولت مومنوں کو فتح و کامیابی پر اس درجہ یقین کامل ہوتا ہے کہ دشمن کی کثرت خواب و خیال تک میں نہیں آتی۔ چنانچہ میدان بدر میں بالمقابل آنے والے لشکر کفار کی کثرت نبی اکرمؐ کے خوابوں میں بھی کثرت کی بجائے قلت دکھائی دیتی تھی۔ آپؐ کے اس یقین کامل کے مطابق ارشاد ہوا ہے:۔

إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾

(اے رسولؐ!) وہ وقت قابل ذکر ہے جب اللہ نے ان کو آپ کی خواب میں تھوڑے دکھایا اور (بفرض محال) اگر آپ کو وہ (کافر) زیادہ دکھاتا تو (اے صحابہؓ) تم کم ہمتی کرتے اور کام میں جھگڑا کرتے۔ ولیکن اللہ نے (تمہارے یقین کامل کی بدولت دشمن کی کثرت کو قلت دکھا کر تمہیں) بچا لیا۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اسے جو ذہنوں میں ہے۔

○۱۔ واضح رہے کہ خواب صاحب خواب کے ذہنی تصورات ہی کا عکس ہوتا ہے۔ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کی فوجی تیاری اور ثبات قدمی کی بدولت ان کے ذہنوں میں عسکری برتری کا جو یقینی تصور موجود تھا۔ یہ اسی کی بدولت تھا کہ آپؐ اور صحابہؓ کو دشمنوں کی کثرت نہ صرف خواب میں قلت دکھائی دی۔ بلکہ جب دشمن کا لشکرِ کثیر میدان جنگ میں بالمقابل آیا تو ان کے ذہنی یقین کامل کی بدولت وہاں بھی وہ تھوڑے ہی دکھائی دیئے۔

وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤٤﴾

اور اے صحابہؓ! (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب تم دشمنوں کے بالمقابل ہوئے۔ اس وقت اس (اللہ) نے انہیں تمہاری آنکھوں میں تھوڑے کر دکھایا اور ان کی آنکھوں میں تمہیں تھوڑے کر دیا تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے' جس کا اس نے فیصلہ کیا ہے ۸/۴۴ اور سب کام اللہ کی طرف لوٹ کر آتے ہیں (یعنی اللہ کے قانون کے مطابق سرانجام ہوتے ہیں)

○ کافروں کا عظیم لشکر مومنوں کے اس قرآنی کلیہ کے مطابق تھوڑا دکھائی دیا کہ اگر بیس ثابت قدم مجاہد ہوں تو دو سو کافروں پر غالب آتے ہیں ۸/۶۵ اور صحابہؓ کا لشکر کافروں کی آنکھوں میں اس لیے تھوڑا دکھائی دیا کہ یہ فی الحقیقت تھوڑے تھے مگر الگ الگ دونوں صورتوں میں فائدے میں صحابہؓ ہی رہے۔ صحابہؓ نے کافروں کی کثرت کو قلت اس لیے دیکھا کہ ان کی تیاری اور ثابت قدمی مکمل تھی۔ جس کے سامنے بڑے بڑے غیر متحد لشکروں کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اس کی بدولت صحابہؓ نے جان توڑ کر پامردی دکھائی۔ اور کامیاب ہوئے۔ مگر کافروں نے جب دیکھا کہ لشکر اسلام کی تعداد بہت قلیل ہے تو انہیں حقیر جانا اور لاپروائی برتی جو ان کی شکست کا موجب ہوئی۔

○ **وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ** کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ سب کام اللہ تعالیٰ کے معیّنہ قوانین کے مطابق ہی سر انجام ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ جملہ متعدد بار آیا ہے۔ اور ہر مقام پر ایک مخصوص انداز بلاغت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے متعیّنہ قوانین کی محکمیت کو نمایاں کرتا ہے۔ ذیل کے چند ایک مقامات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔ سورہ بقرہ میں آیا:۔

○هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن يَأْتِيَهُمُ ٱللَّهُ فِى ظُلَلٍ مِّنَ ٱلْغَمَامِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ ٱلْأَمْرُ ۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ ۲/۲۱۰۔ نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر اس چیز کا کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کے سایوں اور ان کے ذہنی ملائکہ کے جلو میں ان کے پاس آئے اور ان کا کام تمام کر دے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سب کام اللہ ہی کی طرف پھرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے متعینہ قوانین کے مطابق ہی سرانجام ہوتے ہیں۔

دیکھئے ! یہاں وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ کے جملہ سے کھل کر عیاں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہی نہیں کہ وہ اپنے نازل کردہ ضابطے اور مبعوث کردہ رسولوں کے منکروں کا کام تمام کرنے کے لیے ان کے پاس آئے۔ حالانکہ اس کی شان یہ ہے کہ وہ ہر جگہ ہر وقت اور ہر کسی کے پاس موجود ہے مگر دکھائی نہیں دیتا۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ دنیوی بادشاہوں جیسی ہستی ہے جو اپنے باغیوں پر فوجوں کی یلغار اور امراء' وزراء کے جلو میں حملہ آور ہو کر ان کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ کہ وہ بھی بادلوں کے سایوں اور عوام کے ذہنی ملائکہ کے جلو میں منکروں کی طرف بڑھے اور ان کا کام تمام کر دے' بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ منکرین رسالت و نبوت کو پوری ڈھیل دیتا ہے اور پوری اتمام حجت کے بعد اپنے متعینہ قوانین کے مطابق یا تو اپنے جنود السموات والارض کے ذریعہ ان کا خاتمہ کر دیتا ہے اور یا اپنے نبی رسولؐ اور اس کے صحابہؓ کے ہاتھوں انہیں ایسی شکست فاش دیتا ہے کہ ان کی قوت طاقت کا آخری شمہ تک ختم ہو جاتا ہے۔

○ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ سورہ آل عمران میں بانداز ذیل آیا ہے۔ وَلِلَّهِ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ ۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ ۳/۱۰۹ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے۔ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے (پھر جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حقِ ملکیت میں تصرّف کر کے اللہ کی نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ انہیں اس جرم کی سزا فوراً نہیں ملتی۔ بلکہ اللہ کے قانون کے مطابق اس وقت ملتی ہے جب ان کا پیمانہ ظلم لبریز ہو جاتا ہے) کیونکہ ہر کام اللہ ہی کی طرف پھر کر جاتا ہے۔ یعنی ہر کام اللہ تعالیٰ کے متعینہ قوانین کے مطابق ہی سرانجام ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اگر سورہ آل عمران کی اس آیت مجیدہ ۳/۱۰۹ کا یہ مفہوم نہ لیا جائے جو کھل کر عیاں ہو رہا ہے تو اس آیت کے حصہ نمبر۱ کا حصہ نمبر۲ کے ساتھ کوئی تعلق ہی قائم نہیں ہوتا۔

○ نیز زیر بحث جملہ مبارکہ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ سورہ فاطر میں بانداز ذیل آیا ہے۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَٰلِقٍ غَيْرُ ٱللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ ۚ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ۝ وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ ۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ ۳۵/۳-۴۔ اے نوع انسانی تم اللہ کی عطا کردہ نعمت کو یاد کرو اور سوچو کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تمہیں زمین و آسمان سے روزی عطا کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی فرمانبرداری کے لائق نہیں۔ پھر تم کس طرف کو پھیرے جا رہے ہو۔ اور (اے رسولؐ) اگر آپ کو لوگوں نے جھٹلایا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ آپ سے پہلے سب رسولؐ جھٹلائے گئے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر کام اللہ ہی کی طرف لوٹ کر آتا ہے۔ یعنی ہر کام اللہ تعالیٰ کے معیّنہ قوانین کے مطابق ہی سرانجام ہوتا ہے۔ رسولوں کو جھٹلانے والوں کو ان کے جرم کی سزا اللہ تعالیٰ کے معیّنہ قوانین کے مطابق ہی ملتی ہے۔

○ اسی طرح جملہ مبارکہ زیر بحث سورہ حدید میں بھی انہی معنوں میں آیا ہے لَّهُۥ مُلْكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۚ

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۝يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ ط وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝ ۶-۵
/۵۷ آسمانوں اور زمین کی حکومت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور ہر کام اللہ ہی کی طرف لوٹ کر آتا ہے۔ یعنی ہر کام اللہ کے معینہ قوانین کے مطابق سرانجام ہوتا ہے جیسے کہ اپنے معینہ قوانین کے مطابق اللہ تعالیٰ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ لوگوں کے ذہنوں میں پوشیدہ ہے۝

دیکھئے! ان آیات مجیدہ ۵-۶/۵۷ میں وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ کا مفہوم يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ کے الفاظ میں نکھار کر رکھ دیا گیا ہے' جس پر مشاہدات عالم گواہ ہیں کہ رات میں دن اور دن میں رات اللہ تعالیٰ کے اس معینہ قانون کے مطابق داخل ہوتے چلے آرہے ہیں جو اس نے خود مقرر کر رکھا ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد بھی گھومتی ہے اور ایک مخصوص زاویہ میں سورج کی طرف جھکی ہوئی سورج کے گرد بھی گردش کر رہی ہے۔ اپنی محوری گردش چوبیس گھنٹوں میں ختم کرتی ہے۔ جس سے دن رات پیدا ہوتے ہیں اور سورج کے گرد اپنی گردش کو ایک سال میں ختم کرتی ہے۔ جس سے سردی گرمی خزاں اور بہار چار موسم پیدا ہوتے ہیں۔ زمین اپنے مخصوص جھکاؤ کی بدولت جب سورج کے قریب ہوتی ہے تو یہ گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ اس وقت رات' دن میں داخل ہونی شروع ہوجاتی ہے۔ اس موسم کی ایک مخصوص تاریخ کو دن چودہ گھنٹے کا اور رات دس گھنٹے کی ہوتی ہے۔ مگر جب زمین اسی جھکاؤ کی بدولت سورج سے دور ہٹ جاتی ہے تو یہ سردی کا موسم ہوتا ہے اس وقت دن' رات میں داخل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک مخصوص تاریخ کو دن دس گھنٹے کا رات چودہ گھنٹے کی ہو جاتی ہے۔ سردی کا مقدمہ موسم خزاں ہے' اور گرمی کا مقدمہ موسم بہار ہے۔ ان دونوں موسموں میں الگ الگ ایسی تاریخیں آتی ہیں۔ جب دن رات باہم برابر ہوجاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے معینہ قانون کے مطابق ہوتا ہے' جسے ۵-۶/۵۷ میں وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر کام اللہ کی طرف پھرتا ہے یعنی ہر کام اللہ ہی کے معینہ قوانین کے مطابق سرانجام ہوتا ہے۔

قوموں کے زوال کا ایک اہم سبب:۔ جو قومیں سہل انگاری اختیار کرکے ہر کام کو اس طرح اللہ تعالیٰ پر ڈال دیتے ہیں کہ خود تو کچھ نہ کریں اور امید لیے بیٹھے رہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پہلے دن سے لکھ رکھا ہے وہی کچھ ہوگا۔ چنانچہ زیر بحث جملہ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ کا یہ معنی لیتے ہیں کہ ہر کام اللہ کی طرف پھرتا ہے' یعنی جو اس نے لکھ رکھا ہے اسی انداز پر انجام ہوتا ہے۔ اس عقیدہ اور نظریہ کی بدولت قومیں بے کار محض ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مقام پر انتھک محنت کا حکم دیا ہے۔ اور ہر کام کے نشیب و فراز اور اس کے جملہ متعلقات پر نگاہ رکھتے ہوئے مناسب حال عمل کرنے پر زور دیا ہے۔ سابقہ آیتوں میں جنگ بدر کی فتح کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بتایا گیا ہے کہ صحابہؓ کی نگاہ میں دشمن کی کثرت کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ ان کے حوصلے اتنے بلند اور ان کی ہمتیں اس قدر جواں تھیں کہ انہیں کثیر دشمن تھوڑے دکھائی دیئے۔ مگر دوسری طرف کافروں کو صحابہؓ کی قلت حقیر معلوم ہوئی اور انہوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ انہیں مار مٹانا کوئی بڑا کام نہیں ہے نہ صرف یہ کہ مست گام ہوگئے بلکہ ان کے آپس میں بھی اختلاف و انتشار پیدا ہوگیا۔ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ واقعی میدان اس گروہ کے ہاتھ آتا ہے جو ثابت قدمی دکھائیں اور وقتی نصائح کو یاد رکھ کر ان پر عمل کریں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

اے وہ لوگو ! جو ایمان لائے ہو۔ جب تم کسی دشمن گروہ کے سامنے میدان جہاد میں بالمقابل آؤ' تو ثابت قدم رہنا۔ (جان جائے' مگر جہاں قدم جم جائیں اکھڑنے نہ پائیں) اور اللہ (کی اس ثبات قدمی کی نصیحت) کو یاد رکھنا تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (یعنی فتح تمہارے قدم چومے۔)

○ا۔ بڑے سے بڑے دشمن پر فتح پانے کے لیے ثابت قدمی اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ عظیم ہتھیار ہے' جس کے ساتھ اس نے کمزور ویت نام کو امریکہ جیسی عظیم عالمی قوت پر فتح یاب کر دیا ہے۔ اور ایسی عظیم ایٹمی طاقت کو بوریا بستر سمیٹ کر ذلت کے ساتھ نکل جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ نسخہ قرآن کریم کا بتایا ہوا ہے' جس کا تجربہ' نہ صرف ویت نام میں کامیاب ہوا ہے' بلکہ اقوام عالم کے لیے مشعل راہ بن گیا ہے۔

○ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا" کا معنی روایتی تراجم میں یہ لیا گیا ہے کہ اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرو' جو صحیح نہیں کیونکہ میدان جنگ میں جہاں فَاثْبُتُوا کا حکم دیا گیا ہے یعنی ثابت قدم ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنا۔ اس مقام کے لیے یہ تصور قائم کرنا انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ جب تم پر دشمن حملہ کرے تو تم تسبیح لے کر بیٹھ جایا کرو۔ اور اس کے دانوں پر اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کر لیا کرو۔ تسبیح اور تلوار کا کیا مقابلہ تلوار کا مقابلہ تلوار ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ تسبیح کے ساتھ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر تلوار کے مقابلے پر اللہ کا ذکر اللہ' اللہ' اللہ کام دے سکتا تو نبی اکرمؐ کو میدان بدر و اُحد میں صحابہؓ کی بیویوں اور بچوں کو یتیم کروانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پس یہاں آیت نمبر۸/۴۵ میں وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا" کا یہ معنی مطلقاً غلط ہے کہ جب دشمن کے مقابلہ پر آؤ تو ثابت قدم رہنا اور تسبیح کے دانوں پر اللہ کے نام کا ورد شروع کر دینا بلکہ فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا" لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ کا معنی یہ ہے کہ جب تم دشمن کے مقابلے پر آؤ تو ثابت قدم رہنا اور اس ثابت قدمی والی اللہ کی نصیحت کو بہت زیادہ یاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ یعنی شکست سے بچ جاؤ اور فتح تمہارے ہم رکاب ہو جائے۔ اس سے آگے ارشاد ہوا۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

اور اللہ کی اطاعت کرو بذریعہ اس کے رسول کے اور آپس میں جھگڑنا مت' ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (یعنی دشمن پر سے تمہارا رعب اٹھ جائے گا) اور ثابت قدم رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کیساتھ ہے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں اترانے اور فخر کرنے سے منع کیا گیا ہے:۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝

اور (ایمان والو) تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جو گھروں سے اتراتے ہوئے نکلے' لوگوں کو دکھانے کے لیے۔ اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گھیرنے والا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔

○ اترانا' فخر کرنا اور لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی بڑے سے بڑا نیک عمل بجا لانا بھی اللہ تعالیٰ کو ہرگز ہرگز پسند نہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا" ○ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا" ○ ۳۷-۳۸/۱۷ اور تو زمین میں اتراتا ہوا نہ چل۔ بے شک نہ تو (پاؤں کی ٹھوکر سے) زمین کو پھاڑ سکے گا۔ اور نہ (اکڑتے ہوئے) پہاڑوں کی بلندی تک پہنچے گا۔ ان میں سے ہر بات تیرے رب کے ہاں مکروہ ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں ایک جنگ کا واقعہ یاد دلایا گیا ہے' جس میں ایک سرکش کافر نے ایک دفعہ صحابہؓ کے دشمنوں کو اکسا کر اور یہ کہہ کر حملہ کروادیا کہ ان دنوں تمہاری تیاری اتنی زبردست ہے کہ مسلمان تم پر غالب نہیں آسکتے۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر جب میدان جنگ میں شکست ہونے لگی تو یہ کہہ کر بھاگ کھڑا ہوا کہ میں تم سے بیزار ہوں' میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں شکست ہوا ہی چاہتی ہے:۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۞ ۸/۴۸

(مفہوم) "اور وہ وقت قابل ذکر ہے' جب ایک سرکش کافر نے ان (کافروں) کے اعمال (فوجی تیاری) کو مزین کر دیا اور کہا کہ آج لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہیں آسکتا' جب کہ میں بھی تمہارا حامی ہوں۔ پھر جب دونوں فوجیں بالمقابل آئیں۔ تو ایڑیوں کے بل الٹا پھر گیا۔ اور کہا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں' جو کچھ میں دیکھتا ہوں' وہ تم نہیں دیکھتے۔ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب کی رو سے بہت سخت ہے۔"

نمبر۱ ○ یہاں موقعہ شناس ابن الوقت قسم کے سرکش کافر کو شیطان کہا گیا ہے۔ ایسے لوگ ہر موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب دیکھا کہ کافروں کی خاصی تیاری ہے تو حمایتی بن کر حملہ کروا دیا' تاکہ مال غنیمت حاصل کرے۔ مگر جب مومنوں کی یلغار کا نظارہ کیا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ اور قسم قسم کی بہانہ سازیاں شروع کر دیں۔

نمبر۲ ○ **اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ** کا متکلم مذکورہ سرکش کافر ہے۔ ان الفاظ سے ثابت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر نہیں تھا۔ مزید برآں آیت مجیدہ ۸/۳۲ کی تفسیر میں ثابت کیا جاچکا ہے کہ نبی اکرمؐ کے مدمقابل کافر اللہ تعالیٰ کے منکر نہیں تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس نظام ربوبیت کے منکر تھے۔ جو اللہ تعالیٰ اپنے تمام نبیوں سے قائم کرواتا چلا آیا تھا اور خود نبی اکرمؐ سے بھی وہی نظام ربوبیت عامہ قائم کروایا جارہا تھا۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں کے منافقانہ وسوسوں کی خبر دی گئی ہے:۔

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۞ ۸/۴۹

(مفہوم) "اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب منافقوں نے کہا' یعنی جن کے اذہان میں منافقت کی بیماری ہے' کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی اللہ کے قانون پر بھروسہ کرتا ہے تو (اللہ اسے غالب غلبہ عطا کرتا ہے) بلا شبہ اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔"

○ اگلی آیت مجیدہ میں جنگ بدر میں مجاہدوں کے قتال کا منظر انتہائی مخصوص انداز کے ساتھ کھینچا گیا ہے:۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۞ ۸/۵۰

(مفہوم) "اور کاش کہ (اے رسولؐ) آپ دیکھتے جب کافروں کو صحابہؓ مجاہدین اسلام موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ وہ سامنے آنے والوں کے منہ پر ضربیں لگاتے تھے اور بھاگنے والوں کی پیٹھوں پر مارتے تھے۔ (اور کہتے تھے کہ' جلنے کا) (یعنی شکست کا) عذاب چکھو۔"

○ ملائکہ کی بحث آیت مجیدہ ۸/۹ کی تفسیر القرآن بالقرآن میں پیچھے گزر چکی ہے۔ اور ثابت کیا جا چکا ہے کہ ملائکہ کا لفظ فوج کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بدری مجاہدوں کے لیے آیا ہے۔ جنہوں نے حملہ آور مشرکین مکہ کے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ سامنے سے آنے والوں کے مونہوں پر مارا اور بھاگتے کافروں کی پیٹھوں پر ضربیں لگائیں۔

○ **وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ** کا مقامی معنی اوپر لکھا گیا ہے کہ مجاہدین اسلام کافروں کو کہتے تھے کہ شکست کی جلن کا عذاب چکھو۔ واضح رہے کہ ان الفاظ سے اخروی عذاب مراد نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ **ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ** کہنے والے مجاہد' جونسا عذاب کافروں کو چکھا رہے تھے وہ شکست کا عذاب تھا۔ اس لیے وہی مراد ہوسکتا ہے چونکہ **ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ** کہتے ہوئے اخروی عذاب نہیں چکھا رہے تھے' اس لیے اس سے اخروی عذاب ہرگز مراد نہیں۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں مجاہدوں ہی کے کلام کا بقایا درج ہے:۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۵۱/۸

(مفہوم) (وہ مزید کہتے تھے کہ) یہ اسی عمل کی سزا ہے جو تمہارے اپنے ہاتھ آگے لائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو بندوں پر ظلم کرنے والا ہے ہی نہیں (لوگ اپنے آپ پر خود ظلم کرتے ہیں ۱۰/۴۵)

○ پیچھے ثابت کیا جاچکا ہے کہ جنگ بدر و اُحد وغیرہ تمام جنگوں میں کافروں کی حیثیت جارحانہ حملہ آور کی تھی اس لیے جب خود ان کے ہاتھوں نے جنگ کی آگ بھڑکائی تھی۔ اس لیے انہیں جو اس آگ میں جلنا پڑا تو یہ خود اپنے ہاتھوں کی کمائی تھی۔ یہ عذاب خود ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا تھا۔

○ اوپر ۸/۵۰ کے جملہ **وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ** کے الفاظ کو شکست کے عذاب کا حال لکھا گیا ہے۔ اسی چیز کا ٹھوس ثبوت اگلی آیت میں آرہا ہے:۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۵۲/۸

مفہوم) (ان کافروں کا حال ہے) مانند حال قوم فرعون کے' اور مانند حال ان لوگوں کے جو ان سے پہلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا۔ پھر اللہ نے انہیں بھی (ان کی مانند) ان کے گناہوں کے بدلے پکڑ لیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ تعاقب کی رو سے بہت ہی سخت ہے۔

○ **كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ** کے الفاظ سے ثابت ہے کہ مکی مشرکوں حملہ آوروں کا حال قوم فرعون اور اس سے پہلی قوموں جیسا تھا' انہیں بھی اللہ نے ان کے گناہوں کے بدلے پکڑ لیا اور انہیں بھی ان کے گناہوں کے بدلے شکست کا عذاب دیا۔ یہ دنیوی عذاب کا ذکر ہے' اخروی عذاب کا نہیں۔ جس طرح سابقہ اقوام کو دنیا میں عذاب کیا گیا تھا۔ اسی طرح مکی مشرکوں کو بھی دنیوی عذاب دیتے ہوئے بدری مجاہدوں نے کہا تھا۔ **ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ**۔ چکھو عذاب شکست کی جلن کا۔ اگلی آیت مجیدہ میں اس عذاب کی وجہ بتائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں بے جا تصرف:۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۵۳/۸

(مفہوم) (مذکورہ عذاب اس لیے ہوا کہ ان قوموں نے اللہ کی نعمت میں بے جا تصرف کیا)۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ اس نعمت کو بدلنے والا نہیں جو اس نے کسی قوم پر انعام فرمائی ہو۔ حتیٰ کہ وہ خود اسے نہ بدل ڈالیں اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ خوب خوب سننے والا اور خوب خوب جاننے والا ہے۔

○ آیت مجیدہ کا آخری جملہ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ انتہائی غور طلب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب خوب سننے والا اور خوب خوب جاننے والا ہے کہ اصحاب اقتدار جن کے قبضے میں ملک کی نعمتوں کے سرچشمے ہوتے ہیں وہ کہتے تو یہ ہیں کہ ہم غریب عوام کے خدمت گار ہیں' غریب عوام کی بھلائی اور فلاح و بہبود کے لیے ہر آن مصروف عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ان بلند دعووں کو خوب خوب سننے والا اور ان دعووں کے خلاف جو وہ عمل کرتے ہیں کہ غریب عوام جائیں بھاڑ میں۔ سب کچھ اپنے لیے اور اپنے اعزاواقارب کے لیے سمیٹے چلے جاتے ہیں اس کو وہ خوب خوب جاننے والا ہے اور اسی دو عملی کی سزا کے طور پر ان سے اپنی نعمت چھین لیتا ہے یعنی وہ انہیں ان کے اپنے اعمال کی سزا دیتا ہے ظلم نہیں کرتا۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں تکراری تاکیدی کے طور پر دوبارہ واضح کیا گیا ہے کہ مشرکینِ مکہ کا حال قوم فرعون اور دوسری سابقہ سرکش قوموں جیسا ہوا' جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا' اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے جرائم کے بدلے ہلاک کر دیا۔

كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوۡا ظٰلِمِيۡنَ ۸/۵۴

(مفہوم) (ان کافروں کا حال ہے) مانند حال قوم فرعون کے اور مانند حال ان لوگوں کے جو ان سے پہلے تھے۔ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ پھر ہم نے انہیں ان کے گناہوں کے بدلے ہلاک کر دیا۔ خصوصاً آل فرعون کو ہم نے غرق کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب ظالم تھے۔

○ ظالم کا معنی ہے بے ٹھکانہ کام کرنے والا۔ پیچھے آیات نمبر۳۲' ۴۷/۸ میں ثابت کیا جاچکا ہے کہ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کے مخالفین اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہیں تھے۔ بلکہ وہ رسول اللہؐ کے ہاتھوں قائم کردہ نظام ربوبیت کے منکر تھے۔ اس آیت مجیدہ میں وَكُلٌّ كَانُوۡا ظٰلِمِيۡنَ کے الفاظ میں سب کو ظالم بتایا گیا ہے کہ وہ سب بے ٹھکانہ کام کرنے والے یعنی متوازن نظامِ ربوبیت کی بجائے غیر متوازن نظام قائم کرکے نوع انسانی کے ایک حصے کو اس کے حقوقِ ربوبیت سے محروم کیے ہوئے تھے۔ اس آیت مجیدہ میں تکرار کے ساتھ آل فرعون کا ذکر بالخصوص لایا گیا ہے۔ اور فرعون کے ظالمانہ نظام کی خبر سورہ قصص میں بالفاظ ذیل دی گئی ہے:۔

○ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ ۲۸/۴

○ بیشک فرعون نے اپنی سلطنت کی زمین میں سرکشی اختیار کی۔ یعنی اس نے عوام کے طبقے مقرر کر رکھے تھے۔ ان میں سے ایک طبقے کو اس نے کمزور کر دیا تھا۔ (یعنی اس کے حقوقِ ربوبیت غصب کر رکھے تھے) اسی چیز کو آیت زیر نظر ۸/۵۴ میں ظلم کہا گیا ہے' بے ٹھکانہ کام یعنی حقداروں کے حقوقِ ربوبیت غصب کر لینا ظلم ہے۔ كُلٌّ كَانُوۡا ظٰلِمِيۡنَ ○

○ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو ضابطہ باری تعالیٰ کا انکار کرتے اور اس پر ایمان

نہیں لاتے:۔

○ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝۵۵ ۸/۵۵

(مفہوم) بے شک اللہ کے نزدیک بدترین جاندار وہ ہیں جو انکار کرتے ہیں۔ پھر وہ کتاب اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔

صلح کے معاہدات ○ اگلی آیت مجیدہ میں انمونیہ زمانہء رسالت کے بدترین لوگوں' ان کافروں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے نبی اکرمؐ کے ساتھ بارہا صلح کا معاہدہ کیا مگر اپنے عہد سے ہر بار پھر گئے۔

○ اَلَّذِیۡنَ عٰہَدۡتَّ مِنۡہُمۡ ثُمَّ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَہُمۡ فِیۡ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّ ہُمۡ لَا یَتَّقُوۡنَ ۝۵۶ ۸/۵۶

(اے رسولؐ) ان میں سے وہ لوگ (خصوصاً قابل ذکر ہیں) جنہوں نے آپ سے بارہا صلح کا معاہدہ کیا پھر اپنے کئے ہوئے وعدے کو ہر بار توڑ دیا ان کی حالت یہ ہے کہ وہ عہد شکنی کے برے انجام سے ڈرتے نہیں۔

فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّہُمۡ فِی الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِہِمۡ مَّنۡ خَلۡفَہُمۡ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ۝۵۷ ۸/۵۷

پھر (اے رسولؐ) جب آپ انہیں میدان جنگ میں (اپنے بالمقابل پائیں تو) ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی جو ان کے پیچھے ہیں ایسی شکست دے کر منتشر کر دیجئے کہ وہ یاد ہی کرتے رہیں۔

دشمن کو منتشر کردو ○ فشرد کا سہ حرفی مادہ ش۔ ر۔ د شرد ہے جس کا بنیادی معنی ہے بھاگنا' دوڑنا' منتشر ہونا ہے۔ میدان جنگ میں دشمن تبھی منتشر ہو سکتا ہے' جب اسے ایسی شکست فاش دی جائے کہ اس کے فوجی وسائل کا ربط ختم ہو جائے۔ فوج' اسلحہ اور خوراک تینوں چیزیں ایک دوسری سے منتشر ہو کر رہ جائیں۔ موجودہ دور کی جنگوں میں اس کی عملی صورت یہ ہے کہ وہ راستے کاٹ دیئے جائیں جن سے محاذ جنگ پر دشمن کی کمک' اسلحہ اور خوراک پہنچتی ہو۔ اگر ادھر محاذ جنگ میں دشمن پر فوجی دباؤ ہر لحظہ بڑھتا چلا جا رہا ہو' اور ادھر تازہ دم فوج' اسلحہ اور خوراک نہ پہنچنے پائے' تو دشمن کی طاقت جلد سے جلد منتشر ہو جاتی ہے۔ اس ایک ہی حکم فشرد کے الفاظ میں دشمن کی طاقت کو منتشر کرنے کی وہ تمام صورتیں موجود ہیں جن کی بدولت دشمن کم سے کم عرصہ میں شکست فاش تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دشمن کے اتحادیوں کو بھی منتشر کردو ○ **فَشَرِّدۡ بِہِمۡ** کے ساتھ **مَّنۡ خَلۡفَہُمۡ** کے الفاظ آئے ہیں ان کا معنی یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ ساتھ ان طاقتوں کو بھی ان سے جدا کر دو' جو ان کی پیٹھ ٹھونکنے والے ہیں۔ یعنی دشمن پر اتنا زیادہ فوجی دباؤ ڈالا جائے کہ اس کی پیٹھ ٹھونکنے والے خود اپنی خیر منانے کے لیے آپ کے دشمن کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ نیز **مَنۡ خَلۡفَہُمۡ** سے مراد محاذ جنگ پر لڑنے والے دشمن کے پیچھے والے قریبی فوجی ڈپوؤں پر متعین افراد بھی ہیں جو محاذ پر فوری مدد پہنچا رہے ہوتے ہیں اور وہ دور کے فوجی ڈپوؤں والے بھی ہیں۔ جو فوجی مدد قریب کے فوجی ڈپوؤں میں پہنچا رہے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر **مَنۡ خَلۡفَہُمۡ** میں وہ تمام لوگ بھی موجود ہیں جو اس محاذ پر لڑنے والے فوجیوں کی تازہ دم فوج' اسلحہ اور خوراک کے ساتھ پیچھے سے مدد کرنے والے ہیں اور وہ لوگ بھی اس میں شامل ہیں جو دشمن کے اتحادی ملکوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہیں۔ الختصر آیت بالا میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک دشمن کو ملنے والی داخلی اور خارجی مدد کے ذریعے ختم نہ کئے جائیں اس وقت تک دشمن کو ایسی شکست نہیں دی جا سکتی جسے وہ عمر بھر یاد رکھیں **لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ** ○

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں سے صلح کا معاہدہ کیا جائے ان کے حالات پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ اور جب ان سے عہد شکنی کا خوف پیدا ہو تو ان کا عہد انہیں واپس کر دیجئے گا۔

○ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿۵۸﴾ ۸/۵۸

(مفہوم) اور جب آپ کو کسی قوم سے (جس سے صلح کا عہد ہو) خیانت کا خوف ہو تو ان کا عہد انہیں واپس کر کے برابر ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

○ اس آیت مجیدہ میں رسول اللہؐ کو کافروں کی عہد شکنی کے جواب میں عہد شکنی کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عہد شکنوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی عہد شکنی کے جواب میں تم عہد شکنی، عہدی خیانت ہرگز نہ کرنا۔ بلکہ عہد شکن قوم کو ان کا عہد واپس کر کے مساوی طور پر سے عہدی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جانا۔ اور اس عہدی آزادی کے بعد جو بھی مخالفانہ قدم اٹھایا جائیگا۔ وہ خیانت نہیں ہوگی، بلکہ دشمنوں کی بدعہدی کا جواب ہوگا۔

عہد شکن کافر یہ خیال نہ کریں کہ وہ عہد شکنی کر کے مومنوں کو عاجز کر دیں گے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں کافروں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس خام خیال میں مبتلا نہ رہیں کہ اس طرح عہد شکنی کر کے مومنوں پر غالب آجائیں گے، ہرگز ہرگز غالب نہیں آسکتے۔

○ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿۵۹﴾ ۸/۵۹

(مفہوم) اور وہ لوگ جنہوں نے ضابطہ ربوبیت کا انکار کیا ہے، وہ یہ گمان نہ کریں کہ وہ (اپنی غلط کاریوں کے ساتھ مومنوں سے) آگے بڑھ جائیں گے۔ بلا شبہ، وہ مومنوں کو عاجز نہیں کریں گے۔ (ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکیں گے)

ایمان والو! تم ہر آن جنگی تیاریوں میں لگے رہو ○ اگلی آیت مجیدہ میں اس غلط عقیدے کا بطلان کر دیا گیا ہے کہ مومنوں پر کافر صرف اس لیے غالب نہیں آسکتے کہ وہ کافر ہیں، اور یہ مومن ہیں بلکہ ناقابل تسخیر قوم بننے کے لیے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ فوجی قوت مہیا کی جائے۔ اور یہ چیز صرف اس طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ اسلحہ تیار کیا جائے۔ قیمتی زر مبادلہ دے کر خریدنے والی قومیں ناقابل تسخیر نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ ارشاد باری ہے کہ اسلحہ خود تیار کیا کرو اور دن رات تیار کرتے رہو۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿۶۰﴾ ۸/۶۰

(مفہوم) اور (ایمان والو!) ہمیشہ تیار کرتے رہو۔ ان دشمنوں کے مقابلے کے لیے طاقت بھر زیادہ سے زیادہ (فوجی) قوت۔ خصوصاً گھوڑوں کی بہتات (ذرائع رسل و رسائل زیادہ سے زیادہ تیار کرتے رہو۔ اسطرح) تم اس (بے پناہ فوجی قوت) کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے رہو۔ اور ان کے سوا دوسرے دشمنوں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے۔ اللہ انہیں جانتا ہے۔ اور (فوجی تیاری کے لیے) جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، وہ تمہیں پورا پورا واپس کر دیا جائے گا۔ اور تم ظلم نہیں کئے جاؤ گے۔

اسلحہ فیکٹریاں ○ **وَاَعِدُّوْا** فعل امر میں دوام موجود ہے۔ یعنی حکم دیا گیا ہے کہ اپنی طاقت بھر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت، اسلحہ اور ذرائع رسل و رسائل ہمیشہ تیار کرتے رہو' یعنی فوجی قوت (اسلحہ) کی تیاری کے لیے تمہارے ملک کے چپے چپے میں اسلحہ فیکٹریاں موجود ہونی چاہئیں' جو دن رات اسلحہ تیار کرتی رہیں۔ یعنی ان میں چوبیس گھنٹوں میں مسلسل تین تین شفٹیں چلتی رہنی چاہئیں۔

فاضلہ مال کا ہر ٹیڈی پیسہ اسلحہ کی تیاری پر خرچ ہونا چاہیے۔ ○ **مَااسْتَطَعْتُمْ** کے الفاظ میں حکم دیا گیا ہے کہ ایمان والو! تم میں جتنی مالی استطاعت موجود ہو' سب کی سب فوجی قوت تیار کرنے پر خرچ ہونی چاہیے۔ بالفاظ دیگر فاضلہ مال کو سامان تعیش کی تیاری یا در آمد پر خرچ کرنے سے بھی روک دیا گیا ہے اور انفرادی جائیدادیں بنانے سے بھی بالفاظ دیگر پوری قوم کے فاضلہ مال کا ہر ٹیڈی پیسہ فوجی قوت کی تیاری پر خرچ ہونا چاہیے۔

محکمہ جاسوسی ○ **مِنْ قُوَّةٍ** سے یہاں سیاق و سباق کے مطابق فوجی قوت' نیز ہر وہ قوت مراد ہے جو دشمن کے مقابلے پر کام آئے۔ اس میں جاسوسی کا محکمہ بھی موجود ہے جس کے ذریعے دشمن کے حالات سے ہر آن پتہ چلتا رہتا ہے کہ وہ کس قسم کی تیاری کر رہا ہے اور کیا کیا منصوبے بنا رہا ہے۔ پیچھے آیت نمبر ۸/۵۸ میں جو آیا ہے:۔ **وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ**۔ اور اگر تمہیں کسی قوم سے یہ خطرہ لاحق ہو کہ وہ عہد شکنی پر اتر آئے ہیں تو ان کا عہد انہیں واپس لوٹا کر برابر ہو جانا۔" ان الفاظ سے بھی عیاں ہے کہ جن قوموں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا گیا ہو ان کی ہر حرکت پر نگاہ رکھی جائے گی۔ اور جب بھی یہ خطرہ پیدا ہو کہ مد مقابل عہد شکنی کے منصوبے بنا رہا ہے' تو فوراً" اس کا معاہدہ اسے واپس لوٹا کر باہم برابر ہو جانا ہو گا مگر ظاہر ہے کہ فریق مقابل کی مخفی حرکات و سکنات سے اس وقت تک آگاہی نہیں ہو سکتی' جب تک جاسوسی کا محکمہ قائم نہ کیا جائے اور اس کے کارندے ہر لحظہ خبریں نہ پہنچا رہے ہوں۔

آواز سے تیز رفتار طیارے ○ **رِبَاطِ الْخَيْلِ** کا لفظی معنی ہے گھوڑوں کی قطاریں۔ ذرائع رسل و رسائل میں چونکہ دور رسالت میں گھوڑا ایک تیز رفتار ذریعہ تھا۔ اس لیے **الْخَيْلِ** کے الف لام سے قیامت تک کی وہ سواری اور رسل و رسائل کا ہر وہ ذریعہ مراد ہے جو مستقبل میں ایجاد ہوتا رہے گا اس لئے موجودہ دور کے مطابق رباط الخیل سے مراد تیز رفتار فوجی بسوں' جیپوں کے علاوہ آواز سے تیز رفتار طیارے اور ان سے تیز رفتار راکٹ بھی ہیں۔ قیامت تک کی ایجاد ہونے والی سواریوں کی خبر سورہ نحل میں دی گئی ہے۔

○ **وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** ○ ۱۶/۸ اور اللہ نے گھوڑے' خچر اور گدھے پیدا کیے ہیں تاکہ تم ان پر سواری کرو اور وہ تمہارے لیے باعث زینت بھی ہیں۔ اور اللہ (قیامت تک ایسی سواریاں) پیدا کرتا رہے گا' جنہیں تم جانتے ہی نہیں۔ دیکھیے! **مَالَا تَعْلَمُوْنَ** کے الفاظ میں' آئندہ ایجاد ہونے والی ہر سواری کی خبر دی گئی ہے' جنہیں ہر دور کے افراد مستقبل میں ایجاد ہونے والی سواریوں کے طور پر نہیں جانتے۔

چھپے دشمن ○ **لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ج اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ** کے الفاظ میں عالمی سیاست کے ایک مخصوص عظیم راز کا انکشاف کیا گیا ہے کہ ایمان والو! ہوشیار ہو جاؤ کہ تمہارے دشمن صرف وہی نہیں جو کھل کر سامنے آچکے ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ تمہارے

بہت سے چھپے دشمن بھی ہیں جو دوستی کے پردے میں دشمنی کر کے تمہیں گہرا زخم پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ تمہارے دشمنوں کے ساتھ در پردہ ملے ہوئے ہیں۔ ان چھپے اور ظاہر تمام دشمنوں کا ایک ہی حل بتایا گیا ہے کہ ہر آن اتنی زیادہ فوجی قوت تیار کرتے رہنا کہ ایمان والوں کے ظاہر اور چھپے ہر قسم کے دشمن، مسلمانوں کی بے پناہ فوجی طاقت سے گھر بیٹھے کانپتے رہیں۔

سرکاری قرضے ○ **وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ** کے الفاظ میں اس امر کے التزام کی خبر دی گئی ہے کہ اسلامی حکومت فوجی تیاری اسلحہ تیار کرنے کے لیے عوام سے قرضہ لے سکتی ہے۔ جو مقررہ میعاد کے بعد پورا پورا بلا سود واپس کر دیا جائے گا۔ عوام پر لازم ہے کہ وہ اسلحہ کی زیادہ سے زیادہ تیاری میں حکومت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کریں۔

فی سبیل اللہ کا ایک معنیٰ فوجی ضرورتوں کے لیے قرضہ دینا بھی ہے ○ قرآن مجید میں فی سبیل اللہ کے بہت سے معنی آئے ہیں۔ جن میں غرباء کی مالی مدد کرنا بھی شامل ہے۔ اور ظالم حکومت کے پنجے سے کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کو آزاد کرانا بھی ہے ۴/۷۵ مگر اس آیت مجیدہ میں فوجی قوت (اسلحہ اور ذرائع رسل و رسائل) کی تیاری میں اسلامی حکومت کو ہنگامی قرضے دینا بھی انفاق فی سبیل اللہ قرار دیا گیا ہے۔ جو **يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ** کے مطابق عوام کو پورا پورا واپس کیا جانا لازم ہے۔

قرضہ واپس نہ کرنا ظلم ہے ○ **وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ** کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ قرضہ اگر حکومت بھی لے اور خواہ اسے خرچ بھی کرے اسلحہ بنانے جیسی اہم اور ضروری مد پر، مگر اس کا پورا پورا واپس کرنا حکومت پر بھی لازم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عوام میں جو لوگ اسلحہ کی تیاری کے لیے قرضہ نہیں بلکہ فی سبیل اللہ صدقہ دیں، جو واپس لیا ہی نہیں جاتا۔ تو اس کے واپس نہ کرنے میں کوئی ظلم نہیں مگر حکومت، جو رقم صدقہ کی بجائے قرضہ کی صورت میں عوام سے حاصل کرے اس کا واپس کرنا، ہر حالت میں ضروری ہے۔ اور اس کا واپس نہ کرنا قرآن کی میزان میں ظلم ہے، خواہ وہ فوجی قوت کی تیاری پر خرچ کیا گیا ہو۔

نگاہ بازگشت ○ آیت نمبر ۴۱ میں مال غنیمت کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کیا جائے گا جو مجاہدوں کے قریبیوں بے ٹھکانہ لوگوں، جن کے کاروبار ساکن ہو جائیں اور مسافروں پر خرچ کیا جائے گا اور باقی ۴/۵ جنگی اور دفاعی ضروریات کے لیے محفوظ رکھا جائے جس کے ساتھ دفاعی انتظامات ہر آن مکمل رکھے جائیں گے۔

○ آیت نمبر ۴۲ میں جنگ بدر کا وہ وقت یاد دلایا گیا ہے جب صحابہؓ میدان کے ارلے کنارے پر تھے اور دشمن پرلے کنارے پر تھا۔ اور تجارتی قافلہ نچلی طرف تھا۔ صحابہؓ چاہتے تھے کہ غیر مسلح تجارتی قافلے سے ٹکرا جائیں مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں مسلح حملہ آوروں کے مقابلے کا حکم دیا تاکہ معاملہ صاف ہو جائے جن لوگوں نے زندہ رہنا ہے وہ مسلح تصادم میں فتح یاب ہو کر زندہ رہیں، اور جن لوگوں نے ہلاک ہونا ہے وہ مسلح تصادم میں شکست فاش کے ذریعہ ہلاک ہو جائیں کیونکہ قومی زندگی اور موت کا فیصلہ میدان جنگ میں ہوا کرتا ہے۔

○ آیات نمبر ۴۳، ۴۴ میں بتایا گیا ہے کہ جنگِ بدر کے موقعہ پر صحابہؓ کی استقامت و ثابت قدمی کی بدولت دشمنوں کی

کثیر تعداد رسول مقبول سلام علیہ کو خواب میں بھی قلیل دکھائی دی تھی۔ اور صحابہؓ کو سرِ میدان بھی دشمن کی کثرت قلت نظر آئی تھی۔ ارشاد باری ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو صحابہؓ میں کم ہمتی پیدا ہو جاتی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ صحابہؓ کے عزم و استقلال کو جانتا تھا۔ اس لئے اس نے دشمن کی کثرت کو قلت کر دکھایا۔ بے شک ہر کام اللہ تعالیٰ کے متعینہ قوانین کے مطابق ہی سر انجام ہوتا ہے۔

○ آیت نمبر ۴۵، ۴۶ میں ایمان والوں کو خصوصی حکم دیا گیا ہے کہ جب میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے پر آؤ تو ثابت قدم رہا کرو۔ اور جنگ نصائح کو اچھی طرح یاد رکھا کرو، تاکہ تم ان پر بروقت اور صحیح صحیح عمل کرکے کامیاب ہوتے رہو۔ مرکزی احکام کی اطاعت کرتے رہنا اور آپس میں نہ جھگڑنا، ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ پس تم ثابت قدم رہنا۔ اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

○ آیت نمبر ۴۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا، جو فخر و تکبر کے ساتھ گھروں سے نکلتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی راہ (ربوبیت عامہ) سے روکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عملوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

○ آیت نمبر ۴۸ میں صحابہؓ کو ایک سرکش کافر کا واقعہ یاد دلایا گیا ہے جس نے کافروں کو اکسا کر اور اپنی حمایت کا یقین دلا کر مسلمانوں پر حملہ کروادیا۔ لیکن جب شکست ہوتی دیکھی تو یہ کہتے ہوئے میدان سے بھاگ کھڑا ہوا کہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے۔ اس کی غرض صرف مال غنیمت حاصل کرنا تھا۔ لیکن جب شکست کا یقین ہو گیا اور مال غنیمت ملنے کی توقع نہ رہی تو بھاگ گیا۔

○ آیت نمبر ۴۹ میں منافقوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ وہ تھے جو یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکہ دے دیا ہے۔ مگر اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ جو لوگ عملی طور پر اللہ تعالیٰ کے قانون پر بھروسہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں فتح اور غلبہ عطا فرماتا ہے اور جو لوگ اللہ کے قانون سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ وہ شکست کھا جاتے ہیں۔

○ آیت نمبر ۵۰، ۵۱ میں جنگ بدر کا نقشہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے اس طرح کھینچا گیا ہے کہ کاش ! آپ مجاہدوں کو دیکھتے جب وہ حملہ آوروں کے موہنوں پر مار رہے تھے۔ اور جو ان میں سے بھاگے جا رہے تھے۔ ان کی پیٹھوں پر ضربیں لگا رہے تھے اور انہیں کہہ رہے تھے کہ شکست کی جلن کے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ عذاب تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ کیونکہ جارح بن کر تم نے خود حملہ کیا ہے۔

○ آیت نمبر ۵۲، ۵۳ میں بتایا گیا ہے کہ کی حملہ آور مشرکوں کا حال فرعون اور سابقہ قوموں جیسا ہوا تھا کہ فرعون نے بھی موسیٰؑ کا تعاقب کرکے خود حملہ کیا تھا۔ اور وہ ختم ہو گیا۔ یہ بھی حملہ آور ہوئے ہیں۔ یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اللہ کا مستقل قانون ہے کہ وہ کسی قوم سے اس وقت تک نعمت نہیں چھینتا جب تک کوئی قوم خود اللہ کی نعمتوں میں بیجا تصرف کرکے خود کفران نعمت کی مرتکب نہیں ہوتی۔

○ آیت ۵۴ میں بتایا گیا ہے کہ زمانہ رسالت کے مشرکین مکہ کا حال قوم فرعون اور دوسری سرکش قوموں جیسا تھا۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون کو ان کے جرائم کے بدلے غرق کر دیا اور باقی سرکش قوموں کو ان کی سرکشیوں کے بدلے ہلاک کر دیا۔ وہ سب ظالم تھے۔

○ آیت نمبر۵۵۔ میں بتایا گیا ہے کہ نوع انسانی میں بدترین لوگ وہ ہیں جو ضابطہ باری تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے' بلکہ ایمان لانے کی بجائے انکار کر دیتے ہیں۔

○ آیت نمبر۵۶ میں بتایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے کہ جب نبی اکرمؑ نے مدینہ منورہ میں قرآنی نظام قائم کیا تو ان کافروں نے آپؐ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا اور اسے توڑ دیا۔ پھر معاہدہ کیا اور توڑ دیا حتیٰ کہ بار بار صلح کا معاہدہ کرتے اور توڑتے رہے۔ وہ لوگ عہد شکنی کے برے انجام سے ڈرتے نہیں تھے کہ بالآخر عہد شکن ظالم اپنے کیفر کردار کو پہنچ کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

○ آیت نمبر۵۷ میں نبی اکرمؑ کو حکم ہوا ہے کہ ایسے بد عہد ظالموں کو مزید مہلت نہ دی جائے۔ بلکہ ان سے اعلان جنگ کر دیا جائے اور جب (اے رسولؐ) آپ میدان جنگ میں ان کے بالمقابل آئیں تو ان کی طاقت کا آخری شمہ تک ختم کرکے انہیں منتشر کر دیں بلکہ ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی جو ان کے پیچھے ہیں۔ اور ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں اور انہیں کمک پہنچاتے ہیں۔ انہیں بھی ایسی شکست دے کر منتشر کر دیں کہ وہ لوگ عمر بھر یاد کرتے رہیں۔

○ آیت نمبر۵۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ جس قوم کے ساتھ تمہارا صلح کا معاہدہ ہو' اگر تمہیں ان سے عہد شکنی یعنی خیانت کا خوف ہو تو ان کا عہد انہیں واپس کرکے برابر ہو جاؤ۔ تم خیانت کے جواب میں خیانت نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔

○ آیت نمبر۵۹ میں متنبہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ ضابطۂ الٰہی کا انکار کرنے والے ہیں وہ یہ نہ گمان کریں کہ وہ مومنوں کے ساتھ کئے گئے عہد میں خیانت کرکے انہیں عاجز کر دیں گے۔ بلاشبہ وہ عاجز نہیں کر سکیں گے (کیونکہ مومن نہ ان کی خفیہ سازشوں سے بے خبر ہیں اور نہ کمزور کہ کافر انہیں شکست دے سکیں)

○ آیت نمبر۶۰ میں خصوصیت کے کیساتھ حکم دیا گیا ہے کہ دشمنوں کے مقابلے کے لیے ہر آن فوجی قوت اور ذرائع رسل و رسائل کا سامان بدستور تیار کرتے رہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اس بے پناہ فوجی قوت اور ذرائع رسل و رسائل کے ساتھ گھر بیٹھے دہلاتے رہو گے۔ نیز اسی آیت مجیدہ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ تمہارے دشمن صرف وہی نہیں' جو کھل کر سامنے آچکے ہیں۔ بلکہ وہ بھی ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔ اللہ انہیں جانتا ہے یعنی جو قوم در پردہ ان کی مدد کرتی اور ان کی پیٹھ ٹھونکتی ہے وہ بھی تمہاری اور اللہ کی دشمن ہے۔ نیز فرمایا کہ فوجی قوت کی تیاری میں جو قرضہ تم مرکز ملت کو دو گے وہ تمہیں پورے کا پورا واپس کر دیا جائے گا یعنی واپس نہ کرکے تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا اس سے ظاہر ہوا کہ مرکز ملت فوجی تیاری کے لیے عوام سے قرضے بھی لے سکتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ فوجی قوت کے لحاظ سے اس مقام پر پہنچ جائے کہ اس کے ظاہر اور چھپے سب دشمن اس کی فوجی تیاری سے گھر بیٹھے دہلتے اور لرزہ بر اندام رہیں۔

جنگ میں خواہ مخواہ نہ الجھنا ○ واضح رہے کہ آیت نمبر۶۰/۸ میں زیادہ سے زیادہ مکمل فوجی تیاری کا حکم دینے کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں متنبہ کیا گیا ہے کہ مکمل فوجی تیاری کے زعم میں دشمن کے ساتھ اس صورت میں جنگ میں نہ الجھنا جب کہ وہ صلح کا ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔ قرآن مجید زیادہ سے زیادہ جنگی تیاری کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ جنگ سے زیادہ سے زیادہ پرہیز کا بھی حکم دیتا ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾

(اے رسولؐ) اگر آپ کے دشمن صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس کی طرف جھک جانا اور اللہ کے قانون پر بھروسہ کرنا (یعنی دشمن کی طرف سے غافل نہ ہونا) بلا شبہ اللہ تعالیٰ خوب خوب سننے والا اور خوب خوب جاننے والا ہے۔

○ **تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ :** کا مصدری لفظی معنی ہے اللہ پر بھروسہ کرنا مگر واضح رہے کہ اللہ پر بھروسہ اس کے مقررہ قانون کے مطابق عمل کرنا' یعنی اللہ تعالیٰ کے غیر متبدل قوانین پر بھروسہ کرنا ہے جو کبھی بھی دھوکہ نہیں دیتے۔ **تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** یعنی اللہ کے قانون پر توکل کی وضاحت سورہ آل عمران میں بالفاظ ذیل موجود ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ ۱۵۹/۳

اور (اے رسولؐ) صحابہؓ کے ساتھ اہم کاموں میں مشورہ کیا کریں۔ پھر جب (باہمی مشورہ کے بعد اس مہم کی انجام دہی کا ارادہ کریں تو **فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ**' اللہ پر توکل کیا کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

توکل کا یہ مطلب ہے خنجر تیز رکھ اپنا
نتیجہ اس کی تیزی کا اللہ کے حوالے کر

دیکھئے ! یہاں پہلا نمبر ہے مشاورت کا' پھر عزم کا اور پھر توکل علی اللہ کا نمبر بتایا گیا ہے اب ظاہر ہے کہ مشاورت کے بعد عزم' پیش آمدہ مہم کے اس طریق کے عین مطابق ہوگا جو باہمی مشاورت میں مہم کے جملہ نشیب و فراز پر پوری طرح غور کرنے کے بعد طے کیا گیا ہو۔ پس عزم کے بعد' جو توکل علی اللہ کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ پیش آمدہ مہم کی تکمیل کے لیے عملی طور پر وہ راستہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو باہمی مشاورت میں طے کردہ طریق کار سے متعلقہ اس قانون جاریہ کے مطابق ہوگا جو پیش آمدہ مہم کی تکمیل کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ پر توکل کرنے سے مراد ہے اللہ کے خود متعین کردہ غیر متبدل قوانین پر بھروسہ کرنا۔ بالفاظ دیگر اللہ کے قانون پر بھروسہ کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل' بھروسہ کرنا ہے۔

اللہ یعنی اللہ کا قانون خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ○ **سورہ نحل** ارشاد ہوا ہے **اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** "کیا لوگوں نے پرندوں پر غور نہیں کیا یعنی انہیں غور کرنا چاہئے کہ پرندے فضا میں اڑتے ہیں انہیں فضا میں اللہ کا قانون تھامے رکھتا ہے۔ بیشک اس بیان میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لانے والے ہیں" (۷۹/۱۶)

دیکھئے ! یہاں **مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ** میں "اللہ" یعنی اللہ کا قانون ہے کیونکہ جب اڑتے پرندے کو شکاری نشانہ کرتا ہے تو وہ جھٹ نیچے آگرتا ہے یا جب اڑتے پرندے کے پروں میں کوئی کمزوری حادثۃً" واقعہ ہو جاتی ہے تو اللہ کا قانون اسے نیچے گرا دیتا ہے۔ پرندہ ہوا میں اس وقت تک اڑ سکتا ہے جب تک وہ اڑنے کے قابل ہو یہی اللہ کا قانون ہے۔ المختصر آیت مجیدہ زیر نظر ۸/۶۱ میں **تُوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** کا معنی اللہ کے خود متعین کردہ غیر متبدل قوانین پر بھروسہ کرنا ہے اور یہی ہے اللہ پر

بھروسہ کرنا۔

○ **اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ** کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ مومنوں کو کافر' جو صلح کی دعوت دیتے ہیں' اللہ تعالٰی اسے اچھی طرح سنتا بھی ہے اور جو کچھ ان کے ذہنوں میں پوشیدہ ہوتا ہے اسے اچھی طرح جانتا بھی ہے کہ وہ مومنوں کو دھوکا دینے کے لیے صلح کا چکمہ دینا چاہتے ہیں یا فی الحقیقت صلح چاہتے ہیں لیکن چونکہ اسلام اور قرآن صلح پسند مسلک کے حامی ہیں۔ اس لیے مومنوں کو تاکید کی گئی ہے کہ جب دشمن صلح کی طرف جھکے تو تم بھی صلح کی طرف جھک جانا۔ مگر اللہ کے قانون پر بھروسہ کرتے ہوئے ہر آن نگاہ رکھنا کہ آیا دشمن تمہیں دھوکہ تو نہیں دینا چاہتا۔ جب تم عہد شکنی کا خطرہ محسوس کرو تو عہد لوٹا کر برابر ہو جانا ۸/۵۸

اے رسولؐ آپؐ کے لیے اللہ اور صحابہؓ کافی ہیں

اگلی آیت مجیدہ میں رسولؐ اللہ کو مخاطب کرکے دشمنوں کی عہد شکنی کو خاطر میں نہ لانے کی تاکید کی گئی ہے کہ اگر وہ آپ کو دھوکا دیں تو آپ کے لیے اللہ کافی ہے' جس نے اپنے قانون کے مطابق آپ کے جاں نثار صحابہؓ کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی ہے۔ اس لیے عہد شکن دھوکے باز دشمن آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے۔ انجام کار آپ کے ہاتھوں انہیں شکست فاش نصیب ہوگی اور فتح آپ کے قدم چومے گی۔ اس پورے مضمون کو قرآن کریم نے انتہائی اختصار کے ساتھ بالفاظ ذیل بیان کیا ہے۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اور (اے رسولؐ! آپ کے عہد شکن دشمن' عہد توڑ کر) اگر آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ کریں تو (آپ غم نہ کھائیں) بلاشبہ آپ کے لیے اللہ کافی ہے۔ وہی جس نے آپ کو تقویت دی اپنی مدد کے ساتھ۔ یعنی مومنین (صحابہ کرام) کے ذریعے۔

○ حسبک اللہ کے الفاظ میں جو ارشاد ہوا ہے کہ آپ کے لیے اللہ کافی ہے۔ انتہائی غور طلب ہے۔ اوپر وضاحت گزر چکی ہے

اللہ تعالیٰ کا ہر کام اپنے خود مقرر کردہ غیر متبدل قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے انبیاءؑ کی مدد کا الٰہی قانون ہے یا صحابہؓ کی طاقتور جماعت کے ذریعہ اور یا آندھی زلزلہ طوفان وغیرہ اپنے جنود السموات والارض کے ذریعہ جیسے کہ نوحؑ کی مدد آپ کی قوم پر طوفان لاکر کی گئی تھی۔ ہودؑ کی مدد ان کی قوم پر آندھی بھیج کر کی گئی۔ مگر داودؑ سلیمانؑ اور نبی اکرمؐ کی مدد ان کی صحابہؓ کی جماعت کے ساتھ کی گئی، جس کے ذریعہ ان کے دشمنوں کو شکست فاش ہوئی۔ اسی لیے یہاں نصرت الٰہی کو صحابہ رضوان اللہ اجمعین کی قوت بازو کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔

○ **بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ** کی درمیانی واؤ تفسیری بمعنی "یعنی" ہے۔

○ یہاں واؤ بمعنی بذریعہ ہے۔ دیکھیے سورہ توبہ۔ **اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ** اعلان ہے اللہ کا بذریعہ اس کے رسولؐ کے۔

○ اگلی آیت مجیدہ ۸/۶۳ میں صحابہؓ کی باہمی محبت و روا داری کی کھل کر خبر دی گئی ہے کہ ان کے قلوب و اذہان میں باہمی محبت و شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اور (اللہ نے) ان کے ذہنوں میں محبت ڈال دی۔ اور (اے رسول) اگر (بفرض محال) آپ زمین بھر کا سارا مال خرچ کر دیتے تو پھر بھی آپ ان کے ذہنوں میں محبت پیدا نہ کر سکتے تھے ولیکن اللہ نے (اپنے قانون کیمطابق) ان میں محبت ڈال دی بلا شبہ وہ غالب حکمت والا ہے۔

○ **لو انفقت** میں لَو تفریض محال کے لیے آیا ہے۔ کیونکہ نہ زمین بھر کا سارا مال و دولت نبی اکرمؐ کے قبضہ میں تھا اور نہ ہی آپ اسے خرچ کر سکتے تھے۔

ذاتی مفاد پرستی سے باہمی دشمنی پیدا ہوتی ہے اور قومی مفاد کے جذبہ سے باہمی محبت جنم لیتی ہے۔

○ صحابہ رضی اللہ عنہم نزول قرآن سے پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اب باہمی دشمنی اور باہمی محبت کا الٰہی قانون یہ ہے کہ جہاں ذاتی مفاد پرستی کا دور دورہ ہوتا ہے اس معاشرہ کا ہر فرد چونکہ اپنے مفاد کو مقدم رکھتا ہے۔ اس لیے الگ الگ افراد کے مفاد چونکہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اس لیے اس معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں اور جس معاشرہ میں ذاتی مفاد کی بجائے اجتماعی طور پر قومی مفاد کو مقدم رکھا جاتا ہو۔ اس معاشرہ کے افراد ٹیم ورک کی صورت میں صرف قومی مفاد کے لیے باہم مل کر کام کرتے ہیں۔ اس لیے ان افراد میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ نزول قرآن سے پہلے چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم انفرادی مفاد پرستی کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے اس لیے وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے ۳/۱۰۳ لیکن۔

○ جب قرآن کریم نازل ہوا اور اس کے پہلے ہی سبق **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** ۱/۱ میں اللہ تعالیٰ کو پورے عالمین کا رب بتا دیا گیا۔ تو اس پر ایمان لانے والے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب انفرادی مفاد کی بجائے قومی مفاد کے لیے مل کر کام کرنا شروع کیا تو وہی جو آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے گہرے دوست بن گئے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے۔

○**وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا** ج

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ ۳/۱۰۳

○ اور اے جماعت صحابہؓ ! اللہ کی نعمت (قرآن) کو یاد کرو۔ جو اس نے تم پر نازل فرمائی کہ جب تم (ذاتی مفاد پرستی کی بدولت) ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اللہ نے (اپنے قانون کے مطابق) تمہارے اذہان میں محبت ڈال دی۔ پس تم اللہ کی نعمت (قرآن) کے ساتھ آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔ اور تم (اس سے پہلے) آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ پھر اللہ نے (اپنی نعمت قرآن) کے ساتھ تمہیں اس سے بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

○ واضح رہے کہ قرآن کریم پر عمل کرتے ہوئے انفرادی مفاد پرستی سے پرہیز کرنے سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں باہمی محبت قرآن کریم پر عمل کرکے انفرادیت سے ہٹ کر اجتماعیت کو اپنانے ہی سے پیدا ہوئی تھی۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس کام کو جو اس کے قانون کے مطابق سرانجام ہوتا ہے' اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں ذات باری کی طرف سے نبی اکرمؐ کے لیے کفایت صحابہ کرام کا تکرار تاکیدی بالفاظ ذیل لایا گیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۴

اے نبیؐ ! (پھر سن لیجئے گا کہ) آپ کے لیے اللہ کافی ہے یعنی وہ مومن کافی ہیں جنہوں نے آپ کی اتباع کی ہے۔ (اور آپ کی اتباع میں آپ کی عسکری قوت میں اس قدر بے پناہ اضافہ کیا ہے کہ آپ کے دشمن گھر بیٹھے کانپتے ہیں)

صرف جنگی ہتھیار ہی کافی نہیں بلکہ ہتھیاروں کے استعمال کی پوری پوری مہارت بھی ضروری ہے۔

○ اوپر ۸/۶۰ میں جنگی ہتھیاروں اور ذرائع رسل و رسائل کی ہر آن تیاری کا حکم دینے کے بعد اگلی آیت مجیدہ ۸/۶۵ میں مومنوں کو جنگی ہتھیاروں کے استعمال کی زیادہ سے زیادہ مشق کرنے کا اہم ترین حکم دیا گیا ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵

اے نبیؐ ! مومنوں کو لڑائی کی اتنی زیادہ مشق کروائیں کہ وہ تھک کر چور ہو جایا کریں۔ (ایمان والو !) اگر تم میں (ایسے فنون حرب کے ماہر) بیس ثابت قدم مجاہد ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں (ایسے فنون حرب کے ماہر) سو ثابت قدم مجاہد ہوں گے تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔ یہ اسلئے کہ (تم تفقہ کرتے ہو کہ نظام ربوبیت کے قیام کے لیے لڑ رہے ہو) وہ تفقہ ہی نہیں کرتے (کہ کیوں لڑ رہے ہیں۔ صرف استحصالی نظام کی بقا کے لئے؟)

○ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ کے جملہ میں حرض کا سہ حرفی مادہ ح۔ ر۔ ض= حرض ہے اس کا بنیادی معنی

ہے کمزور ہو جانا لاغر ہو جانا۔ اس لیے **حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ** کا یہ معنی تو لیا ہی نہیں جاسکتا کہ اے نبیؐ مومنوں کو قتال کے لیے لاغر اور کمزور کر دیں۔ جب کہ قتال کے لیے طاقت ور اور توانا ہونا شرط اول ہے۔ اس لیے **حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ** کا صحیح معنی یہ ہے کہ اے نبیؐ ! مومنوں سے اتنی زیادہ فوجی مشقیں کروائیں کہ وہ کمزور یعنی تھک کر چور ہو جایا کریں۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں استثناء بیان ہوئی ہے۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

اس وقت اللہ تعالیٰ تم سے تخفیف کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بیشک (اس وقت) تم میں (سامان حرب کی) کمزوری ہے تو اس طرح اگر تم میں (فنون حرب کے ماہر) ایک سو مجاہد ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں (فنون حرب کے ماہر) ایک ہزار مجاہد ہوں تو وہ اللہ کے قانون کے مطابق دو ہزار (کافروں) پر غالب آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

اذن بمعنی اللہ کا قانون ۵۸/۷ میں ملاحظہ فرمائیں:۔ **وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ**= اور تندرست زمین اللہ کے قانون کے مطابق اپنی عمدہ پیداوار اگاتی ہے۔ **وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا**= اور جو بیمار زمین ہے وہ ناقص پیداوار اگاتی ہے اس آیت مجیدہ میں اِذْنِ رَبِّہٖ کے الفاظ سے کھل کر ثابت ہے کہ اِذن بمعنی اس کا قانون ہے کہ اس کے قانون کے مطابق عمدہ زمین عمدہ پیداوار پیدا کرتی ہے اور ناقص زمین ناقص پیداوار پیدا کرتی ہے۔

ثبات قدمی فتح و نصرت کی کنجی ہے ○ واضح رہے کہ آیت نمبر۶۰/۸ میں اتنی بے پناہ فوجی قوت تیار کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے' جس سے ڈر کر دشمن گھر بیٹھے کانپتا رہے۔ آیت نمبر۶۵'۶۶/۸ میں نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اتنی زیادہ فوجی مشقیں کرایا کریں کہ وہ تھک کر چور ہو جائیں۔ اور ساتھ ہی انہی آیات مجیدہ ۶۵-۶۶/۸ میں خبر دی گئی ہے کہ:۔

۱۔ اگر تم میں ایسے فنون حرب کے ماہر بیس ثابت قدم مجاہد ہوں گے تو اپنے سے دس گناہ دشمنوں دو سو پر غالب آئیں گے۔

۲۔ اور اگر تم میں ایسے فنون حرب کے ماہر ایک سو ثابت قدم مجاہد ہوں گے تو اپنے سے دس گنا دشمنوں ایک ہزار پر غالب آئیں گے۔

۳۔ لیکن چونکہ ہنوز تم میں مادی کمزوری ہے۔ مگر پھر بھی تم دگنے دشمنوں پر غالب آؤ گے۔ اگر تم میں سو ثابت قدم مجاہد ہوں تو دو سو پر غالب آئیں گے۔

۴۔ اور اگر ایک ہزار ثابت قدم مجاہد ہوں تو دو ہزار پر غالب آئیں گے۔ اور یہ سب کچھ اللہ کے قانون کے مطابق ہوگا۔

شرط اول ثابت قدمی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

○ اب غور فرمایئے کہ سطور بالا میں مومنوں اور کافروں کے مقابلے کی جو نسبت بیان ہوئی ہے' ۱: ۱۰ اور ۱: ۲ ان میں مندرجہ بالا چار صورتیں پیش کی گئی ہیں۔ اور چاروں صورتوں میں ثابت قدمی قدر مشترک کے طور پر شرط اول قرار دی گئی ہے اللہ کے قانون کے مطابق فتح ان لوگوں کا حصہ قرار دیا گیا ہے جو میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ جہاں قدم جم گئے' جان جائے مگر قدم نہ اکھڑنے پائیں۔ اسی ثابت قدمی ہی کو ذیل کے الہی حکم میں فرض کیا گیا ہے:۔

○ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ○ ۸/۱۵

○ ایمان والو ! جب تم میدان جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ تو پیٹھ نہ دکھانا۔ جم کر لڑنا (اس طرح کہ جان جائے مگر قدم نہ اکھڑنے پائیں)

پس فتح کی شرط اول ثابت قدمی ہے۔

دشمن کے مقابلے کے لیے سامان حرب بھی ضروری ہے اور فنون حرب کے ماہر ثابت قدم مجاہد بھی ضروری ہیں

○ المختصر آیات بالا ۸/۶۰ تا ۸/۶۶ سے بالوضاحت ثابت ہے کہ دشمن کے مقابلے کے لیے جنگی ہتھیار بھی ضروری ہیں۔ نہ ہتھیاروں کے بغیر جنگ ہو سکتی ہے اور نہ ہتھیاروں کے ماہر سپاہیوں کے بغیر۔ بالفاظ دیگر نہ مجاہدوں کے بغیر جنگی سامان خود بخود چل سکتا ہے۔ اور نہ مجاہد ہی سامان جنگ کے بغیر دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دشمن بھی ضرورت کے مطابق سامان جنگ اور فنون حرب کے ماہر سپاہی مہیا کرکے بالمقابل آجائے تو پھر؟..... اس سوال کا جواب **اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ** ۸/۶۶ کے الفاظ میں اوپر گزر چکا ہے۔ فتح انہیں نصیب ہوگی جو پورے سامانِ حرب اور فنونِ حرب کی مہارت کے ساتھ ساتھ میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہوں گے۔ چنانچہ انہی قرآنی حقائق پر روز مرہ کا مشاہدہ گواہ ہے کہ کافر کافر آپس میں لڑتے ہیں۔ کافر اور مومن آپس میں لڑتے ہیں۔ مگر غالب وہ آتے ہیں جو جدید ترین سامان حرب سے لیس ہونے کے ساتھ ساتھ میدان جنگ میں ثابت قدم بھی رہنے والے ہوتے ہیں۔ فتح کا اصلی راز ثبات قدمی میں مضمر ہے۔

نبی سلام علیہ کسی کو قید نہیں رکھ سکتا۔ اگلی آیت مجیدہ میں ربط کلام کے مطابق کہ فاتح قومیں مغلوب قوموں کو غلام اور قیدی بنا لیتی ہیں۔ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ کے نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو قیدی بنا کر رکھے اور نبی آتے ہی ہیں نوع انسانی کے ایک ایک فرد کو آزادی دلانے کے لیے۔ اور ان کی گردنوں سے ہر قسم کی غلامی کے پٹے اتارنے کے لیے۔ چنانچہ بالفاظ ذیل اعلان کیا گیا:۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ⑥	نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں۔ حتی کہ وہ (حملہ آوروں کو) میدان جنگ میں شکست دے کر مغلوب کر دے (کیا تم بلا وجہ قیدی بنا کر) دنیا کا مال حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے) کیونکہ اللہ تعالیٰ آخرت کا ارادہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

○ یہاں الارض کا معنی میدان جنگ کی زمین ہے۔ جیسا کہ ۴/۱۰۱ میں **اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ** کا معنی جنگ کی زمین ہے۔

کسی کو بلا وجہ قید کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں انتہائی ناپسندیدہ امر ہے

○ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اخروی سزا کا فیصلہ پہلے ہی سے نہ کیا جاچکا ہوتا تو کسی کو بلا وجہ قید و بند میں ڈال دینے والوں کو اسی دنیا میں پکڑ کر عذاب عظیم میں مبتلا کر دیا جاتا۔ دیکھئے اس ضمن میں کیسے سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑥	اگر نہ ہوتا پہلے سے فرض کیا ہوا اللہ تعالیٰ کیطرف سے تو تمہیں اس چیز کے بدلے (جو تم کسی کو بلاوجہ قید کرکے حاصل کرتے ہو) ضرور بڑا عذاب مس کرتا۔

صرف غنیمت کا مال حلال اور طیّب ہے:۔ ○ آیات بالا میں اس چیز سے سختی کے ساتھ منع کرنے کے بعد کہ تم کسی کو بلاوجہ قید کرکے اس سے یا اس کے ورثاء سے مال حاصل نہ کیا کرو۔ یہ صریحاً" حرام ہے۔ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جب تمہیں جنگ میں فتح نصیب ہو تو تمہیں وہ مال حاصل کرنا چاہیے جو دشمن میدان جنگ میں چھوڑ کر مرجائے یا

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ښ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑥	اور ایمان والو! (فتح کے بعد) وہ حلال و طیب مال کھاؤ جو تمہیں میدان جنگ میں تمہارے ہاتھ آئے۔ اور (اس سے زائد سے پرہیز کرکے) اللہ سے ڈرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ بچاؤ عطا کرنیوالا مہربان ہے۔

○ آگے بڑھنے سے پہلے مال غنیمت کی تعریف کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ مال غنیمت کے متعلق جو یہ تصور دیا گیا ہے کہ مفتوحہ قوم کے مردوں عورتوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا جائے اور پھر انہیں بڑی رقموں کے بدلے چھوڑا جائے۔ نیز یہ کہ مفتوحہ قوم کی بستیوں کو لوٹ لیا جائے۔ اور بستیوں کی پر امن عورتوں مردوں کو لونڈی غلام بنا کر فروخت کیا جائے اور بڑی بڑی رقمیں وصول کی جائیں۔ یہ سب کچھ از روئے قرآن حکیم حرام ہے۔

مال غنیمت کی تعریف ○ لفظ غنیمت کا سہ حرفی مادہ غ۔ ن۔ م = غنم ہے۔ اس کا بنیادی معنی ہے بغیر قیمت ادا کئے کوئی چیز حاصل کرنا۔ اب آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں قیمت ادا کئے بغیر کوئی چیز حاصل کرنا ازروئے اسلام مطلقاً منع ہے' حرام ہے' سرقہ ہے' چوری ہے تو آیت بالا میں جو **فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ** کے الفاظ آئے ہیں کہ جو مال تم بلا قیمت حاصل کرو اسے حلال طیب صورت میں کھاؤ۔ مال غنیمت صرف وہ ہے جو میدان جنگ میں دشمن چھوڑ کر مرجائے یا چھوڑ کر بھاگ جائے۔ میدان جنگ سے باہر دشمنوں کی بستیوں کا مال اور اس کے پر امن مرد اور عورتیں مال غنیمت نہیں۔ قرآن کہتا ہے۔ **لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ**۔ زمین میں فساد نہ کرو۔ واضح رہے کہ لڑائی ہوتی ہے حکومتوں کے درمیان۔ شریف شہریوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا جو پر امن زندگی گزارنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ مفتوحہ حکومت کی بستیوں میں لوٹ مچانا قطعاً" فساد فی الارض اور قطعاً" حرام ہے۔ البتہ وہ بستیاں اور ان بستیوں کا مال' مال غنیمت قرار دیا گیا ہے جنہیں دشمن خود چھوڑ کر بھاگ جائے ایسا مال اور میدان جنگ میں دشمن کا چھوڑا ہوا مال' مال غنیمت ہے۔ حلال اور طیب ہے۔ کیونکہ نہ دشمن میں لوٹ کر آنے کی طاقت ہو اور نہ وہ اپنا مال حاصل کرسکے۔ اگر وہ مال نہ لیا جائے وہ بیکار پڑا پڑا ضائع ہوجائے گا۔

جنگی قیدیوں کا مسئلہ ○ میدان جنگ میں' دوران جنگ دشمن کے سپاہیوں کو تا اختتام جنگ' اس لیے سختی کے ساتھ قید کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ تخریب کاریاں نہ کرسکیں۔ میدان جنگ میں اس کی بھی اجازت نہیں کہ دوران جنگ یا اختتام جنگ پر دشمن کے جو سپاہی ہاتھ آئیں انہیں قید نہ کیا جائے اور اس امر کی بھی اجازت نہیں کہ انہیں مستقل قیدی بنا کر بین الاقوامی فدیہ سے زائد رقم وصول کی جائے۔ سورہ محمدؐ میں ارشاد ہوا:۔

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ○ ذَٰلِكَ ط ۴۷/۴ پس جب تم (میدان جنگ میں) کافروں کے بالمقابل آؤ تو ان کی گردنیں مارنا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم انہیں تھکا کر چور کر دو تو انہیں سختی کے ساتھ قید کرلیا کرو۔ پھر اس کے بعد جب جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے (یعنی جنگ ختم ہو جائے' تم فتحیاب ہو جاؤ تو پھر ان جنگی قیدیوں کو) یا تو احسان کرکے رہا کر دینا ہے اور یا (باہمی مقررہ) فدیہ لے کر آزاد کر دینا ہے۔ بس جنگی قیدیوں کے لیے یہی ایک حکم ہے (کہ یا تو فدیہ لے کر یا قیدیوں کے ساتھ قیدیوں کا تبادلہ کرکے چھوڑ دینا ہے اور یا اگر فدیہ وصول ہونا ممکن نہ ہو تو انہیں بلا فدیہ' احسان کرکے چھوڑ دینا ہے اور بس۔

○ دیکھا آپ نے کہ جنگی قیدیوں کو صرف آزاد کر دینے کا حکم ہے۔ لونڈی غلام بنانے کی اجازت ہرگز نہیں۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اسلام نوع انسانی کی آزادی کا علمبردار ہے' غلامی کا نہیں۔

جنگی قیدیوں کے متعلق استثنائی حکم ○ اس ضمن میں استثنائی حکم آیت نمبر ۸/۶۷ میں گزر چکا ہے کہ نبی اکرمؐ کے لیے لائق نہیں کہ وہ کسی کو قیدی بنا کر رکھیں' سوائے اس کے کہ قیدیوں میں کوئی ایسا آدمی موجود ہو جس کا کام خونریزی کرنا اور فساد مچانا ہو۔ اسے قید رکھا جاسکتا ہے۔ ایسے شخص کو فساد مچانے کے لیے کھلا چھوڑ دینا ایک الگ جرم عظیم ہے۔ ایسے شخص کے سوا باقی تمام جنگی قیدیوں کو' خواہ ان میں مرد ہوں یا عورتیں' سب کو فدیہ لے کر یا احسان کرکے رہا ہی کر دینے کا حکم ہے۔ کسی بے ضرر انسان کو قید کرنا اور پھر اسے لونڈی اور غلام بنا کر فروخت کرنا اور اسے فروخت در فروخت کے لیے

مخصوص کرنا انسانیت کی انتہائی تذلیل ہے۔ العیاذ باللہ !

مالِ غنیمت پر حلالاً " طیباً کی قید ○ مال غنیمت کی تعریف آپ سن چکے ہیں۔ یہ صرف وہ مال ہے جو دشمن میدان جنگ میں چھوڑ کر مرجائے یا بھاگ جائے۔ یا جن بستیوں کو دشمن خود چھوڑ کر فرار ہو جائے۔ بستیوں والوں کو بستیوں میں سے بنوک سنگین نکالنا بھی جرم عظیم اور تذلیل انسانیت ہے۔ اب جو مال صحیح غنیمت کے طور پر میدان جنگ سے حاصل کیا جائے اس پر حلالا" طیباً کی قید لگائی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ میدان جنگ سے جو بھی مال کسی مجاہد' سپاہی کو ہاتھ آئے خواہ وہ تھوڑی [illegible] ہو یا گراں بہا قیمت کا مال ہو' نیز جس وقت اسے ہاتھ آیا ہو' اس وقت خواہ اسے کوئی دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو' اس کا فرض ہے کہ اسے بلا کم و کاست مال غنیمت کے بیت المال میں جمع کرائے۔ اور پھر مال غنیمت کی تقسیم کے وقت جو کچھ اس کے حصے میں آئے اس پر اکتفا کرے تو یہ مال حلالا" طیباً کی شرط کے مطابق ہے۔ اور اس کے برعکس جو مال میدان جنگ میں چھپا لیا گیا ہو۔ خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت۔ تھوڑی قیمت کا ہو یا بھاری قیمت کا' وہ حلال اور طیب نہیں ہوگا۔ حرام اور خبیث ہوگا۔

نبی اکرمؐ کو اپنے قیدیوں کو پوری پوری تسلی دینے کا خاص الخاص حکم ○ اب دوران جنگ جو جنگی قیدی نبی سلام علیہ کے ہاتھ آتے تھے۔ ان کے متعلق آپ کو حکم ہوا ہے کہ آپ انہیں تسلی دے دیں کہ تم میں جو لوگ غیر مفسد اور امن پسند ہیں انہیں مناسب وقت پر فورا" رہا کر دیا جائے گا۔ اور جو مال ان سے لیا گیا ہے وہ بھی انہیں واپس کر دیا جائے گا۔ ملاحظہ ہو ارشاد باری تعالیٰ :۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّمَن فِي أَيْدِيكُم مِّنَ الْأَسْرَىٰ إِن يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝	اے نبی ! جو قیدی آپ کے قبضے میں ہیں آپ انہیں کہہ دیجئے (انہیں تسلی دیجئے !) کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذہنوں میں بھلائی ظاہر کی تو تمہیں اس مال سے جو تم سے لیا گیا ہے بہتر مال دیا جائیگا اور اللہ تمہیں بچاؤ عطا فرمائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ (ایسے لوگوں کو جن کے اذہان میں بھلائی ہو) بچاؤ دینے والا مہربان ہے۔

○ اس آیت مجیدہ میں جنگی اور ہر قسم کے قیدیوں کے متعلق پوری تحقیق کرنے کا حکم دینے کے بعد اس امر کا فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے اذہان میں اسلامی حکومت کے لیے نیک جذبہ موجود ہو۔ اور وہ دوسروں کے کہنے پر مد مقابل آگئے ہوں۔ انہیں نہ صرف چھوڑ دیا جائے گا بلکہ ان سے جو مال لیا گیا ہو۔ اس سے بہتر مال انہیں واپس کر دیا جائے گا۔ نیز وہ لوگ بھی جو جنگ سے پہلے تو اسلامی حکومت کے مخالف تھے مگر شکست کھانے کے بعد اسلامی حکومت کے وفادار شہری بن کر رہنے کی یقین دہانی کروادیں' انہیں بھی چھوڑ دیا جائے گا۔

○ لیکن اس کے برعکس جو لوگ مسلسل اسلام دشمنی کے مریض چلے آرہے ہوں اور آئندہ کے لیے بھی ان میں کوئی بھلائی دکھائی نہ دیتی ہو' انہیں ہرگز نہیں چھوڑا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے سورہ مائدہ ۵/۳۳ میں ارشاد ہوا ہے۔

○ إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ

عَظِيْمٌ ○ ۵/۳۳

(مفہوم) جو لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ جنگ کریں (یعنی اسلامی حکومت سے لڑیں) اور زمین میں فساد پھیلائیں تو اس کے سوا اور کوئی بات نہیں کہ ان کی سزا یہ ہے کہ یا تو وہ قتل کر دیئے جائیں۔ یا صلیب پر چڑھا کر ختم کر دیئے جائیں۔ یا انہیں ہاتھوں پیروں میں الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر عمر قید کر دیا جائے۔ اور یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے۔ (ان سزاؤں میں سے جو سزا مناسب ہو وہ دی جائے) ان کی یہ سزا دنیا کی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

سود خور بھی اللہ و رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں ○ واضح رہے کہ **الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ** میں سود خور بھی شامل ہیں۔ کیونکہ سورہ بقرہ میں سود خوروں کے متعلق ارشاد ہے:۔

○ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ** ۲۷۸۔۲/۲۷۹= اے ایمان والو ! اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچو اور جو سود زمانہ جہالت کا لوگوں کی طرف باقی ہے اگر تم سچے مومن ہو تو اسے چھوڑ دو' پھر اگر تم ایسا نہ کرو (یعنی سود نہ چھوڑو) تو تمہارا اللہ اور رسول کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔

○ اس آیت مجیدہ کے مطابق سود خور بھی اللہ اور رسول کا متحارب گروہ ہے۔ ان کی سزا بھی یہی ہے جو آیات مجیدہ ۲۷۸۔۲/۲۷۹ کیمطابق اوپر بیان ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سودی نظام قرآنی نظام کی نقیض ہے۔ ارشاد باری ہے **يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ** ۲/۲۷۶ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے معاشرے کے قیام کا حکم دیتا ہے جس میں سودی نظام کو یکسر ختم کر دیا جائے اور صدقات کا نظام جاری و ساری کیا جائے۔ بالفاظ دیگر جن لوگوں کو وقتاً فوقتاً قرضہ لینے کی ضرورت لاحق ہو انہیں حکومت کے صدقہ کے فنڈ سے بلا سود قرضہ میسر آتا رہے۔ سودی قرضہ وہ ظالم جونک ہے جو قرض دار کے خون کا آخری قطرہ تک چوس کر دم لیتی ہے۔ قرضدار کے بیوی بچے ضروریات زندگی کو ترس رہے ہوتے ہیں اور قرض خواہ' قرضدار کی کمائی میں سے ہر ماہ اپنا زر سود وصول کرتا چلا جاتا ہے۔ پس سودی نظام چونکہ تذلیل انسانیت کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ اس لیے اسے حرام قرار دیا گیا ہے اور سود خوار کو اللہ تعالیٰ کا متحارب گروہ قرار دے دیا گیا ہے اور اس کی سزا بھی وہی تجویز کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے والوں کی مقرر ہوئی ہے۔

اگر کوئی دشمن خیانت کرے تو ایک مضبوط مرکز کو کوئی خطرہ نہیں ○ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

اگر قیدی لوگ خیانت کرکے منافقانہ طور پر اپنے آپ کو مرکز ملت کے وفادار بتائیں تو آپ غیب دان تو ہیں نہیں کہ ان کے ذہن کی بات جان لیں' انہیں مذکورہ رعایت دے دیجئے۔ کوئی خطرہ نہیں۔ یہ لوگ پہلے بھی تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں مگر بالآخر شکست یاب ہو کر قیدی ہو چکے ہیں۔

وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٧١﴾

اور (اے رسول) اگر یہ لوگ آپ کے ساتھ خیانت کرنے کا ارادہ کریں تو (کوئی خطرہ نہیں) پس بلا شبہ یہ لوگ اس سے پہلے اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں۔ پھر اللہ نے انہیں پکڑوا دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب علم و حکمت ہے۔

○ مندرجہ بالا احکام ایک مضبوط مرکز ملت کے لیے ہیں جو ہر لحاظ سے خود اپنے قدموں پر قائم ہو کہ اگر کوئی شخص خیانت کرتے ہوئے اپنے آپ کو مرکز ملت کا وفادار ظاہر کرکے رہائی حاصل کر لے اور پھر تخریبی کاروائیاں شروع کر دے تو اسلامی مرکز میں اسے دوبارہ گرفتار کرنے کی سکت موجود ہے وہ اسے پھر گرفتار کرکے سزا دے دے گا۔

○ ہوسکتا ہے کہ وہ منافق اسلامی حکومت کے دشمن کے ساتھ ساز باز کرکے باہر سے ان پر حملہ کروا دے اور اندرونِ ملک خود تخریب کاریوں میں مصروف ہو جائے تو ایسی صورت میں مرکز ملت کا انتہائی مضبوط ہونا ضروری ہے۔ ایسے خطرات کے پیش نظر ہی تو ۸/۶۰ میں حکم دیا گیا ہے:۔

○ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ ۚ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ ط ۸/۶۰

اور ایمان والو ! ان اپنے اور اللہ کے دشمنوں کے مقابلے کے لیے استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت ہر آن تیار کرتے رہو۔ خصوصاً" ذرائع رسل و رسائل۔ تم اس بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے رہو گے۔ تمہارے کچھ چھپے دشمن بھی ہیں جنہیں تم نہیں جانتے' انہیں اللہ جانتا ہے' ان سب کا واحد حل بے پناہ فوجی قوت تیار کرنا ہے۔

نگاہِ بازگشت:۔ آیات نمبر۶۱ میں ارشاد ہوا ہے۔ چونکہ اسلام امن کا ضامن ہے اس لیے اللہ تعالیٰ تمہیں بلا وجہ جنگ میں الجھانا نہیں چاہتا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمہارے دشمن صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ۔ خواہ مخواہ جنگ میں نہ الجھنا۔ لیکن صلح کے معاہدہ کے بعد اللہ کے قانون پر بھروسہ کرنا۔ معاہدہ والی قوم کے حالات سے پوری طرح باخبر رہنا۔ اگر تمہیں یہ خطرہ لاحق ہو کہ صلح کے عہد والی قوم عہد شکنی کے منصوبے بنا رہی ہے۔ تو قبل اس کے کہ وہ تمہیں صلح کے پردے میں نقصان پہنچائے' اس کا عہد اسے واپس لوٹا کر برابر ہو جانا (۸/۵۹)

○ آیت نمبر۶۲ میں پھر تکرار تاکیدی کے طور پر ارشاد ہوا ہے کہ اے رسولؐ اگر آپ کے دشمن آپ کو دھوکہ دینے کا ارادہ کریں تو غم نہ کیجئے گا۔ بلا شبہ اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ وہ اللہ جس نے آپ کو اپنی مدد یعنی مومنوں کی مضبوط جماعت کے ساتھ تقویت عطا فرمائی ہے اس آیت مجیدہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی مستقل مزاجی اور پامردی کی خبر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کو دشمنوں کے مقابلے پر جو کامیابی نصیب ہوئی تھی اس میں صحابہ کرامؓ کی عسکری قوت اور ان کے عزم و استقلال کا بہت بڑا حصہ تھا۔ صحابہؓ رسول ہی تو تھے جن پر اللہ راضی ہو گیا تھا اور وہ اللہ پر راضی ہو گئے تھے ۹/۱۰۰

○ آیت نمبر۶۳ میں ارشاد ہوا ہے کہ اے رسولؐ ! صحابہ کرام کے اذہان میں ہم نے محبت ڈال دی ہے اگر آپ دنیا بھر

کی دولت خرچ کر دیتے تو پھر بھی ان کے قلوب میں محبت نہ ڈال سکتے تھے بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

○ آیت نمبر۶۴، ۶۵ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے کہ اے نبیؐ! آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور اس کے قانون کے مطابق وہ مومن کافی ہیں جنہوں نے آپ کی اتباع کی ہے۔ آپ انہیں قتال (لڑائی) کی اتنی زیادہ مشق کرایا کریں کہ وہ تھک کر چور ہو جایا کریں اس طرح اگر ایسے مومن بیس ثابت قدم مجاہد ہوں گے تو وہ دو سو کافروں پر غالب آئیں گے اور اگر سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔

○ آیت نمبر۶۶ میں تخفیف بیان ہوئی ہے کہ اس وقت چونکہ تم میں سامانِ حرب کی کمی ہے۔ اس لیے اس حالت میں بھی اگر سو ثابت قدم مجاہد ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور اگر ہزار ہوں گے تو دو ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔

○ آیت نمبر۶۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ نبی سلام علیہ کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو قید میں رکھے سوائے جنگی قیدیوں کے۔ وہ بھی صرف اتنا عرصہ تک جب تک جنگ جاری ہو۔ جنگ ختم ہوچکنے پر جنگی قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر رہا کر دینا ہے اور یا احسان کرکے ۴/۴۷۔ بہر حال وہ آزاد ہی کیے جائیں گے جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنا کر بیچنا اور مالی فائدہ حاصل کرنا حرام ہے۔

○ آیت نمبر۶۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانا اور ان سے مالی فائدہ حاصل کرنا اس قدر ناپسندیدہ امر ہے کہ اگر قیامت کا فیصلہ پہلے نہ کیا گیا ہوتا تو اس پر دنیا ہی میں عظیم عذاب نازل کر دیا جاتا۔

○ آیت نمبر۶۹ میں جنگ میں فتح کے بعد حاصل ہونے والے مال غنیمت کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اسے حلال طیب کھاؤ۔ میدان جنگ کے علاوہ دشمن کی بستیوں کو نہ لوٹنا اور نہ شریف شہریوں کو لونڈی غلام بنا کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا۔

○ آیت نمبر۷۰ میں ارشاد ہوا ہے کہ اے نبی سلام علیہ جو قیدی آپ کے قبضے میں ہیں آپ انہیں کہہ دیجئے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے ذہنوں میں بھلائی پائی تو تمہیں رہا کرنے کے علاوہ اس سے بہتر مال واپس کر دیا جائے گا جو تم سے لیا گیا ہے۔ اور تمہیں بچاؤ دیا جائیگا یعنی باحفاظت چھوڑ دیا جائے گا۔) اللہ تعالیٰ غفورالرحیم ہے۔

○ آیت نمبر۷۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ اے رسول سلام علیہ! اگر یہ قیدی آپ کے ساتھ خیانت کرنے کا ارادہ کریں تو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ لوگ اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کرچکے ہیں۔ مگر انہیں اللہ تعالیٰ نے پکڑوا دیا ہے۔ اگر پھر خیانت کریں گے تو پھر پکڑے جائیں گے۔ یعنی دوبارہ شکست یاب ہوکر ذلیل و خوار ہوں گے۔

○ اس سے آگے آیت نمبر۷۲-۷۳ میں ایک اہم مسئلہ کا فیصلہ دیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد آیات نمبر۷۴-۷۵ کا ربط آیت نمبر۶۲، ۶۴ کے ساتھ ہے جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدد اور کفایت کی خبر بالفاظ ذیل دی گئی ہے:۔

○ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَالَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۸/۶۲) پس بے شک (اے رسول سلام علیہ) تیرے لیے اللہ کافی ہے۔ وہ اللہ جس نے آپ کو قوت دی اپنی نصرت اور مومنوں (صحابہ رضی اللہ عنہم) کے ساتھ

○ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ۸/۶۴= اے نبیؐ! آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور مومن کافی ہیں جنہوں نے آپ کی اتباع کی ہے۔

صحابۂ رسولؐ سب حقے سچے مومن تھے ○ آیات مجیدہ ۷۴، ۸/۷۵ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے دونوں گروہوں

مہاجرین و انصار اور پھر ان میں سے پہلے ایمان لانے والوں اور پیچھے ایمان لانے والوں سب کے ایمان کامل کا اعلان کیا گیا ہے تاکہ آنے والی نسلیں ان میں سے کسی کو غیر مومن اور منافق ٹھہرا کر ان کی سیرتِ مقدسہ کو داغدار نہ کر سکیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ صحابۂ رسول کو ایمان سے عاری اور منافق ٹھہرانے کا مرتکب بھی ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جملہ صحابہ رضی اللہ عنہم مہاجرین و انصار' سابقین ولاحقین سب کے متعلق آیت نمبر۷۴ میں فرمایا ہے= **أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا**= وہ سب کے سب حقے سچے مومن ہیں۔ اس سے ماقبل آیت نمبر۷۲ میں اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مکہ **معظمہ** سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو یکبارگی ہجرت کا موقعہ میسر نہیں آیا تھا۔ بلکہ مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف انداز کے ساتھ جوں جوں موقعہ میسر آتا گیا' ہجرت فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ ادھر مدینہ منورہ میں اسلامی سلطنت قائم بھی ہوچکی تھی اور ادھر ہنوز بہت سے صحابہ مکہ **معظمہ** میں موجود تھے' جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی تھی۔ چنانچہ اولین مجاجرین و انصار کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۷۲)	بیشک جو لوگ (ضابطہ الہٰی پر) ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں (انہوں نے) اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا (یعنی ضابطہ الہٰی کے نفاذ کے لیے اپنے مال بھی خرچ کئے اور جانیں بھی لڑا دیں) اور وہ بھی جنہوں نے مہاجروں کو ٹھکانہ دیا اور ان کی مدد کی وہ سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

○ اولین مہاجرین و انصار کی باہمی ہمدردی' محبت اور بے لوث دوستی کے اعلان کے بعد ان صحابہؓ کے متعلق جنہیں ابھی تک ہجرت کرنے کا موقعہ میسر نہیں آیا تھا۔ اور وہ مکہ **معظمہ** ہی میں مشرکین مکہ کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق آیت مجیدہ ۸/۷۲ کے اگلے الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا (۷۲)	اور وہ لوگ جو (ضابطہ الہٰی پر) ایمان لائے مگر ہجرت نہیں کی۔ (اے مدینے والے مہاجر و انصار) ان کی کفالت میں سے تمہارے ذمہ اس وقت تک کچھ نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ (یعنی ہجرت کرکے تمہارے معاشرہ میں نہ آجائیں)۔

پابندیٔ عہد کی انتہائی تاکید۔ آیت مجیدہ زیر نظر ۸/۷۲ کے اگلے الفاظ میں مدینہ والے مہاجرین و انصار کے قائم کردہ مرکز ملت کو حکم ہوا کہ وہ صحابہؓ جو ناساعد حالات کی بدولت' ہجرت نہیں کر سکے' دین کے معاملے میں ان کی مدد کرنا تمہارے ذمہ ہے۔ لیکن اگر ان کا جھگڑا کسی ایسی قوم کے ساتھ ہو۔ جس کے ساتھ تمہارا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو تو پھر تم غیر مہاجر مومنوں کی فوجی مدد نہیں کرسکتے' معاہدہ کی پابندی کی حدود میں رہ کر مدد کی جائے گی۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

اور اگر وہ (غیر مہاجر مومن) تم سے کسی دینی معاملہ میں مدد مانگیں تو اس وقت ان کی مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ سوائے اس قوم کے مقابلے کے لیے جس کے اور تمہارے درمیان (عدم جنگ کا) معاہدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (تم اس حکم کے مطابق یا مخالف جو بھی) عمل کرو گے۔ اللہ اسے دیکھنے والا ہے۔

پابندیٔ معاہدات بجائے خود دین ہی ہے:۔ ○ دیکھا آپ نے ! کہ اسلام میں پابندی معاہدات کو مومنوں کی دینی مدد سے بھی مقدم قرار دیا گیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ معاہدات کی پابندی بجائے خود دین کا ایک حصہ ہے جیسے کہ ارشاد باری ہے۔ **وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا** ○ ۱۷/۳۴= اور عہد وفا کیا کرو بے شک عہد کے متعلق (دنیا و آخرت میں) سوال کیا جائے گا۔

○ تو اس طرح ۸/۷۲ کے مطابق مومنوں کی دینی مدد کرنا بھی اللہ کا حکم ہے اور وفاءِ عہد بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اگر مومنوں کا تنازعہ کسی ایسی قوم کے ساتھ ہو' جس کے ساتھ مرکز ملت کا باہم جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو تو آیت بالا ۸/۷۲ میں ایفاءِ عہد کو مقدم رکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ مدد کے طلبگار غیر مہاجر مومنوں کی مدد بھی فرض ہے اس لیے معاہدہ امن کی حالت میں ان کے دشمن کے ساتھ مصالحانہ انداز سے تنازعہ ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی جو یقیناً کامیاب ہوگی۔ کیونکہ ان کے دشمن کے ساتھ معاہدۂ امن کے ذریعہ مرکز ملت کے دوستانہ مراسم قائم ہیں۔ اور دوستانہ ماحول میں گفتگو کے ذریعہ تنازعہ ختم کیا جانا صد فیصد ممکن ہے کیونکہ مومنوں کے مطالبات بھی تو کبھی ناجائز نہیں ہوتے۔

دین اور غیر دین میں فرق ○ آگے بڑھنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ آیت بالا میں غیر مہاجر مومنوں کی مدد جب دینی معاملات کے ساتھ مشروط کر دی گئی ہے تو اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دینی اور غیر دینی معاملات کی کیا پہچان ہے؟ دین اور غیر دین میں کیا فرق ہے؟ واضح رہے کہ قرآن مجید نے دین کی تعریف بالفاظ ذیل کی ہے:۔

○ **اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ** ۳/۱۸= بے شک اللہ کے نزدیک اسلام ہی دین ہے۔ یعنی دین ہی کا دوسرا نام اسلام ہے اور اسلام کا معنی ہے فرمانبردار ہو جانا۔ کس کا فرمانبردار؟ اللہ تعالیٰ کا۔ ابراہیم سلام علیہ کو حکم ہوا تھا اَسْلِمْ ۲/۱۳۱ فرمانبردار ہو جا۔ تو آپ نے فرمایا۔ **قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** ○ ۲/۱۳۱ فرمایا میں عالمین کے پروردگار کا فرمانبردار ہوگیا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہی اسلام ہے اور یہی دین ہے نیز دین اسلام' یعنی اللہ کی فرمانبرداری کے جملہ احکام چونکہ صرف اور صرف قرآن کریم میں درج ہیں۔ اس لیے قرآن کریم کا ہر حکم اللہ کا دین ہے اور ہر وہ معاملہ جو اللہ کے حکم کے مطابق ہو' وہ دینی معاملہ یا دینی تنازعہ ہے۔ اور ہر وہ معاملہ جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو وہ غیر دینی ہے۔ پھر سن لیجئے گا کہ:۔

○ آیت بالا ۸/۷۲ میں غیر مہاجر مومنوں کی مدد کو اس امر کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے کہ اگر ان کا تنازعہ کسی قوم کے ساتھ دین اللہ کے موافق یعنی اللہ کے حکم کے مطابق ہو تو ان کی مدد کرنا مرکز ملت کا فرض ہے۔ لیکن اگر وہ حکمِ خداوندی سے متجاوز ہوکر کسی قوم کے ساتھ الجھ پڑیں تو ان کی مدد فرض نہیں۔ لیکن مذکورہ بالا جائز مدد کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایفاءِ وعدہ کے مقابلے پر مؤخر قرار دے دیا۔ کیونکہ اقوام عالم میں باوقار قومیں وہی ہوتی ہیں جو اپنے وعدوں کو ہمیشہ ہمیشہ وفا کرتی ہیں۔

تجارتی معاہدات ○ اقوام عالم کے باہمی معاہدات میں ایک شق تجارتی معاہدوں کی ہے۔ جن میں مال کی قیمت اور کوالٹی کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ اور متعینہ مدت تک فریقین مقررہ قیمت اور متعینہ کوالٹی کا تبادلہ کرکے تجارت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو قوم یا ملک ناقص جنس سپلائی کرے یا روئی کی گانٹھوں میں اینٹیں بھر کر بھیج دے تو اس کا اعتبار جاتا رہتا ہے اور وہ اقوام عالم میں نہ صرف ذلیل ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ اس کی تجارتی ساکھ ختم ہو جاتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم تجارت کے علاوہ ہر شعبہ میں پسماندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قوموں کی ترقی کا راز ایفاء عہد میں ہے۔ اس لیے صاحب علم و حکمت نے غیر مہاجر مومنوں کی جائز دینی مدد کو موخر اور ایفاء عہد کو مقدم قرار دیا ہے۔

کافروں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کے مدد گار ہیں ○ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ کافروں کے مختلف گروہ ایک دوسرے کے مدد گار ہیں پیچھے ۸/۷۲ کے ابتدائی الفاظ میں گزر چکا ہے کہ مومن مہاجر و انصار ایک دوسرے کے مدد گار ہیں۔ بالفاظ دیگر دونوں طرف ایک دوسرے کے مدد گار موجود ہیں۔ ۸/۷۲ کے آخری الفاظ میں حکم دیا گیا ہے کہ جو مومن نامساعد حالات کی بدولت ہجرت نہیں کر سکے' ان کی جائز مدد کرنا تمہارا (مرکز ملت) کا فرض ہے سوائے ایسی قوم کے مقابلے کے لیے جس سے تمہارا (مرکز ملت کا) امن کا معاہدہ ہو۔ یعنی ان کی مشروط مدد کا حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان کی متحارب قوم سے تمہارا معاہدہ امن نہیں ہے تو غیر مہاجر مومنوں کی غیر مشروط مدد کرنا فرض ہے اور اگر معاہدہ ہے تو معاہدہ کی حدود میں رہ کر ان کی مشروط مدد گفت و شنید کے ذریعے کی جائے گی۔ چنانچہ ارشاد باری ہے کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں فتنہ اور فساد پھیل جائے گا:۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

اور جن لوگوں نے (کتاب اللہ کا) انکار کیا ہے۔ (ان کے مختلف گروہ) ایک دوسرے کے مدد گار ہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا (یعنی مدد طلبگاروں کی مشروط مدد نہ کی) تو زمین پر فتنہ برپا ہوگا اور بہت بڑا فساد رونما ہو جائے گا۔

○ اب ظاہر ہے کہ اگر غیر مہاجر مومنوں کے متحارب گروہ کے ساتھ مرکز ملت کا معاہدہ امن ہے تو مومنوں کی مدد کرنا معاہدہ کے خلاف ہے۔ ایسے میں اگر مدد کی جائے تو ظاہر ہے کہ کافروں کے تمام گروہ اکٹھے ہو کر واویلا کریں گے کہ مسلمان ایفاء عہد نہیں کرتے۔ اور اگر معاہدہ نہیں اور مدد نہ کی جائے تو کفار و مشرکین اکٹھے ہو کر زمین میں فساد مچا دیں گے۔ پس دونوں صورتوں میں غیر مہاجر مومنوں کی مشروط جنگی مدد یا بذریعہ گفت و شنید مدد کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔

آیت بالا کا اطلاق آج کے زمانہ میں ○ فی زمانہ جب اسلامی حکومتیں مختلف حصوں میں بٹ چکی ہیں۔ آیت بالا ۷۲ /۸ کے مطابق لازم ہے کہ ان تمام حکومتوں میں ایک مرکزی حکومت ہو' اور وہ اتنی مضبوط ہو کہ وقتی تقاضوں کے مطابق باقی حکومتیں اس سے مدد حاصل کر سکیں۔ یہ مرکزی حکومت اللہ کے حکم کے مطابق بیت الحرام کے مرکزی مقام پر قائم ہونی چاہئے۔ جو آیت بالا کے مطابق ان حکومتوں کے ساتھ جنگ نہیں کرے گی جن سے اس کا معاہدہ امن ہو۔ اگر کسی اسلامی حکومت کا تنازعہ' معاہدہ امن والی قوم کے ساتھ ہو جائے تو طاقتور اسلامی مرکزی حکومت گفت و شنید کے ذریعہ اس تنازعہ کو ختم کر دے گی اور اگر معاہدہ امن نہ ہو تو ہر قسم کی مالی اور فوجی امداد کے ساتھ اسلامی حکومت کی مدد کرنا' اسلامی مرکزی

حکومت کا فرض ہوگا۔

مہاجر و انصار سب حقے سچے مومن تھے ○ اس سے آگے سورہ انفال کی آخری دو آیتیں آرہی ہیں ۸/۷۴ اور ۸/۷۵ چونکہ پیچھے ۸/۶۲ اور ۸/۶۴ میں صحابۂ رسول کی شجاعت' جواں مردی اور مستقل مزاجی کی خبر دی گئی ہے۔ نیز خاتم النبین' رحمتہ اللعالمین رؤف الرحیم کی کامیابی کو صحابہؓ ہی کی مدد کا مرہون منت قرار دیا گیا ہے:۔

○ **فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَالَّذِیْ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ** ○ پس بے شک (اے رسول سلام علیہ) آپ کے لیے اللہ کافی ہے۔ وہ اللہ جس نے آپ کو قوت دی اپنی نصرت اور مومنوں کے ساتھ۔ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ۔

○ اب چونکہ بعض لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایمان سے خالی اور منافق قرار دیتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت کے لیے صحابہؓ کے دونوں گروہوں مہاجرین و انصار اور پھر ان میں سے سابق ولاحق سب کے متعلق اعلان عام کر دیا ہے کہ وہ سب حقے سچے مومن تھے۔ ان کے ایمان میں ہرگز شک نہیں کیا جاسکتا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ﴿۷۴﴾

اور وہ لوگ (کتاب اللہ پر) ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں (گھر بار چھوڑ کر) ہجرت کی اور (کتاب اللہ کے نفاذ کے لیے) جہاد کیا۔ اور وہ لوگ بھی جنہوں نے (مہاجروں کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی۔ وہ سب کے سب حقے سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے بچاؤ کا سامان اور عزت کی روٹی ہے (یعنی وہ دنیا میں خلافت ارضی سے سرفراز ہوں گے)

مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچنے والے مہاجر:۔ ○ اس آیت مجیدہ میں مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچے والے صحابہ کو **وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** کے بعد **هَاجَرُوْا** کے الفاظ میں مہاجرین کا لقب دیا گیا ہے اور **وَجٰهَدُوْا** کے الفاظ میں انہی کو مجاہد فی سبیل اللہ بتایا گیا ہے۔

مہاجروں کو جگہ دینے اور ان کی مدد کرنے والے انصار ○ اسی آیت مجیدہ میں **وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا** کے الفاظ میں مدینہ منورہ کے مقامی صحابہؓ جنہوں نے مہاجرین مکہ کو اپنے گھروں میں جگہ دے کر آباد کیا تھا۔ نیز **وَ نَصَرُوْٓا** کے الفاظ میں انہی کے متعلق یہ خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے مہاجرین مکہ کو نہ صرف جگہ اور ٹھکانہ دیا' بلکہ ان کی ہر قسم کی مدد فرمائی تھی' ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹا کر انہیں ان کے قدموں پر کھڑا کر دیا تھا' اللہ تعالیٰ نے ان مدنی صحابۂ رسول سلام علیہ کو انصار کا لقب عطا فرمایا ہے۔ آیت مجیدہ ۹/۱۰۰ میں جو اپنے مقام پر آگے آرہی ہے مہاجرین و انصار کی رفعت شان اور ان کے اصحاب جنت ہونے کا اعلان عام کیا گیا ہے۔

رزق کریم سے آزاد اسلامی حکومت عطا کرنا مراد ہے ○ رزق کریم کا معنی لکھا گیا ہے ان کے لیے عزت کی روٹی ہے یعنی وہ دنیا میں خلافتِ ارضی کے ساتھ سرفراز کیے جائیں گے یہاں رزق کریم سے مراد آزاد خود مختار اور بے محتاج اسلامی حکومت ہے۔ رزق کریم کا لفظی معنی ہے پُر وقار رزق۔ ایسا رزق جو عزت و عظمت اور شان و شوکت کے ساتھ میسر

آتا رہے اور ظاہر ہے کہ ایسا رزق اس قوم کو میسر آتا ہے جس کی اپنی مضبوط' طاقتور آزاد و بے محتاج حکومت قائم ہو۔ ایسی حکومت جو ہر شعبہ میں خود کفیل ہو۔ نہ وہ عسکری ضرورتوں کے لیے غیروں کی محتاج ہو اور نہ اسے غذائی احتیاج کے لیے غیروں کے آگے دامن پھیلانا پڑے۔ واضح رہے کہ محتاج حکومتیں کبھی رزق کریم کی مالک قرار نہیں دی جاسکتیں۔

تفسیر القرآن بالقرآن' صحابہؓ رسولؐ کیساتھ خلافت ارضی کا الٰہی وعدہ ○ تفسیر القرآن بالقرآن کے قرآنی اسلوب کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ سورہ نور میں خلافت ارضی کا وعدہ کیا گیا ہے:۔

○ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** ○ ۲۴/۵۵

(مفہوم) اور (اے جماعت صحابہؓ) اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اصلاح معاشرہ کے کام کئے' وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور ضرور زمین میں خلافت عطا کرے گا' جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلافتِ ارضی (آزاد و بے محتاج حکومت) عطا فرمائی تھی اور ضرور ضرور انہیں اس دین کا تمکن عطا فرمائے گا جو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اور ضرور ضرور ان کے خوف کو امن کے ساتھ بدل دے گا۔ وہ سب کے سب صرف میری محکومی اختیار کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو لوگ مذکورہ بالا خلافت کے قیام' کے بعد (اس خلافت کا) انکار کریں گے وہی توحدیں پھاندنے والے ہوں گے۔

○ واضح رہے کہ **لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ** اور **وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ** ہر سہ الفاظ کے شروع میں لام تاکید اور اخیر پر نون مشدّدہ آیا ہے۔ عربی گرائمر کے مطابق یہ انتہائی تاکید کے لیے آتے ہیں۔ اس لیے ان کا ترجمہ لکھتے ہوئے ضرور ضرور کا تکرار سہ گانہ لایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ضرور ضرور خلافتِ ارضی عطا فرمائے گا۔ ضرور ضرور دینی تمکّن سے سرفراز کرے گا اور ضرور ضرور ان کے خوف کو امن کے ساتھ تبدیل کر دے گا۔ ان کی خلافت کے منکروں کو فاسق قرار دیا گیا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ○ یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا کہ آیت بالا ۲۴/۵۵ میں **اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** کے الٰہی الفاظ کے مطابق خلافت ارضی کا وعدہ' ایمان والوں اور صالح اعمال کرنے والوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کیا صحابہؓ رسول مومن اور صالح اعمال والے تھے؟ کیونکہ اگر وہ مومن اور صالح ہی ثابت نہ ہوسکیں تو پھر ان کے لیے خلافت ارضی کے وعدے کا تصور تک پیدا نہیں ہوسکتا۔

○ جواباً" عرض ہے کہ آیت نمبر ۸/۷۴ میں آپ صحابہ کرام کی ہر دو جماعتوں مہاجرین و انصار کے متعلق اللہ کا اعلان ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ **اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ** ۸/۷۴= وہ سب مہاجر و انصار حقے سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے بچاؤ کا سامان اور پر وقار رزق ہے۔ پس چونکہ صحابہؓ کے ایک ایک فرد کا ایمان ۸/۷۴ سے ثابت ہے۔ اس لیے قرآن کی رو سے ان کے ایمان میں شک و شبہ کی گنجائش تک موجود نہیں۔ باقی رہا اعمالِ صالحہ کا سوال؟ تو اس کا جواب بھی اسی آیت میں موجود ہے۔ کہ مہاجرینِ مکہ نے ایمان لانے کے بعد' الفاظ ھَاجَرُوا کے مطابق اللہ کی راہ میں ہجرت کی' گھربار چھوڑا۔ چلتے کاروبار چھوڑے۔ بھری دکانیں چھوڑیں۔ کھجوروں سے لدے ہوئے باغات چھوڑے اور ہجرت کر گئے۔ اور جٰھدوا کے مطابق اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا اعمال صالحہ ہوسکتے ہیں' جنہیں اعمال

صالحہ کہا جاسکے۔

○ پس آیات مبارکہ ۸/۷۴ اور ۲۴/۵۵ کی تفسیر القرآن بالقرآن کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم کی دونوں جماعتیں مہاجرین و انصار حقے سچے مومن تھے اور صالحین بھی۔ اور ان سب کو ایک آزاد و بے محتاج اسلامی حکومت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی جس کا انکار ۲۴/۵۵ کے مطابق فسق مطلق ہے۔

پہلے پچھلے سب مہاجرین و انصار حقے سچے مومن تھے ○ اس سے آگے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۸/۷۴ میں صرف ابتدائی مہاجرین کا ذکر متصور ہوسکتا ہے بعد میں ہجرت کرنے والے ان میں شمار نہیں ہوسکتے۔ اس کا جواب اگلی آیت مجیدہ میں یوں دیا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ط

○ اور وہ لوگ جو بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا وہ سب کے سب بھی تمہی میں سے ہیں۔

۸/۷۵ ○ واضح رہے کہ **فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ** کے الفاظ سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہجرت **اُوْلٰی** کے علاوہ "وقتاً فوقتاً" بعد میں ہجرت کرنے والے اور پھر سابق مہاجرین کے ساتھ مل کر جہاد کرنے والے سب کے سب حقے سچے مومن تھے۔ نہ ان کے ایمان میں شک و شبہ کی گنجائش ہے نہ ان کے صالحین ہونے میں سورۃ توبہ ۹/۱۰۰ میں مہاجرین و انصار یعنی صحابہؓ کے دونوں گروہوں اور پھر ان میں سے پہلے ہجرت و نصرت کرنے والوں اور بعد میں ہجرت و نصرت کرنے والوں سب کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

○ **وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** ○ ۹/۱۰۰

(مفہوم) اور مہاجرین و انصار میں سے جنہوں نے پہلے ہجرت اور نصرت کی' اور ان میں سے وہ بھی جنہوں نے بعد میں حسن کارانہ انداز کے ساتھ ان کی پیروی کی (جوں جوں وقتاً فوقتاً ہجرت کر کے آتے رہے) ان سب پہلے اور پچھلے مہاجرین و انصار پر اللہ تعالیٰ راضی ہوگیا اور وہ سب اللہ پر راضی ہو گئے۔ اور اللہ نے ان کے لئے ایسے سدا بہار باغ تیار کر رکھے ہیں جن کی سطح میں نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ مذکورہ بالا ہی تو ان کی عظیم کامیابی ہے۔

فتح مکہ کے بعد ایمان والے بھی حقے سچے مومن تھے:۔ ○ اس کے بعد ان صحابیوں کے ایمان کا سوال پیدا ہوتا ہے جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ بعض لوگ انہیں منافقانہ طور پر ایمان لانے والے قرار دیتے ہیں۔ فتح کے بعد والوں کا فیصلہ باری تعالیٰ نے سورۃ حدید میں بالفاظ ذیل کر رکھا ہے۔

○ **لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ط اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ط وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ** ○ ۵۷/۱۰

(مفہوم) (اے صحابہ رسولؐ) تم میں سے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے مال خرچ کیا اور جہاد کیا (وہ ان کے برابر نہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد کیا) ان کا درجہ ان لوگوں سے اعظم و افضل ہے جنہوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے (فتح سے قبل اور بعد مال خرچ کرنے والوں) سب کے ساتھ اچھی جزا کا وعدہ کر رکھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پورا باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو

○ آیت بالا کے الفاظ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى سے بصورت نصف النہار ثابت ہے کہ فتح مکہ کے بعد ایمان لانیوالوں کے بھی ایمان میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش موجود نہیں۔ البتہ ان کے درجے ان صحابہؓ سے کمتر ہیں جو فتح مکہ سے پہلے اس وقت ایمان لائے اور جہاد کیا جب ہر چہار طرف مصائب و آلام کے پہاڑ کھڑے ہوئے تھے۔ فتح و کامیابی ابھی بہت دور تھی یہ وہ مقدس صحابی تھے جو ہجرت جیسی عظیم ۔ ولدوز اور جگرپاش آزمائش میں ثابت قدم رہے۔ اس لیے ان کے مدارج ان لوگوں سے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ ہیں جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اس وقت اسلام قبول کیا جب فتح و کامرانی بصورت مشہود نمایاں ہوچکی تھی۔ اور ہرچہار طرف مسرت و انبساط کے ہفت قلزم ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔

آیت مجیدہ ۸/۷۵ کا آخری حصہ:- ○ آیت مجیدہ ۸/۷۵ کے ابتدائی حصے میں گزر چکا ہے۔ ہجرت اولیٰ کے بعد وقتاً فوقتاً ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچنے والے مہاجرین کے متعلق فیصلہ دیا گیا ہے کہ وہ بھی حقے سچے مومن تھے۔ اسی آیت مجیدہ ۸/۷۵ کے آخری الفاظ ذیل میں مہاجرین کے رحمی تعلقات کی بھی خبر دی گئی ہے کہ ان میں سے جو باہم رحمی رشتوں میں منسلک ہیں وہ رحمی رشتہ دار مہاجر غیر رحمی رشتہ دار مہاجروں کی نسبت اللہ کے قانون کتاب اللہ قرآن کریم کے غیر متبدل فیصلے کی رو سے ایک دوسرے کے بہتر ولی ہیں:-

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

○ اور مہاجرین میں سے جو آپس میں اصحاب ارحام ہیں (یعنی جو آپس میں رحمی رشتوں میں منسلک ہیں) وہ اللہ کی کتاب قرآن کریم (میں درج غیر متبدل فیصلے) کی رو سے ایک دوسرے کے بہتر ولی ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بہتر زیادہ جاننے والا ہے۔

○ باہمی رحمی تعلق کی رو سے باہمی ولایت کو اولیٰ (بہتر ولی) قرار دینے کے بعد آیت مجیدہ کا جو آخری جملہ آیا ہے اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بہت اچھی طرح خوب خوب جاننے والا ہے۔ تو اس جملہ میں بتایا گیا ہے کہ رحمی رشتہ داروں کے حق وارثت کا جو فیصلہ ماقبل ۱۱-۱۲/۴ میں دیا گیا ہے وہ صحیح صحیح علم کے مطابق ہے' سورہ احزاب کی آیت نمبر۶ میں بھی رحمی رشتہ داروں کو ایک دوسرے کے بہتر ولی ٹھہرا کر بتایا گیا ہے کہ یہ فیصلہ قرآن مجید میں ماقبل لکھا ہوا موجود ہے:-

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۗ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ○ ۳۳/۶= اور جو رحمی رشتہ والے ہیں (سگے والدین' سگے بیٹے بیٹیاں اور سگے بہن بھائی) وہ اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی رو سے ایک دوسرے کے بہتر ولی ہیں سوائے اس کے کہ تم اپنے (غیر رحمی) دوستوں کو خود جانے پہچانے طریقے کے مطابق (اپنی زندگی میں) کچھ دے دو۔ مذکورہ بالا (رحمی رشتہ داروں کے حقوق کا فیصلہ) اللہ کی کتاب (قرآن مجید ۱۱-۱۲/۴ میں) لکھا ہوا موجود ہے۔

○ آیت مجیدہ ۸/۷۵ کے آخری الفاظ میں اور سورہ احزاب کی آیت نمبر۳۳ کے الفاظ بالا میں قرآنی تقسیم وارثت کے فیصلہ کو محکم کر دیا گیا ہے کہ متوفی کا مال متروکہ غیر رحمی افراد میں تقسیم نہیں ہوگا۔ وصیت بھی رحمی افراد ہی کے لیے ہے کہ ان میں سے جو فرد اپنے حالات کے مطابق زیادہ مال کا مستحق ہو' متوفی اس کے لیے وصیت کر جائے۔

○كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۲/۱۸۰= تم میں سے جب کسی پر موت کا وقت آجائے تو تم پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اگر مال چھوڑ رہا ہو تو وہ اپنے والدین اور اقربین (یعنی اپنی حقیقی اولاد اور بہن بھائیوں) کے لیے معروف طریقے سے وصیت کر جائے (لکھ کر یا لکھوا کر گواہوں کے دستخط ثبت کروا جائے)۔

○ واضح رہے کہ ۴/۳۳ کے مطابق مرنے والا مالِ وارثت میں سے غیر رحمی افراد کو خود زندگی میں کچھ دے سکتا ہے۔ وصیت صرف رحمی افراد میں سے اس کے لیے ہے جو زیادہ مال کا حق دار ہو۔ متوفی صرف اسی کے لیے وصیت کر سکتا ہے۔ مثلاً" متوفی کے دو بیٹے ہیں ایک کو اس نے ایم اے کروا کر نوکر بھی کروادیا ہے اور اس کی شادی بھی کر دی ہے مگر دوسرا بیٹا ابھی چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ بڑے بھائی کی نسبت ایم۔ اے تک کی تعلیم کے' پھر ملازمت کے اور پھر شادی کے اخراجات کا فاضل حق دار ہے یعنی اسے بڑے بھائی کی نسبت اتنا مال زیادہ ملنا چاہیئے' جو اس پر خرچ ہو اور وہ بڑے بھائی کے برابر ہوسکے۔

۹ سُورَةُ التَّوْبَةِ
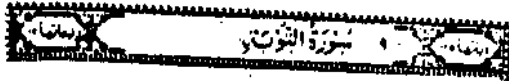
سورہ توبہ' سورہ انفال ہی کا حصہ ہے ○ واضح رہے کہ ۸/۷۵ پر سورہ انفال ختم ہوچکی ہے اس سے آگے سورہ توبہ شروع ہوتی ہے۔ اس کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم موجود نہیں ہے۔ جس سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ سورہ انفال ہی کا دوسرا حصہ ہے۔ کیونکہ پورے قرآن مجید کی باقی ۱۱۳ سورتوں کا انداز نزول یہ ہے کہ اگر سورۂ مجیدہ صرف تین آیتوں پر بھی مشتمل ہے۔ جیسے سورۂ کوثر' تو اسے بھی بسم اللہ شریف سے شروع کیا گیا ہے۔ اور صرف تین آیتوں کے خاتمہ پر جب اگلی سورت کا فرون شروع ہوئی ہے تو اسے بھی بسم اللہ شریف ہی سے شروع کیا گیا ہے۔

روایتی نظریہ ○ سورہ توبہ کے شروع میں بسم اللہ شریف کیوں نہیں؟ اس کے متعلق روایتی نظریہ یہ ہے کہ چونکہ اس سورۂ مجیدہ میں جدال و قتال' جنگ اور خونریزی کا ذکر ہے۔ اس لیے اس سورت کی پیشانی پر رحمٰن و رحیم کا نام نہیں لکھا گیا۔ کیونکہ جدال و قتال اس کی صفات رحمٰن و رحیم کے خلاف ہے۔ یہ نظریہ اس لیے غلط ہے کہ اگر بسم اللہ شریف کی عدم موجودگی کی وجہ' اس کے مندرجات میں جنگ و جدال کے مسائل ہوتے' تو سورہ انفال کی پیشانی پر بھی بسم اللہ شریف نہیں ہونی چاہیئے تھی کیونکہ سورۂ انفال بھی پوری کی پوری جنگ و جدال ہی کے احکامات سے معمور ہے۔

سورۂ انفال کے خاتمہ اور سورۂ توبہ کی ابتدا میں ربط ○ پس سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ شریف کی عدم موجودگی کی یہ وجہ ہے کہ یہ سورۂ انفال ہی کا دوسرا حصہ ہے۔ سورۂ انفال میں بھی جنگ کے احکامات اور تذکارِ جلیلہ ہیں اور اسی کے دوسرے حصہ سورہ توبہ میں بھی جنگ و قتال ہی کے احکام دیئے گئے ہیں۔ ان میں ربط کلام یہ ہے کہ سورۂ انفال کے اخیر پر ۸/۵۶ میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جن سے اسلامی حکومت کا صلح کا معاہدہ تھا۔ مگر انہوں نے اسے توڑ دیا۔ ۸/۵۶ میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تمہیں معاہدوں میں خیانت کی اجازت نہیں دی جاتی۔ تمہیں ان مشرکوں کی حرکتوں پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیئے جن سے تمہارا امن کا معاہدہ ہے پس اگر تمہیں ان کی طرف سے معاہدہ میں خیانت کا خطرہ محسوس ہو تو ان

کا عہد واپس لوٹا کر برابر ہو جایا کرو۔ اسی ربط کے مطابق سورہ انفال کے دوسرے حصہ یعنی سورۂ توبہ کے ابتدائی الفاظ میں عہد شکن مشرکوں سے بیزاری کا اعلان عام کیا گیا ہے:۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱

○ اللہ کی طرف سے اس کے رسولؐ کے ذریعہ مشرکوں کے لیے بیزاری ہے جن سے تم نے امن کا معاہدہ کیا (مگر انہوں نے توڑ دیا۔ اس لیے ان کا عہد انہیں واپس کیا جاتا ہے)

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

○ پس (اے وعدہ شکن مشرکو!) تم (حرمت کے) چار مہینے زمین میں چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ کافروں کو ذلیل و رسوا کرنیوالا ہے۔

○ قرآن کریم کے مرکزی نظام کی رو سے مکہ معظمہ میں ہر سال منعقد ہونے والی سالانہ عالمی حج کانفرنس کیلئے چار ماہ کے لیے پورے کرہ ارض پر جنگ بندی کا حکم ہے۔ حرمت والے چار مہینے رمضان' شوال' ذیقعد اور ذی الحجہ ہیں۔ اس جنگ بندی کی غرض یہ ہے کہ حج کانفرنس میں آنے والے حاجیوں کے لیے ہر چہار طرف کے راستے محفوظ و مامون ہو جائیں۔ حرمت والے مہینوں کی تفصیلی بحث ۹/۳۶ میں اپنے مقام پر آگے آرہی ہے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں تکرار تاکیدی کے طور پر عہد شکن مشرکوں سے پھر بیزاری اور اسلامی مرکز کے پورے طاقت ور ہونے کا اعلانِ عام کیا گیا ہے:۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳

○ اور اللہ کی طرف سے اس کے رسول کے ذریعے حج اکبر کے دن (فتح مکہ پر جو عظیم اجتماع موجود ہے اس میں) پوری نوع انسانی کیلئے اعلان عام کیا جاتا ہے کہ بلا شبہ.. اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ان مشرکوں سے بیزار ہے (جنہوں نے عہد توڑ دیا۔ اے عہد توڑنے والو!) پھر اگر تم توبہ کرو تو پھر وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو تو جانے رہو کہ بلا شبہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور (اے رسولؐ) انکار کرنے والوں کو شکست کے دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے گا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْــــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

○ سوائے ان مشرکوں کے جن سے تم نے امن کا معاہدہ کیا پھر انہوں نے تمہارے عہد میں کوئی کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلے پر (تمہارے دشمن) کسی ایک کی بھی مدد ہی کی (وہ مذکورہ بالا اعلان بیزاری سے مستثنیٰ ہیں) بس (ایمان والو) تم ان کا عہد ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ (عہد شکنی سے) بچنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

○ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ کے الفاظ میں اسلامی مرکز کے انتہائی طاقتور ہونے کی خبر دی گئی ہے کہ اسے مشرکین عاجز یعنی ہرگز مغلوب نہیں کرسکتے۔

نگاہِ بازگشت ○ سورہ انفال کی آیت نمبر۷۲ میں مہاجرین و انصار صحابۂ رسولؐ کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے' اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا۔ اور وہ بھی جنہوں نے مہاجرین کو ٹھکانہ دیا اور ان کی مدد کی وہ سب ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے لیکن ہجرت نہیں کی' ان کی اس وقت تک اہل مدینہ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ہجرت کرکے ان میں شامل نہ ہوجائیں۔ پھر اگر وہ دین کے لیے مدنی مہاجرین و انصار سے مدد مانگیں تو ان کے مرکزی نظام پر ان کی مدد کرنا فرض ہے' اس شرط پر کہ ان کا جھگڑا ان لوگوں کے ساتھ نہ ہو' جن کے ساتھ مرکز ملت کا صلح کا معاہدہ ہو۔ اگر ان کا تنازعہ ایسی قوم کے ساتھ ہو' جن کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہو تو پھر فوجی مدد کے بغیر' بات چیت کے ذریعہ ان کی مدد کی جائے گی۔

○ آیت نمبر۷۳ میں بتایا گیا ہے کہ کفار بھی ایک دوسرے کے دوست اور مدد گار ہیں ایمان والو ! تم نے اگر مذکورہ بالا ہدایت پر عمل نہ کیا تو زمین میں فتنہ برپا ہوگا' اور بہت بڑا فساد رونما ہو جائے گا۔ یعنی اگر غیر مہاجرین کے متحارب گروہ کے ساتھ مرکز ملت کا امن کا معاہدہ ہو تو مومنوں کی فوجی مدد کرنا معاہدہ امن کے خلاف ہے۔ ایسے میں اگر عسکری مدد کی جائے تو کفار سب مل کر بالمقابل آجائیں گے۔ اور اگر معاہدہ امن نہیں اور مدد نہ کی جائے تو کفار و مشرکین جو ایک دوسرے کے مددگار ہیں' اکٹھے ہو کر مکہ میں مقیم باقی مومنوں کا خاتمہ کردیں گے۔ پس دونوں صورتوں میں غیر مہاجرین کی مشروط جنگی مدد یا بذریعہ گفت و شنید مدد کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔

○ آیت نمبر۷۴ میں جملہ صحابۂ رسول مہاجرین و انصار کے متعلق بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے' اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا اور وہ لوگ بھی جنہوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ سب حقے سچے مومن ہیں۔ ان کے لیے بچاؤ کا سامان ہے اور عزت کی روٹی ہے یعنی وہ دنیا میں خلافت ارضی سے سرفراز کئے جائیں گے۔

○ آیت نمبر۷۵ میں بتایا گیا ہے کہ جن مہاجرین نے بعد میں ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ بھی پہلے ہجرت و جہاد کرنے والوں میں سے ہیں۔ یعنی وہ بھی حقے سچے مومن ہیں۔ اسی آیت مجیدہ کے آخری حصہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ مہاجرین میں سے جو باہم رحمی رشتوں میں منسلک ہیں وہ اللہ کی کتاب قرآن مجید کی رو سے ایک دوسرے کے بہتر ولی ہیں۔ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہے جو بلا شبہ ہر چیز کا پورا پورا اور صحیح صحیح علم رکھنے والا ہے۔

○ اس سے آگے سورہ انفال کا دوسرا حصہ سورہ توبہ شروع ہوتی ہے۔ جس کی آیت اول کا ربط سورہ انفال کی آیت نمبر ۵۶ تا ۵۸ کیساتھ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جن مشرکوں کے ساتھ تمہارا معاہدہ امن ہے اور بار بار معاہدہ کرکے توڑ دیتے ہیں' مومنوں کو کہا گیا ہے کہ تمہیں ان کے جواب میں معاہداتی خیانت کی اجازت نہیں۔ تمہیں ان کی حرکتوں پر گہری نگاہ رکھنی چاہئے۔ اگر تمہیں ان کی طرف سے معاہدہ میں خیانت کا خطرہ محسوس ہو تو ان کا عہد لوٹا کر برابر ہو جایا کرو۔ اسی ربط کے مطابق سورہ انفال کے دوسرے حصے یعنی سورہ توبہ کی آیت اول میں عہد شکن مشرکوں سے بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کے رسول کے ذریعہ ان مشرکوں سے بیزاری ہے جن سے (اے مومنو !) تم نے امن کا معاہدہ کیا۔ مگر انہوں نے توڑ دیا۔ اس لیے ان کا عہد انہیں واپس کیا جاتا ہے۔

○ سورہ توبہ کی آیت نمبر۲ میں عہد شکن مشرکوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ تم حرمت کے چار مہینے زمین میں چل پھر لو۔ اور جانے رہو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ذلیل و خوار کرنے والا ہے۔ وہ مومنوں کو فتح اور کافروں کو شکست دے گا۔

○ سورہ توبہ کی آیت نمبر۳ میں فتح مکہ کے عظیم اجتماع کے دن کا اعلان درج ہے کہ حج اکبر کے دن اللہ تعالیٰ کا اس کے رسولؐ کے ذریعہ پوری نوع انسانی کے لیے اعلان ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ ان مشرکوں سے بیزار ہے (جنہوں نے عہد توڑ دیا۔ اے عہد توڑنے والو !) پھر اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم روگردانی کرو تو جانے رہو کہ بلا شبہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں۔ (اے رسولؐ !) آپ انکار کرنے والوں کو شکست فاش کے دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے گا۔

○ سورہ توبہ کی آیت نمبر۴ میں استثنٰی بیان ہوئی ہے کہ جن مشرکوں سے امن کا معاہدہ ہوا اور انہوں نے معاہدہ نہ توڑا وہ اس بیزاری کے اعلان سے مستثنٰی ہیں۔ ان کا عہد مقررہ مدت تک پورا کیا جانا لازم ہے۔ یہی تقاضائے اتقاء ہے بلا شبہ اللہ تعالیٰ عہد شکنی سے بچنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

○ اس سے آگے آیت نمبر۵ میں عہد شکن مشرکوں کے متعلق اعلان عام کیا گیا ہے کہ جب حرمت کے چار مہینے گزر جائیں تو ان کے خلاف ملک گیر اقدام کیا جائے۔ وہ جہاں جہاں پائے جائیں گرفتار کیے جائیں اور اگر توبہ نہ کریں تو انہیں قتل تک کی بھی سزا دیجائے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	پھر (ایمان والو !) جب حرمت کے چار مہینے گزر جائیں تو (عہد شکن) مشرکوں کو قتل کرو جہاں بھی انہیں پاؤ۔ یعنی انہیں گرفتار کرو اور انہیں گھیر لو۔ اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ بیٹھو (تمام راستوں پر پہرے بٹھا دو) انہیں گھیر کو گرفتار کرو اور مرکز میں پہنچا دو تاکہ ان کے جرم کے مطابق قتل تک کی سزا دی جائے) پس اگر وہ شرک سے توبہ کریں اور صلوٰۃ قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ خالی کر دو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بچاؤ دینے والا مہربان ہے۔

شرک کی سزا قتل نہیں ہے ○ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر ان مشرکوں میں سے کوئی مشرک شرک سے توبہ نہیں کرتا مگر مرکز ملت کی وفاداری کا یقین دلاتا ہے۔ اور اے رسول سلام علیہ' اگر وہ آپ سے پناہ مانگتا ہے تو آپ اسے پناہ دیجئے گا۔ عہد شکن مشرک بار بار کی عہد شکنی کی بدولت واجب القتل ہیں' مشرک ہونے کی بدولت نہیں۔ آپ کے پناہ دینے کا اولین فائدہ یہ ہوگا کہ وہ آپ سے اللہ کا کلام سنے گا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتا پھر بھی واجب القتل نہیں۔ بلکہ اسے اس جگہ پر پہنچانا آپ کا ذمہ ہے جہاں وہ اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھتا ہو۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ﴿٦﴾

اور (اے رسول !) اگر ان مذکورہ مشرکوں میں سے کوئی مشرک (شرک پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت کا فرمانبردار ذمی بن کر رہنے کا یقین دلائے اور) آپ سے پناہ مانگے تو آپ اسے پناہ دے دیں' اس طرح وہ اللہ کا کلام سنے گا۔ پھر (بھی اگر وہ ایمان نہ لائے تو) آپ اسے اس کے امن کے مقام پر پہنچا دیں۔ (یہ لوگ قرآن سننے کے باوجود ایمان کیوں نہیں لاتے) یہ اس لیے ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جو حقائق کو نہیں جانتے۔

أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ کے الفاظ میں المشرکین کا الف لام عہدی ذکری ہے۔ مراد وہ مشرک ہیں جو بار بار کی عہد شکنی کی بدولت قرآنی ضابطے میں واجب القتل قرار دیئے گئے تھے۔ ان میں سے جو مشرک پناہ مانگے' اپنی حرکتوں سے تائب ہو جائے تو اسے پناہ دینا لازم ہے نیز واضح رہے کہ اس آیت مجیدہ کے مطابق اگر غیر ملکی مشرکوں سے کوئی مشرک جو اپنے ہی افراد کے ہاتھوں مظلوم ہوکر اسلامی حکومت میں آکر پناہ طلب کرے تو ایسے مظلوموں کو پناہ دینا بھی اسلامی حکومت پر فرض قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ اللہ کا کلام سنیں۔ لیکن اگر وہ قرآن سن کر بھی ایمان نہ لائیں تو پھر بھی وہ اہل اسلام کی پناہ میں ہیں۔ اور انہیں ان کے محفوظ مقام پر پہنچانا اہل اسلام کا قرآنی فریضہ ہے۔

عہد شکن مشرکوں کا اللہ و رسول کے ہاں کوئی عہد نہیں ہے ○ اگلی آیت مجیدہ میں عہد شکن مشرکوں کے متعلق تکرار تاکیدی کے طور پر وضاحت کی گئی ہے کہ جن مشرکوں سے تم نے مسجد حرام کی قریب معاہدہ امن کیا تھا وہ عہد پر قائم ہیں۔ تم بھی عہد پر قائم ہو۔ باقی وہ مشرک جنہوں نے بار بار عہد کرکے توڑ دیا ہے' ان کے عہد کی' اللہ و رسول کے نزدیک ہرگز ہرگز کوئی قدرو قیمت نہیں ہے :-

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٧﴾

○ کس طرح ہوسکتا ہے (عہد شکن) مشرکوں کے لیے اللہ و رسول کے ہاں عہد (جبکہ وہ بار بار کیا ہوا عہد توڑ چکے ہیں ۸/۵۶) سوائے ان مشرکوں کے جن کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب عہد کیا۔ پس جو لوگ تمہارے لیے اپنے عہد پر قائم ہیں تم ان کے لیے اپنے عہد پر قائم رہو۔ بیشک اللہ تعالی عہد شکنی سے بچنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں پھر عہد شکن مشرکوں کے لیے تاکید مزید کے انداز سے ان کی عہد شکنی کی مزید وضاحت بالفاظ ذیل کی گئی ہے۔

كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ ﴿٨﴾

○ کس طرح ہوسکتا ہے (انکا عہد) جبکہ وہ تمہارے مقابلے پر (تمہارے دشمنوں کی مدد کرتے ہیں) نہ وہ قرابت کا لحاظ رکھتے ہیں نہ عہد کا۔ وہ تمہیں اپنے منہ کی باتوں کے ساتھ خوش کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اذہان منکر ہیں۔ اور ان میں سے اکثریت بد عہدوں کی ہے۔

○ آیت مجیدہ میں جو "إلاّ" کا لفظ آیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مشرکین مکہ تھے جو اسلامی مرکز کے ساتھ صلح کا عہد کرکے بار بار توڑ دیتے تھے۔ یہ مہاجر صحابہ رضی اللہ عنہم کے قرابت دار تھے۔ مشرکین کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تو ہیں مگر اس کے ساتھ اس کی ذات' صفات یا اس کے حکم میں غیروں کو شریک کرتے ہیں۔ نیز وہ کسی نبی کے امتی بھی کہلاتے ہیں۔ ان کے پاس سابقہ کتب میں سے اللہ تعالیٰ کی کوئی کتاب بھی ہوتی ہے جس کے احکام کو دنیا کے حقیر مال کے حصول کے لیے پس پشت پھینک دیتے ہیں چنانچہ مذکورہ بالا مشرکین کے متعلق اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے۔

اِشْتَرَوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۹

وہ (مشرک) اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچتے ہیں۔ پھر وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ (انہیں اپنا مفاد مطلوب ہوتا ہے) بیشک برا ہے جو وہ عمل کرتے ہیں۔

○ سورہ بقرہ میں آیا ہے **وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا** "۲/۴۱' اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو' زیادہ قیمت وصول کیا کرو۔ بلکہ ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے کہ تم میری آیتوں کو جتنی بھی قیمت پر بیچو گے وہ تھوڑی ہے' خواہ تم دنیا بھر کا مال بھی ان کی قیمت کے طور پر وصول کرلو۔ اس کی تفسیر آیت ذیل میں کر دی گئی ہے۔ **قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ** ۴/۷۷ اے رسول سلام علیہ! کہہ دیجئے کہ دنیا بھر کا مال بھی (آیات ربانی کے مقابلے پر) تھوڑا ہے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں مشرکین کے برے اعمال مذکورہ بالا کا تکرار تاکیدی کے طور پر پھر انہی الفاظ میں اعادہ کیا گیا ہے:-

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰

وہ (مشرک) کسی مومن کے بارے میں نہ قرابتداری کا لحاظ رکھتے ہیں نہ عہد کا۔ کیونکہ وہ حدوں کو پھاندنے والے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱

پھر اگر وہ (اتنی شدید مخالفت کے باوجود بھی) شرک سے توبہ کرلیں (ایمان لے آئیں) اور صلوٰۃ قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جاننے والی قوم کے لیے (جو یہ جانتی ہے کہ اسلام دینی بھائی چارہ' دینی اخوت قائم کرنے کا مدعی ہے)۔

○ **فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ** کے الفاظ میں دینی بھائی چارے کو نسبی بھائی چارے پر ترجیح دی گئی ہے۔ **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ** ۴۹/۱۰۔ اور دینی اخوت (بھائی بھائی ہونا) اجتماعی طور پر اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ مشروط ہے' واضح رہے کہ یہ اجتماعی نظام صلوٰۃ موقت سے شروع ہوتا ہے۔ جملہ مومنین مل کر حضور الٰہی میں دست بستہ حاضر ہوتے اور **اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ** ۱/۴ کا مشترکہ اقرار کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہم صرف تیری ہی فرمانبرداری کریں گے اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگیں گے۔ اس طرح وہ اجتماعی انداز کے ساتھ معاشرہ میں مل کر ایک دوسرے کے فائدوں کے

لیے سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ اور اپنے مال میں سے اللہ کا حصہ (زکوٰۃ) نکال کر معاشرہ کے کمزوروں کو ان کے قدموں پر کھڑا کرتے ہیں۔ اس طرح سب کے سب باہم اخوان فی الدین بن جاتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے دینی بھائی کا فائدہ مطلوب ہوتا ہے۔ ذاتی مفاد سے سب کے سب مبرّا اور منزّہ ہوتے ہیں۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں ان مشرکوں کے متعلق بھی جنہیں ۹/۷ میں قتل کی سزا سے یہ کہہ کر مستثنٰی قرار دیا گیا ہے کہ جو تمہارے لیے عہد پر قائم رہیں، تم ان کے عہد پر قائم رہو **فاستقاموالکم فاستقیموا لھم** ۹/۷ ذیل کا خصوصی حکم صادر کر دیا گیا ہے۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ⑫

اور اگر وہ (مشرک، جنہوں نے حلف وفاداری اٹھایا ہے) اپنے عہد کے بعد قسم توڑ دیں اور تمہارے دین کے بارے میں تمہیں طعنے دیں تو ان کفر کے اماموں (لیڈروں) سے جنگ کرو۔ بیشک ان کی کوئی قسم نہیں ہے (ان سے جنگ اس لیے کرو) تاکہ وہ عہد شکنی سے باز آجائیں۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ⑬

کیا تم اس قوم سے جنگ نہ کرو گے؟ (یعنی تمہیں اس قوم سے ضرور جنگ کرنی چاہیے) جنہوں نے اپنا عہد توڑ دیا اور جنہوں نے رسولؐ کو (مکہ مکرمہ سے) نکالنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور وہ وہی تو ہیں جنہوں نے تمہارے ساتھ (جنگ میں) پہل کی تھی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اگر تم مومن ہو تو (تمہیں ان سے ڈرنا نہیں چاہئے) کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ اسی سے ڈرا جائے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ⑭

تم ان سے لڑو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے انہیں شکست فاش کا عذاب دے گا۔ اور وہ (تمہارے ہاتھوں سے) انہیں رسوا کرے گا اور اللہ ان کے مقابلے پر (تمہارے ہی ہاتھوں سے) تمہاری مدد کرے گا۔ اور مومن قوم کے ذہنوں کو (تمہارے ہی ہاتھوں سے) ٹھنڈا کرے گا۔

اس آیت مجیدہ میں ہر سہ واؤعاطفہ کے ذریعے چونکہ:۔

يُخْزِهِمْ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ اور **يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ** کا عطف **يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ** کے جملے پر ہے۔ اس لیے عربی متن کے سامنے اردو ترجمہ میں ہر سہ جملہ کے ساتھ الفاظ "تمہارے ہاتھوں سے" بتکرار لائے گئے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرما دی ہے کہ وہ وعدہ شکن مشرکوں کو:۔

۱۔ تمہارے ہاتھوں سے شکست کا عذاب دے گا۔

۲۔ تمہارے ہی ہاتھوں سے انہیں رسوا کرے گا۔

۳۔ تمہارے ہی ہاتھوں سے ان کے مقابلے پر تمہاری مدد کرے گا۔

۴۔ تمہارے ہی ہاتھوں سے پوری مومن قوم کے اذہان ٹھنڈے کرے گا' جن کے مرد عورتوں بیاروں اور بوڑھوں تک کو انہوں نے دکھ دیئے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں ○ واضح رہے کہ آیت بالا زیر بحث ۹/۱۴ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت مبارکہ کی خبر دی ہے جس کا اعلان خود ۲۲/۴۰ میں بالفاظ ذیل فرما رکھا ہے:۔

○ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۲۲/۴۰ اور ضرور ضرور اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرے۔ اگر خود کچھ نہ کیا جائے اور صرف اس امید پر بیٹھے رہیں کہ خود اللہ تعالیٰ کافروں مشرکوں کے مقابلے پر مدد کرے گا۔ انہیں شکست کا عذاب پہنچائے گا اور ہمیں فتح نصیب فرمائے گا۔ تو قرآنی تعلیم کے مطابق یہ محض خام خیالی اور ایک مطلقاً" غلط عقیدہ ہے جو صدیوں سے اہل اسلام کے اذہان میں بٹھا دیا گیا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو صد فیصد ٹھیک ہوگا کہ اہل اسلام کو اقوام عالم میں ذلیل کرنے کے لیے انہیں اس غیر قرآنی عقیدے کی افیون پلا دی گئی ہے کہ ہمیں نہ اسلحے کی ضرورت ہے نہ سامان رسل و رسائل کی۔ ہماری فتح کے لیے صرف' اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد کافی ہے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جس کا آیت زیر نظر میں اعلان کر دیا گیا ہے۔

○ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ ۹/۱۴ = اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو تمہارے ہی ہاتھوں (یعنی تمہارے ہی زور بازو) سے شکست کا عذاب دے گا اور تمہارے ہی ہاتھوں (یعنی تمہارے ہی زور بازو) کے ذریعہ انہیں رسوا کرے گا۔ اور تمہارے ہی ہاتھوں (یعنی تمہارے اپنے ہی زور بازو) کے ذریعہ تمہاری مدد فرمائے گا۔

کاش کہ ○ اگر علماء کرام مسلمانوں کے اذہان میں یہ قرآنی اٹل قاعدہ کلیہ محفوظ کردیں:۔ **وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ** ۲۲/۴۰ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود کرے' تو اس قوم کی بگڑی بن جائے' جو خود ان کے اپنے ہی ہاتھوں سے یعنی خود ان کے اپنے زور بازو ہی سے بن سکتی ہے یہی قوموں کی ترقی کا مرکزی نقطہ ہے' جس کا آیات مقدسہ ۹/۱۴ اور ۲۲/۴۰ میں بانگِ دہل اعلان کر دیا گیا ہے۔ اس قرآنی حکم کے خلاف نہ آج تک ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۹/۱۴ کی اس طرح تفسیر کی گئی ہے:۔

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۚ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾	اور (اللہ تعالیٰ اس طرح تمہارے زور بازو کے ذریعہ مشرکوں کو شکست دیکر) ان کے (یعنی مومن قوم کے) اذہان کے غیظ و غضب کو لے جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم پر رجوع برحمت ہوتا ہے' جو اس کی رحمت کو اپنے زور بازو کے ساتھ خود چاہتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑھ کر جاننے والا اور صاحب حکمت ہے۔

○ اس آیت کے شروع میں بھی واوٗ عاطفہ ہے۔ اس لیے مومن قوم کے اذہان کے غیظ و غضب کا ٹھنڈا ہونا خود ان کے زور بازو کا مرہون منت ہے کہ جب تک یہ اپنے زور بازو سے دشمنوں کو شکست دے کر ذلیل و رسوا نہ کریں گے اس

وقت تک ان مومنوں کے اذہان کا غم و غصہ دور نہیں ہو سکتا جن پر انہوں نے بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔

وَيَتُوبُ اللّٰهُ میں آمدہ واؤ اظہار حقیقت کے لیے آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رجوع برحمت ہوتا ہے جو خود حصول رحمت والے کام کرتے ہیں۔

يَتُوبُ اللّٰهُ میں یتوب کا لفظ تاب یتوب سے ہے۔ یہ مادہ جب بندوں کے لیے استعمال ہو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے جرائم سے توبہ کرنا' آئندہ کے لیے ان سے باز رہنے کا عہد کرنا۔ اور جب یہ مادہ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے۔ "رجوع برحمت ہونا"۔

وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ میں فعل مضارع یشاء کا فاعل من ہے اللہ نہیں۔

○ **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ** کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب خوب جاننے والا ہے کہ کون سی قوم اپنی مدد آپ کرکے اللہ کی مدد اور اس کی رحمت کی مستحق ہے۔ اس لیے وہ کبھی بھی اس قوم کی مدد نہیں کرتا' جو اپنی مدد آپ نہ کرے۔ اور حکیمٌ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہر کام حکمت و دانائی کی اساس پر قائم ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ کی مدد و رحمت کے طلب گاروں پر لازم ہے کہ وہ بھی ہر کام کی تکمیل کے لیے حکمت' یعنی عقل و دانش ہی کو اساس بنایا کریں تاکہ کامیابی ان کے قدم چومنے کی مکلّف ہو جائے۔ فلہذا اسی اساس و بنیاد کے مطابق اگلی آیت مجیدہ میں صحابہ کرام کو مخاطب کرکے یہ ارشاد ہوا ہے:۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾	(اے صحابہ رسول) کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ تم بلا جہاد چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں کو ظاہر نہیں کیا جنہوں نے جہاد کیا۔ اور انہوں نے اللہ' اس کے رسولؐ اور مومنوں کے سوا کسی اور کو دوست نہیں بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پورا پورا باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کو دوغلی روش پسند نہیں ہے ○ اس آیت مجیدہ میں ایمان والوں کو دوغلی پالیسی سے منع کر دیا گیا ہے کہ یہ امر انتہائی ناپسندیدہ ہے کہ ایک طرف اللہ' اس کے رسول اور مومنوں کے ساتھ بھی دوستی ہو اور دوسری طرف انھی کے دشمنوں کے ساتھ بھی دوستانہ مراسم قائم کیے یا قائم رکھے جائیں۔ اس عنوان کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ جیسے کہ سورہ آل عمران میں **وَلِيْجَةً** کی بجائے **بِطَانَةً** کا لفظ لا کر اس مضمون کا ہر پہلو اجاگر کر دیا ہے:۔

○ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۗ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ** ○ ۳/۱۱۸

ایمان والو! تم اپنوں (یعنی مومنوں) کے سوا دوسروں کو رازدار نہ بنانا۔ (ان سے رازدارانہ دوستی نہ قائم کرنا۔ وہ تمہارے راز پاکر) تمہاری تباہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ انہیں وہ چیز پسند ہے جو تمہیں تکلیف دے۔ بلاشبہ ان کا بغض ان کے منہ کے الفاظ سے عیاں ہے اور جو کچھ ان کے ذہنوں نے چھپایا ہوا ہے۔ وہ اس سے بھی بہت بڑا ہے۔ اگر تم عقل سے کام

لیتے ہو تو ہم نے بلاشبہ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے تاکہ تم دشمن کے شر سے محفوظ رہو۔)

غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اور تجارتی معاہدات ○ اس آیت مجیدہ ۳/۱۱۸ میں غیر اقوام کو رازداری سے دور رکھنے کی تاکید کرکے باقی معاملات میں اجازت دے دی گئی ہے۔ مثلاً" سیاسی صلح کے معاہدات' جن کے توڑنے والوں کے لیے آیت مجیدہ ۸/۵۸ میں ان کا عہد واپس کرکے برابر ہو جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور بار بار کے عہد شکنوں کے متعلق ۹/۵ میں **فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ** کے الفاظ میں ان کی گھات میں بیٹھنے کا' پھر انہیں گرفتار کرنے کا اور پھر قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

○اسی طرح غیر مسلم قوموں یا غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ تجارتی معاہدات کی بھی اجازت ہے' اس احتیاط کے ساتھ کہ ان معاہدات کو راز دارانہ نہ بنایا جائے۔ کیونکہ رازداری کی صورت میں وہ کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے' جس میں اہل اسلام کو کسی بھی صورت میں نقصان پہنچایا جاسکتا ہو۔

مشرکوں کے جاسوس ○ اگلی آیت میں خبر دی گئی ہے کہ مشرکوں کے جاسوس مسلمانوں کی صورت میں اہل اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اتنے سرگرم مومن بن کر دکھاتے کہ مسجدیں تک تعمیر کرنی شروع کر دیتے تھے۔ اسی سورہ توبہ کی آیت نمبر ۹/۱۰۷ میں مسجد ضرار کا ذکر آیا ہے جو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے مشرکین منافقین نے بنائی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کو نبی اکرمؐ کے ہاتھوں سے گروا دیا تھا۔ آیت ذیل میں اسی چیز سے منع کیا گیا ہے کہ مشرکین منافقین کو مسجدیں تعمیر کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے:۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۱۷

نہیں لائق واسطے مشرکوں کے کہ وہ مسجدیں تعمیر کریں۔ وہ اپنے آپ پر کفر کے خود گواہ ہیں۔ وہی تو ہیں' جن کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

○ **وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ** سے دنیا کی آگ بھی مراد ہے اور آخرت کی بھی۔ دنیا کی آگ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ غلط معاشرے کی غلط بخشیوں کی بدولت حسد و بغض کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور آخرت کی آگ یہ ہے کہ اخروی زندگی میں انہیں ایسے گرم مقامات میں رکھا جائے گا۔ جن کی آب و ہوا اتنی گرم ہوگی کہ ہر طرف ایسی لوئیں ۵۶/۴۳ چلتی ہوں گی جو جلدوں کو جھلس کر رکھ دیں گی ۵۶/۴۔ گرمی کی شدت کی بدولت وہاں ٹھنڈا پانی معدوم ہو گا۔ پینے کو گرم پانی میسر آئے گا ۴۳/۵۶ اور گرم آب و ہوا ہی کی بدولت اس زمین میں تھوہر کے سوا کچھ پیدا نہ ہو گا ۵۶/۵۲' کھانے کو تھوہر اور پینے کو گرم پانی' نیز جلدوں کو جھلس دینے والی لوئیں' یہ ہے اخروی آگ جس میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے' جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں یعنی اس کی ذات ؛ صفات یا اس کے حکم میں اس کے مخلص بندوں نبیوں' صدیقوں' شہیدوں اور صالحین میں سے کسی کو شریک کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ایک دعا سکھائی ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی آگ کے عذاب سے بچانے کی التجا کی جاتی ہے:۔

○ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ ۲/۲۰۱ اے ہمارے نشوونما دینے والے ! ہمیں دنیا میں بھی حسنات (بھلائیاں) عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنٰت (بھلائیاں) عطا فرما اور ہمیں (دنیا و آخرت) کی آگ سے بچائے۔

○ واضح رہے کہ دعا اپنے آپ کو حصول مدعا کے لیے پوری پوری کوشش کرنے کی ذاتی تحریک ہوتی ہے۔ اب آیت بالا ۲/۲۰۱ میں اپنے آپ کو تحریک کی جاتی ہے کہ وہ ایسے اعمال بجا لائے گا' جن کی بدولت وہ دنیا کی آگ حسد' بغض اور باہمی تشتت و افتراق سے بھی پورا پورا محفوظ رہ سکے اور ایسے ہی اعمال صالح کی بدولت اخروی زندگی میں اخروی آگ سے محفوظ ہو جائے۔ کیونکہ دوسری زندگی میں اس زندگی کے اچھے برے اعمال ہی کا اچھا برا بدلہ ملنے والا ہے۔

اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ○ آیت بالا ۹/۱۷ میں مشرکوں کو ایک تو مسجدیں تعمیر کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور دوسرا ان کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ ان کے اعمال شرک کی بدولت ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال موجودہ دور میں یوں سمجھئے کہ ۱/۴ میں ہم سے اقرار کرایا گیا ہے:۔ **اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ** اے اللہ ! ہم تیری ہی فرمانبرداری کریں گے اور تجھ ہی سے مدد' مانگتے رہیں گے۔

اب دیکھئے کہ ○ ۱/۴ کے الفاظ میں ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم اطاعت و استعانت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور کسی کو ہرگز ہرگز شریک نہیں کریں گے تو اب مومن یعنی غیر مشرک وہ ہے جو اطاعت و استعانت میں کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائے۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے زندہ پیروں اور ان کے مرنے کے بعد ان کی قبروں کو حاجت روا مان رکھا ہے۔ اللہ کے ساتھ انہیں شریک گردان کر ان سے استعانت طلب کرتے' یعنی ان سے مدد اور مرادیں مانگتے ہیں۔ اور اس کے ضمن میں پیروں فقیروں کے مزاروں کی تعمیر اور نذروں نیازوں پر اربوں روپیہ خرچ کر چکے ہیں' جو مطلقاً" ضائع ہو چکا ہوا ہے۔ اور آئندہ بھی خرچ کرتے اور ضائع کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ اتنا بڑا عظیم عمل **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** کی فہرست میں شامل ہوتا چلا جا رہا ہے' کیونکہ مومنوں کے لیے ارشاد ہوا ہے **اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ** ○۳/۱۳۹۔ اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ ہم اربوں روپیہ مزاروں کی تعمیر' نذروں نیازوں اور ماہانہ و سالانہ عرسوں پر خرچ کرنے والے کرۂ ارض کے ہر خطے پر غالب نہیں بلکہ مغلوب ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ عظیم عمل ضائع ہو چکا ہے۔

واضح رہے کہ ○ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نذروں کے ٹیڈی پیسہ تک کو ان کے عالمی مرکز بیت اللہ شریف میں پہنچانے کا حکم دیا ہے مگر ہم نے قریہ قریہ اور بستی بستی لاکھوں کروڑوں خانقاہیں بنا کر نذروں کا اربوں روپیہ ان پر چڑھانا شروع کر رکھا ہے۔ اس لیے ہمارا اربوں روپیہ خرچ کرنے کا عمل ضائع ہو چکا ہے اور ہم کرۂ ارض پر غالب کی بجائے مغلوب ہو چکے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کے ضمن میں ارشاد فرمایا ہے:۔

○ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ ۸/۶۰۔اور (ایمان والو !) تم میں جتنی بھی استطاعت ہے' اس ساری کی ساری استطاعت کیساتھ اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے ہر آن فوجی قوت تیار کرتے رہو۔ خصوصا" (الخیل) ذرائع رسل و رسائل کی بہتات مہیا کرتے رہو۔ تم اس بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے رہو گے۔

لیکن ○ جب اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو جس پر عمل کرنے سے دشمن کا ہمیشہ کے لیے صرف مغلوب نہیں بلکہ لرزہ براندام رہنا لازم ہے پس پشت پھینک دیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو پوری مالی استطاعت کو جدید سے جدید اسلحہ کی تیاری پر خرچ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسے مزاروں کی تعمیر اور انہیں عطر و گلاب کے ساتھ غسل دینے اور ان پر نذریں نیازیں چڑھانے اور ماہانہ سالانہ عرس پر خرچ کرنا شروع کر دیا' تو ہمارا مال خرچ کرنے کا یہ عظیم عمل ضائع ہوگیا اور ہم مغلوب ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مالی استطاعت کا آخری نیڈی پیسہ تک فوجی قوت کی تیاری پر خرچ کرو۔ مگر ہم نے پیروں کے حکم پر عمل کرنا شروع کر دیا کہ لاؤ زیادہ سے زیادہ مال لاؤ تاکہ متوفی پیر صاحب کے مزار کی فلک بوس عمارت تیار ہوکر تمہیں' مدد مرادیں مانگنے کی آماجگاہ میسر آجائے۔ معاذ اللہ استغفراللہ !

○ واضح رہے کہ ہر مزار کے ساتھ ہی مسجد بھی تعمیر کی جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۱/۴ کی دن دہاڑے اس طرح تکذیب ہو رہی ہوتی ہے کہ مسجد میں نماز اللہ تعالیٰ کی پڑھی جاتی ہے۔ اور بیٹے مزاروں سے مانگے جاتے ہیں' حالانکہ ۱/۴ میں اقرار کرتے ہیں کہ عبادت بھی تیری ہی کریں گے اور بیٹے بھی تجھ ہی سے مانگیں گے اسی غیر قرآنی عمل کی روک تھام کے لیے فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ مشرکوں کو مسجدیں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں۔

مسجدیں تعمیر کرنے کا حق صرف انہیں حاصل ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں اقامت صلٰوۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کریں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے ہرگز نہ ڈرتے ہوں:۔ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ مسجدیں تعمیر کرنے کا حق صرف مومنوں کو حاصل ہے اور مومنوں کی نشانیاں بالفاظ ذیل نمایاں کرکے رکھ دی گئی ہیں:۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَن يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴿۱۸﴾	○سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ اللہ کی مسجدیں وہ تعمیر کرتے ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر' اور صلٰوۃ (اجتماعیت) قائم کی اور معاشرہ کے دبلوں کو فربہی دی۔ اور وہ ہرگز نہیں ڈرتے اللہ کے سوا کسی اور سے' پس یقیناً یہی لوگ ہیں جو ہدایت پانے والوں میں سے ہوئے۔

○ اس آیت مجیدہ میں جو مَسٰجِدَ اللّٰهِ کا مرکب اضافی تکرارا" لایا گیا ہے (اس سے پہلے آیت نمبر۱۷/۹ میں بھی مسجد اللہ کا مرکب گزر چکا ہے) اس تکرارِ تاکیدی میں بتایا گیا ہے کہ جن مسجدوں میں اجتماعی نظام قائم ہوتا ہے جس کی اولین فرض معاشرہ کے دبلوں کو فربہی دینا ہوتی ہے' یعنی معاشرہ کے گرے ہوئے افراد کو ان کے قدموں پر کھڑا کرنا' اس اجتماعی نظام کا

اولیں مقصد و مدعا ہوتا ہے۔ وہ ہیں اللہ کی مسجدیں

○ ایسی مسجدوں کو تعمیر کرنے والے مومن باللہ اور مومن بالیوم الآخرت ہیں۔ اس کے برعکس، جن مسجدوں میں اجتماعی نظام قائم کرنے کی بجائے انفرادیت کو ہوا دی جاتی ہے اور جنہیں امت میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کی غرض سے تعمیر کیا جاتا ہے وہ اللہ کی مسجدیں نہیں ہیں بلکہ وہ مساجد ضرار ہیں، جنہیں گرانے کا حکم ہے۔ نبی اکرمؐ کے ہاتھ سے ایسی مسجد ضرار گروا دی گئی تھی۔ ۹/۱۰۷

حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کی تعمیر میں لگے رہنا ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا بدل نہیں ہے:۔ آیتِ بالا میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مسجدیں تعمیر کرنے کا حق صرف مومنوں کو دیا گیا ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اگرچہ مسجدیں تعمیر کرنا ایک مومنانہ عمل ہے۔ لیکن اگلی آیت مجیدہ ۹/۱۹ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ صرف مسجدیں تعمیر کرنے کے ساتھ دنیوی اور اخروی سرخروئی وابستہ کر دینے اور ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور جہاد فی سبیل اللہ سے غافل ہو جانے سے احکامِ الٰہیہ کے تقاضے ہرگز پورے نہیں ہوتے۔ آیتِ ذیل میں مسجدوں میں سے بھی افضل ترین مسجد بیت الحرام کی تعمیر کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی حاجیوں کو پانی پلانے جیسے عمدہ عمل کو بھی ساتھ ہی رکھ لیا گیا ہے:۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑲

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کرتے رہنے (والوں) کو اس شخص کے برابر قرار دیدیا ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن (یعنی اس دنیا کی زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے دن) پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ (یہ دونوں) اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں (یعنی بے ٹھکانہ کام کرنے والوں) کو ہدایت یافتہ نہیں ٹھہراتا۔

○ اب غور فرمائیں کہ اس آیتِ مجیدہ میں کس طرح توہماتی نظریات و عقائد کی بیخ کنی کی گئی ہے جو یہ کہا جاتا ہے کہ جس نے مسجد بنا دی، اس کا گھر اللہ تعالیٰ نے جنت میں بنا دیا، جس نے حج کر لیا۔ اس کے ماقبل کے سارے گناہ معاف کر دیئے گئے۔ جس نے حاجیوں کو پانی پلایا وہ قیامت کو حوضِ کوثر سے پیاس بجھانے کا حقدار ہو گیا وغیرہ وغیرہ

○ آیت زیرِ نظر میں دنیوی اور اخروی سرخروئی کے لیے تین شرطیں قائم کی گئی ہیں:۔ اللہ پر ایمان لانا۔ یوم آخرت پر ایمان لانا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ اب ان ہر سہ کی جو ترتیب اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائی ہے، اس پر غور کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان ہر سہ شرائط میں پورے اعمالِ صالح کو، جن کے ساتھ دنیوی اور اخروی سرخروئی و کامیابی وابستہ ہے سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

۱۔ اللہ پر ایمان لانا ○ پہلا نمبر ہے اللہ پر ایمان لانے کا۔ مگر یاد رہے کہ کیا اس ایمان کا دائرہ یہیں تک محدود ہے کہ ہم تسلیم کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی واجب الوجود، موجود ہے اور بس۔ ہرگز نہیں۔ ایمان کا دوسرا نمبر اس امر کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہستی نے جو یوم آخرت، یوم حساب، یوم الدین مقرر کر رکھا ہے اس پر ایمان لانا لازم

ہے اس کے بغیر ایمان باللہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ایمان بالآخرت کی وضاحت سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی پانچ شرطیں بیان کی ہیں۔

۱۔ ایمان باللہ ۲۔ ایمان بالملائکہ ۳۔ ایمان بالکتب ۴۔ ایمان بالرسل اور ۵۔ ایمان بالآخرت ۴/۱۳۶

○ ان پانچ شروط کی الگ الگ تفصیل سورہ نساء کی تفسیر القرآن بالقرآن میں پیچھے گزر چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ ایمان بالآخرت ○ واضح رہے کہ مذکورہ بالا پانچوں شروط کا تعلق الگ الگ انسانی اعمال کے ساتھ ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ایمان بالملائکہ یہ ہے کہ جو کائناتی قوتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا فرمائی ہیں' ان سے زیادہ سے زیادہ خدمت لی جائے۔ ایمان بالکتب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ نازل کیا گیا ہے۔ اس کے ایک ایک حکم کی بجا آوری کی جائے۔ ایمان بالرسل یہ ہے کہ رسل و انبیاء کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے حصول کا ذریعہ تسلیم کیا جائے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے صد فی صد فرمانبردار اور احکامِ الٰہیہ کی تعمیلی صورت میں سب کو اسوۂ حسنہ مانا جائے۔ جس طرح انہوں نے اللہ کے ایک ایک حکم کی تعمیل فرمائی تھی۔ اسی طرح ہمیں بھی جملہ احکام باری تعالیٰ پر عمل کرنا ہے۔ صرف یہ نہیں کہ محض اس چیز پر ایمان لایا جائے کہ رسل انبیاء نیکو کار' صالحین اور کتاب اللہ کے پورے پورے فرمانبردار تھے۔

○ اسی طرح ایمان بالیوم الآخر یہ نہیں کہ ہم اس امر پر ایمان لے آئیں کہ اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کیلئے یوم آخر ضرور آنے والا ہے اور بس بلکہ ایمان بالآخرت یہ ہے کہ ہم برے اعمال سے کنارہ کش ہو کر نیک اعمال میں شبانہ روز مصروف ہو جائیں۔ بالفاظ دیگر ایمان بالیوم الاخرت یہ ہے کہ ہر آن قیامت کی جوابدہی کی تیاری میں لگے رہیں' شفاعت کفارہ اور پیروں مرشدوں کے دامن پکڑ کر جنت میں پہنچ جانے کے نظریہ پر تکیہ کرکے نیک اعمال سے بے اعتناء ہو جانا' ایمان بالیوم الآخرت کا عملاً" انکار ہے اور واضح رہے کہ زبان سے اقرار اور عمل سے انکار کی اللہ تعالیٰ کے ہاں ہرگز کوئی قیمت نہیں۔

۳۔ جہاد فی سبیل اللہ ○ آیتِ مجیدہ زیرِ بحث ۹/۱۹ میں صرف حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی تعمیر کرتے رہنے کو ایمان باللہ' ایمان بالیوم الآخر کے مقام پر نہ آنے کی وضاحت کے ساتھ ہی اعلان کر دیا ہے کہ یہ کام اگرچہ اعمال صالحہ ہیں مگر یہ جہاد فی سبیل اللہ کے مقام پر بھی نہیں آسکتے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ میں لفظ جہاد کا سہ حرفی مادہ ہے۔ ج۔ ہ۔ د وجہد۔ اس مادہ کا بنیادی معنی ہے پوری پوری کوشش کرنا۔ حصولِ مقصد کے لیے جان تک لڑا دینا۔ تو اب جب کہ سلسلہ ترتیب الٰہی میں پہلا نمبر ہے ایمان باللہ کا۔ دوسرا نمبر ہے ایمان بالآخرت کا تیسرا نمبر ہے جہاد فی سبیل اللہ کا۔ تو صاف ظاہر ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یومِ آخر کی جواب دہی کی تیاری میں اگر جان تک بھی لڑانی پڑے تو اس سے دریغ نہ کرنا ہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

جہادِ فی سبیل اللہ کی ایک شق ہے قتال فی سبیل اللہ ○ سورہ نساء میں ارشاد ہوا ہے:۔ **وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ**

هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۴/۷۵ اور ایمان والو) تمہیں کیا ہے کہ تم فی سبیل اللہ قتال نہ کرو گے' جب کہ کمزور کر دیئے گئے افراد میں سے مرد' عورتیں اور بچے (پکار پکار کر) کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لے کہ اس کے اہل' اس کے حکام ظالم ہیں (انہوں نے ہمیں ظلم کی چکی میں پیس رکھا ہے)

○ دیکھا آپ نے ! کہ مظلوموں کی مدد کے لیے جابر و ظالم قوموں کے پنجہ ظلم سے مظلوموں' مجبوروں اور مقہوروں کو رہائی دلانے کے لیے سر بکف میدانِ جہاد (میدانِ قتال) میں نکل آنا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ لیکن واضح رہے کہ:۔

۱۔ کوئی بھی قوم ظالموں سے مظلوم افراد کو اس وقت تک رہائی نہیں دلا سکتی جب تک اس میں اللہ تعالیٰ کے قطعی فیصلہ ۸/۶۰ کے مطابق ہر لحاظ سے مضبوط اور مستحکم فوجی قوت موجود نہ ہو اور:۔

۲۔ فوجی قوت اس وقت تک موجود نہیں ہو سکتی' جب تک ایک دیانت دار اور مستحکم مرکزی نظام کے ماتحت پوری قوم کی استطاعت کا آخری نیڑی پیسہ تک فوجی قوت کی تیاری کے لیے خرچ نہ کیا جائے اور:۔

۳۔ یہ چیز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرکزی نظام کے ماتحت داخلی طور پر جملہ افراد معاشرہ کو خوشحال' یعنی صاحبِ استطاعت نہ کر دیا گیا ہو۔

۴۔ مگر واضح رہے کہ کسی بھی معاشرہ کے تمام کے تمام افراد کو خوشحال اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ جب ریاست کے حکام و عمال ملک کے مال کو عوام کی امانت تسلیم کریں اور اس کے تصرف میں بد دیانتی' غصب و نہب' خویش نوازی اور اقرباء پروری جیسے عوام کش طور طریقوں سے صد فیصد کنارہ کش ہو جائیں۔

صحابہ کرامؓ نے مذکورہ بالا خاکے میں صد فیصد صحیح رنگ بھر کر دکھا دیا تھا ○ اگلی آیت مجیدہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف کرتے ہوئے مذکورہ بالا نقشہ کی خبر دی گئی ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ⑳	جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ (اللہ کی راہ میں) جہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے درجے بہت بلند ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

○ دیکھئے ! اللہ کی راہ میں مالوں اور جانوں کیساتھ جہاد کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں مراتب عظیم کے حامل اور کامیاب و کامران بتایا گیا ہے۔ اس میدانِ عمل کے اولین شہسوار صحابہ رسول تھے یہ آیتِ مجیدہ انہی کی عظمت شان کو اجاگر کرتی ہے اگلی دو آیات کریمات میں صحابہ رسول اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے لیے ذیل کی عظیم الشان خوشخبری دی گئی ہے:۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ㉑	ان (ہجرت کرنے والوں اور اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں) کو ان کا پروردگار اپنی طرف سے اپنی رحمت اپنی خوشنودی اور ان کے لیے دائمی نعمتوں والے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے۔

۹/۲۱

نَعِيمٌ مُّقِيمٌ کی قرآنی تفسیری جھلک سورہ واقعہ میں بالفاظ ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

○ **وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ○ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ○ فِىْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ○ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ○ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ○ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ○ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ○ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ** ○ ۲۷ تا ۵۶/۳۳ اور جو دائیں ہاتھ والے ہیں۔ کس شان کے ہیں دائیں ہاتھ والے؟ وہ بے خار بیری کے باغوں میں ہوں گے' اور تہ بہ تہ کیلوں والے باغوں میں۔ اور وہ لمبے سایوں میں ہوں گے اور بہتے پانی کے چشموں میں ہوں گے اور وہ ہر قسم کے بہت سے میووں والے باغوں میں ہوں گے' جو نہ کبھی ان سے قطع کیے جائیں گے اور نہ ممنوع قرار دیئے جائیں گے (یہ نعمتیں ان کے لیے دائمی ہونگی)۔ ان آیات کریمات میں **نَعِيمٌ مُّقِيمٌ** کے بدل کے طور پر نعماءِ جنت کے لیے **لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ** کے الفاظ آئے ہیں یعنی وہ نعمتیں دائمی ہوں گی جو نہ ان سے قطع کی جائیں گی اور نہ ان کے لیے کبھی بھی ممنوع قرار دی جائیں گی۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں انہی اللہ کی راہ میں ہجرت اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾	وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والے اور اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کرنے والے ان (دائمی نعمتوں والے باغوں) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کے لیے (ان کے اعمال کا) بہت بڑا بدلہ ہے

شان صحابہؓ ○ واضح رہے کہ سورہ انفال کی آیات نمبر ۶۲ تا ۶۴ اور ۷۲ تا ۷۵' اور آیات بالا سورہ توبہ کی ۲۰ تا ۲۲ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان ارفع و اعلیٰ کو نکھار کر بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ سب کے سب حقے سچے مومن تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے درجے بہت بلند ہیں۔ یہ وہ عظیم الشان ہستیاں تھیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت و خوشنودی کی بشارت دنیا ہی میں دی گئی تھی آیت مجیدہ ۹/۱۰۰ میں سب کے سب صحابۂ رسول کو ذیل کی بلند پایہ سند کے ساتھ نوازا گیا ہے اللہ ان سب پر راضی ہوگیا اور وہ سب کے سب اللہ پر راضی ہوگئے۔ **رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ** ۹/۱۰۰

○ اگلی آیت مجیدہ میں ایمان والوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کی بجائے کفر سے محبت کرتے ہوں تو تم انہیں بھی دوست ' (رازدار) نہ بنانا۔ اگر تم ان سے دوستی کرو گے تو تم بھی انہیں میں شمار ہو جاؤ گے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾	اے ایمان والو ! نہ بناتا تم اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو دوست اگر وہ ایمان کے مقابلے پر کفر کو پسند کرتے ہوں۔ اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے جو لوگ انہیں (اس حالت میں کہ وہ ایمان کے مقابلے پر کفر کو پسند کرتے ہوں) دوست بنائیں کے پس وہ ظالم ہوں گے۔

○ ۹/۲۳

○ اس سے اگلی آیت میں خود خاتم النبین ورحمتہ اللعالمین سلام علیہ کو حکم ہوا ہے کہ آپ ذیل کی قرآنی حقیقت کا اعلان کر دیجیے

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

(اے رسول !) کہہ دیجئے گا کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور (تمہارے) مال جنہیں تم کماتے ہو اور وہ تجارت (سوداگری) جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور تمہارے مکان (کوٹھیاں اور بلڈنگیں) جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہوں تو پھر انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فاسقوں یعنی حدیں پھاندنے والوں کو ہدایت یافتہ نہیں ٹھہراتا۔

○ آیت بالا میں ایک اہم اعلان کر دیا گیا ہے۔

جہاد سے جی چرانے والوں کے لیے غلامی کے عذاب کی بشارت ○ اس آیت ۹/۲۴ میں نبی اکرمؐ سے اعلان کروا دیا گیا ہے کہ اگر تمہیں جہاد کی نسبت تمہارے باپ' بیٹے' بھائی' بیویاں' مال' تجارت اور تمہاری کوٹھیاں اور بلڈنگیں زیادہ پیاری ہیں تو شکست اور غلامی کے عذاب کا انتظار کرو کہ آیا ہی چاہتا ہے جو فاسقوں کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیت میں جہاد کے مقابلے پر نسلی اور خونی رشتوں اور مال و دولت' تجارت اور اپنے گھروں سے محبت کرنے والوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی حدیں پھاندنے والے ہیں۔ اگرچہ وہ' زیادہ سے زیادہ بھی ذاتی مفاد حاصل کر رہے ہوں مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں ہدایت یافتہ نہیں ہیں' صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

○ **اٰبَآؤُكُمْ تا عَشِيْرَتُكُمْ** کے الفاظ میں اعلان کرایا گیا ہے کہ تمہارے باپ بیٹے' بھائی اور بیویاں فی سبیل اللہ جہاد میں مخارج نہیں ہونی چاہئے۔ مومن کی شان یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں خونی اور نسلی رشتے اس کی راہ نہ روک سکیں۔ مومن وہ ہے جو رستے کے ان بھاری پتھروں کو پھاندتا ہوا جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوکر اپنے ایمان کا ثبوت پیش کرے۔

○ اموال۔ اگر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مال کی ضرورت لاحق ہوجائے تو مومن وہ ہے جو ضرورت سے زائد سب کچھ بخوشی خاطر دے ڈالے۔

○ تجارۃ۔ جب جنگیں شروع ہوتی ہیں تو عموماً" ور آمدی برآمدی تجارت بند ہو جاتی ہے۔ مومن کی شان یہ نہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں کی جانے والی جنگ سے تجارت کو ترجیح دے۔ بلکہ لازم ہے کہ ذاتی مفاد پر قومی اور دینی مفاد کو مقدّم جانے۔ سچے ایمان کی یہی نشانی ہے۔

○ **مَسٰكِن**۔ یعنی گھروں کو جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں لانے سے عیاں ہے کہ مومنوں کو اپنے اپنے گھروں' عمارتوں اور بلڈنگوں کی نسبت جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ زیادہ محبت ہونی چاہئے۔ بالفاظ دیگر اگر جنگ کے ایام میں فوجی ضروریات کیلئے کسی شخص کی بلڈنگ کی ضرورت لاحق ہو جائے تو اسے بلا عذر دے دینی چاہئے۔ اس پر نہ اس کے دماغ میں

کوئی غبار آنے پائے نہ پیشانی پر بل۔ بصورت دیگر اسلامی حکومت ازروئے آیت بالا ہر اس بلڈنگ کو حاصل کرنے کی مجاز ہے جس کا فوجی ضروریات کے لیے حاصل کرنا لازم ہوجائے۔ تو اس طرح اسلامی حکومت اسے ہر حال میں حاصل کر سکتی ہے خواہ اس کا مکین بخوشی خاطر خالی کر دے یا شکن آلود پیشانی کے ساتھ۔ خندہ پیشانی یا ماتھے کے بل تو محض اس کے خالص یا ناخالص ایمان کے نشان ہوں گے۔ اور بس۔

صحابہؓ کیساتھ اللہ کی مدد ہمیشہ شاملِ حال رہی ○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں صحابہ کرام کی بشریت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ اگرچہ وہ بلند و بالا شانوں کے مالک تھے۔ مگر تھے بشر۔ سہو و نسیان اور بے ارادہ خطا سے ہرگز مبرّا نہیں تھے۔ جنگ احد کا ذکر پیچھے سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۲ تا ۱۶۵ میں گزر چکا ہے کہ صحابہؓ کے ایک گروہ سے غلطی ہوگئی جس کی بدولت دشمن نے اسلامی لشکر پر پیچھے کی طرف سے حملہ کر دیا۔ لیکن چونکہ ان کا یہ عمل ارادۃ" نہیں تھا بلکہ بشری تقاضوں کے مطابق محض سہوا" ایسا ہوا تھا۔ اس لیے انہیں اس دنیا میں ہی معاف کر دیا گیا ۱۵۲' ۱۵۵' ۱۵۹/۳ جنگ احد میں اگرچہ مسلمانوں کو شکست کا سامنا پڑا۔ مگر دشمن کے قدم مدینہ منورہ کی طرف نہ بڑھ سکے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد صحابہؓ کے شاملِ حال رہی اور دشمن آگے بڑھنے کی بجائے واپس لوٹ گیا۔ جنگ حنین میں بھی صحابہ کرام سے سہوا" کوتاہی ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بروقت ایسے مومنوں کے لشکر بھیج دیئے' جنہیں صحابہؓ نے اس سے پیشتر دیکھا نہیں تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ۝۲۵

(اے صحابہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا ہے خصوصا" حنین کے دن' جب تم اپنی کثرت تعداد پر خوش ہو رہے تھے۔ پھر (تمہاری سہو کی بدولت) تمہاری کثرت تمہارے کسی کام نہ آئی اور تم پر اپنی فراخی کے باوجود زمین تنگ ہوگئی (تم دشمن کے حملے کی شدت سے گھبرا گئے) پھر تم پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹ گئے۔

○ **وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ** کا یہ معنی غلط ہے کہ تم میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بلکہ اس کا صحیح معنی یہ ہے کہ تمہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور دشمن میدان میں آگے بڑھ آیا۔ پھر کیا ہوا؟

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ۝۲۶

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر (یعنی تم پر) اپنی تسکین نازل فرمائی' یعنی اس نے ایسے لشکر نازل کر دیے جنہیں تم نے (اس سے پہلے) نہیں دیکھا تھا۔ اس طرح اس نے کافروں کو شکست فاش کا عذاب دیا۔ حقیقت یہ کہ مذکورہ بالا (شکست ہی) کافروں کی جزا ہے۔

○ صحابہ رضی اللہ عنہ کی شان پر طعن دھرنے والے بعض لوگ آیت بالا میں آمدہ الفاظ و علی المومنین سے مراد صحابہؓ رسول نہیں لیتے۔ بلکہ نبی اکرمؐ کے خونی اور نسلی اقارب علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کو لیتے ہیں ہم نے یہ معنی لکھا ہے ! "پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی تسکین نازل فرمائی" جن مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی تسکین کا ... صحابہ رسول ہی تھے جنہیں پچھلی آیت مجیدہ ۹/۲۴ میں کہا گیا ہے :۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ ... اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ

شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ۹۔

غور فرمائیں کہ:۔ نَصَرَكُمْ کے جملہ میں كُمْ کی ضمیر جمع مخاطب کے ساتھ جنہیں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا ہے انہیں کے متعلق يَوْمَ حُنَيْنٍ کے الفاظ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ حنین کے دن بھی تمہاری مدد کی جاچکی ہے۔

○ نیز اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ کے الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ میدانِ حنین میں انہی کی مدد کی گئی تھی جو اس دن اپنی کثرت پر خوش ہو رہے تھے۔

○ اور ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ کے الفاظ میں مطلع کیا گیا ہے کہ مدد انہی کی کی گئی تھی جن پر میدان حنین میں زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی تھی فلھذا یہ نظریہ صد فیصد باطل ہے کہ آیت مجیدہ ۹/۲۵ کے الفاظ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ میں مومنین سے مراد صحابہ رسول نہیں' بلکہ آپ کے خاندان کے اقارب مراد ہیں۔ واضح رہے کہ ایسے نظریات شان صحابہ رضی اللہ عنہم کو داغدار کرنے کے لیے محض ایجادِ بندہ ہیں۔

جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا : وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا سے روایتی تفاسیر نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ میدانِ بدر اور میدانِ حنین میں رسول اکرم اور صحابہ کرام کی مدد کے لیے فرشتے بھیجے گئے تھے' جو دکھائی نہیں دیتے۔ جنگ بدر کے متعلق ایک ہزار ملائکہ ۸/۹ اور تین ہزار ملائکہ ۳/۱۲۴ کے نزول کی خبر دی گئی ہے۔ ان آیات کریمات کا صحیح مفہوم تفسیر القرآن بالقرآن میں اپنے اپنے مقامات پر گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں صرف اتنا عرض کیا جاتا ہے کہ ملائکہ بمعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ قوتیں ہیں جن میں سے تسکین قلب بھی ایک قوت ہے جو مجاہدوں کو ثابت قدم کرتی اور ثابت قدم رکھتی ہے۔

○ اگر بفرضِ محال جنگ بدر میں ایک ہزار یا تین ہزار نہ دکھائی دینے والے مسلح مجاہدوں کی کمک تسلیم کی جائے تو پھر جنگ بدر کی فتح کا سہرا تین ہزار فرشتوں کے سر پر بندھتا ہے بدری صحابہ کے سر پر نہیں بندھ سکتا۔ دوسرا یہ کہ اگر جنگ بدر ۳۱۳ بدری صحابہ نے تین ہزار نہ دکھائی دینے والے مسلح مجاہدوں (فرشتوں) کی مدد سے جیتی تھی تو ۳۱۳ کی قلت نہ رہی بلکہ وہ ۳۳۱۳ کی کثرت بن گئی۔ پھر قرآن کریم کا ذیل کا مقولہ جنگ بدر کی فتح پر صادق نہیں آسکتا۔

○ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۲/۲۴۹ بہت سے چھوٹے لشکر بڑے لشکر پر اللہ کے قانون (ثبات قدمی) کے ساتھ غالب آتے ہیں۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۲/۲۴۹ کیونکہ اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کیساتھ ہے۔ پس نزول ملائکہ سے مراد نہ دکھائی دینے والے مسلح سپاہی نہیں۔ بلکہ تسکین قلب کی الٰہی قوتیں ہیں جو دشمن کے شدید سے شدید حملوں کے وقت بھی اسلامی مجاہدوں کو ثابت قدم رکھتی ہیں۔

○ یہاں آیت نمبر ۹/۲۶ میں جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا سے مراد وہ مسلح مومن ہیں جو میدانِ حنین میں عین اس وقت پہنچ گئے جب اسلامی لشکر کی طرف سے اپنی کثرت کے زعم میں سستی ہوگئی اور دشمن کے شدید حملہ کی بدولت انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ مگر دشمن کے کچھ لوگ پچھلی طرف بھی متعین تھے۔ اس طرح ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ کا نقشہ نمودار ہوگیا

کہ اسلامی لشکر کے لیے زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہو گئی۔ ان پر دو طرفہ حملہ ہوا۔ مگر فتح مکہ کی خبر پا کر کچھ مسلح مومن جو نبی اکرمؐ کی خدمت میں آ رہے تھے۔ بروقت پہنچ گئے۔ (بروقت پہنچ جانے کی اہمیت کے اظہار کے لیے انزال کا صیغہ استعمال ہوتا ہے) جب انہوں نے آتے ہی میدان حنین کا نقشہ دیکھا تو لشکر کفار پر ٹوٹ پڑے۔ ادھر صحابہ کا لشکر پیچھے ہٹ کر قدم جما چکا تھا' چنانچہ بروقت پہنچنے والے مجاہدوں اور لشکرِ صحابہ نے مل کر دشمن کی طاقت کا آخری شمہ تک ختم کر دیا۔ یہ تھی اللہ تعالیٰ کی مدد۔ پیچھے سورہ انفال میں خود نبی اکرمؐ کی مدد کے ضمن میں یہ الفاظ گزر چکے ہیں۔

○ هُوَالَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِہٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۸/۶۲ (اے رسول! اللہ ہی) وہ ہے جس نے اپنی مدد یعنی مومنین (جماعت صحابہؓ) کے ساتھ آپ کو تقویت پہنچائی۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی مدد اسباب ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔ نبی اکرمؐ کی مدد صحابہ کرام کی طاقت ور اور ثابت قدم جماعت کے ساتھ کی گئی تھی۔ ۸/۶۲ اور میدان حنین میں صحابہ کی مدد مسلح مومنوں کے ساتھ فرمائی گئی۔

○ اب رہا یہ سوال کہ مذکورہ مسلح مومنوں کو جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡھَا کیوں کہا گیا ہے۔ کہ صحابہ نے انہیں اس سے پہلے دیکھا نہیں تھا۔ یہ اس لیے کہ یہ وہ اعرابی' صحرائی' بدوی مومن تھے جن کے بعض افراد کسی کام سے مدینہ منورہ آئے اور آپؐ سے قرآن مجید سنا اور واپس جا کر اپنی اپنی قوم میں تبلیغ کر کے بہت سے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ سورہ احقاف میں آیا ہے۔

وَ اِذۡ صَرَفۡنَاۤ اِلَیۡکَ نَفَرًا مِّنَ الۡجِنِّ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوۡہُ قَالُوۡۤا اَنۡصِتُوۡا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوۡا اِلٰی قَوۡمِہِمۡ مُّنۡذِرِیۡنَ○ قَالُوۡا یٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا کِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ یَہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ وَ اِلٰی طَرِیۡقٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ○ ۴۶/۲۹' ۳۰ اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب (اے رسول!) ہم آپ کی طرف صحرائی (یہودیوں) کی ایک جماعت کو پھیر لائے۔ پھر جب وہ آپ کی مجلس درس قرآن میں حاضر ہوئے تو ایک دوسرے کو کہا کہ خاموشی کے ساتھ سنو۔ پھر جب درس قرآن ختم ہو گیا تو وہ انذار کرتے ہوئے اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی مصدق ہے۔ حق کی طرف یعنی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ جنّ بمعنی صحرائی یہودی کی مکمل اور مدلل بحث معہ لفظ جن کی مکمل تحقیق ادارہ کے شائع کردہ پمفلٹ "مسئلہ جنّ" میں ملاحظہ فرمائیں۔

○ عَذَّبَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا کے الفاظ میں نبی اکرمؐ کے دشمن کافروں جنہوں نے آپ کو مکہ معظمہ سے نکال دینے کے بعد آپ پر لشکر کشی کی۔ اور آخری مرتبہ فتح مکہ کے بعد میدان حنین میں حملہ آور ہوئے تھے' کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ اس طرح انہیں اللہ تعالیٰ نے شکست فاش کا عذاب دیا۔ وَ ذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ○ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے متوازن ضابطہِ حیات کا انکار کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔

توبہ کرنے والوں کیلئے اسلام کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں: اس سے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے

دشمنوں کی شکست فاش کی خبر دینے کے بعد یہ بتایا گیا ہے' اگرچہ یہ حنین کے حملہ آور وہی لوگ تھے۔ جنہوں نے آپؐ کو پے درپے اذیتیں پہنچائیں۔ گھر سے نکالا اور اس کے بعد بھی بار بار آپؐ پر حملہ آور ہوتے رہے۔ بلکہ یوم حنین تک جارحانہ حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر اس کے باوجود ان میں سے جو لوگ بصمیم قلب ایمان لائے اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر متبدل قانون رحمت کے مطابق انہیں معاف کر دیا۔ وہ بڑھ کر معاف کرنے والا مہربان ہے۔

ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۹/۲۷ پھر اللہ تعالیٰ اس کے بعد (یعنی انہیں شکست فاش کا عذاب چکھانے کے بعد) اپنے قانون مشیت کے مطابق ان کی طرف رجوع برحمت ہوا (یعنی ان میں سے ان کو معاف کر دیا جو توبہ کرکے) خود اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خواہاں ہوئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بڑھ کر معاف کرنے والا مہربان ہے۔

○ اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ انسان خواہ سرکشی و طغیانی میں کس حد تک پہنچ چکا ہو۔ مگر وہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونیوالوں کی طرح جب بھی نادم ہو جائے اور اپنی اصلاح کرلے تو اسلام کا در رحمت اس کے لیے ہروقت کھلا ہے۔ بشرطیکہ وہ خالص توبہ کرے۔ جس کی نشانی **مَنْ تَابَ وَ اَصْلَحَ** ۷/۱۵۳ کے مطابق یہ ہے کہ آئندہ کے لیے اپنی پوری پوری اصلاح کرلے یعنی سابقہ جرائم کا آخری دم تک مرتکب نہ ہو۔

نگاہ بازگشت. جنگ حنین کے دن' جب تم اپنی کثرت تعداد پر خوش ہو رہے تھے۔ (پھر تمہاری سہو کی بدولت) تمہاری اکثریت تمہارے کسی کام نہ آئی اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی۔ (تم دشمن کے حملے کی شدت سے گھبرا گئے) اور پیٹھ پھیر کر اپنے مقام سے پیچھے ہٹ گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سلام علیہ اور مومنوں (تم) پر اپنی تسکین نازل فرمائی۔ یعنی ایسے لشکر نازل کر دیئے جنہیں تم نے (اس سے پہلے) نہیں دیکھا تھا۔ دور دراز کا مومن لشکر فتح مکہ کی خوشی میں شامل ہونے کے لیے آرہا تھا' جو بروقت پہنچ گیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں صحابہ نے دیکھا ہوا نہیں تھا۔ چنانچہ کافروں کو شکست ہوئی شکست ہی تو ان کی سزا ہے۔

○ آیت نمبر ۲۷ میں بتایا گیا ہے کہ کافروں کی اس شدید مخالفت کے باوجود ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اس آخری شکست کے بعد بھی اگر وہ نادم ہوکر تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اگرچہ یہ معرکہ حنین کے حملہ آور وہی لوگ تھے جنہوں نے نبی اکرم رحمتہ اللعالمین اور آپ کے مقدس صحابہؓ کو پے درپے اذیتیں پہنچائی تھیں۔ انہیں ان کے وطن مالوف مکہ معظمہ سے نکال دیا تھا اور اس کے بعد جب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ کو اسلامی نظام کا مرکز مقرر فرمایا تو پھر جنگ بدر' جنگ احد' جنگ احزاب وغیرہ کے پر آشوب معرکوں کے موجد بھی یہی تھے' جو بار بار جارحانہ صورت میں حملہ آور ہوتے رہے۔ حتی کہ جنگ حنین کی آگ بھڑکانے والے بھی یہی لوگ تھے۔ لیکن اس کے باوجود آیت محولہ بالا ۹/۲۷ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ جو کوئی بصدق قلب ایمان لے آئے اور تائب ہوکر اپنی اصلاح کر لے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔

○ پیچھے آیات مجیدہ ۹/۸'۱۰ میں دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مد مقابل ان کے قریبی ہی تھے۔ پھر وہ لوگ نبی اکرمؐ کے ساتھ صلح کے معاہدے کرکے بار بار توڑ دیتے اور دوبارہ سہ بارہ

جارحانہ انداز کے ساتھ چڑھ دوڑتے تھے اور بعضے نبی اکرمؐ کے دشمنوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ارشاد ہوا ہے۔ **كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً** ۹/۸۔ ان کا صلح کا کوئی معاہدہ کیسا ہے؟ جب کہ اگر وہ تمہارے خلاف تمہارے دشمنوں کی مدد کریں اور نہ قرابت داری کا لحاظ رکھیں نہ اپنے کئے ہوئے عہد کا۔۹/۱۰ میں ان کے متعلق کھلی خبر دی گئی ہے **لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً**" وہ ایسے ہیں کہ کسی بھی مومن کیلئے نہ قرابت کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ اپنے کئے ہوئے عہد کا۔

مشرکین نجس ہیں ○ آیت مجیدہ ۹/۲۸ کا تعلق ای سورت کی ابتدائی آیات کے ساتھ ہے جن میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سلام علیہ کے ذریعہ اعلان کرتا ہے کہ وہ مشرکوں سے بیزار ہے فتح مکہ سے پہلے' حج کے موقعہ پر انتظام مشرکوں ہی کے ہاتھ میں تھا جن کے متعلق پیچھے ۹/۱۹ میں خبر دی گئی ہے کہ ان کی صلوٰۃ مسجد حرام میں صرف تالیاں اور سیٹیاں بجانا تھی۔ وہ لوگ مسجد حرام کے متولی بن کر لوگوں سے نذروں نیازوں کے مال وصول کرکے بڑے بڑے سرمایہ دار بن چکے تھے۔ ای سرمایہ کے ساتھ وہ حج کا انتظام کرتے تھے لیکن فتح مکہ کے بعد کے لیے مومنوں کو مخاطب کرکے اعلان عام کر دیا گیا' کہ خبردار ! آئندہ کے لیے مشرک مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

ایمان والو ! سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ مشرک ناپاک (متعصب) ہیں پس وہ اس سال (فتح مکہ) کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں اور اگر تمہیں اقتصادی کمزوری کا خوف رہے (تو اپنے ہی وسائل پر انحصار رکھو) پھر اللہ تعالیٰ اپنے قانون مشیت کے مطابق تمہیں غنی کر دیگا۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ بڑھ کر جاننے والا صاحب حکمت ہے۔

○ نجس کا سہ حرفی مادہ ن-ج-س= نجس ہے۔ اس کا بنیادی معنی ہے ناپاک و پلید ہونا۔ مجازی طور پر یہ لفظ ہٹ دھری اور تعصب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ حقائق کو معلوم کر چکنے کے باوجود ان پر ایمان نہ لائیں انہیں نجس یعنی ہٹ دھرم و متعصب کہا جاتا ہے۔ عربی ادب میں **دَآءٌ نَجَسٌ** اس بیماری کو کہتے ہیں' جس سے شفا نصیب نہ ہو۔ چنانچہ تعصب و ہٹ دھری بھی وہ بیماری ہے جس سے متعصب (نجس) لوگوں کو شفا نصیب نہیں ہوتی۔

○ **بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا** کا لفظی ترجمہ ہے "ان کے اس سال کے بعد" یہ وہ سال تھا جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا۔ اس سے پہلے کعبہ مکرمہ کی تولیت مشرکوں کے قبضہ میں تھی' جو فتح مکہ کے بعد مومنوں کے قبضہ اقتدار میں آئی۔ مشرکوں نے کعبہ شریف کو محض زیارت کا ایک استھان بنا رکھا تھا اسے اپنی پیشوائیت کی گدی کے طور پر استعمال کرتے اور عوام سے نذریں نیازیں وصول کیا کرتے تھے۔

○ **عَيْلَةً** کا سہ حرفی مادہ ع-ی-ل = عیل ہے۔ اس کا بنیادی معنی ہے کسی بوجھ کے نیچے دب جانا۔ عیال کا معنی ہے بہت سی اولاد لڑکے لڑکیاں اور عائل کہتے ہیں اس شخص کو جو بہت سی اولاد کے اخراجات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا اور نبی اکرمؐ نے ایک آزاد خود مختار قرآنی سلطنت قائم کی تو اس وقت آپ عوام کی ضروریات زندگی کے بوجھ تلے دب گئے۔ چنانچہ سورہ الضحیٰ میں رسول اکرم خاتم النبین کو مخاطب کرکے یہی وقت یاد دلایا گیا ہے۔

○ **وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى** ۹۳/۸= اور اے رسولؐ آپ کو اللہ تعالیٰ نے عائل (عوام کی ضروریات زندگی کے

بوجھ تلے دبا ہوا پایا۔ پھر اس نے آپ کو غنی کر دیا۔ آیت زیر بحث ۹/۲۹ میں اسی چیز کی خبر دی گئی ہے کہ اگر تمہیں اقتصادی کمزوری (عیلۃ) کا خوف ہو تو پھر بھی مشرکوں کو اس لیے مسجد حرام کے قریب نہ آنے دینا کہ ان کے مال سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں غنی کر دے گا۔ اب دیکھئے کہ اس درمیانی اور عبوری دور میں اپنے ہی وسائل پر انحصار کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

اپنے مسائل کو اپنے ہی وسائل کیساتھ حل کرنا ہی کلید کامیابی ہے ○ جو چھوٹی حکومتیں بڑی حکومتوں سے قرضے لیتی ہیں۔ وہ قرض خواہ ممالک کے خونی پنجوں سے نکل نہیں سکتیں۔ پچھلے قرضے معہ سود ابھی ادا نہیں کر پاتیں کہ مزید قرضے سر چڑھانے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔ آیت بالا میں اس شیطانی چکر سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کا واحد حل یہی ہے کہ عبوری دور کے لیے اپنے ہی وسائل کے ساتھ اپنے مسائل حل کئے جائیں' تاآنکہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو جائیں۔

○ **یُغْنِیْکُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ** کے جملہ میں اِنْ شَآءَ کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حکومت کو اپنے فضل سے اس وقت ہی غنی کرتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے قانون مشیت کے مطابق عمل کرتی ہے۔ جیسے کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد اقتصادی کمزوری کے باوجود مشرکوں کے مال سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ اپنے جملہ مسائل اپنے ہی وسائل کے ساتھ حل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اب اگر اس حکم کے بعد بھی مشرکوں کے ساتھ دوستی گانٹھی جائے اور اپنے مسائل کو ان کے وسائل کے ساتھ حل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ایسی قوم پر اپنا فضل کرے گا اور نہ اسے غنی کرے گا۔ وہ غیروں ہی کی محتاج رہے گی۔

○ اِنْ شَآءَ میں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت مشروط ہے یہ اس کا قانونِ مشیت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر ہم اس کے قانونِ مشیت کے خلاف عمل کرتے رہیں تو وہ پھر بھی ہم پر اپنا فضل کرکے غنی کر دے گا بلکہ اس کا مطلب و مفہوم بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شَآءَ (مشیت) مشروط ہے۔ اگر اس کی مشیت پر عمل کیا جائے گا تو جزا کا ظہور ہوگا۔ تب اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے غنی کرے گا۔ بصورت دیگر قرضوں پر انحصار کرنے والے مشرکوں کے قرضوں ہی کے نیچے دبتے چلے جائیں گے۔ اور بس فلہذا جو حکومت خود اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے وہ قرضوں کے ابلیسی چکر سے نکل کر اپنے ہی وسائل کے ساتھ اپنے مسائل حل کرے۔ اللہ تعالیٰ اسے غنی کر دے گا۔

○ **اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ** آیت زیر بحث ۹/۲۸ کا آخری جملہ ہے۔ جس میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ آیت مجیدہ میں جو مندرجہ ذیل حکم دیئے گئے ہیں کہ مشرکوں کو مسجد حرام کے قریب نہ آنے دینا۔ اقتصادی کمزوری لاحق ہو تو پھر بھی ان کی طرف رخ نہ کرنا۔ بلکہ عبوری دور کے لیے اپنے ہی وسائل تک محدود رہنا' یہ سب احکام علم و حکمت کے عین مطابق ہیں۔ اب ارباب عقل و دانش خود کرۂ ارض پر نگاہ دوڑا کر دیکھ سکتے ہیں کہ کیا وہ حکومتیں جو قرضوں کے ابلیسی چکر میں پھنسی ہوئی ہیں' ان کے اپنے قدموں پر کھڑے ہوکر بڑی طاقتوں کے برابر ہو جانے کی کوئی امید اس وقت تک کی جاسکتی ہے' جب تک کہ وہ مندرجہ بالا ربانی حکم کے مطابق اس ابلیسی دام فریب سے نکلنے کی خود کوشش نہ کریں اور اپنے مسائل کو اپنے ہی وسائل

کے ساتھ حل کرنے کے عبوری دور کو عزم و استقلال کے ساتھ طے کرتے ہوئے اپنے قدموں پر آپ کھڑا ہونے کی سعی مشکور نہ کریں۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جب تم عبوری دور کو طے کرکے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ تو پھر جو لوگ تمہارے مرکز پر ایمان نہ لائیں۔ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ یعنی اگر وہ اسلامی مرکز کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہوں تو ان سے اس وقت تک جنگ کرو کہ وہ اسلامی مرکز کی آزاد حکومت کو تسلیم کرکے اسلامی ریاست کے فرماں بردار شہری بن کر رہیں۔ اور جزیہ یعنی ریاستی ٹیکس بصمیم قلب ادا کیا کریں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

(ایمان والو!) ان سے لڑو (جن کی پہچان یہ ہے کہ) جو اللہ اور نتیجے کے دن پر (اسطرح) ایمان نہیں رکھتے (جس طرح تم رکھتے ہو ۲/۱۳۷) اور نہ وہ ان امور کو حرام ٹھہراتے ہیں جنہیں اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ حرام ٹھہرایا ہے (یہاں تک تو وہ لا اکراہ فی الدین ۲/۲۵۶ کے مطابق آزاد ہیں۔) مگر وہ (قرآنی ریاست کے اندر رہتے ہوئے قرآن کے) حق پر مبنی قانون کی اطاعت نہیں کرتے۔ ان میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے (ان ریاست میں رہنے والے یہود و نصاریٰ سے اس وقت تک لڑو) حتیٰ کہ وہ (اپنے مال و جان آبرو اور عبادت خانوں کی حفاظت کے عوض بصمیم قلب یعنی) دائیں ہاتھ کے ساتھ جزیہ (ٹیکس) ادا کیا کریں اور (اسلامی ریاست کے) وفادار بن کر رہیں۔ (انہیں کوئی کلیدی اسامی میسر نہیں آئے گی)

آیت مجیدہ ۹/۲۹ کو ایک معمہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے ○ روایتی تراجم میں اس آیت سے یہ تاثر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مطلق ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے جو اللہ اور قیامت کے دن کو نہیں مانتے۔ اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ اور رسولؐ نے حرام ٹھہرایا ہے اور اس طرح کافر کافر کہہ کر ہر کسی پر اس غرض کے لیے چڑھ دوڑنے کا جواز پیدا کیا گیا ہے کہ کافروں کو مسلمان بنایا جائے۔ یہ وہ غلط مفہوم ہے جس سے "پڑھ کلمہ' ورنہ سر اڑ جائے گا" کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

○ حالانکہ اس غلط تصور سے قرآن مجید میں تضاد پیدا ہوتا ہے اور اللہ کی پاک کتاب اقوام عالم میں مورد طعن تشنیع بن کر رہ جاتی ہے کہ ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی سختی نہیں **لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ** ۲/۲۵۶ اور دوسری طرف یہ کہتی ہے کہ جو لوگ اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے ان سے لڑو۔ واضح رہے کہ یہاں لڑنے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اللہ اور قیامت کو نہ مانتے ہوں۔ یہ آیت مجیدہ خصوصاً یہود و نصاریٰ سے متعلق ہے جو متن کے خط کشیدہ الفاظ **مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ** سے سورج کی طرح عیاں ہے اور لڑنے کی غرض **حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ** سے ثابت ہے کہ اس وقت تک لڑو کہ وہ جزیہ ادا کریں اور اسلامی ریاست کے وفادار بن کر رہیں۔ یعنی کافروں کو مسلمان بنانا

مقصود نہیں' بلکہ ریاستی امن قائم رکھنے کے لیے اقلیتوں کو اسلامی ریاست کا وفادار بنا کر رکھنا ہے۔ ان کے مال جان آبرو اور ان کے عبادت خانوں کی حفاظت قرآنی نظام کے ذمہ ہے اور وہ اس کے عوض جزیہ ادا کرتے ہیں۔ اب آیئے آیت مجیدہ کے الفاظ کی بالترتیب تفسیر کی طرف تاکہ الفاظ کی روشنی میں حقیقت مزید نکھر کر عیاں ہو جائے۔

اللہ اور قیامت پر اہل اسلام کی طرح ایمان نہ لانا یہود و نصاریٰ کی پہچان کے طور پر بیان ہوا ہے

○ **لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ** کے الفاظ جنگ کرنے کی شرط کے طور پر نہیں آئے بلکہ اہل کتاب کی پہچان کے طور پر آئے ہیں کہ وہ اللہ اور قیامت کو تمہاری طرح نہیں مانتے ۲/۱۳۷ تم اللہ کو ایک مانتے ہو مگر وہ تین خدا اور مسیح سلام علیہ و عزیز سلام علیہ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں ۹/۳۰ تم قیامت کی کامیابی کو اعمال پر منحصر کرتے ہو۔ وہ کفارہ کے قائل ہیں۔ المختصر! ان کا اللہ اور قیامت پر اہل اسلام سے مختلف ایمان ان کی پہچان کے لیے آیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے۔ لہذا ان سے جنگ کرو۔ وہ تو اللہ کو بھی مانتے ہیں اور قیامت کو بھی مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اہل اسلام کی طرح نہیں مانتے۔

اللہ نے اپنے احکام اپنے رسول سلام علیہ کے ذریعہ دیئے ہیں۔

○ **مَاحَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ** کا یہ معنی مطلقاً" غلط ہے کہ جو اللہ اور رسول سلام علیہ نے حرام کیا یا حرام ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اس طرح اللہ کے رسول اللہ کے حکم میں شریک ٹھہرتے ہیں۔ حالانکہ ارشاد باری ہے **وَّلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖۤ اَحَدًا**" ۱۸/۲۶۔ اور وہ (اللہ) اپنے حکم میں کسی ایک کو بھی شریک نہیں کرتا۔

○ واضح رہے کہ **اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ** کی درمیانی جلی لکھی ہوئی واؤ کا معنی ہے بذریعہ اور جملے کا مفہوم یہ ہے:۔

جو حرام ٹھہرایا اللہ نے اپنے رسول سلام علیہ کے ذریعہ۔ بات بڑی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جملہ احکام معہ احکام حلت و حرمت اپنے رسول سلام علیہ ہی کے ذریعہ پہنچائے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا قرآن مجید میں واؤ بمعنی بذریعہ کسی اور مقام پر بھی آیا ہے؟ ہاں:۔

اسی سورہ توبہ میں پیچھے گزر چکا ہے:۔ **وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖۤ..... اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَ رَسُوْلُہٗ** ۹/۳۔ اور اللہ کا اعلان ہے بذریعہ اس کے رسولؐ کے کہ بلا شبہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں۔ یہاں بھی من اللہ و رسولہٖ کی درمیانی جلی واؤ بمعنی بذریعہ ہے کیونکہ اعلان ایک ہے دو نہیں اور واحد اعلان اللہ تعالیٰ کا ہے جو اس نے اپنے رسول کے ذریعے کرایا اسلیئے یہاں واؤ کا معنی بذریعہ کے سوا اور کچھ لگ ہی نہیں سکتا۔

دین کے بارے میں ہر کسی کو مکمل آزادی ہے۔ ○ **لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ** ۲/۲۵۶' چونکہ محکم آیت ہے اس لیے ترجمہ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مذاہب کے جملہ افراد کو یہاں تک تو پوری آزادی ہے کہ اللہ اور قیامت کو اپنے عقیدہ کے مطابق مانتے رہیں۔ اسلامی حکومت کسی کو زبردستی حلقہ بگوش اسلام کرنے کی مجاز نہیں۔

واؤ بمعنی "دیگر"

وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ کی ابتدائی واؤ کا معنی لکھا گیا ہے مگر وہ حق پر مبنی قرآن کے ریاستی قانون کی اطاعت نہیں کرتے۔ یعنی وہ اپنی آزادی کی حدوں کو پھاند گئے ہیں۔ واؤ بمعنی "مگر" یا "لیکن" کے لیے آیت ذیل **يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ** ۴/۱۰۸۔ وہ (چھپ چھپ کر تجویزیں کرنے والے) لوگوں سے تو چھپ سکتے ہیں "مگر" اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر و موجود ہے۔

دین بمعنی قانون

آیت زیر بحث میں **دِيْنَ الْحَقِّ** کا معنی لکھا گیا ہے "حق پر مبنی قانون" دین بمعنی قانون سورہ یوسف میں آیا ہے **مَاكَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ** ۱۲/۷۶ وہ (یوسفؑ) اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے مطابق رکھ نہیں سکتا تھا۔ پس **وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ** کے قرآنی مفہوم کے مطابق اہل کتاب سے لڑنے کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ اور قیامت کو نہیں مانتے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ قرآنی ریاست کے حق بدوش ریاستی قانون کی اطاعت نہیں' بغاوت کرتے تھے۔

حتّٰی کے لفظ نے حقیقت نکھار کر رکھ دی ہے۔

○ **حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ** کا لفظی معنی یہ ہے: "حتیٰ کہ وہ دائیں ہاتھ سے جزیہ ادا کریں" اس جملے نے حقیقت کو نکھار کر رکھ دیا ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دے دیا گیا ہے جب تک وہ قرآنی ریاست کے فرمانبردار ہو کر جزیہ نہ ادا کریں یعنی لڑائی کی غرض انہیں ریاست کے وفادار بنانا ہے۔ تلوار کے ساتھ مسلمان بنانا نہیں اور بنوک سنگین کلمہ پڑھانا نہیں۔ کیونکہ عقیدہ کے لحاظ سے قرآن کریم کا اعلان عام ہے۔ **لَا اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ** ۲۵۶/۲ عقائد کی رو سے یہود و نصاریٰ' پارسی' مجوسی' ہندو سکھ وغیرہ کسی پر کسی قسم کا کوئی جبر روا نہیں۔

جزیہ' بدلہ ہے غیر مسلموں کے مال و جان عزت اور عبادت خانوں کی حفاظت کا ○ جزیہ کا لفظ جزا سے ہے جس کا معنی ہے بدلہ۔ اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلموں کے مال' جان عزت آبرو اور ان کے عبادت خانوں کی حفاظت اسلامی ریاست کے ذمہ ہے۔ اسلامی نظام صد فیصد مکلّف ہے کہ اس کے زیر سایہ غیر مسلم آباد رہیں۔ بڑھیں پھولیں انہیں مسلم عوام کے دوش بدوش جملہ ریاستی مراعات حاصل ہوں۔ انہیں پوری مذہبی آزادی میسر ہو۔ ان کے عبادت خانے ہیکل' گرجے' مندر اور گوردوارے مرکزی نظام کی حفاظت میں ہوں۔ اور اس ہمہ جہتی حفاظت کا بدلہ اس حفاظت کی جزا ہے۔

جزیہ اور غیر مسلموں کی طرف سے اس کی ادائیگی ان کی وفاداری کا' اور عدم ادائیگی بغاوت کا نشان ہے۔

جزیہ دائیں ہاتھ سے ادا کریں ○ **يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ** کا لفظی معنی یہ ہے کہ وہ لوگ اپنی ہمہ جہتی حفاظت کے عوض اسلامی نظام کی مقررہ رقم دائیں ہاتھ سے ادا کریں۔ دائیں ہاتھ سے ادا کرنا' بطور اصطلاح آیا ہے۔ جس کا معنی اور مفہوم ہے۔ بصمیم قلب جزیہ ادا کریں۔ اسے بوجھ اور گرانی نہ محسوس کریں اور جزیہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے ہمہ تن وفادار رہیں۔ چھپی غداری اور مخفی بغاوت نہ کریں۔

هُمْ صٰغِرُوْنَ ○ یہ بھی اصطلاح کے طور پر آیا ہے لفظ صٰغِرون کا سہ حرفی مادہ ص۔ غ۔ ر= صغر ہے' جس کا بنیادی معنی ہے چھوٹا ہونا۔ صغیر کا معنی ہے چھوٹا اور اصغر کا معنی ہے سب سے چھوٹا۔ پس **هُمْ صٰغِرُوْنَ** کا لفظی مفہوم تو یہ ہے کہ وہ اسلامی ریاست میں چھوٹے بن کر رہیں۔ مراد یہ کہ ریاست کے فرمانبردار وفادار رہیں۔ مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ مل کر مخفی بغاوتیں نہ پھیلائیں۔ نیز **هُمْ صٰغِرُوْنَ** کا ایک مفہوم یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں کوئی کلیدی آسامی نہیں دی جائے گی۔ یہ حکم عین مشاہدات کے مطابق ہے کہ غیر مسلموں کے مخفی جذبات غیر مسلموں ہی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ گواہ ہے کہ جب انہیں کوئی کلیدی آسامی میسر آتی ہے تو اس منصب سے غلط فائدہ اٹھا کر اسلامی ریاست کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ غیر مسلموں کی مخفیات تک سے واقف ہے اس لیے اس نے مذکورہ بالا حکم حفظ ماتقدم کے طور پر نافذ کر رکھا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ

○ آیت زیر نظر ۹/۲۹ میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے لڑنے کا حکم مذہبی اختلاف کی بنا پر نہیں دیا گیا' بلکہ انہیں اسلامی حکومت کا وفادار بنانے کے لیے دیا گیا ہے۔ ان کی وفاداری کا ظاہری نشان بتایا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ کے ساتھ جزیہ ادا کیا کریں۔ آیت مجیدہ میں جو الفاظ آئے ہیں **لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** کہ وہ اللہ اور قیامت پر (اس طرح) ایمان نہیں رکھتے) (جس طرح تم رکھتے ہو) اس ترجمہ میں جو الفاظ بریکٹوں میں بڑھائے گئے ہیں' ان کا ایک جواز تو ۲/۱۳۷ میں موجود ہے:۔

○ **فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا**۔ پس اگر (اہل کتاب یہود و نصاریٰ) اس کے ساتھ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم لائے ہو تو ہدایت پا جائیں۔ اور اس کا دوسرا جواز خود اگلی آیت مجیدہ میں درج ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے اللہ پر ایمان کی حالت یہ ہے کہ یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح' اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کا اللہ پر ایمان تمہارے جیسا نہیں:۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝	اور یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کی محض مونہوں کی بات ہے (اس میں مطلقاً کوئی حقیقت نہیں ہے)۔ وہ ان لوگوں کے قول کی مشابہت کرتے ہیں جنہوں نے ان سے پہلے (وحدت) کا انکار کیا تھا۔ اللہ انہیں ہلاک کرے۔ وہ کس طرف کو الٹے جا رہے ہیں۔

یہود و نصاریٰ نے غیر اللہ کو اپنے حاجت روا ٹھہرا لیا ہے ○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے رب بنا رکھا ہے۔ انہیں اپنے حاجت روا اور مشکل کشا ٹھہرا کر اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ	ان یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے علماء اور مشائخ کو بھی پکڑ رکھا ہے حاجت روا اللہ کے ساتھ' خصوصاً" مسیح ابن مریم کو (بھی حاجت روا بنا رکھا

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

ہے) حالانکہ وہ نہیں حکم کیے گئے مگر یہ کہ وہ فرمانبرداری کریں اکیلے الٰہ (اللہ تعالیٰ) کی۔ نہیں ہے کوئی بھی الٰہ مگر صرف وہی ہے۔ وہ اس شرک سے پاک ہے جو وہ (یہود و نصاریٰ اس کے ساتھ) کرتے ہیں۔

○ یہ ایک عالمی مشاہدہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے علماء و مشائخ کو ارباب بنا لیا ہوا ہے۔ رب کا لفظی معنی ہے پرورش کرنے والا۔ مشکل وقت میں کام آنے والا یہود و نصاریٰ اپنے بزرگوں سے غائبانہ مرادیں مانگتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے عالم اور پیر مشکلیں حل کر سکتے ہیں۔ العیاذ باللہ !

○ **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** کا معنی اللہ کے سوا بھی ہے اور اللہ کے ساتھ بھی۔ جیسے کہ یہ لوگ اللہ کو بھی حاجت روا مانتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے پیروں کو بھی۔

○ **مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا وَّاحِدًا**" کے الفاظ سے عیاں ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہرگز نہیں دیا گیا تھا کہ اپنے اپنے علماء و مشائخ اور مسیحؑ کو حاجت روا بنا کر ان کی عبودیت کریں۔ بلکہ حکم یہ دیا گیا تھا کہ اکیلے الٰہ اللہ تعالیٰ معبود حقیقی کی عبودیت اختیار کریں:

○ اگلی آیت مجیدہ ۹/۳۲ میں یہود و نصاریٰ کے متعلق خصوصاً" اور باقی منکرینِ ضابطہ باری تعالیٰ کے متعلق عموماً" ارشاد ہوا ہے کہ وہ لوگ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ اس اللہ کے نور' قرآنی قندیل راہ کو پھونکوں کے ساتھ بجھا دیں۔ مگر ان کے مقابلے پر اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل کرکے چھوڑے گا' خواہ اس ضابطے کا انکار کرنے والے اسے کتنا ہی ناپسند کرتے رہیں۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

(یہود و نصاریٰ) ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے نور (قرآن مجید' الٰہی ضابطہ حیات) کو اپنے مونہوں کی پھونکوں کے ساتھ بجھا دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نہیں مانتا سوائے اس کے کہ اپنے نور (قرآن مجید) کو مکمل کرکے رہے گا۔ اگرچہ (اس ضابطے) کا انکار کرنے والے اسے ناپسند کریں۔

قرآن نور ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ ○ اس آیت مجیدہ میں کفار یہود و نصاریٰ کے برے ارادوں کے اظہار کے علاوہ اس امر کا بھی اعلان کر دیا گیا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا نور ہے یہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے روشنی کا مینار ہے زندگی کی تاریک راہوں کے لیے یہ ایک ایسی قندیل راہ ہے جو زندگی کے ہر خطرناک موڑ اور ہر پُر خطر گوشے کو روشن کرکے نمایاں کر دیتی ہے۔

تصریفِ آیات ○ قرآن مجید نے اس مسلّمہ حقیقت کو تصریف آیات کے مخصوص انداز کے ساتھ پوری طرح نمایاں کر رکھا ہے' چنانچہ سورہ نساء میں پوری نوع انسانی کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

○ **يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا** (۴/۱۷۴) اے پوری نوع انسانی بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حقائق کی کھلی دلیل آ گئی ہے' یعنی ہم نے تمہاری طرف اپنا نور نازل فرمایا ہے اسی طرح سورہ تغابن میں قرآن مجید کو بانداز ذیل نور کہا گیا ہے:۔

○ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ۶۴/۸۔ پس (اے نوع انسانی !) ایمان لاؤ اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس نور (قرآن) کے ساتھ جو ہم نے نازل فرمایا ہے۔

○ سورہ اعراف میں اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

○ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۱۵۷/۷

پس وہ لوگ اس (رسول محمد سلام علیہ) پر ایمان لائے اور اس کی حمایت کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (قرآن) کی اتباع کی جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ وہ لوگ وہی ہیں فلاح پانے والے۔

○ مندرجہ بالا ہر سہ آیات کریمات میں قرآن مجید کو نور کہا گیا ہے اور تینوں آیتوں میں اسے منزل من اللہ بتا گیا ہے یعنی نور قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک مغالطے کا رفع کرنا لازم ہے۔ وہ یہ کہ اہل اسلام کا ایک گروہ نبی اکرمؐ صاحب نور خاتم النبیین رحمتہ اللعالمین کی ذات مقدس کو دائرہ بشریت سے خارج کرکے آپ کو مجسم نور بتاتا ہے اور اپنے اس نظریے کو سورہ مائدہ کی آیت ذیل سے ثابت کرتا ہے۔

○ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۱۵/۵ اس آیت میں جلی لکھی ہوئی واؤ تفسیری ہے اور اس کا معنی اور مفہوم یہ ہے:۔ بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے اس کا نور "**یعنی**" خود بیان کرنے والی کتاب آگئی ہے۔

○ واضح رہے کہ عربی متن میں جلی لکھی ہوئی واؤ کا ترجمہ جلی لکھا ہوا لفظ یعنی ہے۔ بالفاظ دیگر اس آیت میں اللہ کی کتاب قرآن مجید ہی کو نور کہا گیا ہے۔ جس کا پوری وضاحت کے ساتھ پیچھے آیات مجیدہ ۱۷۴/۴ + ۶۴/۸ + ۱۵۷/۷ میں بالصراحت اعلانِ عام کر دیا گیا ہے۔ نیز ان ہر سہ آیات کریمات میں اَنْزَلْنَا + اَنْزَلْنَا + اُنْزِلَ کے الفاظ میں اس حقیقت کو سہ گانہ تکرار کے ساتھ نکھار کر بیان کر دیا ہے کہ اللہ کے نور کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس کی طرف سے نازل کیا گیا تھا' مبعوث نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی اللہ کی طرف سے نازل فرمائی گئی اس کی کتاب ہے اور مبعوث کئے گئے اس کے نبی ہیں۔

تمام نبی مبعوث کئے گئے تھے نازل نہیں فرمائے گئے تھے ○ جملہ انبیاء کے متعلق سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۲۱۳/۲۔ پوری نوعِ انسانی ایک ہی جماعت ہے۔ پھر اللہ نے (انہیں) اپنے نبی اچھے کاموں کی اچھی جزا کی خوشخبری دینے والے اور برے کاموں کی بری سزا سے ڈرانے والے مبعوث فرمائے۔

سب کے سب نبی اللہ تعالیٰ کے بندے بشر تھے ○ قرآن بھر میں کہیں بھی انبیاء سلٰمٌ عَلَیْهِم کے لیے یہ نہیں آیا کہ وہ نازل کئے گئے تھے اور نہ قرآن بھر میں قرآن کریم کے لیے آیا ہے کہ وہ مبعوث کیا گیا تھا۔ الختصر نبی مبعوث کئے گئے تھے ۲۱۳/۲ اور قرآن نازل فرمایا گیا تھا ۱۷۴/۴ + ۱۵۷/۷ + ۶۴/۸ آیت مجیدہ ۱۵/۵ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِیْنٌ میں جلی لکھی گئی واؤ کو' جو قرآنی دلائل قاطعہ کے مطابق تفسیری ہے بلا وجہ واؤ مغائرت قرار دے کر' پہلے تو نور کو قرآن سے الگ قرار دے دیا گیا ہے اور پھر نبی اکرمؐ کو جو از روئے قرآن حکیم صد فیصد بشر تھے' نور ٹھہرا دیا ہے۔ حالانکہ قرآنی دلائل بالا کے مطابق نور نازل ہوا تھا اور نبی اکرمؐ مبعوث ہوئے تھے نازل نہیں ہوئے تھے۔ سورہ ابراہیم میں

سب کے سب رسولوں کا قول درج ہے:۔

○ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۱۴/۱۱ سب کے سب رسولوں نے اپنے اپنے وقت پر اپنی اپنی زندگی میں اپنی اپنی قوم سے کہا کہ نہیں ہیں ہم مگر یقیناً تمہارے جیسے بشر ہیں۔ اس آیتِ مجیدہ میں اِنْ نافیہ ہے اور خط کشیدہ اِلَّا اثبات کا ہے۔ یعنی نفی' اثبات کے محکم حصر کے ساتھ خود انبیاء سلام علیہم کا اپنا اعلان درج کر دیا گیا ہے کہ وہ سب کے سب بلا شبہ بشر تھے۔

○ پھر اسی ضمن میں خود نبی اکرمؐ سے بھی دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ نفی اثبات کے حصر ہی سے اعلان کروا دیا گیا ہے کہ لوگو ! بشریت کے لحاظ سے میں بالکل تمہارے جیسا بشر ہوں۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۱۱۰/۱۸ اے رسول کہہ دیجئے گا کہ سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ میں تمہارے جیسا بشر(ہی) ہوں۔ (تم میں اور مجھ میں فرق صرف یہ ہے) کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے جملہ انبیاءؑ اور خاتم النبین کی بشریت سے انکار کی مطلقاً گنجائش موجود نہیں ہے۔

○ حقیقت حال یہ ہے جس سے کسی بھی مومن باللہ کو مجالِ انکار نہیں کہ رحمتہ للعالمینؐ سمیت سب کے سب نبی رسول بشروں ہی کی طرح پیدا ہوئے' والدہ کا دودھ پیا۔ بچپن' جوانی' ادھیڑپن اور بڑھاپے کے تقاضوں سے واسطہ پڑا۔ بھوک' پیاس اور موسمی تغیرات سردی گرمی کے مکمل احساسات کے حامل تھے۔ نٹی پیشاب' تھوک' سینڈھ' بادی بلغم وغیرہ کے عوارضات سے بھی مبرا نہیں تھے بیمار بھی ہوتے اور صحت یاب بھی ہو جاتے تھے۔ سر درد' پیٹ درد یا بخار میں مبتلا بھی ہو جایا کرتے تھے۔ یعنی بستر مرض سے بھی ناآشنا نہیں تھے۔ بلکہ سب کے سب نبی یکے بعد دیگرے فوت بھی ہوگئے اور اسی زمین کے بطن میں دفن بھی ہوئے۔ چنانچہ رحمتہ للعالمین کی قبر مبارک مدینہ منورہ کی مسجد نبوی میں آج تک موجود ہے۔

○ یہی ہیں تقاضائے بشریت جن سے نبی اکرم سمیت کوئی بھی نبی مبرا نہیں تھا۔ اس لیے قرآن کریم اور مشاہدات کی رو سے نبی کریم سمیت جملہ انبیاء سلام علیہم کی بشریت سے کسی صاحبِ عقل و خرد اور فہم و انصاف کے لیے ہرگز ہرگز مجال انکار نہیں ہو سکتی۔

نگاہِ بازگشت ○ واضح رہے کہ حقائق اپنے مقام پر ہمیشہ اٹل اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔ انبیاء سلام علیہم کی بشریت کا انکار کرنے اور انہیں نور نور کہنے کی رٹ لگاتے رہنے سے وہ قرآنی اور مشاہداتی حقائق ہرگز بدل نہیں سکتے' جو پیچھے بانداز ذیل نمایاں کئے جا چکے ہیں کہ:۔

(الف) جملہ انبیاء نور نہیں تھے بشر تھے ۱۴/۱۱ + ۱۱۰/۱۸ + ۴۱/۶

(ب) جملہ انبیاء مبعوث ہوئے تھے' نازل نہیں ہوئے تھے۔ ۲۱۳/۲ + ۶۴/۳

(ج) قرآن کریم معہ جملہ کتب الٰہیہ نور ہے ۱۷۴/۴ + ۱۵/۵ + ۱۵۷/۷ + ۸/۶۴ + ۴۴/۵ + ۴۶/۵

(د) قرآن مجید معہ جملہ کتب الٰہی مبعوث نہیں کیا گیا تھا' بلکہ نازل کیا گیا تھا۔ ۱۷۴/۴ + ۱۵۷/۷ + ۸/۶۴

تورات اور انجیل بھی نور تھیں ○ قرآن کریم کے نور ہونے کی قرآنی اسناد پیچھے آیات نمبر۱۷۴/۴' ۱۵۷/۷' ۶۴/۸ میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب آیات مجیدہ ۴۴/۵ اور ۴۶/۵ میں ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل کو بھی قرآن کریم کی طرح نور ہی کہا ہے:۔

○ ۴۴/۵ **اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ج۔** بیشک ہم نے تورات نازل فرمائی اس میں ہدایت اور نور ہے

○ ۴۶/۵ **وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ۔** اور ہم نے (مسیح) کو انجیل عطا فرمائی۔ اس میں ہدایت اور نور ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔

تورات اور انجیل میں تحریف ○ خود قرآنی سند **يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ مَّوَاضِعِهٖ** ۴۶/۴ + ۱۳/۵ کے مطابق جب تورات و انجیل محرّف ہو چکی ہوئی ہیں' اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں تو پھر ان میں ہدایت و نور کی موجودگی کا سوال کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب بالکل سیدھا اور صاف ہے کہ ۴۴' ۴۶/۵ میں اصلی تورات و انجیل کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو نسخے اصلی حالت میں ہیں ان میں ہدایت اور نور ہے۔

○ اب اس سے آگے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ غیر محرف تورات اور انجیل ہے کہاں؟ اس کا جواب بھی قرآنی شواہد کی روشنی میں بالکل سیدھا اور صاف ہے کہ اگر آج غیر محرف نسخے نابود ہو چکے ہوں تو اسے زمانے کی دست برد کے تقاضے قرار دیا جائے گا۔ قرآنی آیات زیرِ بحث سے صاف ظاہر ہے کہ زمانہ رسالتِ محمدی میں یقیناً تورات و انجیل کے غیر محرف نسخے بھی اہل کتاب کے پاس موجود تھے۔ انہی کے متعلق سورہ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے کہ اے رسول سلام علیہ انہیں فرمایئے گا۔

○ **قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** ○ ۹۳/۳۔ کہہ دیجئے گا کہ اگر تم سچے ہو تو (غیر محرّف) تورات لاؤ اور اسے (میرے سامنے) پڑھو۔

نبی اکرمؐ خاتم النبین سمیت سب نبی صاحب نور تھے ○ نور کی بحث کے ضمن میں ہم یہاں تک پہنچ چکے ہیں کہ قرآن مجید بھی نور ہے ۱۷۴/۴ + ۱۵/۵ + ۱۵۷/۷ + ۶۴/۸ اور تورات و انجیل بھی نور تھیں ۴۴/۵ + ۴۶/۵ تو اب ظاہر ہے کہ جن مقدس ہستیوں کو یہ نور عطا کئے گئے تھے' وہ اگرچہ خود تو بشر تھے' نور نہیں تھے' مگر وہ سب کے سب صاحب نور تھے۔ کیونکہ انہیں نور سے معمور کتاب عطا کی گئی تھی۔

قرآن مجید ہدایت اور مکمل ضابطہ حیات ہے ○ مودبانہ التماس ہے کہ ہم بشر نور کی بحث کے ضمن میں تصریف آیات کی مدد سے دور نکل گئے ہیں۔ اب آیئے آیت زیرِ بحث ۳۲/۹ کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن مجید نوعِ انسانی کے لیے اس کی زندگی کی تاریک راہوں کو روشن کرنے والا نور ہے' قندیلِ راہ ہے مگر کافر ارادہ کرتے ہیں کہ اس نورانی قندیل کو اپنے مونہوں کی پھونکوں کے ساتھ بجھا دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنے نور کو مکمل کرکے ہی رہے گا اگلی آیتِ مجیدہ میں وضاحت فرمائی گئی ہے کہ یہ نور جو رشد و ہدایت کا مجموعہ ایک مکمل ضابطہ ہدایت ہے' یہ نور' صاحبِ

نور کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ اس کے بھیجنے کی غرض یہ ہے کہ اگرچہ مشرک ناپسند کرتے رہیں، مگر یہ نورانی ضابطہ تمام ضابطوں پر غالب آکر رہے گا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

وہ (اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات) ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچا ضابطہ ہدایت (قرآن مجید) دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ضابطہ ہائے حیات پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرک لوگ (اس کے غالب آنے کو) ناپسند ہی کرتے رہیں۔

اللہ کا دین، اس کا نازل کردہ ضابطۂ حیات، کیا واقعتہ "جملہ ضابطہ ہائے حیات پر غالب ہے؟

○ یہ ایک انتہائی اہم سوال ہے، جس کا کسی جانب سے تسلی بخش جواب نہیں دیا جاتا۔ محض عوام کے مذہبی عقائد سے فائدہ اٹھا کر، انہیں خاموش کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ نہ آیت مجیدہ کے الفاظ میں کوئی ایچ پیچ موجود ہے، اور نہ حقائق و مشاہدات ہی کہیں دبیز پردوں کے نیچے چھپے ہوئے ہیں کہ جو قوم اپنے آپ کو اس ضابطہ حیات کی حامل و عامل ظاہر کرتی ہے، اس کی اگرچہ درجنوں حکومتیں قائم ہیں مگر وہ اقوام عالم میں غالب قوم نہیں کہلا سکتی۔ فی زمانہ غالب اقوام وہ ہیں جو اسلامی ضابطہ حیات کی حامل نہیں، بلکہ اس کے سوا نظامِ سرمایہ داری یا کمیونسٹ نظام کی حامل کہلاتی ہیں تو اس طرح سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت بالا ۹/۳۳ میں جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین، اس نظام کو ضرور غالب کرے گا، خواہ مشرک لوگ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کرتے رہیں، یہ دعویٰ کس طرح سچا ثابت ہو سکتا ہے؟

قرآنی نظام یقیناً غالب ہے ○ واضح رہے کہ آیت بالا ۹/۳۳ کا اعادہ سورہ فتح میں تکرار تاکیدی کے طور پر، ربانی شہادت کے مخصوص اضافے کے ساتھ بالفاظ ذیل کیا گیا ہے:۔

○ "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا"

○ ۴۸/۲۸۔ وہ (اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات) ہے جس نے ہدایت اور دین حق (سچے ضابطہ حیات) کے ساتھ اپنے رسول سلام علیہ کو بھیجا تاکہ وہ اس ضابطہ حیات کو تمام ضابطہ ہائے حیات پر غالب کر دے اور (اس پر) اللہ تعالیٰ خود کافی گواہ ہے۔

○ دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں ضابطہ الٰہی کے غلبہ پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو بطور گواہ پیش فرمایا ہے بالفاظ دیگر ضابطۂ الٰہی کے غلبہ کے خلاف معمولی سے شک و شبہ کی گنجائش بھی ختم کر دی گئی ہے۔ آج کے دور کے متعلق تو ہم آگے چل کر عرض کریں گے، پہلے زمانہ رسالت مصطفویہ کی تمیز پیش خدمت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب نبی اکرمؐ صاحبِ نور خاتم النبیین رحمتہ اللعالمین نے لوگوں کے سامنے قرآنی ضابطۂ حیات پیش کیا تو چند ایک افراد کے سوا پوری قوم آپ کی دشمن ہوگئی۔ حتیٰ کہ لوگوں کی عداوت اس حد تک بڑھ گئی کہ نبی اکرمؐ کے متعلق متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ یا تو آپؐ کو عمر قید کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے اور یا ملک بدر کر دیا جائے۔

○ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۸/۳۰۔ اور (اے رسول سلام علیہ!) وہ وقت قابل ذکر ہے جب ان لوگوں نے جنہوں نے ضابطہ ربانی کا انکار کیا، یہ تجویز کی کہ یا تو آپ کو عمر قید کر دیا جائے، اور یا آپ سلام علیہ کو قتل کر دیا جائے یا جلا وطن کر دیا جائے۔

○ چنانچہ نبی اکرمؐ اپنے وطن' مالوف مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ لیکن بالآخر ضابطۂ ربانی دین اللہ کا غلبہ اس مشہور و محسوس صورت کے ساتھ نمایاں ہونا شروع ہوا کہ پہلے تو وہی شہر مکہ معظمہ جس سے نبی اکرمؐ کو جلا وطنی کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا' بلا جنگ و جدال فتح ہوگیا۔ نبی اکرمؐ نے اتنی عظیم عسکری طاقت کے ساتھ دشمن پر جوابی حملہ کیا کہ وہ مقابلے کی جرات تک نہ کرسکے اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ بیت اللہ شریف کی چابیاں صاحب قرآن سلام علیہ کے قدموں میں ڈال دیں۔ قرآن مجید میں اسی فتح و نصرت اور غلبہ دین کی خبر بالفاظ ذیل درج ہے:۔

○ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" ○ ۱۱۰/۲-۱۔

○ جب اللہ کی نصرت اور فتح آئے گی تو (اے رسول سلام علیہ !) آپ دیکھیں گے کہ اللہ کے دین میں لوگ فوج در فوج داخل ہو رہے ہوں گے۔ یہ تھی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۹/۳۳ + ۴۸/۲۸ کی عملی تفسیر خود نبی پاک کے اپنے دور میں۔

نبی اکرمؐ کے پاکیزہ جانشینوں کے دور میں غلبۂ دین اللہ کی محسوس صورت ○ رسول مقبول سلام علیہ کے بعد غلبہ دین کی محسوس و مشہود صورت کے مطالعہ اور آپ سلام علیہ کے مقدس جانشینوں کے حالات کے لیے تاریخ اسلام کے ان حقائق کو نگاہوں کے سامنے لائیے جن کی تائید و تصدیق مشاہداتِ عالم اور عالمی آثار قدیمہ ہر آن کرتے چلے آرہے ہیں۔ تاریخ و آثار کی شہادت کے مطابق وہی ضابطۂ ربانی جسے اس کے لانے والے سمیت مکہ معظمہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ وہی مقدس ضابطہ' نبی اکرمؐ کے مقدس جانشینوں کے دور میں نہ صرف پورے خطہ عرب پر غالب آیا' بلکہ مصر' عراق اور ایران کی پوری سرزمین اسی مقدس ضابطہ کے زیر نگیں ہوگئی۔ حتیٰ کہ نبی اکرمؐ کے جانشینوں کے بعد کے ادوار میں اسی ضابطہ کا پرچم ایک طرف افریقہ کے صحراؤں سے ہوتا ہوا سپین کی سرزمین پر جا لہرایا اور دوسری طرف ایران' ترکستان اور افغانستان کی سرحدوں کو پار کرتا ہوا برصغیر ہند کے مغربی ساحل پر دیبل' ٹھٹھہ اور ملتان کی فصیلوں کی زینت جا بنا۔

برادران عزیز ! یہ ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۹/۳۳ + ۴۸/۲۸ کی عملی تفسیر نبی اکرمؐ کے جانشینوں کے اور پھر ان کے بعد کے ادوار میں۔

آج کا دور ○ اب آیئے اس بحث کی طرف ! کہ وہی ضابطہ حیات' جس کے دامنِ رحمت کی لپیٹ اتنی وسیع تھی کہ سپین سے سندھ ملتان تک کی پوری انسانیت اس کے سایہ عافیت میں آگئی تھی۔ آج کیا وجہ ہے کہ اس سے زیادہ وسیع علاقوں پر حکمران ہونے کے باوجود اس ضابطہ کے نام نہاد حاملین کو غلبہ نصیب نہیں۔ بلکہ بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے کے لیے مجبور محض ہیں۔ حتیٰ کہ نہ غذائی ضرورتوں میں خود کفیل ہیں نہ جنگی ضرورتوں میں بے محتاج۔

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۳/۱۳۶ ○ واضح رہے کہ ضابطہ ربانی آج بھی وہی ہے جو اولین نبی رسول سلام علیہ پر نازل کیا گیا تھا' اور جو محمد رسول اللہ اور ان کے مقدس جانشینوں کے ادوار میں موجود تھا۔ مگر انہیں جو اجر غلبہ کی صورت میں میسر آیا تھا وہ ان کے اعمال کا نتیجہ تھا جو انہوں نے ضابطہ ربانی پر عمل کرکے حاصل کیا تھا اور آج ہمیں جو عدم کفالت اور محتاجی میسر ہے وہ ہماری بد عملی کا نتیجہ ہے: قرآن کہتا ہے:۔ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۳/۱۳۶ اور اچھا بدلہ عمل کرنے والوں کے لیے ہے (بد عملوں کے لیے نہیں) نبی اکرمؐ اور آپ کے جانشینوں رضوان اللہ علیہم نے جب ربانی ضابطہ حیات پر عمل کرکے دکھایا

تو ربانی ضابطے نے غالب ہو کر دکھا دیا۔ اور اس عمل کے صلے میں' انہیں دنیا ہی میں **جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰر** کی جزا عطا کی گئی اور اس کے برعکس جب ہم نے ربانی ضابطۂ حیات (قرآن مجید) کو محض قسمیں کھانے اور اسے ختم کر کر کے متوفی بزرگوں کو بھیجنے کے لیے مختص کر لیا تو وہی غلبہ' جو اس ضابطے پر عمل کرنے کا صلہ ہے۔ اس سے ہم نے اپنے آپ کو خود محروم کر لیا۔

انسانی عمل ○ سورہ فاطر میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ قانون (ضابطہ حیات) میں غالب ہونے' صعود کرنے کی طاقت تو موجود ہے' لیکن انسان کا اپنا عمل ہی وہ چیز ہے جو اس کی رفعت کا موجب بنتا ہے۔

○ **فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا ؕ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ** ۳۵/۱۰۔

○ غلبہ سارے کا سارا اللہ کے لیے ہے (یعنی اس کے قانونِ مشیت کے مطابق میسر آتا ہے) طیب کلام (اللہ کا ضابطہ حیات قرآن مجید) اللہ کی طرف صعود کرتا ہے' اوپر کو اٹھتا ہے' مگر عمل صالح اسے بلند کرتا ہے۔

○ دیکھئے ! آیت بالا ۳۵/۱۰ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ طیب کلام' قرآن مجید (ضابطۂ حیات) اللہ کی طرف اوپر کو اٹھتا ہے۔ غالب ہوتا ہے۔ مگر غور طلب یہ امر ہے کہ کیا اسے صرف زبان کے ساتھ رٹ لینے سے؟ یا پڑھ پڑھ کر مردوں کو بخشنے سے؟ اسی چیز کا جواب **وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ** کے الفاظ میں دیا گیا ہے کہ اس صالح' پاکیزہ' بے عیب اور بے نقص قانون' ضابطۂ حیات پر جب تک عمل نہیں کیا جائے گا اس وقت تک غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے قانون میں لچک نہیں ہے ○ اس غلبہ کے حامل ضابطۂ حیات پر جو قوم بھی عمل کرے گی وہ اس پر عمل کرنے کا اجر و صلہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے غلبہ وہ اسے ضرور پائے گی۔ مثلاً" اسی ضابطہ حیات میں درج ہے:۔

○ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ** ۸/۶۰۔ اور دشمنوں کے مقابلے کے لیے ہمیشہ فوجی قوت (جدید اسلحہ) تیار کرتے رہو' خصوصاً" گھوڑوں کی قطاریں (ذرائع رسل و رسائل کی بہتات) تم اس بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے رہو گے۔

○ دیکھئے ! ضابطۂ الٰہی کا یہ وہ حکم ہے جس میں دشمن کے مقابلے کے لیے جدید سے جدید اسلحہ اور جدید سے جدید تیز رفتار ذرائع رسل و رسائل اس بہتات سے تیار کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ دشمن مقابلے کی جرات ہی نہ کر سکے۔ نبی اکرمؐ نے اس حکم پر عمل کر کے جب بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ مشرکین مکہ پر حملہ کیا تو انہوں نے مقابلے کی تاب نہ لا کر بلا جدال و قتال شکست تسلیم کر لی اسی قرآنی حکم کے مطابق آپ کے مقدس جانشینوں اور پھر ان کے بعد والوں کے پاس ہمیشہ جدید سے جدید اسلحہ پایا جاتا رہا۔ چنانچہ تاریخ کہتی ہے کہ آسمان نے سب سے پہلے بندوق (جو توڑا دار کی شکل میں ایجاد ہوئی تھی) بابر کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ المختصر ! جب تک قرآنی ضابطۂ حیات کے اس حکم پر اہل اسلام عامل رہے اس وقت تک ان کی بے پناہ فوجی قوت سے ان کے دشمن لرزاں و ترساں تھے۔ جب بھی مقابلے کی جرات کی تو شکست کھائی۔ اور جب سے انہوں نے اس حکم کو پس پشت پھینک کر اسلحہ تیار کرنا تو درکنار' ساٹھ باسٹھ اسلامی حکومتوں میں لوہے کا کارخانہ تک موجود نہیں' اس وقت سے یہ مجبور و محتاج بن کر رہ گئے ہیں۔ اور اس وقت جو قومیں ربانی ضابطۂ حیات کے اس حکم پر عمل

کرکے شبانہ روز جدید سے جدید اسلحہ اور جدید سے جدید ذرائع رسل و رسائل کے انبار لگا رہی ہیں' اب ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ فاتح بھی ہیں اور کامیاب و کامران بھی۔

○ جن قوموں یا ملکوں نے اسلحہ اور ذرائع رسل و رسائل کی تیاری میں جدّت اور کثرت کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اب ان کے دشمن ان کی فوجی تیاریوں سے لرزہ براندام رہتے ہیں۔ مثلاً" آج جب امریکہ اور روس دونوں ملکوں نے ضابطۂ ربانی کے حکم ۸/۶۰ پر زیادہ سے زیادہ عمل کرکے اپنے اپنے ہاں فوجی قوت کے انبار لگا رکھے ہیں تو آج انہیں **تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّكُمْ** کا شرف حاصل ہو چکا ہے کہ وہ بے پناہ فوجی قوت بن چکنے کے باوجود دونوں ہی الگ الگ ایک دوسرے سے خائف ہیں۔

○ یہاں ہم اس قرآنی حقیقت کو کھل کر بیان کرنا چاہتے ہیں کہ قرآنی ضابطۂ حیات از ابتدا تا انتہاء غالب ہی چلا آرہا ہے جب اس پر مسلمان عامل تھے تو ان کے ذریعہ اس کے غلبہ کا اظہار ہوتا چلا آرہا تھا اور اس کے بعد جب غیر مسلم اقوام و ممالک نے اس پر عمل شروع کر دیا تو ضابطہ ربانی کے غلبے کا اظہار ان کے ذریعے ہو رہا ہے ضابطۂ ربانی ماضی میں بھی غالب تھا۔ حال میں بھی غالب ہے اور مستقبل میں بھی غالب رہے گا۔

رجوع الی المطلب ○ واضح رہے کہ آیت مجیدہ ۹/۳۳ کے الفاظ **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** کی تفسیر میں ہم دور نکل آئے ہیں کہ اللہ کے دین (ضابطہ حیات) کی غرضِ نزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جملہ ضابطہ ہائے حیات پر غالب کر دے۔ اور ۱۰/۳۵ کے حوالہ سے اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ربانی ضابطۂ حیات' قرآن مجید پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے غلبہ خواہ کوئی قوم اس پر عمل کرے۔

قرآنی ضابطۂ حیات کے مخالف ابتدائے آفرینش ہی سے تین گروہ چلے آرہے ہیں۔

ملا' پیر اور سرمایہ دار۔

○ الہٰی ضابطۂ حیات میں نہ 'ملا حضرات کے 'ملائی کاروبار کو تحفظ دیا گیا ہے' نہ اس میں پیر حضرات کی پیری مریدی کے دھندے کی اجازت ہے اور نہ ہی اس میں سرمایہ داری کے استحصالی نظام کی گنجائش موجود ہے جس میں زمیندار کاشتکار کا اور سرمایہ دار مزدور کا خون چوسنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتا ہے۔

○ ملائی اور پیری کی مزیّن دکانداریوں میں بھی جہاں ایک طرف سادہ لوح عوام کا مال حرام طریقے سے کھایا جاتا ہے وہاں دوسری طرف یہی ملا اور پیر حضرات اپنے آپ کو عوام سے اعلیٰ وارفع بھی قرار دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ عوام کو ملا حضرات کے اور مریدوں کو پیر حضرات کے ساتھ ایک سطح پر بیٹھنے تک کی اجازت نہیں ہوتی نیز سرمایہ داری نظام میں بھی جہاں ایک طرف مزدوروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا ماحصل بٹورا جاتا ہے' وہاں انہیں ادنے' کمینے اور رذیلے سمجھنے کا قدیمی شعار موجود ہے۔ جب بھی کوئی نبی رسول الہٰی ضابطۂ حیات' اللہ کی کتاب لے کر آیا' جس میں ان تینوں گروہوں کی مذمت موجود ہے تو یہی تین گروہ ہر نبی رسول سلام علیہ کے مخالف ہوگئے بلکہ ہر سہ گروہوں نے ضابطۂ الہٰی کے خلاف باہمی گٹھ جوڑ کیا اور متفقہ طور پر الہٰی ضابطۂ حیات لانے والے کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہوگئے۔

○ اگلی آیت مجیدہ ۹/۳۴ میں ان تینوں گروہوں کے نام لے لے کر ان کے متعلق کھلے الفاظ میں عذاب الیم کی خبر دی گئی ہے اور ایمان والوں کو نئے سرے سے مخصوص خطاب کے ساتھ مخاطب کرکے متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کے استحصال سے پوری طرح بچ کر رہنا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

اے وہ لوگو ! جو ضابطہ ربانی پر ایمان لائے ہو (گوش ہوش سن لو کہ) علماء و مشائخ میں سے اکثریت ان کی ہے جو لوگوں کا مال حرام طریقے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اور (انہیں) اللہ کے راستے (اس کے ضابطہ حیات) سے روکتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ (اے رسول سلام علیہ ! آپ) انہیں درد ناک عذاب کی خوشخبری دے دیں۔

حرام طریقے سے مال کھانا ○ حصول مال کا جائز اور حلال طریقہ ہے اجرت و تجارت کا۔ مثلاً" پہلے نمبر پر ایک شخص دوسرے شخص کا کوئی کام کرتا ہے اور وہ اسے اس کی اجرت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ضمن میں بھی تاکید کر دی ہے کہ محنت کش کو اس کی محنت سے نہ کم اجرت دی جائے اور نہ محنت کش اپنی محنت سے زیادہ اجرت وصول کرے اور دوسرے نمبر پر ایک شخص دوسرے شخص کو کوئی غذائی یا اور کسی ضرورت کی چیز قیمتاً" دیتا ہے اور اس سے قیمت وصول کرتا ہے اس گوشے میں بھی اللہ تعالیٰ نے انتہائی تاکید کر رکھی ہے کہ نرخ بازار سے زیادہ قیمت وصول نہ کی جائے۔ ناقص اور ملاوٹ والا مال نہ دیا جائے۔ ایسی تجارت کو باری تعالیٰ نے عوام کا اقتصادی قتل قرار دیا ہے:۔

○ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ** ۴/۲۹۔ ایمان والو ! تم آپس میں ایک دوسرے کے مال غلط (حرام) طریقے سے نہ کھانا۔ سوائے ایسی تجارت کے جس میں بائع اور مشتری دونوں رضا مند ہوں اور یاد رکھو کہ ناجائز تجارت کے ذریعہ' تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا۔

○ اب دیکھیے ! کہ تجارت میں کوئی چیز خریدار کو دے کر اس سے پیسے وصول کیے جاتے ہیں مگر ملّا اور پیر حضرات کونسی چیز دیتے ہیں جس کی قیمت کے طور پر عوام اور مریدوں سے رقمیں بھی وصول کرتے ہیں؟ اور انہیں اپنے برابر بیٹھنے بھی نہیں دیتے۔ آیت زیر بحث ۹/۳۴ میں ملّا اور پیر حضرات کے دھندوں کو باطل اور موجب عذاب الیم قرار دیا گیا ہے۔

○ ملّا حضرات نماز پڑھا کر تنخواہ اور نذرانے وصول کرتے ہیں' حالانکہ نماز کی ادائیگی جس طرح عام مسلمانوں پر فرض ہے اسی طرح ملّا حضرات پر بھی فرض ہے۔ نماز باجماعت میں جس طرح عوام اللہ کا فرض ادا کر رہے ہوتے ہیں' اسی طرح نماز پڑھانے والا اللہ کا فرض ادا کر رہا ہوتا ہے' اجرت کس محنت کی وصول کی جاسکتی ہے؟

○ اسی طرح پیر حضرات بیماروں کے لیے پانی دم کرکے اور تعویز لکھ کر عوام سے حرام مال وصول کرتے ہیں۔ حالانکہ بیماری کے لیے علاج لازم ہے نہ کہ پانی دم کرکے پلانا یا تعویز باندھنا۔ ملّا اور پیر حضرات خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بیماری کا علاج دوا ہے دم اور تعویز نہیں۔ کیونکہ جب وہ خود بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کرتے ہیں نہ تعویز استعمال

کرتے ہیں نہ پانی دم کر کے پیتے ہیں۔ اس طرح وہ خود بھی جانتے ہیں کہ جو مال اور نذرانے وصول کرتے ہیں' سرتاپا حرام ہیں۔

○ پھر یہ لوگ جو کاشتکاروں سے فصل کا حصہ وصول کرتے ہیں کہ اس سے ان کی فصل اچھی ہوگی۔ یہ بھی سراسر فریب محض ہے۔ جب تک پیروں کے تعویز کھیتوں میں دبائے جاتے رہے تھے اس وقت تک دس من فی ایکڑ سے پیداوار آگے نہ بڑھ سکی تھی۔ مگر اب جب کافروں کا ایجاد کردہ کیمیاوی کھاد استعمال ہوا ہے تو گندم کی پیداوار نوے من فی ایکڑ تک پہنچ چکی ہے۔ المختصر ! اللہ تعالیٰ نے ملائی اور پیری کے ذریعہ حاصل کئے گئے مال کو حرام اور موجبِ عذابِ الیم قرار دیا ہے۔

سبیل اللہ ○ آیتِ مجیدہ کے متن کے سامنے پچھلے صفحہ پر سبیل اللہ کا معنی لکھا گیا ہے اللہ تعالیٰ کا ضابطہ حیات' قرآن مجید' قرآن مجید ہی اللہ کی بتائی ہوئی وہ سبیل (اللہ کا بتایا ہوا وہ راستہ) ہے جس پر چل کر نوعِ انسانی کامیابی اور کامرانی کی منزلیں طے کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ضابطہ حیات میں بیماری کے لیے علاج کا راستہ بتایا گیا ہے۔ مگر ملاّ اور پیر حضرات اتوار کو دم کر کے پھر کہتے ہیں کہ اگلے اتوار پھر دم کروانا اور اس طرح چھ سات اتواریں دم کروانے میں ضائع کرنے کے بعد جب بیمار کو فائدہ نہیں ہوتا تو کہہ دیتے ہیں کہ اسے بڑے سخت تعویز پڑے ہوئے ہیں۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستے' علاج کی طرف نہیں آنے دیتے یعنی اللہ کے راستے سبیل اللہ سے روکتے ہیں۔

○ کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو ملاّ اور پیر حضرات یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطہ حیات (اللہ کی سبیل) میں قتل کی سزا جان کا بدلہ جان ہے اور اگر قتل بلا ارادہ ہوا ہے تو اس کی سزا خون بہا ادا کرنا ہے۔ بلکہ پیر صاحب' قاتل مرید کو اللہ کی اس سبیل سے روکتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ہم تعویز دیں گے اور تو بری ہو جائے گا۔ العیاذ باللہ !

سونا چاندی جمع کرکے اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا ○ اس آیتِ مجیدہ میں سونا چاندی جمع کرنے کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ نہ خزانہ کرکے اس پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور نہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بجائے اپنے لیے جائیدادیں کھڑی کرنا شروع کر دیں جو لوگ سونے چاندی کو خزانہ کرکے بیٹھ جائیں یا اپنے لیے جائز ضروریات سے زائد کرایہ کھانے کے لیے مارکیٹیں' دکانیں' کوٹھیاں اور گودام تعمیر کریں انہیں بھی عذاب الیم کی بشارت دی گئی ہے۔

○ اب رہا یہ سوال کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی عملی صورت کیا ہے؟ قرآن مجید میں بھوکوں کو کھانا کھلانا' ننگوں کو لباس پہنانا' قرض داروں کے قرض ادا کرنا اور ظالم حکومت کے چنگل میں گرفتار بے بس مرد عورتوں اور بچوں کو آزاد کرانے میں مال خرچ کرنے اور ملکی دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے اسلحہ سازی اور ذرائع رسل و رسائل وغیرہ یعنی ان تمام مدّوں میں مال خرچ کرنے کو انفاق فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ دیکھئے پہلے نمبر پر:۔

۱۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

○ سورہ یاسین میں ارشاد ہوا ہے:۔

○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ

اَطْعَمَہٗٓ ٣٦/٤٧ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو تمہیں اللہ نے رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو جن لوگوں نے ضابطہ الٰہی کا انکار کیا ہے' وہ کہتے ہیں' کیا ہم ان (بھوکوں) کو کھانا کھلائیں' جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلاتا کھلاتا۔ سورہ یاسین کی اس آیت مجیدہ میں دو چیزوں کی وضاحت کی گئی ہے:۔

(الف) پہلی یہ کہ بھوکوں کو کھانا کھلانے یا ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنے میں مال خرچ کرنا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

(ب) دوسری یہ کہ عوامی عقیدہ مطلقاً" غیر قرآنی ہے کہ بھوکوں کو خود اللہ تعالیٰ نے بھوکا رکھا ہوا ہے۔ افسوس ہے اس عقیدہ کے مبلغین حضرات پر کہ اگر اللہ نے خود بھوکا رکھا ہوا ہو تو تمہیں کیوں کہے کہ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ بلاغ القرآن کے صفحات میں بارہا وضاحت کر دی گئی ہے کہ عوام کو بھوکا ننگا بنانا فرعون کی سنت ہے:۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ ٢٨/٤ بیشک فرعون نے زمین میں سرکشی کی تھی۔ اس نے اپنی رعایا کے طبقے بنا دیئے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو کمزور کر دیا تھا (انہیں بھوکا ننگا کر رکھا تھا۔ وہ ان سے بیگاریں لیا کرتا تھا۔ ان کی محنت کی متوازن اجرت نہیں دیتا تھا)۔

٢۔ بے بس کمزور مرد عورتوں اور بچوں کو ظالم حکومت کے چنگل سے آزاد کرانا قتال فی سبیل اللہ ہے۔

○ سورہ نساء میں ارشاد ہوا ہے:۔

○ **وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا** ٤/٧٥۔ اور (ایمان والو !) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں (فی سبیل اللہ) قتال نہیں کرو گے۔ جبکہ کمزور کیئے گئے مردوں' عورتوں اور بچوں میں سے وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس ظالموں کی بستی سے نکال لے۔

○ سورہ نساء کی اس آیت مجیدہ میں بھی دو چیزوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

(الف) پہلی یہ کہ ظالموں کے چنگل میں گرفتار بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کو ظالموں کے پنجے سے آزاد کرانے کے لیے قتال کرنا۔ قتال فی سبیل اللہ ہے اور اس قتال فی سبیل اللہ کی تیاری کے لیے مال خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

(ب) دوسری یہ کہ مظلوم جب اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں تو ان کی مدد کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کے پروگراموں کی تکمیل اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔ اسی طرح جو رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے۔ **نحن نرزقکم** یہ ذمہ داری اسلامی حکومت کے سربراہ کے سر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ ایک متوازن معاشرے کے قیام کے ضامن ہوئے تھے اور عمر رضی اللہ عنہ معاشرہ کے ان افراد کے ہاں اپنی پیٹھ پر اٹھا کر سامان خوراک پہنچاتے تھے' جو سامان رزق سے محروم پائے جاتے نبی اکرمؐ کی اسی عوامی رزق کی ذمہ داری کی خبر آیت ذیل میں دی گئی ہے:۔

○ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى ۸/۹۳۔ اور (اے رسول سلام علیہ) ہم نے آپ کو عوام کے رزق کی ذمہ داری کے بوجھ تلے دبا ہوا پایا' پھر ہم نے آپ کو غنی کر دیا۔ بے محتاج کر دیا۔

۴۔ اسلحہ کی تیاری میں مال خرچ کرنا' انفاق فی سبیل اللہ ہے ○ سورہ انفال کی آیت مجیدہ ۸/۶۰ کا ایک حصہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ذیل میں پوری آیت ملاحظہ فرمائیں' ارشاد باری ہے:۔

○ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ** ○ ۶۰/ ۸۔ اور (ایمان والو !) ان (دشمنوں) کے مقابلے کے لیے تم میں جتنی استطاعت ہے (پوری استطاعت بھر عسکری) قوت تیار کرتے رہو۔ خصوصاً" گھوڑوں کی قطاریں (یعنی تیز رفتار ذرائع رسل و رسائل اس بہتات کے ساتھ تیار کرتے رہو) کہ تم اس بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے رہو۔ ان کے سوا تمہارے اور بھی دشمن ہیں' جنہیں تم نہیں جانتے' انہیں اللہ جانتا ہے۔ اور (اس بے پناہ فوجی قوت کی تیاری میں) تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔ تمہیں واپس کر دیا جائے گا۔ یعنی تم ظلم نہیں کیے جاؤ گے۔

○ اس آیت ۸/۶۰ میں بھی ذیل کی دو مخصوص چیزوں کا اعلان کیا گیا ہے:۔

(الف) پہلی یہ کہ اسلحہ کی تیاری پر جو مال خرچ کیا جائے وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

(ب) دوسری یہ کہ اسلامی حکومت اسلحہ کی تیاری کے لیے واپسی کی شرط پر عوام سے قرضہ جات بھی لے سکتی ہے۔

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ یہ ضمنی نوٹ آیت مجیدہ ۹/۳۴ کا آخری نوٹ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ نہ کرنے والوں اور سونے چاندی پر سانپ بن کر بیٹھ جانے والوں کو درد ناک عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ انفرادی طور پر مال جمع کرنے والوں کے لیے دنیا میں تو خود وہ مال ہی ایک عذاب الیم بن جاتا ہے۔ چھپا چھپا کر رکھنے کا اور اس کی حفاظت کا عذاب۔ چوری ہو جانے کا خطرہ اور کہیں لازما" خرچ کرنا پڑے تو اس کے گھٹ جانے کا غم۔ یہ تو ہوا دنیا کا عذاب۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں کے لیے آخرت کے عذاب کی خبر اگلی آیت میں بیان ہوئی ہے:۔

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۞

(قیامت کے) دن (خزانہ کیا ہوا سونا چاندی) جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس کے ساتھ ان (خزانہ کرنے والوں) کے ماتھوں پر اور ان کی کروٹوں پر اور ان کی پیٹھوں پر داغ دیئے جائیں گے (اور کہا جائیگا کہ) یہ ہے وہ (سونا چاندی) جسے تم (اجتماعی نظام سے چھپا کر صرف اپنے لیے) خزانہ کیے ہوئے تھے۔

○ اس آیت مجیدہ میں جو خزانہ کیے ہوئے سونے چاندی کو جہنم کی آگ میں تپا کر' ذاتی منفعت کے لیے خزانہ کرنے والوں کے ماتھوں' کروٹوں اور پیٹھوں پر داغ دیئے کے متعلق اعلان کیا گیا ہے یہ اخروی عذاب ہے' جو دوسری زندگی میں دیا جائے گا۔ جب جہنمیوں کو ان گرم کرہ جات میں پھینک دیا جائے گا' جن کی پیداوار تھوہر ہے اور جہاں گرم کے سوا ٹھنڈا پانی

میسر نہیں آ تا ۶۲ تا ۳۷/۶۷ ، ۴۳ تا ۴۴/۴۶ ، ۵۲ تا ۵۶/۵۴= اس جھلس دینے والی گرم لوؤں' گرم پانیوں اور تھوہر کی غذاؤں کا عذاب دیئے گئے مجرموں میں ذاتی منفعت کے لیے سونا چاندی جمع کرنے والوں کو سونا چاندی تپا کر داغ دینے کی خبر بھی دی گئی ہے۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ کا ربط اسی سورت مجیدہ توبہ کی ابتدائی آیات نمبر۲ اور ۵ کے ساتھ ہے۔ آیت نمبر۲ میں چار ماہ کی مہلت دیتے ہوئے مشرکوں کو کہا گیا ہے **فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ** ۹/۲۔ چار ماہ کے لیے زمین میں چل پھر لو۔ اور آیت نمبر۵ میں مومنوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو کہا گیا ہے۔ **فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ۔** پھر جب حرمت کے چار مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کے ساتھ جنگ کرکے انہیں قتل کرو۔

بین الاقوامی اصول ○ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بیت الحرام کی سالانہ عالمی حج کانفرنس میں ہر چہار اطراف سے شمولیت کرنے والوں کی سہولت کے لیے بین الاقوامی طور پر سال میں چار ماہ کے لیے جنگیں بند کرنے کا قانون نافذ کیا گیا ہے تاکہ حج کے سالانہ امن اجتماع میں شامل ہونے والوں کے لیے سب راستے صد فیصد محفوظ ہو جائیں چنانچہ اگلی آیت میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے حرمت والے مہینوں کی گنتی چار ہے' جن میں جنگ کرنا حرام قرار دے دیا گیا ہے۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝

بیشک اللہ تعالیٰ کے ہاں (یعنی اس کی طرف سے متعینہ) اللہ تعالیٰ کی کتاب کائنات میں مہینوں کی گنتی بارہ ہے' اسی دن سے جب اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا۔ ان (بارہ) میں سے حرمت والے مہینے (یعنی جن میں جنگ کرنا حرام ہے) چار ہیں۔ (امنِ عالم کو برقرار رکھنے کے لیے) یہی قانون انتہائی پکا ہے۔ پس تم ان (چار مہینوں) میں جنگ کرکے اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا۔ اور (باقی مہینوں میں) تم مشرکوں کے ساتھ اسی طرح اکٹھے ہوکر (پوری قوت) کے ساتھ جنگ کرنا' جس طرح وہ اکٹھے ہوکر (پوری قوت کے ساتھ) تمہارے ساتھ لڑتے ہیں۔ اور جانے رہو کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو (ہمہ وقتی اور جز وقتی) قوانین الٰہی کی مخالفت سے بچنے والے ہیں۔

○ یہاں "کِتٰبِ اللہ" سے مراد اللہ کی کتاب کائنات ہے' کیونکہ بارہ مہینوں کی گنتی کی سالانہ گردش کتاب کائنات میں موجود ہے جس پر آیت مجیدہ کے یہ الفاظ بطور شاہد عادل درج ہیں **يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ** کہ جس دن سے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا۔

○ یہ بارہ ماہ کا نظام اللہ تعالیٰ کی کتاب کائنات میں موجود ہے' اس کی قولی کتاب قرآن مجید میں اس کی خبر دی گئی ہے کہ کتاب کائنات میں بارہ مہینوں کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ جو لوگ اس آیت مجیدہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس کے دعوے کے مطابق اللہ کی کتاب قرآن مجید میں سے بارہ مہینوں کے نام اور پھر چار حرمت والے مہینوں کے نام نکال کر دکھاؤ۔ ان کا

اعتراض غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اور عربوں کے ہاں بارہ مہینوں کے نام' محرم' صفر' ربیع الاول' ربیع الثانی' جمادی الاول' جمادی الثانی' رجب' شعبان' رمضان' شوال' ذیقعد اور ذی الحج ہیں۔ ان میں سے قرآن مجید نے رمضان اور حج کے مہینوں کو حرمت والے مہینے قرار دیا ہے۔ لہٰذا حرمت والے مہینے رمضان' شوال' ذیقعد اور ذی الحج ہیں' جیسے کہ آگے واضح کیا جا رہا ہے۔

○ **مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ** کا سیدھا سادہ معنی یہ ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت والے ہیں یعنی سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینوں میں جنگ کرنا حرام ہے' جس کی خبر سورہ بقرہ میں بالفاظ درج ہے:۔

○ **يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ** ۲/۲۱۷ اے رسولؐ ! لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کے متعلق سوال کریں گے۔ آپ کہہ دینا کہ اس میں جنگ کرنا کبیرہ گناہ ہے۔

پس اس آیت مجیدہ کے مطابق حرمت والے مہینوں سے مراد وہ مہینے ہیں' جن میں جنگ کرنا منع ہے۔

حرمت کے چاروں مہینے مسلسل و متواتر ہیں' کٹویں نہیں ہیں ○ آیت زیر نظر پر اعتراض کرنے والوں کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید نے جب سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت والے بتائے ہیں تو قرآن مجید میں سے ان کے نام بتائے جائیں۔ اس اعتراض کے ذریعہ معترض صاحبان منوانا یہ چاہتے ہیں کہ حرمت والے چار مہینوں کے نام قرآن مجید میں نہیں ہیں' روایات میں ہیں۔ اس لیے قرآن مجید کتب روایات کا محتاج ہے یہ تو ہم ابھی ثابت کریں گے کہ قرآن مجید میں حرمت والے مہینوں کے نام موجود ہیں اور کس انداز سے موجود ہیں۔ پہلے قارئین کرام پر واضح کیا جاتا ہے کہ کتب روایات نے حرمت والے مہینوں کے جو ذیل کے نام بتائے ہیں' وہ چونکہ قرآنی کسوٹی پر پورے ہی نہیں اترتے اس لیے وہ مطلقاً" غلط ہیں:۔

○ ذیقعد' ذی الحج' محرم اور رجب۔ اب دیکھئے کہ یہ چاروں مہینے بالترتیب نہیں ہیں۔ کیونکہ محرم اور رجب کے درمیان پورے پانچ ماہ کا فاصلہ ہے۔ لیکن ادھر قرآن مجید کی رو سے حرمت والے چاروں مہینے پے در پے اور مسلسل ہیں۔ جیسے آپ ۹/۲ میں دیکھ چکے ہیں کہ مشرکوں کو ارشاد ہوا ہے:۔ **فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ**۔ پس تم چار ماہ زمین میں چل پھر لو۔ دیکھئے ! "چار ماہ چل پھر لو" کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ چاروں مہینے مسلسل و متواتر ہیں ان میں سے کسی دو میں بھی بُعد ہرگز نہیں۔ اسی چیز کی تائید ۹/۵ کے الفاظ ذیل میں موجود ہے:۔

○ **فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ** ۹/۵۔ پھر (ایمان والو !) جب حرمت کے (چار) مہینے گزر جائیں تو مشرکوں سے جنگ کرو۔ اب دیکھئے ! "جب حرمت کے (چار) مہینے گزر جائیں"۔ کے الفاظ سے سورج کی طرح عیاں ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے حرمت کے چاروں مہینے باہم مسلسل و متواتر ہیں۔ ان میں سے کسی بھی دو میں بُعد موجود نہیں تو اب اس قرآنی کسوٹی پر روایات کے بتائے ہوئے حرمت کے مہینوں کو کَس کر دیکھ لیجئے کہ ذیقعد' ذی الحج اور محرم کے بعد چوتھا مہینہ حرمت والا بتایا گیا ہے رجب' مگر قرآنی حکم کے مطابق اس کے گزرنے کی انتظار میں مزید پانچ مہینے گزارنے پڑتے ہیں۔ صفر' ربیع الاول' ربیع الثانی' جمادی الاول اور جمادی الثانی۔

○ پس چونکہ روایات کے بتائے ہوئے حرمت کے مہینے مندرجہ بالا قرآنی کسوٹی پر پورے ہی نہیں اترتے۔ اس لیے

مطالقا" غلط اور افتریٰ محض ہیں۔ کیونکہ قرآنی شرط کے مطابق وہ چاروں مسلسل و متواتر ہیں۔ مگر روایات کے بتائے ہوئے مہینے کٹویں ہیں' محرم اور رجب میں پانچ ماہ کا درمیانی بُعد ہے۔

حرمت والے چار مہینوں کے نام ○ اب آیئے قرآن مجید کی طرف۔ سورہ بقر ۲/۱۸۵ میں ماہ رمضان کے روزوں کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ** ۔ (روزوں کے لیے پورا) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا تھا۔ اس آیت مجیدہ **شَهْرُ رَمَضَانَ** آیا ہے اور اس کے بعد ۲/۱۹۴ میں حرمت کے مہینوں سے متعلقہ حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:۔ **اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط** ۲/۱۹۴ مذکورہ بالا حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہی ہے (یعنی اگر دشمن تم پر حرمت کے مہینے میں حملہ کر دے تو حرمت والے مہینے ہی میں انہیں دندان شکن جواب دینا ہوگا اور باقی حرمت والے مہینوں کا بدلہ حرمت والے مہینے ہی ہیں۔ (یعنی جس بھی حرمت والے مہینے میں تم پر دشمن حملہ کرے تم اسی میں اس کے دانت توڑ دیا کرو)۔

حرمت کا پہلا مہینہ رمضان شریف ہے ○ اب عربی دان حضرات غور فرمائیں کہ آیت مجیدہ مندرجہ بالا ۲/۱۹۴ میں آیا ہے **اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ** اس میں **اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ** میں الف لام عہدی ذکری ہے اور ماقبل مذکور ۲/۱۸۵ میں ہے **شَهْرُ رَمَضَانَ** جس سے اظہر من الشمس ہے کہ رمضان کا مہینہ حرمت والا مہینہ ہے۔ لیکن ۲/۱۹۴ میں حکم دیا گیا ہے کہ اس حرمت والے مہینے کا بدلہ یہی حرمت والا مہینہ ہے۔ یعنی اگر تم پر دشمن رمضان شریف میں حملہ کر دے تو تم اسی حرمت والے مہینے میں ہی اسے ناک چنے چبوا دینا۔ چنانچہ جنگ بدر کے متعلق جو تاریخوں میں آیا ہے کہ دشمن نے رمضان کے مہینے میں حملہ کر دیا تھا تو نبی اکرمؐ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے رمضان ہی میں دشمن کا مقابلہ کرکے ان پر ایک عظیم تاریخی فتح حاصل کی تھی اور دشمن کو ایک تاریخی ذلت آمیز شکست رمضان ہی میں دی گئی تھی۔

باقی تین مہینے مسلسل و متواتر ہیں ○ اب جب کہ پہلا حرمت والا مہینہ قرآن مجید کی رو سے ثابت ہو چکا رمضان شریف۔ تو آیات مجیدہ ۹/۲' ۹/۵ کے مطابق کہ حرمت والے مہینے چار ہیں اور چاروں مسلسل و متواتر ہیں' کٹویں نہیں تو ثابت ہوا کہ باقی تین مہینے رمضان شریف کے ساتھ ملحقہ مسلسل و متواتر ہیں اور وہ ہیں رمضان کے بعد شوال' ذیقعد اور ذی الحج۔ پس قرآن مجید کی رو سے حرمت کے چار مہینے جو قرآنی شرط کے مطابق باہم مسلسل و متواتر ہیں' وہ ہیں رمضان' شوال' ذیقعد اور ذی الحج' ان چاروں میں لڑائی کرنا حرام ہے اور جنگ بندی کی غرض حج کے سالانہ امن اجتماع میں دور دراز سے شرکت کرنے والوں کے لیے سفر کے راستوں کو محفوظ کرنا ہے تاکہ اس عالمی سالانہ امن کانفرنس میں شامل ہوکر اقوام عالم باہمی تنازعات کو جنگ کے ذریعہ نہیں' بلکہ عالمی امن کانفرنس کے ذریعہ طے کر لیا کریں۔

○ **ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ** میں **الدِّیْن** کا معنی قانون ہے۔ اور اس سے مراد ہے سال میں چار ماہ کیلئے جنگ کو بین الاقوامی طور پر بند کر دینے کا عالمی قانون۔ دین بمعنی قانون سورہ یوسف میں بالفاظ ذیل مذکور ہے۔ جہاں یوسفؑ کے متعلق کہا گیا ہے۔ **مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ** ۱۲/۷۶۔ کہ وہ بادشاہ کے دین (قانون) کے مطابق اپنے بھائی کو رکھ نہیں سکتا تھا۔ سال میں چار ماہ کے لیے جنگ بندی کا عالمی قانون' امن عالم میں انتہائی ممد معاون ہے۔ دو متحارب اقوام میں

جب چار ماہ کے لیے جنگ بند کرادی جائے تو لازمی امر ہے کہ جنگ کی گرما گرمی میں چار ماہ کا وقفہ واقع ہو جانے کی بدولت متنازعہ مسائل پر فریقین کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ غور کرنے کا موقعہ میسر آتا ہے۔ ضد اور تعصب میں کمی واقع ہوتی ہے اور قرآنی اصولوں کے مطابق جنگ کے بغیر مسائل حل کرنے کے مواقع مہیا ہوتے ہیں۔

○ وَاعْلَمُوٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ میں متقین سے مراد وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جز وقتی اور کل وقتی قوانین کی مخالفت سے بچنے والے ہیں۔ یہاں جز وقتی قانون اللہ تعالیٰ کے حکم فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً کے الفاظ سے عیاں ہے کہ مشرکوں سے جنگ پوری قوت کے ساتھ سیسہ پلائی دیوار کی صورت میں کی جائے۔ اور جنگ سے متعلقہ ہمہ وقتی قانون وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ۸/۶۰ کے ربانی الفاظ میں موجود ہے کہ خواہ زمانہ جنگ ہو یا امن دشمن کے مقابلے کیلئے اپنی پوری استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت تیار کرتے رہو۔ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو دشمن کے مقابلے کے لیے ہر آن زیادہ سے زیادہ فوجی قوت تیار کرتے رہتے ہیں اور جو دشمن کا مقابلہ پوری قوت کے ساتھ سیسہ پلائی دیوار کی صورت میں کرتے ہیں۔

حرمت کے مہینوں میں کمی بیشی کرنا کفر ہے ○ سابقہ آیات کریمات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ :۔

۱۔ حرمت کے مہینوں میں جنگ کرنا حرام ہے۔ ۲/۲۱۷

۲۔ حرمت کے مہینوں کی تعداد چار ہے۔ ۹/۲، ۹/۳۶

۳۔ حرمت کے مہینے مسلسل و متواتر ہیں۔ کٹویں نہیں ہیں ۹/۵۔ چنانچہ۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں حرمت کے مسلسل و متواتر مہینوں کو غیر متواتر کر دینے یا انہیں بھلا دینے کو کفر قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِى الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ (حرمت کے مہینوں کو) بھلا دینا کفر میں زیادتی ہے۔ اس کے ذریعہ کافر گمراہ کئے جاتے ہیں جو ایک سال کسی مہینے کو حلال ٹھہراتے ہیں اور دوسرے سال اسے حرام کر لیتے ہیں۔ تاکہ وہ (حرمت والے مہینوں کی) وہ گنتی پوری رکھیں جو اللہ نے حرام کی ہے۔ تاکہ وہ حلال کریں اسے، جسے اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ ان کے برے اعمال مزین کر دیئے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انکار کرنے والی قوم کی رہنمائی نہیں کرتا۔

○ سال میں چار ماہ کی لازمی جنگ بندی کے اہم حکم کی وضاحت کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں پھر قتال فی سبیل اللہ کا تاکیدی حکم دیا جا رہا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝

اے ایمان والو! کیا ہے تمہیں! کہ جب تمہارے لیے کہا جائے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے) نکلو تو تم بوجھل ہو جاؤ زمین کی طرف۔ کیا تم آخرت کے مقابلے پر دنیا کی زندگی پر راضی ہوگئے ہو۔ (تم ہرگز ایسا نہیں کرو گے) پس آخرت کے مقابلے پر دنیا کا مال (خواہ کتنا ہی زیادہ ہو) بہت تھوڑا ہے۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں تعریض محال کے طور پر صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو کچھ کہا گیا ہے وہ قیامت تک کے لیے ایک مستقل قانون کی حیثیت رکھتا ہے:۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝	اگر تم (قتال فی سبیل اللہ کے لیے دشمن کے مقابلے پر) نہ نکلو تو (اللہ) تمہیں درد ناک عذاب دے گا۔ اور تمہیں تمہارے سوا دوسری قوم کے ساتھ بدل دے گا اور تم اسے ذرہ بھر تکلیف نہ پہنچا سکوگے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (قتال سے جی چرانے والی قوموں کو تبدیل کرنے سمیت) ہر چیز کے قوانین مقرر کرنے والا ہے۔

○ اس آیت مجیدہ کے اولین مخاطب صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں' جنہیں ان کی صد فیصد فرمانبرداری کی بدولت باری تعالیٰ کی طرف سے **رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ** کا سرٹیفکیٹ ان کی زندگیوں ہی میں عطا کر دیا گیا تھا۔ اس پاکیزہ جماعت کو مخاطب کرکے ایک عالمگیر قانون کی خبر دی گئی ہے کہ جو قوم جنگ سے جی چرائے گی اسے شکست کا درد ناک عذاب دیا جائے گا۔ وہ محکوم ہو جائے گی اور اس کی جگہ پر ایسی طاقتور قوم کھڑی کر دی جائے گی' جسے وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ اس سوال کا جواب بالکل سیدھا سادہ اور صاف ہے کہ کیا صحابہ رضی اللہ عنہم قتال فی سبیل اللہ سے جی چراتے تھے؟ اگر وہ جدال و قتال کے تارک ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے غیر متبدل قانون کے مطابق کسی ایسی قوم کے ساتھ بدل دیئے جاتے جو ان پر مسلط ہو جاتی۔ یہ اس کے محکوم ہو جاتے اور یہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے ثابت و بیّن ہے کہ صحابہؓ کی پاکیزہ جماعت قتال فی سبیل اللہ پر صدفی صد عامل تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غالب رہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں ان کی زندگیوں ہی میں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے ربانی اعزاز کے ساتھ نواز دیا گیا تھا۔

○ **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ** کا یہ معنی صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیونکہ قدیر بھی عربی لفظ ہے۔ اور قادر بھی عربی لفظ ہے۔ عربی کا عربی ترجمہ کرنا ترجمہ نہیں کہلا سکتا پھر لفظ قدیر صفت مشبّہ ہے اور قادر اسم فاعل ہے۔ صفت مشبّہ کا ترجمہ اسم فاعل میں کرنا بھی علمی لحاظ سے درست نہیں۔ لفظ قدیر صفت مشبّہ ہے۔ مادہ۔ ق - د- ر یعنی قدر ہے' جس کا بنیادی معنی ہے اندازہ' پیمانہ اور قانون۔ اس مادہ سے اسم فاعل قادر کا معنی ہے اندازے' پیمانے اور قوانین متعین کرنے والا۔ اور اس مادہ سے صفت مشبّہ قدیر کا معنی ہے ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح اندازے پیمانے اور قوانین مقرر کرنے والا۔ پس پورے جملہ **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ** کا معنی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح اندازے پیمانے اور قوانین مقرر کرنے والا ہے۔ اب چونکہ ماقبل ذکر ہے جنگ جہاد سے جی چرانے والی قوموں کے لیے درد ناک عذاب کا اور انہیں محکوم کرکے ان کی جگہ دوسری قوم کے تبدیل کرنے کا۔پس بدرجہ اتم ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی شکست اور انہیں اقتدار کے لحاظ سے دوسری قوموں کے ساتھ بدل دینے کا ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح قانون متعین کر رکھا ہے' جس کے مطابق قیامت تک کے لیے جنگ جہاد سے جی چرانے والی قوموں کو شکست کا درد ناک عذاب بھی ملتا رہے گا اور اقتدار کے لحاظ سے انہیں ایسی طاقتور قوموں کے ساتھ تبدیل بھی کیا جاتا رہے گا' جن کا وہ کچھ بگاڑ نہ سکیں گی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون چار دانگ عالم میں جاری و ساری ہے۔

ہجرت نبویہؐ ○ اگلی آیت مجیدہ میں ایک مخصوص انداز کے ساتھ نبی اکرمؐ کی ہجرت مبارکہ کا ذکر جمیل لایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف ایک عظیم المرتبہ صحابی کے ساتھ ہجرت فرمائی ذیل میں نبی اکرمؐ کی مخصوص مدد کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۗ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اگر (بالفرض محال) تم اس کی (ہمارے رسولؐ کی) مدد نہ کرو (تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا) پس تحقیق اللہ نے اس کی اس وقت مدد فرمائی تھی جب لے ضابطہ الٰہی کے منکروں نے (مکہ سے) نکال دیا تھا۔ وہ دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں دشمنوں کے انبوہ میں تھے۔ جب اس نے اپنے ساتھی سے کہا تھا کہ غم نہ کر۔ بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اس پر اپنی تسکین نازل فرمائی اور ایسے لشکروں کے ساتھ اس کی مدد فرمائی جنہیں تم نے دیکھا ہوا نہیں تھا اور کافروں کی تجویز کو ناکام کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی تجویز ہی بلند ہونے والی ہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (اس کا ہر حکم حکمت ہی کے ساتھ غلبہ پاتا ہے)۔

○ **اِلَّا تَنْصُرُوْهُ** کے مخاطب صحابہ ہیں' جو تفریضِ محال کے لیے لایا گیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی اکرمؐ کی پوری طرح تن من دھن کے ساتھ مدد فرمائی تھی۔ سورہ انفال میں پیچھے گزر چکا ہے۔ **فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ** ○ ۸/۶۲۔ پس بلا شبہ (اے رسول سلام علیہ) آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ وہی عظیم الشان ذات جس نے آپ کو قوت بخشی اپنی مدد اور مومنوں (جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم) کے ساتھ پس **اِلَّا تَنْصُرُوْهُ** سے یہ مفہوم اخذ کرنا مطلقاً" غلط ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی اکرمؐ کی مدد نہیں کی تھی۔ **اِلَّا تَنْصُرُوْهُ** تفریضِ محال کے لیے آیا ہے۔

○ **اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اس آیت مجیدہ میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اس وقت کا جب نبی اکرم سلام علیہ کو کافروں نے مکہ معظمہ سے نکال دیا۔ یعنی یہ ہجرت مبارکہ نبویہ کا واقعہ ہے۔

○ **ثَانِيَ اثْنَيْنِ** کے الفاظ سے اظہر من الشمس ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب ہجرت فرمائی تو اس وقت آپ صرف دو افراد تھے یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھا۔ تاریخ نے اس عظیم صحابی کا اسم گرامی ابوبکر رضی اللہ عنہ بتایا ہے اب چونکہ قرآن مجید سے اس نام کی نفی ثابت نہیں۔ اس لیے ٹھیک ہے کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہیں نبی اکرمؐ کی معیّت میں ہجرت کرنے کا شرف عظیم نصیب ہوا۔

○ **اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ** کے الفاظ میں جو لفظ غار آیا ہے اس کا معنی پہاڑ کی "غار" بھی ہے اور "انبوہ مرداں" بھی ہے۔

دیکھئے ! لغت منتہی الارب مادہ غور۔ روایتی تفاسیر نے یہاں غار بمعنی پہاڑ کی کھوہ لیا ہے۔ اور اس پر یہ قصہ چسپاں کر دیا ہے کہ نبی اکرم نے ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی اور جبل ثور کی ایک غار میں دونوں چھپ گئے۔ غار کے

منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا اور کبوتری نے اس میں گھونسلا بنایا اور فوراً انڈا دے دیا۔ کفار مکہ نے آپ کا تعاقب کیا اور عین اس غار پر پہنچ گئے جس کے اندر نبی اکرمؐ اپنے ساتھی سمیت چھپے ہوئے تھے۔ مگر جب انہوں نے غار کے منہ پر جالا تنا ہوا اور اس میں کبوتری کا گھونسلا اور گھونسلے میں انڈا پڑا ہوا دیکھا تو یہ سمجھ کر غار سے چلے گئے کہ اگر آپ سلام علیہ اس غار میں داخل ہوتے تو جالا ٹوٹ جاتا اور اس طرح نہ گھونسلا باقی رہ سکتا تھا نہ انڈا۔

○ روایات کا بیان کردہ یہ قصہ آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ کے ساتھ فٹ نہیں آتا۔ جہاں ارشاد ہوا ہے **فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا**۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس (اپنے رسول سلام علیہ) پر اپنی تسلی نازل فرمائی یعنی ایسے لشکروں کے ساتھ اس کی مدد فرمائی جنہیں تم نے دیکھا ہوا نہیں تھا۔ آیت مجیدہ کے ان الفاظ سے عیاں ہے کہ نبی اکرمؐ اپنے ساتھی سمیت تعاقب کرنے والے گروہ میں گھر گئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسکین اس طرح نازل فرمائی کہ بروقت وہ لشکر پہنچ گئے جن کے ذریعہ آپ کی مدد فرمائی گئی۔ جنہوں نے تعاقب کرنے والے گروہ کا مقابلہ کیا اور وہ نبی اکرمؐ کو گرفتار نہ کر سکے اور ناکام و نامراد واپس لوٹ گئے پس **اِذْ هُمَا فِى الْغَارِ** کے الفاظ میں غار سے مراد پہاڑ کی کھوہ نہیں بلکہ انبوہ مردماں ہے۔ کیونکہ غار میں نہ لشکر آئے' نہ آسکتے تھے اور نہ انہوں نے غار میں نبی اکرمؐ کی مدد کی تھی۔

○ **اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا** سے مراد نبی اکرمؐ کے وہ مسلح مدنی صحابیؓ ہیں جو نبی اکرمؐ کو آگے سے لینے کے لیے لشکر کی صورت میں مدینہ منورہ سے آرہے تھے اور جنہوں نے بروقت پہنچ کر نبی اکرمؐ کا تعاقب کرنے والے کفار کے گروہ کا مقابلہ کیا اور نبی اکرمؐ کو بخیریت تمام مدینہ منورہ لے گئے۔

○ **كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا**۔ اور **كَلِمَةُ اللّٰهِ** کے الفاظ میں لفظ کلمہ کا معنی و مفہوم ہے' تجویز ان کی جنہوں نے ضابطہ الٰہی کا انکار کیا' اور تجویز اللہ تعالیٰ کی۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی تجویز کو ناکام بنا دیا ور اپنی تجویز کو غالب کرکے بلند و بالا کر دیا۔ نبی اکرمؐ کے متعلق کافروں کی تجویز کا ذکر سورہ انفال میں درج ذیل الفاظ میں ہے۔

○ **وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ** ○ ۸/۳۰ (اے رسولؐ !) وہ وقت قابل ذکر ہے جب ضابطہ قرآنی کا انکار کرنے والوں نے آپ کے متعلق یہ تجویز کی کہ یا تو وہ آپ کو عمر قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں اور یا آپ کو (مکہ معظمہ سے) نکال دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی تجویز کرتے تھے اور اللہ بھی تجویز کرتا تھا اور اللہ سب تجویز کرنے والوں سے بہتر تجویز کرنے والا ہے۔ اس آیت مجیدہ کی تصریف آیات کے مطابق آیت مجیدہ زیر بحث ۹/۴۰ میں **كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** اور **كَلِمَةُ اللّٰهِ** میں کلمہ بمعنی تجویز ہے۔ کافروں کی تجویز ناکام ہوئی نبی اکرمؐ اپنے ایک ساتھی سمیت ہجرت کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ کی تجویز بلند و بالا ہوئی۔ لیکن کفارِ مکہ نے نبی اکرمؐ کی ہجرت پر آپ کا تعاقب کیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بروقت مدد فرما کر ان کی اس تجویز کو بھی سفلی کر دیا' ناکام کر دیا۔

○ **وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ** کا جملہ قرآن مجید میں بتکرار کثیر آیا ہے۔ جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ غلبہ اور حکمت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حکمت کے بغیر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ آیت مجیدہ ۹/۴۰ میں جو ہجرت مبارکہ نبویہ کا ذکر ہے' جس کے اخیر پر **وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ** کا جملہ لایا گیا ہے' یہ پورا واقعہ حکمت سے معمور ہے۔ جب کفار مکہ نے نبی

اکرمؑ سلام علیہ کی مخالفت میں اتنی شدت اختیار کر لی کہ آپ کے لیے عرصہ حیات تنگ ہوگیا اور اس پر آپ کے لیے قتل اور عمر قید وغیرہ کے منصوبے تیار ہونے لگے تو اس وقت حکمت ہی کے تقاضے کے مطابق نبی اکرمؑ نے ہجرت فرمائی۔ جملہ انبیاء سلام علیہم کی مبارک زندگیاں واقعہ ہجرت سے معمور و مزین ہیں۔ حکمت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ جس خطہ ارضی کے لوگ حقائق سے آنکھیں مونده کر اتنی شدید مخالفت پر اتر آئیں کہ نبی سلام علیہ کی بات سننا تو درکنار اس کے لیے عرصہ حیات تک تنگ کر دیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر کوئی ایسا خطہ تلاش کیا جائے جس کی فضا پیغام ربانی کے لیے سازگار ہو۔ اسی حکمت الیہہ پر جملہ انبیاء نے عمل کرکے غلبہ حاصل کیا۔

قتال فی سبیل اللہ کی تکراری تاکید ○ آیت بالا ۹/۴۰ میں نبی اکرمؑ کی ہجرت مبارکہ کے ضمنی تذکرہ کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں پھر قتال فی سبیل اللہ کا حکم تکرار تاکیدی کے طور پر بالفاظ ذیل دیا گیا ہے:۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

(قتال فی سبیل اللہ میں خواہ مجاہدوں کی وقتی ضروری مدد کے لیے) ہلکے پھلکے نکلو۔ اور خواہ بوجھل ہوکر نکلو (یعنی میدان جنگ میں داد شجاعت دینے کے لیے مسلح ہوکر نکلو) مگر اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ کوشش کرو۔ یہ چیز تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

○ **اِنْفِرُوْا خِفَافًا**" کے الفاظ سے عیاں ہے کہ یہ لوگ غیر مسلح ہیں۔ جنہیں ابتدائی دور میں زرہ بکتر تلوار اور گھوڑا وغیرہ اس وقت کا اسلحہ میسر نہیں تھا۔ میدان جنگ میں ایسے مجاہدوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو مجاہدوں کی ضروری وقتی مدد کی خدمات بجا لاتے تھے۔ لڑنیوالے مجاہدوں کو پیاس لگے تو انہیں پانی پلانا۔ زخمی مجاہدوں کے گھوڑوں کو سنبھالنا۔ زخمیوں کو فرسٹ ایڈ مہیا کرنا۔ فوری مرہم پٹی کے فرائض ادا کرنا وغیرہ وغیرہ۔

○ **ثِقَالًا**" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ بوجھل ہوکر نکلنے والے مسلح مجاہد ہیں' جو پورے اسلحہ کا بوجھ اپنے بدن پر اٹھا کر نکلتے تھے۔ اس دور کا اسلحہ ہوتا تھا' ایک یا دو تلواریں۔ پورے جسم پر لوہے کی زرہ سر پر لوہے کا خود' نیزہ' بھالا اور پیش قبض وغیرہ ان اوزارں سے مسلح مجاہدوں کے لیے ثقالا" کا لفظ لایا گیا ہے۔

○ **وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** میں ابتدائی جلی لکھی ہوئی واؤ کا معنی متن کے سامنے لکھا گیا ہے مگر' یعنی ہلکے پھلکے نکلو یا بوجھل ہوکر مگر ہر حالت میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں کوشش کرنا لازمی ہے واؤ بمعنی مگر ۴/۱۰۸ میں موجود ہے' جہاں منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

○ **يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ** ۴/۱۰۸۔ ان الفاظ میں جلی لکھی ہوئی واؤ اول کا معنی ہے مگر اور جلی لکھی ہوئی واؤ ثانی کا معنی ہے کیونکہ اور پورے الفاظ قرآنیہ کا مفہوم یہ ہے: وہ لوگ' لوگوں سے چھپتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ کیونکہ جب وہ چھپ کر مشورے کرتے ہیں۔ اللہ اس وقت بھی ان کے پاس خود موجود ہوتا ہے۔

○ **ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** کے الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ ایمان والو! تمہارے لیے جنگ کے لیے ہلکے یا بوجھل نکلنا اور ہر حال میں اللہ کی راہ میں مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنا بہتر ہے اگر تم جانو۔ یعنی تمہیں

جاننا چاہیئے کہ دشمن کے مقابلے کے لیے ہر آن اور ہمہ تن تیار رہنے اور اس کے حملے کے وقت سیسہ پلائی دیوار بن کر پوری قوم کی طرف سے اجتماعی دفاع کرنے ہی میں باعزت قومی زندگی کا راز مضمر ہے۔

غیر جنگجو قوموں کے لیے عزت کا کوئی مقام نہیں ○ آیت مجیدہ ۹/۳۹ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کو کہہ دیا گیا ہے:۔ اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا ○ ۹/۳۹ اگر تم دشمن کے مقابلے کے لیے نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ تم پر غلامی کا دردناک عذاب مسلط کر دے گا۔ اور اقتدار کے لحاظ سے تمہارے سوا ایک ایسی قوم بدل کرلے آئے گا۔ جس کو تم کوئی ضرر نہ پہنچا سکو گے۔

○ پس قرآن مجید کی رو سے دنیا میں باوقار اور مقتدر زندگی ان قوموں کو میسر آتی ہے جو میدان جنگ میں دشمن کو دندان شکن جواب دینے کے لیے ہر آن تیار ہوں۔ بصورت دیگر شکست و غلامی ان کا نصیب بن کر رہ جاتی ہے۔

منافقوں کی ایک اور پہچان ○ کسی بھی معاشرے میں منافقوں کا وجود انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ دشمنوں کے لیے جاسوسی اور ان کی ایجنٹی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ ان کی ہمدردیاں دشمنوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ اور وہ کسی بھی وقت پر ملک اور قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں شروع سورہ بقرہ ہی میں ۲/۸ سے منافقوں کا عنوان چلا آرہا ہے۔ قرآن کی بیشتر سورتوں میں ان سے خبردار رہنے کی تاکید کی گئی ہے اور ان کے نشانات بیان ہوتے چلے آئے ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ صلوٰۃ موقت کے اجتماعات میں ٹوٹے ہوئے ذہن کے ساتھ آتے ہیں ۴/۱۴۲ مومنوں کو قتال فی سبیل اللہ کے لیے نکلنے سے منع کرتے ہیں کہ جھلس دینے والی گرمی میں گھروں سے نہ نکلو ۹/۸۱ نہ خود قتال فی سبیل اللہ کے لیے گھروں سے نکلتے ہیں۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں کا نشان بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ان کی جہاد فی سبیل اللہ میں عدم شرکت کی وجہ یہ ہے:۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِیْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَیْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ یُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

(اے رسول سلام علیہ ! منافق جنگ کے لیے نہیں نکلتے) اگر مال غنیمت قریب ہوتا اور سفر آسان ہوتا تو وہ ضرور آپ کی اتباع کرتے۔ (گھر سے نکلتے) لیکن ان پر لمبی مسافت (گراں گزرتی ہے) اور وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم میں سکت ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ گھروں سے نکلتے اور وہ اپنی جانوں کو ہلاک کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

○ منافق کے قول اور ارادے میں مطابقت نہیں ہوتی۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں' جو کچھ کہتے ہیں' ان کا ارادہ اور نیت اس کے خلاف ہے:۔

منافقوں کی ایک اور بہانہ سازی ○ ایک جنگ کے موقعہ پر منافقوں نے نبی اکرمؐ کے سامنے جنگ میں عدم شرکت کے لیے کچھ بہانے پیش کرکے عدم شرکت کی اجازت لے لی۔ جیسے کہ دوسرے مقام پر سورہ احزاب میں آیا ہے' انہوں نے کہا کہ ہمارے گھر ننگے' غیر محفوظ ہیں وغیرہ اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی ہے۔ اگر اجازت نہ دی جاتی تو پھر بھی یہ جنگ میں جانے والے نہیں تھے۔ جب نہ جاتے تو نکھر کر عیاں ہو جاتے کہ

جو لوگ عدم اجازت کے باوجود نہیں گئے، وہ منافق ہیں:-

عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰی يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے انہیں کیوں اجازت دیدی۔ (اجازت نہ دینی چاہئے تھی) تاکہ آپ کے لیے ظاہر ہو جاتے وہ لوگ جو سچے ہیں اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

جو لوگ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ سے اجازت نہیں طلب کریں گے کہ وہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے باخبر ہے جو ضابطہ قرآنی کی مخالفت سے بچنے والے ہیں۔

کیا نبی اکرم سلام علیہ کا ہر قول وحی تھا؟ **عَفَا اللّٰہُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ** کے الفاظ سے اس متنازعہ مسئلہ کا حل ملتا ہے، جو کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ کا ہر قول وحی الہٰی تھا اور دلیل پکڑی جاتی ہے۔ **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى** ○ ۳-۴/۵۳ سے مگر **عَفَا اللّٰہُ**...... **الخ** سے عیاں ہے کہ نبی اکرمؐ کا وہ قول وحی الہٰی نہیں تھا، جس میں نبی اکرمؐ نے منافقوں کو جنگ میں عدم شرکت کی اجازت دی تھی۔ کیونکہ اگر وہ اجازت بذریعہ وحی ہوتی تو پھر وحی قرآنی ۴۳/۹ میں اس کی مخالفت اور تردید نہ کی جاتی۔ کیونکہ وحی، وحی کی مخالف ہرگز نہیں ہوسکتی۔ نبی اکرمؐ نے جو اجازت دی تھی وہ آپ کی اپنی صوابدید کے مطابق تھی آپ نے عذر پیش کرنے والوں کے عذروں کو صحیح جانا اور از راہ شفقت اجازت دے دی۔ مگر وحی الہٰی نے اسے صحیح قرار نہ دیا۔

○ اب رہا یہ سوال کہ **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى** ○ کا کیا مفہوم ہے۔ واضح رہے کہ ۴۳/۹ کی تصریف آیات کے فیصلے کے مطابق بات یہ بنتی ہے کہ نبی اکرمؐ کے کلام، آپ کے اقوال میں نفسانی خواہش کا دخل ہرگز نہیں تھا۔ بتقاضائے بشریت سہو ہو جاتی تھی۔ جیسے کہ ۴۳/۹ سے ظاہر ہے کہ منافقوں کو اجازت دینے میں نفسانی خواہش کا دخل ہرگز نہیں تھا۔ محض بشری سہو تھی۔ باقی رہا **اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى** کا معنی صاف ہے کہ جس کلام کو نبی اکرمؐ فرماتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے وہ واقعی، خالصتہً اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے قرآن مجید۔ آپ نے قرآن مجید کے سوا کسی بھی کلام کو ہرگز اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں کہا تھا۔

○ **وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ** سے عیاں ہے کہ جب نبی اکرمؐ منافقوں کو اجازت نہ دیتے تو انہوں نے شریک جنگ تو ہونا ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ ظاہر ہو جاتے اور آپ سلام علیہ جان لیتے کہ فلاں فلاں آدمی منافق ہے۔

○ **لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ مومن صحابہ چونکہ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی بھی جنگ میں عدم شرکت کی اجازت نہیں مانگی تھی۔ وہ تو قتال فی سبیل اللہ کے اتنے شیدائی تھے کہ سورہ آل عمران میں صحابہ کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ جب کفار جنگ کی تیاری کرتے اور لوگ صحابہ کو ڈراتے کہ تمہارے مقابلے کے لیے بڑے لشکر اکٹھے ہو رہے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کے اذہان میں خوف پیدا ہوتا۔ ان کے ایمان تازہ ہو جاتے اور مزید بڑھ جاتے:-

○ **اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ قف وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ** ○ ۱۷۳/۳ یہ وہ لوگ ہیں کہ لوگوں نے انہیں کہا کہ تمہارے ساتھ لڑنے کے لیے بہت لوگ (لشکر) جمع

ہوئے ہیں۔ تم ان سے ڈر جاؤ۔ مگر ہوا یہ کہ ان کے ایمان بڑھ گئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے اللہ کافی اور وہ بہتر کار ساز ہے۔

○ متقین کا معنی ہے خود بچنے والے اور ہر خطرے سے بچنے کے لیے اللہ کے قانون ہی پر عمل کرنا لازم ہے۔ پس متقین کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہر خطرے سے بچاؤ کے لیے اللہ تعالیٰ کے متعینہ متعلقہ قانون کو نگاہ میں رکھتے اور اس کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں۔

اگلی آیت مجیدہ میں بہانہ بناکر جنگ میں عدم شرکت کی اجازت مانگنے والے منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ﴿۴۵﴾

(اے رسول سلام علیہ !) سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ آپ سے (جنگ میں عدم شرکت کی) اجازت وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور ان کے اذہان شک میں ہیں۔ پس وہ اپنے شک میں متردد ہیں۔

○ واضح رہے کہ شک اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں ایمان و یقین ہوگا' وہاں شک کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اور جہاں شک موجود ہوگا وہاں ایمان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان شک میں متردد منافقوں کے متعلق اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر ان کا جنگ کے لیے گھروں سے نکلنے کا ارادہ ہوتا تو وہ اس کے لیے تیاری کرتے۔ لیکن چونکہ انہوں نے جنگ کے لیے کوئی تیاری نہیں کی' اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا' آپ کے ساتھ مل کر آپ کے دشمنوں سے جنگ کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادے کے فقدان کی بدولت ان کے نکلنے پر جبر نہیں کیا:۔

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿۴۶﴾

اور اگر ان کا (جنگ کیلئے) نکلنے کا ارادہ ہوتا تو وہ اس (جنگ) کے لیے تیاری کرتے۔ (چونکہ ان کا ارادہ نہیں تھا اس لیے انہوں نے تیاری نہیں کی) ولیکن اللہ تعالیٰ نے (ان کی تیاری نہ کرنے کی بدولت) ان کے اٹھنے پر جبر نہیں کیا (یہ اللہ کے قانون میں مکروہ ہے) انہیں اس (ان کے ارادے) نے روک دیا اور انہیں ان کے سرغنہ کی طرف سے کہا گیا کہ (پیچھے) بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔

○ **وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً** کے الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ منافقوں کا جنگ کے لیے نکلنے کا ہرگز ہرگز ارادہ ہی نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

○ **وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ** کے الفاظ سے عام مترجمین نے جو مفہوم لیا ہے' مطلقاً" غلط ہے کہ منافقوں نے جنگ کے لیے نکلنے کا اس لیے ارادہ نہیں کیا تھا اور اس لیے جنگ کے لیے کوئی تیاری نہیں کی تھی کہ اللہ نے ان کا جنگ کے لیے اٹھنا پسند نہیں کیا تھا' بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے' چونکہ ان کا جنگ کے لیے نکلنے کا ارادہ ہی نہیں تھا اور اسی لیے انہوں نے جنگ کی کوئی تیاری نہیں کی تھی' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادہ اور عدم تیاری کی بدولت ان کے اٹھنے پر جبر نہیں کیا تھا۔ واضح رہے کہ آیت مجیدہ کے الفاظ کے تقدم و تاخر کے مطابق منافقوں کا جنگ کے لیے عدم ارادہ اور عدم تیاری مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا عدم جبر موخر ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو کسی نیک کام سے زبردستی ہرگز نہیں روکتا۔ یعنی جب کوئی شخص

کسی نیکی کی طرف قدم اٹھانے سے خود رک جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ زبردستی نیکی کی طرف نہیں لے جاتا۔

○ اور اسی طرح جب کوئی شخص کسی برائی کی طرف قدم بڑھانے سے خود رک جاتا ہے تو اللہ زبردستی برائی کی طرف نہیں لے جاتا۔ سورہ نساء میں اس مفہوم کو ذیل کے الفاظ میں کھل کر واضح کر دیا گیا ہے:۔

○ **وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا** " ۱۱۵/۴ اور جو شخص سیدھی راہ واضح ہو چکنے کے بعد رسولؐ کی مخالفت کرے اور مومنوں کے سوا اور راستہ خود اختیار کرے' ہم اسے اسی طرف کو پھرنے دیتے ہیں' جدھر کو وہ خود پھرتا ہے اور اسے ہم جہنم واصل کرتے ہیں اور وہ بہت بری جگہ ہے پھر جانے کی۔

نیکی یا برائی انسان خود کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے لیے وہی راستہ کھول دیتا ہے' جس پر وہ خود چلتا ہے۔

○ آیت بالا ۱۱۵/۴ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ:۔

○ کسی شخص کا رسول سلام علیہ کی مخالفت کرنا خود اس کا اپنا فعل بتایا گیا ہے اور مومنوں کی راہ کے خلاف اور راستہ اختیار کرنا بھی اس کا اپنا عمل ہے۔ اور اس کے بعد کے الفاظ ہیں **نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى** اسے ہم اس طرف کو پھرنے دیتے ہیں جدھر کو وہ خود پھرتا ہے۔ بالفاظ دیگر جو شخص خود جہنم کی طرف لپکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے روکتا نہیں اسی طرف کو لپکنے دیتا ہے:۔ پس ۱۱۵/۴ کی تصریف آیات کے مطابق ثابت ہوا کہ آیت زیر بحث ۴۶/۹ کے الفاظ **وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ** کا مفہوم اس کے سیاق کے مطابق یہ ہے:۔ چونکہ منافقوں کا ارادہ ہی جنگ کے لیے اٹھنے کا نہیں تھا۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اگر ان کا اردہ ہوتا تو وہ جنگ کے لیے سامان تیار کرتے۔ اس لیے ۱۱۵/۴ **نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى** کے مطابق اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ جس طرف کو پھرے اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی طرف کو پھرنے دیا انہیں جنگ کے لیے زبردستی نہیں اٹھایا تھا اور زبردستی گھروں سے نہیں نکالا تھا۔

○ **فَثَبَّطَهُمْ** کا بھی عام مترجمین نے یہ مفہوم لیا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے جنگ کے لیے اٹھنے سے روک دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ مفہوم بھی مطلقاً" غلط ہے۔ کیونکہ اگر انہیں اللہ تعالیٰ نے روک دیا تھا اور وہ اللہ کے روکنے سے رک گئے تھے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے بڑے فرمانبردار تھے جنہوں نے اللہ کے حکم پر عمل کیا۔ لیکن جب انہیں اللہ تعالیٰ کے نافرمان بتایا گیا ہے تو ثابت ہوا کہ **فَثَبَّطَهُمْ** میں جو ضمیر واحد مذکر غائب مستتر ہے' اس کا مرجع اللہ تعالیٰ نہیں۔ بلکہ ان کا اپنا ارادہ ہے جو انہوں نے جنگ کے لیے نہ نکلنے کا خود کر لیا تھا۔ پس ان کے اس ارادے ہی نے انہیں تیاری کرنے سے بھی روک دیا تھا اور جنگ کے لیے نکلنے سے بھی روک دیا تھا۔ اللہ نے نہیں روکا تھا۔

○ **وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ** کا مفہوم بھی عام مترجمین نے یہ لیا ہے کہ جس اللہ نے انہیں جنگ کے لیے اٹھنے سے روک دیا تھا' اسی نے انہیں کہا تھا کہ جنگ سے پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ لیکن جیسے کہ پہلے ثابت کیا گیا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے نہیں' بلکہ ان کے اپنے ارادے نے جنگ کے لیے اٹھنے سے روک دیا تھا۔ اسی طرح **وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ** کا بھی یہ مفہوم ہرگز صحیح نہیں ہے کہ انہیں اللہ کی طرف سے کہا گیا تھا کہ جنگ سے پیچھے بیٹھ

رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ بلکہ **قِيْلَ فعل ماضی مجهول مالم يُسَمَّ فاعله** ہے اور ظاہر ہے کہ جس طرح جنگ کے لیے نکلنے سے روکنے والا اللہ تعالیٰ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ کہنے والا بھی اللہ نہیں ہے کہ جنگ سے پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ بلکہ عیاں ہے کہ یہ کہنے والا منافقوں کا سرغنہ تھا جس نے انہیں الگ الگ یہ کہکر ورغلا لیا کہ دیکھو فلاں فلاں سب پیچھے بیٹھ رہنے والے ہیں تم بھی ان کے ساتھ پیچھے بیٹھ رہو۔ جنگ میں جانیں ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟

بفرض محال اگر وہ جنگ میں شامل ہوتے تو فساد ہی کرتے ○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں پیچھے رہنے والوں منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اگر بفرض محال وہ تمہارے ساتھ جنگ کے لیے نکلتے بھی تو تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ فساد پیدا کرتے:۔

لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَّلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌۢ بِالظّٰلِمِينَ ﴿٤٧﴾

اگر وہ (منافق بفرض محال) تمہارے ساتھ (جنگ کے لیے گھروں سے) نکلتے بھی تو تمہیں صرف فساد ہی میں زیادہ کرتے اور تمہارے اندر پھوٹ پیدا کرتے۔ وہ تمہارے لیے فتنہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ تمہارے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں اور اللہ ان ظالموں کو جانتا ہے (تمہیں جاسوسوں کی پہچان کرنی اور ان سے ہوشیار رہنا چاہیئے)

○ جاسوسی کے بغیر مد مقابل قوم کے حالات سے آگاہی ناممکن ہے۔ جاسوس ہی وہ خطرناک لوگ ہوتے ہیں جو دشمن کو مقابل قوم کے مخفی حالات سے آگاہ رکھتے اور ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں' جہاں باسانی شگاف پیدا کرکے نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس لیے آیت بالا میں دشمن کے جاسوسوں کی موجودگی کی خبر دی گئی ہے جس کی غرض یہ ہے کہ جاسوسوں کو پہچاننے کی کوشش کی جائے اور ان کے شر سے محفوظ رہا جاسکے' چنانچہ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ جاسوس لوگ تمہارے لیے فتنہ تلاش کرتے رہے ہیں اور تمہاری بہت سی سکیموں میں الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی بری تجویزوں میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے:۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوا لَكَ الْأُمُورَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُونَ ﴿٤٨﴾

البتہ تحقیق انہوں نے اس سے پہلے بھی (تمہارے لیے) فتنہ تلاش کیا ہے اور (اے رسول سلام علیہ!) آپ کے لیے آپ کی سکیموں کو الٹ پلٹ کیا ہے۔ یہاں تک کہ (آپ کی صحیح تدبیری کی بدولت) حق آپہنچا (آپ کو کامیابی نصیب ہوئی) اور اللہ کا قانون غالب آیا۔ اگرچہ وہ اسے ناپسند کرتے رہے۔

○ اگر صحیح تدبیری اور پوری ہوشیاری سے کام لیا جائے تو جاسوسوں کی تخریبی کارروائیوں کے باوجود کامیابی قدم چومتی ہے۔ آیت بالا میں اسی چیز کی خبر دی گئی ہے کہ اگرچہ ظالم جاسوسوں نے نبی اکرمؐ کی سکیموں میں الٹ پھیر کی پوری کوشش کی تھی مگر آپؐ کی خوش تدبیری' ہوشیاری اور مستعدی کی بدولت وہ لوگ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور کامیابی نبی اکرمؐ ہی کے حصے میں آئی۔

بعض منافقوں نے کھل کر کہا کہ ہمیں تو جنگ سے معاف ہی رکھیں ○ اگلی آیت مجیدہ میں پھر جنگ سے پیچھے رہنے کی اجازت چاہنے والے منافقوں کے بعض افراد کا قول درج کیا گیا ہے کہ انہوں نے نبی اکرمؐ سے کھل کر کہا کہ

ہمیں جنگ کے فتنہ میں نہ ڈالیے:۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور ان (منافقوں) میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جنگ سے پیچھے رہنے کی) اجازت دیجئے اور مجھے (جنگ کے) فتنہ میں نہ ڈالیے۔ خبردار! وہ لوگ (ناکامی کے) فتنے میں پڑ چکے ہیں اور بلاشبہ جہنم (شکست کی آگ) کافروں کو گھیرنے والی ہے۔

○ یہاں جہنم کا معنی شکست کی آگ ہے۔ اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ منافقوں کی ہمدردیاں جن کافروں کے ساتھ ہیں نیز جن کے ساتھ وہ در پردہ ملے ہوئے ہیں اور جن کے لیے ان کے بعض افراد جاسوسی کے فرائض ادا کرتے ہیں' انہیں عنقریب شکست فاش ہونے والی ہے اور ناکامی کی جلن چونکہ انہیں گھیرے ہوئے ہے اس لیے یہ لوگ بھی جان لیں جو ان کے خیر خواہ ہیں' یہ بھی ناکامی کی آگ میں گھرے ہوئے ہیں۔ جہنم بمعنی شکست ۳/۱۲ میں دُور پیچھے گزر چکا ہوا ہے۔ جہاں نبی اکرمؐ کے مخالفین کے متعلق خود نبی اکرمؐ سے اعلان کروا دیا گیا ہے:۔

○ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۳/۱۲ ۔ کہہ دیجئے گا (اے رسول سلام علیہ) واسطے ان لوگوں کے جنہوں نے ضابطہ الٰہی کا انکار کیا ہے کہ تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور تم سب شکست کے جہنم میں اکٹھے کئے جاؤ گے۔

منافقوں کی ایک اور پہچان ○ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ جب نبی اکرمؐ کو کامیابی نصیب ہوتی تو وہ انہیں بری لگتی تھی اور جب آپ سلام علیہ کو کوئی تکلیف پہنچتی تو خوش ہوتے اور کہتے کہ ہم نے اسی لیے تو اپنا الگ راستہ اختیار کر لیا تھا:۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾

(اے رسول سلام علیہ) اگر آپ کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو انہیں (منافقوں) کو بری لگتی ہے اور اگر آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو اپنا کام پہلے ہی (الگ) اختیار کر لیا تھا (تاکہ ہمیں تکلیف نہ پہنچے) اور وہ خوشیاں مناتے ہوئے منہ موڑ کر لوٹ جاتے ہیں۔

بھلائی اور برائی اللہ تعالٰی کے لکھے ہوئے قانون ہی کے مطابق آتی ہے۔ جب نبی اکرمؐ کو کوئی تکلیف پہنچتی تو منافق خوش ہوتے اور کہتے کہ مسلمانوں سے اللہ ناراض ہوگیا ہے مگر اگلی آیت مجیدہ میں خود نبی اکرمؐ سے کہلا دیا گیا ہے کہ ہمیں جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اللہ تعالٰی کے لکھے ہوئے قانون کے مطابق خود ہماری کسی سہو و سستی کی بدولت پہنچتی ہے وہ اللہ تو اپنے لکھے ہوئے قوانین کے مطابق ہمارا کارساز ہے' مومنوں کو اسی کے غیر متبدل قوانین پر بھروسہ کرنا چاہئے:۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

(اے رسول سلام علیہ!) کہہ دیجئے گا کہ ہمیں نہیں پہنچتی کوئی تکلیف مگر جو ہمارے لیے اللہ نے (اپنی کتاب میں) لکھوا دیا ہے (اس کے غیر متبدل قوانین کے مطابق پہنچتی ہے) وہ ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ (کے قانون) پر بھروسہ کریں۔

○ **مَا كَتَبَ اللّٰهُ** کے الفاظ سے جو یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الگ الگ اقوام و افراد کے لیے الگ الگ لکھ دیا ہوا ہے کہ فلاں فلاں کو فلاں فلاں راحت پہنچے گی اور فلاں فلاں کو تکلیف پہنچے گی' یہ مطلقاً" غلط ہے۔ **مَا كَتَبَ اللّٰهُ** سے مراد اللہ کا وہ قانون ہے جو اس نے اپنی کتاب میں لکھوا دیا ہوا ہے کہ رنج و راحت برائی اور بھلائی' ناکامی و کامیابی خود انسان کے اپنے اعمال کے ساتھ وابستہ ہے۔ سورہ شوریٰ میں اسی چیز کو انتہائی بلیغ انداز میں بالفاظ ذیل لکھوا دیا گیا ہے:۔

○ **وَمَآ أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ** ○ ۴۲/۳۰

مفہوم:۔ اور تمہیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے' پس وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے اور وہ (اللہ تو تمہاری بہت سی (غلطیوں کو) معاف کرتا رہتا ہے۔ سورہ آل عمران میں لکھوا دیا گیا ہے۔

○ **وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ** ○ ۳/۱۳۹

اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ۔ اگر تم مومن ہو (یعنی اگر تم اس حکم پر ایمان لانے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہو) تو تم ہی غالب رہو گے۔

اب غور فرمایئے گا کہ ○ اوپر ۴۲/۳۰ میں صاف لفظوں میں لکھوا دیا گیا ہے کہ تمہیں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں لکھا ہوا کہ فلاں فلاں کو فلاں فلاں تکلیف پہنچے گی' بلکہ یہ لکھوا دیا ہوا ہے کہ ہر تکلیف انسان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوگی۔

○ دوسرے نمبر پر سورہ آل عمران ۳/۱۳۹ میں لکھوا دیا ہوا ہے:۔ **وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا** ۔ اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ۔ ان الفاظ میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ غم تمہاری اپنی سستی کا نتیجہ ہوگا' ہمارا لکھا ہوا نہیں ہے۔

كَتَبَ بمعنی لکھوانا ○

○ **مَا كَتَبَ اللّٰهُ** کا صحیح معنی یہ ہے:۔ جو اللہ تعالیٰ نے لکھوایا۔ فعل یا فاعل کَتَبَ کا عام معنی ہے:۔

○ اس نے لکھا۔ لیکن یاد رہے کہ جب اس فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے لکھوایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تو ہاتھ ہی کوئی نہیں' جس کی انگلیوں میں قلم پکڑ کر لکھے۔ فعل کَتَبَ کے مذکورہ معنوں کی وضاحت سورہ اعراف میں کر دی گئی ہے کہ جب موسیٰ سلام علیہ ستر کاتبوں کو کوہ طور پر کتاب لکھوانے کے لیے لے گئے اور انہوں نے اللہ کی کتاب کو لکھا' اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:۔

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ ۷/۱۴۵۔ اور ہم نے اس کے لیے (موسیٰ سلام علیہ کے لیے اپنی کتاب کو) تختیوں میں لکھوایا۔ دیکھئے یہاں کَتَبْنَا کا معنی ہم نے لکھا نہیں' بلکہ ہم نے لکھوایا ہے۔ کیونکہ لکھنے والے ستر کاتب تھے۔

لفظ "اللہ کا معنی" "اللہ کا قانون" ○ **وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ** کا معنی لکھا گیا ہے:۔ اور مومنوں کو چاہیئے کہ وہ اللہ (کے قانون) پر بھروسہ کریں۔ ان معنوں پر ایک لازمی سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ اللہ کے معنی "اللہ کا قانون" کیوں لکھا گیا ہے؟ جواباً" عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اس کے قانون ہی پر بھروسہ ہوتا ہے اگر کوئی شخص عملاً" تو

اللہ کے قانون کی مخالفت کر رہا ہو اور زبان سے یہ کہہ رہا ہو کہ میرا اللہ پر بھروسہ ہے تو اللہ کا قانون اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ مثلاً" کوئی آدمی درخت کے کسی ٹہنے پر بیٹھ کر' اسی ٹہنے کو آری کے ساتھ درخت کے تنے کی طرف سے کاٹنا شروع کر دے اور زبان سے یہ کہہ رہا ہو کہ میں یہ کام اللہ توکل' اللہ کے بھروسے پر کر رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ کا غیر متبدل قانون اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ٹہنے کے کٹ کر گرنے کے ساتھ ہی اسے بھی زمین پر پٹخ دیا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ کے قوانین جاریہ کی مخالفت اور زبان سے توکل علی اللہ کا ورد فریب محض ہے' اللہ پر توکل اس کے قانون پر توکل ہے۔ باری تعالیٰ نے سورہ نحل میں "لفظ اللہ بمعنی اللہ کا قانون" کی وضاحت بالفاظ ذیل کر رکھی ہے:۔

○ **اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ** ۱۶/۷۹ کیا ان لوگوں نے پرندوں کی طرف غور نہیں کیا (انہیں غور کرنا چاہیئے کہ پرندے) فضاءِ آسمانی میں اڑتے ہیں۔ نہیں تھامے رکھتا انہیں فضا میں مگر اللہ (کا قانون) بلا شبہ مذکورہ بالا بیان میں ماننے والی قوم کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

○ اس آیت میں **مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ** کے الفاظ کو جب مشاہدات یعنی صحیفہ فطرت کی آیاتِ مقدسہ کے ساتھ جوڑ کر غور کیا جائے تو کھل کر عیاں ہوتا ہے کہ یہاں لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون ہے۔ کیونکہ پرندے فضا میں اللہ کے قانون کے مطابق اڑتے ہیں' اللہ کا قانون ہی انہیں فضا میں تھامے رکھتا ہے۔ اب پرندوں کے اڑنے اور ان کے فضا میں ٹھہرے رہنے کا قانون یہ ہے کہ وہ جسمانی لحاظ سے تندرست و تنومند ہوں' ان کے پروں میں کوئی نقص موجود نہ ہو' بلکہ وہ صحیح و سالم ہوں۔ اب اللہ تعالیٰ کے غیر متبدل قانون کی حالت یہ ہے کہ وہی پرندہ جو فضائے آسمانی میں بااطمینان اڑ رہا ہے' جب وہ شکاری کے فائر کا نشانہ بن جاتا ہے تو فوراً" گر پڑتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ اب وہ فضا میں تھامے رکھنے والے اللہ کے قانون کے دائرہ سے خارج ہو چکا ہے۔ اب اس کا جسم تندرست و تنومند نہیں رہا۔ یا اب اس کے پَر صحیح سالم نہیں رہے۔ واضح رہے کہ اس آیت مجیدہ ۱۶/۷۹ **مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ** میں لفظ اللہ کا معنیٰ اللہ کے قانون کے سوا کچھ اور لگ ہی نہیں سکتا۔

لفظ اللہ بمعنی اللہ کا عذاب ○ جس طرح ۱۶/۷۹ میں لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون ہے۔ اسی طرح اسی سورہ نحل ۲۶/۱۶ میں لفظ اللہ سے مراد اللہ کا عذاب بھی موجود ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہوا ہے:۔

○ **قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ** ○ ۱۶/۲۶ بے شک ان سے پہلے لوگوں نے بھی بری تجویز کی پھر آیا اللہ (کا عذاب) ان کی عمارتوں پر بنیادوں کی طرف سے۔ پھر عمارتوں کے چھت ان کے اوپر' اوپر کی طرف سے گر پڑے اور انہیں عذاب اس طرف سے آیا جس کا انہیں شعور ہی نہیں تھا۔

○ دیکھئے ! اس آیت مجیدہ میں **فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ** کا یہ معنی لگ ہی نہیں سکتا کہ ان کی عمارتوں پر بنیادوں کی طرف سے اللہ آیا اور ان کی چھتیں ان کے اوپر گر پڑیں۔ بلکہ یہی معنی لگ سکتا ہے اور یہی صحیح ہے کہ ان کی عمارتوں پر بنیادوں کی طرف سے اللہ کا عذاب آیا' ان کے مکانوں کی بنیادیں ہل گئیں اور چھت

ان کے اوپر گر پڑے۔ یعنی ان پر اللہ کا عذاب زلزلہ وغیرہ کی صورت میں نازل ہوا۔ جس سے پوری بستی کے مکانوں کی بنیادیں ہلا دیں اور مکانوں کے چھت مکینوں کے اوپر آگرے۔

لفظ اللہ کا معنی اللہ کا قانون یا اللہ کا عذاب خود قواعد عرب کی رو سے ○ یہاں پہنچ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیات بالا ۷۹/۱۶ اور ۲۶/۱۶ سے تو ثابت ہوچکا کہ قرآن مجید میں لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون بھی موجود ہے اور اللہ کا عذاب بھی موجود ہے' مگر کیا یہ مفہوم (ازروئے قواعد عرب بھی صحیح ہے کہ لفظ اللہ کا معنی مرکب اضافی کی صورت میں اللہ کا قانون یا اللہ کا عذاب لیا جائے؟ جواباً" عرض ہے' جی ہاں۔ جملہ اہل لغت کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ لفظ اللہ مرکب ہے ال اور الہ سے۔ یعنی لفظ الہ پر الف لام داخل ہوا' لام میں لا مدغم ہوکر مشدد ہوگئی اور لفظ بنا اللہ اور اس کا معنی ہے الہِ حقیقی۔ الف لام سے معرف ہوکر اُن جھوٹے الا ہوں سے مخصوص ہوگیا جو لوگوں نے از خود بنا لیے ہوئے ہیں۔

○ اس سے آگے اہلِ قواعد کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ الف لام عوض مضاف بھی ہوتا ہے اور عوض مضاف الیہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہ بیت اللہ کے مرکب اضافی میں بیت مضاف اور اللہ مضاف الیہ ہے۔ مگر جب بیت مضاف پر الف لام داخل کرکے اَلْبَیْت بنایا جائے تو الف لام عوض مضاف الیہ ہوتا ہے اور جس طرح بیت اللہ کا معنی ہے اللہ کا گھر اسی طرح اَلْبَیْت کا معنی بھی ہے "اللہ کا گھر" اسی طرح الف لام عوض مضاف الیہ کی صورت میں اَمْرُاللہ کے مضاف پر جب الف لام لایا جائے تو وہ اَلْاَمْر بمعنی اللہ کا امر ہوتا ہے یہ تو صورت ہوئی الف لام عوض مضاف الیہ کی۔ اسی طرح قواعد کا مسلمہ قاعدہ ہے الف لام عوضِ مضاف کا جس کی دو مثالیں پیچھے ۲۶/۱۶ اور ۷۹/۱۶ میں گزر چکی ہیں۔

○ ۷۹/۱۶ **مَایُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ** میں لفظ اللہ کا الف لام جو لفظ الہ پر داخل ہوا ہے عوض مضاف ہے' مضاف ہے امر (قانون) اور مرکب اضافی ہے اَمْرِ الہ یعنی الہِ حقیقی کا قانون اور آیت مجیدہ کا صحیح معنی' جس کے سوا کوئی اور معنی یہاں فٹ نہیں آتا' یہ ہے کہ فضا میں پرندوں کو نہیں تھامے رکھتا مگر الہ حقیقی کا قانون ہی تھامے رکھتا ہے۔ پرندہ جب بھی اس کے قانون کے دائرہ سے خارج ہوتا ہے تو فوراً" گر پڑتا ہے۔

○ اسی طرح ۲۶/۱۶ میں **فَاَتَی اللّٰہُ بُنْیَانَھُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ** میں لفظ اللہ کا الف لام جو لفظ الہ پر داخل ہوا' عوض مضاف ہے۔ مضاف ہے عذاب۔ اور مرکب اضافی ہے عذابِ الہ' یعنی الہ حقیقی کا عذاب اور آیت مجیدہ کا صحیح معنی' جس کے سوا کوئی اور معنی یہاں فٹ ہی نہیں آتا یہ ہے کہ ان کے مکانوں پر الہِ حقیقی کا عذاب بنیادوں کی طرف سے آیا۔ جس کی وضاحت اس آیت کے اگلے ٹکڑے **وَاَتٰھُمُ الْعَذَابُ** میں موجود ہے کہ:۔ انہیں اللہ کا عذاب اس طرف سے آیا جس کا انہیں شعور ہی نہیں تھا۔

رجوع الی المطلب ○ سابقہ آیت نمبر۵۱ میں منافقوں کے طعن کے جواب میں کہا گیا ہے کہ مصیبت جو بھی آتی ہے اللہ تعالٰی کے لکھے ہوئے قانون کے مطابق انسان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی جو مصیبت آئی تھی کسی سُستی یا عدم تدبیری کی بدولت ہی آئی تھی۔ لیکن اگلی آیت میں اللہ تعالٰی نے خود نبی اکرمؐ سے یہ اعلان کروا دیا ہے کہ انجام کار ہمیں بھلائی ہی نصیب ہوگی۔ تم ہمارے لیے دو میں سے کسی ایک بھلائی کا انتظار کرو اور ہم تمہارے لیے اللہ کے عذاب کا انتظار کرتے ہیں جو تمہیں یا تو اللہ کے مخفی لشکروں جنود السموت والارض کے ذریعے پہنچے گا' اور یا خود ہمارے

ہاتھوں پہنچے گا' کہ تمہیں میدان جنگ میں آخری شکست فاش نصیب ہوگی۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

(اے رسول سلام علیہ) منافقوں سے کہہ دیجئے کہ تم ہمارے لیے دو میں سے ایک بھلائی کا انتظار کرو۔ اور ہم بھی تمہارے لیے (دو میں سے ایک چیز کا) انتظار کرتے ہیں کہ یا تو اللہ تعالٰی تمہیں اپنی طرف سے (اپنے جنود السموت والارض زلزلہ' آندھی' سیلاب وغیرہ کے ذریعے) عذاب کرے' اور یا وہ ہمارے ہاتھوں سے تمہیں شکست فاش دلا کر عذاب کرے۔ پس تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔

○ **اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ** کی تفسیر اگلے الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ یا تو مومنوں کو یہ بھلائی پہنچے گی کہ اللہ تعالٰی ان کے دشمنوں پر اپنی طرف سے عذاب لے آئے گا (زلزلہ' آندھی یا سیلاب وغیرہ) جیسے کہ بعض انبیاء کے مخالفین کو الگ الگ ان عذابوں میں گرفتار کرکے ختم کر دیا گیا تھا اور یا میدان جنگ میں انہیں خود مومنوں ہی کے ہاتھوں سے شکست فاش کا عذاب دیا جائے گا۔ یہ دونوں صورتیں مومنوں کے لیے کامیابی کی دلیل ہیں۔

○ **بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ** کی وضاحت اوپر کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالٰی منکرین پر اپنے ارضی اور سماوی لشکروں زلزلہ' آندھی یا سیلاب کا کوئی عذاب نازل کر دے۔

○ **اَوْ بِاَيْدِيْنَا** کی وضاحت بھی اوپر گزر چکی ہے کہ یا منکرینِ ضابطۂ الٰہی سے مومنوں کی مٹھ بھیڑ میدان جنگ میں ہو اور انہیں ایسی شکست فاش ہو جائے کہ ان میں مخالف طاقت کی ادنٰی سی رمق بھی باقی نہ رہے۔

منافقوں کا خرچ کیا ہوا مال قبول نہیں ہوگا ○ منافق لوگ اپنے آپ کو مومنوں کے ساتھ ظاہر کرنے کے لیے زبانی دعوؤں کے علاوہ یہ بھی کرتے تھے کہ بظاہر اللہ کی راہ میں کچھ مال بھی دیتے تھے۔ لیکن اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ تمہارا مال قبول نہیں ہوگا۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

(اے رسول سلام علیہ منافقوں کو) کہہ دیجئے گا کہ خواہ تم خوشی سے مال خرچ کرو یا ناخوشی سے خرچ کرو۔ تم سے ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ بلاشبہ تم حدیں توڑنے والی قوم ہو۔

○ یہ جو کہا گیا ہے کہ تمہارا خوشی سے دیا ہوا مال بھی اللہ تعالٰی کے ہاں قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ اس لیے کہ وہ قوم جو در پردہ اسلامی ریاست کے دشمنوں کے ساتھ ملی ہوئی ہو اور مومنوں کے اندر رہ کر ان کے دشمنوں کی جاسوسی کے فرائض انجام دیتی ہو تو ظاہر ہے کہ جو مال وہ بظاہر بخوشی خاطر دے رہی ہو وہ اس لیے ہوگا کہ ان کی طرف سے مومن مطمئن ہو جائیں تاکہ وہ کھل کر جاسوسی کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ منافقوں کے ناخوشی سے دیئے ہوئے مال کے ساتھ ساتھ خوشی سے دیئے ہوئے مال کے متعلق بھی اعلان کرا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالٰی کے ہاں دونوں ہی قبول نہیں کیے جائیں گے۔

اگلی آیت مجیدہ میں کھل کر بیان کر دیا گیا ہے کہ منافقوں کا مال اللہ کے ہاں کیوں قبول نہیں ہوگا۔

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور نہیں منع کیا ان سے کہ ان سے ان کا خرچ کیا ہوا مال قبول کیا جائے مگر یہ کہ بلا شبہ انہوں نے اللہ کا انکار کیا اور اس کے رسول سلام علیہ کا انکار کیا۔ اور وہ اجتماعی نظام کے لیے صلوٰۃ موقت کی طرف نہیں آتے مگر سستی کے ساتھ اور وہ مال خرچ نہیں کرتے مگر ناخوش ہوکر خرچ کرتے ہیں۔

○ دیکھئے ! اس آیت مجیدہ میں:۔

○ منافقوں کے ظاہر ایمان کی مطلقاً نفی کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کا نہ اللہ پر ایمان ہے نہ رسولؐ اکرم خاتم النبین رحمتہ للعٰلمین پر ایمان ہے۔ یہ ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں' جس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ مومنوں کے اجتماعی نظام صلوٰۃ موقت میں ٹوٹے ہوئے ذہن کے ساتھ آتے ہیں اور جو تھوڑا بہت مال خرچ کرتے ہیں' خوشی سے نہیں بلکہ ناخوشی سے خرچ کرتے ہیں۔ ان کی خوشی فریب محض ہوتی ہے۔

منافقوں میں بڑے بڑے مال دار آدمی موجود تھے ○ اس سے اگلی آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ منافقوں میں بڑے بڑے مال دار آدمی موجود تھے۔ مگر نبی اکرمؐ کو کہہ دیا گیا کہ آپ ان کے مالوں پر تعجب نہ کریں اللہ تعالیٰ انہیں عذاب میں مبتلا کرے گا:۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

پس (اے رسول سلام علیہ !) آپ کو ان (منافقوں) کا مال حیرت میں نہ ڈال دے اور نہ ان کی اولاد سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ (ان کی منافقت کی بدولت) ارادہ کرتا ہے کہ انہیں اس (ان کے مال) کے ساتھ دنیا کی زندگی ہی میں عذاب کرے اور ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہی ہوں۔

○ **اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ:۔

منافقوں میں بڑے بڑے مال دار لوگ بھی موجود تھے' جن کی کثرتِ مال پر تعجب کیا جاسکتا تھا۔ نیز وہ لوگ بڑی بڑی اولادوں والے بھی تھے۔ لیکن:

○ **اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** کے الفاظ سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انہیں اللہ نے ان کے مالوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ دنیا کی زندگی ہی میں عذاب دیا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ کبھی باطل نہیں ہوسکتا۔

ایک عظیم تاریخی تنازعہ کا قرآنی حل ○ اہل اسلام میں' نام نہاد اسلامی تاریخ کے باب اول ہی میں ایک عظیم تاریخی تنازعہ مدت مدید سے چل رہا ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفاتِ مبارکہ کے بعد یکے بعد دیگر جو تین صحابیؓ آپ کے جانشین ہوئے

تھے مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ وہ تینوں منافق تھے۔ العیاذ باللہ ! لیکن یاد رہے کہ آیت بالا ۹/۵۵ کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ منافقوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی دنیوی زندگی ہی میں خود ان کے مالوں اور ان کی اولادوں کے ذریعہ عذاب کیا تھا۔ یعنی ان کے مال ان سے چھن گئے تھے اور وہ مال خود انہی کے خلاف ان کی تباہی و بربادی کے لیے خرچ ہوئے تھے اور ان کی اولادوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح عذاب کیا کہ وہ مسلمان ہوگئیں اور ان کے خلاف جہاد کیا۔ حتیٰ کہ وہ اسی حالت میں کہ ان کے مال ان کے خلاف خرچ ہو رہے تھے اور ان کی اولادیں ان کے خلاف مصروف پیکار تھیں' بلا توبہ کفر ہی کی حالت میں مرگئے۔ یہ تو ہوا قرآن مجید کا فیصلہ مگر۔

○ جو لوگ نبی اکرمؐ خاتم النبیین رحمتہ للعلمین کے پہلے تین مقدس جانشینوں کو معاذ اللہ معاذ اللہ منافق قرار دیتے ہیں ان کے نظریہ کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ناکام ہوگیا۔ وہ منافقوں کو ان کی دنیوی زندگی ہی میں خود انہی کے مالوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ عذاب دینا چاہتا تھا مگر بجائے اس کے کہ وہ دنیا میں مغضوب ہوتے' الٹے انہیں نبی اکرمؐ کی خلافت یعنی جانشینی میسر آئی ان کے مال اللہ کے رسول سلام علیہ نے خود طلب کئے اور وہ اللہ کی راہ میں صرف ہوئے۔ نیز ان کی اولادیں بجائے اس کے کہ ان کے لیے باعث عذاب بنتیں اور خود ان کی قاتل ہوتیں' ان کی معاون و مددگار ہوئیں اور وہ تینوں رضی اللہ عنہم اسلام کی عظیم خدمت بجالاتے ہوئے زندگی بھر خوش و خرم اور صاحب اقتدار رہے۔

○ اب چونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔ اس لیے اس چیز میں معمولی سے شک کی گنجائش تک موجود نہیں کہ منافقوں کو ان کی زندگی ہی میں ان کے مالوں اور اولادوں کے ذریعہ عذاب نہ کیا گیا ہو اور وہ مغضوب ہونے کی بجائے صاحبِ اقتدار ہوگئے ہوں۔ اس لیے ثابت ہوا کہ یقیناً یقیناً منافقوں کو ان کی زندگی ہی میں ان کے مالوں اور ان کی اولادوں کے ذریعہ عذاب دیا گیا تھا اور وہ تین صحابیؓ جو یکے بعد دیگر نبی اکرمؐ کی مسند خلافت پر فائز ہوئے وہ منافق نہیں تھے۔ حقے سچے مومن تھے۔ کیونکہ اگر وہ منافق ہوتے تو دنیوی زندگی میں اقتدار پانے کی بجائے اپنے مالوں کے ذریعہ' اور اپنی اولادوں کے ہاتھوں عذاب دیئے جاتے۔

سورہ احزاب میں ارشاد ہوا ہے:۔

منافقوں کو نبی اکرمؐ کی زندگی ہی میں ختم کر دیا گیا تھا ○ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۚ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝٦١

(۶۰-۶۱/۳۳۔

○ (اے رسول سلام علیہ !) اگر یہ منافق یعنی جن کے اذہان میں نفاق کی بیماری ہے اور شہر میں بری خبریں اڑانے والے' باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ اس (مدینہ) میں آپ کے پڑوس میں نہیں رہیں گے' مگر تھوڑا عرصہ **ملعون** ہوکر رہیں گے جہاں کہیں پائے جائیں' گرفتار کر لیے جائیں اور اس طرح قتل کر دیئے جائیں جو قتل کرنے کا حق ہے۔

افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے کہ منافقوں کو ان کے مالوں اور اولادوں کے ذریعے عذاب دیا گیا تھا۔ ۹/۵۵
اور وہ گرفتار ہوکر قتل ہوگئے تھے۔ ۳۳/۶۱ مگر

مسلمانوں کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ نہیں نہیں نہ انہیں عذاب دیا گیا تھا نہ وہ گرفتار ہوئے تھے نہ قتل' بلکہ وہ تو مسند خلافت پر فائز ہوئے تھے۔ کاش کہ

اگر ان آیتوں پر غور کیا جائے تو خلافت کا عظیم تنازعہ ایک سیکنڈ میں طے ہو سکتا ہے:۔

اگلی آیت مجیدہ نمبر۵۶ میں منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمہیں میں سے ہیں۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ۝

اور وہ منافق اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں۔ حالانکہ نہیں ہیں وہ تم میں سے ولیکن وہ وہ قوم ہیں جو (جنگ سے) ڈرتے ہیں۔ (میدان جنگ سے خوف کھاتے ہیں)۔

○ **يَفْرَقُونَ** کا سہ حرفی مادہ۔ ف۔ر۔ق۔ فرق ہے جس کا مصدری معنی جدا ہونا بھی ہے اور خوف کھانا اور ڈرنا بھی ہے اگرچہ منافقوں کے متعلق اسی آیتِ مجیدہ میں بتا دیا گیا ہے کہ وہ مومنوں کے ساتھی نہیں بلکہ ان سے جدا ہیں' اس لیے یَفرقُون کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے جدا ہیں' الگ ہیں' مگر چونکہ اگلی آیتِ مجیدہ' ان معنوں کی بجائے اس مادہ کے مصدری معنی ڈرنا کی تائید کرتی ہے کہ وہ ڈرتے ہیں۔ اس لیے **قَوْمٌ يَفْرَقُونَ** کا یہ معنی لکھا گیا ہے کہ وہ' وہ قوم ہیں جو جنگ سے ڈرتے ہیں۔ اگلی آیت انہی معنوں کی تائید کرتی ہے۔

لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ۝

(ان کی حالت یہ ہے کہ) اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ پائیں یا کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ' تو اس کی طرف منہ موڑ کر رسے تڑاتے ہوئے دوڑ جائیں۔

منافق بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں ○ ملجأ' مغٰرٰت اور "مدّخلاً" یعنی کوئی پناہ گاہ' کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے یعنی چھپنے کی جگہ' ان ہر سہ الفاظ سے عیاں ہے کہ یہ تینوں جگہیں ڈرنے والوں' بزدلوں اور بھگوڑوں کی ہیں' میدان جہاد میں داد شجاعت دینے والوں کی نہیں۔ پس اس آیت مجیدہ سے ثابت ہوا کہ منافقوں کی ایک قرآنی نشانی یہ ہے کہ وہ بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔

منافق حریص اور طعنہ زن ہوتے ہیں: اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جب نبی اکرمؐ سلام علیہ صدقات کا مال غرباء میں تقسیم فرماتے تو وہ آپ کو طعنے دیتے۔ اگر اس میں سے انہیں کچھ مال مل جاتا تو راضی ہو جاتے اور اگر نہ ملتا یعنی نبی اکرم سلام علیہ' اگر انہیں مستحق نہ جان کر انہیں کچھ نہ دیتے' جیسے کہ آیت نمبر۵۵ میں گزر چکا ہے کہ وہ مال دار تھے تو وہ جھٹ ناراض ہو جاتے:۔

وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ۝

اور ان (منافقوں) میں سے بعض وہ ہے جو (اے رسول .. پ کو صدقات (کے ضمن) میں طعنے دیتا ہے۔ پھر اگر انہیں اس ۔ں سے (کچھ مال) دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر نہ ملے تو جھٹ ناراض ہو جاتے ہیں۔

پھر ارشاد باری ہے:۔

وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ ۙ وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ ﴿۵۹﴾

اور اگر وہ اس پر راضی ہوں جو اللہ' انھیں اپنے رسولؑ کے ذریعہ دے (تو بہتر ہے) اور وہ کہیں کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے وہ عنقریب ہمیں اپنے فضل سے مزید مال دے گا اپنے رسولؑ کے ذریعہ۔ بلا شبہ ہم اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔

اللہ کے فضل میں اس کا رسول شریک نہیں ہے ○ اس آیت مجیدہ کے الفاظ:۔

اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ اور **سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ...... وَرَسُوۡلُهٗۤ** کا معنی لکھا گیا ہے:۔ "اللہ نے دیا اپنے رسولؑ کے ذریعہ" اور "عنقریب مزید مال دے گا اللہ ... اپنے رسول سلام علیہ کے ذریعہ" یہ اس لیے کہ حقیقی طور پر معطی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ زمانۂ رسالت محمدی میں جب نبی اکرمؑ نے قرآنی نظام قائم فرمایا اور مالِ غنیمت اور صدقات کے مال کو جب آپ تقسیم فرماتے تو اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قانون کے مطابق حقداروں ہی میں تقسیم فرماتے تھے۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مال کو اپنے رسولؑ کے ذریعہ تقسیم کرواتا اور حقداروں کو دلواتا تھا۔ اس لیے معطی' وہ صرف آپ ہے زمانۂ رسالت میں وہ اپنے رسول کے ذریعہ دلواتا تھا۔

داتا صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ ○ افسوس ہے کہ **اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ** اور **سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ.... وَرَسُوۡلُهٗۤ** کے الفاظ سے نبی اکرم کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ داتا تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ **اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ** کے بعد آیا ہے **وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ** اور وہ یہ کہیں کہ ہمارے لیے اکیلا اللہ ہی داتا کافی ہے۔

○ اور **سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ** کے درمیان میں آیا ہے واحد کا صیغہ **مِنۡ فَضۡلِهٖ** یعنی اللہ اکیلے کے فضل سے

پس:۔ **حَسۡبُنَا اللّٰهُ** اور **مِنۡ فَضۡلِهٖ** کے الفاظ قرآنیہ سے بصورت نصف النہار عیاں ہے کہ داتا بھی ایک اکیلا اللہ ہی ہے۔ کافی بھی ایک اکیلا اللہ ہی ہے اور صاحبِ فضل بھی ایک اکیلا اللہ ہی ہے کیونکہ **حَسۡبُنَا اللّٰهُ** میں بھی لفظ اللہ بصیغہ واحد آیا ہے **حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ** نہیں آیا۔ اور اسی طرح **مِنۡ فَضۡلِهٖ** میں بھی ہٖ ضمیر واحد برائے اللہ واحد آئی ہے۔ **مِنۡ فَضۡلِهِمَا** ضمیر تثنیہ نہیں آئی۔ اگر اللہ کے فضل میں اللہ کے ساتھ رسول مقبول سلام علیہ بھی شریک ہوتے تو آنا چاہئے تھا۔

○ **سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ مِنۡ فَضۡلِهِمَا** یعنی عنقریب ہمیں اللہ اور اس کا رسول سلام علیہ دونوں اپنے اپنے فضل میں سے دیں گے۔ پس آیت مجیدہ میں الفاظ **سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ** کا صحیح معنی یہ ہے کہ:۔ضرور اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے اپنے رسول سلام علیہ کے ذریعہ دے گا۔

واوٗ بمعنی "بذریعہ" کی قرآنی مثال ○ اب رہا یہ سوال کہ کیا قرآنی لغت و قواعد کے مطابق واوٗ بمعنی "بذریعہ" یا بمعنی "کے ذریعہ" قرآن مجید میں موجود ہے؟ جی ہاں اسی سورہ توبہ کی آیت نمبر۳ میں آیا ہے:۔

○ **وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ وَرَسُوۡلُهٗ** ۹/۳۔

اس آیت مجیدہ میں تحریر کردہ واوٗں کا معنی ہے بذریعہ اور بذریعہ یا کے ذریعہ کے سوا دوسرا معنی یہاں لگ ہی نہیں سکتا۔ دیکھئے

! یہ ہے معنی اور مفہوم۔

○ اور حج اکبر کے دن لوگوں کی طرف اللہ کا اعلان ہے۔ اس کے رسول سلام علیہ کے ذریعہ کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعہ مشرکوں سے بیزار ہے۔ دیکھئے ! **اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ** کے الفاظ سے اللہ اور رسول کے دو الگ الگ اعلان مراد نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بیزار ہے۔ اور اس بیزاری کا اظہار بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سلام علیہ ہی کے ذریعہ فرمایا تھا۔

صدقات کے مصرف ○ اوپر آیت نمبر۵۸ میں بتایا گیا ہے کہ صدقات کے مال میں سے اگر منافقوں کو کچھ دے دیا جاتا تو وہ خوش ہو جاتے اور اگر نہ دیا جاتا تو جھٹ ناراض ہو جاتے اس لیے اگلی آیت مجیدہ میں صدقات کے مصرف بتا دیئے گئے ہیں کہ یہ مال حق داروں ہی میں تقسیم کیا جائے گا۔ غیر حقداروں کو نہ اس مال کی طلب کرنی اور نہ اس کے نہ ملنے پر ناراض ہو جانا چاہیے۔ دیکھئے ارشاد باری:-

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

سوائے اس کے نہیں ہے کہ صدقات کا مال حاجتمندوں کے لیے ہے۔ اور ان کے لیے ہے جن کے کاروبار ساکن ہو جائیں۔ اور اس عملہ کے لیے ہے جو صدقات وصول کرنے پر متعین ہو اور ان نو مسلموں کے لیے جن کی دلجوئی کرنا ہو۔ اور غلاموں کی گردنیں آزاد کرنے کے لیے ہے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے کے لیے ہے۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے ہے اور مسافروں کے لیے ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

① **الفقرآء** فقیر کی جمع ہے۔ فقیر کا معنی بھکاری نہیں ہے۔ بلکہ فقیر کا معنی ہے وہ شخص جس کی ضروریات زندگی میں سے کوئی حاجت رکی پڑی ہو۔

② **المسٰکین** مسکین کی جمع ہے۔ اس لفظ کا سہ حرفی مادہ ہے۔ س۔ک۔ن= سکن۔ جس کا معنی ہے کسی متحرک کا ساکن ہو جانا۔ اس طرح مسکین کا معنی ہے۔ وہ شخص جس کا چلتا کاروبار کسی بھی وجہ سے ساکن ہو جائے' رک جائے۔ صدقات کے مال سے اس کے رکے ہوئے کاروبار کو پھر سے متحرک کر دیا جائے گا۔ مثلاً" بارش' آندھی' آگ زلزلہ یا سیلاب سے جن افراد کے کاروبار و رہائش وغیرہ متاثر ہو۔ اسلامی حکومت صدقات کے مال سے اس کی مدد کرے گی اور جو کمی واقع ہوئی ہو' پورا کرکے' اسے پھر سے معاشرہ میں رواں دواں کر دے گی۔ اب چونکہ ان حادثات کا کسی بھی وقت پر اچانک رونما ہونا ممکن ہے اس لیے لازم ہے کہ صدقات کا بیت المال ہر آن لبالب بھرا پڑا ہو۔ اسی کے لیے آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ سے یہ حکم ثابت ہوتا ہے کہ صدقات کا مال جمع کرنے کے لیے ایک الگ محکمہ متعین کیا جائے اور اس میں کام کرنے والے عملہ کے وظائف اسی مال سے ادا کیے جائیں۔

③ **وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا** سے یہی مراد ہے جس سے کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے صدقات وصول کرنے اور اکٹھے کرکے بیت المال میں جمع کرانے کے لیے ایک الگ محکمہ مقرر کر رکھا تھا اور اس قرآنی حکم کے مطابق اس عملہ کے

وظائف صدقات کے مال ہی سے ادا کئے جاتے تھے۔

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ نو مسلموں کی ثابت قدمی اور ان کی دلجوئی کے لیے بھی مال خرچ کرنا لازم ہے تاکہ انہیں مسلمان ہونے کے بعد کسی قسم کی مالی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اور ان پر بھی صدقات میں سے ہی مال خرچ کیا جائے گا۔

وَفِي الرِّقَابِ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی گردنیں بکی ہوئی ہوں یعنی غلاموں کی گردنیں بھی اسی مال "صدقات" کے ساتھ آزاد کرائی جائیں گی۔ واضح رہے کہ اسلام شرفِ انسانیت کا صدفی صد محافظ ہے۔ غلاموں کی آزادی کا مسئلہ شرفِ انسانیت سے متعلقہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس لیے اسلام نے اسے بھی ہر مقام پر ملحوظ رکھا ہے۔

وَالْغَارِمِينَ سے مراد معاشرہ کے وہ افراد ہیں جو قرضہ کی ذلت میں پھنسے ہوئے ہوں۔ ان کا قرضہ ادا کرکے انہیں بھی شرفِ انسانیت سے بہرہ یاب کرنے کے لیے صدقات کے بیت المال ہی سے مال خرچ کرنا ہوگا۔

وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ کا معنی اگرچہ صرف یہ ہے کہ صدقات کے مال اللہ کی راہ میں بھی خرچ کئے جائیں گے۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اوپر جو چھ مدیں بیان ہوئی ہیں' کیا وہ فی سبیل اللہ سے خارج ہیں؟ جبکہ وہ بھی سب فی سبیل اللہ ہی سے متعلق ہیں تو غور کرنا پڑے گا کہ یہاں فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟ اس کے لیے جب تصریفِ آیات کے ذریعہ قرآن مجید میں غور کریں تو آیتِ مجیدہ ۴/۷۵ کے الفاظ ذیل ابھر کر سامنے آجاتے ہیں:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۴/۷۵ اور تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہ لڑو گے۔ جب کہ کمزور کئے گئے مرد' عورتیں اور بچے کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال لے کہ اس کے حاکم ظالم ہیں۔

اس آیت مجیدہ میں جو فی سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لیے قتال کرنا' فی سبیل اللہ ہے تو اب ظاہر ہے کہ قتال بغیر تیاری کے ممکن نہیں اور تیاری بغیر مال کے ناممکن ہے' جو قبل از وقت ہونی لازم ہے' کیونکہ جب جنگ شروع ہو جائے تو اس وقت تیاری ہوگی یا جنگ؟ پھر جنگ کی ایک صورت دفاعی بھی ہے' یعنی جب کوئی دشمن اسلامی ریاست پر چڑھ دوڑے تو اسے ناک چنے چبوانے کے لیے اسلامی لشکر ہر قسم کے سامان حرب سے لیس تیار ہو۔ پس تصریفِ آیات کی مدد سے آیت زیر بحث ۹/۶۰ میں فی سبیل اللہ سے مراد مظلوموں کی مدد اور دفاعی ضروریات کے لیے فوجی تیاریوں پر مال خرچ کرنا ہے۔ تاکہ لشکر اسلام کی فوجی تیاریاں ہر آن مکمل رہیں۔

وَابْنِ السَّبِيلِ سے مراد ہر قسم کے مسافروں کی وقتی ضرورتوں پر مال خرچ کرنا ہے خواہ وہ اندرونِ ملک کے مسافر ہوں جو کسی وجہ سے بے خرچ ہو جائیں۔ انہیں عوام کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑیں۔ آیتِ بالا میں ان کا حق اسلامی حکومت کے ہاں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ نیز اس سے مراد غیر ملکی سیاح اور سفیر بھی ہیں جن کی وقتی ضروریات پورا کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ جو صدقات کے مال ہی سے پوری کی جائیں گی۔

فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ یہ سب مدیں اللہ تعالیٰ کی فرض کردہ ہیں۔ ان میں سے کسی ایک

میں کمی یا نافرض شناسی کرنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے جس سے بچنے کے لیے مذکورہ بالا آٹھوں شقوں کا پورا کرنا لازم ہے۔

○ **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ** جملہ آیت زیر بحث کا آخری جملہ ہے۔ جس میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ آٹھوں مدیں علم و حکمت کی اساس پر قائم کی گئی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ کے علم سے بڑھ کر اور کس کا علم ہو سکتا ہے؟ جس سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم نہ تو ناقص ہے نہ نامکمل اور ساتھ ہی اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ جملہ احکام حکمت (دانائی) ہی سے متعلقہ ہیں اور یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ دنیا کا کوئی کام بھی حکمت کے بغیر صحیح خطوط پر انجام پذیر نہیں ہوتا۔

ایک مضبوط بیت المال کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ○ پس کھل کر ثابت ہو چکا کہ اگر اہل اسلام صد فیصد کامیاب حکومت کے متمنی ہیں تو انہیں عوام سے وصول کردہ مال صدقات کا ایک انتہائی طاقت ور بیت المال قائم کرنا چاہیے۔ جو ایک الگ محکمہ کے ماتحت ہو۔ وزارت صدقات بھی الگ ہو اور اس کا وفاقی' صوبائی' ضلعی' تحصیل دار' تھانہ دار اور ذیل دار عملہ بھی الگ الگ ہو۔ اس عملہ کو معقول وظائف ادا کئے جائیں وہ شبانہ روز صدقات کی وصولی میں منہمک ہو تا کہ بیت المال ہر آن بھرپور چھلک رہا ہو۔

○ پھر مضبوط بیت المال کے قیام کے علاوہ مذکورہ بالا ربانی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک کامیاب حکومت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک مال صدقات کے مذکورہ بالا آٹھوں مصرفوں کو عملاً" نہ اپنایا جائے اسی سے ریاست کا داخلی اور خارجی استحکام مکمل ہوگا۔ داخلی طور پر:۔

۱۔ اندرون ملک کوئی حاجت مند ایسا نہ ہو جس کی کوئی ضرورت رکی ہوئی ہو۔ اور اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت موجود نہ ہو۔
۲۔ اندرون ملک کوئی فرد ایسا نہ ہو جس کا کاروبار رک گیا ہو اور وہ معاشرہ میں ساکن ہو کر رہ گیا ہو۔
۳۔ اندرون ملک کوئی فرد ایسا نہ جو اسلام تو قبول کرنا چاہتا ہو' مگر اس کی راہ میں مالی مشکلات کے پہاڑ حائل ہوں جو اسے اسلام کی طرف آنے نہ دیتے ہوں' یا اگر وہ اسلام لا چکا ہو تو اسے مالی مشکلات متزلزل کر رہی ہوں۔
۴۔ اندرون ملک سرکاری عمال میں سے کوئی فرد ایسا نہ ہو جسے بروقت اور باقاعدہ وظیفہ نہ مل رہا ہو۔
۵۔ اندرون ملک کوئی ایسا فرد موجود نہ ہو جس کی گردن بکی ہوئی ہو اور اسے آزاد نہ کرا دیا گیا ہو۔
۶۔ اندرون ملک کوئی فرد موجود نہ ہو جو قرضے اور تاوان کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو اور اس پر سے وہ بوجھ اتار نہ دیا گیا ہو۔
۷۔ اندرون ملک ملکی دفاع اور فوجی تیاریاں ہر آن مکمل ہوں تاکہ بوقت مظلوموں کی مدد بھی کی جاسکے اور اگر دشمن حملہ آور ہو تو اس کے دانت بھی فوراً" توڑے جاسکیں۔
۸۔ اندرون ملک مسافروں کی سہولتوں کے لیے ہر طرف سڑکوں اور ریلوے لائنوں کے جال بچھے ہوئے ہوں۔ حسب ضرورت ریلیں اور بسیں میسر آئیں۔ اور اندرون و بیرون ملک ہوائی سروسوں کا انتظام مکمل ہو۔ نیز بیرون ملک سے آنے والے سیاحوں' سفیروں اور سیاسی مہمان مسافروں کی تمام وقتی سہولتیں ہر وقت مکمل ہوں۔

پس یہ آٹھوں شقیں علم و حکمت کے بھرپور مظاہر ہیں ○ ان آٹھوں شقوں پر عمل کئے بغیر دنیا کی نہ کوئی

حکومت ہی کامیاب ہوسکتی ہے اور نہ ہی کوئی قوم عالمی قومی برادری میں عزت کا مقام حاصل کر سکتی ہے اور نہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جاسکتی ہے۔

صدقاتی نظام' سودی نظام کی ضد ہے ○ واضح رہے کہ اوپر آیت مجیدہ ۹/۶۰ میں صدقات کے مصرف کی تفصیل میں طاقت ور اور کامیاب حکومت کے قیام کا راز بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ضمن میں ایک سوال باقی ہے کہ صدقات سے مراد گیا ہے اور ان کی تفصیل کیا ہے؟ جواباً" عرض ہے کہ قرآن مجید نے سر فہرست صدقات کو سودی نظام کی ضد بیان کیا ہے:۔

○ **يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ** ۲/۲۷۶۔ اللہ تعالیٰ سودی نظام کو مٹانے کا اور صدقاتی نظام کو بڑھانے کا حکم دیتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نے تقابل ضدّین کے ذریعہ جو معنی صدقات کا ۲/۲۷۶ میں بتا دیا ہے۔ یہ اس قدر جامع اور بلیغ ہے کہ اس سے نظام صدقات کی حقیت کھل کر عیاں ہو چکی ہے کہ سودی نظام جو ضرورت مندوں کی وقتی ضرورتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تذلیلِ انسانیت کرتا ہے۔ صدقاتی نظام میں اس کے برعکس ہر طرف شرفِ انسانیت کا پرچم لہرارہا ہوتا ہے۔

○ ظاہر ہے کہ سودی نظام میں حاجت مند افراد کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کی ضرورتیں اس طرح پوری کی جاتی ہیں کہ سود خوار قرض خواہ کی کمائی میں ظالمانہ انداز سے حصہ دار بن جاتا ہے۔ مگر صدقاتی نظام میں کسی بھی فردِ معاشرہ کی وقتی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی بجائے اس کا حق تسلیم کرتے ہوئے ہر رکی ہوئی ضرورت بروقت پوری کی جاتی ہے۔

○ صدقاتی نظام کی اس تفصیل کے بعد اب آیئے اس سوال کی طرف کہ صدقات سے مراد گیا ہے جو عوام سے وصول کئے جائیں گے۔ اور جن کی وصولی کے لیے ملک بھر میں ایک الگ محکمہ ہر آن مصروفِ عمل رہے گا۔ قرآن مجید میں ایک تو آیا ہے لفظ زکوٰۃ کا جس کے متعلق سورہ حٰم سجدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے' وہ مشرک اور آخرت کے منکر ہیں:۔

○ **وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ○ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ** ○ ۴۱/۶-۷۔ اور تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ وہی تو آخرت کے منکر ہیں۔ اسی چیز کو **وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ** ۲/۳ کے الفاظ میں نمایاں کیا گیا ہے۔ پس ان آیات کریمات سے وضاحتا" عیاں ہو رہا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ بصورت دیگر قرآن مجید کی میزان میں اسے مشرک اور آخرت کا کھلا منکر قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ریاست کے ہر فرد سے زکوٰۃ کی وصولی ایک بہت بڑا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے لازما" الگ وزارت بھی ضروری ہے اور وفاقی' صوبائی' ضلعی' تحصیل دار' تھانہ دار ذیل دار عمال کی تقرری بھی لازمی ہے۔

○ یہ تو ہوئی زکوٰۃ جو ہر مسلمان پر فرض ہے جو سرکاری طور پر جمع کی جائے گی اور حکومت کا متعینہ عملہ اسے حلقہ وار وصول کرکے سرکاری بیت المال میں جمع کرائے گا۔ زکوٰۃ کے علاوہ قرآن مجید میں جو صدقات کے الفاظ آئے ہیں' علماءِ روایات نے ان کا معنی بھی زکوٰۃ ہی لیا ہے۔ جیسے کہ مولوی احمد علی صاحب لاہوری مرحوم نے انجمن خدام الدین لاہور کے شائع کردہ مترجم قرآن کے صفحہ نمبر۳۰۰ پر آیت مجیدہ ۹/۶۰ کے الفاظ **إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ ...... الخ** کا معنی لکھا ہے:

"زکوٰۃ مفلسوں اور محتاجوں اور اس کا کام کرنے والوں کا حق ہے۔"

○ لیکن جہاں تک تدبر فی القرآن بتصریف آیات الفرقان کا تقاضہ ہے' صدقات وہ مال ہے جو معاشرہ کے مال داروں سے زکوٰۃ کے علاوہ وصول کیا جائے گا جیسے کہ ۹/۱۰۳ میں ارشاد ہوا ہے:۔

○ **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔** ۹/۱۰۳۔ اے رسول سلام علیہ ! (معاشرہ کے مال داروں سے) ان کے مالوں سے صدقہ کے طور پر مال وصول فرمائیں۔ اور اس مال کے ساتھ (معاشرہ کے ناداروں کو) غربت سے پاک کریں اور ان کی نشوونما فرمائیں۔ یہ مال زکوٰۃ کے مال سے الگ ہے۔ مگر چونکہ اس میں بھی **تُزَكِّيْهِمْ بِهَا** کے الفاظ مادہ ۔ز۔ک۔و= زکو ہی سے آئے ہیں۔ اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ صدقات کے مال بھی مال زکوٰۃ ہی کی ایک مد ہیں' جن کی خصوصیت یہ ہے کہ مال زکوٰۃ تو ہر فرد ریاست سے ایک مقررہ مقدار کے مطابق وصول کیا جائے گا۔ مگر صدقات صرف مال داروں سے لیے جائیں گے۔ اور ان کی مقدار محکمہ کے اعلیٰ افسر' مالی وسعت کے مطابق خود مقرر کیا کریں گے۔

○ اب چونکہ آیت مجیدہ ۹/۱۰۳ میں صدقات کو بھی زکوٰۃ ہی کی ایک شق قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے ۹/۶۰ میں جز بمعنی کل کے انداز میں دونوں قسم کے مالوں کے لیے قرآن مجید نے لفظ صدقات کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ ریاست کے محکمہ صدقات کے عمال زکوٰۃ اور صدقات دونوں کے مالوں کو جمع کریں گے۔ جو ایک ہی صدقاتی بیت المال میں جمع کئے جائیں گے اور ۹/۶۰ میں مذکور آٹھ مدوں پر خرچ کئے جائیں گے۔ یہ پورا انداز اللہ تعالیٰ کے کامل علم اور عظیم حکمت کے عین مطابق ہے' جس پر عمل کرنے سے ریاست کی تمام داخلی خامیاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور خارجی امور بھی کامیاب ہوکر عالمی برادری میں عزت کا مقام دلانے کا موجب بنتے ہیں۔

رجوع الی المطلب ○ آیت مجیدہ ۹/۶۰ کی تفصیلی بحث کے بعد اب پھر اپنے درس کی طرف رجوع فرمائیں۔ ۹/۶۰ سے ماقبل ۹/۵۹ میں منافقوں کا ذکر کیا گیا تھا کہ اگر وہ اس پر راضی رہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ اپنے رسول سلام علیہ کے ذریعہ دیتا ہے اور وہ ہمارے رسول سلام علیہ کو طعنے نہ دیں تو اچھا ہے۔ اگلی آیت ۹/۶۱ میں انہی (منافقوں) کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ رسول سلام علیہ کانوں کا کچا ہے۔ خود تحقیق نہیں کرتا کہ کون صدقات کا حقدار ہے۔ جو کچھ سنتا ہے اسی پر یقین کر لیتا ہے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾

اور ان منافقوں میں سے بعض وہ ہیں جو ہمارے نبی کو ایذا (طعنے) دیتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ وہ کان ہے (سنی سنائی پر یقین کرتا ہے) کہہ دیجئے گا وہ کان تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔ وہ اللہ پر ایمان لاتا ہے اور مومنوں کی خبر پر یقین کرتا ہے (اسے صحیح مانتا ہے) اور وہ ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں رحمت ہے اور جو لوگ اللہ کے رسول سلام علیہ کو طعنے دیتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا

(ایمان والو !) منافق تمہارے لیے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش کریں۔ حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ وہ اسے اس کے رسول کے

مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ ذریعہ خوش کریں۔ بشرطیکہ وہ مومن ہوں۔ (وہ تو مومن ہی نہیں ہیں منافق ہیں)۔

○ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ کے الفاظ میں ایذا بمعنی زبانی طعنے ہیں۔ جس سے ذہنی ایذا پہنچتی ہے جیسے کہ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ میں بلکھی ہوئی واؤ تفسیری بمعنی یعنی کے ذریعہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ نبی اکرمؐ علیہ کو کہتے تھے کہ یہ کان ہے مومن جو خبر دیتے ہیں' اس پر یقین کر لیتا ہے کہ فلاں آدمی صدقات کے مال کا حق دار ہے' فلاں حقدار نہیں ہے اور یہ یقین کر لیتا ہے۔ تصدیق نہیں کرتا۔ حالانکہ نبی اکرمؐ پورے امین تھے۔ کوئی کام غیر ذمہ دارانہ انداز سے کرتے ہی نہیں تھے۔ جیسے کہ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ سے عیاں ہے کہ آپؐ کا یہ انداز بھی رحمت کا حامل تھا۔ کیوں نہ ہوتا' جب کہ آپؐ رحمۃ اللعلمین (سلام علیہ) تھے۔ پورے عالمین کے لیے رحمت تھے ۲۱/۱۰۷۔ سَلَامٌ عَلٰى رحمة للعٰلمين

○ اُذُنٌ۔ اسم فاعل ہے بمعنی سننے والا۔ صرف سن کر یقین کر لینے والا۔ مگر جواب میں کہا گیا ہے:۔

○ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ کہہ دیجئے گا کان تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔ یعنی اس نے خبر رسانی کا ایسا معقول انتظام کر رکھا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال باقی نہیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ صدقات کا مال حقداروں کو ملے' غیر حقداروں کو نہ پہنچے۔

○ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ کا مقامی معنی صاف ہے کہ مومن پاکباز صحابی جو خبریں لاتے تھے' نبی اکرمؐ ان پر پورا پورا یقین فرمایا کرتے کیونکہ حضورؐ کے صحابی اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۸/۷۴ کے مطابق سچے مومن تھے۔ وہ کوئی غلط خبر بلا تحقیق آپؐ کے پاس لاتے ہی نہیں تھے۔

○ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ منافق جو نبی اکرمؐ کو طعنے دے کر ایذا پہنچاتے تھے ان کے جرم کی سزا مقرر کی گئی ہے درد ناک عذاب' جس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عذاب منافقوں کو دنیا ہی میں دیا گیا تھا یا نہیں؟ کیا یہ اخروی عذاب کی خبر ہے؟ جواباً عرض ہے کہ تصریف آیات کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ منافقوں کو دنیا ہی میں یہ عذاب دے دیا گیا تھا۔ جیسے کہ پیچھے آیت نمبر۹/۵۲ میں نبی اکرمؐ سے اعلان کروا دیا گیا ہے:۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۹/۵۲۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجئے گا (اے منافقو !) تم ہمارے لیے دو بھلائیوں میں سے ایک کا انتظار کرو اور ہم تمہارے لیے (دو چیزوں میں سے ایک کا) انتظار کرتے ہیں کہ یا تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے (یعنی اپنے کائناتی لشکروں آندھی' سیلاب یا زلزلہ وغیرہ کے ساتھ) تم پر عذاب لے آئے اور یا وہ (میدان جنگ میں شکست کا درد ناک عذاب) تمہیں ہمارے ہاتھوں سے دلوائے۔

○ تو اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ منافقوں پر ان دو میں سے کون سا عذاب نازل ہوا؟ اس کا جواب اسی سورۃ مجیدہ توبہ میں آگے چل کر ۹/۷۳ سے عیاں ہے' جہاں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے:۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ ۹/۷۳ + ۶۶/۹۔ اے نبی کافروں اور منافقوں دونوں کے ساتھ جہاد

کریں اور ان پر پوری سختی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم (شکست ۳/۱۲) ہے اور وہ کتنی بری ہے جگہ پھر جانے کی۔ (شکست کا کتنا برا عذاب ہے)۔

○ پس اس تکراری آیت مجیدہ کے مطابق منافقوں کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں سے عذاب دیا گیا تھا جہاد کے ذریعہ میدان جنگ میں' جو جَاهِدْ اور وَاغْلُظْ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے تمام نشان بتا کر انہیں نمایاں کرنے کے بعد حکم دیا کہ ان سے جہاد کریں اور ان پر پوری طرح سختی کریں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے اس الٰہی حکم کے مطابق انجام کار منافقوں کے ساتھ جہاد فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مومن صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں شکست فاش کا دردناک عذاب پہنچایا۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ انہیں جاننا چاہیے کہ جو فرد یا قوم اللہ اور اس کے رسول سلام علیہ کا مقابلہ کرتی ہے اس کے لیے شکست فاش کی آگ کا دائمی عذاب ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی پھر وہ کبھی بھی بالمقابل آنے کی طاقت نہیں پائیں گے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾

کیا ان (منافقوں) نے نہیں جانا کہ جو کوئی اللہ کے رسول سلام علیہ کے ذریعہ اللہ کا مقابلہ کرے تو بلاشبہ اس کے لیے شکست کی آگ ہے (۳/۱۲) وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (مذکورہ شکست فاش کی سزا) بہت بڑی رسوائی ہے۔

اس سے اگلی آیت میں منافقوں کا ایک اور نشان بتایا گیا ہے:۔

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَن تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُم بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾

منافق (لوگ) اس چیز سے ڈرتے ہیں کہ ان کے متعلق کوئی سورۃ نازل ہو جو اس چیز کی خبر دے جو ان کے ذہنوں میں (پوشیدہ) ہے۔ کہہ دیجئے (اے رسول سلام علیہ !) کہ تم (اللہ کے دین کا) مذاق اڑاتے رہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو باہر لانے والا ہے جس (کے اظہار سے) تم ڈرتے ہو۔

○ اس آیت مجیدہ سے کھل کر عیاں ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں منافقوں کے ہر چھپے عزائم کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہوا ہے' غرض یہ کہ ایک ایک منافق کھل کر عیاں ہو جائے اور نبی اکرمؐ اللہ کے حکم (۹/۷۳ + ۶۶/۹) کے مطابق ان سے جہاد کریں اور ان پر سختی کرکے ان کی طاقت پوری طرح ختم کر دیں۔ اور ان کے سرغنوں اور ان کے سرگرم عمال کو اس طرح قتل کر دیں جو قتل کرنے کا حق ہے۔ ۳۳/۶۰-۶۱

اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں ہی کے متعلق نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر آپ ان سے سوال کریں گے تو وہ جواب دیں گے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦٥﴾

اور (اے رسولؐ) اگر آپ ان سے (منافقوں سے ان کی منافقت کے متعلق) سوال کریں تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم بحث اور دل لگی کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے گا کہ کیا تم اللہ کے ساتھ' اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول سلام علیہ کے ساتھ تمسخر کرتے ہو؟

نیز فرمایا کہ ○ اگر اس حد تک آگے بڑھ جانے کے باوجود وہ معذرت پیش کریں تو اس پر بھی اگلی آیت مجیدہ میں انتہائی منصفانہ جواب دیا گیا ہے۔

لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٦﴾ ع

تم عذر مت کرو' بلا شبہ تم نے ایمان لانے کے بعد انکار کر دیا ہے۔ اگر ہم تمہارے ایک گروہ کو (جو مجرم نہیں صرف کافر ہوگیا ہے) معاف کر دیں تو ہم دوسرے گروہ کو ضرور عذاب کریں گے۔ اس لیے کہ وہ مجرم ہیں۔

دنیوی سزا کفر کی نہیں' جرم کی ہے ○ اس آیت مجیدہ میں پہلے ارشاد ہوا ہے کہ تم لوگ عذر بہانے نہ بناؤ۔ بلاشبہ تم ایمان لانے کے بعد کافر مرتد ہوگئے ہو۔ لیکن **لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ** ۲/۲۵۶۔ کے مطابق دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو جائے تو اس کے اس فعل کی کوئی دنیوی سزا مرتب نہیں ہوتی۔ مگر جو لوگ کافر ہو جانے کے بعد اسلامی ریاست کے ملکی قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کریں تو ان کے لیے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں منافق مردوں اور عورتوں سب کے متعلق بتایا گیا ہے:۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ ۚ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ۗ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٦٧﴾

منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ وہ حکم کرتے ہیں قرآنی منکرات بجا لانے کا اور منع کرتے ہیں قرآنی معروف نیکیوں سے اور (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے) اپنے ہاتھ بند کئے رہتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھول گئے ہیں۔ اس لیے اس نے انہیں بھلا دیا ہے بلا شبہ منافق جو ہیں تو وہ حدیں پھاندنے والے ہیں۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٦٨﴾

اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں کے ساتھ اور کافروں کے ساتھ جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے۔ وہ (اخروی زندگی میں) اس میں ہمیشہ رہیں گے ان کے لیے وہی کافی ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے بیزار ہوگیا۔ اور ان کے لیے قائم رہنے والا دائمی عذاب ہے۔

جہنم سے مراد ہے ناکامی کی جلن ۳/۱۲ میں جہنم کا معنی بتایا گیا ہے اسی دنیا میں شکست فاش کی جلن کا درد ناک عذاب' محولہ آیت مجیدہ ۳/۱۱۱ میں مخالف کفار کو نبی اکرمؐ سے کہلوا دیا گیا تھا:۔

○ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ○ ۳/۱۲۔ (اے رسولؐ کافروں کو کہہ دیجئے گا کہ تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم (یعنی شکست فاش والے میدان) میں سب اکٹھے کئے جاؤ گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

○ اس کے علاوہ آخری ناکامی کو بھی قرآن مجید میں نار جہنم کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قیامت کے دارالجزا میں جن لوگوں کا نیکیوں والا پلڑا ہلکا رہ جائے گا۔ اور وہ موازنہ اعمال کی رو سے گھاٹا کھا جائیں گے وہ جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔ جہاں پینے کے لیے گرم پانی اور کھانے کے لیے تھوہر میسر آئے گی۔ ہر طرف جسموں کو جھلس دینے والی گرم لو چلتی' اور دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوں گے ایسے لوگوں کو ذہنی جلن کے علاوہ جسمانی جلن کا عذاب بھی دیا جائے گا۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ کفار مکہ نے بھی اپنے وقت میں دنیوی فائدہ اٹھایا اور ان سے پہلی قومیں بھی اپنے اپنے وقت میں دنیوی فائدہ اٹھاتی رہیں۔ لیکن ان کے اعمال دنیا ہی میں ضائع ہوگئے۔ انھیں دنیا میں بھی جہنم' شکست کا عذاب دیا گیا اور وہ آخرت میں بھی گھاٹا کھانے والوں میں سے ہوں گے۔ دیکھیے اس پورے مضمون کو کس وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے:۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾

(اے ضابطہ الٰہی کے منکرو! سنو!) جس طرح تم سے پہلے لوگ جو طاقت میں تم سے زیادہ سخت تھے اور مال اور اولاد میں بھی زیادہ تھے پس وہ اپنے حصے کا دنیوی فائدہ اٹھا گئے۔ پھر تم نے اپنے حصے کا فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسے کہ تم سے پہلے لوگ اپنے حصے کا فائدہ اٹھا گئے اور تم نے اسی طرح بد اعمالیوں کو اپنایا ہے' جس طرح انہوں نے اپنایا تھا۔ ان کے اعمال دنیا ہی میں ضائع ہوگئے اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ (تمہارا حال بھی ایسا ہے تمہیں بھی ان کی طرح دنیا میں شکست اور آخرت میں ناکامی نصیب ہوگی۔)

برادران عزیز! ○ قرآن مجید میں جو کفار مکہ اور سابقہ بد عمل اقوام کے حالات بیان ہوئے ہیں وہ:۔ قصے کہانیاں نہیں ہیں بلکہ صحیح واقعات ہیں ان کی غرض درس عبرت ہے کہ ہم قارئین قرآن حکیم کے ان واقعات سے نصیحت حاصل کرکے اپنے اپنے اعمال کا جائزہ لیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے معروف کو اپنا کر اور اس کے منکر سے پرہیز کرکے دنیا و آخرت کی

کامیابی کے حقدار ہوں نیز انفرادیت سے آگے بڑھ کر اجتماعی مفاد پر ہر آن نگاہ رکھیں تاکہ مسلم قوم پسماندگی کے جہنم سے نکل کر ترقی کی جنت میں داخل ہو جائے۔

اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ کیا ان کے پاس سابقہ نافرمان قوموں کی خبر نہیں آئی۔

الم یاتہم نبا الذین من قبلہم قوم نوح وعاد وثمود وقوم ابرہیم واصحب مدین والمؤتفکت اتتہم رسلہم بالبینت فما کان اللہ لیظلمہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون ﴿۷۰﴾

کیا ان لوگوں کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ قوم نوح کی اور قوم عاد اور قوم ثمود' اور قوم ابراہیم اور مدین والوں کی اور ان بستیوں والوں کی جو الٹ دی گئی تھیں۔ ان سب کے پاس (الگ الگ) ان کے رسولؐ واضح دلائل کے ساتھ آئے پھر ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا تھا اور لیکن انہوں نے (ہمارے رسولوں کو جھٹلا کر) اپنی جانوں پر آپ ظلم کر لیا تھا۔

○ اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کے مد مقابل منافقین' مذکورہ بالا سابقہ اقوام کی طرح نبی اکرمؐ کو جھٹلا کر اپنی جانوں پر آپ ظلم کر رہے ہیں۔ اس سے دو اگلی آیتیں' ۷۱'۷۲' پچھلی دو آیتوں ۶۷'۶۸ کی متقابل ہیں۔ آیات مجیدہ ۶۷'۶۸ میں بتایا گیا ہے کہ منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے میں سے ہیں یعنی وہ سب ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ وہ منکر کا حکم اور معروف سے منع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں اور منافقہ عورتوں کیساتھ جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تو ہے آیات مجیدہ ۶۷-۶۸ میں منافق مردوں اور منافقہ عورتوں کا بیان۔ اس کے متقابل اگلی آیات مجیدہ ۷۱-۷۲ میں مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے وہ بھی ایک دوسرے میں سے ہیں۔ یعنی وہ سب ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے اور منکر سے منع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کے ساتھ سدا بہار باغوں جن کی سطح میں نہریں بہتی ہیں' عمدہ رہائش گاہوں اور عظیم کامیابی کا وعدہ کیا ہے:-

والمؤمنون والمؤمنت بعضہم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینہون عن المنکر ویقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکوۃ ویطیعون اللہ ورسولہ اولئک سیرحمہم اللہ ان اللہ عزیز حکیم ﴿۷۱﴾

اور مومن مرد اور مومنہ عورتیں (سب باہم) ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ معروف (قرآنی نیکیوں) کا حکم دیتے ہیں اور منکر (قرآنی برائیوں سے منع کرتے ہیں۔ اور وہ اجتماعی نظام قائم کرتے اور دلوں کو فربہی دیتے ہیں اور وہ اس کے رسولؐ کے ذریعہ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ ان پر ضرور رحم فرمائے گا' بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

وعد اللہ المؤمنین والمؤمنت جنت تجری من تحتہا الانہر خلدین فیہا ومسکن طیبۃ فی جنت عدن ورضوان من اللہ اکبر ذلک ہو الفوز العظیم ﴿۷۲﴾

اللہ نے مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کیساتھ ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے۔ جن کی سطح میں نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے نیز سدا بہار باغوں میں عمدہ رہائش گاہوں کا۔ (یہ سب اللہ کی خوشنودی کے مظہر ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بہت بڑی چیز ہے یہی تو سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اس تقابلِ آیات پر غور فرمائیں' جس میں الگ الگ بتایا گیا ہے کہ منافق مرد عورتیں منکر کا حکم دیتے اور معروف سے منع کرتے ہیں مگر مومن مرد عورتیں منکر سے منع اور معروف کا حکم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافق مرد عورتوں کے ساتھ جہنم کا وعدہ کیا ہے اور ان سے بیزار ہوگیا ہے' مگر مومن مرد عورتوں کے ساتھ اللہ نے سدا بہار باغوں میں عمدہ رہائش گاہوں' اپنی خوشنودی اور عظیم کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے۔ اگلی آیتِ مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم ہوا ہے کہ منافقوں کے خلاف جہاد کریں اور ان پر پوری سختی فرمائیں:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

اے نبیؐ ! کافروں اور منافقوں (دونوں) کیساتھ جہاد کریں اور ان پر پوری پوری سختی فرمائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ پھر کر جانے کی بہت بری جگہ ہے۔

اب غور فرمایئے گا کہ:۔ اس آیتِ مجیدہ سے کھل کر عیاں ہو چکا ہے کہ زمانہ رسالت میں جس طرح کافر پوری طرح نمایاں تھے' اسی طرح منافق بھی پوری طرح نمایاں ہو چکے تھے۔ تبھی تو حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کے علاوہ منافقوں کے ساتھ بھی جہاد فرمایئے گا۔ اگر منافق چھپے ہوئے ہوتے تو منافقوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم ہی معاذ اللہ باطل ٹھہرتا ہے۔ یہی آیت مجیدہ ۹/۷۳ بالکل انہی الفاظ کے ساتھ ۹/۶۶ میں بھی آئی ہے۔

ایک لمحہ فکریہ:۔ پس یہ تکراری آیت مجیدہ ان حضرات کو غور و فکر کی کھلی دعوت دیتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ منافق لوگ نبی اکرمؐ کی وفات مبارکہ تک چھپے رہے اور آپؐ کے بعد مسند خلافت پر منافقوں ہی نے قبضہ کر لیا۔ استغفر اللہ ! معاذ اللہ ! یہ تصور' نہ صرف یہ کہ انتہائی گمراہ کن اور مخالفت قرآن حکیم پر مبنی ہے' بلکہ نبی اکرمؐ کی ذات مقدس کو بھی اللہ تعالیٰ کا نافرمان ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ۲ مرتبہ کے تکرار کے ساتھ حکم دیا تھا کہ کافروں کے علاوہ منافقوں کے ساتھ بھی جہاد فرمائیں اور ان پر پوری پوری سختی کریں۔ یعنی ان کا پوری طرح خاتمہ کر دیجئے گا۔ مگر نبی اکرمؐ نے معاذ اللہ معاذ اللہ' اللہ کے اس حکم کی نافرمانی کی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافق نہ صرف آپؐ کی زندگی میں وندناتے رہے' بلکہ آپؐ کی وفات کے بعد خلافت پر بھی منافقوں ہی نے قبضہ کر لیا۔ استغفر اللہ ! **مِنْ هٰذِهِ الْمُفْتَرِيَات:۔**

○ المختصر ! آیتِ بالا سے کھل کر عیاں ہو چکا کہ زمانہ رسالت میں منافق نمایاں ہو چکے تھے' مخفی نہیں رہے تھے' چنانچہ اس سے اگلی آیتِ مجیدہ میں منافقوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ پہلے تو کفر بولتے ہیں اور پھر اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا:۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ

(منافق) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے (کلمہ کفر) نہیں کہا' حالانکہ بلاشبہ انہوں نے کلمہ کفر کہا ہے۔ اور اپنے اسلام لانے کے بعد انکار کر دیا ہے۔ اور انہوں نے اس امر کا ارادہ کیا جس تک پہنچ نہیں سکے۔ (انہوں نے اپنے انکار کے ذریعہ مومنوں سے انکار کرانے کا ارادہ کیا مگر کامیاب نہیں ہوئے) وہ نہیں بدلہ لیتے مگر اس کا کہ اللہ نے انہیں اپنے رسولؐ کے ذریعہ غنی کر دیا ہے۔ ہاں اگر وہ توبہ کریں تو ان کے لیے بہتر

اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

ہے۔ اور اگر روگردانی کریں تو اللہ انہیں عذاب کرے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور زمین میں ان کا کوئی نہ خیر خواہ ہوگا نہ مددگار۔

○ اس سے پہلے آیت مجیدہ ماقبل میں:۔ اگرچہ کافروں اور منافقوں دونوں کا ذکر ہے۔ مگر اس آیت مجیدہ میں صرف منافقوں کے متعلق مذکور ہے' کیونکہ ان کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ انہوں نے اسلام لانے کے بعد کلمہ کفر کہا۔ انکار کیا۔ کافر تو مطلقاً" ایمان لائے ہی نہیں تھے۔

○ اب آپ اس آیت پر بھی بنظر تعمق غور فرمایئے گا کہ منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اگر وہ توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں بھی عذاب نہیں کرے گا اور آخرت میں بھی۔ پیچھے آیت نمبر۵۵ میں گزر چکا ہے:۔ **يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** ۹/۵۵۔ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ انہیں خود ان کے مال اور ان کی اولاد کی ساتھ دنیا کی زندگی میں بھی عذاب کرے۔ اور اسی طرح آیت زیر بحث ۹/۷۴ میں بھی انہیں دنیا اور آخرت کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے تو اب بتایئے کہ کیا اللہ تعالیٰ کا ۹/۵۵ والا ارادہ بھی ناکام ہوگیا تھا۔ اور ۹/۷۴ کی وعید بھی باطل ہوگئی تھی کہ منافقوں کو بجائے اس کے کہ دنیا میں عذاب دیا جاتا' الٹا انہیں مسند خلافت کا اعزاز نصیب ہوا۔ پس واضح رہے کہ ان پے در پے آنے والی آیات کریمات سے کھل کر ثابت ہو چکا کہ منافقوں کو دنیا کی زندگی ہی میں عذاب کیا گیا تھا۔ اور مسند خلافت پر فائز ہونے والے اصحابؓ رسولؐ حقے سچے مومن تھے ۸/۷۴ انہیں منافق قرار دینا قرآن مجید کی تکذیب اور رسولؐ مقبول کی توہین ہے۔

○ اگلی آیات مجیدہ میں منافقوں ہی کے بعض افراد کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ذیل کا وعدہ کرکے پھر چکے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور ان (منافقوں) میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ وعدہ کیا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے دے' تو ہم صدقہ دیں گے اور صالحین میں سے ہو جائیں گے۔

فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾

مگر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا تو انہوں نے بخل کیا۔ اور روگردانی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہیں ہی اعراض کرنے والے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

پھر (ان کی اس روش کا یہ نتیجہ ہوا کہ) اس (ان کے بخل) نے ان کے دلوں میں اس دن تک کے لیے نفاق کو پیوست کر دیا ہے' جب وہ اس (سزا) سے ملاقات کریں گے جو اس سبب سے ملے گی جو انہوں نے اس وعدہ کے خلاف کیا جو اللہ کے ساتھ کیا تھا۔ اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

○ اس سے اگلی آیات کریمات میں بھی منافقوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اللہ خوب جانتا ہے جو وہ اہل اسلام کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ

کیا انہوں نے نہیں جانا (یعنی انہیں جان لینا چاہئے) کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کی

نَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِى الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

پوشیدگیوں اور ان کے خفیہ مشوروں کو جانتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ پوشیدگیوں کو اچھی طرح جاننے والا ہے۔
(یہ) وہ لوگ ہیں جو مومنوں میں سے انہیں طعنے دیتے ہیں' جو صدقات کی ادائیگی میں بڑھ کر حصہ لیتے ہیں (کہ سب کچھ دیکر خود قلاش ہو جاؤ گے) اور مومنوں میں سے وہ لوگ جو (خدمت دین کیلئے) جسمانی محنت کے سوا (کوئی مال) نہیں پاتے' وہ (منافق) ان کی تحقیر کرتے ہیں۔ اللہ ان کی (منافقوں) کی تحقیر کرتا ہے اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔

○ منافقت کا معنیٰ ہے دوغلا پن۔ اس لفظ کا سہ حرفی مادہ ہے۔ ن' ف' ق= نفق جس کا معنی ہے وہ بل' وہ سوراخ جس کے دونوں سرے کھلے ہیں۔ یعنی بل میں رہنے والے جانور کا بل کی ایک طرف سے تعاقب کیا جائے تو وہ دوسری طرف سے نکل کر بچ جائے اس طرح نفق یعنی دو راستوں والے بل کی مناسبت سے منافقت کا معنیٰ دوغلا پن بھی ہے منافقوں نے اپنے لیے دونوں راستے کھلے رکھے ہوتے ہیں۔ کہ اگر کافروں کی طرف کوئی فائدہ دکھائی دیا تو جھٹ ان کی طرف ہوگئے ورنہ مومنوں میں گھسے رہے' کیونکہ ان کے ہاں متوازن تقسیم رزق تو ہے ہی۔ آیت بالا ۹/۷۹ میں منافقوں کے اس دوغلا پن کی خبر دی گئی ہے کہ مومنین میں سے جو لوگ خدمت دین کے لیے صدقات کی ادائیگی میں تطوّع کرتے تھے' یعنی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے' وہ لوگ انہیں بھی طعنے دیتے تھے کہ اس طرح کھلے ہاتھوں صدقے دے رہے ہو' دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ کنگال ہو بیٹھو۔

○ اور جن مسلمانوں کے پاس مال نہیں تھا' اور وہ فروغ دین کے لیے صرف جسمانی محنت کی خدمت ہی کرسکتے تھے' وہ لوگ (منافق) انہیں بھی طعنے دیتے' ان کا مذاق اڑاتے اور تحقیر کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دینی خدمت کے لیے مشقت گزار مومنوں کی عزت افزائی فرماتے ہوئے خود منافقوں کی تحقیر فرمائی ہے اور ان کے لیے پے درپے درد ناک عذاب کی وعید پر مزید اضافہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔

نبی اکرمؐ رحمتہ للعلمین کی انسانی ہمدردی اور منافقوں تک کیلئے قلبی دردمندی کا اظہار

○ قارئین کرام ذرا آیات زیر بحث سے دور پچھلی آیات کریمات پر غور فرمائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آیت نمبر ۴۲ سے منافقوں کا ذکر شروع ہوا ہے اور مسلسل آیت نمبر۷۹ تک قریباً" تمام آیتوں میں منافقوں کی منافقانہ کرتوں کو نمایاں کیا گیا اور ان کے لیئے پے درپے درد ناک عذاب کی وعید پر وعید سنائی جا رہی ہے۔ لیکن رحمتہ للعالمین کی شانِ رحمت ملاحظہ فرمائیں کہ آپؐ اس کے باوجود بھی یہی چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح یہ لوگ اب بھی اللہ کے عذاب سے بچ جائیں۔ آپ کے درد مند اور گداز ذہن میں ان لوگوں کے لیے بدستور رحمت و الفت اور شفقت و مغفرت کے پاکیزہ جذبات کا ہفت قلزم موجزن تھا۔ آپ کی آخری تمنا اور انتہائی آرزو یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی بخشش ہو جائے۔

○ مگر قرآن مجید میں مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے جو آذر کیلئے مغفرت کی دعا فرمائی تھی' اسے شرف قبولیت نصیب نہیں ہوا تھا۔ شاید اسی لیے آپ نے مذکورہ منافقوں کے لیے دعا مغفرت نہ فرمائی۔ مگر آپ اپنے انتہائی درد مند ذہن کے ہاتھوں مجبور

ہوکر ملول و محزون رہتے تھے' یعنی یہ کہ اگر دعا کرنے سے ان افراد کی بخشش ممکن ہو جو اس کی حدیں پھاند چکے ہوں تو نبی اکرمؐ دعا مغفرت بھی فرما ہی دیتے' مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے بخشش و عذاب کے غیر متبدل قوانین پر نہ کھلنے والی تالہ بندی کرتے ہوئے اگلی آیت میں ارشاد فرمایا ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

(اے رسول!) ان (منافقوں) کے لیے آپ مغفرت طلب کریں اور یا آپ ان کے لیے نہ مغفرت طلب کریں۔ اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی مغفرت طلب کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ کا اور اس کے رسولؐ کا انکار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حدیں پھاندنے والی قوم کو ہدایت یافتہ نہیں ٹھہراتا (مغفرت ہدایت یافتہ افراد کا حق ہے)

جرائم منافقین کی طویل فہرست اور رحمتہ للعالمین کی انتہائی درد مند ذہنی کیفیت کے اظہار کی مزید آیات مبارکہ

○ آیت بالا میں:-

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون بخشش و عذاب پر انتہائی مخصوص انداز کے ساتھ شدید تالہ بندی کر دی ہے' وہاں نبی اکرمؐ کی انتہائی درد مند ذہنی کیفیت کو بھی نکھار کر بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ منافق' جن کے عذاب کی خبروں پر نبی اکرمؐ ملول و محزون رہتے تھے' وہ وہی تو تھے جو:-

○ مومن بن کر نبی اکرمؐ کی شان رحمتہ للعالمینی سے مستفیض ہونے کے باوجود آپ کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ۹/۴۲

○ جنگ کے موقعوں پر جھوٹے بہانوں کے ساتھ نبی اکرمؐ سے جنگ میں عدم شرکت کی اجازت لے لیتے تھے۔ ۹/۴۳

○ ان منافقوں کے اندر وہ لوگ بھی موجود تھے جو نبی اکرمؐ کے دشمنوں کے لیے جاسوسی کے فرائض ادا کرتے تھے۔ ۹/۴۷

○ یہ لوگ مسلمانوں کے لیے فتنے تلاش کرتے اور نبی اکرمؐ کی تجاویز میں الٹ پھیر کے مرتکب بھی ہو چکے تھے۔ ۹/۴۸

○ اگر نبی اکرمؐ کو کوئی بھلائی پہنچتی تو انہیں بری لگتی تھی اور اگر آپؐ کو کوئی تکلیف پہنچتی تو وہ خوش ہوتے تھے۔ ۹/۵۰

○ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نبی اکرمؐ سے اعلان کروا دیا تھا کہ ان کا مال ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ۹/۵۳

○ وہ قسمیں کھاتے تھے کہ مومنوں میں سے ہیں مگر وہ مومنوں میں سے نہیں تھے۔ ۹/۵۶

○ وہ نبی اکرمؐ کو تقسیم صدقات کے ضمن میں طعنے دیتے تھے۔ پھر اگر اس میں سے کچھ مال انہیں مل جاتا تو خوش ہو جاتے اور اگر عدم استحقاق کی بدولت انہیں کچھ نہ ملتا تو جھٹ ناراض ہو جاتے تھے۔ ۹/۵۸

○ ان میں ایسے افراد بھی تھے' جو نبی اکرمؐ کے متعلق یہ کہتے تھے کہ یہ تو کان ہے۔ صرف سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرتا ہے۔ تصدیق نہیں کرتا۔ ۹/۶۱

○ وہ اللہ و رسولؐ کو خوش کرنے کی بجائے مومنوں کو خوش کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔ ۹/۶۲

○ وہ لوگ ڈرتے تھے کہ کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جس سے ان کے مخفی برے عزائم کا اظہار ہوتا ہو۔ ۹/۶۴

○ منافق مرد اور منافقہ عورتیں باہم ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ وہ منکر کا حکم کرتے اور معروف سے روکتے تھے۔ ۹/۶۷

○ وہ کلمہ کفر کہنے کے باوجود قسمیں کھاتے تھے کہ انہوں نے نہ کلمہ کفر کہا ہے اور نہ ضابطہ الٰہی کا انکار کیا ہے۔ ۷۴/۹

○ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ انہیں اپنے فضل سے نوازے تو وہ صدقات ادا کریں گے اور نیکوکار ہو جائیں گے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان پر فضل فرمایا تو اپنے کئے ہوئے وعدے سے صاف پھر گئے۔ ۷۵-۷۶/۹

○ مومنوں میں سے جو لوگ صدقات کی ادائیگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے منافق انہیں طعنے دیتے تھے کہ کنگال ہو جاؤ گے۔ اور مومنوں میں سے جن لوگوں کے پاس دینی خدمت کے لیے مال نہیں تھا اور وہ صرف جسمانی خدمات پیش کرنے پر مجبور تھے' وہ لوگ ان کی تحقیر و تضحیک کرتے تھے۔ ۹/۷۹

اب غور فرمایئے گا کہ :۔ یہ وہی لوگ تھے' جو مسلمان بن کر نبی اکرمؐ سے ہر قسم کے دنیوی مفاد حاصل کرنے کے باوجود' آپؐ کے دشمنوں کی جاسوسی کے فرائض ادا کرنے کا ارتکاب کر رہے تھے ۹/۴۷۔ مسلمانوں کے لیے فتنے تلاش کرتے تھے اور نبی اکرمؐ کی مہمانہ تجویزوں میں الٹ پھیر کر چکے تھے اور آئندہ کے لیے تائب بھی نہیں ہوتے تھے مگر نبی اکرمؐ کی شان رحمۃ للعالمینی کے قربان جایئے کہ آپ کا درد مند ذہن ان کے عذاب کی خبروں سے ملول و محزون رہتا اور آپ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح یہ لوگ عذاب سے بچ جائیں۔ **سَلٰمٌ عَلٰی رحمۃ لِّلعالمین۔**

○ نبی اکرمؐ کی اس درد مند و گداز ذہنی کیفیت' کہ پوری نوع انسانی ضابطہ الٰہی پر ایمان لاکر دنیوی اور اخروی عذاب سے بچ جائے' قرآن مجید میں مخفی اور مظہر انداز کے ساتھ بتکرار کثیر موجود ہے۔ چند مقامات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

بخشش و عذاب کے قوانین اٹل ہیں' نبی اکرمؐ لوگوں پر داروغہ نہیں تھے :۔ ہدایت و گمراہی لوگ خود اختیار کرتے ہیں' نبی اکرمؐ کوئی داروغہ نہیں تھے کہ زبردستی ہدایت دے کر سب لوگوں کو عذاب سے بچا لیتے۔

○ **لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ** ۸۸/۲۲۔ (اے رسولؐ!) آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں (کہ لوگوں کو زبردستی ہدایت دیکر عذاب سے بچالیں)۔

○ **اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ**○ ۳۹/۴۱ بیشک ہم نے (اے رسولؐ!) آپ پر لوگوں کے لیے سچی کتاب نازل فرمائی ہے (ہدایت اس کی اتباع میں ہے) پس جس نے ہدایت پائی تو اپنے لیے اور جو کوئی گمراہ ہوگیا' اس کا وبال اسی پر ہوگا اور آپ ان کے کارساز نہیں ہیں۔

○ ۱۰۸/۱۰ میں بھی قریبا" الفاظ بالا ہی میں نبی اکرمؐ کی انسانی ہمدردی نمایاں کی گئی ہے۔

نبی اکرمؐ کی درد مند ذہنی کیفیت کا اظہار کھلے لفظوں میں :۔ ○ ان آیتوں میں نبی اکرمؐ کی ذہنی انسانی ہمدردی جو مخفیانہ انداز میں بیان ہوئی ہے' آیات ذیل میں اسے کھول کر نمایاں کر دیا گیا ہے۔

○ **لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ**○ ۱۸/۶ + ۲۶/۳= (اے رسولؐ!) اس لیے کہ لوگ (ضابطہ الٰہی قرآن مجید پر) ایمان نہیں لاتے (اور اس طرح جہنم کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کے غم میں گھل گھل کر) گیا آپ اپنی جان ہلاک کرلیں گے؟۔ سورہ فاطر میں ہے۔

○ **فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ**○ ۳۵/۸= پس (اے رسولؐ!) ان لوگوں پر حسرت کرتے ہوئے آپ کی جان ہی نہ چلی جائے (انہیں بلاوجہ عذاب نہیں کیا جائے گا) بلاشبہ اللہ جانتا ہے جو وہ کرتوتیں کرتے ہیں۔

اب غور فرمایئے گا :۔ ○ آیات بالا میں **لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ** اور **فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ** سے کس طرح کھل کر نبی اکرمؐ کی انسانی ہمدردی کی ذہنی کیفیت عیاں ہو رہی ہے کہ نبی اکرمؐ اپنے دشمنوں تک کے غم میں اس قدر گھلتے رہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ازراہ شفقت ارشاد فرمایا کہ ان نافرمانوں کے لیے ہمدردی میں آپ کی کہیں جان ہی نہ چلی جائے ....

○ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ جنگ سے پیچھے بیٹھ رہنے پر خوش ہوتے ہیں۔ جنگ میں شامل ہونے اور اس کے لیے مالی اور جانی جہاد سے کراہت کرتے ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی یہ کہہ کر روکتے ہیں کہ اس سخت گرمی میں جنگ کے لیے مت نکلو۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

(جنگ سے) پیچھے بیٹھ رہنے والے (منافق) اللہ کے رسولؐ سے پیچھے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے سے کراہت کی ہے اور انہوں نے (جنگ کے لیے نکلنے والوں سے) کہا کہ (اس جھلس دینے والی) گرمی میں مت نکلو۔ (اے رسولؐ کہہ دیجئے گا کہ جہنم (شکست) کی آگ (جلن) گرمی کے لحاظ سے بہت سخت ہے۔ کاش کہ وہ تفقہ کریں۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں جنگ سے پیچھے بیٹھ رہنے پر خوش ہونے والوں (یعنی منافقوں) کو کہا گیا ہے کہ وہ ہنسیں تھوڑا اور روئیں زیادہ۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

پس انہیں اپنے (ڈھیلے پن پر) ہنسنا کم چاہیئے اور رونا زیادہ۔ یہ بدلہ ہے ان کرتوتوں کا جو وہ خود کرتے چلے آرہے ہیں (جب انہیں منافقت کی سزا ملے گی تو اس تھوڑے سے ہنسنے کے مقابلے پر انہیں اپنے انجام پر بہت زیادہ رونا پڑے گا۔

منافقوں کو جنگ میں شامل ہونے سے ہمیشہ کیلئے روک دیا گیا ہے:۔

○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے حکم دے دیا گیا ہے کہ۔
اے رسولؐ اگر آپ کبھی منافقوں کے کسی گروہ کے پاس جائیں اور وہ آپ سے جنگ کی اجازت طلب کرے تو آپ ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنگ میں شمولیت سے روک دیجئے گا۔

فَإِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ إِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ أَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخَالِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

پھر (اے رسولؐ) اگر اللہ آپ کو منافقوں کے کسی گروہ کی طرف پھیر لے جائے (یعنی آپ کسی ضروری دینی کام سے منافقوں کے کسی گروہ کے پاس جائیں) پھر وہ آپ سے (جنگ کے لیے) نکلنے کی اجازت طلب کریں تو آپ کہہ دیجئے گا کہ تم میرے ساتھ ہرگز نہ نکلو گے۔ اور میرے دشمن سے تم میرے ساتھ ہوکر ہرگز نہ لڑو گے۔ بیشک تم پہلی مرتبہ پیچھے بیٹھنے پر راضی ہوگئے تھے۔ پس تم پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کے مخصوص دینی اعمال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

○ **فَإِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ** کے الفاظ میں، نبی اکرمؐ کی منافقوں کے کسی گروہ کی طرف رجعت کا فاعل اللہ تعالیٰ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن قرآنی اسلوب بیان سے عیاں ہے کہ دین سے **متعلقہ** رسولؐ اکرم کے افعال کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جیسے کہ ۸/۱۷ میں گزر چکا ہے۔ **وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى**۔ اور (اے رسولؐ) جب آپ نے تیر پھینکے تھے، وہ آپ نے نہیں پھینکے تھے۔ ولیکن وہ اللہ تعالیٰ نے پھینکے تھے۔ دیکھئے! اس آیت مجیدہ ۸/۱۷ میں صاف بتایا گیا ہے کہ تیر نبی اکرمؐ ہی نے پھینکے تھے۔ لیکن چونکہ وہ آپؐ کا ایک مخصوص دینی عمل تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے **وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** کہہ کر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اسی طرح آیت بالا ۹/۸۳ میں، نبی اکرمؐ کے منافقوں کے کسی گروہ کی طرف کسی مخصوص دینی ضرورت کے لیے جانے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ پھیر کرلے جائے۔

○ اب رہا یہ سوال کہ نبی اکرمؐ کے لیے منافقوں کے ہاں جانے کا مخصوص دینی کیا کام ہوسکتا ہے؟ اس کی خبر خود آیت مجیدہ کے الفاظ میں موجود ہے۔ ان کا نبی اکرمؐ سے جنگ میں شرکت کی اجازت طلب کرنا۔ تاکہ وہ عین دوران جنگ دھوکہ دے کر اسلامی لشکر کو شکست سے دو چار کر دیں۔ اسی لیے نبی اکرمؐ کو پیشگی ہدایت کر دی گئی ہے کہ آپ انہیں اپنے ساتھ جنگ میں شریک ہونے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روک دیجئے گا۔ اس پر ہمارا ایک ضمنی سوال ان لوگوں سے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی زندگی میں منافق چھپے رہے تھے اور آپ کی وفات کے بعد منافقوں ہی نے مسند خلافت پر قبضہ کرلیا تھا، کیا جن لوگوں کو یہ کہنے اور کھلی وارننگ دینے کا حکم دیا گیا تھا کہ، چونکہ تم نے پہلی مرتبہ ہی پیچھے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا۔ اس لیے تم آئندہ کبھی بھی میرے ساتھ جنگ کے لیے نہیں نکلو گے۔ **لَنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ أَبَدًا**" میرے ساتھ مل کر میرے دشمنوں سے ہرگز ہرگز قتال نہیں کرو گے: **وَلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا**۔ پس ان الفاظ قرآنیہ سے کھل کر ثابت ہوچکا، کہ منافق چھپے ہوئے نہیں تھے۔ عیاں ہوچکے ہوئے تھے، جن کے خلاف نبی اکرمؐ نے اللہ تعالیٰ کے تکراری حکم کے مطابق پورا

پورا جہاد کیا اور پوری پوری سختی فرمائی تھی ۹/۷۳ + ۶۶/۹۔ نیز آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ایک ایک منافق کو تلاش کرکے اور گرفتار کرکے قتل کر دیا تھا۔ ۶۰-۶۱/۳۳۔ (تفصیل آگے آرہی ہے۔)

○ **لَنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ** کے الفاظ میں مضارع پر لن داخل ہوا ہے۔ جس کا لفظی معنیٰ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ آئندہ بھی کبھی ہرگز ہرگز جنگ کے لیے نہیں نکلو گے۔ مگر محاورۂ عرب کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم میرے ساتھ جنگ کے لیے کبھی مت نکلنا۔ میں تمہیں کبھی جنگ میں شامل نہیں کروں گا۔ کبھی جنگ کی اجازت نہیں دوں گا۔

○ **وَ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا**" میں بھی مضارع پر لن داخل ہوا ہے اور اس کا بھی وہی اوپر والا مفہوم ہے کہ تم آئندہ بھی میرے ساتھ مل کر میرے دشمنوں کے ساتھ کبھی قتال نہیں کرو گے۔ آئندہ کے لیے بھی تمہیں جنگ کی کبھی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آئندہ کے لیے تم جنگ میں شامل ہونے کے لیے اجازت طلب کرنے کی زحمت تک نہ اٹھانا۔

منافق تو پہلی مرتبہ ہی جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

○ **اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ** کے الفاظ سے بصورت نصف النہار ثابت ہوتا ہے کہ منافق پہلی مرتبہ ہی جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ ہی سے انہوں نے پیچھے بیٹھ رہنا پسند کیا تھا۔ بالفاظ دیگر منافق ایک بار بھی جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی نبی اکرمؐ کے ساتھ مل کر آپؐ کے دشمنوں کے خلاف جنگ نہیں کی تھی

○ **فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ** کے الفاظ میں نبی اکرمؐ کی زبان فیض ترجمان سے منافقوں کو کھل کر کہلوا دیا گیا تھا کہ تم جنگ سے پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ جنگ میں تمہاری شمولیت بحکم باری بند ہوچکی ہے۔ بالفاظ دیگر اس سے پہلے تو تم اپنے نفاق کی بدولت جنگ کے لیے نہیں نکلتے تھے اب تمہارا جنگ کے لیے نکلنا حکماً" بند کر دیا گیا ہے۔

نہ کسی منافق کی میت پر دعاء مغفرت کرنا اور نہ اس کی قبر پر دعا کے لیے کھڑے ہونا:۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ جب منافقوں میں سے کوئی مرجائے تو آپ اس کی میت پر بھی دعا نہ کرنا اور نہ اس کی قبر پر بھی کبھی کھڑے ہونا۔ یعنی منافق کی قبر پر دعا کرنے سے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روک دیا گیا ہے۔ چنانچہ واضح الفاظ میں ارشاد ہوا ہے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ؀	اور (اے رسولؐ!) ان (منافقوں) میں سے کوئی مرجائے تو آپ اس پر کبھی بھی صلوۃ (دعاء میت) نہ کرنا۔ اور نہ ہی کبھی اس کی قبر پر (دعا کے لیے) کھڑے ہونا' بیشک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا انکار کیا ہے اور وہ اس حالت میں مرگئے کہ وہ اللہ کی حدیں پھاندنے والے ہی رہے۔

روائتی شان نزول کی بوالعجبیاں:۔

○ یہ آیت مجیدہ نمبر۸۴' آیت یا سبق نمبر۸۰ میں نازل کردہ فیصلے کی تاکیدی اور تائیدی آیت مجیدہ ہے آیت نمبر۸۰ میں ارشاد ہوا ہے۔ **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ**○ ۹/۸۰ اور اس کا ذیل کا مفہوم بھی پیچھے بیان ہوچکا

ہے کہ۔ (اے رسول سلام علیہ) آپ ان منافقوں کیلئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں۔ اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سلام علیہ کا انکار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حدیں پھاندنے والی قوم کو ہدایت یافتہ نہیں ٹھہراتا۔

○ دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں بھی زندہ اور مردہ جملہ منافقوں کے لیے طلب مغفرت سے منع کر دیا گیا ہے اور اس شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ اگر آپ منافقوں کے لیے ستر بار بھی طلب مغفرت فرمائیں گے تو ہم انہیں پھر بھی معاف نہیں کریں گے۔ اور اسی نہی کی تاکید مزید کے لیے آیت زیر نظر نمبر ۸۴ میں **وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ ......الخ** کے الفاظ میں منافقوں کی میت اور قبر پر بھی صلی کرنے سے بحکم خصوص منع کر دیا گیا ہے۔ مگر روایتی شان نزول کی بوالعجبی ملاحظہ فرمائیں کہ روایات کی افضل ترین مانی ہوئی کتاب بخاری شریف میں ان آیتوں کے متعلق یہ تصور دیا گیا ہے کہ آیت نمبر ۸۰ نازل ہو چکی ہوئی تھی جس میں نبی اکرمؐ کو کہا گیا ہے۔ **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ**= آپ ان کیلئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں (برابر اور بے سود ہے) اگر آپ ان کے لیے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں پھر بھی معاف نہیں کرے گا۔ مگر روایات کہتی ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد عبداللہ بن ابی منافق مر گیا۔ نبی اکرمؐ نے اس کے جنازے کے لیے چلنے کا ارادہ فرمایا۔ تو عمرؓ نے نبی اکرمؐ کا دامن پکڑ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ منافقوں کے لیے دعاء مغفرت سے آیت مجیدہ **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ** ..... ۹/۸۰ میں منع کر دیا گیا ہے۔ لیکن نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ نہیں، اس آیت میں منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ منافقوں کا جنازہ پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ چنانچہ جب آپ نے منافق کا جنازہ پڑھ دیا تو آیت مجیدہ زیر بحث ۹/۸۴ نازل ہوئی۔ جس نے نبی اکرمؐ کے فہم قرآن کی نہیں بلکہ عمرؓ کے فہم قرآن کی تائید کی اور نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا۔ **وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا**"...... ۹/۸۴

○ ذیل میں محمد سعید اینڈ سنز کراچی کی مطبوعہ بخاری شریف مترجم جلد دوم 'کتاب التفسیر باب **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً**' صفحہ نمبر ۸۰۳ کا اقتباس نقل مطابق اصل پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ روایت کی رو سے گیا نبی اکرمؐ کے فہم قرآن کی تائید ثابت ہوتی ہے یا عمرؓ کے فہم قرآن کی؟۔

ترجمہ بخاری شریف نقل مطابق اصل :۔ ○ عبید بن اسمٰعیل، ابو اسامہ، عبید اللہ نافع، ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب عبداللہ بن ابی مر گیا تو اس کا بیٹا نبی اکرم سلامٌ علیہ کی خدمت میں آیا اور آپؐ سے کہا کہ اپنا کرتہ اس کے کفن کیلئے دیجئے۔ آپ نے کرتہ دیدیا۔ پھر وہ کہنے لگا کہ آپ ان کی نماز جنازہ پڑھا دیجئے۔ آپ نے چلنے کا ارادہ کیا۔ عمرؓ نے آپ کا دامن پکڑ کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ منافق کا جنازہ پڑھا رہے ہیں اور دعاء مغفرت فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس سے منع فرمایا ہے۔ نبی اکرم سلامٌ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ خدا نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں ان کے لئے دعا مغفرت کروں یا نہ کروں۔ اور اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ اگر ان کے لئے ستر بار بھی دعاء مغفرت کی جائے تو بھی میں ان کو نہیں بخشونگا۔ لہٰذا اس کے لئے ستر بار سے زیادہ مغفرت چاہونگا۔ عمرؓ نے کہا وہ تو منافق ہے۔ آخر آپ نے نماز پڑھا دی۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ **وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ**...... "یعنی اے رسولؐ ان منافقوں سے جو بھی مر جائے نہ اس کی نماز

پڑھو اور نہ اس کی قبر پر جاؤ۔"

قابل غور:۔

○ اس روایت میں نبی اکرمؐ کے قلب گداز اور پوری نوع انسانی کی نجات کے متمنی ذہن کی ترجمانی تو صحیح کی گئی ہے۔ مگر آپ کے فہم قرآن پر اس قدر سوقیانہ حملہ گیا ہے کہ آیت مجیدہ **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ .... سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ** ۹/۸۰ سے عمرؓ تو منشاء الہٰی کو سمجھ گئے کہ اس میں منافقوں کے لیے دعا مغفرت سے منع کر دیا گیا ہے۔ مگر معاذ اللہ معاذ اللہ نبی اکرمؐ نے منشاء الہٰی کے خلاف آیت نمبر۹/۸۰ سے یہ مطلب اخذ گیا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ منافقوں کے لیے دعاء مغفرت کروں یا نہ کروں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو مبالغہ کا عدد استعمال کرکے فرمایا کہ اگر آپ ستر مرتبہ بھی منافقوں کے لیے مغفرت طلب کریں تو پھر بھی ہم انہیں معاف نہیں کریں گے۔ اس سے آپ یہ سمجھے کہ اگر اکہتر بار مغفرت طلب کی جائے تو اللہ معاف کر دے گا۔ مگر روایت کے مطابق ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اکہتر بار تو گیا' ایک بار بھی منافقوں کے لیے دعا مغفرت سے منع فرما دیا۔ **وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا** "...... الخ = اور اے رسول! ان میں سے کوئی مر جائے تو اس پر ہرگز صلوۃ (دعائے مغفرت) نہ فرمائیں۔

شان نزول ایک غیر قرآنی نظریہ ہے:۔

○ مندرجہ بالا روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر نبی اکرمؐ عبداللہ بن ابی کا جنازہ نہ پڑھاتے تو آیت مجیدہ ۹/۸۴ **وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا** " نازل ہی نہ ہوتی۔ معاذ اللہ! حالانکہ آیت مجیدہ **وَلَا تُصَلِّ** واؤ عاطفہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے پوری آیت معطوفہ ہے۔ یعنی کلام جاریہ کا حصہ ہے اور اس کی معطوف علیہ آیت مجیدہ ماقبل موجود ہے۔ **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ** اور تقدیر کلام یہ ہے۔

○ **اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ .... وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا" وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَا تُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ** ○ ۹/۸۰-۸۴

○ (مفہوم) اے رسولؐ! برابر ہے کہ) آپ ان (منافقوں) کے لیے طلب مغفرت کریں یا نہ کریں۔ اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ (ان گنت دفعہ) بھی طلب مغفرت فرمائیں تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کا انکار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حدیں پھاندنے والی قوم کو ہدایت یافتہ نہیں ٹھہراتا .... یہ اس لیے ان میں سے کوئی مر جائے تو آپ اس پر کبھی بھی صلوۃ (دعا میت) نہ فرمائیں اور نہ ہی کبھی اس کی قبر پر دعا کے لیے کھڑے ہوں۔ (اس لیے کہ) بیشک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ اسی حالت میں مرگئے کہ وہ بدستور اللہ تعالیٰ کی حدیں پھاندنے والے ہی رہے۔

○ پس قرآنی اسلوب بیان' قرآنی تصریف آیات اور قواعد کے قاعدہ عطف معطوف کے کھلے انداز کے مطابق آیت مجیدہ ۹/۸۴ کا نزول کسی شان نزول کا مرہون منت ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ آیت معطوفہ ہے اور اس کا عطف ۹/۸۰ پر ہے جو ماقبل مذکور و موجود ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار؟**

○ تقدیرِ کلام کے مطابق یہاں واؤ بمعنی اس لیے ہے۔ چونکہ منافقوں نے اللہ اور رسول سلام علیہ کا انکار کیا ہے۔ اس لیے ان میں سے کوئی مرجائے تو آپ اس پر کبھی بھی دعاءِ مغفرت نہ کرنا۔

رجوع الی المطلب ○ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں ہی کے متعلق نبی اکرمؑ کو واؤ عاطفہ کے ساتھ یعنی بصورت کلام مسلسل ارشاد ہوا ہے:۔

۸۵ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ	اور (اے رسول!) آپ کو ان (منافقوں) کا مال حیرت میں نہ ڈال دے اور نہ ان کی اولاد۔ سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ اللہ تعالٰی (ان کی منافقت کی بدولت) ارادہ کرتا ہے کہ انہیں اس (ان کے مال اور اولاد) کے ساتھ دنیا ہی میں عذاب کرے۔ اور ان کی جانیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہی ہوں۔

○ **اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ منافقوں میں بڑے بڑے مال دار لوگ موجود تھے جن کی کثرت مال پر تعجب کیا جاسکتا تھا۔ نیز وہ لوگ بڑی بڑی اولادوں والے بھی تھے۔ لیکن۔

○ **اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا** پیچھے ۹/۵۵ میں یہی آیت مجیدہ ۹/۸۵ بالکل انہی الفاظ میں منافقوں ہی کے متعلق آئی ہے۔ اس میں فی الدنیا کی بجائے فی الحیوۃ الدنیا آیا ہے۔ ان الفاظ سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالٰی نے منافقوں کو ان کے مالوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ اس دنیا کی زندگی ہی میں عذاب کرنے کا ارادہ فرمایا تھا۔ اور اب چونکہ اللہ تعالٰی کے ارادے تو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ بلاشبہ بلاشبہ اللہ تعالٰی نے زمانہ رسالت محمدی سلام علیہ کے منافقوں کو ان کے مالوں اور اولادوں کے ساتھ ان کی دنیوی زندگی ہی میں ضرور ضرور عذاب دیا تھا۔

ایک عظیم تاریخی تنازعہ کا قرآنی حل ○ اہل اسلام میں نام نہاد اسلامی تاریخ کے باب اول ہی میں ایک عظیم تاریخی تنازعہ مدت مدید سے چلا آرہا ہے' جو امت میں وجہ مخالفت و مخاصمت ہی نہیں بلکہ وجہ جدال و قتال بھی رہا ہے۔ وہ یہ کہ نبی اکرمؑ کی وفات مبارکہ کے بعد یکے بعد دیگرے جو تین مقدس صحابیؓ آپ کے جانشین ہوئے تھے' مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ وہ تینوں منافق تھے۔ معاذ اللہ ! استغفراللہ !

○ اس تاریخی تنازعہ کا حل قرآن مجید میں آج سے چودہ سو سال پیشتر سے ایک ہی لفظ کی تکراری آیات مجیدہ ۹/۵۵' ۹/۸۵ میں نازل کیا جاچکا ہے۔ جسے نظر انداز کرکے آئے دن کی باہمی سر پھٹول کا سامان خود مہیا کر لیا گیا ہے۔ اس عنوان کو آیت مجیدہ ۹/۵۵ کی تفسیر القرآن بالقرآن کے ضمن میں بالوضاحت درج کیا جاچکا ہے۔ عنوان کی اہمیت اور آیت زیر بحث ۸۵/۹ کی تفسیر کے لیے ۹/۵۵ کی تفسیری بحث دوبارہ ہدیہ قارئین کی جاتی ہے۔ تاکہ اولین خلفا رسولؐ (اصحاب ثلاثہ) کو منافق قرار دینے والوں پر قرآنی حقائق دوپہر کے سورج کی طرح عیاں ہو جائیں کہ ۹/۵۵ + ۹/۸۵ کے مطابق اللہ تعالٰی نے زمانہ رسالت کے منافقوں کو ان کے مالوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ ان کی دنیوی زندگی ہی میں مغضوب کر دیا تھا۔ منافقوں کے مسند خلافت پر پہنچنے اور غاصبانہ طور پر مسلط ہونے کا' ازروئے قرآن سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کیا منافقوں کو ان کے مالوں اور اولادوں کے ساتھ دنیوی زندگی ہی میں عذاب نہیں کیا گیا تھا؟ ○

اب جب کہ ۹/۵۵ اور ۹/۸۵ میں اللہ تعالیٰ کا تکراری اعلان موجود ہے کہ اس نے ارادہ فرمایا تھا کہ منافقوں کو ان کے مالوں اور اولادوں کے ساتھ ان کی دنیوی زندگی ہی میں عذاب کرے گا تو بصورت نصف النہار ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو **فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ** ۱۱/۱۰۷ ہے اور اس کے ارادے میں نہ کوئی حائل ہونے والا ہے اور نہ وہ بدل ہی سکتا ہے' یقیناً یقیناً منافقوں کو ان کی دنیوی زندگی میں ان کے مالوں اور اولادوں کے ساتھ عذاب دیا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے آپ اس عنوان کی ہردو تکراری آیات مجیدہ بالمقابل ملاحظہ فرمائیں کہ یہ تھا اللہ تعالیٰ کا تکراری اعلان و ارادہ۔

○ **فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ** ○ ۹/۵۵

○ **وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ** ○ ۹/۸۵

پس ○ ان تکراری آیات مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ :۔

○ منافقوں کے مال ان کی زندگی ہی میں ان سے چھن گئے تھے۔ جو انہی کے خلاف استعمال کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا تھا۔ اور ان کی اولادوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح عذاب دیا کہ وہ مسلمان ہوگئیں اور خود ان کے خلاف جہاد کیا۔ حتیٰ کہ وہ اسی حالت میں بلاتوجہ ختم کر دیئے گئے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے مال ان کے خلاف خرچ ہو رہے تھے اور ان کی اولادیں ان کے خلاف مصروف پیکار تھیں۔

○ برادران عزیز ! غور فرمائیں کہ ۹/۵۵ اور ۹/۸۵ کی تکراری آیات مجیدہ کا عملی نقشہ مذکورہ بالا کے سوا اور کیا سامنے آسکتا ہے جس میں **لِيُعَذِّبَهُم بِهَا** کے تقاضے پورے ہوتے ہوں۔ لیکن جو لوگ نبی اکرمؐ کے پہلے تین مقدس جانشینوں کو معاذ اللہ' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ ! منافق قرار دیتے ہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تکراری ارادہ ۹/۵۵ + ۹/۸۵ ناکام ہوگیا تھا۔ وہ تو منافقوں کو ان کی دنیوی زندگی میں خود انہی کے مالوں اور اولادوں کے ساتھ عذاب دینا چاہتا تھا۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ دنیا میں معتوب و مغضوب ہوتے۔ الٹا انہیں نبی اکرمؐ کی خلافت (جانشینی) کا شرف عظیم میسر آیا۔ ان کے مال اللہ کے رسول نے طلب فرمائے جو اللہ کی راہ میں فروغ دین کے کام آئے نیز ان کی اولادیں بجائے اس کے کہ ان کے لیے باعث عذاب بنتیں اور ان کے خلاف مصروف پیکار ہوتیں' ان کی معاون و مددگار ہوئیں۔ اور وہ تینوں مقدسین رضی اللہ عنہم' اسلام کی عظیم خدمت بجالاتے ہوئے زندگی بھر خوش و خرم صاحب اقتدار اور عوام کے خدمت گزار اور کافروں سے برسرپیکار رہے۔

○ پس مکرر گزارش ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادے کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔ اس کے تکراری اعلان کے مطابق اس امر میں معمولی سے شک کی گنجائش تک موجود نہیں کہ منافقوں کو ان کی زندگی ہی میں ان کے مالوں اور اولادوں کے ساتھ عذاب نہ کیا گیا ہو۔ اور وہ مغضوب ہونیکی بجائے صاحب اقتدار ہوگئے ہوں۔ اگر اصحاب ثلاثہ منافق ہوتے تو آیات بالا ۹/۵۵ + ۹/۸۵ کے تکراری اعلان ربانی کے مطابق دنیوی زندگی ہی میں برسر اقتدار آنے کی بجائے اپنے ہی مالوں اور اولادوں

کے ساتھ عذاب دیئے جاتے۔

منافقوں کو نبی اکرمؐ نے اپنی زندگی ہی میں ختم کر دیا تھا ○ سورہ احزاب میں منافقوں کے متعلق نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا" ○ مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا" ○ ۶۰-۶۱/۳۳- (اے رسولؐ) اگر یہ منافق یعنی جن کے اذہان میں منافقت کی بیماری ہے' اور شہر میں بری خبریں اڑانے والے' باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ اس (شہر مدینہ) میں آپ کے پڑوس میں نہیں رہیں گے مگر تھوڑا عرصہ ملعون ہوکر رہیں گے پس حکم دیا جاتا ہے کہ جہاں کہیں پائے جائیں گرفتار کر لیے جائیں اور اس طرح قتل کر دیئے جائیں جو قتل کرنے کا حق ہے۔

افسوس ہے کہ ○ ارشاد باری تو یہ ہے کہ منافقوں کو خود ان کے مالوں اور اولادوں کے ساتھ عذاب دیا گیا تھا ۹/۵۵ + ۹/۸۵ اور وہ گرفتار ہو کر قتل ہوگئے تھے۔ ۶۰-۶۱/۳۳۔ مگر ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ نہیں نہیں' نہ انہیں عذاب دیا گیا تھا' نہ وہ گرفتار اور نہ قتل ہوئے تھے بلکہ وہ تو غاصبانہ طور پر مسند خلافت پر فائز ہوگئے تھے۔ کاش کہ اگر آیت مجیدہ ۹/۵۵ + ۹/۸۵ + ۶۰-۶۱/۳۳ کو مشعل راہ بنایا جائے تو خلافت کا قدیمی خونی تنازعہ ایک سیکنڈ میں طے ہو جائے کہ اصحاب ثلاثہ منافق نہیں تھے بلکہ سچے سچے مومن تھے۔

آیات مجیدہ ۵۳-۹/۵۴ میں پیچھے گزر چکا ہے کہ منافقوں سے مال قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر چونکہ اصحابؓ ثلاثہ کے مال نبی اکرمؐ کے ہاں مقبول تھے۔ اس لیے وہ منافق نہیں' مومن تھے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مل کر کافروں کے خلاف جہاد کرو تو ان میں سے جو مال دار ہیں وہ جنگ سے پیچھے بیٹھ رہنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۸۶

اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کیساتھ (عملاً) ایمان لاؤ۔ یعنی اس کے رسولؐ کے ساتھ ملکر (اللہ اور رسول کے دشمنوں کے خلاف) جہاد کرو تو (اے رسولؐ) ان (منافقوں) میں سے مالدار لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم پیچھے بیٹھنے والے (معذوروں) کے ساتھ پیچھے بیٹھنے والے ہو جائیں۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۸۷

وہ اس پر راضی ہوئے ہیں کہ وہ پیچھے رہنے والوں (لوبلے۔ لنگڑوں) کے ساتھ ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اذہان پر (عدم تفقہ کی) مہریں لگ چکی ہیں۔ کیونکہ وہ تفقہ نہیں کرتے۔

○ یہاں واؤ کا معنی ہے یعنی۔ یہ واؤ تفسیری ہے جو اللہ تعالیٰ پر عملاً" ایمان لانے کی تفسیر کرتی ہے' یعنی اللہ کے رسولؐ کے ساتھ ملکر جہاد کرو۔ جو لوگ جہاد سے جی چراتے اور پیچھے بیٹھ رہتے ہیں' ان کا ایمان محض زبانی زبانی ہے جو اللہ کے ہاں

مقبول نہیں۔

○ منافقوں میں سے جو لوگ اولوا الطول یعنی مال دار تھے۔ وہ تو جنگ سے پیچھے رہنے کے لیے آگے بڑھ کر نبی اکرمؐ سے عدم شرکت کی اجازت طلب کرتے تھے اور باقی منافق ان کے پیچھے ہوتے یعنی مالدار منافق جملہ منافقوں کے لیے بطور نمائندہ اجازت طلب کرتے تھے۔ جنگ میں کوئی منافق شامل ہی نہیں ہوتا تھا۔ جیسے کہ پیچھے آیت مجیدہ ۹/۸۳ میں نبی اکرمؐ کی زبان فیض ترجمان سے اعلان کرا دیا گیا ہے۔

فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا اِنَّکُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ۹/۸۳۔ پس (اے رسولؐ!) انہیں منافقوں کو کہہ دیجئے گا کہ تم میرے ساتھ کبھی بھی (جنگ کے لیے) نہیں نکلو گے اور نہ ہی میرے ساتھ مل کر میرے دشمنوں کے خلاف کبھی بھی جنگ کرو گے۔ بیشک تم تو (پہلی مرتبہ ہی پیچھے بیٹھ رہنے والوں لولوں لنگڑوں) کے ساتھ پیچھے بیٹھ رہنے پر راضی ہوئے تھے۔ بالفاظ دیگر منافق تو پہلی مرتبہ یعنی ایک مرتبہ بھی نبی اکرمؐ کے ساتھ نہ جنگ کے لیے نکلے تھے اور نہ آپ کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کی تھی۔

○ **فھم** کی فا کا معنی ہے کیونکہ' جو اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ ان کے ذہنوں پر عدم تفقہ کی مہریں اس لیے لگی ہوئی ہیں کیونکہ وہ تفقہ کرتے ہی نہیں۔

اللہ کے رسول کے ساتھ مل کر اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد صرف مومن کرتے تھے ○

آیات بالا میں منافقوں کے متعلق دو ٹوک فیصلہ دینے کے بعد کہ وہ تو پہلی مرتبہ ہی لولوں' لنگڑوں کیساتھ پیچھے بیٹھ رہنے پر راضی ہوئے تھے' یعنی وہ ایک مرتبہ بھی نبی اکرمؐ کے ساتھ جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اگلی آیت میں مومنوں کے متعلق اعلان کیا گیا ہے۔

لٰکِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْخَیْرٰتُ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۸۹﴾

لیکن (اللہ کا) رسولؐ اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں (یعنی حقے سچے مومن صحابی ۸/۷۴) انہوں نے اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

اللہ تعالی نے ان کے (اپنے رسول اور مجاہد مومنوں کے) لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کی سطح میں نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ مذکورہ بالا (سدا بہار معاشرہ حاصل کرلینا ہی تو) بہت بڑی کامیابی ہے۔

جنت تجری من تحتھا الانھر کی اصطلاح قرآن مجید میں ایسے سدا بہار متوازن و ہموار معاشرہ کیلئے مستعمل ہے جو دنیا میں بھی قائم ہو تو **جنت تجری من تحتھا الانھر** کہلاتا ہے اور آخرت میں کامیاب ہونے والوں کے لیے اخروی زندگی میں بھی میسر آئے گا۔ دنیا کی **جنت تجری من تحتھا الانھر** کی خبر سورہ مائدہ میں بنی اسرائیل کے ذکر میں بیان ہوئی ہے:۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیۡتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِیۡ وَعَزَّرۡتُمُوۡہُمۡ وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَلَاُدۡخِلَنَّکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ..... ۵/۱۲

(مفہوم) اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے پکا عہد لیا اور ہم نے ان کے درمیان (داخلی انتظام کے لیے) بارہ منتظم مقرر کیے۔ اور اللہ نے انہیں (اپنے رسول موسیؑ کے ذریعہ) کہا کہ بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے اجتماعی نظام قائم کیا اور اپنے دلوں کو فربہی دی۔ اور میرے رسولوں (موسیٰ و ہارون) پر ایمان لائے اور ان کی حمایت کی اور (غریبوں کی حالت سدھارنے کے لیے) اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دیا تو میں تمہاری تمام بد حالیاں دور کردوں گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کی سطح میں نہریں بہتی ہوں گی۔ (تمہیں **جنت تجری من تحتھا الانہر** میں داخل کر دوں گا۔)

○ واضح رہے کہ مفسرین و مترجمین کرام کا ذہن مذکورہ زیر بحث الفاظ **جنت تجری من تحتھا الانہر** سے فوراً اخروی جنت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ ان الفاظ سے دوسری زندگی کی جنت ہی مراد لیتے ہیں۔ لیکن یہاں ۵/۱۲ میں ان الفاظ سے دنیوی جنت مراد ہے' جس میں انفرادی نظام کی بجائے اجتماعی نظام قائم ہو اور معاشرہ کے جملہ افراد کی بدحالیاں مجموعی طور پر دور ہو چکی ہوں۔ یہاں آیت مجیدہ ۵/۱۲ میں **جنت تجری** سے اخروی جنت ہرگز مراد نہیں ہو سکتی' کیونکہ دوسری زندگی میں جنت مل جانے کے بعد کفر و نافرمانی کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ۵/۱۲ کی جنت وہ جنت ہے جس کے ملنے کے بعد اس کے رہنے والے کفر و سرکشی بھی کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ میں جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد کے لیے ارشاد ہوا ہے:۔

○ **فَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ** ○ ۵/۱۲۔ پھر اس کے بعد اس کے (یعنی جنت کے داخلے کے بعد) تم میں سے جو کوئی کفر (سرکشی) کرے گا تو بے شک وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو جائے گا۔ پھر اس سے اگلی آیت مجیدہ ۵/۱۳ میں بنی اسرائیل کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اجتماعی نظام اور متوازن معاشرہ کا کیا ہوا عہد توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ملعون کر دیا۔ ان سے متوازن معاشرہ **جنت تجری من تحتھا الانہر** چھن گئے:۔

○ **فَبِمَا نَقۡضِہِمۡ مِّیۡثَاقَہُمۡ لَعَنّٰہُمۡ وَجَعَلۡنَا قُلُوۡبَہُمۡ قٰسِیَۃً ۚ یُحَرِّفُوۡنَ الۡکَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِہٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِہٖ ۚ**..... ۵/۱۳ پھر ان کے اس عمل' یعنی پکے عہد کو توڑ دینے کی بدولت ہم نے ان پر لعنت کی (ان سے ہم بیزار ہوگئے) اور ہم نے ان کے اذہان کو سخت ہوا ہوا پایا' وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو اس کے مقام سے بدل دیتے (اجتماعی احکام کو انفرادی قرار دے دیا اور اس طرح) وہ اس حصے کو بھول گئے۔ جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی (کہ اللہ کی نعمتوں میں پوری نوع انسانی کا مساوی حق ہے مگر انفرادیت میں پھنس کر انہوں نے عوام غرباء کے حصے غصب کر لیے)۔

المختصر ! آیت زیر بحث ۹/۸۹ میں نبی اکرمؐ اور آپ کے ساتھیوں صحابہ کرام کے ساتھ **جنت تجری من تحتھا الانہر** کا جو وعدہ کیا گیا ہے' وہ دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں کا ہے۔ دنیوی زندگی میں نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کرام کو ہموار و متوازن معاشرہ یعنی متوازن قرآنی حکومت عطا فرمانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے لیے وعدہ حکومت ○ ۹/۸۹ کے علاوہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر صحابہ رسول کو قرآنی ہموار و

متوازن دنیوی حکومت عطا کرنے کی خبر دی گئی ہے۔ سورہ حج میں صحابہؓ کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

○ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ○ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ..... وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ○ ۲۲/۴۰ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○ ۲۲/۴۱

(مفہوم) ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے جن پر جنگ ٹھونسی جائے (جن پر جارحانہ حملہ ہوا) یہ اجازت اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے کے ٹھیک ٹھیک اندازے پیمانے قوانین مقرر کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں (صحابہ رسولؐ) جو ناحق گھروں سے نکالے گئے۔ (ان کا قصور) اس کے سوا نہیں تھا کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے (انہوں نے ربوبیت عامہ کا نظریہ پیش کیا) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ (صحابہؓ رسولؐ نے اپنی مدد آپ کی۔ اس لیے اللہ نے ان کی مدد فرمائی) بیشک اللہ تعالیٰ طاقتور اور غالب ہے ۲۲/۴۰ یہ (صحابہ رسولؐ ناحق گھروں سے نکالے گئے مہاجر) وہ ہیں کہ بے شک ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائیں گے۔ وہ اجتماعی نظام قائم کریں گے اور دلوں کو فربہی دیں گے۔ اور قرآنی نیکیوں کا حکم کریں گے اور قرآنی برائیوں سے منع کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے لیے ہے (یعنی ہر کام اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرانجام ہوتا ہے) ۲۲/۴۱

○ یہاں اِنْ اِنَّ کا مخفف ہے۔ اہل قواعد کا یہ فیصلہ غلط ہے کہ ان بلا ورود لام مفتوح ان کا مخفف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سورہ اعراف میں

ان بمعنی اِنَّ بلا لام مفتوح بانداز ذیل آیا ہے کہ شعیبؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

○ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا ۚ وَهُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ○ ۷/۸۷ اور بلا شبہ تم میں سے ایک گروہ اس پر ایمان لایا ہے جو میں دیکر بھیجا گیا ہوں۔ اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا۔ پس انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے وہ بہتر فیصلے کرنیوالا ہے۔ یہاں ان بلا ورود لام مفتوح آیا ہے اور اس کا معنی اگر لگ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہ ان بمعنی اِنَّ بمعنی بلاشبہ ہے۔

اب غور فرمایئے کہ آیات مجیدہ مذکورہ بالا ۴۰-۲۲/۴۱ میں صحابہ کرام میں سے ان لوگوں کی خلافت ارضی (قرآنی متوازن حکومت) کی خبر دی گئی ہے جو ناحق گھروں سے نکالے گئے تھے۔ اور ان کا قصور صرف یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عالمینی پر ایمان لے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مہاجر صحابہ رسولؐ تھے' جنہیں نبی اکرمؐ کی وفات مبارکہ کے یکے بعد دیگر آپ کی جانشینی کا شرف عظیم نصیب ہوا۔ اسی سلسلے کی ایک اور آیت مجیدہ ملاحظہ فرمائیں:۔

○ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ ۲۴/۵۵

(مفہوم) (اے صحابہ رسولؐ) اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان افراد کے ساتھ جو ایمان لائے اور اصلاح کے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ انہیں

ضرور ضرور زمین میں اسی طرح خلافت عطا کرے گا۔ جس طرح ان افراد کو خلافت ارضی عطا فرمائی تھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اور وہ ان کے لیے اسی دین کا تمکن عطا فرمائے گا جو اس نے خود ان کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اور وہ ضرور ضرور ان کے خوف کے بعد اسے امن میں بدل دے گا۔ وہ میری ہی فرمانبرداری کریں گے اور وہ میرے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو کوئی اس کے بعد (ان کی خلافت کا) انکار کرے گا۔ پس وہی لوگ ہیں جو اللہ کی حدیں پھاندنے والے ہیں۔

○ دیکھئے ! اس آیت مجیدہ میں صحابہ رسولؐ کے ساتھ اسی طرح کی خلافت ارضی کا وعدہ گیا ہے' جس طرح کی خلافت ان سے پہلے خلفاء ارضی کو عطا کی گئی تھی۔ سابقین خلفاء ارضی میں ہیں۔ داؤدؑ' سلیمانؑ جیسے کہ ارشاد ہوا ہے۔ **یٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ** ۳۸/۲۶۔ اے داؤد ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ آپ لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلے فرمایا کریں۔ پس ظاہر ہے کہ یہ اسی طرح کی خلافت کا وعدہ تھا جس کی رو سے زمین میں اقتدار میسر آتا اور لوگوں کے مقدمات' فیصلوں کے لیے خلیفہ کے حضور میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ وعدہ صحابہ کرام' جانشینان رسول ہی کے ساتھ وفا ہوا تھا۔ جنہیں زمین میں اقتدار و تمکن میسر آیا۔ اور عوام کے مقدمات ان کے حضور پیش ہوا کرتے تھے۔ یہ وعدہ ان لوگوں کے ساتھ ہرگز نہیں تھا' جنہیں اقتدار و تمکن فی الارض میسر ہی نہیں آیا تھا۔

○ **ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا** کے الفاظ سے کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ یہ وعدہ خلافت انہی لوگوں کے ساتھ تھا۔ جن کا خوف امن کے ساتھ بدل چکا تھا۔ نہ کہ ان لوگوں کے ساتھ کہ بقول تاریخ ان کی پوری جماعت کو کئی پشتوں تک امن ہی نصیب نہ ہوا۔ (واضح رہے کہ یہ تبصرہ مروجہ تاریخ پر ہے۔ قرآن مجید کی رو سے یہ تاریخ صد فیصد محل نظر ہے' جس میں صحابہ رسول کی ایک جماعت کو پشتوں تک کے لیے خوف ہی میں مبتلا بتایا گیا ہے) العیاذ باللہ !

○ **ومن کفر بعد ذلک فاولئک ھم الفسقون** کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی موعود خلافت کا انکار کرنے والوں کو حدیں پھاندنے والے فاسق بتایا گیا ہے۔

رجوع الی المطلب ○ اس وقت آیت مجیدہ ۹/۸۹ زیر بحث ہے' جس میں صحابہ کرامؓ کیساتھ **اعد اللہ لھم جنت تجری من تحتھا الانھر**' کے الفاظ میں ان کے لیئے بہتی نہروں والے باغوں کی تیاری کی خبردی گئی ہے۔ اس کے ضمن میں ۵/۱۲ سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ **جنت تجری من تحتھا الانھار** کے الفاظ قرآن مجید میں سدا بہار متوازن معاشرہ کے لیے بطور اصطلاح استعمال ہوئے ہیں۔ اور آیت مجیدہ زیر بحث ۹/۸۹ میں صحابہ کرامؓ کے لیے خلافت ارضی کی خبردی گئی ہے۔ اور دنیا میں سدا بہار متوازن معاشرہ کے مل جانے ہی کو **ذلک الفوز العظیم** کے الفاظ میں سب سے بڑی کامیابی بتایا گیا ہے' جس میں پوری ریاست کا کوئی ایک فرد بھی زندگی کے کسی بھی حصے میں کبھی بھی محروم نہ پایا جائے۔

دیہاتیوں میں سے عذر کرنے والے۔ اگلی آیت مجیدہ میں ان لوگوں کا ذکر درج ہے جو دیہات کے رہنے والے تھے اور جنگ میں شریک نہ ہونے کے لیے عذر پیش کرنے کے لیے حضور رسالت میں حاضر ہوئے تاکہ انہیں جنگ سے پیچھے رہنے کی اجازت دے دی جائے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۹۰

اور (جنگ سے پیچھے رہنے کے لیے) عذر بہانے پیش کرنے والے دیہاتی (نبی اکرمؐ کے پاس) آئے تاکہ انہیں اجازت مل جائے۔ اور (جنگ سے پیچھے) وہ لوگ بیٹھ رہے جنہوں نے اللہ کے رسولؐ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے جھوٹ بولا۔ ان میں سے جنہوں نے (جنگ کے حکم کا) انکار کیا' انہیں ضرور درد ناک عذاب پہنچے گا۔

○ یہاں **الذین کفروا منھم** سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے جھوٹے بہانے بنا کر جنگ کے حکم کا عملاً انکار کیا' یعنی دیہاتی منافق۔ وہ بھی جملہ منافقین میں شامل ہیں۔ ان کے خلاف **الکفار والمنفقین واغلظ علیھم** ۹/۷۳ کے قرآنی حکم کے مطابق پوری سختی کی جائے گی اور انہیں ضرور درد ناک عذاب دیا جائے گا۔ اس کے برعکس جن دیہاتی مومنوں نے جائز عذر پیش کئے اور جنگ میں شامل نہ ہوئے وہ اس عذاب کی وعید سے مستثنٰی ہیں۔

جنگ سے مستثنٰی مومنین کی فہرست ○ اگلی آیت مجیدہ میں مومنوں کے ان افراد کی فہرست بیان کی گئی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے جنگ میں شامل ہونے سے خود مستثنٰی قرار دے دیا ہے۔ غور فرمایئے گا۔ ارشاد باری ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۹۱

نہیں حرج (پیچھے بیٹھ رہنے میں) کمزوروں پر اور نہ ان پر جو بیمار ہوں اور نہ ان پر جو خرچ کرنے کے لیے کوئی مال نہیں پاتے (اس شرط پر) جب وہ اللہ اور رسول کی (یعنی اسلامی نظام کی) خیر خواہی کریں۔ جو لوگ معاشرہ میں توازن پیدا کرنے والے ہیں۔ ان پر (مذکورہ عذروں کی بدولت) کوئی الزام نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بچاؤ عطا کرنے والا مہربان ہے۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝۹۲

اور نہ ان لوگوں پر کوئی (الزام) ہے' جب وہ (اے رسولؐ) آپ کے پاس آئے تاکہ آپ انہیں سوار کریں۔ (یعنی گھوڑا اور جنگی اوزار دیں تاکہ وہ جنگ میں شامل ہوں مگر) آپ نے فرمایا کہ میں (سواری) نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں۔ وہ واپس چلے گئے اس حالت میں کہ ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں اس غم میں کہ وہ نہیں پاتے (مال) جو وہ خرچ کرتے۔ (یعنی گھوڑا اور جنگی اوزار خود خرید سکتے)

اوزاروں کے بغیر جنگ کرنے کی اجازت نہیں ○ آیت بالا ۹/۹۲ انتہائی غور و تدبر کی مستحق ہے جس سے کھل کر عیاں ہو رہا ہے کہ جنگی اوزاروں کے بغیر خالی ہاتھ جنگ نہیں ہوسکتی۔ یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ مومنوں کو جنگی ہتھیاروں کی ضرورت نہیں' مومن بلا ہتھیار بھی لڑ سکتے ہیں' آیت بالا کی رو سے مطلقاً" غلط ہے۔ کیونکہ اس آیت میں خود ذات باری

نے خبر دی ہے کہ ایک جنگ کے موقعہ پر کچھ مجاہد صحابہؓ حضور رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمیں گھوڑے اور ہتھیار دیجئے تاکہ ہم کفار کے مقابلے پر میدان جنگ میں داد شجاعت دیں۔ مگر نبی اکرمؐ کے پاس چونکہ اس وقت سامان جنگ کی کمی تھی' اس لیے آپ نے فرمایا کہ میرے پاس گھوڑے نہیں ہیں جن پر میں تمہیں سوار کروں۔ اس لیے تم جنگ میں نہیں جاسکتے۔ اگر سامان جنگ کے بغیر جنگ ممکن ہوتی تو نبی اکرم فرماتے کہ اس وقت ہتھیار تو ہیں نہیں مگر تم جاؤ صرف ایمانی قوت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرو۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے انکار کی بدولت جذبہ جہاد وقتال سے سرشار صحابی اس حالت میں واپس لوٹ گئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ جی میں کہہ رہے تھے کہ کاش ہمارے پاس مال ہوتا تو آج ہم گھوڑے اور ہتھیار اپنی گرہ سے خرید کر داد شجاعت دیتے۔

جدید سے جدید جنگی ہتھیار شبانہ روز خود تیار کرتے رہو ○ واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیت مجیدہ ۹/۹۲ حقیقت ثابتہ کی علمبردار ہے کہ میدان جنگ میں پیادے سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ نہتے ان سپاہیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو ڈھال' تلوار' نیزہ' بھالا اور پیش قبض پانچوں ہتھیاروں سے لیس ہوں۔ تلوار والے بندوق والوں کے بالمقابل نہیں آسکتے اور بندوقوں والے توپ خانے کے مقابلے پر ٹھہر نہیں سکتے۔ اور اسی طرح ٹینکوں کا مقابلہ ٹینکوں کے ساتھ اور میزائیلوں کا مقابلہ میزائیلوں ہی کیساتھ ہوسکتا ہے۔ بلکہ ٹینک شکن اور میزائیل شکن ہتھیاروں کا بھی مزید شامل حال ہونا لازم ہے' طیاروں اور بمباروں کے مقابلے کے لیے لڑاکا بمبار اور نیپام بموں کا مقابلہ نیپام بموں ہی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے ایمان والوں کے نام جدید سے جدید ہتھیار خود تیار کرتے رہنے کا خصوصی حکم جاری کر رکھا ہے۔

○ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ** ○ ۶۰ /۸۔ اور (ایمان والو !) تم اپنی پوری استطاعت بھر (ہر آن جدید سے جدید فوجی) قوت تیار کرتے رہو خصوصاً" الخیل (یعنی تیز رفتار ذرائع رسل و رسائل) تمہارے ہاں قطار در قطار موجود ہوں۔ تم اس فوجی قوت کے ساتھ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو دہلاتے رہو (تاکہ وہ گھر بیٹھے کانپتے رہیں) اور تم ان ظاہر دشمنوں کے علاوہ ان چھپے دشمنوں کو بھی دہلاتے رہو۔ جنہیں تم نہیں جانتے' انہیں اللہ جانتا ہے۔ اور اس (جدید سے جدید فوجی تیاری) پر جو مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے (یعنی جنگی قرضوں کے طور پر جو کچھ دو گے) وہ تمہیں واپس لوٹا دیا جائے گا اور تم ظلم نہیں کیے جاؤ گے۔

المختصر ! قرآن مجید اور عالمی مشاہدات کی رو سے جنگی ہتھیاروں کے بغیر جنگ نہیں ہوسکتی۔ اہل ایمان کو ہر آن جدید سے جدید جنگی اوزار خود تیار کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے' جو **اعدوا** کے دائمی حکم سے عیاں ہے۔ مشاہدہ گواہ ہے۔ دنیا میں انہی اقوام کو بالا دستی میسر رہی ہے جو خود اسلحہ تیار کرنے والی ہوں۔ داؤدؑ' سلیمانؑ کو اس لیے مضبوط سرحدوں والی حکومت میسر آئی کہ ان کے ہاں لوہے اور تانبے کی فیکٹریاں شبانہ روز مصروف عمل تھیں۔

○ داؤد سلام علیہ کے متعلق خبر دی گئی ہے **وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ** ۱۰/۳۴ اور اس داؤد کے لیے ہم نے لوہے کو نرم پایا۔ یعنی ان کے ہاں لوہے کے جنگی اوزار اس آسانی کے ساتھ تیار کیے جاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ لوہے کی سختی پر قابو پا لیا گیا ہے۔ سورہ حدید میں لوہے کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ **وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ** ۲۵/۵۷۔ اور

ہم نے لوہا (ایک مخصوص نعمت) پیدا فرمایا ہے۔ اس میں سخت لڑائی (کے اوزار ہیں) اور تمام لوگوں کے لیے فائدے ہیں۔

○ سلیمان سلام علیہ کے متعلق خبر دی گئی ہے۔ **وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ** ۱۲/۳۴۔ اور ہم نے اس (سلیمانؑ) کے ہاں پگھلے ہوئے تانبے کے چشمے بہتے ہوئے پائے۔ یعنی ان کے ہاں دھاتوں کو گلا کر فوجی سامان تیار کرنے کی فونڈریاں ہر آن مصروف عمل رہتی تھیں۔

قرآن مجید کو چیستان بنا کر رکھ دیا گیا ہے ○ افسوس ہے کہ قرآن مجید کی جن آیات کریمات میں داؤدؑ و سلیمانؑ کے فوجی سامان تیار کرنے کی خبر دی گئی ہے' سابقہ تراجم و تفاسیر نے انہیں چیستان بنا کر یہ عقیدہ پیش کر رکھا ہے کہ داؤد کے ہاتھ میں لوہا موم ہو جاتا تھا۔ اور آپ اس کی زرہیں بنایا کرتے تھے حالانکہ آپ لوہے کو اپنے ہاتھ کیساتھ موڑ کر زرہیں بناتے نہیں تھے بلکہ سائنٹیفک طریقے سے لوہے کو بھٹیوں میں تپا کر گلا کر موم کرتے تھے۔ اور اسی طرح سلیمانؑ کی بہتے تانبے والی فیکٹریوں کو بھی معجزاتی رنگ دے دیا گیا ہے کہ یہ ان کا معجزہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم تو لوہے اور تانبے کے بہتے چشموں کو پیغمبروں کے معجزے قرار دے کر انہیں سر دھن دھن کر بیان کرتی چلی آرہی ہے اور دشمنوں نے سائنٹیفک طریقے سے لوہے کو موم کر لیا ہے اور تانبے کے چشمے بہا دیئے ہیں۔ جس طریقے سے داؤد و سلیمانؑ نے بہائے تھے۔ اور اس فوجی قوت کے ذریعے ہی اللہ کے پیغمبروں کو دنیا کی اس وقت کی قوموں پر بالادستی حاصل تھی۔

مالداروں کو بھی جنگ میں عدم شرکت کی اجازت نہیں ○ اگلی آیت مجیدہ میں مالداروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ مال دینے سے بدنی جہاد کا حکم ساقط نہیں ہو جاتا۔ ان کی مالی اور جانی دونوں انداز سے شرکت ضروری ہے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

سوائے اس کے نہیں کہ جرم ان لوگوں پر ہے جو (اے رسولؐ) آپ سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں (اور بدنی لحاظ سے معذور نہیں) وہ اس پر راضی ہوئے ہیں کہ وہ پیچھے رہنے والوں (معذوروں) کے ساتھ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ان کے اذہان پر (منافقت کی) مہر لگی پائی ہے پھر وہ جانتے ہی نہیں (کہ مال دینے سے جانی جہاد ساقط نہیں ہوجاتا)

○ اس آیت مجیدہ میں مالداروں کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھی بدنی جہاد سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتے تندرست توانا ہوتے ہوئے جہاد سے پیچھے رہنے والے منافقت کے شکار ہیں۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں جھوٹے بہانے بنا کر جنگ میں عدم شرکت کی اجازت طلب کرنے والوں کے متعلق اعلان عام کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خبر دے دی ہے اس لیے ان کا عذر ہرگز قبول نہیں ہوگا۔

الجزء الحادي عشر

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۚ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۚ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى

(ایمان والو!) جب تم ان (منافقوں) کی طرف واپس جاؤ گے تو وہ تم سے عذر کریں گے (اے رسولؐ) کہہ دیجئے گا کہ عذر مت کرو ہم تمہاری (باتوں) پر ایمان نہیں لائیں گے (نہیں مانیں گے) بے شک اللہ نے ہمیں تمہاری خبریں (تمہاری نشانیاں) بتا دی ہیں اور اللہ اور اس کا رسول تمہارے عمل دیکھے گا۔ (تمہارے خلاف جہاد کیا جائے گا ۹/۷۳ + ۹/۶۶) پھر تم قیامت کو

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٤﴾

غائب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے (حاضر کئے جاؤ گے) پھر وہ تمہیں خبر دے گا جو تم عمل کرتے رہتے تھے۔

○ **اخبارکم** سے منافقوں کی وہ تمام نشانیاں مراد ہیں جو پیچھے اسی سورت مجیدہ میں بتائی گئی ہیں کہ وہ جھوٹے بہانے بنا کر جنگ میں عدم شرکت کی اجازت طلب کرتے ہیں ۹/۴۳، ۹/۴۵، ۹/۹۳ نبی اکرمؐ کی تجاویز میں الٹ پھیر کرتے ہیں ۹/۴۸ صلوٰۃ موقت میں لوٹے ہوئے ذہن اور بوجھل قدموں کے ساتھ آتے ہیں ۹/۵۴ نبی اکرمؐ کو مال صدقات کی تقسیم میں طعنے دیتے ہیں۔ اگر انہیں اس میں سے کچھ مل جائے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ اور بوجہ عدم استحقاق کچھ نہ ملے تو جھٹ ناراض ہو جاتے ہیں ۹/۵۹۔ مومنوں کو راضی کرنے کے لیے قسمیں کھاتے ہیں۔ ۹/۶۲ اس چیز سے ڈرتے ہیں کہ ان کی نشانیاں بتانے کے لیے کوئی سورت نازل ہو ۹/۶۴ منافق مرد اور منافقہ عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کو منکر کا حکم کرتے اور معروف سے منع کرتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے عموماً" ہاتھ روک رکھتے ہیں ۹/۶۷

○ وہ کلمہ کفر کہتے ہیں اور پھر قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے کلمہ کفر نہیں کہا ۹/۷۴ انہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ انہیں اپنے فضل سے مال دے تو صدقہ دیں گے۔ مگر جب اللہ تعالٰی نے اپنے فضل سے عطا فرمایا تو منہ موڑ گئے ۹/۷۶۔ انہیں آئندہ کے لیے جنگ میں شمولیت سے بالکل روک دیا گیا ہے ۹/۸۳۔ ان کے مالدار لوگ کچھ مال دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے فریضہ قتال ساقط ہو چکا ہے ۹/۹۳

○ **سیری اللہ عمالکم و رسولہ** کے الفاظ میں کہا گیا ہے کہ تمہارے اعمال کا دوبارہ جائزہ لیا جائے گا۔ اور پھر تمہارے خلاف دنیا میں بھی ۹/۷۳، ۶۶/۹ کے حکم **جاھد الکفار ولمنفقین** کے مطابق جہاد کیا جائے گا اور پوری پوری سختی کرکے تمہیں ختم کر دیا جائے گا۔ ۶۰-۳۳/۶۱

○ **ثم تردون الی علم الغیب و الشھارہ** کے الفاظ میں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ پھر قیامت کو بھی تمہیں اعمال کی جواب وہی کے لیے اللہ تعالٰی کی عدالت عالیہ میں حاضر کیا جائے گا۔ اور وہ تمہاری ظاہر اور پوشیدہ تمام کرتوتیں کھول کر بیان کر دے گا۔ اور تم قیامت کے عذاب سے بھی بچ نہ سکو گے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ ایمان والو ! جب تم فاتح اور غالب ہو کر جنگ سے واپس جاؤ گے تو وہ قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے درگزر کرو۔

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ إِنَّهُمْ رِجْسٌ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٥﴾

(ایمان والو) جب تم لوٹ کر ان کی طرف جاؤ گے تو وہ ضرور کہیں گے کہ تم ان سے درگزر کرو۔ پس تم (فی الحال) ان سے درگزر کرو۔ بلاشبہ وہ ناپاک لوگ ہیں۔ اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (دنیا کی شکست اور آخرت کی ناکامی) بدلہ ہے اس کا جو وہ عمل کیا کرتے تھے۔

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿٩٦﴾

(ایمان والو !) وہ اس لیے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم ان سے راضی ہوجاؤ۔ مگر (سن لو کہ) اگر تم ان سے راضی ہوگئے تو بلاشبہ اللہ تعالٰی فاسقوں کی قوم سے راضی نہیں ہوگا۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں دیہاتیوں گنواروں کے متعلق بتایا گیا ہے:۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

دیہاتی لوگ کفر اور نفاق کے لحاظ سے بہت سخت ہوتے ہیں۔ اور وہ زیادہ اس قابل ہیں کہ وہ ان حدوں کو نہیں جانتے۔ جو اللہ نے اپنے رسول سلام علیہ کے ذریعہ نازل فرمائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑھ کر علم والا اور بڑھ کر حکمت والا ہے۔

○ اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ دیہاتی لوگ کفر و نفاق میں اس لیے سخت ہوتے ہیں کہ انہیں حدود اللہ کا علم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جملہ لایا گیا ہے **واللہ علیم حکیم** اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑی حکمت والا ہے' جس نے ایمان والو ! تم پر واضح کر دیا ہے کہ دیہاتیوں کی سختی اسی صورت میں کم ہو سکتی ہے کہ انہیں حدود اللہ سے آشنا کیا جائے۔ لہٰذا مومنوں کا فرض ہے کہ دیہاتیوں میں **ما انزل اللہ** کی تبلیغ و تعلیم عام کی جائے۔ تاکہ وہ لاعلمی کی وجہ سے گمراہی کا شکار نہ بنے رہیں۔

○ اس سے اگلی دو آیتوں میں دیہاتیوں کے دونوں قسم کے حضرات کی خبر دی گئی ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کئے گئے مال کو الگ الگ تاوان اور اللہ کے تقرب کا ذریعہ جانتے ہیں۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَاۗىِٕرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

اور دیہاتیوں میں سے (ایک گروہ وہ ہے) جو اس مال کو وہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تاوان قرار دیتا ہے اور ایمان والو ! وہ تم پر گردش زمانہ کی انتظار کرتا ہے۔ خود ان پر زمانہ کی بری گردش ہے اور اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اور دیہاتیوں میں سے (ایک گروہ وہ ہے) جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتا ہے۔ اور اس مال کو جو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اللہ کی قربت کا اور رسول کی دعاؤں (تحسین و آفرین) کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ خبردار (بگوش ہوش سن لو کہ) بلا شبہ وہ مال ان کے لیے اللہ کی قربت کا (بھی اور رسول کی دعاؤں کا بھی) ذریعہ ہے۔ ضرور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ بچاؤ عطا فرمانے والا مہربان ہے۔

○ **علیہم دائرۃ السوء** کے جملہ میں علیہم کے لفظ سے ثابت ہے کہ زمانہ کی طرف اچھی یا بری گردش ان لوگوں کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان لوگوں نے خود ہی یہ تصور ایجاد کر رکھا ہے اور خود ہی اس کے برے توہمات کے چکر میں گرفتار ہیں۔ اس کا عذاب خود انہی کے اوپر مسلط ہے۔

○ صلوات الرسول سے مراد ہے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والوں کو نبی اکرمؐ کی طرف سے مرحبا تحسین و آفرین کہنا اور ان پر خوش ہوجانا۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں صحابہؓ رسولؐ کی پانچ اقسام میں سے پہلی چار قسموں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اللہ ان سب سے راضی ہوگیا تھا اور وہ سب کے سب اللہ پر راضی ہوگئے تھے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے صحابہؓ رسولؐ مقبول کو سب سے پہلے مہاجر و انصار کے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچنے والے مکی مہاجر اور ان کی نصرت کرنے والے مدنی انصار

○ اور پھر انہیں سابق و لاحق کے کے دو حصوں میں تقسیم کرکے ذیل کے چار حصوں پر منقسم کر رکھا ہے۔

۱۔ سابقین مہاجر یعنی سب سے پہلے ہجرت کرنیوالے ۲۔ لاحقین مہاجر یعنی وقتاً فوقتاً بعد میں ہجرت کرنیوالے

۳۔ سابقین انصار یعنی سب سے پہلے نصرت کرنیوالے ۴۔ لاحقین انصار یعنی بعد میں نصرت کرنیوالے۔

○ ان چاروں اقسام کو باری تعالیٰ نے ایک ہی سطح پر حقے سچے مومن قرار دیا ہے۔ ۸/۷۴ اور آیت مجیدہ ۹/۱۰۰ میں ان ہرچہار اقسام کو رضی اللہ عنہ اور رضوا عنہ قرار دیا اور سب کے سب کیلئے جنت و مغفرت کی خوشخبری دی ہے۔

۵۔ صحابہ رضی اللہ عنہ کی پانچویں قسم بتائی گئی ہے فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے یہ بھی حقے سچے مومن تھے۔ فرق یہ ہے کہ ان کے مدارج فتح مکہ سے ماقبل دور کے گوناگون مصائب برداشت کرنیوالی چار اقسام کے برابر نہیں تھے۔ اس پانچویں قسم کی قرآنی وضاحت اپنے مقام پر آگے آرہی ہے۔ پہلے آیت مجیدہ ۹/۱۰۰ ملاحظہ فرمائیں جس میں پہلی چار اقسام کی وضاحت کی گئی ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

اور (مکی) مہاجرین اور (مدنی) انصار میں سے سبقت کرکے اولین ہجرت کرنیوالے اور اولین نصرت کرنیوالے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے ہجرت و نصرت میں ان کی حسن کارانہ پیروی کی (یعنی سابقون الاولون کے بعد وقتاً فوقتاً ہجرت اور نصرت کرتے رہے) اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور اس نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کر دیئے ہیں جن کی سطح میں نہریں بہتی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

○ رضی اللہ عنہم و رضوانہ کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں کہ اللہ تعالیٰ مہاجرین مکہ اور انصار مدینہ پر اس لئے راضی ہوگیا کہ مہاجرین کرام نے اپنا وطن، عزیز و اقارب، بھرے گھر، بھری دکانیں اور چلتے کاروبار چھوڑ کر اللہ کی راہ میں ہجرت فرمائی اور انصارؓ نے اپنی ضرورتوں کو پس پشت پھینک کر مہاجر بھائیوں کی دامے درمے قدمے اور سخنے ہر نوع کی مدد کی۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحابہؓ کرام مہاجر و انصار کس امر پر اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگئے تھے۔ اس کا جواب اس کے سوا نہیں ہوسکتا کہ وہ پاکیزہ نفوس اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون ربوبیت پر راضی ہوگئے کہ اگر وطن عزیز اور گھربار، سب کچھ قربان کرکے نظام ربوبیت قائم ہو جائے تو گھاٹے والا سودا نہیں اور یہی حالت انصارؓ مدینہ کی تھی کہ مہاجرؓ بھائیوں پر سب کچھ نچھاور کرکے بھی اگر ایک ہموار و متوازن معاشرہ میسر آجائے تو پھر بھی سستا سودا ہے۔ مہاجرینؓ مکہ اور انصارؓ مدینہ کے ایثار کی مثال پوری دنیا کی پوری تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے اور شاید قیامت تک قاصر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقدس ہستیوں کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کیلئے رضی اللہ عنہ کے مخصوص انعام سے سرفراز کر رکھا ہے۔

صحابہ کرام کی پانچ اقسام :۔ ○ پچھلے صفحہ پر بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے صحابہؓ رسولؐ کی پانچ قسمیں بتائی ہیں۔ سابقین الاولین مہاجر سابقین الاولین انصار، لاحقین مہاجر، لاحقین انصار اور فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے مہاجر پہلی چار اقسام کی وضاحت تو آیت مجیدہ ۹/۱۰۰ میں اوپر گزر چکی ہے۔ جس کی تائید سورہ انفال کی آیت مجیدہ ۸/۷۴ میں موجود ہے۔ جس میں سابق و لاحق مہاجرین و انصار کو ذیل کے انتہائی کھلے الفاظ میں حقے سچے مومن کہا گیا ہے۔

○ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ** ○ ۸/۷۴ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ بھی جنہوں نے انہیں جگہ دی اور مدد کی وہ وہی تو حقے سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے (ہر قسم کے خطرات سے) بچاؤ اور عزت کا رزق ہے یعنی انہیں زمین میں اقتدار عطا کیا جائیگا۔ انہیں ایک باعزت آزاد اسلامی ریاست عطا کی جائیگی۔

○ یہ تو ہوئے پہلی چار قسم کے صحابہؓ سابق و لاحق مہاجرین و انصار ۸/۷۴ کے بعد ساتھ ہی اگلی آیت مجیدہ میں فتح مکہ کے بعد ایمان لانیوالوں کے متعلق بھی اعلان کر دیا گیا ہے کہ وہ بھی انہی میں سے تھے، یعنی وہ بھی حقے سچے مومن تھے۔

○ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ** ۸/۷۵= اور (اے سابق و لاحق مہاجر و انصار!) جو لوگ (فتح مکہ کے) بعد ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا، وہ بھی تمہیں میں سے ہیں۔ (وہ بھی حقے سچے مومن ہیں۔ وہ بھی رضی اللہ عنہ ہیں)۔

فتح مکہ کے بعد ایمان لانیوالوں کے مدارج سابق و لاحق صحابہؓ کے برابر نہیں :۔ ○ فتح مکہ سے پہلے کا دور صحابہؓ کرام مہاجرینؓ و انصارؓ کیلئے گوناگون مصائب کا دور تھا جس میں صحابہؓ کرام نے ہر آنیوالی مصیبت کا انتہائی مستقل مزاجی اور پامردی کیساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن فتح مکہ کے بعد مصائب و آلام کے تمام بادل چھٹ گئے، آئے دن مکہ معظمہ کی طرف سے اٹھنے والی شدید طوفانی آندھیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ اس لئے فتح مکہ کے بعد امن و عافیت اور ترقی و خوشحالی کا دور شروع ہوگیا۔ فلهذا چونکہ بعد میں ایمان لانے والوں کو فتح سے قبل والے مصائب و شدائد کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ماقبل اور مابعد والوں کے مدارج برابر نہیں بتائے۔ فتح مکہ سے ماقبل ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کرنے والوں کو بالفاظ ذیل اعلیٰ مدارج والے قرار دیا ہے۔

○ **لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ** ○ ۵۷/۱۰= (اے صحابہؓ!) تم میں سے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا اور (اسلام کے دشمنوں کے ساتھ) لڑائی کی وہ برابر نہیں ہیں۔ وہ درجات کے لحاظ سے ان لوگوں سے اعظم (اونچے درجے پر فائز ہیں) جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور (اسلام کے دشمنوں سے) لڑائی کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب (صحابہؓ) کیساتھ (ہر ایک کے اعمال کے مطابق بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اور (سن لو کہ) اللہ تعالیٰ اس سے پورا پورا باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔ (وہ ہر ایک کے درجے اس کے اعمال کے مطابق ہی متعین کرتا ہے)۔

اس آیت مجیدہ ۵۷/۱۰ کے مطابق اظہر من الشمس ہے کہ فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں اور اپنی جانوں اور مالوں

کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے درجے' فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں اور اپنے مالوں اور جانوں کیساتھ جہاد کرنے والوں سے افضل ہیں۔ لیکن آیت مجیدہ کے آخری جملہ **واللہ بما تعملون** خبیر کے الفاظ سے عیاں ہے کہ اس سے آگے پھر فتح سے پہلے اور بعد ایمان لانے والوں اور ہجرت و جہاد کرنے والوں میں سے ہر صحابیؓ کا درجہ اس کے اعمال صالحہ کے مطابق الگ الگ ہے اور یہی تقاضائے انصاف ہے۔

سب کے الگ الگ مدارج :۔ ○ اس آیت مجیدہ کے مطابق تاریخ اسلام میں جن صحابہؓ کی مخصوص اسلامی خدمات اور مثالی قربانیوں کے تذکار جلیلہ بیان ہوئے ہیں اور انہی اعلیٰ وارفع قربانیوں کے معیار کے مطابق جن صحابہؓ کرام کو بلند و بالا مدارج کا حامل بتایا گیا ہے۔ خود مذکورہ بالا آیت قرآنیہ کے مطابق اس سے مجال انکار نہیں ہوسکتی۔ مثلاً" ابوبکر و عمرؓ کے متعلق تاریخ اسلام میں آیا ہے کہ ایک جنگ کے موقعہ پر جب نبی اکرمؐ نے جنگی ضروریات کیلئے صحابہ کرام سے مال طلب فرمایا تو عمرؓ نے اپنی آدھی نقدی حضور رسالت میں پیش کی۔ مگر ابوبکرؓ نے ساری کی ساری نقدی لاکر حضور رسالت میں ڈھیر کر دی۔

○ تو اسطرح ابوبکر رضی اللہ عنہ' واللہ **بما تعملون** خبیر کے مطابق یقیناً" جملہ صحابہؓ سے اعلیٰ و ارفع اور بلند و بالا مرتبہ کے حامل ٹھہرتے ہیں اور دوسرے درجہ پر عمرؓ جنہوں نے آدھی نقدی حاضر کر دی۔ اور اسی طرح جملہ صحابہؓ کے الگ الگ مدارج انفاق مال کے لحاظ سے آیت مجیدہ ۵۷/۱۰ سے عیاں ہیں۔ مجال انکار نہیں ہوسکتی۔ صحابہؓ کرام کے الگ الگ مدارج اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہیں اور ان کے الگ الگ اعمال کے الگ الگ مدارج کی جزا بھی اس ذات باری کے پاس محفوظ ہے۔ جس کے ہاں بے انصافی اور دھاندلی کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا اور جس نے انہیں خود ارشاد فرما دیا تھا کہ تم جو بھی عمل کرو گے۔ اللہ تعالیٰ اس سے پورا پورا باخبر ہے۔ ۵۷/۱۰

○ ہمیں ان حضرات سے ازراہ ہمدردی و خیر خواہی عرض کرنا ہے۔ جو صحابہؓ رسولؐ کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کرتے اور انہیں کافر و منافق قرار دیکر آیات قرآنیہ کی مخالفت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق باری تعالیٰ نے انتہائی وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کر دیا ہے کہ مہاجر و انصار سابق و لاحق سب کے سب حقے سچے مومن تھے۔ ۸/۷۴ اور جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے اور اپنی جانوں اور مالوں کیساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ بھی انہی میں سے تھے' وہ بھی حقے سچے مومن تھے ۸/۷۵ البتہ ان کے درجے سابقین' لاحقین' مہاجرین و انصار کیساتھ برابر نہیں۔ ۵۷/۱۰

منافقوں کا مسئلہ :۔ تو اسطرح صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق کفر و نفاق کا تصور پیدا کرنا صریحاً" قرآن کریم کی مخالفت پر مبنی ہے۔ باقی رہا منافقوں کا معاملہ' جو کفر چھپا کر ایمان ظاہر کرتے اور صحابہؓ کرام کے اندر ملے ہوئے تھے۔ ان کے متعلق بھی قرآن مجید میں کھل کر بیان کر دیا گیا ہے کہ انہیں ختم کر دیا گیا تھا۔ اسی سورہ توبہ کی آیت نمبر ۴۲ سے منافقوں کا ذکر شروع کیا گیا ہے۔

○ آیات مجیدہ ۹/۵۵ + ۹/۸۵ میں دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ اعلان گزر چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ وہ انہیں اس دنیا کی زندگی ہی میں ان کے مالوں اور اولادوں کے ذریعہ عذاب کریگا۔ اور ۹/۷۳ میں خود نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ

منافقوں اور کافروں دونوں کے خلاف جہاد فرمائیں اور ان پر پوری پوری سختی کریں۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارادہ ۹/۵۵ + ۹/۸۵ اور اس کے نبی اکرمؐ کی طرف نافذ کردہ حکم ۹/۷۳ کے مطابق روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ منافقوں کا خاتمہ خود نبی اکرمؐ کے ہاتھوں ہی کروا دیا گیا تھا۔ نیز ۶۰-۶۱/۳۳ میں منافقوں کی آخری سزا بیان کر دی گئی ہے کہ ایک ایک منافق کا پیچھا کرکے ایک ایک کو قتل کر دیا گیا۔ مذکورہ بالا جملہ آیات مجیدہ گزر گئی ہیں۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں ہم آپ کو منافقوں ہی کے عنوان سے متعلقہ اگلی ملحقہ آیت مجیدہ کی سیر کراتے ہیں' جس میں شہری اور بدوی دونوں قسم کے منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ۝

اور (اے صحابہؓ!) تمہارے اردگرد دیہاتی منافقین اور مدینہ کے رہنے والے (منافق) بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے ہم انہیں جانتے ہیں۔ ہم ضرور انہیں دو مرتبہ عذاب کرینگے۔ پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائینگے۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

اور (انکے علاوہ کچھ منافق) اور ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا ہے انہوں نے اچھے اور دوسرے برے عملوں کو ملا دیا ہے۔ قریب ہے کہ اللہ (انکے گناہوں کے اقرار اور توبہ و اصلاح اعمال کی بدولت) ان پر رجوع برحمت ہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بچاؤ عطا فرمانے والا مہربان ہے۔

○ **سنعذ بھم مرتین** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کو دو مرتبہ عذاب کرنے کا اعلان فرمایا ہے۔ اس کے متعلق روایتی تفسیروں نے تو عجیب قسم کی بھول بھلیاں پیش کی ہیں۔ اکثر مفسروں نے ایک عذاب تو قبر کا عذاب قرار دیا ہے اور دوسرا قیامت کا۔ لیکن منافقوں کے عذاب کے متعلق چونکہ پیچھے ۹/۵۵ + ۹/۸۵ میں بیان کیا گیا ہے کہ انہیں اسی دنیا کی زندگی میں خود ان کے مالوں اور اولادوں کیساتھ عذاب کیا جائیگا۔ اس کے مطابق بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ نبی اکرمؐ نے کچھ منافقوں کے نام لے کر انہیں مسجد سے نکال دیا اور دوسرا عذاب وہ قرار دیا ہے جو ان کے مالوں اور اولادوں کے ذریعہ دیا جانیوالا تھا اور انہوں نے تیسرا عذاب عظیم قیامت کا عذاب قرار دیا ہے۔

○ لیکن واضح رہے کہ دو مرتبہ کے دنیا کے عذاب کے بعد ان کے لئے دنیا ہی میں عذاب عظیم کی طرف لوٹائے جانے کی خبر دی گئی ہے۔ آخرت کا عذاب تو منافقوں اور کافروں سب کیلئے مشترک ہوگا۔ اسے صرف منافقوں کیلئے قرار دینا کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہوسکتا۔

تفسیر القرآن بالقرآن :۔ ○ اس لئے اب آیئے تفسیر القرآن بالقرآن کی طرف۔ آیات بالا میں منافقوں کیلئے دنیا ہی میں دو مرتبہ کے دنیوی عذاب کی خبر دی گئی ہے اور **ثم یرد ون الی عذاب عظیم** کے الفاظ میں تیسری مرتبہ کے دنیوی عذاب عظیم کا اعلان فرمایا گیا ہے۔ تصریف آیات کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے کہ پیچھے ۹/۵۵ + ۹/۸۵ میں اعلان کیا گیا ہے کہ منافقوں کو دنیا ہی کی زندگی میں ان کے مالوں اور اولادوں کے ذریعہ عذاب کیا جائیگا۔ پس منافقوں کیلئے ایک عذاب تو یہ تھا کہ ن کی اولادیں ان کی زندگی ہی میں مسلمان ہوگئیں اور انہی کے خلاف برسرپیکار آگئیں اور ان کی اولادوں نے خود انہی کا مال منافقوں کے خلاف نبی اکرمؐ کی مہم کو کامیاب کرنے میں خرچ کیا۔ بالفاظ دیگر منافقوں کے مال اور اولادیں ان کی زندگی ہی

میں ان کے خلاف جہد آزما ہو کر باعث عذاب بنیں۔

○ اور منافقوں کو دوسرا دنیوی عذاب یہ ہوا کہ جب نبی اکرمؐ کو حکم ہوا **یایھا النبی جاھد الکفار والمنفقین واغلظ علیھم** ۹/۷۳ + ۹/۶۶ (تو عیاں ہے آپؐ نے یقیناً" منافقوں کے خلاف جہاد یعنی کوشش فرمائی تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر بہت سے منافق مارے گئے' کچھ بھاگ گئے اور کچھ نہایت محتاط ہو کر مسلمانوں کے اندر چھپ گئے۔ اس کے بعد باری آتی ہے منافقوں کیلئے اس عذاب عظیم کی' جس کی خبر آیت بالا ۹/۱۰۱ میں دی گئی ہے)۔ **ثم یروون الی عذاب عظیم** اور جس کا حکم ۶۰-۳۳/۶۱ میں بالفاظ ذیل دیا گیا ہے۔

منافقوں کیلئے دنیوی عذاب عظیم :۔ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ○ مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا"

○ ۶۰-۳۳/۶۱۔ اگر منافق باز نہ آئے یعنی جن کے اذہان میں منافقت کی بیماری ہے اور شہر میں بری خبریں اڑانے والے بھی تو ہم آپ کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ اس شہر میں آپ کے اردگرد نہیں رہیں گے مگر تھوڑی مدت (یعنی صرف اتنی مدت کہ جب تک وہ گرفتار نہ ہو جائیں اور اتنی دیر بھی) ملعون ہو کر رہیں گے (یعنی ذلیل و خوار چھپتے چھپاتے حکم دیا جاتا ہے کہ ایک ایک منافق کی تلاش کی جائے) وہ جہاں جہاں پائے جائیں گرفتار کرلئے جائیں اور (مرکز میں حاضر کرکے) اس طرح قتل کئے جائیں جو قتل کرنے کا حق ہے۔ یہ ہے برادران عزیز! پہلے دو دنیوی عذابوں کے علاوہ ان کے لئے آخری عذاب عظیم جس میں منافقوں کے خلاف بحکم باری ایک عظیم مہم چلائی گئی' ایک ایک کا پیچھا کیا گیا اور ایک ایک کو گرفتار کرکے کیفرکردار تک پہنچا دیا گیا۔ ایک ایک کو قتل کرکے جماعت صحابہؓ کو مدنی اور بدوی جملہ منافقوں سے پاک کر دیا گیا۔

بعض نے توبہ کرکے اپنی اصلاح کرلی :۔ ○ اب منافقوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو محض بڑے بڑے منافقوں کے ظاہری رعب کی بدولت ان میں ملے ہوئے تھے اور ان میں ملے ہونے کی بدولت بعض اعمال سیئہ یعنی اسلامی حکومت کے خلاف عمل بھی کرتے تھے اور بعض اعمال صالحہ یعنی اسلامی حکومت کی اطاعت گزاری کے بھی کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے متعلق **اعترفوا بذنوبھم** کے الفاظ میں خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کیا اور اپنی اصلاح کا وعدہ کیا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے اعمال سے اپنی توبہ کا ثبوت پیش کر دیں تو اللہ تعالیٰ ان پر رجوع برحمت ہوگا۔ انہیں معاف کر دیگا۔ (آیت مجیدہ ۱۰۲ بغور ملاحظہ فرمائیں)

مالداروں کے مالوں سے صدقات وصول کرنے کا خصوصی حکم :۔ ○ نبی اکرمؐ نے جب قرآنی معاشرہ قائم کیا تو آپ کے سامنے بیشمار اقتصادی یعنی مالی مشکلات آموجود ہوئیں۔ سب سے پہلے عوام کے ان افراد کی ضروریات زندگی کا لازماً" پورا کرنا جو ناہموار و غیر متوازن معاشرہ کی بدولت اپنی جائز ضرورتوں سے بھی محروم کئے جاچکے تھے۔ دوسرے نمبر پر بیرونی حملہ آوروں کے دفاع کے لئے ہر قسم کے فوجی ساز و سامان ہر آن تیار کرتے رہنا اور تیسرے نمبر پر منافقوں کا قلع قمع کرنا جو مار آستین بن کر اسلامی حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے اور یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ جہاں مال کی ضرورت ہو وہاں مال ہی کام کرسکتا ہے اور مالی ضرورتیں مال ہی کیساتھ پوری ہوسکتی ہیں' مال کے بغیر ہرگز پوری نہیں

ہوسکیں۔ اس لئے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے نام ذیل کا خصوصی حکم جاری کیا گیا ہے تاکہ رکی ہوئی مالی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۰۳)

(اے رسولؐ! ریاستی ضروریات کیلئے ان (یعنی مالداروں) کے مالوں سے صدقات وصول کریں اور ان (کے کمزوروں) کو اس مال کیساتھ (مالی بدحالی سے) پاک کریں اور انہیں فربہی دیں اور ان (صدقات دینے والوں) کو شاباش دیں بیشک آپ کی شاباش ان کے لئے وجہ تسکین ہے۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

○ خذ امر کا صیغہ ہے۔ یعنی مالدار مومنوں کے مالوں سے صدقات وصول کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس مال کو صدقات اس لئے کہا ہے کہ دینی ضروریات کیلئے مال دینا ہی ایمان کی تصدیق ہے۔ یہ مال زکوۃ کے مال سے الگ ہے۔ زکوۃ وہ مال ہے جو ہر مومن نے اپنی آمدنی کے دسویں حصے کی صورت میں لازماً ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسلامی معاشرہ کی تکمیل کا کام زکوۃ کے مال سے پورا نہ ہوسکے تو اسلامی حکومت کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مالداروں کے مالوں سے اضافی مال بھی وصول کرنے کی مجاز ہے۔

○ **تطهرهم و تزكيهم بها** کے الفاظ میں اس مال کی اضافی وصولی کی اولین غرض بتائی گئی ہے۔ اقتصادی بدحالوں کو ان کی مالی بدحالی سے پاک کرنا۔ یہاں طہارت بالمال کا حکم ہے طہارت بالماء کا نہیں اور طہارت بالمال اس کے سوا نہیں ہے کہ اقتصادی بدحالوں کو ان کی مالی بدحالی سے پاک کیا جائے۔ اور دوسرا حکم ہے۔ **تزكيهم بها** یعنی معاشرہ کے کمزوروں' دبلوں کو اس مال کیساتھ فربہی دیں اور اس کے علاوہ اس اضافی مال کی وصولی کی دوسری غرض سیاق کلام کے مطابق عیاں ہے کہ اس کے ساتھ منافقوں کا قلع قمع کیا جائے۔

○ **صل عليهم** میں صلوۃ بمعنی شاباش و آفرین کہنا ہے اور نبی اکرمؐ کا مومنوں کو شاباش و مرحبا کہنا ان کیلئے یقیناً" وجہ تسکین تھا۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہے:۔ ○ اگلی آیت مجیدہ میں پھر ان لوگوں کیطرف رخ کیا گیا ہے جو منافقوں میں سے اعتراف گناہ کرکے توبہ کی طرف رجوع ہوئے تھے چنانچہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی توبہ بھی قبول کرتا ہے اور ان کے صدقات بھی قبول کرتا ہے۔ پیچھے آیت نمبر ۵۴ میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ منافقوں سے مال ہرگز قبول نہیں کئے جائینگے۔ لیکن آیت ذیل میں خالص توبہ کی فضیلت کے اظہار کے طور پر منافقوں میں سے سچی توبہ اور اصلاح کرنے والوں کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ بھی قبول کریگا۔ اور ان سے صدقات کے مال بھی قبول کئے جائینگے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۱۰۴)

کیا لوگوں نے نہیں جانا (یعنی انہیں جان لینا چاہئے) کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو اپنے بندوں کی (سچی اور عملی) توبہ قبول کرتا ہے۔ اور ان سے صدقات بھی لیتا (قبول کرتا ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ بلاشبہ وہ رجوع برحمت کرنے والا مہربان ہے۔

توبہ کی تصدیق:۔ ○ آیت بالا میں توبہ کی تصدیق بذریعہ اعمال کا اٹل قانون بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں توبہ کرنے والے منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ سن لو تمہاری توبہ کی تصدیق تمہارے آئندہ کے اعمال سے ہوگی۔ محض زبانی توبہ توبہ کی کوئی قیمت نہیں۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۰۵)

اور (اے رسولؐ!) آپ ان توبہ کرنے والوں سے) کہہ دیجئے گا کہ تم عمل کرو۔ پھر اللہ بھی تمہارا عمل دیکھے گا اور اس کا رسولؐ بھی اور سب مومن بھی دیکھیں گے۔ پھر تم غیب و حاضر کے جاننے والے (اللہ) کیطرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر وہ تمہیں (قیامت کی عدالت عالیہ میں) ہر چیز کی خبر دیگا جو تم عمل کرتے رہے تھے۔

منافقوں کا ایک اور گروہ:۔ ○ منافقوں کے اس تائب گروہ کی وضاحت کے بعد منافقوں کے ایک مشکوک گروہ کی خبر دی گئی ہے جس کا فیصلہ نبی اکرمؐ نے کچھ دیر کیلئے ملتوی فرما دیا تھا تاکہ تحقیقات مکمل ہو جائے اور صحیح فیصلہ دیا جاسکے کہ وہ عذاب یعنی سزا کا مستحق ہے یا نہیں ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۱۰۶)

اور کچھ اور ہیں جن کا فیصلہ اللہ کے حکم کیلئے ملتوی کر دیا گیا ہے خواہ وہ انہیں عذاب کرے یا ان پر رجوع برحمت ہو کیونکہ اللہ صاحب علم و حکمت ہے۔

○ واضح رہے کہ سیاق کلام کے مطابق بھی یہ منافقوں ہی کا گروہ تھا اور سباق کلام کے مطابق بھی۔ مگر روایتی تفاسیر نے اس گروہ کو مسلمانوں کا گروہ قرار دیکر اس پر یہ شان نزول چسپاں کر رکھا ہے کہ کچھ صحابہؓ تھے جو جنگ تبوک میں عمداً شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان کی توبہ کی قبولیت ملتوی کر دی گئی تھی۔ لیکن جہاں تک کلام باری کے سیاق و سباق کا تعلق ہے اس کے مطابق یہ منافقوں کا گروہ تھا جو ایک ایسا عمل بجا لایا تھا جسے نبی اکرمؐ نے بیک نظر غلط قرار نہیں دیدیا تھا بلکہ اس کے لئے کچھ وقت کی لازمی مہلت درکار تھی۔ کیونکہ وہ عمل یہ تھا کہ انہوں نے ایک مسجد بنائی تھی۔ اب عیاں ہے کہ مسجد بنانا بظاہر ایک نیک کام ہے اور انہوں نے ظاہر بھی یہی کیا کہ ان کا نیکی ہی کا ارادہ ہے۔ لیکن اللہ نے ان کے اس عمل کے متعلق یہ فیصلہ دیا

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۰۷)

اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد بنائی ضرر پہنچانے کیلئے اور انکار کرنے اور مومنوں میں تفریق ڈالنے کیلئے اور اس گروہ کے گھات لگانے کیلئے جو اس سے پہلے اللہ اور رسولؐ (اسلامی حکومت) کیساتھ لڑ چکا ہے۔ اور وہ لوگ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے نہیں کیا ارادہ مگر نیکی کا (مسجد بنانا ایک نیک کام ہے)۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

مسجد ضرار:۔ ○ واضح رہے کہ مذکورہ مسجد بنانے والوں کے متعلق جو فیصلہ نبی اکرمؐ نے ملتوی کر رکھا تھا کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نازل ہو۔ آیت بالا میں یہ فیصلہ دیا گیا کہ یہ لوگ فسادی ہیں۔ انہوں نے جو مسجد بنائی ہے اس میں

اللہ و رسولؐ کے دشمنوں کیلئے گھات لگانے کا اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ موقعہ پاکر داخلی طور پر حملہ کرکے اسلامی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ ان لوگوں کی ایک سکیم یہ تھی کہ نبی اکرمؐ کو اس مسجد میں صلوۃ کیلئے بلایا جائے اور جب نبی اکرمؐ صلوۃ میں کھڑے ہوں تو آپؐ پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن اگلی آیت مجیدہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو اس مسجد میں صلوۃ موقت کیلئے کھڑے ہونے سے مطلقاً" منع کر دیا۔

لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ﴿۱۰۸﴾

(اے رسولؐ!) آپ اس (مسجد) میں کبھی بھی (صلوۃ کیلئے) کھڑے نہ ہونا۔ البتہ وہ مسجد جو پہلے دن سے تقویٰ (مسلمانوں کیلئے بچاؤ) کی اساس پر بنائی گئی ہے (مسجد نبوی) وہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس مسجد (نبوی) میں ایسے مومن مرد ہیں جو (منافقت سے) پاکیزہ رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور اللہ پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

○ اس آیت مجیدہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ

مسجد ضرار کے بنانیوالے پاکیزہ لوگ نہیں تھے۔ وہ ناپاک ذہنوں والے یعنی منافق تھے۔ مذکورہ مسجد، مسجد کے نام سے اسلامی ریاست کے دشمنوں کیلئے محفوظ کمین گاہ بنائی گئی تھی۔ جہاں دشمن گھات لگا کر محفوظ بیٹھ سکتے تھے۔ اس نام نہاد مسجد کا انجام اور اس کے بنانیوالوں کی سزا اگلی دو آیات کریمات میں بیان کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی مساجد کی تعمیر کے اصول کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ان کی بنیاد مسلمانوں اور ان کی حکومت کے بچاؤ کے پاکیزہ جذبے پر ہونی چاہیئے۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۰۹﴾

کیا پھر جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ سے بچاؤ طلب کرنے اور اس کی رضامندی پر رکھی ہو، وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے گرنیوالے کمزور کنارے پر رکھی ہو۔ پھر وہ بنیاد اسے جہنم (ناکامی) کی آگ میں لے گرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کی قوم کو ہدایت یافتہ نہیں ٹھہراتا۔

○ منافقوں نے جو مسجد بنائی اس کی بنیاد آیت بالا کے مطابق آگ کے گڑھے کے گرنے والے کنارے پر رکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس بنیاد نے اس مسجد کو آگ کے گڑھے میں گرا دیا۔ وہ سب ظالم قوم یعنی منافق گروہ کے افراد تھے۔ ان کا اسلامی حکومت کے خلاف مسجد کے نام سے گھات لگانے کا منصوبہ ناکام ہوا۔ انہیں اپنی سکیم میں ناکامی کی آگ میں گرنا پڑا۔ ایسے شر کی اساس پر قائم کی گئی عمارت کے قائم رہنے کی امید تک ہی باطل ہے۔ چنانچہ وہ عمارت گرا دی گئی اور اس مکروہ اقدام کرنیوالوں کو مناسب وقت پر قرار واقعی سزا دی گئی۔

○ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ خبیث عمارت ہمیشہ کیلئے ان کے ذہنوں میں اس وقت تک کھٹکتی رہے گی جب تک ان کے اذہان ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَن تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۱۰﴾

ان (منافقوں) نے جو عمارت (اسلامی سلطنت کی تباہی کیلئے) بنائی وہ ان کے اذہان میں ہمیشہ وجہ قلق رہے گی۔ (کیونکہ ان کی سکیم اللہ کی وحی

نے ناکام کر دی) ان کی یہ خلش اس وقت تک نہیں مٹے گی) حتیٰ کہ ان کے قلوب (اذہان) ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

○ **ریبة**" کا سہ حرفی مادہ ر' ی' ب= ریب ہے جس کا بنیادی معنی ہے شک' شبہ' اضطراب' بے چینی اور قلق و خلش وغیرہ۔ منافقوں کے اس مخصوص گروہ کا ایک عمارت بنانا' جسے قرآن مجید نے **بنیانھم** کے الفاظ میں ان کی عمارت کہا ہے اور ان کا اسے مسجد کا نام دیکر اسلامی حکومت کے خلاف سازشوں کا ایک خفیہ اڈا بنانا تاکہ موقعہ ملنے پر اسلامی حکومت پر اچانک شدید ضرب لگا کر تختہ الٹ دیا جائے۔ یہ کوئی معمولی سازش نہیں تھی اس کے ناکام ہو جانے کی عملی صورت کے طور پر اس نام نہاد مسجد کا گرایا جانا اور اس عمارت کو بنانے والے منافقوں اور ان کی عظیم خفیہ سازش کا بے نقاب ہو جانا کوئی معمولی قلق و خلش کا موجب نہیں تھا۔ اس لئے بتایا گیا ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ قلق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ ان کے اذہان ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں یعنی جب تک انہیں ان کی خطرناک سازش کی قرار واقعی مزا دیکر انہیں بالکل ختم نہ کر دیا جائے چنانچہ آیت مجیدہ ۹/۱۰۱ گذشتہ کے مطابق منافقوں کو دو مرتبہ عذاب کرنے کے بعد بالآخر **یردون الی عذاب عظیم** وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے گئے' یعنی ایک ایک منافق کی تلاش اور تعاقب کیا گیا اور ایک ایک کو اس طرح قتل کر دیا گیا جو قتل کرنے کا حق ہے۔ ۶۰-۶۱/۳۳

○ **ان تقطع قلوبهم** کے مخصوص الفاظ سے بھی ظاہر ہے کہ منافقوں کا ذہنی قلق و اضطراب اس وقت ختم ہوا جب انہیں عذاب عظیم بڑے عذاب کی طرف لوٹا کر ان کا یکسر خاتمہ کر دیا گیا۔ اس طرح جب ان کے قلوب (اذہان) ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے تو پھر ان کی مذکورہ قلق و خلش ختم ہوئی۔

○ **واللہ علیم حکیم** کے مخصوص جملہ میں بتایا گیا ہے کہ منافقوں کو آہستہ آہستہ بتدریج ختم کرنا۔ علم پر مبنی ایک مخصوص حکیمانہ عمل تھا اس جملہ میں قیامت تک کیلئے خبردی گئی اور حکم دیدیا گیا ہے کہ ہر حکومت میں بعض ملکی افراد' اندرون ملک ایسی بڑی بڑی سازشوں کے جال پھیلاتے رہیں گے کہ آن واحد میں حکومت کا تختہ الٹ کر رکھدیں۔ یہ لوگ اتنے وجیہہ اور بااثر ہونگے کہ اگر موقعہ کی مناسبت کے بغیر انہیں گرفتار کرلیا جائے تو اندرون ملک ایک طوفان عظیم برپا ہو جائے' جس پر قابو پانا مشکل ہو جائے۔ جیسے کہ مسجد ضرار بنانیوالوں نے عوام پر یہ اثر ڈال رکھا تھا کہ انہوں نے اللہ کا گھر بنایا ہے۔ اب عوام میں سے کون ہے جو اللہ کے گھر کی مخالفت کرے۔ اس لئے نبی اکرمؐ نے اس معاملے کو اس وقت تک کیلئے ملتوی کر دیا کہ ان کی سازش کھل کر عیاں ہو جائے۔

○ اس طرح جب اس نام نہاد مسجد میں اسلامی ریاست کے ان دشمنوں کے قیام نے جو اس سے قبل نبی اکرمؐ کیساتھ لڑائیاں لڑچکے تھے' منافقانہ سازش کو بے نقاب کر دیا۔ اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اس عمارت کی غرض تعمیر عیاں کر دی کہ دشمنوں کیلئے گھات کا اڈا بنایا گیا ہے۔ تو اس طرح جب فضا سازگار ہوگئی تو نبی اکرمؐ نے اس نام نہاد مسجد کو گروا دیا۔ اور پھر بتدریج منافقوں کو کیفرکردار تک پہنچایا۔ نبی اکرمؐ کا یہ سارا عمل **واللہ علیم حکیم** کی تفسیر اور علم و حکمت کا مظہر ہے۔

○ واضح رہے کہ اسلامی سلطنت ہموار و متوازن قرآنی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے معاشرہ کے اندرونی اور بیرونی دشمن جس قدر بھی سکیمیں اور منصوبے ہر دور میں بناتے رہتے ہیں۔ اور بناتے رہیں گے' انہیں ناکام کرنے کے لیے مالی اور جانی جہاد و قتال ایک لازمی چیز ہے۔ چنانچہ آیت نمبر ۱۱۱ میں اللہ نے قیامت تک کے مومنوں کے ساتھ ذیل کا سودا کر رکھا ہے۔ جس کے مطابق اسلامی حکومت کے دشمنوں کو ناکام بنایا جاسکے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۱۱۱)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے مال اور ان کی جانیں خرید لی ہیں۔ اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے (دنیا میں بھی ہموار و متوازن معاشرہ اور عاقبت کو بھی عظیم کامیابی)۔ وہ (اس جنت کے دشمنوں سے) اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل ہو جاتے ہیں۔ (اس ہموار و متوازن معاشرہ' جنت کا) وعدہ اللہ کے ذمہ ہے (جو مذکور ہے) تورات میں انجیل میں اور قرآن میں اور جس کسی نے اللہ کے ساتھ کیے ہوئے اپنے وعدے کو پورا کیا' پس چاہیے کہ تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ کے ساتھ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہموار و متوازن معاشرہ جنت کو پالینا ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔

○ جنت بمعنی ہموار و متوازن معاشرہ کی تعریف جس میں نوع انسانی کا کوئی متنفس نہ بھوکا ہو نہ ننگا' نہ بے علاج ہو نہ بے مکان۔ سورہ طٰہٰ میں بالفاظ ذیل درج ہے۔

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ○ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ○ ۲۰/۱۱۸'۱۱۹

(اے نوع آدم) بلاشبہ تیرا حق ہے کہ تو اس جنت' میں نہ بھوکا رہے گا نہ ننگا' اور نہ تو اس میں بے علاج ہو اور نہ (بے مکان کہ) دھوپ میں جلے۔

○ آیت زیر بحث میں مومنوں کے مال جان کا سودا اسی جنت یعنی ہموار و متوازن معاشرہ کے عوض ہی کیا گیا ہے۔ کہ یہ جنت جان اور مال کی قربانی کے عوض میسر آتی ہے مگر:۔

○ مگر واضح رہے کہ آیت مجیدہ کے الفاظ **فیقتلون و یقتلون** کے مطابق جان و مال کا یہ سودا نہ گھروں میں ہوتا ہے نہ بازاروں میں' بلکہ یہ سودا میدان قتال میں ہوتا ہے۔ جہاں اللہ کے ہاتھ مال و جان بیچنے والے مومن دشمنوں کو قتل بھی کرتے ہیں اور خود قتل ہو بھی جاتے ہیں۔ اور واضح رہے کہ کامیاب زندگی ایسی ہی اقوام کو میسر آتی ہے جو ہر آن دشمن کو قتل کرنے کے لیے اور خود قتل ہو جانے کے لیے تیار رہتی ہیں۔ پس **فیقتلون و یقتلون** کے الفاظ میں کامران و کامیاب زندگی کا اصول بتا دیا گیا ہے۔

○ صحابہ کرام اور قیامت تک کے مومنوں کے لیے مذکورہ بالا انداز سے جنت کا وعدہ' آیت مجیدہ کے الفاظ **وعداً علیه حقاً فی التورته والانجیل** کے مطابق تورات میں بھی درج چلا آرہا ہے اور انجیل میں بھی جیسے کہ سورہ فتح میں صحابہؓ رسول کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ **مثلهم فی التورة و مثلهم فی الانجیل** ۴۸/۲۹ محمد رسول اللہ کے ساتھیوں کا حال تورات میں بھی (نازل کر دیا گیا تھا) اور انجیل میں بھی۔

○ آیت زیر بحث میں جو صحابہ کرام کے ساتھ کیے گئے جنت کے مذکورہ بالا وعدے کے متعلق **والقرآن** کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ یہ وعدہ قرآن میں بھی موجود ہے۔ اس پر بعض حضرات سوال کرتے ہیں کہ اس وعدے کا ذکر قرآن مجید میں کہاں درج ہے؟ جواباً" عرض ہے کہ یہ وعدہ خود آیت زیر بحث میں اس کے الفاظ **ان اللہ اشترٰی** ...... الخ میں موجود ہے۔ اور اسی چیز کی خبر انتہائی واضح انداز میں **فی التورٰۃ والانجیل** کے بعد **والقرآن** کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ قرآن مجید کا یہی اسلوب بیان ہے کہ کسی چیز کی خبر جس آیت مجیدہ میں دی گئی ہوتی ہے۔ وہی آیت اس خبر کی دلیل قاطع ہوتی ہے۔ مثلاً" سورہ حج میں ارشاد ہوا ہے۔

○ **یٰاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا" وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ** ...... ۲۲/۷۳ اس آیت میں **ضرب مثل** کا معنی لیا جاتا ہے' بیان کی گئی ہے ایک مثال حالانکہ وہ بیان کی گئی نہیں' بلکہ اس سے اگلے الفاظ میں بیان کی جا رہی ہے اور وہ اسی آیت کے اندر موجود ہے **ضرب** ماضی مجہول کا معنی مضارع کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ ہے۔

اے پوری نوع انسانی! ایک مثال بیان کی جاتی ہے' کان کھول کر سنو! بلاشبہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ اگر سب کے سب جمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے۔

○ اسی طرح آیت زیر بحث ۹/۱۱۱ میں اللہ تعالٰی کے ساتھ مومنوں کے کیے گئے سودے اور اللہ کے وعدے کا ذکر ہے۔ اگلی آیت مجیدہ میں اللہ تعالٰی کے ساتھ مال جان کا سودا کرنے والے مومنوں کی مزید صفات بیان کی جا رہی ہیں جو ان کی عام شبانہ روز کے معمولات زندگی سے متعلق ہیں۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ(۱۱۲)

(مومنوں کی شان یہ ہے کہ وہ) توبہ کرنے والے' (اللہ کی) فرمانبرداری کرنیوالے' (اس کی) حمد کرنے والے (اس کی راہ میں) سفر کرنے والے' رکوع کرنے والے' سجدہ کرنے والے' نیکیوں کا حکم کرنے والے اور برائیوں سے منع کرنے والے۔ اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور (اے رسولؐ) آپ مومنوں کو خوشخبری دے دیں۔

○ **التائبون** مومنوں کی پہلی صفت بتائی گئی ہے کہ اگر بتقاضائے بشریت ان سے کوئی خطا ہو جائے تو توبہ کرکے اپنی اصلاح کرلیتے ہیں۔

○ **العبدون** کا لفظی معنی ہے (اللہ کے) بندے بننے والے۔ بندہ وہ ہوتا ہے جو اپنے مالک کا فرمانبردار ہو۔ اس لیے اس کا معنی لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالٰی کی فرمانبرداری کرنے والے۔ **العبدون** کا معنی جو لیا جاتا ہے عبادت کرنے والے" یہ اس صورت میں صحیح ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں اللہ تعالٰی کی فرمانبرداری کرنا' سب عبادت میں داخل ہے۔ یعنی پورا تولنا عبادت ہے' سچ بولنا عبادت ہے۔ ملاوٹ' بلیک اور ذخیرہ اندوزی نہ کرنا عبادت ہے۔ رشوت نہ لینا عبادت ہے۔ بالفاظ دیگر معاشرہ کی ہر خدمت صحیح خطوط پر دیانتداری کے ساتھ ادا کرنا عبادت ہے۔ صوم و صلوۃ کا پابند ہونا' حج اور زکوۃ ادا کرنا بھی چونکہ اللہ تعالٰی کے احکام کی فرمانبرداری ہے' اس لیے یہ بھی سب عبادت ہیں اور ان پورے قرآنی خطوط پر زندگی گزارتے

والے ہیں۔ **العبدون**

○ **الحمد ون** کا معنی ہے اللہ کی حمد بیان کرنے والے۔ **الراکعون** کا معنی ہے رکوع کرنے والے اور **السجدون** کا معنی ہے سجدہ کرنے والے۔ یہ تینوں چیزیں صلوۃ موقت سے بھی متعلق ہیں کہ صلوۃ میں اللہ تعالی کی حمد بھی کی جاتی ہے اور اس کے حضور رکوع بھی کیا جاتا ہے اور سجدہ بھی۔ اس کے علاوہ **الراکعون** کا معنی قانون الٰہی کے سامنے جھکنے والے بھی ہے اور **السجدون** کا معنی اس کے قانون کی پوری طرح فرمانبرداری کرنے والے بھی ہے۔

○ **السائحون** کا سہ حرفی مادہ س' ی' ح= سیح ہے جس کا بنیادی معنی ہے چلنا' پھرنا' سیاحت و سفر اختیار کرنا۔ یہاں مومنین کی جو تعریف بیان ہوئی ہے۔ اس سے مراد ہے۔ دین اللہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے سفر اختیار کرنا۔ جن میں جنگی سفر مقدم ہیں۔

مشرکوں کے لئے طلب مغفرت نہ کی جائے :۔ ○ آیت بالا میں مومنین کی مذکورہ بالا مخصوص صفات حمیدہ بیان کرنے کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں خود نبی اکرمؐ اور جملہ مومنین کو مشرکوں کیلئے طلب مغفرت سے منع کر دیا گیا ہے خواہ وہ قریبی ہی کیوں نہ ہوں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○ (۱۱۳)

نہیں لائق واسطے نبی کے اور نہ واسطے ان لوگوں کے جو ایمان لائے کہ وہ بچاؤ طلب کریں واسطے مشرکوں کے اگرچہ وہ ان کے قریبی ہی ہوں' پیچھے اس کے کہ ان کے لئے یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ دین اللہ کی مخالفت میں آگ کی طرح' بھڑک اٹھنے والے ہیں۔

○ استغفار کا معنی بچاؤ طلب کرنا ہے۔ جس کا زندگی کے ساتھ بھی تعلق ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ مشرکوں کے لئے نہ ان کی زندگی میں استغفار کی اجازت ہے۔ نہ ان کے مرنے کے بعد۔ چونکہ زندگی میں ہر مومن' ہر دوسرے مومن کا خیر خواہ' ہمدرد و غمخوار ہوتا ہے اس لئے زندگی میں کسی مومن کیلئے استغفار یعنی بچاؤ طلب کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ میری طرف سے دوسرے مومن کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اور کسی مومن کے مرنے کے بعد اس کے لئے استغفار یعنی بچاؤ طلب کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ میرے ذہن میں اس کے لئے کسی قسم کی شکر رنجی باقی نہ رہے گی۔ جیسے کہ متوفی مومنوں کیلئے قرآن میں جو دعا سکھائی گئی ہے اس کے الفاظ ذیل سے یہی چیز عیاں ہے۔

حقوق العباد :۔ ○ **رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○** ۵۹/۱۰

اے ہمارے پروردگار! ہمیں بچاؤ عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ایمان کے ساتھ ہم سے سبقت کر گئے ہیں۔ (یعنی جو مومن فوت ہو چکے ہیں' اور ہماری آرزو ہے کہ) تو نہ پائے ہمارے ذہنوں میں ان لوگوں کے لئے کوئی شکر رنجی جو ایمان لائے ہیں' اے ہمارے پروردگار! تو شفقت کرنے والا مہربان ہے۔ اس آیت مجیدہ ۹/۱۰ کے الفاظ میں استغفار کا مفہوم واضح کر دیا گیا ہے کہ ہر مومن دوسرے مومن کے لئے اپنے ذہن کو ہر قسم کے حسد و کینہ اور شکر رنجیوں سے پاک کرے۔ جو تکلیف کسی مومن کو کسی مومن کی طرف سے بتقاضائے بشریت پہنچی ہو۔ اسے معاف کر دے تاکہ اللہ تعالی بھی اسے معاف کر

دے۔ کیونکہ یہ مسئلہ حقوق العباد سے متعلق ہے کہ بندوں کے جو حقوق بندوں پر واجب کئے گئے ہیں ان میں خیانت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اس وقت ہی معاف کرتا ہے جب وہ لوگ معاف کر دیں جن کے حقوق میں خیانت کے ذریعہ ان پر زیادتی کی گئی ہو۔ جیسے کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے ان پر زیادتی کی تھی۔ مگر جب وہ **ان کنا لخطئین۔** ○ ۱۲/۹۱ کہہ کر معافی کے طلبگار ہوئے کہ بلاشبہ ہم خطاکار ہیں تو یوسفؑ نے ارشاد فرمایا۔

○ **قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ**○ ۱۲/۹۲ یوسف نے کہا آج تم پر (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں (یعنی میں نے تمہیں معاف کیا) اللہ بھی تمہیں معاف کرے گا۔ کیونکہ وہ رحم کرنے والوں میں سے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

○ اسی طرح برادران یوسف نے اپنے والد محترم یعقوبؑ کو بھی تکلیفیں پہنچائی تھیں مگر جب ان کے حضور بالفاظ ذیل اقرار جرم کیا۔

○ **قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ**○ ۱۲/۹۷ انہوں نے کہا کہ اے ہمارے ابا جان ہمارے لئے ہمارے گناہوں کیلئے بچاؤ طلب فرمائیں بلاشبہ ہم خطاکار ہیں۔ تو اس پر یعقوبؑ نے ارشاد فرمایا۔ **قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ**○ (یعقوب نے) فرمایا میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے (اب نہیں بعد میں) بچاؤ طلب کرونگا (جب میں معاف کر دونگا تو وہ بھی معاف کر دیگا) بلاشبہ وہ وہی ہے جو بڑھ کر معاف کرنے والا مہربان ہے۔

○ عربی زبان میں سوف مستقبل بعید کے لئے آتا ہے۔ اس لئے معنی لکھا گیا ہے اب نہیں بعد میں۔

○ اوپر آیت مجیدہ ۱۲/۹۲ میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ جب برادران یوسفؑ نے یوسفؑ کے سامنے **انا کنا خطئین** کہہ کر ان سے معافی طلب کی تو انہوں نے فوراً" کہدیا **لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم و ھوا رحم الرحمین**○ آج تم پر (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں (یعنی میں نے تمہیں معاف کیا) اللہ بھی تمہیں معاف کرے گا کیونکہ وہ معاف کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر معاف کرنے والا ہے۔ ان الفاظ میں دیکھئے! کہ جس طرح یوسفؑ نے اللہ کی معافی کو اپنی معافی کے ساتھ مشروط کیا ہے بالکل اسی طرح ۱۲/۹۸ میں یعقوبؑ نے بھی اللہ کی معافی کو اپنی معافی کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ مگر:۔

○ مگر یوسفؑ نے فوراً" معاف کر دیا تھا۔ اس میں ایک تو ان کی انتہائی کشادہ ظرفی کا ثبوت ہے۔ اور دوسرے یہ بھی ہے کہ بھائیوں نے جو زیادتی ان پر کی کنوئیں میں پھینکنے کی اور پھر انہیں بیچ کر ملک بدر کرنے کی یوسفؑ کا ان مصائب کو برداشت کرنا اس چیز پر منتج ہوا کہ آپ عزیز مصر کے اعلیٰ منصب پر پہنچ گئے اور آپ پر زیادتی کرنے والے بھائی سب کے سب آپ کے پاس طلب غلہ کے لئے حاضر ہوئے۔ یوسفؑ نوجوان تھے انہوں نے بھائیوں کی طرف سے پہنچنے والے مصائب کو باآسانی برداشت کرلیا۔ مگر یعقوبؑ ایک بوڑھے باپ کو ان بیٹوں نے جو دکھ دیئے تکلیفیں پہنچائی اور طعنے دیتے رہے وہ ان کی ضعیف العمری کی بدولت چونکہ ناقابل برداشت تھے مگر آپ کو برداشت کرنے پڑے اس لئے جب بیٹوں نے **انا کنا خطئین** کہہ کر بوڑھے باپ سے معافی مانگی تو آپ نے یوسفؑ کی طرح فوراً" معافی نہ دی۔ بلکہ فرمایا **سوف استغفر لکم ربی** میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے بچاؤ طلب کرونگا۔ (جب میں معاف کروں گا تو وہ بھی معاف کر

دے گا) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے باپ کے سارے دکھ تازہ ہوگئے جو بیٹوں نے انہیں ضعیفی کے عالم میں پہنچائے تھے۔ اس لئے اپنی معافی کے الفاظ محذوف رکھ کر ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے تمہارے گناہوں کی سزا سے بچاؤ ضرور طلب کروں گا۔ مگر فوراً نہیں بعد میں جب صدمہ کی شدت کم ہو جائے گی۔ اللہ کی معافی میرے معاف کرنے کے ساتھ مشروط ہے جسے تم نے دکھ تکلیفیں پہنچائی ہیں۔

المختصر!:۔ ○ کسی زندہ یا متوفی مومن کے لئے طلب مغفرت کا مفہوم اپنے آپ کو اس امر کی تحریک ہے کہ اس کے متعلق اپنے ذہن میں کسی قسم کی کوئی شکر رنجی باقی نہیں رکھی جائیگی۔ اس کے برعکس استغفار کا یہ مفہوم صحیح نہیں کہ اگر اپنے لئے استغفار کیا جائے۔ تو بلا توبہ واصلاح گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یا اگر کسی دوسرے زندہ یا مردہ مومن کیلئے استغفار کیا جائے تو اس کے گناہ معاف ہو جاتے یا اس کے مرتبے بلند ہو جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ اپنے لئے استغفار' خود اپنے لئے اس امر کی تحریک ہوتی ہے کہ آئندہ کے لئے گناہ کے قریب نہیں جاؤں گا۔ اور دوسرے زندہ مومنوں کیلئے استغفار یہ ہے کہ ان کے متعلق پیدا ہونے والی شکر رنجیوں کو طول نہیں دونگا۔ بلکہ جلدی ہی ذہن صاف کرلوں گا۔ اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ اور متوفی مومنوں کیلئے استغفار کا مطلب وہ ہے جو اوپر ۹/۱۰ سے عیاں ہوچکا ہے کہ ان کے متعلق ذہن میں کوئی غل' شکر رنجی نہیں رکھی جائیگی۔ اگر انہوں نے کوئی زیادتی کی ہو تو فوری معاف کر دی جائیگی کہ مسئلہ حقوق العباد کے مطابق اللہ تعالیٰ بھی اسے معاف کر دے۔ البتہ

○ آیت زیر نظر ۹/۱۱۳ میں مشرکوں کے لئے طلب مغفرت سے منع کر دیا گیا ہے' جیسے اسی سورہ توبہ میں آیت مجیدہ ۹/۹۶ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اگر تم منافقوں سے راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ تعالیٰ ان سے کبھی راضی نہیں ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومنوں سے جو قصور دوسرے مومنوں کا ہوا ہو تو قصور وار کو اللہ تعالیٰ اس وقت تک معاف نہیں کرے گا۔ جب تک وہ معاف نہ کرے جس کا قصور کیا گیا ہو۔ جیسے کہ پیچھے ۹۱-۱۲/۹۲ اور ۹۷-۱۲/۹۸ میں یوسفؑ اور یعقوبؑ کے تذکار جمیلہ سے عیاں ہے کہ یوسفؑ نے بھائیوں کو کہا کہ پہلے تمہیں میں معاف کرتا ہوں پھر اللہ تمہیں معاف کرے گا۔ اور یعقوبؑ نے بھی فرمایا کہ پہلے تمہیں میں معاف کروں گا۔ پھر اللہ معاف کرے گا۔

اصحاب الجحیم:۔ اصحاب الجحیم کا معنی لکھا گیا ہے آگ کی طرح بھڑک اٹھنے والے واضح رہے کہ جحیم کہتے ہیں بھڑکتی ہوئی آگ کو۔ اصحب الجحیم کے لئے طلب مغفرت سے منع کیا گیا ہے' جن کی نشانی خود ان الفاظ کے اندر بیان کر دی گئی ہے کہ وہ بھڑکتی ہوئی آگ والے ہیں' اصحب الجحیم کا لفظی معنی یہی ہے اور موقعہ و محل کے مطابق مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے دشمن جو اس کی دشمنی میں آگ کی طرح بھڑک اٹھتے ہیں' ان کے لئے طلب مغفرت نہ کرنا۔

ابراہیمؑ کی اپنے باپ کے لئے طلب مغفرت:۔ آیت زیر بحث ۹/۱۱۳ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کو حکم دیا گیا ہے کہ مشرکوں کے لئے طلب مغفرت نہ کرنا خواہ وہ تمہارے قریبی ہی کیوں نہ ہوں۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں اس پر وارد ہونے والے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے مشرک باپ کے لئے دعاء مغفرت کیوں کی تھی؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (۱۱۴)

اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لئے استغفار نہیں تھا مگر ایک وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا' پھر جب اس پر یہ کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہوگیا۔ (اپنے استغفار کو غلط قرار دے کر رجوع کرلیا) بلاشبہ ابراہیمؑ نرم دل اور بہت بردبار تھا۔

چونکہ ابراہیمؑ بہت نرم دل تھے اس لئے باپ کے لئے طلب مغفرت کر دی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قبول نہ کیا۔ ۴/۶۰ آپ کی اس طلب مغفرت کا ذکر سورہ مریم میں بالفاظ ذیل درج ہے۔ کہ جب باپ نے کہا کہ اگر تو میرے معبودوں کو نہ مانے گا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ پتھر مار مار کر مار ڈالوں گا۔ اس پر ابراہیمؑ نے جواباً" ارشاد فرمایا۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا" ○ ۱۹/۴۷

ابراہیمؑ نے فرمایا تجھ پر سلام ہو (میری طرف سے تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی' میں تیرے لئے اپنے رب سے طلب مغفرت کروں گا) تو نے جو زیادتیاں مجھ پر کی ہیں میں معاف کر دوں گا تاکہ اللہ بھی تجھے معاف کر دے' بلاشبہ میرا پروردگار مجھ پر بہت مہربان ہے۔

لیکن چونکہ وہ مشرک یعنی اللہ کا دشمن تھا۔ جب وہ آخری دم تک شرک سے باز نہ آیا اور آپ پر کھل گیا کہ وہ بدستور اللہ کا دشمن ہی رہا ہے تو ارشاد ہوا ہے۔ **تبرامنہ** آپ اس سے بیزار ہوگئے اور اس کے لئے طلب مغفرت سے رجوع کرلیا۔

ابراہیم کی طلب مغفرت کے قرآنی الفاظ :۔ ابراہیمؑ نے اپنے وعدہ کے مطابق جس کا حوالہ اوپر ۱۹/۴۷ میں گزر چکا ہے اس طلب مغفرت کے الفاظ آپ کی ایک لمبی دعا میں آئے ہیں۔ جو سورہ شعراء میں بانداز ذیل مذکور ہے۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا" وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ○ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ○ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ○ وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ○ ۲۶/۸۳-۸۶

اے میرے پروردگار مجھے اپنی طرف سے حکم عطا فرمایا۔ اور مجھے صالحین کے ساتھ ملحق رکھیو۔ اور آنیوالی نسلوں میں میری زبان کو سچا کریو۔ اور مجھے نعمتوں والی جنت کے وارثوں میں بنائیو۔ اور تو میرے باپ کو معاف کر دے وہ گمراہوں میں سے ہے۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی مذکورہ دعائیں قبول فرمائیں۔ آپ کو بیت اللہ شریف کے مرکزی مقام کا سربراہ بنا کر آپ کو حکم کرنے کا منصب عطا فرمایا۔ آپ کی زبان کو بھی قیامت تک کے لئے قرآن مجید میں سچا قرار دیا۔ **انہ کان صدیقا" نبیا"** ۱۹/۴۱ آپ کو جنت کے وارثوں میں سے بھی ٹھہرایا۔ بلکہ آپ کی ملت کی پیروی کو باعث نجات قرار دیکر قرآنی مومنوں کو اس کی پیروی کا حکم دیا۔ **فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا" وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** ○ ۳/۹۵= (ایمان والو!) ملت ابراہیم کی پیروی کرو' جو ہر دین باطل سے کٹ کر اسلام کی طرف جھکنے والا تھا۔ یقیناً" وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔

لیکن برادران عزیز! اوپر ۲۶/۸۶-۸۳ میں درج ابراہیمؑ کی دعاؤں میں سے باپ کے لئے طلب مغفرت والی دعا قبول نہ ہوئی۔ چنانچہ سورہ الممتحنہ میں آپ کے اسوہ حسنہ کو واجب الاتباع قرار دینے کے ساتھ ہی باپ کے لئے طلب مغفرت والی دعا

کو مستثنیٰ قرار دیدیا گیا ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ ...... اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ ۶۰/۴=
بلاشبہ ابراہیمؑ میں پیروی کرنے کا بہترین نمونہ ہے سوائے ابراہیمؑ کے اس قول کے جو اس نے اپنے باپ کے لئے کہا کہ البتہ میں تیرے لئے طلب مغفرت کرونگا۔ اگلی آیت مجیدہ میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے باپ آذر اور اس کی قوم کو بلاوجہ نہیں' اپنے قانون کے مطابق گمراہ ٹھہرایا تھا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى یُبَیِّنَ لَهُمْ مَّا یَتَّقُوْنَؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۱۱۵
اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کسی قوم کو گمراہ قرار دے پیچھے اس کے جب انہیں ہدایت (اپنی کتاب عطا) فرمائے جب تک کہ ان پر (اپنی کتاب کے ذریعہ) وہ کچھ واضح نہ کر دے جس سے وہ بچیں ...... مگر جب وہ نہیں بچتے تو ان کی اپنی گمراہیوں کی بدولت انہیں گمراہ قرار دیتا ہے' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب خوب جاننے والا ہے۔

دیکھئے اس آیت مجیدہ سے عیاں ہے کہ آذر اور اس کی قوم پر ابراہیمؑ اور ان کی کتاب کے ذریعہ کھل کر واضح کر دیا گیا تھا کہ وہ بت پرستی اور ستارہ پرستی سے پوری طرح بچیں۔ مگر جب وہ الٰہی آیات آچکنے کے باوجود شرک سے نہ بچے تو انہیں گمراہ قرار دیدیا گیا۔

اگلی آیت مجیدہ میں پوری نوع انسانی کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہی ہے جو ہر جاندار کو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔ تمہارے لئے اس کے سوا نہ کوئی دوست ہے نہ مددگار۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِؕ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۱۱۶
بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہی وہ عظیم الشان ذات ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت بادشاہی) اسی کے لئے ہے۔ وہی زندگی اور موت دیتا ہے اور (اے نوع انسانی) تمہارے لئے اس کے سوا نہ کوئی دوست ہے نہ مددگار ہے۔

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس چیز کی وضاحت صحیفہ کائنات کے گوشے گوشے اور ذرے ذرے سے عیاں ہے۔ ہر چہار سو ذات باری کا قانون قدرت کار فرما ہے اور ہر امر اسی کے مقررہ و متعینہ قوانین کے مطابق سرانجام ہوتا چلا جا رہا ہے حتیٰ کہ ملکوں کی حکومتیں بھی اسی کے قوانین جاریہ کے مطابق قائم ہوتی اور ختم ہوتی چلی آرہی ہیں بعض حکومتیں سو سو دو دو سو سال تک قائم رہتی ہیں اور بعض کا تختہ چند ہی برسوں میں الٹ دیا جاتا ہے۔ قانون الٰہی یہ ہے کہ کوئی حکومت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک وہ امن قائم رکھے اور فساد سے مجتنب رہے۔ بالفاظ دیگر جونہی کوئی حکومت فساد پر اتر آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے مستقل قانون کے مطابق اسے کسی اور قوم کے ہاتھوں شکست دلا کر دفع کر دیتا ہے۔ اسی چیز کی خبر سورہ بقرہ میں بالفاظ ذیل دی گئی ہے۔ **وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ** ۲/۲۵۱ اور اگر (اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون فساوی) لوگوں کو' بعض کے ذریعہ بعض کو دفع کرتا نہ ہو تو ضرور زمین فساد سے بھر جائے۔

دیکھئے اس آیت مجیدہ میں مستقل قانون بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فسادی انسانوں اور فسادی حکومتوں کو ان سے بہتر

انسانوں اور بہتر حکومتوں کے ساتھ بدلتا چلا آرہا ہے۔

یحییٰ و یمیت کے الفاظ میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مستقل قانون کی خبر دی ہے۔ جس کے مطابق ہر جاندار پیدا ہوتا ہے اور مرجاتا ہے۔ نیز **یحییٰ و یمیت** کے الفاظ سے قوموں کی زندگی اور موت کے قانون الٰہی کا اعلان بھی مظہر ہے۔ جیسے کہ آیت مجیدہ کے آخری الفاظ میں پوری نوع انسانی کو کہا گیا ہے۔ **وما لکم من دون اللہ من ولی و لا نصیر** کہ اے نوع انسانی اللہ کے سوا تمہارا کوئی نہ دوست ہے نہ مددگار۔ وہی ہے جس نے تم (عوام) پر سے فساد کو دفع کرنے کا مستقل اہتمام کر رکھا ہے۔

زمانہ قبل نبوت میں ظلم و فساد:- اگلی آیات مجیدہ کو زیر بحث لانے سے پہلے مذکورہ بالا سیاق کلام کو اذہان میں محفوظ فرما لیجئے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی نے افرادی اور قومی زندگی اور موت کے قوانین متعین فرما رکھے ہیں اور جب کوئی قوم ظلم و فساد کی حامل ہو جائے تو رب جلیل اسے دفع کرنے کا سامان مہیا فرما دیتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے زمانہ قبل نبوت میں جب سرزمین عرب گہوارہ ظلم و فساد ہوگئی تو ظلم کے دفعیہ کے لئے نبی اکرمؐ کو مبعوث فرمایا گیا۔ مگر جب رحمت عالمؐ نے اہل مکہ کو ان کے خالق و مالک کا پیغام امن پہنچایا تو سوا معدودے چند افراد کے تمام لوگ مخالف ہوگئے۔ آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو قسم قسم کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ بائیکاٹ کیا گیا۔ حتیٰ کہ آخر الامر آپ کے لئے جلا وطنی' عمر قید اور قتل تک کا منصوبہ تیار کرلیا گیا جس کی خبر سورہ انفال کی آیت ذیل میں دی گئی ہے۔ **وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ** ۸/۳۰

اور (اے رسولؐ!) وہ وقت قابل ذکر ہے جب ضابطہ الٰہی کا انکار کرنے والوں نے تجویز کی کہ آپ کو عمر قید کر دیا جائے' یا آپ کو قتل کر دیا جائے اور یا آپ کو ملک بدر کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بھی یہ تجویز کی اور اللہ نے بھی تجویز کی۔ اور اللہ بہتر تجویز کرنے والا ہے (اس نے نبی اکرمؐ سے ہجرت کروا کر کافروں کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ کافروں کا منصوبہ عمر قید' قتل اور ملک کا باغی قرار دیکر جلا وطن کرنے کا تھا مگر نبی اکرمؐ ایک معزز و باوقار حیثیت سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ کے ایسے پرامن مقام پر پہنچ گئے جہاں آپ نے آزاد قرآنی مملکت بھی قائم کرلی۔ اگلی آیت میں ہجرت اور قیام مملکت کو ایک مخصوص رحمت قرار دیا گیا ہے۔ نبی اکرمؐ کے ساتھ آپ کے ساتھی مکی مہاجرین اور انصار مدینہ کو بھی اس میں شامل کرلیا گیا ہے جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں ہجرت و نصرت فرمائی۔ مشرکین مکہ نے نبی اکرمؐ اور آپ کے مکی صحابہؓ پر بے پناہ مظالم توڑ کر انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ نبی اکرمؐ اور آپ کے صحابہؓ مہاجر و انصار پر کی گئی مخصوص رحمت کا ذکر اگلی آیت مجیدہ میں ذیل کے حسین ترین انداز میں کیا گیا ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۱۱۷

البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ رجوع برحمت ہوا اپنے نبیؐ پر اور ان مہاجرین و انصار پر (یعنی انہیں مصائب و آلام سے نکال کر ایک آزاد حکومت کی فراوانیاں عطا فرمائیں' جنہوں نے انتہائی تنگی کے وقت میں نبیؐ کی اتباع کی مہاجروں نے ہجرت کی اور انصار نے ان کی مدد کی) پیچھے اس کے کہ قریب تھا' ان کے ایک (کمزور ذہن والے) فریق کے اذہان پھر جاتے۔ پھر اللہ ان پر بھی رجوع برحمت ہوا۔ بلاشبہ وہ شفقت کرنے والا

مہربان ہے۔

غور فرمائیں کہ یہاں :۔ **تاب اللہ** کے بعد آیا ہے علیٰ جارہ' جس کے معطوف معطوف علیہ کی صورت میں تین مجرور ہیں۔ **النبی والمھجرین والانصار۔** بالفاظ دیگر تاب علیٰ کا جو عمل النبی پر ہے وہی المہجرین پر ہے اور وہی الانصار پر ہے۔ ہم نے اوپر آیت مجیدہ کے متن کے سامنے **تاب اللہ علی** کا معنی لکھا ہے۔ "اللہ تعالیٰ رجوع برحمت ہوا۔" اور اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "انہیں مصائب و آلام سے نکال کر ایک آزاد حکومت کی فراوانیاں عطا فرمائیں"۔ کیونکہ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کی ہجرت و نصرت' آزاد حکومت کے قیام ہی پر منتج ہوئی تھی۔

تاب یتوب :۔ واضح رہے کہ تاب ماضی اور یتوب مضارع کا سہ حرفی مادہ ت۔ و۔ ب= توب ہے' اس کا مصدری معنی ہے رجوع کرنا' لوٹ آنا جب تاب کا فاعل انسان ہو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے کسی غلط کام کرنے سے لوٹ آنا' باز آجانا لیکن جب اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے رجوع برحمت ہونا۔ قرآن مجید میں اس کے ان ہر دو استعمالات کے الگ الگ انداز مقرر ہیں۔

تاب الیٰ :۔ جب تاب یتوب کا فاعل انسان ہو تو یہ افعال یا تو بلا حرف جار آتے ہیں اور یا ان پر حرف جار الیٰ داخل ہوتا ہے۔ اول الذکر بلا ورود حرف جار کی قرآنی مثالیں بے شمار ہیں۔ مثلاً" **من عمل منکم سوء بجھالۃ ثم تاب من بعدہ و اصلح** ۶/۵۴۔ تم میں سے جو کوئی نادانی کے ساتھ برا عمل کرے پھر توبہ کرے۔ لوٹ آئے اس کے بعد اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

اسی طرح تاب پر الیٰ حرف جارہ کے ورود کی قرآنی مثالیں بھی بہت ہیں۔ مثلاً" **فتوبوا الیٰ بارئکم** ۲/۵۴۔ پس تم لوٹ آؤ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف .... وہ اللہ رجوع برحمت ہونے والا مہربان ہے۔

تاب علیٰ :۔ یہاں تک تو اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ جب تاب یتوب کا فاعل انسان ہو تو یہ فعل یا تو بلا ورود حرف جار آتا ہے اور یا اس پر حرف جار الیٰ داخل ہوتا ہے۔ لیکن ذیل میں بانداز خصوص وضاحت کی جاتی ہے کہ جب تاب یتوب کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو تو اس پر لازماً" حرف جار علیٰ داخل ہوتا ہے اور وہاں کسی سہو' خطا' گناہ یا کسی غلط اقدام سے رجعت مراد نہیں ہوتی' بلکہ اس کا مفہوم صرف رجوع برحمت ہوتا ہے۔ کیونکہ سہو' خطا' گناہ اور غلط اقدام سے باری تعالیٰ صد فیصد پاک و منزہ ہے۔ حرف جار علیٰ کے ورود کی ایک مثال تو آپ آیت بالا زیر بحث میں **لقد تاب اللہ علی النبی** .... ۹/۱۱۷ میں دیکھ چکے ہیں۔ مزید بھی متعدد مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ **فتاب علیہ** ۲/۳۷= پھر اللہ اس پر رجوع برحمت ہوا۔ (جب اس نے غلط اقدام سے رجوع کرلیا تو اس سے درگزر فرمایا۔)

☆ **اتوب علیھم** ۲/۱۶۰= (جب وہ توبہ اور اصلاح کرلیں گے تو) میں اللہ ان پر رجوع برحمت ہونگا۔

☆ **یتوب اللہ علیھم** ۴/۱۷= (جب وہ برائی پر عملاً" رجوع کرلیں گے تو) اللہ تعالیٰ ان پر رجوع برحمت ہوگا۔

المختصر:۔ آگے بڑھنے سے پہلے مذکورہ صدر قرآنی اصول کو ذہن نشین فرما لیں کہ آیت مجیدہ زیر بحث ۹/۱۱۷ میں **علی** جارہ

کے ساتھ **لقد تاب اللہ علی النبی والمھجرین والانصار** آیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ "بلاشبہ اللہ تعالیٰ رجوع برحمت ہوا اپنے نبی پر اور مہاجرین اور انصار پر۔ پیچھے بتایا جاچکا ہے کہ اس آیت میں **النبی والمھجرین والانصار** میں نبی مہاجرین اور انصار باہم مگر معطوف معطوف علیہ ہیں۔ اور **تاب علی** کا عمل جس انداز سے النبی پر ہے' اسی انداز سے وہی عمل المہاجرین اور الانصار پر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں جو **تاب اللہ علی النبی** آیا ہے اس سے پہلے نبی اکرم کی کوئی سہو' خطا یا گناہ مذکور نہیں ہے جس کی معافی کا اعلان کیا گیا ہو۔ بلکہ سیاق کلام **ان اللہ لہ ملک السموت والارض** کے مطابق اللہ تعالیٰ کا نبی اکرمؐ اور مہاجرین و انصار پر رجوع برحمت ہونا' عطاء ملک' عطاء حکومت ہے جو مہاجرین و انصارؓ ہی کے تعاون سے مدینہ منورہ میں قائم ہوئی۔

اگلی آیت مجیدہ ۹/۱۱۸ میں تین صحابہ رسول کا تذکرہ ہے۔ جن کا تعلق گذشتہ آیت ذیل ۹/۱۰۶ کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۝ اور دوسرے وہ ہیں جو اللہ کے فیصلے کے امیدوار ہیں یا وہ انہیں عذاب کرے یا ان پر رجوع برحمت ہو کر معاف کر دے۔ چنانچہ آیت مجیدہ ۹/۱۱۸ کا ایک مفہوم یہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ تین صحابیؓ تھے' جن کا معاملہ نبی اکرمؐ نے ملتوی کر رکھا تھا' ان پر اس التوا کی بدولت زمین بھی اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان کے لئے دوبھر ہوگئیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کب نازل ہو۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ۱۱۸

اور ان تینوں پر بھی (اللہ تعالیٰ رجوع برحمت ہوا) جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ (اس التواء کی بدولت) ان پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان کیلئے ان کی جانیں بھی دوبھر ہوگئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یقین تھا کہ ان کا ٹھکانہ اللہ کی طرف سے اسی کی طرف ہے۔ پھر وہ (اللہ) ان پر رجوع برحمت ہوا تاکہ وہ سابقہ خطاؤں سے باز رہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ وہی ہے۔ جو رجوع برحمت ہونے والا مہربان ہے۔

نمبر۱ **خُلِّفُوْا** کا سہ حرفی مادہ خ۔ ل۔ ف= خلف بمعنی پیچھے رہنا ہے۔ اور لفظ **خلفوا** جو فعل ماضی مجہول ہے' اس کا لفظی معنی ذاتی لحاظ سے پیچھے چھوڑے گئے بھی صحیح ہے اور ان کے معاملہ کے فیصلہ کے لحاظ سے پیچھے چھوڑے گئے بھی ٹھیک ہے۔ اسی لئے اس کا معنی لکھا گیا ہے۔ "جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔"

نمبر۲ **ضاقت علیھم الارض** کے الفاظ سے ان کی ایمانی حالت کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ معافی کے طلبگار تھے۔ مگر چونکہ ان کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔ اس لئے نہ جائے ماندن اور نہ پائے رفتن کے مصداق ان کے لئے زمین تنگ ہوگئی۔

نمبر۳ **و ضاقت علیھم انفسھم** کے الفاظ سے ان کی انتہائی ذہنی بیقراری کا اظہار ہوتا ہے۔

نمبر۴ **ظنوا** کا سہ حرفی مادہ ظ۔ ن۔ ن= ظن ہے اس مادہ کا معنی وہم و گمان بھی ہے اور یقین بھی۔

نمبر۵ **ثم تاب اللہ علیھم** کے بعد **لیتوبوا** پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب **تاب اللہ علیھم** کے

الفاظ سے عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رجوع برحمت ہوچکا' یعنی اس نے انہیں ان کے قصور معاف کر دیئے تو پھر **لیتوبوا** کے کیا معنی ؟ کہ اللہ نے انہیں اس لئے معاف فرمایا کہ وہ توبہ کرلیں۔ واضح رہے کہ یہاں **لیتوبوا** کا معنی توبہ کرنا نہیں لگتا۔ بلکہ اس کے بنیادی معنوں کے مطابق سابقہ خطاؤں سے باز رہنا فٹ آتا ہے۔

نمبر۶ **ان اللّٰہ ھو التواب الرحیم** کے جملہ سے عیاں ہوتا ہے کہ ان تین صحابہؓ کی خطائیں سنگین تھیں۔ اور اگرچہ انہوں نے خود توبہ کرلی۔ مگر نبی اکرمؐ نے ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا نہ سزا کا اور نہ معافی کا اس لئے ان پر انتہائی بیقراری طاری ہوگئی جو ان کے بصمیم قلب تائب رہنے اور آئندہ کے لئے اعمال صالحہ بجا لانے کی دلیل تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا۔ کیونکہ وہ تائب ہونے اور عمل صالحہ بجا لانے کا مصمم ارادہ کرنے والوں کو معاف کرنے والا مہربان ہے۔

آیت بالا ۹/۱۱۸ کا ایک اور مفہوم :۔ چونکہ آیت بالا ۹/۱۱۸ میں آمدہ لفظ **خلفوا** کا ایک معنی یہ بھی صحیح ہے۔ "جو تین صحابیؓ پیچھے چھوڑے گئے تھے۔" اس لئے ہمیں اس آیت ذیل کا ایک اور مفہوم موصول ہوا ہے۔ جو افادۂ عام کے لئے ساتھ ہی نقل کیا جا رہا ہے۔ اس سے نبی اکرمؐ کے چار جاں نثار صحابہؓ کا ثبوت مہیا ہوتا ہے۔

○ سب سے پہلے اس آیت کی ماقبل آیت نمبر۱۱۷ کے اس آخری نشان لا پر غور فرمائیں کہ وہ لا کا رمز ہے اور اگلی آیت نمبر۱۱۸ کے شروع میں واؤ مشددہ ہے۔ جس سے عیاں ہے کہ آیت نمبر ۱۱۸ میں سلسلہ کلام بھی منقطع نہیں ہوا۔ اور قرات بھی بانداز ذیل جاری ہے۔ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ نیز اگلی آیت زیر بحث نمبر۱۱۸ چونکہ واؤ عاطفہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت نمبر۱۱۸ معطوفہ کا عطف آیت نمبر۱۱۷ پر ہے' یعنی ماسبق مضمون اور قرات مسلسل جاری ہے۔ متن اور ترجمہ دونوں بغور ملاحظہ فرمائیں۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۔ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۔ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۔۔

اور (اللہ تعالیٰ) ان تینوں پر (بھی رجوع برحمت ہوا' انہیں بھی مصائب سے نکال کر آزاد حکومت کی فراوانیاں عطا فرمائیں' جو (ہجرت کے وقت مکہ معظمہ میں) پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ یہاں تک کہ جب (ان کے دشمنوں مشرکین مکہ نے ان پر مکہ میں سختیاں کیں تو) ان کے لئے اللہ کی زمین وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان کے لئے ان کی اپنی جانیں بھی تنگ ہوگئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یقین یہی تھا کہ "ان کی اللہ کی طرف سے مقررہ پناہ اسی کی طرف ہے (یعنی ہجرت کرکے پناہ گاہ میں پہنچنا ہے) پھر وہ ان پر رجوع برحمت ہوا تاکہ وہ بھی لوٹ آئیں (ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچ جائیں) اللہ رجوع برحمت ہونے والا مہربان ہے۔

واضح رہے کہ :۔ ○ یہ آیت مجید۔ انتہائی اہم ہے۔ اس لئے اس کے اس مفہوم سے متعلقہ ضمنی آٹھ اہم اور طویل نوٹ یکے بعد دیگر انتہائی غور کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔

نمبر۱ : اوپر بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ آیت مجیدہ واؤ عاطفہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے واضح کیا جاتا ہے کہ اس کی تقدیر کلام اس کی معطوفہ علیہا آیت کے مطابق یہ ہے۔ **و تاب اللّٰہ علی الثلثۃ الذین خلفوا** اسی لئے ترجمہ لکھا گیا ہے۔" اور (اللہ تعالیٰ) ان تینوں پر (بھی رجوع برحمت ہوا) جو پیچھے چھوڑے گئے تھے۔" (وہ خود پیچھے نہیں رہے تھے)

نمبر ۲: **الذین خلفوا** کے الفاظ میں **خلفوا** فعل ماضی مجہول **مالم یسمی فاعلہ** ہے اس کا فاعل **الذین** نہیں ہے۔ سابقہ تراجم و مفاہیم میں **خلفوا** کو فعل معروف قرار دیا۔ اور **الذین** کو اس کا فاعل ٹھہرا کر مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ یہ نبی اکرمؐ کے تین صحابیؓ تھے جو جنگ تبوک سے خود پیچھے رہ گئے تھے۔ خود سستی کر کے مجاہدوں میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان کے نام بتائے گئے ہیں۔ کعبؓ بن مالک، مرارہ بن الربیع اور ہلال بن امیہ۔ روایتی تفاسیر میں آیت زیر بحث ۱۱۸ کا شان نزول یہ لکھا ہے کہ مذکورہ تینوں صحابیؓ خود سستی کر کے فوج سے پیچھے رہ گئے تھے۔ جب نبی اکرمؐ واپس تشریف لائے تو ان تینوں نے سچ سچ بتا دیا۔ مگر رسولؐ مقبول نے باقی صحابہؓ کو حکم دیا کہ ان تینوں کے ساتھ ہر طرح سے قطع تعلق کریں حتیٰ کہ نہ انہیں سلام کہیں اور نہ ان کے سلام کا جواب دیں۔ ان پر یہ حالت پچاس دن تک برابر طاری رہی اس طرح ان پر زمین تنگ ہو گئی اور خود ان کی جانیں بھی ان کے لئے تنگ ہو گئیں بالآخر پچاس دن کے بعد آیت زیر بحث ۹/۱۱۸ نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کیا تو پھر ان کا فیصلہ کیا گیا اور انہیں باقی صحابہؓ کے ساتھ سلام کلام کی اجازت دی گئی۔

لیکن واضح رہے کہ **الذین خلفوا** فعل مجہول ہے، جس سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ وہ خود پیچھے رہے تھے، عربی قواعد کو کند چھری کے ساتھ ذبح کرنے کے مصداق ہے۔ مولوی مقبول احمد شیعہ مرحوم اور شاہ رفیع الدین مرحوم نے **الذین خلفوا** کا ٹھیک معنی لکھا ہے "جو پیچھے چھوڑے گئے تھے۔" مگر عام مترجمین نے اس آیت مجیدہ پر چسپاں کئے گئے شان نزول کو صحیح رکھنے کے لئے **الـــذین خلفوا** کا معنی لکھا ہے "جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا۔" لیکن اگر **خلفوا** کے اس مفہوم کو صحیح مانا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تین صحابیوںؓ کے سستی کے ساتھ جنگ سے خود پیچھے رہ جانے کا مفہوم اخذ کرنے کے لئے آیت مجیدہ میں کونسے الفاظ ہیں؟ کوئی نہیں۔ اور ان سے متعلقہ کیا معاملہ تھا جو ملتوی رکھا گیا تھا؟ اس کا جواب بھی کوئی نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ یہ سارا قصہ ایجاد محض ہے۔

تو اس طرح دونوں صورتیں تفسیر القرآن بالقرآن کے خلاف ہیں۔ یعنی **الذین خلفوا** کے الفاظ سے مذکورہ تین صحابہؓ کے خود پیچھے رہ جانے کا مفہوم اخذ کرنا بھی غلط ہے کیونکہ **خلفوا** فعل مجہول ہے۔ اور ان الفاظ سے تین صحابہؓ کے معاملے کو ملتوی کرنے کا مفہوم لینے کے بعد ان کے ذمہ یہ الزام لگانا کہ وہ جنگ میں شامل ہونے سے پیچھے رہ گئے تھے یہ بھی غلط ہے کیونکہ اس کے لئے نہ آیت مجیدہ میں کوئی الفاظ موجود ہیں اور نہ قرآن بھر میں کہیں بھی تصریف آیات کے قرآنی اصول کے مطابق جماعت صحابہؓ میں سے تین کے جنگ سے پیچھے رہنے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس عنوان کا آخری سوال یہ ہے کہ آخر یہ تین صحابی کون تھے جن کا انتہائی مخصوص انداز سے **و علی الثلثۃ الذین خلفوا** کے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا جواب ہمارے محررہ ترجمہ سے عیاں ہے کہ وہ کسی جنگ سے پیچھے رہ نہیں گئے تھے۔ بلکہ وہ ہجرت کے وقت ضروری امور کی انجام دہی کے لئے مکہ معظمہ میں پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ مزید وضاحت تصریف آیات کے قرآنی اصول کے مطابق ذیل کے اگلے عنوان میں ملاحظہ فرمائیں۔

یہ تین صحابیؓ کون تھے؟:۔ **حتی اذا ضاقت علیھم الارض و ضاقت علیھم انفسھم** کا مفہوم روایتی تفاسیر نے یہ لیا ہے کہ کعبؓ، مرارہؓ اور ہلالؓ جو جنگ تبوک سے بوجہ سستی خود پیچھے رہ گئے تھے، جب ان کا مقاطعہ کیا گیا تو ان پر زمین تنگ ہو گئی اور خود ان کی جانیں بھی ان کے لئے دوبھر ہو گئیں، لیکن جیسے کہ اوپر وضاحت کی جا چکی ہے کہ نہ خود آیت

زیر نظر میں اس تصور کے لئے الفاظ موجود ہیں اور نہ ہی قرآن بھر میں تصریف آیات کے ذریعہ کسی تین صحابہؓ کے جنگ سے پیچھے رہنے اور ان کے مقاطعہ کی خبر ملتی ہے' اس لئے یہ روایتی تصور نہ صرف ناقابل قبول ہے۔ بلکہ مذکورہ بالا تین صحابہؓ پر محض الزام کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقت حال وہی ہے جو **الذین خلفوا** فعل ماضی مجہول **مالم یُسَمّٰی فاعلہ** سے عیاں ہے کہ یہ وہ تین اولوالعزم صحابی تھے جو خود پیچھے نہیں رہے تھے بلکہ وہ پیچھے چھوڑے گئے تھے کس نے انہیں پیچھے چھوڑا تھا؟ یعنی **خلفوا** فعل مجہول مالم یُسَمّٰی فاعلہ کا فاعل کون تھا؟

نبی اکرمؐ کے جاں نثار چاریارؓ:۔ تصریف آیات کی رو سے سیاق کلام کے مطابق ان تین پیچھے چھوڑے گئے صحابہؓ کے واقعہ کا تعلق پیچھے آیت مجیدہ ۹/۴۰ کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ جس میں واقعہ ہجرت نبوی کے ضمن میں بتایا گیا ہے۔ کہ نبی اکرمؐ نے جب مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اپنے چار جاں نثاروں میں سے صرف ایک صحابیؓ کو اپنے ساتھ لیا۔ اور تین کو خود پیچھے چھوڑ گئے۔ صرف ایک کو ساتھ لے کر ہجرت فرمانے کی خبر ۹/۴۰ میں بالفاظ ذیل درج ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۹/۴۰

اگر (بفرض محال) تم اس کی (ہمارے رسول کی) مدد نہ بھی کرو تو (پھر بھی کوئی بات نہیں) پس بلاشبہ اللہ نے اس کی اس (نازک) وقت پر مدد فرمائی تھی جب اسے کافروں نے (مکہ) سے نکال دیا (اس وقت اس کے ساتھ صرف ایک ساتھی تھا) وہ (ہمارا رسولؐ) صرف دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ غار یعنی دشمنوں کے انبوہ میں تھے۔ جب (اس کا ساتھی غمگین ہوا تو) اس نے اپنے ساتھی سے کہا غم نہ کر' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ غار کا معنی پہاڑ کی کھوہ بھی ہے اور انبوہ مرد ماں بھی ہے۔ دیکھئے منتہی الارب مادہ غور۔ اس آیت ۹/۴۰ میں غار کا معنی پہاڑ کی کھوہ نہیں لگ سکتا' انبوہ مرد ماں ہی لگ سکتا ہے۔ کیونکہ اسی آیت کے اگلے الفاظ میں ارشاد ہوا ہے۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۹/۴۰

(جب وہ دونوں دشمنوں کے انبوہ میں تھے) تو اللہ نے اس (اپنے نبیؐ پر تسکین نازل فرمائی اور اسے ایسے لشکروں کے ساتھ مدد دی جو تم نے نہیں دیکھے اور کافروں کی تجویز کو ناکام و نامراد کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجویز ہی بلند و بالا (کامیاب) ہونے والی ہے۔ پس لشکروں کی ضرورت میدان میں ہوتی ہے غار میں نہیں۔

○ تصریف آیات کی اس آیت مجیدہ ۹/۴۰ میں نبی اکرمؐ کے واقعہ ہجرت کا ذکر جمیل ہے کہ آپ نے اپنے چار جاں نثار صحابہؓ میں سے صرف ایک کو ساتھ لے کر ہجرت فرمائی تھی اور ۹/۱۱۸ میں باقی تین کا تذکرہ ہے جنہیں خود نبی اکرمؐ نے ضروری امور کی انجام دہی کے لیے خود پیچھے چھوڑا تھا' وہ اپنے آپ پیچھے نہیں رہے تھے۔ جس جاں نثار صحابیؓ کو آپؐ نے ساتھ لیا' تاریخ اسلام نے اس کا نام ابوبکرؓ بتایا ہے اور باقی تین کے نام بتائے ہیں۔ عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ۔ اب چونکہ قرآن مجید سے ان اسماء گرامی کی مخالفت ثابت نہیں ہوتی' اس لیے یہ نام صحیح ہیں۔

تین صحابہؓ کو پیچھے چھوڑنے کی غرض:۔ اب اس سلسلے کا لازمی سوال یہ ہے کہ مذکورہ تین صحابہؓ کو خصوصی طور پر پیچھے چھوڑنے کی غرض کیا تھا؟ اس کا جواب تاریخ ہی کی ان خبروں میں موجود ہے' جن کی قرآن مجید سے مخالفت ثابت نہیں ہوتی بلکہ قرآن مجید سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جب نبی اکرمؐ نے ہجرت فرمائی اس وقت مشرکین مکہ کی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ آپ کے لیے قتل و قید وغیرہ کا منصوبہ تیار کرلیا گیا تھا۔ ۸/۳۰ اس لیے آپ کا ہجرت فرمانا لازم ہوچکا تھا۔ چنانچہ جب آپ ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ہجرت فرما گئے۔ یعنی جب دشمنوں کا شکار ان کے پھیلائے ہوئے دام سے نکل گیا تو ان کا آگ بگولا ہو جانا لازمی امر تھا۔ جس کی زد مکی مسلمانوں پر پڑنی ناگزیر تھی۔ اس لیے نبی اکرمؐ نے مکہ میں مقیم مسلمانوں کی حفاظت' ان کی مالی ضروریات اور دشمنوں کی امانتیں واپس لوٹانے کے لیے مذکورہ اصحابؓ ثلاثہ کو خود پیچھے چھوڑا تھا۔ تاکہ پہلے نمبر پر جب غریب کمزور مسلمانوں پر کافر سختی کریں تو عمرؓ آڑے آجائیں' کیونکہ آپ نہ صرف شہ زور اور جنگجو تھے' بلکہ آپ کے رعب و دبدبہ سے کفار خوف کھاتے تھے۔ چنانچہ عمرؓ کو پیچھے چھوڑنے کی غرض غریب اور کمزور مسلمانوں کو نہ صرف کفار مکہ کے مظالم سے محفوظ کرنا تھی' بلکہ انہیں ہجرت کے مواقع مہیا کرنے میں مدد کرنا بھی مقصود تھا۔

○ دوسرے نمبر پر جب نبی اکرمؐ کے ہجرت کر جانے پر کفار مغلوب الغضب ہوکر غریب مسلمانوں کے لیے اقتصادی مسائل کھڑے کر دیں تو عثمانؓ جو تاریخ میں غنی کے لقب سے مشہور ہیں' وہ نہ صرف ان کی مالی امداد کرکے انہیں مالی بحران سے نکالنے کے فرائض انجام دیں بلکہ مکی مہاجروں کی ہجرت کے وقت ان کے لیے زادراہ وغیرہ کا اہتمام بھی فرماتے رہیں اور

○ تیسرے نمبر پر نبی اکرمؐ کے پاس جو کفار مکہ کی ظاہر اور خفیہ امانتیں پڑی ہوئی تھیں ان کی واپسی کے لیے علیؓ کو پیچھے چھوڑا گیا۔ تاکہ وہ ہر ظاہر امانت کو ظاہر طور پر اس کے مالک کو واپس کر دیں اور خفیہ امانت کو خفیہ انداز کے ساتھ اس کے مالک تک پہنچانے کے فرائض ادا کریں۔ چنانچہ ان تینوں جاں نثاروں کو جن جن امور کی ادائیگی کے لیے پیچھے چھوڑا گیا۔ انہوں نے اپنے اپنے فرائض منصبی کو انتہائی جاں نثاری کے ساتھ ادا کیا۔ اگرچہ نبی اکرمؐ کے ہجرت کر جانے پر مغلوب الغضب کفار مکہ کی طرف سے ان تینوں صحابیوںؓ کی بے پناہ مخالفت کی گئی کیونکہ ہر مقام پر یہی تینؓ تھے جو غریب مسلمانوں پر مظالم توڑنے کی راہ میں آڑے بھی آتے رہے' ان کی مالی مدد بھی کرتے رہے اور ان کے لیے ہجرت کے مواقع اور زادراہ بھی مہیا کرتے رہے۔

○ چونکہ نبی اکرمؐ کی ہجرت کے بعد کافروں کے پُر غضب انتقام کی راہ میں یہی تین افراد سد راہ بنے' اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کفار نے ان کے خلاف عظیم محاذ بنا لیا اور ان کی اس حد تک ناکہ بندی کی کہ خود ان کے لیے ہجرت کرنا دشوار ہوگیا' اسی چیز کی خبر آیت زیر بحث میں بالفاظ ذیل دی گئی ہے۔

○ **حتی اذا ضاقت علیهم الارض بما رحبت** یہاں تک کہ ان کے لیے زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی۔ **وضاقت علیهم انفسهم** اور ان کی اپنی جانیں ان کے لیے تنگ ہوگئیں یعنی رسول اکرمؐ کے مذکورہ تینوں جاں نثار آپ کے بعد مکہ میں بے پناہ ذہنی گھٹن کا شکار ہوگئے۔

○ **و ظنوا** میں آمدہ واؤ اظہار حقیقت کیلئے آئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں یقین کامل تھا کہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں یقیناً کامیابی نصیب ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ پناہ گاہ مدینہ منورہ میں نبی اکرمؐ کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔

○ **ظنوا** کاسہ حرفی مادہ ظ ۔ ن۔ ظن ہے یہ لفظ قرآن مجید میں محض خیال و گمان کے لیے بھی مستعمل ہے اور یقین کے لیے بھی وہم و گمان کے لیے سورہ نجم میں آیا ہے۔ **و ان الظن لایغنی من الحق شیاء**" ۲۸/۵۳= اور بلاشبہ وہم و گمان حق کے مقابلے پر کچھ کام نہیں آتا اور یقین کے لیے سورہ بقرہ میں خاشعین مومنین کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ **الخشعین○ الذین یظنون انہم ملقوا ربہم و انہم الیہ راجعون○** ۴۵-۴۶/۲ خاشعین مومنین وہ لوگ ہیں جن کا پختہ یقین ہے کہ بلاشبہ وہ (اعمال کی جوابدہی کے لیے) اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور بلاشبہ وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے (اسی کی عدالت میں حاضر ہونے والے) ہیں۔ پس آیت مجیدہ زیر نظر میں **ظنوا** کا معنی خیال و گمان نہیں، بلکہ یقین ہے کہ مذکورہ اصحابؓ ثلاثہ کو کامل یقین تھا کہ وہ ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

○ **اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ** کے الفاظ میں **من اللہ** جار مجرور کا معنی ہے اللہ کی طرف سے مقررہ و متعینہ اور ملجا کا معنی ہے ٹھکانہ، پناہ گاہ اور **الا الیہ** کے الفاظ میں **الا** استثنائیہ کے ساتھ بتایا گیا ہے صرف اس (اللہ) کی طرف، یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی متعینہ پناہ گاہ مدینہ منورہ ہی پہنچنا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان پر رجوع برحمت ہوا۔ ان کے لیے ہجرت کے مواقع بہم پہنچائے تاکہ وہ اپنے ملجا پناہ گاہ مدینہ منورہ پہنچ جائیں۔

○ **ثم تاب علیہم** میں تاب کا فاعل چونکہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کا معنی ہے وہ ان پر رجوع برحمت ہوا۔ اور اس کی غرض بتائی گئی ہے۔ **لیتوبوا** جس میں لام مکسورہ علت کے لیے آئی ہے بمعنی تاکہ اور **یتوبوا** کے فاعل ہیں مذکورہ اصحاب ثلاثہ اس لئے اس کا معنی ہے تاکہ رجوع کریں۔ پیچھے وضاحت کی جاچکی ہے کہ مذکورہ اصحابؓ ثلاثہ نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جس کی وہ معافی چاہتے۔ چونکہ **و علی الثلثۃ الذین خلفوا** کا معطوف علیہ ہے **لقد تاب اللہ علی النبی والمھجرین والانصار الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ** ۱۱۷/۹ بلاشبہ اللہ تعالیٰ رجوع برحمت ہوا نبیؐ پر اور ان مہاجرین و انصار پر جنہوں نے نہایت تنگی کے وقت نبی کی اتباع کی تھی۔ جس طرح **تاب اللہ** سے مراد نبی اور مہاجرین و انصار کا کوئی جرم ثابت نہیں بلکہ ان کی دینی استقامت کے عوض اللہ تعالیٰ کا رجوع برحمت ہونا مراد ہے۔ اسی طرح جملہ معطوفہ میں مذکور اصحابؓ ثلاثہ بھی اسی زمرہ میں شامل ہیں۔ جس میں خود نبی اکرمؐ اور مہاجرین و انصار شامل ہیں۔ اس لیے **ثم تاب علیہم لیتوبوا** کے الفاظ سے بھی چونکہ اصحاب ثلاثہ کے کسی جرم و گناہ کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں **لیتوبوا** کا معنی گناہ سے توبہ کرنا نہیں بلکہ توبہ کے لفظی معنوں رجعت کے مطابق اور سیاق کلام کی رو سے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ پناہ گاہ مدینہ کی طرف رجعت ہجرت کرنا ہے۔

<u>**لیتوبوا** کے متعلق دو اعتراضات</u>۔ ○ مذکورہ بالا مفہوم پر سیاق کلام اور تصریف آیات کی رو سے کوئی اعتراض مطلقاً وارد نہیں ہوتا البتہ معترض ذیل کے اعتراض کرسکتا ہے۔

○ پہلا یہ کہ **لیتوبوا** کے مادہ تاب **یتوب** کا معنی جب لغت کی رو سے ذہنی رجعت ہے تو اس سے رجعت مکانی کا معنی

کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب خود آیت مجیدہ کے الفاظ **ظنوا ان لا ملجا من اللہ الا الیہ** کے لفظ ملجا میں موجود ہے جو مفعل کے وزن پر ظرف مکان ہے بمعنی پناہ گاہ' جو **یتوبوا** میں رجعت مکانی کی تخصیص کرتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید اہل لغت کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ وہ یہ کہ اس مادہ تاب یتوب میں رجعت مکانی کا مفہوم بھی موجود ہے۔

○ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ رجعت کے مطابق' اصحابؓ ثلاثہ کا مدینہ منور کی طرف واپس لوٹنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔ کیا وہ مدینہ سے آئے تھے جو وہاں لوٹ جانا صحیح مانا جاسکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ **یتوبوا** کی لفظی حاکیت سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے یہ تین جاں نثار صحابہؓ دارالہجرت مدینہ منورہ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اس سے پہلے بھی مدینہ منورہ بھیجے جاچکے تھے۔ جہاں انہیں لوٹ کر جانا تھا۔

حاصل کلام :۔ ○ اوپر سیاق کلام۔اور تصریف آیات کے مستقل قرآنی اسلوب بیان کے مطابق ثابت کیا جاچکا ہے کہ آیت بالا ۹/۱۱۸ سے کسی تین صحابہؓ رسولؐ کا جنگ سے پیچھے رہنا مقصود نہیں۔ بلکہ یہ چار یار یعنی نبی اکرمؐ کے چار جاں نثاروں میں سے وہ تھے کہ رسول پاک نے ہجرت کے وقت چار میں سے ایک جاں نثار کو اپنے ساتھ لیا اور تین کو نہایت اہم امور کی انجام دہی کے لیے مکہ معظمہ میں خود پیچھے چھوڑ گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا اپنا فرض منصبی نہایت جاں نثاری کے ساتھ ادا کیا۔ نبی اکرمؐ کی ہجرت کے بعد یہ تینوں کفار مکہ کی سختیوں کا مخصوص نشانہ بنے۔ حتیٰ کہ خود ان کی ہجرت اس قدر دشوار ہوگئی کہ ان کے لیے نہ صرف یہ کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی بلکہ ان کے اپنے نفس بھی تنگی اور گھٹن کا شکار ہوکر رہ گئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ' نبی اکرمؐ اور باقی مہاجرین مکہ کی طرح ان پر بھی رجوع برحمت ہوا تاکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ملجا' پناہ گاہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرکے لوٹ سکیں۔ چنانچہ انہیں بھی ہجرت کے مواقع میسر آئے اور وہ اپنے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد' جن کی انجام دہی کے لیے وہ پیچھے چھوڑے گئے تھے ہجرت کرکے نبی اکرمؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوگئے۔

ایک ضروری وضاحت :۔ ○ روایتی تراجم نے **خلفوا** فعل مجہول کا معنی جنگ سے پیچھے رہنا لیا ہے جو قواعد عرب ہی کی رو سے صد فیصد غلط ہے۔ اسی سورت مجیدہ میں جنگ سے پیچھے رہنے والے منافقوں کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ پیچھے بیٹھ رہنے کے لیے **قعد الذین کذبوا** ۹/۹۰ آیا ہے اور جنگ سے پیچھے بیٹھ رہنے والوں کو قاعدین کہا گیا۔ **ذرنا نکن مع القعدین** ۹/۸۶ یہ خالص منافقوں کے لیے ہے کیونکہ قعد مصدر میں ارادہ پایا جاتا ہے جیسے کہ موسیٰؑ کو قوم نے کہا **فاذهب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قعدون** ۵/۲۴ تو اور تیرا بھائی جاؤ لڑو ہم یہاں بیٹھنے والے ہیں۔ نیز پیچھے رہنے والے کے لیے خوالف بھی آیا ہے یعنی پیچھے رہنے والے معذور لوگ۔

رضوا بان یکونوا مع الخوالف ۹/۸۷ اس طرح اس میں ارادہ نہیں پایا جاتا۔ اسی مادہ خلف کو جب باب تفعیل میں لاکر لام کی تشدید سے خَلَّفَ لایا جائے تو متعدی بن جاتا ہے اور یا فعل لازم میں مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے۔ لیکن اس پر عَنْ جارہ کا ورود لازم ہے جیسے ۹/۱۲۰ میں آیا ہے۔ **ما کان لاهل المدینته و من حولهم من الاعراب ان**

یتخلفوا عن رسول اللّٰہ مدینہ والوں اور ان کے اردگرد کے اعرابیوں کے لئے یہ لائق نہیں کہ وہ جنگ میں اللہ کے رسول سے پیچھے رہیں۔

الختصر! آیت مجیدہ ۹/۱۱۸ میں رسول اکرمؐ کے چار جاں نثاروں میں سے تین کا ذکر ہے۔ جنہیں نبی اکرمؐ ہجرت کے وقت ضروری امور کی انجام دہی کے لیے خود مکہ معظمہ میں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

○ اس آیت مجیدہ میں تین صحابہؓ رسولؐ کے لیے **و علی الثلثۃ الذین خلفوا** آیا ہے۔ **خلفوا** کا یہ معنی ازروئے لغت صحیح ہے جو اوپر لکھا گیا ہے کہ جن تین صحابہؓ کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا' اللہ تعالیٰ ان پر رجوع برحمت ہوا' یعنی انہیں معاف کر دیا۔ مگر لفظ **خلفوا** کا یہ معنی بھی صحیح ہے کہ جو پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ لہذا **وعلی الثلثۃ الذین خلفوا** کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تین صحابہؓ پر رجوع برحمت ہوا' جو پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ اس لئے آیت نمبر ۱۱۸ کا یہ مفہوم بھی افادۂ عام کے لیے درج کر دیا گیا تھا۔ "اور اللہ تعالیٰ ان تین صحابہؓ پر بھی رجوع برحمت ہوا (یعنی انہیں بھی مصائب و آلام سے نکال کر آزاد قرآنی حکومت کی فراوانیاں عطا فرمائیں) جو (ہجرت کے وقت مکہ معظمہ میں) پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ یہاں تک کہ جب (دشمنان اسلام' مشرکین مکہ نے ان پر مکہ میں سختیاں کیں تو ان کے لئے اللہ کی زمین وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان کے لیے ان کی اپنی جانیں بھی تنگ ہوگئیں' حقیقت یہ ہے کہ ان کا یقین یہی تھا کہ ان کی اللہ کی طرف سے مقررہ پناہ اسی کی طرف ہے (یعنی ہجرت کرکے پناہ گاہ میں پہنچنا ہے) پھر وہ ان پر رجوع برحمت ہوا تاکہ وہ بھی لوٹ آئیں (ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچ جائیں)۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ رجوع برحمت ہونے والا مہربان ہے۔ آیت مجیدہ ۹/۱۱۸ کے اس مفہوم سے نبی اکرمؐ کے چار جاں نثاروں کا تصور نمایاں ہوتا ہے جن میں سے ایک کو نبی اکرمؐ مکہ معظمہ سے ہجرت کے وقت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اور باقی تین ضروری امور کی انجام دہی کے لیے پیچھے چھوڑے گئے تھے۔ اس سوال کا جواب ہے کہ وہ کون سے ضروری امور تھے۔ جن کے لیے انہیں خود نبی اکرمؐ کی طرف سے ہجرت کے وقت مکہ معظمہ میں پیچھے چھوڑ دیا گیا۔

اگلی آیت مجیدہ ۹/۱۱۸ میں جملہ اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی مخالفت سے بچیں اور سچوں یعنی انبیاء سلام علیہم کے ساتھ ہو جائیں۔ پوری نوع انسانی کی مشکلات کا حل انہی کے لائے ہوئے ضابطے میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۱۱۹

اے وہ لوگو! جو (اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے وعیدار ہو) اللہ تعالیٰ (کے قوانین کی مخالفت سے بچو اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انبیاء سلام علیہم) سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

○ **اتقوا اللّٰہ** کا لفظی معنی لیا جاتا ہے۔ "اللہ سے بچو یا اللہ سے ڈرو۔" آیت مجیدہ میں آمدہ **اتقوا** فعل امر کا سہ حرفی مادہ ہے و۔ ق۔ ی= وقی' جس کا بنیادی معنی ہے کسی کو کسی چیز کے ضرر سے بچانا ۷۶/۱۱ میں ہے۔ **فوقھم اللّٰہ** اللہ

انہیں بچالے گا۔ اور ۵۶/۴۴ میں ہے۔ **ووقهم عذاب الجحيم** اور اللہ انہیں جحیم کے ضرر' عذاب سے بچالے گا۔ اس مادہ کا مصدر اتقاء متعدی نہیں لازم ہے۔ اور اس کا معنی بچانا نہیں' بچنا ہے۔ تو اس طرح **اتقوا** کا معنی ہوا بچو۔ نیز چونکہ اس مصدر کا معنی ڈرنا بھی لیا جاتا ہے۔ اس لیے **اتقوا اللہ** کا عموی معنی لیا جاتا ہے۔ بچو اللہ سے یا ڈرو اللہ سے لیکن قابل غور یہ امر ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کوئی معنرذات ہے کہ اس سے بچا جائے یا اس کے ضرر سے ڈرا جائے؟ اس کا جواب بالکل سیدھا سادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو رحمان و رحیم ہے۔ وہ تو رحمت ہی رحمت ہے تو پھر جب کہ رحمت سے بچنے یا رحمت سے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' تو ثابت ہوا کہ **اتقوا اللہ** کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے قوانین تکوینی اور تنزیلی کی مخالفت کے ضرر سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

○ **مثلاً** باری تعالیٰ کے تکوینی قوانین میں سے آگ کے قانون پر غور فرمائیں جس کا مستقل قانون ہے جلانا۔ اگر آگ میں انگلی ڈالی جائے تو وہ یقیناً جل جائے گی اور اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا۔ جو لوگ ہاتھ میں آگ پکڑ لیتے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ پر مینڈک کی چربی یا کوئی اور کیمیکل لگایا ہوا ہوتا ہے جو چند سیکنڈوں کیلئے ہاتھ کو جلنے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ورنہ آگ کا دائمی قانون جلانا اور پھونک دینا ہے۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ کے اس تکوینی قانون کی مخالفت کے ضرر سے بچنا **اتقوا اللہ** میں داخل ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا تنزیلی حکم ہے چوری نہ کرو' جھوٹ نہ بولو' ملاوٹ اور چور بازاری نہ کرو۔ ایسا کرنے والا ملکی قانون کے عذاب کے ضرر کا بھی مستحق ہوتا ہے اور قیامت کو بھی اللہ تعالیٰ کی عدالت عالیہ سے دائمی عذاب کے ضرر کا سزاوار ہوگا۔ پس **اتقوا اللہ** کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ سے ڈرو یا بچو۔ بلکہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی مخالفت سے لازم ہونے والے ضرر سے بچو' ڈرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین کی مخالفت نہ کرو۔ ورنہ تم پر اس حکم عدولی کا عذاب ضرر لازم ہو جائے گا۔

○ **كونوا مع الصدقين** کا لفظی معنی ہے سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ اب سوال یہ ہے کہ سچے کون ہیں؟ قرآن مجید میں ضابطہ الٰہی کے فرمانبرداروں کو بھی صدقین کہا گیا ہے۔ اور اس ضابطہ الٰہی کے لانے والوں یعنی انبیاء سلام علیہم کو بھی صدقین اور صدیقین کے مقدس القاب سے نوازا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوع انسانی کے عالمگیر مصائب و آلام کا واحد حل صرف کتاب اللہ ہے جو آدمؑ سے لے کر خاتم النبین تک جملہ انبیاء کو دیا جاتا رہا۔ جس میں نوع انسانی کے ہردور کے مصائب کا حل نازل کر دیا گیا ہے۔ جن میں سرفہرست ہے پوری نوع انسانی کا بلاتمیز ایک ہی جماعت ہونا۔ یکساں واجب التکریم ہونا اور سب کے بنیادی حقوق کا مساوی ہونا۔

○ **كان الناس امة واحدة** ۲/۲۱۳

نوع انسانی بلاتمیز ایک ہی جماعت ہے۔ (ان میں سے کوئی بھی اونچ نیچ نہیں)۔

○ **و لقد كرمنا بنى آدم** ۱۷/۷۰

اور بے شک بیشک ہم نے پوری نوع آدم کے ایک ایک فرد کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔

○ **ولكم فى الارض مستقر و متاع الى حين**○ ۲/۳۶ + ۷/۲۴

اے نوع انسانی! زمین میں تم سب کا حق استقرار بھی مساوی ہے' اور حق ضروریات زندگی بھی۔ یعنی تم میں سے ہر ایک کو زمین میں مکان بھی

بلا کرایہ میسر ہونا لازم ہے اور آخری دم تک کیلئے ضروریات زندگی بھی ملتے رہنے کا حق مسلم ہے۔

مومنوں کو نبی اکرمؐ سے پیچھے رہنے کا حق حاصل نہیں :۔ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جب نبی اکرمؐ جنگ پر تشریف لے جا رہے ہوں تو مومنوں کو' خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی آپ سے پیچھے رہنے کا حق حاصل نہیں۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲۰﴾

نہیں لائق اہل مدینہ کے لیے اور جو ان کے اردگرد والے دیہاتی ہیں' کہ وہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں (جب اللہ کا رسولؐ جنگ میں جا رہا ہو) اور نہ انہیں یہ لائق ہے کہ وہ لوگ اس (اللہ کے رسولؐ) کی جان سے اپنی جانوں کو عزیز سمجھیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں اللہ کی راہ میں نہیں تکلیف پہنچی' پیاس کی یا تھکاوٹ کی یا بھوک کی یا وہ ایسی جگہ چلتے ہیں جو کافروں کو غضب آلود کر دے یا وہ دشمنوں سے کوئی چیز چھین لیں مگر لکھا جاتا ہے ان کے لیے اس (ہر چیز کے) عوض ایک ایک عمل صالح' بلاشبہ اللہ تعالیٰ توازن قائم کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۱﴾

اور نہیں خرچ کرتے وہ (اللہ کی راہ میں) کوئی مال تھوڑا یا بہت' اور نہ وہ کوئی وادی عبور کرتے ہیں' مگر سب ان کیلئے لکھا جاتا ہے' تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں احسن بدلہ دے اس کا جو وہ عمل کرتے ہیں۔

○ مادہ خلف کے باب تفعل سے مصدر تخلّف کا معنی بصورت لازم بلاارادہ پیچھے رہنا ہے۔ کیونکہ جنگ سے بالارادہ پیچھے رہنے والوں کے لیے قرآن مجید میں قاعدین کا لفظ آیا ہے جس کا مصدر قعد ہے۔ اس مصدر میں قصداً" پیچھے رہنے کا مفہوم پایا جاتا ہے' جیسے کہ موسیٰؑ کو قوم نے کہا **فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ**○ ۵/۲۴= تو اور تیرا بھائی جاؤ اور لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھنے والے ہیں۔

○ اس کے علاوہ قرآن مجید میں جنگ سے پیچھے رہنے والوں کے لیے مادہ خلف سے خوالف بمعنی پیچھے رہنے والے آیا ہے۔ مگر اس مادہ میں ارادہ نہیں پایا جاتا۔ یہ لفظ لولے' لنگڑے' اندھے وغیرہ معذور لوگوں کے لیے آیا ہے' جو جنگ میں جانے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ منافق ان کے ساتھ بیٹھ رہنا پسند کرتے تھے' جیسے کہ ۹/۸۷ + ۹/۹۳ میں ان کے متعلق دو جگہ پر بتایا گیا ہے۔ **رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ** وہ اس پر خوش ہیں کہ وہ جنگ سے پیچھے رہنے والے لولے لنگڑوں کے ساتھ ہو کر پیچھے بیٹھ رہیں۔

○ الختصر مادہ خلف میں قصداً" پیچھے رہ جانے کا مفہوم موجود نہیں۔ آیت زیر بحث ۹/۱۲۰ میں **ان يتخلفوا عن رسول اللّه** کے الفاظ لاکر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس مادہ میں قصداً" پیچھے رہنے کا مفہوم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس فعل کے بعد حرف جار عن داخل ہو۔ چنانچہ آیت زیر بحث میں اعلان کیا گیا ہے کہ جب اللہ کا رسولؐ جنگ کے لیے جا رہا ہو تو کسی مومن کے لیے خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی' یہ لائق نہیں کہ وہ پیچھے رہ جائے۔ سوائے اس کے کہ' اللہ کا

رسولؐ کسی وقتی فرض کی انجام وہی کے لیے خود پیچھے چھوڑ جائے۔

○ **وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ** کے الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کے رسول کی جان سب سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے ہاں جملہ اصحاب و احباب کی جانوں سے عزیز تر ہے۔ بالفاظ دیگر ہر مومن کے لیے اللہ کے رسولؐ کی جان کو اپنی جان سے عزیز تر جاننا ضروری' یعنی شرط ایمان ہے۔ اسی چیز کو ایک مخصوص انداز کے ساتھ سورہ احزاب میں بالفاظ ذیل اجاگر کیا گیا ہے۔ **اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ** ۳۳/۶ اللہ کا نبیؐ (محمدؐ) مومنوں کے لیے اپنی جانوں سے اولیٰ ہے۔ اور ساتھ ہی اگلے الفاظ میں کہا گیا ہے۔ **و ازواجه امهتهم** ۳۳/۶ اور اس کی بیویاں ان کی (مومنوں کی دینی) مائیں ہیں۔ بالفاظ دیگر نبی اکرمؐ مومنوں کے دینی باپ ہیں۔ پس اس لحاظ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جملہ مومنین نبی اکرمؐ کی جان کو اپنی جانوں سے افضل وارفع اور عزیز تر سمجھیں' یہی شرط ایمان ہے۔

ایک صحیح حدیث شریف :۔ ○ کتب روایات میں ایک صحیح حدیث شریف درج ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا' جب تک کہ وہ نبی اکرمؐ کو اپنے ماں باپ' اولاد اور جملہ اقارب سے' حتیٰ کہ اپنی جان تک سے بھی عزیز نہ سمجھے۔

○ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ** کا معنی لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ توازن قائم کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ محسنین کا معنی ہے توازن قائم کرنے والے۔ اس لفظ کا سہ حرفی مادہ ہے ح۔ س۔ ن= حسن' اس کا بنیادی معنی ہے متوازن ہونا۔ حسین یعنی خوبصورت اسے کہتے ہیں جس کا قد' طول' عرض' جسامت وغیرہ اور جملہ اعضاء عین متوازن ہوں۔ اس طرح محسن اسے کہتے ہیں جو ہر کام میں اعتدال و توازن قائم کرنے والا ہو۔ چونکہ قرآن کریم ایک متوازن معاشرہ کے قیام کا داعی ہے اس لیے آیت زیر بحث ۹/۱۲۰ میں محسنین کا معنی ہے معاشرہ میں توازن قائم کرنے والے۔ اور انہی کے متعلق اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاشرہ میں توازن قائم کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

قرآن مجید کی رو سے جنگ کی اجازت بھی معاشرہ میں توازن قائم کرنے ہی کیلئے دی گئی ہے

○ واضح رہے کہ سورۃ انفال اور توبہ' دونوں میں جنگ اور قتال کے احکام نازل کیے گئے ہیں۔ حالانکہ امن متوازن ہے اور جنگ غیر متوازن اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو سورتوں میں مسلسل لڑائی ہی کے احکام دیے گئے ہیں جو معاشرہ کو غیر متوازن کر دیتی ہے۔ پھر جنگی احکام ہی کے دوران یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ' معاشرہ میں توازن قائم کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

○ اس سوال کا جواب قرآن بھر میں پھیلا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ امن کو پسند کرتا ہے۔ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ **ان اللّٰه لا يحب الفساد** جنگ کی اجازت صرف دو صورتوں میں دی گئی ہے۔

۱۔ **پہلی** یہ کہ جب کوئی دشمن ملک پر چڑھائی کرے یعنی جارحانہ حملہ کر دے۔ تو ملک و قوم کو بچانے کے لیے مدافعانہ جنگ

کی اجازت دی گئی ہے۔ **اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** ۳۹/۲۲ جنگ کی اجازت انہیں دی جاتی ہے جن سے جنگ کیا جائے (یعنی دشمن جن پر جارحانہ حملہ کر دے) یہ اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ ان پر جارحانہ حملہ کرکے ظلم کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کی رو سے جنگ کی اجازت ظلم کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ مدافعانہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ جو ظلم ہی کے خاتمے کے لیے ہے۔

۲۔ دوسری اجازت نہیں' بلکہ حکم ہے جو خاتمہ ظلم کے لیے اس طرح دیا گیا ہے کہ کسی ملک یا حکومت میں کچھ کمزور مرد عورتیں اور بچے رہ رہے ہوں۔ مگر وہ قوم ان پر ظلم کر رہی ہو اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہوں کہ بار الہا ہمیں ان ظالموں کے ظلم سے بچالے۔ چنانچہ سورہ نساء میں ارشاد ہوا ہے۔ **وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا** ۷۵/۴ اور (ایمان والو!) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہ لڑو گے جبکہ کچھ کمزور کئے گئے مرد' عورتیں اور بچے (پکار پکار کر) کہہ رہے ہوں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال لے کہ اس کے حاکم ظالم ہیں (انہوں نے ہمیں ظلم کے چنگل میں جکڑ رکھا ہے۔)

المختصر! اللہ تعالیٰ کو امن پسند ہے فساد اور ظلم پسند نہیں۔ ظلم کو مٹانے کے لیے جنگ تک کی اجازت اور حکم دیا گیا ہے تاکہ معاشرہ میں امن یعنی توازن قائم ہو۔ چنانچہ آیت مجیدہ زیر بحث ۱۲۰/۹ میں اعلان کیا گیا ہے کہ توازن قائم کرنے کے لیے جب جنگ کرنی پڑے اور جنگ کے دوران جو بھی مصیبت پہنچتی ہے خواہ وہ بھوک پیاس کی ہو یا کسی سنگلاخ وادی کو عبور کرنا پڑے جس کے عوض دشمن آگ بگولا ہو کر انتہائی شدت کی جنگ پر اتر آئے' ان تمام اقدام کے عوض مومنوں کے اعمال ناموں میں اعمال صالح لکھتے جاتے ہیں۔

○ آیت مجیدہ زیر بحث ۱۲۱/۹ میں بتایا گیا ہے کہ جنگ میں خرچ کیا گیا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اور دوران جنگ ہر ہموار یا سنگلاخ وادی کو عبور کرنے میں جو تھوڑی یا بہت تکلیف پہنچتی ہے' انہیں اس کا احسن بدلہ دینے کے لیے سب کچھ لکھ لیا جاتا ہے۔ **كُتِبَ لَهُمْ** سورہ بنی اسرائیل میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان جو بھی عمل کرتا ہے اچھے یا برے سب لکھے جاتے ہیں اور ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں بندھا رہتا ہے۔ **وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا○ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا○** ۱۳-۱۴/۱۷ اور ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں باندھ دیا ہے (جب چاہے ذرا گردن جھکا کر پڑھ لے) اور ہم قیامت کے دن اس کی کتاب نکال کر اس کے سامنے کر دیں گے (اور کہا جائے گا کہ) اپنی کتاب پڑھ لے آج کے دن تیرے حساب کے لیے یہی کافی ہے۔ انسان جو بھی اچھا یا برا عمل کرتا ہے اس کے حافظہ میں محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے' لکھا چلا جاتا ہے۔ دنیا کی کی زندگی میں بھی اس کتاب کو ہر انسان خواہ وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ یعنی خواہ لکھا پڑھا ہو' خواہ مطلقاً" ان پڑھ ہو۔ اپنی کتاب' اعمال نامے کو ہر آن پڑھ لیتا ہے۔ اور قیامت کو بھی پڑھ لے گا۔ دنیا میں جو چھوٹی چھوٹی چیزیں' اعمال نامہ سے پڑھی نہ جاتی ہوں۔ ان کے متعلق سورہ ق میں ارشاد ہوا ہے کہ قیامت کو انسانی نظر اتنی تیز کر دی جائیگی کہ وہ ہر چھوٹی بڑی چیز کو پڑھ لے گا۔

○ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۝ ۵۰/۲۲
بیشک تو اس دن (کی حاضری) سے غفلت میں رہا۔ پس ہم نے (آج) تجھ سے تیرا پردہ دور کر دیا ہے۔ پس آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے (انتہائی چھوٹے چھوٹے اعمال بھی آج تجھے اعمالنامہ میں نمایاں دکھائی دے رہے ہیں)' اسی سورہ ق میں بتایا گیا ہے کہ انسانی اعمالنامہ میں ہر وہ لفظ بھی لکھا جاتا ہے جو انسان اچھا یا برا اپنی زبان سے نکالتا ہے۔

○ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۝ ۵۰/۱۸ (انسان) منہ سے کوئی بات نہیں نکالتا مگر اس کے پاس ایک ہوشیار و تیار (مخصوص قوت) موجود ہے (جو اس کے حافظے میں اس کا ہر ہر لفظ محفوظ کرتی' لکھتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح ہر انسان کی پوری زندگی کے اعمال و اقوال کا ریکارڈ ایک مکمل کتاب' اعمال نامے کی صورت میں ہر آن تیار ہوتا چلا جاتا ہے پس لازم ہے انسان روزانہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور گردن جھکا کر اپنی کتاب پڑھ لیا کرے تاکہ اس پر ہر روز عیاں ہوتا رہے کہ وہ قیامت کی عدالت عالیہ کی حاضری کے لیے کس قدر تیار ہو رہا ہے۔

رجوع الی المطلب :۔ ان مذکورہ آیات مجیدہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں کی گئی جنگ کی فضیلت اجاگر فرمائی گئی ہے کہ میدان جہاد میں آنے والی بھوک پیاس وغیرہ اور اللہ کی راہ میں خرچ کئے گئے مال کے بدلے' خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ' یعنی ہر چھوٹے بڑے اقدام کے عوض مجاہدین کے نامہ اعمال میں ایک ایک عمل صالح لکھا جاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کا حکم' چونکہ ظلم کے خاتمہ کے لیے ہے' اس لیے باری تعالیٰ معاشرہ میں توازن قائم کرنے والوں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔

○ اگلی آیت مجیدہ انتہائی اہم ہے۔ اس کا ترجمہ اور تفسیری نوٹ انتہائی توجہ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔ آیت مجیدہ نقل کرنے سے پہلے اس امر کی یاد دہانی ضروری ہے کہ سورہ انفال اور سورہ توبہ کا واحد عنوان صرف جہاد ہے اس لیے اگلی آیت میں جنگی تربیت یعنی فوجی ٹریننگ کا خصوصی حکم دیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۝(۱۲۲)

اور مومنوں کے لیے یہ لائق نہیں کہ سب کے سب (ٹریننگ کے لیے) نکل آئیں۔ پس ایسا کیوں نہ ہو کہ ان میں سے (ہر بستی کے ہر مسجدی) حلقہ کے چند افراد قریبی مرکز میں آجائیں تاکہ وہ جنگی ٹریننگ حاصل کریں۔ اور تاکہ جب وہ (بستی میں) واپس آئیں تو اپنی اپنی قوم (اپنے اپنے مسجدی) حلقہ والوں) کو ان کے فرائض منصبی سکھائیں تاکہ وہ بھی سب ہتھیار بند (مسلح) ہو جائیں۔

○ اس آیت مجیدہ کے ترجمہ میں جو مسجدی حلقہ' قریبی مرکز' جنگی ٹریننگ اور ہتھیار بند مسلح ہو جانے کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کے قرآنی ثبوت ضمنی نوٹوں کی تشریح میں آگے آرہے ہیں۔ ان نوٹوں کی تشریح ذرا لمبی ہے' اطمینان کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔

○ اس آیت مجیدہ کے ترجمہ میں جو مسجد حلقہ' قریبی مرکز' جنگی ٹریننگ اور ہتھیار بند مسلح ہو جانے کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کے قرآنی ثبوت ضمنی نوٹوں کی تشریح میں آگے آرہے ہیں۔ ان نوٹوں کی تشریح ذرا لمبی ہے' اطمینان کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔

اہل اسلام کا ایک ایک فرد فوجی سپاہی ہے :۔ ○ **لِيَنْفِرُوْا** کا سہ حرفی مادہ ن۔ ف۔ ر= نفر ہے جس کے بنیادی معنے ہیں کوچ کرنا' جانا' نکلنا' بھاگنا۔ جب اس کا صلہ عن آئے تو **نفرعن الشی** کا معنی ہوتا ہے' کسی چیز سے روگردانی کی نفرت کی۔ (نفرت کا لفظ بھی اسی مادہ نفر سے مشتق ہے)۔ اور جب اس کا صلہ الی آئے تو **نفر الی الشی** کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کی طرف بھاگا۔ **نفر الی الحرب** کا معنی ہے۔ لڑائی کے لیے نکلا۔ تو اس طرح اس مادہ کا معنی کسی کام کے لیے نکلنا بھی ہے۔ ۹/۳۸ میں آیا ہے۔ **مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** کیا ہے تمہیں کہ جب کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکلو۔ نیز ۹/۳۹ میں آیا ہے۔ **اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا** " اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا۔ پس آیت مجیدہ زیر بحث ۹/۱۲۲ کے الفاظ **وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً** کا لفظی معنی یہ ہے کہ نہیں لائق مومنوں کو کہ وہ سب کے سب نکل پڑیں۔ کس کام کے لیے؟ اس کے دو جواب ہیں۔

○ یہ سوال کہ چند کے سوا سب مومنوں کو کس کام کے لیے نکلنے سے منع کیا گیا ہے' اس کا پہلا جواب آیت زیر بحث کی آیات' ماسبق کے مطابق یہ ہے کہ لڑائی کے لیے سب کے سب کو نکلنے سے اس لئے منع کر دیا ہے کہ پیچھے بھی نوجوانوں کی ضرورت لازم ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا کوئی دستہ بستی پر حملہ کر دے اور وہاں جوابی کاروائی کے لیے کوئی نوجوان موجود ہی نہ ہوں اس لیے ہر حلقہ میں سے چند افراد کے ایک گروہ کو نکلنے کا حکم دیا گیا ہے۔

○ اس سوال کا دوسرا جواب ہے خود آیت زیر بحث کے اگلے الفاظ **لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ** کے مطابق جن میں سب کے نکلنے کی نہیں' بلکہ ان میں سے بعض کے نکلنے کی غرض نمبرا بتائی گئی ہے کہ وہ تفقہ فی الدین کریں' یعنی دین سیکھنے کیلئے نکلیں۔ اور غرض نمبر۲ بتائی گئی ہے۔ **وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْآ اِلَيْهِمْ** کہ جب وہ دین سیکھ کر واپس آئیں تو اپنی اپنی قوم کو انذار کریں' یعنی انہیں ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کریں۔ انہیں بھی ان کے فرائض سکھایں اور غرض نمبر ۳ بتائی گئی ہے۔ **لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ** تاکہ وہ سب بھی ہتھیار بند مسلح ہو جائیں۔

○ واضح رہے کہ آیت مجیدہ کے اپنے مذکورہ بالا داخلی الفاظ میں جو صرف بعض افراد کے نکلنے کی کیے بعد دیگر تین غرضیں بتائی گئی ہیں۔ ان کے مطابق **وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً**" کا یہ مفہوم فٹ نہیں بیٹھتا کہ جنگ کے لیے سب کو نکلنے سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ **تفقہ فی الدین** کے لیے سب کے سب کی بجائے ہر حلقہ کے چند افراد کو نکلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس آیت تفقہ فی الدین کا یہ معنی بھی فٹ نہیں آتا کہ وہ عربی زبان کی گردانیں ضَرَبَ يَضْرِبُ اور ضُرِبَ يُضْرَبُ وغیرہ سیکھنے کے لیے نکلیں اور واپس آکر ساری قوم کو عربی گرائمر ماضی مضارع کی گردانیں پڑھائیں اور یا فقہ کے مسائل سیکھنے جائیں اور واپس آکر ساری قوم کو فقہ پڑھائیں کیونکہ غرض نمبر۲ بتائی گئی ہے۔ **لینذروا قومھم** اپنی اپنی قوم کو ان کے فرائض منصبی سکھائیں۔ انذار کا معنی ہے فرائض منصبی بتانا' سکھانا۔ غرض نمبر۳ میں بتایا گیا ہے کہ قوم کے جملہ افراد اپنے فرائض منصبی پر عمل کرکے فوجی ٹرننگ لے کر سب کے سب ہتھیار بند یعنی مسلح سپاہی بن جائیں۔ اب چونکہ عربی گرائمر پڑھنے یا فقہ کے مسائل یاد کرنے سے سپاہی نہیں بنا جاسکتا۔ اس لیے ۹/۱۲۲ میں **تفقہ فی الدین** کا معنی صرفی نحوی گردانیں اور فقہی مسائل سیکھنے کے لیے گھروں سے نکلنا نہیں۔ فقہی مسائل تو بلا اختلاف اسلامی حکومت کی طرف سے مصدقہ شیڈول کی صورت میں شائع کرکے بستی بستی میں پہنچا دیے جائیں گے جن پر

عمل کرانا حکومت کا فرض ہے۔ فلہذا مذکورہ سوال کا جواب نمبر۲ صحیح ہے کہ فوجی ٹریننگ کے لیے جانا ہے' جس سے آیت مجیدہ میں مذکور تینوں غرضیں بھی پوری ہو جاتی ہیں اور سیاق کلام کے ساتھ ربط بھی قائم رہتا ہے کہ مسلسل دو سورتوں میں جنگ جہاد کے مسائل و احکام درج ہیں۔ اس لیے اس آیت میں ربط کلام کے مطابق پوری قوم کو مسلح سپاہی بنانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ پوری قوم فوجی ٹریننگ حاصل کرلے اور اسلام کے دشمنوں کو دندان شکن جواب دینے کے لیے ہر آن تیار رہے' پورے مسلمانوں کی فوجی ٹریننگ' عسکری تربیت کا حکم سورہ انفال میں نبی اکرمؐ کو بالفاظ ذیل دیا گیا

○ **يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ** ۸/۶۵ اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے "اے نبیؐ مومنوں کو لڑائی کی تربیت (فوجی ٹریننگ) دیجئے۔ اگر تم میں سے بیس ثابت قدم مجاہد ہوں گے تو دو سو پر اور اگر سو ہوں گے تو ایک ہزار پر غالب آئیں گے۔ مگر اس آیت کا مروجہ ترجمہ یہ ہے۔ اے نبی مومنوں کو لڑائی کی ترغیب دیجئے۔ یہ معنی بہ متعدد وجوہ غلط ہے۔ اولین ٹھوس وجہ یہ ہے کہ اگر مومنوں کو عسکری تربیت (فوجی ٹریننگ) ہی نہ ہوگی تو لڑائی کی ترغیب دینا ایک کار عبث ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حرض کا معنی ترغیب دینا ہے ہی نہیں۔ حرض باب تفعیل' مصدر تحریض سے ہے' جس کا معنی امام راغب نے مفردات القرآن میں لکھا ہے۔ "ازالہ حرض" (دیکھئے اہل حدیث اکاڈی کشمیری بازار لاہور کی مطبوعہ مفردات القرآن امام راغب کا صفحہ ۲۲۵) **التحریض** کے معنی ازالہ حرض کے ہیں (یعنی کسی چیز سے بگاڑ اور خرابی کو دور کر دینا)۔

○ اسی کے صفحہ ۲۲۴ پر مادہ ح۔ ر۔ ض= حرض کا معنی لکھا ہے۔ "الحرض اس چیز کو کہتے ہیں جو نکمی ہو جائے.... جو چیز قریب بہ ہلاکت ہو اس کے متعلق حرض کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے **حتی تکون حرضا**" ۱۲/۸۵ یا تو قریب بہ ہلاکت ہو جائے پس مادہ حرض کا بنیادی معنی ہے قریب بہ ہلاکت ہونا۔ اب مصدر تحریض جو ازالہ حرض (یعنی ازالہ ہلاکت) کا مفہوم دیتا ہے' اس کے مطابق **حرض المومنین** کا معنی ہوا "مومنوں کو ہلاکت سے بچا" پس **حرض المومنین علی القتال** کا معنی ہوا "مومنوں کو قتال کی تربیت دے کر ہلاکت سے بچائیں۔ اسی آیت زیر بحث ۸/۶۵ سے قبل ۸/۶۰ میں تمام مومنوں کو حکم دیا گیا ہے۔

○ **و اعدوالھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ و عدوکم** ۸/۶۰۔ اور (ایمان والو!) دشمنوں کے مقابلہ کیلئے پوری استطاعت بھر فوجی قوت تیار کرتے رہو۔ خصوصاً" تمہارے ہاں الخیل (ذرائع رسل و رسائل) کی بہتات ہو۔ تم اس فوجی قوت کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے لرزاتے رہو۔ تو برادران عزیز! اگر مومنوں کو فوجی ٹریننگ عسکری تربیت ہی نہ ہوگی تو فوجی قوت تیار کرنے کے کیا معنے؟ اگر معمولی سا غور کیا جائے تو اس آیت مجیدہ ۸/۶۰ میں بھی مومنوں کے لیے فوجی ٹریننگ کا حکم موجود ہے۔ پس آیت مجیدہ ۸/۶۵ کا صحیح معنی یہ ہے کہ اے نبیؐ! مومنوں کا ازالہ ہلاکت کرنے یعنی انہیں ہلاکت و تباہی سے بچانے کے لیے' عسکری تربیت (فوجی ٹریننگ) دیجئے۔ اگر تربیت یافتگان میں سے بیس مجاہد ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو ہوںگے تو ایک ہزار پر بھاری ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر تربیت یافتہ افراد کو اقوام عالم میں ہرگز کوئی مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔ (اب آیت مجیدہ زیر بحث ۹/۱۲۲ کا ضمنی نوٹ نمبر۲ ملاحظہ فرمائیں)۔

فرقہ بندی شرک ہے:۔ ○ **من کل فرقۃ" منھم طائفۃ"** کا معنی ہم نے لکھا ہے۔ ہر مسجدی حلقہ کے چند

افراد" ہم نے یہاں فرقہ کا معنی لکھا ہے مسجدی حلقہ اور **طائفة** " کا معنی لکھا ہے چند آدمی۔ واضح رہے کہ قرآن مجید کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ **ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینهم و کانوا شیعا** " ۳۱-۳۲/۳۰ اور تم مشرکوں میں سے نہ ہو جانا' جنہوں نے دین میں تفریق پیدا کی اور خود فرقہ فرقہ ہوگئے۔ تو اس طرح جب اللہ تعالیٰ کے ہاں فرقہ بندی شرک ہے تو پھر وہ خود ایمان والوں کو کس طرح فرقے کہہ کر مخاطب کرنے لگا تھا۔ اس لیے یہاں فرقوں سے مراد اہل اسلام کی ہر بستی کے الگ الگ مسجدی حلقے ہیں جو محلہ وار مسجدوں کی اساس پر قائم ہوتے ہیں۔ مسجد کیا ہے؟ اہل اسلام کے اکٹھے ہونے کا مقام۔ تمام صلوتوں کے اوقات پر عموماً" اور فجر کی صلوۃ کے وقت خصوصاً" مسجدی حلقہ وار روزانہ اجتماع ہوتا ہے۔ **ان قرآن الفجر کان مشهودا**"○ ۱۷/۷۸

○ مسجد ہی ہر مسجدی حلقہ کی عدالت بھی ہے۔ سورۂ مائدہ میں بتایا گیا ہے کہ زمانہ رسالت میں صلوۃ فجر کے بعد نبی اکرمؐ مسجد ہی میں عدالت قائم فرما دیتے تھے اور صلوۃ کے بعد گواہوں سے گواہیاں لی جاتی تھیں۔ **تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ** ۵/۱۰۶= تم الصلوۃ (فجر کی صلوۃ) کے بعد دونوں گواہوں کو روک لیتے ہو۔ پھر وہ اللہ کی قسم کھا کر گواہیاں دیتے ہیں۔ چونکہ ۱۷/۷۸ کی رو سے مسلمانوں کے روزانہ عام اجتماع کا وقت فجر کی صلوۃ کا مذکور ہے۔ اس لئے **من بعد الصلوة** کا معنی لکھا گیا ہے "فجر کی صلوۃ کے بعد"

○ المختصر! چونکہ فرقہ بندی ازروئے قرآن شرک ہے۔ اس لئے یہاں جو اہل اسلام میں فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مسجدی حلقوں کے مومنین مراد ہیں۔ ہر حلقے کے افراد میں سے چند افراد جو حسب ضرورت تین سے دس تک ہوسکتے ہیں فوجی تربیت حاصل کرنے کے لیے قریبی فوجی مرکز میں جائیں گے اور وہاں سے فوجی ٹریننگ حاصل کرکے جب واپس آئیں گے تو اپنے اپنے حلقہ کے افراد کو فوجی ٹریننگ دیں گے تاکہ پوری قوم فوجی سپاہی بن جائے۔ ہم نے **طائفة**" کا معنی جو چند افراد نے لکھا ہے' یہ خود لفظ **طائف** کے مطابق بھی صحیح ہے۔ اور **لولا نفرمن کل فرقة**" کے فعل نفر میں جو ضمیر مستقر ہے اس کی رو سے بھی صحیح ہے' کیونکہ عربی ادب میں نفر کا لفظ تین سے لے کر دس افراد تک کے لیے بولا جاتا ہے۔

○ اب آیئے قریبی مرکز کے لفظ کی طرف' تو جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ حلقہ وار چند افراد نے فوجی ٹریننگ کے لئے جانا اور واپس آکر اپنے افراد کو ٹریننگ دینی ہے تو کھل کر ثابت ہوا کہ جانے والے قریب کے فوجی ٹریننگ سینٹر میں جائیں گے۔ کسی مذہبی جماعت کے تعلیمی مرکز میں نہیں جائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے عسکری تربیت حاصل کرنا ہے' کروانیں رٹنا نہیں۔

○ **لیتفقهوا فی الدین** کے الفاظ میں سے دین کا معنی آیت مجیدہ کے سیاق اور سباق دونوں کی رو سے فوجی ٹریننگ' عسکری تربیت ہے' کیونکہ آیت مجیدہ کے ماقبل بھی فوجی احکام و مسائل درج ہیں اور مابعد بھی۔ لفظ دین کا سہ حرفی مادہ د- ی-ن= دین ہے۔ دال کی زبر کے ساتھ دین کا معنی ہے قرض بامقررہ مدت ادائیگی قرضدار کو مدیون کہا جاتا ہے اور دال کی زیر کے ساتھ دین کا بنیادی معنی ہے۔ ضابطہ' قانون' اسی ضابطہ و قانون کی رو سے ہی ارشاد ہوا ہے۔ **ان الدین عندالله الاسلام** ۳/۱۹ بلاشبہ نوع انسانی کے لیے زندگی کا ضابطہ اللہ کی فرمانبرداری ہے۔

○ سورۂ یوسفؑ میں ملکی قانون کو دین کہا گیا ہے۔ **مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ** ۱۲/۷۶ اور بادشاہ کے قانون کے مطابق یوسفؑ اپنے بھائی کو رکھ نہیں سکتا تھا۔ آیت زیر بحث ۹/۱۲۲ میں **لیتفقهوا فی الدین** کے الفاظ میں

الدین سے مراد فوجی قانون ہے۔ **لیتفقھوا** کا یہاں معنی ہے سیکھنا ہے۔ پس الفاظ کی حاکیت اور آیت مجیدہ کے سیاق و سباق کے مطابق **لیتفقھوا فی الدین** کا صحیح مقامی معنی فوجی قوانین کا سیکھنا عسکری تربیت حاصل کرنا اور فوجی ٹریننگ لینا ہے۔

○ **لینذروا قومھم** کا عمومی معنی یہ لیا گیا ہے کہ وہ فقہ کا علم حاصل کرکے واپس آنے والے اپنی اپنی قوم کو ڈرائیں' تاکہ وہ نیکوکار بن جائیں۔ **لینذروا** کا سہ حرفی مادہ ن۔ ذ۔ ر= نذر ہے۔ جس کا بنیادی معنی ہے فرض منصبی اور نذیر کا معنی ہے فرائض منصبی سے آگاہ کرنے والا یہاں آیت زیر بحث میں **لینذروا قومھم** میں آمدہ مادہ نذر کے معنوں کی وضاحت' انذار کا نتیجہ بتاکر ان الفاظ میں کر دی گئی ہے۔ **لعلھم یحذرون** تاکہ وہ ہتھیار بند مسلح ہو جائیں۔ یعنی جو ٹریننگ وہ مرکز سے سیکھ کر آئے ہیں۔ باقی مومن بھی ان سے سیکھ کر عسکری سپاہی بن جائیں' یہی ان کا فرض منصبی ہے۔ ایک دفعہ پھر ۸/۶۵ کے الفاظ کو نگاہ میں لائیں۔ **یایھا النبی حرض المومنین علی القتال** اے نبی! مومنوں کو قتال کی تربیت دیجئے گا۔ اس الٰہی حکم کے مطابق ہر مومن کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ عسکری تربیت حاصل کرکے اللہ کا سپاہی بن جائے۔

○ **لعلھم یحذرون** کا معنی عربی متن کے سامنے لکھا گیا ہے۔ تاکہ وہ بھی سب ہتھیار بند مسلح ہو جائیں۔ **یحذرون** کا سہ حرفی مادہ ح۔ ذ۔ ر= حذر ہے' جس کا بنیادی معنی ہے محتاط رہنا۔ بچاؤ حاصل کرنا۔ مفردات القرآن امام راغب کے صفحہ ۲۱۹ پر ۲۶/۵۶ **و انا لجمیع حذرون** کا معنی لکھا ہے۔ اور ہم سب با سازو سامان ہیں۔ یہ الفاظ فرعون کے ذکر ذیل میں آئے ہیں۔ فرعون نے موسیٰ کے مقابلہ کے لیے شہروں سے سیاست دان منگائے اور کہا۔ **اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ۔ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ۔ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ** ۵۴ تا ۲۶/۵۶ بے شک یہ ایک تھوڑی سی جماعت ہے۔ مگر وہ ہمیں غصہ دلانے والے ہیں۔ حالانکہ ہم سب با سازو سامان ہیں۔ حذرون مادہ حذر سے ہے جس کا مصدری معنی ہے باسازو سامان ہونا۔ اسی مادہ سے لفظ حذر کا معنی ہے فوجی ہتھیار امام راغب نے مفردات القرآن کے صفحہ ۲۱۹ پر آیت مجیدہ **خذوا حذر کم** ۴/۷۱ کا معنی لکھا ہے۔ جہاد کے لیے ہتھیار لے لیا کرو۔ اس میں حذر سے مراد اسلحہ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ مولوی احمد علی صاحب مرحوم لاہوری نے بھی **خذوا حذر کم** کا معنی لکھا ہے۔ "اپنے ہتھیار لے لو" یعنی ہتھیار بند مسلح ہو جاؤ۔ (مترجم قرآن عزیز صفحہ ۱۳۲)

○ آیت مجیدہ ۲۶/۵۶ **و انا لجمیع حذرون میں حذرون** کا معنی تمام مترجمین نے باہتھیار ہونا ہی لکھا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے ذیل کے تراجم کھلے پڑے ہیں۔

○ مولوی احمد علی صاحب مرحوم لاہوری نے **و انا لجمیع حذرون** کا معنی لکھا ہے "اور بے شک ہم سب ہتھیار بند ہیں" (مترجم قرآن عزیز صفحہ ۵۹۷)

○ شاہ رفیع الدین مرحوم نے اس کا معنی لکھا ہے۔ اور تحقیق ہم جماعت ہیں با اسباب" (مترجم قرآن مجید نامی گرامی مطبع بمبئی صفحہ ۵۱۰)

○ شاہ اشرف علی صاحب مرحوم نے اس کا معنی لکھا ہے۔ "اور ہم سب مسلم جماعت (اور باقاعدہ فوج ہیں)" (مترجم

قرآن مجید ملک دین محمد صفحہ ۵۸۸)

حاصل کلام:۔ ○ آیت مجیدہ زیر بحث میں **لعلھم یحذرون** ۹/۱۲۲ کا معنی مذکورہ بالا قرآنی دلائل قاطعہ کے مطابق یہ ہے۔ "تاکہ وہ سب بھی فوجی ٹرننگ حاصل کرکے باہتھیار فوجی سپاہی بن جائیں۔" یہی ہر مسلمان کا فرض منصبی ہے کہ وہ معاشرہ کا اگر کاشت کار ہو تو فوجی ہو۔ دکاندار ہو تو فوجی ہو۔ دستکار ہو تو فوجی ہو۔ معلم ہو تو فوجی ہو۔ متعلم ہو تو فوجی ہو۔ بالفاظ دیگر اسلامی معاشرہ میں کوئی ایک مومن بھی ایسا نہ پایا جائے۔ جو فوجی ٹرننگ' عسکری تربیت سے بے بہرہ اور لابلد ہو

○ آیات بالا میں ہر مسلمان کیلئے مسلح سپاہی بننے کی تاکید کے بعد اگلی آیت مجیدہ' میں کافروں کیساتھ انتہائی سخت جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (۱۲۳) ○

اے ایمان والو! اپنے آس پاس کے کافروں سے مدافعانہ جنگ کرو اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر انتہائی سختی پائیں اور جانے رہو کہ بلاشبہ اللہ ان لوگوں کیساتھ ہے جو خطرات سے خود بچنے والے ہیں۔

○ **قاتلوا الذین یلونکم** سے روایتی تفاسیر نے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اردگرد کے کافروں سے صرف اس لئے لڑائی چھیڑ دی جائے کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے' یہ عقیدہ اور نظریہ خود ازروئے قرآن حکیم غلط ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم ہی یہ ہے کہ قبول اسلام کے معاملہ میں مطلقاً" کوئی زبردستی نہ کی جائے۔ **لا اکراہ فی الدین** ۲/۲۵۶

قرآن کریم امن عالم کا علمبردار ہے:۔ ○ حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو امن پسند ہے جنگ وجدال ہرگز ہرگز پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب امن عالم کی علمبردار ہے' قتل و غارت اور خون خرابے کی حامی نہیں۔ جنگ کی مدافعانہ اجازت اس صورت میں دی گئی ہے کہ جب اہل اسلام پر جنگ ٹھونسی جائے' یعنی جب ان پر جارحانہ حملہ ہو تو پھر انہیں مدافعانہ جنگ کی اجازت ہے۔

○ **اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** ۲۲/۳۹= جنگ کی اجازت ان کے لئے ہے جن سے جارحانہ جنگ کی جائے (جن پر جنگ ٹھونسی جائے)۔ یہ اس لئے کہ ان پر حملہ کرکے ظلم کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جنگ کی اجازت مدافعانہ ہے جارحانہ نہیں کہ پرامن ہمسایوں کیساتھ صرف اس لئے جنگ چھیڑ دی جائے کہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہ ہے جنگ کی اجازت اور

○ دوسرے نمبر پر ظلم کو مٹانے کیلئے جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً" کوئی ملک یا قوم کمزور افراد پر ظلم کر رہے ہوں اور وہ مجبور و مقہور افراد اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر رہے ہوں کہ بار الہا! ہمیں ان ظالموں کے چنگل سے نکالنے کیلئے ہمارا کوئی مددگار بنا۔ تو ایسے وقت پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تم ان مظلوموں کی مدد کو پہنچو اور ظلم کی بساط الٹ کر رکھدو۔

○ **وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا** ۴/۷۵= اور (ایمان والو!) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہ لڑو گے جبکہ کمزور کر دیئے گئے مرد' عورتیں اور

بچے ہمارے حضور میں دعائیں کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نکال لے۔ اور خود اپنی طرف سے ہمارا کوئی دوست بنا اور خود اپنی طرف سے ہمارا کوئی مددگار بنا دے۔

○ حاصل کلام یہ کہ آیت زیر بحث ۹/۱۲۳ میں پرامن ہمسایہ کافروں پر بلاوجہ چڑھ دوڑنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ جنگ کی اجازت اور حکم قرآنی حدود کے اندر محدود ہے کہ اگر ہمسائے یا دور کے کافر جارحیت کریں تو ان کے دانت توڑ دو۔ اور اگر اپنے کمزور مرد، عورتوں اور بچوں پر ظلم کرنے کے مرتکب ہوں تو ظلم کی کلائی مروڑ کر مظلوموں کو ظلم سے نجات دلا دیا کرو۔

○ آیت مجید زیر بحث میں مومنوں کو خبردار کیا گیا ہے۔ **وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً**" اور ایمان والو! چاہیے کہ کافر تمہارے اندر انتہائی سختی پائیں یعنی حکم دیا گیا ہے تمہاری طرف سے دفاعی کاروائی اتنی شدید ہونی چاہیے کہ حملہ آور کفار اس کی تاب نہ لاکر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائیں۔ قرآن نے تو یہاں تک تاکید کی ہے کہ ایمان والو! تمہاری جنگی تیاری اتنی زیادہ ہونی چاہیے کہ دشمن اس سے ڈر کر تمہاری سرحدوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی جرات نہ کرسکے، بلکہ گھر بیٹھا کانپتا رہے۔ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ** ۸/۶۰ اور (ایمان والو!) دشمنوں کیلئے استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت تیار کرتے رہو۔ خصوصاً" تمہارے ہاں (**الخیل**) ذرائع رسل و رسائل کی وہ بہتات ہو کہ تم اس (فوجی قوت) کیساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے رہو۔ اور ان کے سوا (جنہیں تم جانتے ہو) تمہارے اور بھی دشمن ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔ انہیں اللہ جانتا ہے۔ آیت زیر بحث میں **وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً**" کے الفاظ سے بھی شدید فوجی قوت تیار کرنے کا حکم عیاں ہے، کیونکہ جدید سے جدید جنگی ہتھیاروں کے بغیر لڑائی میں شدت پیدا ہی نہیں کی جاسکتی۔ نیز جنگ میں سختی پیدا کرنے کیلئے ضروری چیز ہے ثابت قدمی چنانچہ ۸/۶۵ میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم میں بیس ثابت قدم مجاہد ہونگے تو دو سو کافروں پر غالب آئینگے اور اگر سو ثابت قدم ہوں گے تو ایک ہزار پر بھاری ہونگے۔ **اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا**۔ پس تصریف آیات کے الٰہی اسلوب کے مطابق **و لیجدوا فیکم غلظتہ** کے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ فوجی تیاری کا حکم بھی موجود ہے۔ اور اسلامی لشکر کے ایک ایک سپاہی کیلئے ثابت قدمی کی تاکید بھی کر دی گئی ہے۔ ارشاد باری ہے کہ ثابت قدم مجاہد اللہ تعالی کے محبوب ہیں۔

○ **اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ**○ ۶۱/۴= بیشک اللہ تعالی ان مجاہدوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہیں، گویا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں۔

○ **ان اللہ مع المتقین** کے الفاظ میں بھی اسی چیز کی خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالی ان لوگوں کیساتھ، یعنی فتح و کامرانی انہیں نصیب ہوتی ہے جو اپنا بچاؤ خود کرنیوالے ہیں۔ **متقین** کا معنی ہے خود بچنے والے اور دشمن کے حملے کے بچاؤ کی عملی صورت صرف یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فوجی قوت تیار کی جائے۔ جدید سے جدید جنگی اوزار بنائے جائیں ۸/۶۰ بہترین فوجی ٹرینگ لی جائے۔ ۸/۶۵ اور ہر سپاہی ثابت قدمی کا پیکر عظیم ہو۔ تاکہ حملہ آور کو دنداں شکن جواب دیکر **و لیجدوا فیکم غلظتہ**" کے خداوندی حکم کے تقاضے بھی پورے ہوسکیں اور **متقین** میں شمار بھی ہوسکے۔

منافقوں کا ایک قول :۔ ○ اگلی آیت مجیدہ میں پھر منافقوں کی طرف روئے سخن کیا گیا ہے کہ جب کوئی سورہ نازل ہوتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں۔

وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۱۲۴

اور جب (جنگ جہاد سے متعلق) کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان (منافقوں) میں سے بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم میں سے کون ہے کہ اس کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہو پھر جو ایمان لائے ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ خوشخبری دیئے جاتے ہیں۔

○ اسی سورہ توبہ میں منافقوں کا نشان بتایا گیا ہے کہ وہ جنگ سے ڈرتے' اس سے دور بھاگتے اور لوہلے لنگڑے معذوروں کیساتھ پیچھے بیٹھ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ۹/۸۹ اس لئے جب لڑائی سے متعلقہ احکام نازل ہوتے اور ان میں یہ بشارت دیجاتی کہ اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کیساتھ ہے۔ تو مومن مجاہد صحابہؓ کے ایمان تازہ ہوتے اور بڑھ جاتے تھے۔ لیکن منافق ان احکام کا برا مانتے تھے جن سے ان کی آرام طلبی اور سہل انگاری متاثر ہوتی تھی۔ اس لئے وہ ایمان والوں کو یہ کہا کرتے کہ تم میں سے کون ہے جس کا ایمان جنگ کے حکموں کے ساتھ تازہ اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ان کے لئے جنگ جہاد کے احکام سے ایمان کا بڑھنا تو کیا' وہ تو رخصت ہی ہو جاتا تھا۔ دیکھئے! مومن مجاہدوں کے متعلق سورہ آل عمران میں ارشاد ہوا ہے۔

○ **ٱلَّذِينَ قَالَ لَهُمُ ٱلنَّاسُ إِنَّ ٱلنَّاسَ قَدْ جَمَعُوا۟ لَكُمْ فَٱخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَٰنًا وَقَالُوا۟ حَسْبُنَا ٱللَّهُ وَنِعْمَ ٱلْوَكِيلُ** ○ ۳/۱۷۳ (یعنے مومن مجاہد) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں لوگ کہتے ہیں کہ تمہارے مقابلے کیلئے بہت سے لوگ (کافر) جمع ہوچکے ہیں' تم ان سے ڈر جاؤ (ان کی شرائط تسلیم کرلو) تو ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اور وہی ہمارا بہتر کارساز ہے۔ (جس نے جنگ کے متعلقہ احکام بھی نازل کر دیئے ہیں اور فتح و نصرت کے رازوں سے ہمیں پوری طرح آگاہ بھی کر دیا ہے۔ چونکہ مومن مجاہدوں کا قوانین الٰہی پر پورا پورا ایمان ہوتا ہے اور انھوں نے دشمن کے مقابلہ کیلئے پوری تیاری کر رکھی ہوتی ہے اس لئے جنگ کا حکم نازل ہونے سے ان کے ایمان تو بڑھ جاتے ہیں مگر منافق اپنے ضعف ایمان کی بدولت' جنگی احکام مین ایمان کے بڑھنے کی کوئی چیز موجود ہی نہیں پاتے۔ العیاذ باللہ!

○ **و هم یستبشرون** کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ جنگی احکام میں مومن مجاہدوں کیلئے تو فتح و نصرت کی اور دشمن کے نیست و نابود ہو جانے کی خوشخبری دی گئی ہوتی ہے۔ مگر منافق کہتے تھے کہ اس میں مسلمانوں کیلئے خوشخبری کی کونسی بات ہے گرمی میں گھروں سے نکلو اور میدان جنگ میں زخم کھاؤ اور جانیں دو۔ لیکن حقیقت حال کی رو سے مسلمہ اور مصدقہ امر صرف یہی ہے کہ باعزت زندگی کی خوشخبری ان لوگوں ہی کیلئے ہے جو میدان جہاد میں خون بہاتے ہیں۔ قوم کے جو افراد میدان جنگ میں کام آجاتے ہیں وہ خود تو مرجاتے ہیں۔ مگر اپنی قوم کو زندہ کر جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے۔

○ **وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَىْءٍ مِّنَ ٱلْخَوْفِ وَٱلْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ ٱلْأَمْوَٰلِ وَٱلْأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٰتِ ۗ وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا۟ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ○ أُو۟لَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُهْتَدُونَ** ۱۵۵-۱۵۶/۲ اور تم کو ہم ظاہر کرتے ہیں دشمن کے خوف کیساتھ' بھوک کیساتھ

اور مالوں' جانوں اور پھلوں کے نقصان کیساتھ اور (اے رسول!) آپ ان مومنوں کو (فتح و کامرانی کی) خوشخبری دیدیں جو ثابت قدم رہ کر مصائب کا مقابلہ کرنے والے ہیں' کہ جب انہیں کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ ہم اللہ ہی کیلئے ہیں (یعنی ہمارے لئے اللہ ہی کا قانون کافی ہے اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں۔ یعنی ہمیں اللہ تعالیٰ کے غیر متبدل قوانین کے مطابق ہی ہمارے اعمال کی جزا اس دنیا میں بھی ملنے والی ہے اور آخرت میں بھی۔

المختصر!:۔ جنگی احکام پر اگر خدا تعالیٰ کے احکام کے مطابق صحیح صحیح عمل کیا جائے تو ان کے اندر ان لوگوں کیلئے فتح و نصرت اور باوقار قومی زندگی کی خوشخبری موجود ہے' جو ثابت قدمی کیساتھ مصائب کا مقابلہ کرنے والے ہیں' منافقوں کیلئے کوئی خوشخبری نہیں ہے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں ہی کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ جنگی احکام سے ان کیلئے اسی گندگی میں اضافہ ہوتا ہے جو ان کے ذہنوں میں پہلے سے موجود ہے۔ مومنوں کا ایمان تو جنگی احکام سے بڑھ جاتا ہے مگر اس کے برعکس جو منافق ہیں ان کی حالت یہ ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ﴿۱۲۵﴾ (۱۲۵)

اور وہ لوگ جن کے ذہنوں میں (منافقت کی) بیماری ہے۔ پس (نازل کردہ سورت) انہیں ان کی ذہنی نجاست میں نجاست ہی زیادہ کرتی ہے۔ اور (یہاں تک کہ) وہ مرجاتے ہیں اور وہ کافر ہی ہوتے ہیں۔

○ قرآن مجید رحمت الٰہی ہے۔ مگر اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ لوگ جو اس کی طرف آنے سے پہلے اپنے اذہان کو سابقہ غیر اللہ تصورات کی نجاست سے پاک کرلیں۔ اس کے برعکس اگر ذہن میں سابقہ گندگی بدستور موجود رہے تو ایسے اشخاص اس الٰہی رحمت سے ہرگز مستفیض نہیں ہوسکتے۔ بلکہ اس سے فائدہ وہی اٹھا سکتے ہیں جو خالی الذھن ہو کر یعنی پاک ذہن کیساتھ اس کی طرف آتے ہیں۔ اسی چیز کو سورہ واقعہ میں بالفاظ ذیل اجاگر کیا گیا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ○ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ○ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ○ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ○ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ○ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ○ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ○ (۷۵ تا ۸۱ /۵۶) شہادت ہے ستاروں کے ان مواقع (مداروں) کی جن پر وہ دن رات محو خرام ہیں۔ اور اے مخاطب اگر تو جانے تو ستاروں کے راستوں کی شہادت بہت بڑی شہادت ہے (کیونکہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی ایک ستارہ کا بھی راستہ تبدیل نہیں ہوا۔ یہ شہادت اس چیز پر ہے کہ بلاشبہ وہ قرآن کریم بڑی تکریم والا ہے۔ یہ محفوظ کتاب (علم الٰہی) میں ہے۔ اسے نہیں مس کرتے مگر وہ جو پاک (اذہان والے ہیں) اس کا نازل کیا جانا جہانوں کے نشوونما دینے والے کی طرف سے ہے۔ گیا تم اس حدیث (کلام الٰہی) کو سرسری اور معمولی چیز سمجھتے ہو (تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے ہر حکم کو ستاروں کے مداروں کی طرح اٹل جاننا چاہیے)۔

○ ان آیات کریمات میں **لایمسہ الا المطھرون** کا مفہوم یہ نہیں کہ اس کو صرف پاکیزہ لوگ ہی (مس کرتے) ہاتھ لگاتے ہیں۔ جبکہ حالت یہ ہے کہ قرآن مجید کے نسخے ہندوؤں' سکھوں' عیسائیوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکرین کے پاس موجود ہیں اور وہ انہیں پکڑتے ہیں' مس کرتے ہیں۔ پس **لایمسہ** ...... الخ کا مفہوم پاکیزہ ہاتھوں سے چھونا نہیں بلکہ

پاکیزہ اذہان والوں کا اس سے مستفیض ہونا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنے ذہنوں کو صاف کرکے اس کی طرف آتے ہیں وہ اس سے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی برکتیں حاصل کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ذہنی نجاست سے پاک نہیں ہوتے وہ ہر قسم کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں۔

○ اگر کوئی شخص یہ چیز ذہن میں لے کر آئے کہ قرآنی آیات مجیدہ کے ورد سے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں تو اس کے کام تو اسی طرح بگڑے رہیں گے جس طرح کرہ ارض کی مسلم ریاستوں کے کام بگڑے اور الجھے ہوئے ہیں۔ مگر وہ قرآن مجید میں سے یہی چیز اخذ کرے گا کہ قرآن مجید کی آیات مبارکہ کی محض تلاوت ہی ہر کام کے سدھارنے اور ہر الجھن کے دور کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس کے برعکس اگر ذہن کو پاک کرکے **مطھرون** میں شامل ہو کر آئے اور قرآن سے یہ پوچھے کہ فلاں مشکل کا حل کیا ہے اور فلاں الجھن کا بے خطا نسخہ کونسا ہے۔ تو قرآن مجید اسے پہلے ہی نمبر پر یہ کہے گا کہ محض تلاوت آیات سے نہ مشکلیں حل ہوتی ہیں نہ الجھنیں دور ہو سکتی ہیں' بلکہ اجر عمل کا ملتا ہے' زبان سے الفاظ دہراتے چلے جانے کا نہیں : **نعم اجر العالمین ۳/۱۳۶**

○ پھر قرآن مجید صاف اور پاکیزہ ذہن والوں کو یہ کہے گا کہ تم الفاظ کا ورد کرنے کے لئے پیدا نہیں کئے گئے بلکہ یہ بھری کائنات تم سب کے لئے پیدا کرکے اس کی ایک ایک چیز کو تمہارے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے۔ و سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا" منہ ۴۵/۱۳ اور اے نوع انسانی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے' اللہ نے وہ سب کا سب تم سب کے سب کے تابع تسخیر کر دیا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن کریم کا مطہر قاری ارض و سماوات کے مخفی خزانوں اور اللہ تعالی کی پیدا کردہ مہیب ترین قوتوں کو لگام دے کر تابع تسخیر کرنا شروع کر دے گا۔ اس کے برعکس وہ شخص جو ذہن میں گوشہ نشینی اور اللہ تعالی کے ناموں کا جاپ لے کر جائے گا وہ قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتا رہے گا۔ اس کے معنے اور مفہوم میں تفقہ بھی کرے گا مگر رہے گا وہ وہیں کا وہیں۔ تسخیر کائنات کی بجائے حجرہ میں بیٹھ کر اسماء الہی کے ورد ہی میں مشغول رہے گا۔

○ اگلی آیت مجیدہ کو سامنے لانے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اوپر والی آیات کریمات میں بتایا گیا ہے کہ جب کوئی سورت جنگ جہاد کے متعلق نازل ہوتی تھی تو منافق اسے برا مانتے تھے حالانکہ ادھر کافروں کی یہ حالت تھی کہ وہ ہر سال میں ایک یا دو مرتبہ ضرور مدینہ منورہ پر حملہ کرتے تھے تو ایسے حالات میں جنگ جہاد سے جی چرانا اور اپنے وفاع سے لاپرواہی کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۲۶﴾ ۱۲۶

کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا (کیا غور نہیں کیا) کہ بلا شبہ وہ ہر ایک سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ فتنے میں ڈالے جاتے ہیں (حملہ کئے جاتے ہیں) پھر بھی وہ اپنے (لڑائی سے فرار کے) نظریہ سے رجوع نہیں کرتے اور نہ ہی وہ (آیات قرآنیہ سے) نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

جنگی تیاری کیوں ضروری ہے؟ ○ اس آیت مجیدہ میں کفار مکہ کی ذہنی خباثت کی خبر دی گئی ہے کہ وہ ہر سال میں ایک یا دو مرتبہ مدینہ منورہ پر جارحانہ حملہ کیا کرتے تھے۔ کیوں؟ کیا نبی اکرمؐ نے ان کا کچھ بگاڑا تھا؟ کیا آپؐ کے ساتھی ان کا کچھ چرا کر لے آئے تھے۔ نہیں ہرگز نہیں آپؐ کی ہجرت مبارکہ سے نہ ان کا کچھ بگڑا تھا اور نہ آپ کے ساتھی ان کا کچھ

چرا لائے تھے۔ بلکہ وہ تو اپنے مکان' دکانیں اور رخت و جنس سب کچھ کافروں کے لئے چھوڑ کر ہجرت فرما ہوئے تھے۔ کفار مکہ کو نبی اکرمؐ کی ذات سے کوئی عداوت نہیں تھی۔ بلکہ انھیں عداوت و مخالفت تھی اس قرآنی نظام کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ پر نازل فرمایا تھا اور آپؐ اسے انسانی معاشرہ میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔

○ قرآنی نظام کی زد پڑتی ہے سرمایہ داروں پر' مشائخ عظام پر اور علماء کرام پر' اگر قرآنی نظام یا آج کی اصطلاح میں نظام مصطفیٰ کا صحیح نفاذ ہو جاتا تو نہ سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ باقی رہتی تھی اور نہ مشائخ عظام کی مافوق الانسان تصوراتی برتری قائم رہتی تھی۔ سرمایہ داروں کو مناسب اور جائز منافع پر تجارت کرنی پڑتی تھی اور مشائخ عظام کو بھی خانقاہی بلندیوں سے عام انسانی سطح پر اتر آنا پڑتا۔ اور یہی حال ہوتا علماء کرام کا جنہیں محض حکام اور اصحاب زر کی خوشنودی کے لئے دین اللہ کا حلیہ بگاڑنے کی اجازت نہ ملتی۔ اس لئے ان تینوں گروہوں نے اپنے اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے نبی اکرمؐ کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ پہلے تو جب تک نبی اکرمؐ مکہ معظمہ میں مقیم رہے اس وقت تک آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے لئے مکہ معظمہ میں رہنا مشکل بنا دیا۔ اس لئے مجبوراً" نبی اکرمؐ کو اپنا وطن مالوف چھوڑنا پڑا۔ لیکن جب آپؐ مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے تو اس خوف سے کہ اگر قرآنی نظام مدینہ منورہ میں نافذ ہو گیا تو اس کے اثرات سے مکہ معظمہ کا محفوظ رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ نا ممکن ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے پہلے ہی سال حملہ کر دیا۔ تاکہ یہ کمزور و ناتواں نوخیز پودا مدینہ منورہ میں بھی جڑ نہ پکڑ سکے۔ اور اسے بآسانی اکھاڑ کر الگ پھینک دیا جائے مگر ہوا یہ کہ نبی اکرمؐ نے پہلی مرتبہ ہی بدر کے مقام پر کفار مکہ کے ساتھ ایسی مدافعانہ جنگ فرمائی اور دشمنوں کو ایسی تاریخی شکست دی جس کی مثال ممکن نہیں۔

○ آیت بالا ۹/۱۲۶ زیر بحث میں بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد کافروں کی آتش غیض و غضب اس قدر بھڑک اٹھی کہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ مدینہ منورہ پر جارحانہ چڑھائی کر کے عظیم لاؤ لشکر کے ساتھ حملہ کر دیتے تھے۔ تو اس سورت میں منافقوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ' تم جنگ جہاد کے احکام کو برا مانتے ہو حالانکہ دشمن سال میں ایک یا دو مرتبہ جارحانہ جنگ کر کے مدافعت پر مجبور کر دیتا ہے۔ پس اس کا حل یہی ہو سکتا تھا کہ اہل مدینہ ہر آن تیار رہیں۔ اور جب بھی اور جس وقت بھی دشمن حملہ کرے اہل اسلام کو ان کے دانت توڑنے کے لئے ہر آن تیار پائے۔ اسی چیز کی تاکید آیت نمبر ۱۲۴ کے الفاظ ذیل میں گزر چکی ہے **ولیجد و فیکم غلظه** (ایمان والو)لازم ہے کہ حملہ آور کافر ہربار تمہارے اندر نئی سے نئی مدافعانہ سختی میں شدت پاتے رہیں۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں منافقوں کے متعلق مزید بتایا گیا ہے کہ جب جنگ جہاد سے متعلقہ کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان کی حالت یہ ہوجاتی ہے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْاؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ ۹ ○ ۱۲۷

اور جب بھی کوئی سورت جنگ جہاد سے متعلق نازل ہوتی ہے تو منافقوں کے بعض' بعض کی طرف نظر کرتے (ایک دوسرے کو) دیکھتے ہیں۔ اے منافقو کیا تمہیں کوئی ایک (مومن بھی اس طرح) دیکھتا ہے۔ پھر وہ (قرآنی ہدایت سے) پھر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اذہان کو پھرا ہوا پاتا ہے۔ اس سبب سے کہ وہ لوگ ایسے ہیں جو تفقہ (غوروفکر) نہیں کرتے۔

○ **نظر بعضهم الی بعض** کے الفاظ میں جنگ جہاد کے احکام سے منافقوں کی حواس باختگی کی خبر دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں' گویا کہ وہ نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو کہہ رہے ہوتے ہیں کہ دیکھ لو آئے دن جنگ و جدال ہی سے متعلقہ احکام و ہدایات نازل ہوتی رہتی ہیں۔ واضح رہے کہ سورۃ انفال اور سورۃ توبہ دونوں سورتیں مکمل جنگ جہاد ہی کے احکام و ہدایات سے معمور ہیں۔ ان احکام سے منافق بالکل گھبرا کر رہ گئے تھے۔

○ سورۃ احزاب میں منافقوں کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ جب دشمنوں کے حملے کا خطرہ محسوس کرتے تو ان کی آنکھوں کے ڈیلے آنکھوں کے اندر گردش کرنے لگتے ہیں اور جب خوف رفع ہو جاتا ہے تو ان کی زبانیں قینچی کی طرح چلتی ہیں۔ **فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ کَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ ج فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْکُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَی الْخَیْرِ ط اُولٰٓئِکَ لَمْ یُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ وَکَانَ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا** ۳۳/۱۹

پس جب جنگ کا خوف آتا ہے تو(اے رسولؐ) آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف (ٹکٹکی لگائے) دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں اس شخص کی طرح گھومتی ہیں جس پر موت طاری ہو رہی ہو۔ پھر جب مومن فتح یاب ہو جائیں اور خوف جاتا رہے تو (اے مومنو!) وہ تمہیں تیز زبانی کے ساتھ (تقسیم غنیمت میں) طعنے دیتے ہیں وہ مال کے لالچی ہیں۔ وہ ایسے ہی لوگ ہیں کہ وہ (حقیقی طور پر) ایمان نہیں لائے (منافقین ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ پر آسان ہے (کیوں کہ وہ ذہنوں کی **مخفیات** تک سے واقف ہے' خوب جانتا ہے کہ ان کے تمام اعمال محض مال حاصل کرنے کے لئے منافقانہ تھے)

○ **صرف اللّٰه قلوبهم** کا معنی عام تراجم میں یہ لیا گیا ہے کہ گمراہی کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کے دل پھیر دیئے۔ یہ ترجمہ بوجوہ غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر منافقوں کے ذہن ہدایت کی طرف سے خود اللہ تعالیٰ نے پھیر دیئے ہوں تو پھر گمراہی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر وارد ہوتی ہے اور منافق بری ہو جاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہدایت و گمراہی کے ضمن میں کسی بھی قسم کا کوئی جبر روا نہیں رکھا بلکہ کھل کر اعلان کر دیا گیا ہے **لا اکراه فی الدین** ۲/۲۵۶ نیز ارشاد ہوا ہے **وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ** ۱۸/۲۹ اور (اے رسولؐ) کہہ دیا کیجئے گا کہ حق (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے (نازل) ہوا ہے۔ پس جو کوئی خود چاہے اس پر ایمان لائے اور جو خود چاہے انکار کر دے۔ اسی طرح سورۃ یونس میں ارشاد ہوا ہے:

○ **قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ ج فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا** ۱۰/۱۰۸ اے رسول! کہہ دیجئے گا کہ بلاشبہ حق(قرآن) تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے پھر جو کوئی (اس حق قرآن کے ساتھ) خود ہدایت پائے وہ خود ہدایت پائے گا اپنی جان کے لئے۔ اور جو کوئی خود گمراہ ہو گیا تو اس کے خود گمراہ ہونے کا وبال اس کی اپنی جان پر ہو گا۔

○ یہ اور اسی قسم کی محکم آیات کریمات میں ذات باری نے وضاحتاً" اعلان کر رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے اپنی طرف سے الحق' قرآن مجید نازل کر دیا ہوا ہے۔ پس اس ہدایت مجسم سے جو کوئی ہدایت پاتا ہے خود پاتا

ہے' اپنے ذہن کو اس کے لئے خود فارغ کر کے اسے خود اس کی طرف پھیرتا اور خود راہ الحق پاتا ہے اور جو کوئی خالی الذہن نہیں ہوتا وہ اللہ کی عطا کردہ ہدایت کی طرف خود نہیں پھرتا اور ۱۰/۱۰۸ کے خط کشیدہ جملہ پر غور فرمائیں۔ **ومن ضل فانما یضل علیھا** میں اعلان کیا گیا ہے کہ جو کوئی خود گمراہ ہو جائے تو اس کی گمراہی کا وبال خود اس کی اپنی جان پر ہوگا۔ اب اس اعلان الٰہی کے مطابق آیت مجیدہ ۹/۱۲۷ کے الفاظ **صرف اللہ قلوبھم** کے روایتی ترجمے پر غور فرمائیں کہ اگر اس کے اذہان گمراہی کی طرف اللہ پھیر دیتا ہے تو کیا تقاضائے انصاف یہی ہے کہ گمراہی کی طرف دل تو پھیرے اللہ اور اس کا وبال پڑے بندے پر؟ العیاذ باللہ!

○ واضح رہے کہ **صرف اللہ قلوبھم** میں **صرف** فعل ماضی ثلاثی مجرد سے ہے ۔ اہل قواعد کی سہو ہے کہ انہوں نے ثلاثی افعال کا خاصہ وجدان تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ بعض مقامات پر آثار و شواہد کے مطابق افعال ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان بصورت نصف النہار عیاں ہوتا ہے مثلاً" سورۃ **یٰسین** میں گمراہوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے :۔

○ **وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ** ۳۶/۹ اس آیت مجیدہ کے **جعلنا** فعل ثلاثی کا خاصہ وجدان تسلیم کرنا آثار و شواہد کی رو سے لازم ہے۔ ورنہ مروجہ تراجم میں اس کا یہ ترجمہ درج ہے ۔ اور ہم نے ان کے آگے کی طرف دیوار کھینچ دی ہے اور ان کے پیچھے کی طرف دیوار کھینچ دی ہے۔ پھر ہم نے انہیں اوپر سے ڈھانپ دیا ہے پس وہ نہیں دیکھتے"۔

○ اس ترجمہ کی رو سے غور طلب یہ امر ہے کہ جس کے آگے اور پیچھے دیواریں کھینچ دی جائیں اور اسے اوپر سے ڈھانپ دیا جائے وہ دیکھے گا خاک؟ مروجہ تراجم کی رو سے ان کے آگے پیچھے دیواریں کھینچ کر اور انہیں اوپر سے ڈھانپ کر راہ ہدایت کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ محروم کر دیتا ہے چونکہ اس تصور سے شان باری مجروح ہوتی ہے اس لئے یہ ترجمہ یکسر غلط ہے اور **جعلنا** فعل ثلاثی کے خاصہ وجدان کے مطابق آیت مجیدہ ۳۶/۹ کا صحیح ترجمہ جس سے ناموس باری محفوظ رہتی ہے یہ ہے اور ہم نے ان کے آگے کی طرف (عدم تدبر) کی دیوار کھینچی ہوئی پائی اور ان کے پیچھے بھی (عدم تدبر) کی دیوار کھینچی ہوئی پائی ہے اور انہیں اوپر سے عدم تدبر کے پردوں سے ڈھکا ہوا پایا ہے اس لئے وہ راہ ہدایت کو نہیں دیکھتے۔ پس اسی طرح آیت زیر بحث ۹/۱۲۷ کے جملہ **صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ** کا صحیح ترجمہ یہ ہے' اللہ نے ان کے ذہن (قرآن سے) پھرے ہوئے پائے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو قرآن پر غور و فکر کرتے ہی نہیں۔

○ چونکہ سورۃ انفال اور سورۃ توبہ دونوں میں مسلسل جنگ جہاد کے احکام و مسائل نازل فرمائے گئے ہیں اور جنگ وہ چیز ہے جس میں لازماً" دشمن کا خون بہایا جاتا ہے بالفاظ دیگر نوع انسانی شمشیر بکف ہو کر نوع انسانی کی گردنیں کاٹ رہی ہوتی ہے۔ یہ منظر بظاہر انسانیت سے سو فیصد متصادم دکھائی دیتا ہے۔ نیز یہ ابتدائی جنگیں خاتم النبی رحمتہ اللعالمینؐ کی زیر قیادت اور آپ ہی کی سپہ سالاری میں لڑی گئی تھیں۔ اس لئے مخالف لوگ نبی اکرمؐ کے متعلق ایک خونریز انسان ہونے کا اعتراض کر سکتے ہیں اس لئے باری تعالیٰ نے سورۃ انفال و توبہ کی آخری دو آیات کریمات میں ایک مخصوص اور اہم اعلان کر دیا ہے کہ لوگو! تمہارے پاس تمہیں میں سے ہمارا رسول آیا ہے جو بلا تمیز مومن کافر سب کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔ اس پر تمہاری بدحالیاں بلا تمیز مومن کافر گراں گزرتی ہیں۔ وہ تم سب کے مصائب پر ہمیشہ بے قرار رہتا ہے۔ کانٹا تمہیں چبھتا ہے اور درد

اسے ہوتی ہے۔ وہ انسانی خون بہانے کا حامی نہیں۔ جو مدافعانہ جنگیں اسے لڑنی پڑیں' ان میں مجبوراً" حصہ لینا پڑا ہے۔ کیونکہ دشمن ایک ہی سال میں ایک یا دو مرتبہ لاؤ لشکر لے کر چڑھ دوڑتا اور ہمارے رسولؐ پر جارحانہ جنگ ٹھونس دیتا ہے ۹/۱۲۶ اس لئے ہم نے اپنی نوع انسانی کے کمزور افراد کے بچاؤ لئے مدافعانہ جنگ کی اجازت عطا فرمائی ہے ۲۲/۳۹ ورنہ ہمارا رسول تو انتہائی گداز ذہن کا مالک ہے جو بلا تمیز کافر و مومن پوری نوع انسانی کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے۔ اگلی آیت مبارکہ میں اسی اہم چیز کو اجاگر کیا گیا ہے۔

○ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾

(اے نوع انسانی) تمہارے پاس تمہاری اپنی ہی جانوں میں سے ہمارا رسول آیا ہے۔ اس پر تمہاری بدحالیاں گراں گزرتی ہیں۔ وہ بلا تمیز تم سب کی بھلائی کے لئے حریص ہے (خصوصاً" مومنوں پر شفقت کرنے والا مہربان ہے)۔

○ یہاں پوری نوع انسانی کے نام خطاب کے الفاظ محذوف ہیں۔

جس کی واضح دلیل اسی آیت مجیدہ کے الفاظ میں موجود ہے کہ **عزیز' علیہ' عنتم' حریص علیکم** کا تعلق پوری نوع انسانی کے ساتھ ہے۔ جس میں کافر اور مخالف تک سب شامل ہیں مگر آیت مجیدہ کے آخری الفاظ میں پوری نوع انسانی میں سے مومنوں کو مستثنیٰ کر کے ان کے متعلق بتایا گیا ہے۔ **بالمومنین رئوف رحیم** یعنی وہ پوری نوع انسانی کا مونس و غمخوار جس پر پوری نوع انسانی کی بدحالیاں گراں گزرتی ہیں وہ ان مومنین پر جو اس کے مشن میں اس کے ہمرکاب ہو چکے ہیں خصوصی شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

نبی اکرمؐ پوری قوم کے جانے پہچانے ہوئے تھے

○ **جائکم الرسول من انفسکم** کے الفاظ میں باری تعالٰی نے ایک ایسی حقیقت کا اظہار کر کے شان رسالت اور نبی اکرمؐ کے بے لوث عظیم کردار کا اعلان فرمایا ہے جس سے نبی اکرمؐ کی پوری کی پوری قوم کو مجال انکار نہیں تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ لوگو تمہارے پاس تمہیں میں سے رسولؐ آیا ہے۔ یہ تمہارے اندر پیدا ہوا' تمہارے اندر بڑھا' جوان ہوا' اس کا بچپن اور جوانی سب تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یعنی تمہارا جانا پہچانا فرد ہے۔ کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تم اسے جانتے نہ ہو۔ یہ وہی تو ہے جو شبانہ روز تمہارے دکھ سکھ میں تمہارا ساتھی رہا ہے تم غور کر کے دیکھ سکتے ہو کہ :۔

○ کیا اس کی قبل نبوت کی پوری کی پوری زندگی ایک سفید چادر کی طرح بے داغ نہیں ہے ؟

○ کیا اس نے کبھی جھوٹ بولا؟

○ کیا اس نے ذاتی مفاد کی طرف لپک کر اسے انسانی مفاد پر ترجیح دی ہے؟

○ کیا اس نے کبھی تمہاری امانتوں میں خیانت کی ہے؟

○ کیا یہ وہی نہیں جسے تم سب نے متفقہ طور پر خود صادق و امین کا خطاب دے رکھا ہے؟

○ جب حقیقت حال تمہارے سامنے ہے تو تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے۔ اور کیوں اسے جنگ و جدال کا حامی قرار دے کر اس کی کردار کشی کے مرتکب ہوتے ہو۔ ہمارا رسولؐ خونریزی کے صد فیصد خلاف ہے مگر جب وہی دشمن جنہوں نے ہمارے رسولؐ کو اس کے لئے عرصہ حیات تنگ کر کے وطن مالوف سے نکال دینے کے بعد پھر ہر سال ایک یا دو مرتبہ جارحانہ

حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا تو ایسے حالات میں کمزوروں' بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے مدافعانہ جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رحمت مجسم شمشیر بکف میدان جہاد میں اتر آئے حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کا یہ عمل بھی رحمت ہی کا ایک حصہ ہے' جس کے متعلق باری تعالیٰ نے سورۃ انفال اور توبہ میں بالصراحت احکام و مسائل بھی نازل کر دیئے۔ اور منافقوں کے نشانات بھی کھل کر بیان کر دئے ہیں۔ بعض روایات کا یہ کہنا کہ زمانہ نبوت میں منافق کھل کر سامنے نہیں آئے تھے غلط ہے اسی سورۃ توبہ کی پچھلی آیت نمبر۱۲۶ میں جو نشان بتا دیا گیا ہے کہ جب جنگ جہاد کے متعلق کوئی سورت نازل ہوتی تو منافق ایک دوسرے کو بٹ بٹ دیکھنے لگتے۔ کیا وہ چھپے ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں۔ نبی اکرمؐ کے ذریعہ منافقوں کے نشانات کا کھل کر بیان کردینا کیا یہ بھی رحمت اللعالمین کی رحمت کا حصہ نہیں؟ ضرور ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی سلطنت اس وقت تک صحیح خطوط پر چل ہی نہیں سکتی' جب تک کہ اسے منافقوں سے پاک نہ کر لیا جائے یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ کے نام دو مرتبہ کے تکرار تاکیدی کے ساتھ یہ حکم جاری کیا گیا تھا۔

○ **يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ** ۹/۷۳+ ۶۶/۹ اے نبیؐ! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جنگ جہاد کریں اور ان پر پوری پوری سختی فرمائیں۔ منافق لوگ آستین کے سانپ ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سانپوں پر سختی کر کے ان کا سر کچلنا انسانی زندگی کے امن و سکون کے لئے انتہائی لازمی امر ہے۔

پوری نوع انسانی کی بدحالیاں بلاتمیز کافر و مومن نبی اکرمؐ پر گراں گزرتی تھیں

○ **عزیز علیه ما عنتم** کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں۔ جن میں **ما عنتم** میں جمع کا صیغہ لا کر ان میں بلاتمیز کافر و مومن پوری نوع انسانی کو شامل کر لیا گیا ہے۔ ہمارا رسول اس قدر گداز ذہن کا مالک ہے کہ اس پر تم سب کے وہ گوناگوں مصائب جن میں تم الگ الگ پھنسے ہوئے ہو گراں گراں گزرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کانٹا تمہیں چبھتا ہے اور درد سے بیقرار یہ ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نبی اکرمؐ نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ کہیں اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز موجود ہے کہیں آقا اور لونڈی غلام کی انسانیت کش تفریق وجہ تذلیل انسانیت بنی ہوئی ہے۔ کہیں جاگیردار و مضارع اور سرمایہ دار و مزدور کا امتیاز مضارعوں اور مزدوروں کو ظلم کی چکی میں پیس رہا ہے۔ حتیٰ کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا عربوں کا مبنی بر فخر عمل قرار پا چکا تھا۔

○ اس کے علاوہ برہمنیت و مشخیت نے بندوں ہی کو بندوں کا اللہ بنا کر رکھ دیا ہوا تھا۔ اپنے اپنے بزرگوں کے بت لات و منات اور عزیٰ اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کر ان سے مرادیں مانگنا ان کا دائمی شعار تھا۔ بالفاظ دیگر جن لوگوں میں نبی اکرمؐ نے شعور کی آنکھ کھولی ان کی اکثریت اقتصادی لحاظ سے بھی بدحال تھی اور احترام آدمیت کے لحاظ سے بھی مقام آدمیت سے گر چکی تھی۔ اپنے ہی جیسے مردہ انسانوں کے مجسموں کے حضور سجدے کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ تو اس طرح جب آپؐ نے قوم کو مالی اور اخلاقی ہر لحاظ کی گوناگون بدحالیوں میں مبتلا پایا تو سیماب دار بے قرار ہو گئے۔

غربا پر سارا مال خرچ کر دیا

○ اسی بے قراری کا عملی ثبوت یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی اہلیہ ام المومنین سیدہ خدیجہؓ ایک انتہائی مال دار خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی بے پناہ دولت نبی اکرمؐ کے قدموں میں ڈال دی اور اسی رحمت مجسم نے وہ سارے کا سارا مال ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جن کی گوناگون جائز ضروریات رکی پڑی تھیں۔ آپؐ نے بھوکوں کو کھانا دیا'

ننگوں کو کپڑے دیئے' بیماروں کو علاج اور بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنے پر اس بے پناہ دولت کی آخری پائی تک خرچ کر دی۔ واضح رہے کہ آیت مجیدہ زیر نظر میں نبی اکرمؐ کے مکارم اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے **عزیز علیہ ما عنتم** کے بعد آیا ہے۔

حریص علیکم ○ نبی اکرمؐ پوری نوع انسانی کی ہمہ جہتی بھلائی کے لئے حریص تھے۔ بالفاظ دیگر نوع انسانی کی بدحالیاں آپ کے لئے انتہائی شاق تھیں۔ اس کے برعکس آپؐ چاہتے یہ تھے کہ کائنات بھر کی بھلائیاں اکٹھی کر کے نوع انسانی کی جھولی میں ڈال دیں۔ اس محسن انسانیت پر لاکھوں کروڑوں سلام' جس نے اپنی پوری زندگی انسانی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر کے نوع آدم کو شرف آدمیت سے ہمکنار فرمایا۔ عطاء نبوت کے بعد تیرہ سالوں میں آپؐ نے ہر وہ مصیبت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کی جس کا تصور بھی وجہ اضطراب بن سکتا ہے۔

○ اور نبوت کی زندگی کے آخری دس سالوں میں یعنی ہجرت مدینہ منورہ کے بعد جب حالات معمولی سے سازگار ہوئے تو قرآنی معاشرہ کی بنیاد ڈال دی۔ ان دس برسوں میں کفار مکہ سے درجنوں بار بنفس نفیس میدان جنگ میں شریک ہو کر ظلم کی کلائی مروڑنے کا شرف عظیم حاصل فرمایا۔ اور بالآخر متوازن قرآنی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب و کامران ہو گئے۔ دشمن کی طاقت کا آخری شمہ تک ختم ہوگیا۔ لیکن قربان جایئے اس محسن انسانیت پر کہ وہ آخری عظیم الشان فتح بھی آگئی جس کی خبر ذات باری نے بالفاظ ذیل دی ہے۔

○ **اذا جاء نصر اللہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا**" ۱۱۰/۲-۱ جب اللہ کی مدد اور فتح آگئی تو (اے رسولؐ) آپ دیکھیں گے کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوں گے۔ مگر اس کے باوجود۔

نہ تخت نشینی نہ جشن تاجپوشی ○ نبی اکرمؐ نے نہ شاہان عالم کی طرح تخت نشینی کا جشن منعقد فرمایا' نہ تاجپوشی کا اعلان بلکہ ہوا یہ کہ آپؐ قرآنی ریاست کے اولین صدر' سربراہ ہو کر صد فیصد عوامی زندگی گزار کر نوع انسانی کے لئے وہ مثال قائم فرماگئے جو چشم فلک نے آپؐ سے پہلے صرف انبیاء سلام علیہ کی زندگیوں میں دیکھی تھی۔ اور آپؐ کے بعد صرف خلفائے راشدین کی زندگیوں میں ملاحظہ کی۔

نبی اکرمؐ نے بطور ترکہ اپنے پیچھے کیا چھوڑا ○ اس سلسلے کا آخری سوال یہ ہے کہ جب نبی اکرمؐ نے صدر و سربراہ مملکت کی حالت میں وفات پائی تو آپؐ نے کتنی نقدی یعنی کتنا بنک بیلنس' کتنے مربع زمین' کتنے مکان' کتنی دکانیں اور کتنا سونا چاندی بطور ترکہ اپنے پیچھے چھوڑا؟ انسانی زندگی کے اس گوشے میں بھی نبی اکرمؐ کا کردار صد فیصد پاک و منزہ تھا۔ نہ آپؐ نے کوئی نقدی چھوڑی نہ زمین نہ ضرورت سے زائد کوئی مکان چھوڑا نہ دکانیں نہ گودام۔ آپؐ کا پورے کا پورا اثاثہ صد فیصد عوامی زندگی تھی جو پوری نوع انسانی کے لئے بطور سربراہ مملکت ایک ایسی مثال ہے جو چشم فلک نے آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء راشدین کے سوا نہ دیکھی ہوگی۔

امن عالم کا صد فیصد عملی مجرب نسخہ ○ نبی اکرمؐ کی عوامی زندگی کی عملی صورت یہ تھی کہ نہ آپؐ کا کوئی کوٹھی' بنگلہ یا سربفلک محل تھا' بلکہ جس قسم کے عوامی مکانات میں عوام رہتے تھے اسی قسم کا ایک مکان نبی اکرمؐ کی رہائش

گاہ تھی۔

○ ۲ اور اسی طرح دوسرے نمبر پر نبی اکرمؐ یعنی قرآنی ریاست کے اولین صدر و سربراہ کا لباس بھی عوامی لباس سے مختلف نہ تھا۔ بلکہ جس قسم کے ملبوسات سے عوام تن پوشی کرتے تھے بالکل اسی قسم کا لباس نبی اکرمؐ کے زیب تن ہوا کرتا تھا۔

○ ۳ تیسرے نمبر پر باری آتی ہے خوراک کی بنیاد ضروریات زندگی کے اس گوشے میں بھی قرآنی سلطنت خدا داد کے صدر و سربراہ ایک عام شہری کی حیثیت رکھتے تھے۔ نہ آپؐ کے دسترخوان پر رنگا رنگ ناشتہ چنا جاتا تھا نہ پر تکلف نہار اور نہ عشائیہ بلکہ جس قسم کی غذا عوام کو میسر آتی تھی اسی قسم کا کھانا نبی اکرمؐ استعمال فرماتے تھے۔

○ ۴ چوتھے نمبر پر باری آتی ہے آرائشی تکلفات اور بیگمات کے زیورات کی۔ یہ چیز نبی اکرمؐ کی زندگی میں نام تک کو بھی موجود نہیں تھی' بالفاظ دیگر زندگی کے ہر گوشے میں نبی اکرمؐ نے وہ نمونہ پیش فرمایا کہ آپؐ کو پہچاننے کے لئے عوام سے الگ کوئی تمیزی نشان موجود ہی نہ تھا باہر سے آنے والے وفود کو پوچھنا پڑتا تھا کہ مسلمانو! تمہارا صدر مملکت کون ہے؟

○ بس یہی ہے امن عالم کا مجرب ترین عملی نسخہ جس پر عمل کرکے صدر مملکت اور اس کے تمام تر عمال و اراکین اگر عوامی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں تو نہ اونچ نیچ کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ نہ **ادنٰی و اعلٰی** کا جنم خیز تصور ابھر کر معاشرہ میں فساد کا موجب بنتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سلام اس محسن انسانیت پر جس نے قیامت تک کی انسانیت کے لئے امن عالم کا وہ عملی نسخہ پیش فرمایا کہ جس کی نامکمل سی چرائی ہوئی صورت پر اگر چین کا ماؤ عمل شروع کردے تو ۷۵ کروڑ انسانوں میں امن قائم ہوجاتا ہے۔ اور اگر ویت نام یا کوریا کے سربراہ اسے عملی جامہ پہنا دیں تو امریکہ جیسی چوٹی کی عالمی طاقت کو شکست فاش بھی دیدیں اور داخلی طور پر بھی ملک امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے۔ مگر اس کے برعکس اگر کوئی صرف سات کروڑ کی آبادی والا ملک امن عالم کے مذکورہ بالا رسولی نسخہ کو پس پشت پھینک کر صدر مملکت اور اس کے عمال و اراکین عوام سے الگ عیش کی زندگی اختیار کرتے ہیں تو اس قلیل تر آبادی کے ملک میں بھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔

مومنوں پر خصوصی شفقت ○ ۴ **بالمؤمنین رؤف رحیم** کے الفاظ نے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کر رکھی ہے کہ نبی اکرمؐ کے کردار **عزیز علیہ ما عنتم** کا تعلق پوری نوع انسانی کے ساتھ بلا تمیز مومن کافر مساویانہ تھا۔ کیونکہ **بالمؤمنین رؤف رحیم** کے جملہ میں مومنوں کے ساتھ خصوصی شفقت بطور **استثنٰی** بیان کی گئی ہے۔ سورۃ نجم میں پوری نوع انسانی کے ساتھ آپؐ کا سلوک بتایا گیا ہے۔

○**وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى** ۵۳/۲-۱ اور (اے نوع انسانی) ستارہ ہدایت قرآن مجید کی شہادت ہے جب وہ نازل ہوا (کیوں کہ اس میں نہ کوئی قانون بھکا ہوا ہے اور نہ غلط راستے کی طرف لے جانے والا ہے اس لئے) تمہارے دکھ سکھ کا ساتھی محمدؐ **صاحبکم** نہ بھٹک گیا ہے اور نہ غلط راہ چل گیا ہے۔ دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو پوری نوع انسانی کا صاحب ساتھی بتایا گیا ہے۔ اور اسی چیز کو سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۱۲۷ زیر نظر میں **عزیز علیہ ما عنتم** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اے نوع انسانی ہمارے رسولؐ تمہارے دکھ سکھ کے ساتھی کی حالت یہ ہے کہ اس پر تمہاری بدحالیاں گراں گزرتی ہیں۔ **حریص علیکم** وہ تمہاری بھلائی کا حریص ہے۔ چاہتا ہے کہ کائنات بھر کی نعمتیں تمہاری جھولی میں ڈال دے۔ مگر چونکہ بدحالیوں سے رہائی اور بھلائیوں کا حصول صرف ہمارے قانون کے مطابق میسر آتا ہے

اس لئے اس نے تمہیں ہمارے قانون کی راہ پر ڈال کر تمہاری صحیح راہنمائی فرما دی ہے۔

○ مومنوں پر خصوصی شفقت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسانی حقوق مساوات میں مومنوں کو کافروں کے مقابلے پر کوئی الگ مخصوص مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ کاروبار مملکت میں نبی اکرمؐ کے شریک کار بنتے تھے' آپ کے راز دار اور آپ کے بعد انہیں نبی اکرمؐ کے قرآنی مشن کو آگے بڑھانے کے مواقع میسر آئے تھے ۔ اس کے علاوہ جہاں تک بنیادی انسانی حقوق اور انسانی بنیادی ضروریات زندگی کا تعلق ہے۔ اسلامی اور قرآنی ریاست میں یہ جملہ حقوق جس طرح مومنوں کے مسلم مانے گئے ہیں اسی طرح کافروں کے بھی من و عن مسلم قرار دئے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے قانون پر بھروسہ کرنا ہی کلید کامیابی ہے ○ اگلی آیت مجیدہ ۱۲۹/توبہ میں نبی اکرمؐ کی تسلی و تشفی کے لئے ذیل کے انتہائی ہمت افزاء' سکون آمیز' اور اطمینان بخش الفاظ نازل کئے گئے ہیں۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾

پھر اے رسول (منافق) اگر اعراض کریں آپ کے پیغام کو تسلیم نہ کریں تو آپ کہہ دیجئے گا کہ میرے لئے میرا اللہ کافی ہے اور میرے تابع مومن کافی ہیں ۸/۶۴ اس (اللہ) کے سوا فرمانبرداری کے لائق کوئی نہیں میں نے اسی پر اس کے نازل کردہ قانون پر بھروسہ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ عظیم سلطنت کا رب روزی رساں ہے۔

صحابہؓ رسول نے نبی اکرمؐ سے کبھی اعراض نہیں کیا ○ **فان تولو** سے بعض لوگ صحابہؓ کرام کا اعراض کرنا مراد لیتے ہیں۔ یہ مطلقاً غلط ہے۔ کیوں کہ قرآن کریم صحابہؓ رسولؐ کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے وہ مقدس ہستیاں ایسی پاک باز اور نبی اکرمؐ کے ایسے جاں نثار تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ انفال میں انہیں بھی اپنی کفائت میں شامل کر رکھا ہے۔

نبی اکرمؐ کے لئے اللہ تعالیٰ اور آپؐ کے تابع مومن کافی تھے ○ **حسبی اللہ** کا لفظی معنی ہے میرے لئے اللہ کافی ہے ۔ لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ کی کفایت اسباب و علل کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لئے سورۃ انفال ۸/۶۰ میں دشمنوں کے مقابلے کے لئے استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت تیار کرنے کا حکم دینے کے بعد ۸/۶۴ میں ارشاد ہوا ہے۔

○ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۸/۶۴ اے نبیؐ! آپ کے لئے اللہ ہی کافی ہے اور آپ کے تابع مومن کافی ہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی کفائت بذریعہ صحابہؓ کرام فرمائی تھی۔ اسی چیز کی وضاحت ۸/۶۲ میں بالفاظ ذیل درج ہے۔

وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ○ ۸/۶۲ اور اے رسولؐ اگر (کافر بدعہدی کر کے) آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ کریں تو (غم نہ کھایئے گا) بلاشبہ آپ کے لئے آپ کا اللہ ہی کافی ہے وہ وہی عظیم الشان ذات ہے جس نے آپ کو طاقت بخشی اپنی مدد کے ساتھ اور مومنین (صحابہؓ کی عظیم فرمانبردار جماعت) کے ساتھ واضح رہے کہ انبیاء سلام علیہم کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد کے دو ہی طریقے قرآن مجید سے ثابت ہیں۔

○ پہلا یہ کہ جن نبیوں کو صحابہ کی مضبوط اور فرمانبردار جماعت میسر آئی انہوں نے ان کی مدد سے حکومت **الٰھیہ** قائم فرمائی اور دشمنوں کی طاقت کا آخری شمہ تک میدان جہاد میں ختم کر دیا گیا۔

○ دوسرا یہ کہ جن انبیاء کو صحابہؓ کی جماعت میسر نہ آئی اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو اپنے **جنود السمٰوات والارض** آسمانی اور زمینی لشکروں' سیلاب' اندھیری' زلزلہ وغیرہ کے ذریعہ انبیاء کی آنکھوں کے سامنے ختم کر دیا اور اپنے نبیوں کو معہ ان کے ناتوان ساتھیوں کے عذاب سے بچا لیا۔ جیسے کہ قوم نوحؑ سیلاب کے ساتھ قوم عاد اندھیری کے ساتھ اور قوم ثمود زلزلہ کے ساتھ ختم کر دی گئی اور نبیوں کے کمزور ساتھیوں کو بال بال بچا لیا گیا۔

اللہ کے سوا کوئی فرمانبرداری کے لائق نہیں ○ **لا الٰہ الااللہ** کا عموماً" معنی یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ **الٰہ** کا معنی معبود' عربی کا عربی معنی ہے۔ قرآن حکیم نے معبود کا معنی حاکم سورۃ یوسف میں کھل کر واضح کر رکھا ہے۔

○ **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَه**

۴۰/۱۲۔ نہیں ہے حکم مگر صرف اللہ تعالیٰ کا اسی نے حکم دیا ہے کہ مت فرمانبرداری کرو اس کے سوا کسی اور کی۔ یہی پکا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

○ پس **الٰہ** کا معنی ہے وہ ذات مقدس جس کا حکم مانا جائے اور **لا الٰہ الا اللہ** کا معنی ہے:۔ اللہ کے سوا کوئی اور حاکم موجود ہی نہیں واضح رہے کہ اگر مذکورہ حقیقت کو ذہن نشین کر لیا جائے تو شرک فی الذات شرک فی الصفات کے علاوہ شرک فی الحکم سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا " ۱۸/۲۶ اور وہ اللہ اپنے حکم میں کسی ایک کے حکم کو بھی شریک نہیں کرتا۔ پس اس **الٰھی فیصلے** کے مطابق اس تصور سے اعراض لازم ہے کہ یہ حکم اللہ کا ہے اور یہ اس کے رسول کا ہے' اللہ کے رسول کا معنی ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم پہنچاتے تھے۔ اپنا کوئی حکم دیتے ہی نہیں تھے۔اللہ کا حکم ہی اس کے رسول کی زبان سے نکلتا تھا۔

اللہ تعالیٰ پر توکل کا صحیح مفہوم ○ **علیه توکلت** کا لفظی معنی یہ ہے کہ میں نے اس اللہ ہی پر توکل کیا ہے۔ اس میں اللہ کا قانون محذوف ہے جو زندگی کے ہر مقام پر نکھر نکھر کر خود بخود عیاں ہوتا رہتا ہے۔ اور کسی کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا۔

○ مثلاً" ایک شخص درخت کے ٹہنے پر شاخ کی طرف بیٹھا ہوا ہے اور ٹہنے کو درخت کی جانب سے یہ کہہ کر کاٹنا شروع کر دیتا ہے کہ اللہ توکل کاٹ رہا ہوں۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس ٹہنے کے کٹنے کے ساتھ ہی کاٹنے والا بھی دھڑام سے زمین پر آگرے گا تو ثابت ہوا کہ توکل علی اللہ کا یہ معنی غلط ہے کہ توکل کی بنیاد قانون الٰہی کی مخالفت پر قائم کی جائے۔ بلکہ توکل کا صحیح معنی یہ ہے کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق انجام دیا جائے۔

○ دوسری مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص جون کے مہینے میں اللہ توکل گندم کی کاشت کرتا ہے۔ اچھی زمین بناتا ہے۔ اچھا بیج ڈالتا ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ گندم کی انگوری نکلتے ہی جون کی جھلس دینے والی تمازت کی تاب نہ لا کر جل کر راکھ ہوجاتی

ہے۔ تو عملاً" ثابت ہوا کہ اس کا اللہ توکل کا نظریہ مطلقاً" غلط ہے۔ اللہ توکل کا صحیح مفہوم ہی یہ ہے کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے متعینہ قوانین کے مطابق کیا جائے۔ یعنی ذات باری کے غیر متبدل قوانین پر بھروسہ کرنا توکل علی اللہ ہے۔

○ تیسری مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص اپنی موٹر کار پر سو میل کا سفر اس حالت میں کہ اس کی کار میں صرف دس میل کے لئے پٹرول ہے اللہ توکل کہہ کر شروع کر دیتا ہے تو اسے اس کا یہ غلط توکل کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچائے گا۔ بلکہ اس کی کار دسویں میل پر جا کر رک جائے گی۔ اور اس وقت تک ایک قدم آگے نہیں بڑھے گی جب تک غیر متبدل قوانین الٰہی کے مطابق اس میں پٹرول نہ ڈالا جائے گا۔ اسی طرح اللہ توکل کا صحیح مفہوم معاشرہ میں قدم قدم پر خود بخود نکھر کر عیاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت پانی کے بغیر اللہ توکل آٹا گوندھنے بیٹھ جائے تو آٹا ہرگز نہ گندھ سکے گا۔ اگر وہ آگ کے بغیر ہنڈیا اور روٹی اللہ توکل پکانے بیٹھ جائے تو ہرگز ہرگز نہ ہنڈیا پکا سکے گی نہ روٹیاں ہم ان چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے اس اعلان عام کے ساتھ آگے بڑھنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اللہ توکل کا صحیح معنی ہے:۔ اللہ تعالیٰ کے غیر متبدل قوانین پر بھروسہ کرنا جو کبھی دھوکا نہیں دیتے۔

سورۃ توبہ کے انتہائی آخری الفاظ ربوبیت عالمینی کے علمبردار ہیں ○ وھو رب العرش العظیم

۹/۱۲۹ اس جملہ کا لفظی معنی یہ ہے:۔ وہ اللہ ہی اپنی عظیم سلطنت کا رب ہے۔ رب کا معنی ہے پرورش کے نقطہ آغاز سے شروع کر کے اس کے نقطہ انجام تک پہنچانے والا۔ اور عرش عظیم اللہ تعالیٰ کی وہ بیکراں سلطنت ہے جو ارض و سماوات کے چپہ چپہ پر جاری ہے۔ جہاں تک پرورش و ربوبیت کا تعلق ہے اس کا نقطہ آغاز اس طرح عیاں ہے کہ اس سے کسی ضدی سے ضدی اور متعصب سے متعصب آدمی کے لئے بھی مجال انکار ممکن نہیں۔ بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے کہ اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی ماں کی چھاتی پر دودھ کی دو نہریں بہا دی جاتی ہیں اور دو سال کے بعد جب یہ نہریں خشک ہونے کو ہوتی ہیں' اتنے میں بچے کو ٹھوس غذائیں چبانے کے لئے دانت عطا کر دیئے جاتے ہیں۔ ماں باپ میں بچے کی پرورش کا اتنا شدید جذبہ بھر دیا جاتا ہے کہ جب تک بچہ پیٹ بھر کر کھا نہ لے اس وقت تک وہ خود نہیں کھاتے۔ یہ جملہ مشاہدات اللہ تعالیٰ رب العزت کی شان ربوبیت کے مظہر ہیں۔ مگر افسوس کہ

○ اس سے آگے جب وہی بچہ بڑا ہو کر اقتصادی میدان میں خود قدم رکھتا ہے تو حصول سامان ربوبیت کی راہ میں اسے قدم قدم پر رکاوٹوں مشکلوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کہیں حکومت کی بد انتظامیاں آڑے آتی ہیں' کہیں بددیانت افراد سے پالا پڑتا ہے' کہیں کاروباری رقابتیں راہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور کہیں حاسدوں کی کھینچی ہوئی حسد کی دیواریں محروم ربوبیت کر دیتی ہیں۔

○ ربوبیت عالمینی کی راہ میں حائل ان سنگلاخ چٹانوں کو پاش پاش کرنے ہی کے لئے سورۃ انفال اور توبہ میں جنگی احکام و مسائل وضاحتاً" بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ ان برائیوں اور رکاوٹوں سے پاک ایسا ربوبیت بدوش معاشرہ قائم کیا جائے جس میں اللہ تعالیٰ کے عظیم دسترخوان سے کوئی فرد بشر محروم نہ رہ سکے۔ بلکہ:۔

○ ہر شخص کو ناشتہ' نہار' عصرانہ اور عشائیہ زندگی کے آخری سانس تک مسلسل ملتا رہے۔

○ کوئی شخص ذاتی مکان کے بنیادی انسانی حق سے محروم نہ پایا جائے۔

○ کوئی فرد واحد بھی سردی گرمی کے الگ الگ قسم کے لباس کو ترستا ہوا نہ پایا جائے۔
○ نوع آدم کا کوئی فرد بھی تعلیم کی نعمت غیر مترقبہ سے محروم نہ ہو۔
○ ہر بیمار کو فوری اور صحیح علاج میسر آتا رہے کوئی شخص بلاعلاج ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتا ہوا نہ پایا جائے۔
● بس ربوبیت عامہ سے یہی محرومیاں ہی تو ہیں نوع آدم کی بدحالیاں' جو نبی اکرمؐ پر گراں گزرتی تھیں۔ **عزیز علیہ ماعنتم** ۹/۱۲۸ اور مذکورہ بالا وہ نعمتیں ہیں جن کے لئے نوع آدم کے حق میں نبی اکرمؐ کو **حریص علیکم** کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

نگاہ بازگشت ○ آیت نمبر ۱۲۳ میں ارشاد ہوا ہے ایمان والو! اپنے آس پاس کے کافروں سے بھی جو تم پر حملہ آور ہوں' مدافعانہ جنگ کرو' اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر انتہائی سختی پائیں اور جانتے رہو کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو خطرات سے خود بچنے والے ہیں۔

○ آیت نمبر ۱۲۴ میں منافقوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ:۔ جب جنگ جہاد کے متعلق کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو منافقوں میں سے بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم میں سے کون ہے کہ اس کا ایمان اس کے ساتھ زیادہ ہوجاتا ہے اور وہ کون سی خوشخبری دیئے جاتے ہیں۔

○ آیت نمبر ۱۲۵ میں منافقوں ہی کے متعلق بتایا گیا ہے:۔ اور وہ لوگ جن کے اذہان میں منافقت کی بیماری ہے۔ پس نازل کردہ سورت انہیں ان کی ذہنی نجاست میں نجاست ہی زیادہ کرتی ہے اور یہاں تک کہ وہ مرجاتے ہیں مگر وہ کافر ہی رہتے ہیں۔

○ آیت نمبر ۱۲۶ میں منافقوں ہی کے متعلق کہا گیا ہے:۔ کہ ان لوگوں نے غور نہیں کیا یعنی انہیں غور کرنا چاہئے کہ وہ ہر سال میں ایک یا دو مرتبہ فتنے میں ڈالے جاتے ہیں (یعنی ان پر کسی سال ایک مرتبہ اور کسی سال دو مرتبہ حملہ کیا جاتا ہے) پھر بھی وہ جنگ سے فرار کے نظریہ سے رجوع نہیں کرتے اور نہ ہی وہ آیات قرآنیہ سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

○ آیت نمبر ۱۲۷ میں منافقوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔ اور جب بھی کوئی سورت جنگ جہاد سے متعلق نازل ہوتی ہے تو منافقوں کے بعض افراد بعض کی طرف دیکھتے ہیں(اے منافقو!) کیا تمہیں کوئی ایک مومن بھی اس طرح دیکھتا ہے؟ پھر وہ (قرآنی ہدایت) سے پھر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذہنوں کو اس سبب سے پھرا ہوا پاتا ہے کہ وہ لوگ ایسے ہیں جو تفقہ یعنی غور و فکر نہیں کرتے۔ (وہ تو اتنا بھی نہیں سوچتے کہ زندہ قوموں کے لئے جنگ جہاد سے فرار ممکن ہی نہیں)۔

○ آیت نمبر ۱۲۸ میں نوع انسانی سے خطاب ہے کہ "اے نوع انسانی تمہارے پاس تمہاری ہی جانوں میں سے ہمارا رسول آیا ہے اس پر تمہاری بدحالیاں گراں گزرتی ہیں۔ وہ بلاتمیز تم سب کی بھلائی کے لئے حریص ہے(خصوصاً") مومنوں پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

○ آیت نمبر ۱۲۹ میں رسول اللہ سے کہا کہ منافق اگر اعراض کریں(آپ کے پیغام کو تسلیم نہ کریں) تو آپ کہہ دیجئے گا کہ میرے لئے اللہ کافی ہے اور میرے تابع مومن کافی ہیں۔ اللہ کے سوا فرمانبرداری کے لائق کوئی نہیں' میں نے اسی پر (اس کے نازل کردہ قانون پر) بھروسہ کیا حقیقت یہ ہے کہ وہ عظیم سلطنت کا رب (روزی رساں) ہے۔

سُوۡرَةُ یُونُسَ

پس منظر اور پیش منظر:۔ سورۃ انفال اور سورۃ توبہ میں جنگ وجدال کے احکام و مسائل بیان ہوئے اور کفار و منافقین پر پوری پوری سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو خود انہی کے اعمال کا رد عمل ہے۔ زمانہ رسالت کے کفار جارحانہ حملوں کے ذریعہ خود ہی جنگیں چھیڑا کرتے تھے اور یہی حال مخالفین اسلام کا اس کے بعد بھی بدستور چلا آرہا ہے۔ بالفاظ دیگر پچھلی دو سورتوں میں ان کے لئے جو سختی و عذاب کا حکم نافذ کیا گیا ہے وہ بے جا اور ناروا نہیں۔

وجہ تسمیہ:۔ ○ اس چیز کے ثبوت میں کہ اللہ تعالیٰ تو بڑھ کر رحمت کرنے والا ہے اس سورت میں قوم یونس کا خصوصی ذکر ہے کہ وہ لوگ انکار کے اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ عذاب آیا ہی چاہتا تھا' حتیٰ کہ خود اللہ کے نبی رسول یونس نے یہ جانکر کہ قوم عذاب الٰہی کی پوری مستحق ہوچکی ہے' باز نہیں آتی۔ اب نزول عذاب کا وقت آپہنچا ہے' اس لئے ہجرت فرماگئے۔ لیکن آپ کے تشریف لیجانے کے فوراً بعد قوم تائب ہوگئی اور اپنی اصلاح شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ذات جو عزیز ذوانتقام ہے۔ غفور رحیم ہوگئی۔ چونکہ اس سورت میں اس رحمت بھرے واقعہ کا خصوصی تذکرہ ہے۔ اس لئے اسی نسبت سے اس سورت مجیدہ کا نام سورہ یونس ہے۔

سابقہ سورتوں کیساتھ ربط:۔ ○ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ سابقہ دو سورتوں میں جنگ وجدال کے احکام و مسائل نازل کئے گئے ہیں۔ اس سورت متصلہ میں عموماً رحمت الٰہی کا ذکر ہے۔ چونکہ جنگ و عذاب کے سامان نوع انسانی خود پیدا کرتی ہے۔ اس لئے سابقہ دو سورتوں میں جنگ کے احکام و مسائل اور عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ مگر یہ ثابت کرنے کیلئے کہ اللہ تعالیٰ عذاب کرنے کو ہرگز پسند نہیں کرتا' قوم یونس کی طرح اگر نوع انسانی عذاب کے دہانے پر پہنچ کر بھی باز آجائے اور اپنی اصلاح شروع کر دے تو اللہ تعالیٰ اپنا دست عذاب اس لئے روک لیتا ہے کہ اس کی شفقت و رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔ سورہ مومن میں ایسے ہی دعائیہ الفاظ آئے ہیں۔

○ **ربنا وسعت کل شئی رحمة و علما** ″ ۷/۴۰= اے ہمارے پروردگار تیری رحمت اور علم ہر چیز سے وسیع ہے۔ (تو ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے اور ہر چیز کو اپنے دامن رحمت میں لئے ہوئے ہے۔ (عذاب تو ہم لوگ خود خریدتے ہیں)۔

اجمالی عنوانات:۔ ○ سورہ یونس کی ابتداء میں اپنی کتاب حکمت کے تذکرہ کے بعد اہل عرب کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ بھی اسی مغالطہ کا شکار تھے۔ جس میں سابقہ جملہ اقوام مبتلا تھیں کہ اللہ کیطرف سے انسان رسول نہیں بھیجے جاسکتے۔ نبی رسول تو مافوق الانسان ہستیاں ہوسکتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پھر بتایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرکے اپنے رب کی عبودیت اختیار کی جائے۔ موجودہ زندگی ہی پر نہ خوش ہو جاؤ بلکہ دوسری زندگی کیلئے اعمال صالحہ کا زادراہ مہیا کرو۔ انسان ناشکرا ہے۔ تکلیف آتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے' جب رفع ہو جاتی ہے تو پھر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کی قبل نبوت کی بے داغ زندگی کی خبر دی گئی ہے۔ نیز قیامت کے متعلق بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو وہ اس دن تم سے جدا ہو جائیں گے۔ قرآن کریم کے مفصل ہونے کا اعلان کرکے چیلنج کیا گیا ہے۔ کہ نوع آدم

اس جیسی ایک سورت بھی نہیں بنا سکتی۔ نبی اکرمؐ سے اعلان کرا دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جان کیلئے بھی کسی نفع نقصان کے مالک نہیں۔ پھر نوحؑ اور موسیٰؑ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ فرعون کی تباہی اور غرقابی کا ذکر ہے اس کی لاش کو محفوظ کرنے کی خبر دے دی گئی ہے۔ فرعون جب غرق ہونے لگا تو رجوع ہوا مگر رد کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کی توبہ اور رجعت گرفتار عذاب ہونے کے بعد کی تھی۔ مگر قوم یونس کی توبہ اس لئے قبول ہوئی کہ وہ نزول عذاب سے پہلے کی تھی۔ سورت مجیدہ کے آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ لوگو! تمہارے پاس حق قرآن آگیا ہے' جو کوئی اس قرآن کے ذریعہ خود ہدایت پائے تو وہ اپنی ہی جان کیلئے ہدایت پائیگا۔ گمراہ ہونے والا خود گمراہ ہوگا اور اس کی گمراہی کا وبال خود اسی پر پڑیگا ہم نے اپنے رسولؐ کو لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا کہ زبردستی ہدایت دیں۔ سورہ یونس کی آخری آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ وحی کی اتباع فرمائیں اور مستقل مزاجی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ کر دے وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

○ سورہ یونس کی ابتدائی آیت مجیدہ میں حروف مقطعات کیساتھ نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ مذکورہ بالا یعنی سورہ توبہ کی آیتیں بھی حکمت والی کتاب قرآن حکیم ہی کی آئتیں ہیں۔ یعنی جو اس سورت میں نازل کی جا رہی ہیں یہ بھی اسی کتاب حکمت کا حصہ ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۱/۱۰

اللہ رحمان و رحیم کے نام سے ہم لکھتے ہیں اور اسی نام سے آپ پڑھیے گا

اے امین! لین القلب! راکع! مذکورہ بالا (بھی) ہماری حکمت والی کتاب کی آئتیں ہیں۔

○ نمبر۱ **الر** حروف مقطعات ہیں۔ جن کے متعلق بلاغ القرآن کے صفحات میں بارہا وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ نبی اکرمؐ کے القاب گرامی ہیں۔ الف سے امین لام سے لین القلب اور را سے راکع مراد ہے' یعنی صلوۃ موقت میں اللہ کے حضور رکوع کرنے والا اور صلوۃ موقت سے باہر اللہ تعالیٰ کے جملہ قوانین کے سامنے جھکنے والا۔ (حروف مقطعات کی مکمل تشریح و توضیح کیلئے ادارہ کا پمفلٹ مسئلہ حروف مقطعات ملاحظہ فرمائیں)۔

○ نمبر۲ **تلک** اسم اشارہ مونث بعید بمعنی وہ' مذکورہ بالا ہے۔ اس کا معنی "یہ" لینا عربی گرائمر کے خلاف ہے۔ جب **تلک** تحریر میں آئے تو اس کا معنی ہوتا ہے مذکورہ بالا۔ اگلی آیت مجیدہ میں اولین مخاطبین قرآن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ متعجب ہوئے کہ انہی میں سے ایک شخص پر وحی اتری ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وحی الٰہی مافوق الانسان' ان کے ذہنی عجیب الخلقت ملک (فرشتے) پر نازل ہونی چاہئے۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۲/۱۰

کیا لوگوں کیلئے یہ مقام تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص کی طرف وحی فرمائی ہے کہ تو لوگوں کو برے کاموں کے برے انجام سے آگاہ کر' اور جو ایمان لائیں (اور اصلاحی اعمال بجا لائیں) انہیں خوشخبری دیدے کہ صدق کا قدم (یعنی راستی پر مبنی جو اعمال وہ بجا لائیں

وہ) ان کے رب کے پاس (محفوظ) ہیں۔ (مگر) کافر کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ (مدعی نبوت) مگر صریحاً جھوٹا ہے۔

○ **اوحینا الٰی رجل منھم** کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی پر وحی فرمائی ہے۔ اس پر نبی اکرمؐ کی مخاطب قوم نے تعجب کیا۔ سابقہ اقوام میں سے قوم نوحؑ، قوم عاد و ثمود وغیرہ کی طرف جب انہی میں سے رسول بھیجے گئے تو وہ بھی اسی طرح متعجب ہوئے تھے۔ چنانچہ قوم نوح کو کہا گیا تھا۔

○ **او عجبتم ان جاء کم ذکر من ربکم علی رجل منکم** ۷/۶۳= اور کیا تم نے اس پر تعجب کیا ہے کہ اللہ کا نصیحت نامہ تمہیں میں سے ایک شخص کی طرف آیا ہے۔ نیز بالکل یہی الفاظ قوم عاد کے متعلق مذکور ہیں۔

○ **او عجبتم ان جاء کم ذکر من ربکم علی رجل منکم** ۷/۶۹= اور کیا تم نے اس پر تعجب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نصیحت نامہ تمہیں میں سے ایک شخص کی طرف آیا ہے۔ یہی حال مکی قوم کا تھا۔ انہوں نے تو یہاں تک کہدیا کہ اگر انسانوں میں سے ہی کسی پر قرآن نازل ہونا تھا تو ان دو شہروں (مکہ اور مدینہ) کے کسی بڑے (مالدار) آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ **و قالوا لولا نزل ھذا لاقرآن علی رجل من القریتین عظیم**○ ۴۳/۳۱

○ **انذر الناس** کے الفاظ سے عیاں ہے کہ، ہر نبی رسول کا فریضہ لوگوں کو برے عملوں کے برے انجام سے آگاہ کرنا تھا۔ لفظ **انذر** کا سہ حرفی مادہ ن۔ ذ۔ ر= نذر ہے جس کا بنیادی معنیٰ، کسی خطرناک چیز سے آگاہ کرنا ہے۔ اس طرح چونکہ برے اعمال کا نتیجہ برا ہوتا ہے اس لئے انذار کا صحیح مفہوم اس کی سزا سے خبردار کرنا ہے۔ اب چونکہ کسی خطرہ کے پیش نظر انسان بہت سے اقدام قبل از وقت اپنے اوپر لازم کرلیتا ہے۔ اس لئے یہی معاملہ نذروں کا ہے جو اپنے اوپر خود واجب کرلی جاتی ہیں۔ مثلاً" کسی علاقہ میں سکول یا ہسپتال کھولنا ہو تو اس کے لئے دی جانے والی رقمیں نذریں کہلاتی ہیں جو اس خطرہ کو رفع کرنے کیلئے پیش کی جاتی ہیں کہ اس علاقہ کے بچے جاہل اور بیمار علاج صحیح سے محروم نہ رہ جائیں۔ یہی حال کعبہ مکرمہ کی نذروں کا ہے جو حج سے پہلے ادا کی جاتی ہیں۔ ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ہمارا مرکز حج کے موقعہ پر لاکھوں افراد کی مہمان نوازی کے بوجھ تلے دب کر کمزور نہ ہو جائے۔ نیز جہاں تک عام نذر نیازوں کا تعلق ہے قرآن کی رو سے وہ بھی صرف کعبہ مکرمہ ہی سے مختص ہیں۔ تاکہ عالم اسلام کی چار طرف سے آمدہ نذروں کے بے پناہ مال کیساتھ اسلامی مرکز دنیا بھر کے مراکز میں سب سے زیادہ طاقتور ہو۔

○ نمبر۳ **بشر الذین امنوا** کے الفاظ میں ربانی بشارتیں صرف مومنوں کیلئے مختص کی گئی ہیں۔ کیونکہ ایمان کا تعلق قرآن کیساتھ ہے اور قرآن مجید صرف نیک کاموں (اصلاحی اعمال) کا حکم دیتا ہے۔ لہٰذا ربانی بشارتیں اعمال صالحہ ہی کیساتھ وابستہ ہیں۔

○ نمبر۴ واضح رہے کہ **الذین امنوا** کے بعد یہاں پر **و عملوا الصلحت** کے الفاظ محذوف ہیں۔ کیونکہ قرآنی کلیہ کے مطابق ایمان بلا اعمال صالح اللہ تعالیٰ کے ہاں ہرگز مقبول نہیں۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ہر مقام پر **ان الذین امنوا** کیساتھ **و عملوا الصلحت** کی قید موجود ہے اور ان کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

○ نمبر۵ **لھم قدم صدق عند ربھم** کا لفظی معنی یہ ہے کہ ان کے لئے ان کے رب کے پاس سچ کا قدم ہے۔ قدم کہتے ہیں پاؤں کو، پاؤں چونکہ آگے کو بڑھتا ہے اس لئے اس لفظ میں آگے آنے یا آگے ہونے کا تصور از خود پیدا ہوگیا۔

چنانچہ مقدم اور موخر کا معنی ہے آگے والا اور پیچھے والا۔ اسی سے تقدم و تاخر کے الفاظ عام مستعمل ہیں۔ **قدم صدق** مرکب اضافی ہے بمعنی راستی کا قدم۔ مگر چونکہ آیت مجیدہ میں اس کے بعد آیا ہے۔ **عند ربھم** بمعنی تمہارے رب کے پاس ○ اس لئے ہم نے یہ معنی لکھا ہے کہ صدق کا قدم (یعنی راستی پر مبنی جو اعمال وہ بجا لائیں) وہ ان کے رب کے پاس (محفوظ) ہیں۔ مادہ ق۔ د۔ م= قدم کو قرآن مجید میں بطور فعل بھی استعمال کیا گیا ہے۔ **لا یستاخرون ساعۃ" ولا یستقدمون** ۱۶/۶۱ میں **یستقدمون** کے لفظ میں یہی مادہ قدم بطور فعل مضارع معروف جمع مذکر غائب باب استفعال مزید فیہ سے آیا ہے۔

○ نمبر۶ **ان ھذا لسحر مبین** میں جو لفظ سحر آیا ہے۔ عام تراجم میں اسکا معنی جادوگر لیا جاتا ہے۔ مگر اس کا جو سہ حرفی مادہ ہے۔ س۔ ح۔ ر= سحر' اس کا بنیادی معنی ہے جھوٹ' دھوکا' فریب' ملمع سازی۔ قرآن مجید میں سحر کو حق کی ضد بیان کرکے وضاحت کر دی گئی ہے کہ سحر کا معنی جھوٹ اور ساحر کا معنی ہے جھوٹا۔ **و تقولون للحق سحر**۔ کیا تم حق کو جھوٹ کہتے ہو۔ پس حق کی ضد جھوٹ ہوتا ہے۔ جادو کا تو دنیا میں وجود ہی موجود نہیں ہے۔

نگاہ بازگشت:۔ ○ آیت نمبر ایک میں نبی اکرمؐ کو حروف مقطعات **الٰر** کے ساتھ مخاطب کرکے ارشاد ہوا ہے کہ اے مین' لیین القلب' راکع مذکورہ بالا آیتیں ہماری حکمت والی کتاب قرآن حکیم ہی کی آیتیں ہیں۔ واضح رہے کہ **الٰر** جو حروف مقطعات ہیں۔ یہ نبی اکرمؐ کے القاب گرامی ہیں جو اپنے اپنے پورے لفظ سے قطع کردہ پہلے حروف ہیں۔ الف' امین کا قطع کردہ پہلا حرف ہے۔ لام' لیین القلب کا اور را' راکع کا۔

○ آیت نمبر۲ میں ارشاد ہوا ہے۔ "کیا لوگوں کیلئے یہ چیز جائے تعجب ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص (محمدؐ) کی طرف وحی فرمائی ہے۔ کہ (اے رسول!) لوگوں کو آپ برے اعمال کے انجام سے آگاہ کریں اور جو لوگ ایمان لائیں۔ (یعنی جو اصلاحی اعمال بجا لائیں) انہیں خوشخبری دے دیجئے گا کہ وہ راستی پر مبنی جو اعمال بھی بجا لائیں' وہ ان کے رب کے پاس محفوظ ہیں۔ مگر انکار کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ (مدعی نبوت) مگر صریحاً" جھوٹا ہے۔ یعنی نبی اکرمؐ کے مخالفوں نے نہ صرف یہ کہ آپ کے پیغام ربوبیت عامہ کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہوں نے نبی اکرمؐ کی کھلی تکذیب بھی کی تھی۔

○ واضح رہے کہ قرآن کریم کا اولین درس ہی ربوبیت عالمینی ہے۔ **الحمدللہ رب العلمین**○ ۱/۱ یعنی تمام اچھی تعریفیں اللہ ہی کو سزاوار ہیں **جو رب ہے تمام جہانوں کا** اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نظام ربوبیت کو اپنے انبیاء سلام علیہم کے ذریعہ نوع انسانی کو پہنچایا بھی تھا اور انہی کے ذریعہ عوام میں قائم بھی کرایا تھا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے عوام کو نہ صرف یہ کہ ربوبیت عامہ کا درس دیا بلکہ اسے عملاً" بروئے کار لاکر بھی دکھا دیا۔ آیت نمبر۲ میں جو بتایا گیا ہے۔ کہ منکرین قرآن نے نبی اکرمؐ کو جھٹلایا اور صریحاً" جھوٹا قرار دیا' اس کی وجہ آپؐ کا درس ربوبیت عامہ ہی تھی' جو استحصالی معاشرہ کے ارباب اقتدار کیلئے کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہوتا۔ وہ لوگ غریب عوام کو بھوکا اور کمزور رکھ کر ہر حال میں اپنا استحصالی نظام برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ نوع انسانی کا استحصال برا عمل ہے' ظلم ہے۔ اس لئے اس کی سزا سے بچنے کیلئے ان لوگوں نے شفاعت کا عقیدہ تراشا' اور بہت سے شفیع بنا رکھے ہیں۔ اگلی آیت مجیدہ میں اللہ

رب العزت نے مذکورہ لوگوں سمیت پوری نوع انسانی کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور و خوض کی دعوت دی ہے کہ دیکھو! اس طرح ہر چہار طرف اللہ تعالیٰ کا نظام ربوبیت جاری و ساری ہے۔ اور ساتھ ہی شفاعت کی بھی نفی کر دی گئی ہے۔ جو عدل و انصاف کی ضد ہے کیونکہ یہ امر صد فیصد مسلم ہے کہ جہاں انصاف ہوگا وہاں شفاعت و سفارش نہیں ہوگی اور جہاں شفاعت و سفارش ہوگی وہاں انصاف ناپید ہوگا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ عادل و منصف ہے اس لئے اس کے ہاں شفاعت و سفارش کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ ۱۰/۳

(اے لوگو!) بلاتمیز تم سب کا رب وہ ہے' جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقفوں میں پیدا کیا۔ پھر وہ پورا پورا تسلط رکھتا ہے اپنی حکومت پر وہ اپنے قانون کی تدبیر کرتا ہے نہیں ہے کوئی بھی (اس کی عدالت میں اس کے حضور کسی کی بھی) شفاعت کرنے والا' سوائے اس کے قانون شفاعت کے مذکورہ بالا صفات والا ہے۔ تمہارا رب۔ پس تم اسی کی فرمانبرداری کرو۔ کیا پھر تم نصیحت نہیں پکڑتے۔

○ **ربکم** میں **کم** ضمیر جمع کا مرجع استحصال کے جانبوالوں سمیت پوری نوع انسانی ہے۔ چنانچہ **ربکم** کے الفاظ سے دوپہر کے سورج کی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری نوع انسانی کا **رب** ہے' صرف جاگیرداروں' زمینداروں اور سرمایہ داروں ہی کا رب نہیں بلکہ کائنات میں اس کے بچھائے ہوئے وسیع دسترخوان میں پوری نوع انسانی کو مساوی اور متوازن حق ربوبیت حاصل ہے کہ سب لوگ کام کریں اور اپنی اپنی ضروریات زندگی سے پوری طرح بہرہ یاب ہوتے رہیں۔ یہاں **ربکم** کے الفاظ آئے ہیں اور قرآن مجید کے اولین درس ۱/۱ میں رب العلمین آیا ہے۔ تمام جہانوں کا رب۔ نوع انسانی کے حق ربوبیت کا اعلان عام رب العزت نے ۲/۳۶ اور ۷/۲۴ میں بالفاظ ذیل کر رکھا ہے۔

○ **ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین**○ = اے نوع انسانی! تم سب کے سب کیلئے زمین میں حق استقرار بھی مسلم ہے اور مرتے دم تک ضروریات زندگی کے ملتے رہنے کا حق بھی دائم ہے۔ دیکھئے! یہاں بھی **ولکم** کے الفاظ میں **کم** ضمیر جمع آئی ہے جس کا مرجع پوری نوع انسانی ہے۔ اور اعلان عام کر دیا گیا ہے کہ نوع انسانی کے ایک ایک فرد کو زمین میں مکان بھی بلا کرایہ میسر آنا چاہئے اور ضروریات زندگی بھی مرتے دم کیلئے **(الی حین)** مسلسل اور بدستور ملتی رہنی چاہئیں۔

○ واضح رہے کہ انبیاء سلام علیہم ایسے ہی مساوی اور متوازن نظام ربوبیت قائم کرنے کیلئے مبعوث کئے جاتے رہے تھے۔ افسوس ہے کہ قرآن مجید پر روایات کے پردے ڈال کر مذکورہ بالا نظام ربوبیت اہل اسلام کے تصور تک سے خارج کر دیا گیا ہے۔

سِتَّةِ أَيَّامٍ کی وضاحت :۔ ○ **ستۃ" ایام** کا معنی روایتی تفاسیر میں یہ لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا گیا تھا۔ جو غلط ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پہلے جب دن رات ابھی عالم وجود میں آئے ہی نہیں تھے تو اس دور کیلئے چھ دن معنی کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لئے **ستتہ" ایام** کا معنی لکھا گیا ہے۔ چھ وقفے جو الگ الگ چھ حالتوں پر مشتمل تھے۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ ابتداء میں زمین و آسمان سب ملے جلے

تھے۔ دونوں کا ایک ہی ہیولیٰ تھا۔ **ان السموت والارض کانتارتقا** ۳۰/۲۱۔ یہ تخلیق کائنات کا ایک یوم' ایک وقفہ' ایک حالت تھی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے **ففتقنھما** ۳۰/۲۱ پھر ہم نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا۔ یہ دوسرا یوم' دوسرا وقفہ' دوسری حالت تھی۔

○ سورہ حمٰ سجدہ میں آیا ہے کہ زمین کو دو یوم' دو مراحل' دو وقفوں میں بنایا۔ پہلا یوم' پہلا وقفہ وہ تھا جب زمین مشترکہ ہیولیٰ سے الگ ہو کر ابھی آگ کا انگارا تھی۔ اور دوسرا یوم دوسرا وقفہ وہ' جس میں اسے موجودہ شکل میں لایا گیا۔ اس وقفہ میں اس کے اندر ہزارہا خزانے محفوظ کر دیئے گئے اور اس کے جملہ عناصر میں الگ الگ خواص بھر دیئے گئے چنانچہ تخلیق زمین سے متعلقہ ان دو یوم کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

○ **قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ** ۹/۴۱= اے رسول! کہہ دیجئے گا کہ کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو یوم' دو وقفوں' دو مراحل دو حالتوں میں پیدا کیا۔ اس کے بعد آیا ہے۔

○ **ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ** ۱۱/۴۱= پھر اس نے آسمان پر اپنے قانون تخلیق کا اس وقت نفاذ فرمایا جبکہ وہ دھواں ہی دھواں تھا۔ **فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا** ۱۱/۴۱ پھر اس نے اپنے قانون کی زبان سے آسمان اور زمین دونوں کو کہا کہ تم آجاؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ دونوں نے بزبان حال جواب دیا۔ **قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىٕعِیْنَ**○ ۱۱/۴۱ دونوں نے کہا کہ ہم آگئے ہیں' تیار ہوگئے ہیں فرمانبردار ہو کر۔

○ آپ دیکھ چکے ہیں کہ ذات باری نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب زمین و آسمان کو بنایا گیا تو ابتداء میں دونوں کا ایک ہی ہیولیٰ تھا۔ پھر انہیں الگ الگ کر دیا گیا۔ ۳۰/۲۱= دو یوم' دو وقفے تو یہ ہوئے۔ نیز آپ دیکھ چکے ہیں کہ ارشاد باری ہے کہ ہم نے زمین کو دو یوم' دو وقفوں میں پیدا کیا۔ یہ ہوگئے چار۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جب وہ ابھی دھواں ہی دھواں تھا۔ ۱۱/۴۱ تو اسے موجودہ حالت میں لایا گیا۔ یہ ہوئے آسمان کو درست کرنے کے دو یوم' دو وقفے' جن کی خبر آیت ذیل میں دی گئی ہے۔

○ **فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا** ۱۲/۴۱= پھر اللہ نے بیشمار آسمانی کرہ جات بنا دیئے اور ہر ساوی کرہ کو اس سے متعلقہ خواص تفویض کر دیئے۔ پس قرآن کریم کی روشنی میں یہ ہیں چھ یوم' چھ وقفے جن میں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور انہیں موجودہ حالت میں لایا گیا۔ خلاصہ مبحث آگے آرہا ہے۔

○ ہم نے سبع کا معنی لکھا ہے بیشمار عربی زبان میں سبع اور سبعین یعنی سات اور ستر کے الفاظ مبالغہ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ ساوی کرہ جات بھی ان گنت ہیں اور ان کی الگ الگ فضائیں (یعنی ان کے آسمان) بھی ان گنت ہیں مشاہدات کی شہادت نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ جہاں تک کسی کرہ کی کشش ثقل کام کرتی ہے وہاں تک اس کی فضائی حد ہے۔ اس کے بعد ایک خلا ہے اور خلا کے بعد پھر دوسرے کرہ ساوی کی فضا' کشش ثقل کی حد شروع ہوتی ہے۔ تو اس طرح ان گنت اجرام فلکی (سیارگان) کی ان گنت فضائیں یعنی ان گنت سماء ہیں' جنہیں ذات باری نے **سبع سموت** کے الفاظ میں بصیغہ مبالغہ بیان فرمایا ہے۔

○ سبعین یعنی ستر کا لفظ بھی قرآن مجید میں مبالغہ کیلئے آیا ہے۔ جیسے کہ سورہ توبہ میں نبی اکرمؐ کو منافقوں کے متعلق

ارشاد ہوا ہے۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَاللّٰهُ ۹/۸۰= اے رسولؐ! آپ منافقوں کیلئے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں اگر آپؐ ان کے لئے ستر بار (یعنی ان گنت مرتبہ) بھی مغفرت طلب کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز مغفرت نہیں فرمائے گا۔ دیکھئے! یہاں یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ اگر آپؐ ستر سے زائد اکہتر بار طلب مغفرت فرمائینگے تو اللہ تعالیٰ معاف کردیگا۔ بلکہ مغفرت کی کلی نفی کر دی گئی ہے کہ اگر آپ ان گنت مرتبہ بھی ایسا کریں گے تو منافقوں کیلئے ہرگز مغفرت نہیں فرمائی جائیگی۔

خلاصہ مبحث :۔ ○ اوپر **ستۃ** ایام کی قرآنی تشریح پیش کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔
سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین فرمالیجئے کہ تخلیق کائنات کے مرکزی مراحل دو ہیں۔

۱۔ تخلیق بالارادہ۔ اور ۲۔ تخلیق بالمادہ

○ تخلیق بالارادہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ○ ۱۶/۴۰= سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ ہم جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے لئے بزبان حال کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ پس اس طرح جب مادہ کا وجود موجود نہیں تھا تو مادہ کو ذات باری نے بالارادہ پیدا فرمایا۔ یعنی ارادہ کیا اور وہ عالم وجود میں آگیا۔ مگر مادہ کے عالم وجود میں آنے کے بعد پھر تخلیق بالمادہ کا دائمی قانون نافذ کر دیا گیا۔ یعنی مادہ کی تخلیق تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے آن واحد میں ہوگئی۔ لیکن آسمانوں اور زمین کی تخلیق چھ یوم یعنی چھ وقفوں میں ہوئی' جس پر ہزارہا برس کا وقت صرف ہوا۔ یوں بھی ارشاد باری ہے کہ اس کے ہاں ایک یوم کی مقدار کہیں ایک ہزار سال اور کہیں پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔

○ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ○ ۲۲/۴۷ بلاشبہ تیرے رب کے ہاں ایک یوم کی مقدار وہ ہزار سال ہے جو تم شمار کرتے ہو۔

○ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ○ ۷۰/۴= (اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ) کائناتی قوتیں اور (اس کے نازل کردہ تنزیلی قوانین) اس کی وحی اس کی طرف عروج کرتے ہیں ایک یوم' ایک وقفہ میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ تو اس طرح تخلیق بالارادہ اور تخلیق بالمادہ کے قرآنی تصور کو ذہن نشین کرنے کے بعد **ستتہ" ایام** کی اوپر دی گئی تفسیری آیات مجیدہ کے مطابق چھ ایام 'چھ دِقفوں' چھ حالتوں کی قرآنی تفسیر یہ ہے۔

○ دو یوم' دو حالتوں میں پہلی وہ ہے جب آسمانوں اور زمین کا ہیولیٰ واحد تھا۔ اور دوسری یہ کہ جب انہیں جدا جدا کر دیا گیا۔ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا" فَفَتَقْنٰهُمَا ۲۱/۳۰ بلاشبہ تمام آسمان اور زمین کا ایک ہی ہیولیٰ تھا پھر ہم نے انہیں جدا جدا کر دیا۔

○ دو یوم وہ ہیں جن میں پہلا یہ کہ زمین آگ کی طرح گرم تھی اور دوسرا یہ کہ اسے موجودہ صورت میں لایا گیا۔
خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ ۴۱/۹= اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو یوم دو وقفوں میں پیدا کیا۔ اور

○ دو یوم وہ ہیں جن میں سے پہلا یہ ہے جب آسمان دھواں ہی دھواں تھا۔ اور دوسرا یہ جس میں اسے ان گنت کرہ جات اور ان کی الگ الگ ان گنت فضاؤں اور خلاؤں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ ہوگئے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے پورے چھ ایام' چھ

وقفے' چھ حالتیں یا چھ مرحلے خود قرآن کریم کی رو سے

رجوع الی المطلب :- ○ **ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ** کا روایتی مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چھ دنوں میں زمین و آسمان کو بنانے کے بعد پھر اپنے تخت پر بیٹھ گیا اور اللہ کے عرش (تخت) کی کیفیت مترجم مشکوۃ شریف مطبوعہ مطبع قرآن و سنت امرتسر کے ربع چہارم کے صفحہ ۲۲۲ پر یہ درج ہے کہ وہ اونٹ کے کوہان کی شکل کا ہے اور وہ اپنے سوار کے بوجھ سے آواز کرتا ہے چرچراتا ہے۔ روایت کے الفاظ مع اردو ترجمہ مطبوعہ یہ ہیں۔ **"و انه لیاط به اطیط الرحل بالراکب=** اور تحقیق وہ آواز کرتا ہے آواز کرنے پالا اونٹ کے بسبب سوار کے۔ یعنی وہ تخت اپنے سوار یعنی اللہ تعالیٰ کے بوجھ کی وجہ سے آواز کرتا ہے۔ چرچراتا ہے۔ العیاذ باللہ!

○ محولہ بالا مشکوۃ شریف ہمارے سامنے کھلی پڑی ہے۔ جس کا مندرج تصور شان باری کے صد فیصد خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ وہ مقدس ذات ہے کہ نہ اس کا کوئی جسم ہے اور نہ ہی وہ کسی تخت پر بیٹھنے کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کیا ہے؟ اس کا جواب بارگاہ قرآنیہ سے یہ ملتا ہے۔ **لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ** ۶/۱۰۳= اسے نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کوئی عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ ایسی ذات مقدس کیلئے اس کا وجود بتانا اور اس کے لئے بیٹھنے کے تخت کا تصور پیش کرنا ہرگز صحیح نہیں۔ واضح رہے کہ یہاں عرش کا معنی تخت نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے اور استویٰ کا معنی ہے اپنی حکومت پر پوری طرح مسلط ہونا۔ یعنی پوری کائنات کا اس کے مقرر کردہ طبعی قوانین کی زنجیروں میں ہر آن جکڑا ہوا ہونا۔ واضح رہے کہ استویٰ کا ایک معنی نفاذ قانون بھی ہے جیسے کہ **ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ** کا معنی یہ ہے کہ۔ اس نے آسمان پر اس وقت اپنے مقررہ قوانین کا نفاذ فرمایا جب وہ دھواں ہی دھواں تھا۔ نفاذ قوانین مکمل تسلط ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔

○ **يُدَبِّرُ الْاَمْرَ** کا معنی لکھا گیا ہے کہ وہ اپنے قانون کی تدبیریں کرتا ہے۔ امر بمعنی قانون ۱۴/۳۲ میں ملاحظہ فرمائیں۔

○ **وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ** ۱۴/۳۲= اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے کشتیوں (جہازوں) کو مسخر کر دیا ہے۔ تاکہ وہ سمندر میں اللہ کے امر (اس کے قانون) کے مطابق چلا کریں۔ دیکھئے اس آئت مجیدہ میں امر کا معنی کھل کر بیان کر دیا ہے قانون۔ کیونکہ سمندر میں کشتیاں اور جہاز اللہ کے قانون کے مطابق چلتے ہیں' جہاں ذرا بھی قانون الٰہی (اس کے امر) کی مخالفت ہوتی ہے۔ وہیں جہاز غرق ہو جاتا ہے۔

○ **مَامِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ** کا معنی لکھا ہے۔ نہیں ہے کوئی بھی (اس کی عدالت میں اس کے حضور کسی کی) شفاعت کرنے والا سوائے اس کے قانون کے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے قوانین میں شفاعت کا قانون ہے؟۔ اس کی تو ذرا آگے چل کر وضاحت کی جائے گی۔ پہلے اذن بمعنی قانون کی قرآنی شہادت پیش کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ کتب روایات نے یہاں اذن بمعنی اجازت لیکر یہ تصور پیدا کر رکھا ہے کہ امت محمدیہ کے تمام گناہ اس طرح معاف کر دیئے جائینگے کہ نبی اکرمؐ کو قیامت کے دن شفاعت کی اجازت دیجائیگی۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر یہ ہوگا اس امت کے جتنے گنہگار دوزخ میں پھینکے جاچکے ہونگے' ان میں سے پہلے تو وہ نکال لئے جائینگے جن میں جو بھر ایمان تھا۔ اور اس کے بعد رائی بھر ایمان والے بھی نکال لئے جائینگے اور اخیر پر وہ بھی نکال لئے جائیں گے جن میں رائی بھر ایمان بھی نہیں تھا۔ گویا کہ وہ جو پورے پورے بے ایمان

ہونگے ان کی بھی شفاعت ہو جائیگی۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی وضعی روایات نے امت کو گناہوں پر بری طرح دلیر کر رکھا ہے۔

○ اذن بمعنی قانون کیلئے دیکھئے آیات ذیل۔ **فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ...... وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا** " ۷/۵۸-۵۷ ان آیات مجیدہ میں **باذن ربہ** کے خط کشیدہ الفاظ آئے ہیں۔ ان میں اذن بمعنی قانون کے سوا کوئی اور معنی لگ ہی نہیں سکتا۔

(ترجمہ) پھر ہم اس (بادل) کے ذریعہ پانی نازل کرتے ہیں۔ پھر ہم اس پانی کیساتھ (زمین سے) ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں ...... اور حقیقت یہ ہے کہ جو (طیب) صحتمند زمین ہے اس کی پیداوار اس کے رب کے (اذن) قانون کے مطابق (بہت زیادہ) نکلتی ہے اور جو (خبیث) ناقص زمین ہے اس کی پیداوار نہیں نکلتی مگر ناقص (اور بہت کم) نکلتی ہے۔ دیکھئے! اس (اذن الہی) یعنی قانون ربانی پر پوری دنیا گواہ ہے کہ صحتمند زمین سے عمدہ اور زیادہ فصل پیدا ہوتی ہے اور ناقص زمین سے ناقص اور کم فصل پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا غیر متبدل اور دائمی قانون ہے جو پورے کے پورے کرہ ارض پر روز آفرینش سے جاری ہے اور قیامت تک جاری رہیگا۔ پس ۷/۵۸-۵۷ سے کھل کر ثابت ہوا کہ قرآنی لغت کے مطابق اذن بمعنی قانون بھی ہے۔

شفاعت کی کلی نفی :۔ ○ مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ یہاں ۱۰/۳ میں **اِلَّا بِاِذْنِهٖ** کے الفاظ میں اذن بمعنی قانون ہے اجازت نہیں واضح رہے کہ ذات باری نے شفاعت کی کلی نفی کر رکھی ہے۔ **وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ** ○ ۲/۴۸= اور ڈرو اس دن سے جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ذرا بھی کام نہیں آئیگا اور نہ کسی مجرم کیلئے شفاعت قبول کی جائیگی۔ اور نہ اس سے رشوت لی جائیگی اور نہ ہی (مجرم کسی بھی طرح کی کوئی بھی) مدد دیئے جائیں گے۔

○ دیکھئے! مجرم کو سزا سے بچانے کے جتنے بھی طریقے دنیوی عدالتوں میں رائج ہیں' سب کی نفی کر دی گئی ہے۔

○ پہلے نمبر پر مجرم کو کوئی بڑا آدمی تھانے ہی سے چھڑا کر لے آتا ہے۔ اس کی نفی **لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ** میں موجود ہے۔

○ دوسرے نمبر پر جب مقدمہ عدالت میں چلا جاتا ہے تو جج سے سفارش کرکے مجرم کو سزا سے بچا لیتے ہیں۔ اس کی نفی **وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ** " سے ثابت ہے۔

○ تیسرے نمبر پر جج کو رشوت دیکر مجرم بری ہو جاتے ہیں۔ اس کی نفی **وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ** میں کر دی گئی ہے۔

○ اس کے علاوہ دنیوی عدالتوں میں وکیلوں کی موشگافیاں بھی قانون کا خون کرکے مجرم کو سزا سے بچالیتی ہیں۔ نیز اور بھی کئی طریقے ہیں۔ مثلاً" اصل گواہوں کو بٹھا لیا جاتا ہے اور جھوٹے گواہ کھڑے کر لئے جاتے ہیں۔ گاؤں کے چوہدری خود قتل کرکے کسی ملازم سے اقبال جرم کرا کر خود بچ جاتے ہیں اسے کہتے ہیں کہ ہم تجھے چھڑا لینگے۔ مجرم کو سزا سے بچانے کے ان تمام طریقوں کی مکمل نفی کا اعلان عام **وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ** کے الفاظ میں کر دیا گیا ہے۔

ایک لمحہ فکریہ :۔ ○ اب غور فرمائیں مندرجہ بالا آیت مجیدہ ۲/۴۸ ایک محکم آیت ہے جس میں کوئی ابہام بھی موجود

نہیں اور اس کا کھلا اور واضح مفہوم عدل و انصاف کے بھی عین مطابق ہے۔ تو جب اس محکم آیت میں مجرموں کے سزا سے بچ جانے کے تمام تر مروجہ طریقوں کی پوری پوری نفی کر دی گئی ہے تو پھر کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ قیامت کو اللہ امت محمدیہ کے مجرموں کی شفاعت کی اجازت اس ذات اقدس محمد رسول اللہ کو دیگا' جن کے ذاتی عدل و انصاف کا مشہور واقعہ خود کتب روایات میں درج ہے' جو عین قرآن مجید کے مطابق ہے اور جسے علماء روایات خود بر سر منبر بیان کرتے چلے آرہے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی ممتاز قبیلے کی فاطمہ نامی لڑکی چوری کے الزام میں نبی اکرمؐ کی عدالت میں پیش ہوئی۔ تو آپ نے اس پر چوری کی قرآنی حد لگا دی۔ لیکن قبیلہ کے بڑے بڑے لوگ سفارش لے کر آئے کہ یہ ہمارے خاندانی وقار کا مسئلہ ہے اس لئے فاطمہ کو بری کر دیجئے گا۔ لیکن نبی اکرمؐ نے جواباً" ارشاد فرمایا کہ چوری تو اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی کریگی تو میری عدالت سے اس پر بھی قرآنی حد نافذ کر دیجائیگی۔ جرم کی سزا سے تو وہ بھی نہیں بچ سکے گی۔

○ تو اب غور طلب یہ امر ہے کہ جو ذات مقدس دنیا میں فاطمہؓ بنت محمدؐ کو بھی چوری کی سزا معاف کرنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ وہی ذات پاک قیامت کو ان بے ایمانوں کی شفاعت فرمائینگے جن میں بقول روایات رائی بھر ایمان بھی موجود نہیں ہوگا۔

شفاعت کے متعلق ایک اہم فیصلہ:۔ ○ اسی سورۂ یونس میں آگے چل کر شفاعت کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہوتا ہے۔ **وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○**

۱۰/۱۸= اور وہ اللہ کیساتھ ساتھ ان لوگوں کی فرمانبرداری بھی کرتے ہیں جو نہ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں نفع دے سکتے ہیں۔ اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفاعتی ہیں۔ یہ ہماری شفاعت کرکے ہمیں گناہوں کی سزا سے بچالینگے۔ اے رسولؐ! کہہ دیجئے گا کہ کیا تم (اللہ کے ہاں شفاعتی مقرر کرکے) اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں کی خبر دو گے جنہیں وہ (گویا کہ) آسمانوں اور زمین میں جانتا ہی نہیں۔ وہ اللہ ایسے مشرکانہ تصور سے پاک ہے جو یہ لوگ (اس کے ہاں شفیع ٹھہرا کر) شرک کرتے ہیں۔

○ اس آیت مجیدہ میں شفاعت کے یہ معنے بھی اجاگر کر دیئے گئے ہیں جو دنیوی حاکموں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اس شخص کو پولیس والوں نے محض شبہ کی بناء پر گرفتار کرلیا ہے۔ یہ بچارہ تو بے گناہ ہے لہٰذا اسے بری کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ لفظ شفاعت کا سہ حرفی مادہ ہے۔ ش۔ ف۔ ع=۔ شفع۔ جس کا بنیادی معنی ہے جوڑا ہونا' کسی کیساتھ مساوی کھڑا ہونا۔ ۸۹/۲ میں لفظ شفع' وتر کی ضد بیان ہوا ہے۔ **وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ**= اور شہادت ہے جفت کی اور طاق کی۔ حق شفع بھی اسی مادہ سے ہے۔ ہمسایہ کو یہ حق اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کیساتھ مساوی کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نظریہ شفاعت کو اسلئے شرک قرار دیا ہے کہ اس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شفیع اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن معاذاللہ استغفراللہ! وہ خبریں بتائے گا جن کا اسے علم نہ ہوگا۔ **قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ** ۱۰/۱۸

○ اسکے برعکس شفاعت کے جو معنے کتب روایات نے لئے ہیں کہ باری تعالیٰ! میری امت کے فلاں فلاں افراد ہیں تو مجرم' لیکن تو اپنے قانون مکافات عمل پر خط تنسیخ کھینچ کر انہیں سزا سے بچالے' وہ کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں

ہوسکتے' جن سے اللہ تعالیٰ غیر عادل اور غیر منصف ثابت ہوتا ہے۔ اور پھر باقی انبیاء کی امتوں کو تو یہ رعایت دی نہ جائے اور امت محمدیہ کو مکمل جانبدارانہ انداز سے عطا کی جائے۔ چونکہ اس غیر قرآنی نظریہ کے مطابق نہ ناموس باری محفوظ رہتی ہے نہ ناموس رسول' اس لئے یہ نظریہ صد فیصد غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی بھی شفیع ہوسکتا ہے۔ سورہ زمر میں بالفاظ ذیل نظریہ شفاعت کی جڑ ہی کاٹ دی گئی ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ○ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ○ ۴۳-۴۴=۳۹/۴۴ کیا لوگوں نے اللہ کیساتھ کوئی اور شفیع مقرر کرلئے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے گا کہ اگرچہ وہ کسی چیز کے مالک نہ ہوں۔ اور نہ ہی وہ عقل سے کام لیتے ہوں (کہ اللہ کے ہاں تو کوئی شفیع ہو ہی نہیں سکتا)۔ آپ اعلان فرما دیجئے گا کہ شفاعت ساری کی ساری صرف اور صرف اللہ کیلئے ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت صرف اسی کی ہے پھر یہ (شفیع ٹھہرانے والے اور شفیع ٹھہرائے گئے) سب لوگ (اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کیلئے) اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

○ دیکھئے! ان آیات مجیدہ میں شفاعت کو کلی طور پر اللہ تعالیٰ کیلئے بتایا گیا ہے کیونکہ شفاعت کے قرآنی معنوں کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر کسی کے مخفی اعمال تک کی خبر رکھتا ہے اسے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہی نہیں جو قیامت کو اسے یہ بتائے کہ یہ شخص یونہی پکڑ لیا گیا ہے یہ تو بے گناہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاں شفاعت کا ذکر آیا ہے۔ **الا باذنہ** کے الفاظ میں اس کی نفی کر دی گئی ہے کیونکہ اس کے ہاں شفاعت کا قانون ہے ہی نہیں اور ساتھ ہی اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مجرموں کے آگے پیچھے کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے شفیع کی کیا ضرورت ہے؟ ۲/۲۵۵ میں ارشاد ہوا ہے۔

○ **مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ** ۲/۲۵۵= کون ہے جو اس کے حضور (مجرموں کی) شفاعت کرسکے سوائے اس کے قانون کے (اور شفاعت کا قانون ہے کوئی نہیں ۳۹/۴۴ کیونکہ) وہ خود جانتا ہے جو کچھ (مجرموں کے) آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے (اس کے لئے کسی شفاعتی کی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اسی طرح سورہ انبیاء میں آیا ہے۔

○ **يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ** ۲۱/۲۸= وہ اللہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے۔ (یعنی جو انہوں نے آگے بھیجا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو ان کے پیچھے ہے (یعنی جو انہوں نے پیچھے چھوڑا ہے۔ اسے شفیع کی ضرورت ہی نہیں)۔ اور وہ (مزعومہ شفاعتی) شفاعت نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے جس کیلئے وہ راضی ہو' اور حقیقت یہ ہے کہ (وہ لوگ شفاعت کیا کریں گے) وہ تو اس دن اس کے خوف سے خود کانپتے ہونگے۔ اسی طرح سورہ طٰہٰ میں آیا ہے۔

○ **يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا○ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا○** ۲۰/۱۱۰= قیامت کے دن شفاعت نفع نہ دیگی سوائے اس کے کہ جس کیلئے رحمٰن کا قانون ہو۔ اور وہ اس سے (شفاعت کی) بات کیلئے راضی ہو۔ (ایسا کس طرح ہوسکتا ہے جبکہ) وہ اللہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ لوگوں کے آگے ہے (یعنی جو انہوں نے آگے بھیجا) اور وہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے ہے (یعنی جو کچھ انہوں

نے پیچھے چھوڑا) اور وہ ٹھہرائے گئے شفاعتی اللہ کے علم پر محیط نہیں ہیں۔

○ دیکھئے یہاں تک وہ تمام آیتیں پیش کر دی گئی ہیں جن میں شفاعت کا ذکر ہے۔ ہر مقام پر شفاعت کی نفی کر دی گئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک متنفس کے آگے پیچھے کو خود جانتا ہے۔ اسے حقیقت حال بتانے والے کی ضرورت نہیں۔

الا باذنه:۔ ○ آیت مجیدہ زیر بحث ۳/۱۰ اور ۲/۲۵۵ میں شفاعت کو **الا من بعد اذنه** اور **الا باذنه** کے الفاظ میں اذن الٰہی کیساتھ مشروط کر رکھا ہے۔ واضح رہے کہ یہ نفی تام کا ایک مخصوص قرآنی اسلوب بیان ہے۔ کیونکہ شفاعت کا اذن قانون قرآن بھر میں موجود نہیں بلکہ ۳۹/۴۴ میں جار مجرور کے مخصوص حصر کیساتھ شفاعت کو خالصا" اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص کرکے غیر اللہ کی شفاعت کی مکمل نفی کر دی گئی ہے۔

○ **قل للہ الشفاعۃ" جمیعا**"○ ۳۹/۴۴ کہہ دو کہ شفاعت ساری کی ساری صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ یہ اعلان نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے کرا دیا ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اے نوع انسان تم سب کو اعمال کی جوابدہی کے لئے اسی کی طرف رجوع کرنا ہے:۔

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝ ۴/۱۰

(اے نوع انسانی! اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے) تم سب کے لئے اسی کی طرف لوٹ کر جانے کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ (قیامت) سچا ہے۔ بے شک وہی ہے جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیاپھر وہ (تمہارا) اعادہ کریگا۔ اس لئے (دوبارہ پیدا کریگا) تاکہ وہ ان لوگوں کو انصاف کیساتھ بدلہ عطا فرمائے جو ایمان لائے اور صلاحیت بخش کام کئے۔ اور جن لوگوں نے ضابطہ الٰہی کا انکار کیا انکے پینے کے لئے گرم پانی اور درد ناک عذاب ہے انکے اس کفر کے بدلے جو وہ کرتے رہے تھے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اللّٰہ مرجعکم کا لفظی معنی ہے۔ اس الیہ ہی کی طرف ہے تمہارے لوٹ کر جانے کی جگہ۔ ان الفاظ سے وحدت الوجودی حضرات یہ مفہوم اخذ کرتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ ہی کا حصہ ہے۔ اسی میں سے نکل کر آیا ہے اور اسی میں لوٹ کر چلا جاتا ہے۔ ان حضرات کو یہ غلطی اسلئے لگی ہے کہ لفظ مرجع کا سہ حرفی مادہ ہے ر-ج-ع = رجع۔ جس کا مصدری معنی یہ ہے کہ جہاں سے آئے ہوں اسی جگہ پر واپس چلے جائیں۔ لیکن اہل زبان کے ہاں اس مادہ کے ذیل کے معنے

بھی مستعمل ہیں' جن پر خود قرآن کریم شاہد ہے:۔

نادم ہونا

سورہ انبیاء میں ابرہیمؑ سلامؑ علیہ کے ذکر جمیل میں مذکور ہے کہ جب آپنے بت پرست قوم کے بتوں کو توڑ پھوڑ دیا مگر سب سے بڑے بت کو سلامت رکھا۔ اس پر بت پرست بہت سٹ پٹائے اور ابراہیمؑ سے پوچھا کہ کیا تو نے ہمارے بتوں کیساتھ یہ عمل کیا ہے۔ تو آپنے فرمایا کہ اگر یہ بولتے ہیں تو خود انہی سے پوچھ لو کہ یہ توڑ پھوڑ کس نے کی ہے:۔ فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (21/63) اس پر وہ سب نادم ہو کر رہ گئے:۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ (21/64) پس وہ اپنے آپ میں نادم ہوکر رہ گئے اور ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ تم خود ہی بے ٹھکانہ کام کرنیوالے ہو۔ جو اپنے ہی ہاتھ کے تراشے ہوئے بتوں کے سامنے ماتھا ٹیکتے چلے آرہے ہو۔ دیکھئے! یہاں فرجعوا الی انفسہم میں مادہ رجع آیا ہے۔ مگر یہاں یہ معنٰی ہرگز نہیں کہ وہ جہاں سے آئے تھے وہیں لوٹ کر چلے گئے۔ بلکہ اسکا معنٰی ہے کہ وہ اپنے آپ میں شرمسار ہو گئے اور آپس ہی میں ایک دوسرے کو کوسنے لگے۔

جواب دینا

اسی طرح سورہ نمل میں سلیمان سلامؑ علیہ کے ذکر جمیل میں آیا ہے کہ آپنے ملکہ سبا کو چٹھی لکھی اور اپنے نامہ بر ہدہد سے کہا:۔ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (27/28) میری یہ چٹھی لے جا اور انکو دیدے۔ پھر تو ان سے اعراض کر جانا پھر دیکھنا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ دیکھئے! یہاں ماذا یرجعون کے الفاظ میں مادہ رجع آیا ہے۔ مگر یہاں یہ معنٰی نہیں کہ پھر تو دیکھنا' وہ کہاں لوٹ کر چلے جاتے ہیں۔ بلکہ صاف مفہوم یہ ہے' پھر دیکھنا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

قیامت کی عدالت عالیہ میں اس زندگی کے اچھے برے اعمال کی جوابدہی کے لئے حاضر ہونا

قرآن مجید میں مذکورہ مادہ رجع قیامت کی عدالت عالیہ میں اس زندگی کے اچھے برے اعمال کی جوابدہی کے لئے متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ جیسے کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ

(2/28)

لوگو! تم اللہ تعالٰی کی ہستی کا انکار کس طرح کر سکتے ہو۔ جبکہ حالت یہ ہے کہ ایک وقت تھا کہ تم نیست تھے پھر اس نے تمہیں زندگی دی۔ پھر وہی تمہیں موت دیگا۔ پھر تم کو زندہ کریگا۔ پھر تم (اس زندگی کے اچھے برے اعمال کی جوابدہی کے لئے) اسی کی (عدالت میں) حاضر کئے جاؤ گے۔

رجعت الی اللہ کی اصطلاح برائے جوابدہی اعمال کا ثبوت سورہ حم سجدہ میں انتہائی وضاحت و صراحت کیساتھ مذکور ہے۔ جہاں انسان کے متعلق خبر دی گئی ہے۔ **لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ○ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى** (۴۱/۴۹)

(مفہوم) انسان کا جی خیر کے لئے دعا کرنے میں بھرتا نہیں۔ اور اگر اسے کوئی برائی پہنچے تو وہ ناامید اور ہراساں ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم اسے اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو اپنے طرف سے رحمت کا مزہ چکھائیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ میرے لئے ہے (یہ مرا حق) اور میں گمان نہیں کرتا کہ (اللہ کے حضور میں اعمال کی جوابدہی کے لئے) قیامت قائم ہونیوالی ہے اور اگر میں اپنے رب کی عدالت میں حاضر کیا بھی گیا تو (وہ غفور رحیم ہے) اس کے ہاں وہاں بھی میرے لئے بھلائی ہی بھلائی ہوگی۔

دیکھئے یہاں بھی **وَلَئِنْ رُّجِعْتُ** کے الفاظ میں مادہ رجع آیا ہے اور اس کا کھلا مفہوم صرف اور صرف اعمال کی جوابدہی کے لئے اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے۔ جو وقتہ قیامت میں ہوگا۔ آیت مجیدہ میں **وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً** کے الفاظ میں **السَّاعَةَ** یعنی قیامت پوری طرح اظہر و بین ہے۔

المختصر! وحدت الوجودی اصحاب کا **اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ**' **اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ** اور **اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ** کے الفاظ سے مسئلہ وحدت الوجود کی دلیل پکڑنا مطلقاً" غلط ہے کہ انسان اللہ میں سے بنایا گیا تھا اور اسی میں لوٹ کر چلا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ ہر اچھی بری چیز کو اللہ تعالی ہی کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ یعنی ہر چیز اسی میں سے بنی ہوئی ہے اور اسی میں لوٹ جانیوالی ہے۔ مسئلہ وحدت الوجود کی اگر گہرائی میں جائیں اور اس کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو اس کے سوا ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لوگ پہلے تو اپنے بزرگوں کو اللہ بناتے ہیں اور پھر خود اللہ بن بیٹھتے ہیں۔ پہلے تو جاہل عوام سے اپنے بزرگوں کی قبروں کو سجدہ کرواتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو ماتھے ٹکواتے ہیں۔ حالانکہ انسان اور اللہ تعالی کے واحد الاصل ہونے کا نظریہ عالم مشاہدات میں قدم قدم پر مطلقاً" غلط اور فریب محض ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ۔

جو چیزیں باہم واحد الاصل ہوں ان کے خواص میں ہرگز ہرگز اختلاف موجود نہیں ہوتا۔ مثلاً" اگر سومن سونے میں سے ایک ماشہ سونا بھی الگ کر لیا جائے تو اصل کے لحاظ سے جو خاصیت سومن سونے کے اندر موجود ہے وہی خوبی من د عن ایک ماشہ سونے میں موجود ہوگی۔ پھر سونے کے خواہ زیورات بنائے جائیں یا برتن اس کا تاج بنایا جائے یا گھڑی کا چین چمک دمک کے لحاظ سے ہر مقام پر سونے کے خواص قائم و دائم رہیں گے۔ یہی حال اصل کے لحاظ سے لوہے' لکڑی' تانبے' پیتل وغیرہ سے بنی ہوئی چیزوں کا ہے کہ ہر مقام پر ہر چیز کے اصل کے خواص موجود اور نمایاں ہوتے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ سونا' لوہا' تانبا' پیتل اور لکڑی وغیرہ میں سے بنائی ہوئی چیز کے خواص کبھی بھی اور کہیں بھی تبدیل ہوگئے ہوں۔

مگر مسئلہ وحدت الوجود' جو کائنات کی ہر چیز کو اللہ کا حصہ اور اللہ ہی میں سے بنی ہوئی بتا کر ہر چیز کو واحد الاصل قرار دیتا ہے۔ یہ چیز تو کائنات کی افضل ترین مخلوق انسان پر بھی صادق نہیں آتی۔ جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اصل کے لحاظ

سے واحد الاصل اشیاء کے خواص میں سرموفرق نہیں آتا۔ مگر انسان اور اللہ تعالیٰ کے خواص میں زمین و آسمان کا فرق موجود ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ مگر انسان کھانے پینے کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ بول و براز' اخراج ریح' تھوک۔ سینڈھ اور بلغم وغیرہ کے عوارضات سے صد فیصد مبّرا ہے مگر انسان ان جملہ عوارضات میں ہر لحظہ اور ہر ساعت مبتلا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کیلئے موت کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پس ان دلائل قاطعہ کے مطابق مسئلہ وحدت الوجود یکسر غلط' بے بنیاد محض اور خود تراشیدہ ہے۔ پھر مزیداری یہ ہے کہ اگر انسان اللہ الاصل ہے تو وہ بدکار' گنہگار' چور زانی' دروغ گو' دھوکہ باز اور ڈاکو کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب نظریہ ہے جو اہل اسلام میں راہ پا چکا ہے کہ اصل کے لحاظ سے جملہ کائنات اور ہر قسم کے انسان اللہ ہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ظالم بھی اللہ ہے اور مظلوم بھی اللہ ہے۔ قاتل بھی اللہ ہے اور مقتول بھی اللہ ہے۔ اور اس طرح چور بھی اللہ ہے اور جسکی چوری کی جارہی ہو وہ بھی اللہ ہے۔ اور اسی طرح دھوکے باز بھی اللہ ہے اور جس کو دھوکا دیا جا رہا ہو وہ بھی اللہ ہے۔ العیا ذ باللہ! وحدت الوجودی نظریہ وحدت الوجود کی اسطرح تعریف کرتے ہیں کہ کوزہ' کوزہ بنانیوالا کمہار اور کوزے کی مٹی سب اللہ ہیں:۔

ہم کوزہ و ہم کوزہ گرو ہم گلِ کوزہ

اور اس مطلقاً" بے بنیاد اور خود تراشیدہ تصور کی دلیل قرآن کریم کے الفاظ الیہ مرجعکم الیہ ترجعون اور الیہ یرجعون وغیرہ سے پکڑتے ہیں۔ جو قیامت کی عدالت عالیہ میں اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے آئے ہیں۔جن کی مکمل بحث پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔

والیہ مرجعکم کے مذکورہ بالا قرآنی نظریہ اعمال کی جوابدہی کے ملئے اللہ کے حضور میں حاضری کی تائید ذات باری نے آیت زیر بحث کے اگلے الفاظ میں کر دی ہے ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَّعَذَابٌ أَلِيمٌ پھر وہ اللہ نوع انسانی کا اعادہ (یعنی اسے دوبارہ زندہ) اس لئے کریگا تاکہ ایمان لانیوالوں اور صلاحیت بخش عمل بجالانیوالوں کو منصفانہ جزا دے اور انکار کرنے والوں بد کرداروں کو گرم پانی اور درد ناک عذاب کی منصفانہ سزا دے۔ پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی کی بجائے گرم پانی دیا جانا بھی ایک درد ناک عذاب ہے۔

آیت مجیدہ کے ان الفاظ سے کھل کر ثابت ہوا کہ الیہ مرجعکم کی غرض یہ ہے کہ ضابطہ الہٰی پر ایمان لانیوالے نیکو کاروں کو منصفانہ جزا دی جائے اور انکار کرنیوالے بد کرداروں کو منصفانہ سزا مل جائے جو قیامت کے دارالجزا میں اسوقت دیجائیگی جب مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ زندہ کر لیا جائیگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظریہ وحدت الوجود تراشاہی گیا ہے قیامت کی اخروی عدالت عالیہ میں اس زندگی کے اچھے برے اعمال کی جوابدہی سے بچنے کے لئے۔ کیونکہ جب یہ مان لیا جائے کہ انسان گنہگار اور نیکو کار سب کے سب اللہ ہی ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے آپکو کیونکر جہنم سپرد کرنے لگے گا؟

آیت مجیدہ کے اخیر میں انکار کرنیوالوں کی سزا کا ذکر کرنے کے بعد آیا ہے بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ کہ انہیں گرم پانی

اور درد ناک عذاب کی سزا غیر منصفانہ طور پر نہیں دیجائیگی بلکہ یہ انکے خود کفر کرنیکا منصفانہ بدلہ ہو گا۔ اسی سورہ یونس میں آگے چل کر ارشاد ہوا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡئًا وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ (10/44) بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھی ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ لوگ اپنے آپ پر خود ظلم کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی بد اعمالیوں کی بدولت خود ہی اپنے لئے' اپنے کئے ہوئے بُرے اعمال کی سزا کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

اگلی آیت مجیدہ میں ذات باری کی صفات مخصوصہ کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ نوع انسانی ان پر غور و فکر کر کے راہ راست اختیار کر لے۔

هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِیَآءً وَّ الۡقَمَرَ نُوۡرًا وَّ قَدَّرَہٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَ الۡحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰہُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالۡحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۝ ۵/۱۰

(وہ اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات) ہے جس نے سورج کی روشنی (کا منبع) بنایا اور چاند کو روشنی۔ (حاصل کرنیوالا ٹھہرایا) اور اسکی (29-30) منزلیں مقرر کر دیں۔ تاکہ تم سالوں کی گنتی اور انکے حساب کا علم حاصل کرو۔اور نہیں پیدا کیا اللہ نے مذکورہ (اجرام فلکی) کو مگر ٹھیک ٹھیک پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی آیتوں کو اس قوم کے لئے جو علم حاصل کرتے ہیں' کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔

جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِیَآءً کے الفاظ سے ثابت وبیّن ہے کہ سورج کو ازخود روشن بنایا گیا ہے۔ اور وَالۡقَمَرَ نُوۡرًا کے الفاظ سے عیاں ہے کہ چاند' روشنی حاصل کرنے والا ہے۔ ازخود روشن نہیں۔ اس حقیقت پر مشاہدہ گواہ ہے کہ سورج کی روشنی گرم ہے اور چاند کی روشنی ٹھنڈی یعنی سورج روشنی اور گرمی کا ذخیرہ ہے بالفاظ دیگر سورج میں جلنے والے مادے موجود ہیں۔ جو ہر آن جلتے رہتے ہیں' جس سے ہر لحظہ گرمی اور روشنی پھوٹ رہی ہے لیکن چاند کی روشنی چونکہ ٹھنڈی ہے' اس سے ثابت وبیّن ہے کہ چاند از خود روشن نہیں بلکہ یہ اسی طرح روشن ہے جس طرح آئینے میں سے ایک بہت بڑے قمقمے کی روشنی منعکس ہو کر آئینے سے باہر بکھر رہی ہو۔

ضیاء اور نور دنوں کا معنی روشنی ہے۔ مگر قرآن کریم اور عالمی مشاہدہ کی شہادت کے مطابق ان میں فرق یہ ہے کہ ضیاء سے وہ روشنی مراد ہے جو مستعار نہ ہو بلکہ ذاتی ہے۔ اور نور سے مراد وہ روشنی ہے جو ذاتی نہ ہو بلکہ کسی روشنی کے ذخیرہ سے حاصل کی گئی ہو۔ واضح رہے کہ لفظ نور اسم ہے مگر چونکہ عربی ادب میں اسم بمعنی اسم فاعل بھی مستعمل ہے اس لئے آیت بالا کے الفاظ والقمر نورا کا معنی یہ ہے:۔اور چاند کو بنایا اللہ نے روشنی حاصل کرنیوالا۔ اسم بمعنی اسم فاعل کی مثال سورہ توبہ میں آئی ہے۔ وَیَقُوۡلُوۡنَ ہُوَ اُذُنٌ (9/61) اور منکرین رسالت کہتے ہیں۔ کہ (یہ رسول) سننے والا ہے۔ سُنی سنائی باتوں کا حامل ہے۔ یہاں اُذُنٌ کا معنی اسم بمعنی اسم' یعنی کان نہیں۔ بلکہ اسم بمعنی اسم فاعل یعنی سننے والا ہے۔

وَقَدَّرَہٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَ الۡحِسَابَ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ چاند کی انتیس اور

تیس منزلیں اسلئے مقرر کی گئی ہیں تاکہ نوع انسانی سالوں کی گنتی معلوم کرے اور انکا حساب رکھا کرے۔ مہینہ بھر میں چاند کی مختلف شکلیں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ پہلی قمری رات کو سرشام چاندی کی باریک تار کی صورت میں افق مغرب پر نمایاں ہوتا اور اسکے بعد متواتر چودہ تاریخ قمری تک بڑھتے بڑھتے مکمل گول دائرے کی شکل کو پہنچ جاتا ہے۔ مگر اسکے بعد گھٹنا شروع ہوتا ہے۔ تا آنکہ پھر چاندی کی باریک تار کی شکل میں سرشام افق مغرب پر نمایاں ہو کر اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ آج نئے قمری مہینے کی پہلی تاریخ ہے۔

اس طرح قمری مہینوں کا لا متناہی سلسلہ از ابتداء آفرینش آجتک جاری ہے اور تا قیامت جاری رہیگا۔ اس سے آگے ہے سالوں کے شمار اور اسکے حساب کا سوال رب عالم نے سورج اور زمین کا باہمی تعلق اس انداز کیساتھ متعین فرما رکھا ہے۔ کہ زمین کے مختلف حصے بدستور سورج کے قریب آتے رہتے اور اس سے دور ہٹتے رہتے ہیں۔ جس سے کرہ ارض پر موسموں کا انقلاب ہرلحظہ اور ہر آن جاری ہے۔ دوموسم سردی اور گرمی کے ہیں اور دو الگ الگ سردی گرمی کے خاتمہ پر معتدل موسم نمودار ہوتے ہیں۔ تو اس طرح جب ایک موسم لوٹ کر واپس آتا ہے تو سال پورا ہو جاتا ہے۔ خالق کائنات نے سال کے اس چکر کو بارہ مہینوں پر مشتمل کر رکھا ہے اور قرآن حکیم میں خبر دیدی ہے:۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

(9/36)بلاشبہ مہینوں کی گنتی اللہ تعالیٰ کی کتاب کائنات میں اللہ کی طرف سے خود مقرر کردہ اسی وقفہ سے بارہ مہینے ہے جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا۔ تو اس طرح بارہ ماہ کا ایک سال خود خالق کائنات کا اپنا مقرر کردہ ہے۔ پس اس طرح قمری حساب سے ہر 29 یا 30 دن کے بعد مہینہ ختم ہو جاتا ہے اور بارہ قمری مہینوں کے بعد ایک قمری سال پورا ہوتا چلا جارہا ہے۔ سو سال کی ایک صدی شمار ہوتی چلی آرہی ہے۔ اور اسی طرح صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی جارہی ہیں۔

نظام قمری کا حال تو آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اب نظام شمسی کے متعلق عالمی مشاہدات کو نگاہوں کے سامنے لایئے۔ خالق کائنات عزوجل نے سورج اور چاند کے مداروں میں یہ حکمت بھرا نظام قائم فرما رکھا ہے کہ سال بھر کے جس سفر کو چاند 355 دن میں ختم کرتا ہے سورج چونکہ چاند کی نسبت زمین سے زیادہ دور ہے اور اسکے مدار کی مسافت چونکہ چاند کے مدار کی مسافت کی نسبت زیادہ ہے اسلئے سورج سال بھر کی مسافت کو 355 دن کی بجائے 365 دن 6 گھنٹے اور 6 سیکنڈ میں طے کرپاتا ہے۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ شمسی جنتری کا ماہ دسمبر سردیوں ہی میں آتا ہے اورجون گرمیوں ہی میں آتا ہے۔ مگر قمری جنتری کے مطابق قمری مہینوں کے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ قمری مہینہ رمضان شریف کے روزے کبھی گرمیوں میں آتے ہیں، اور اسی طرح کبھی سردیوں کے خاتمہ والے معتدل موسم میں نمودار ہوتے ہیں اور کبھی گرمیوں کے خاتمہ والے معتدل موسم میں آتے ہیں۔ اللہ رب العزت کا مقرر کردہ مشاہدہ گواہ ہے کہ 36 سال کے بعد رمضان کے روزے عین 36 سال قبل کے موسم میں لوٹ آتے ہیں۔ باری تعالیٰ کا خود مقرر کردہ ایک دن رات کا وقفہ 24 گھنٹے 6 منٹ پر مشتمل مہینہ 30-31 دنوں کا ہے۔ 12 مہینوں کا سال اور سو سال کی صدیوں پر صدیاں گزرتی جارہی ہیں۔ مشاہدہ کے مطابق نبی اکرمؐ کی ہجرت مبارکہ کو 1398 سال یعنی دو کم چودہ قمری صدیاں گزر چکی ہیں اور مسیحؑ کو پیدا ہوئے 1977 برس یعنی 23 برس کم بیس شمسی صدیاں بیت گئی ہیں۔ اسی طرح ہر قوم اپنے اپنے جاری کردہ سن کے مطابق سالوں اور صدیوں کا حساب کرتی چلی آرہی ہیں۔ یہ ہے

برادران عزیز! لتعلموا عدد السنین والحساب کی انتہائی مختصر کائناتی تفسیر' جو آیات مبارکہ صحیفہ فطرت کے مطابق پیش کی گئی ہے۔

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ کے الفاظ سے کھل کر عیاں ہو رہا ہے کہ مشاہدات عالم بھی اسی طرح حق ہیں۔ جس طرح قرآن کریم حق ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب ہے اور صحیفہ کائنات اسکی فعلی کتاب ہے' دونوں حق ہیں اور دونوں پر ایمان لانا یکساں طور پر فرض ہے۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ کے الفاظ سے کھل کر ثابت ہو رہا ہے کہ آیات قرآنیہ کی قرآنی تفسیر ان لوگوں کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کائنات کا علم حاصل کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کائنات سے جاہل ہیں وہ قرآن کریم کی اس تفصیل سے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید کے اندر کر رکھی ہے (2/159) کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کتاب کائنات ہی کے متعلق اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

بلاشبہ دن اور رات کے بدل بدل کر آنے' اور جو کچھ بھی اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا
ہے' ان سب میں اس قوم کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو (خطرات سے) خود بچتے ہیں۔

لقوم یتقون کے مطابق اس آیت سے عیاں ہے کہ دن رات کے نظام اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہے ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں' جو خود بچتے ہیں لفظ یتقون اپنے سہ حرفی مادہ و-ق-ی= وقی کے باب افتعال سے ہے' جس کا معنی ہے خود بچنا۔ اس مادہ سے اسم فاعل ہے متقی' یعنی خود بچنے والا۔ اور بچاجاتا ہے ہمیشہ خطروں سے اسلئے اسکا ترجمہ لکھا گیا ہے کہ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو خطرات سے خود بچتے ہیں۔ اب چونکہ ذکر ہے دن رات کے بدل بدل کر آنے کا' اسلئے ظاہر ہے کہ یہاں دن رات کے خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ خطرات کون کونسے ہیں؟

اس سوال کے بہت سے جواب ہر آن سامنے موجود ہیں کہ نوع انسان دن کے وقت بھی خطرات ہی میں گھری ہوئی ہے اور رات کے وقت بھی اسے خطروں ہی کا اندیشہ دامن گیر رہتا ہے۔ ادھر ضروریات زندگی میں سے خوراک اور پوشاک کی فکر ہے اور ادھر رہائش اور علاج کا اندیشہ ہے۔ ایک طرف غیر مہذب چوروں' ڈاکوؤں اور جیب تراشوں کا خوف لاحق ہے کہ صفایا نہ کر جائیں تو دوسری طرف مہذب ڈاکوؤں یعنی ناجائز منافع خور ذخیرہ اندوزوں سے خطرہ ہے کہ ناخالص مال اور کم ناپ تول کے ذریعہ جیب کا صفایا نہ کر دیں۔

ایک طرف تو دن رات دامنگیر رہنے والے مذکورہ بالا خطرات ہیں اور دوسری طرف اچانک حادثوں یعنی ایکسیڈنٹوں کی فکر ہے جو سفر ہو یا حضر ہر وقت پیش آسکتے ہیں۔اور دوسرے طرف سیلابوں اور طوفان باد و باراں کا بھی خطرہ ہے اور آگ کے

حادثوں کا بھی اندیشہ ہے۔ لہذا آئت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ دن ہو یا رات' جو لوگ دن رات پیش آنیوالے خطرات سے خود بچنا چاہتے ہیں ان کے لئے ان میں بہت سے واضح نشانات موجود ہیں یعنی وہ لوگ مذکورہ بالا خطرات کے انسداد میں ہر آن کمر بستہ رہتے ہیں۔ جن خطرات کا تعلق مجموعی سطح کیساتھ ہے۔ ان کا انسداد مجموعی طور پر یعنی سرکاری سطح پر ہر آن جاری رہتا ہے مثلاً" ہر سال آنیوالے سیلابوں کی روک تھام کے لئے مضبوط بندھ باندھے جارہے ہوتے ہیں اور ٹریفک کے حادثوں کی روک تھام کے لئے یکطرفہ آمد و رفت کے لئے سڑکیں کشادہ اور ٹریفک پولیس کا معقول انتظام کیا جارہا ہوتا ہے۔

اور جن خطرات کا تعلق انفرادی سطح کیساتھ ہے ان کا انسداد انفرادی طور پر ہر فرد کی طرف سے جاری و ساری رہتا ہے اسکے برعکس جو لوگ متقی نہیں ہیں' یعنی جو لوگ ان خطرات سے خود ہی بچنا نہیں چاہتے وہ مذکورہ بالا جرائم میں سب مبتلا رہتے ہیں یعنی زید بکر کو مہذبانہ طریقے سے لوٹ رہا ہوتا ہے اور بکر' امر کی جیب کاٹ رہا ہوتا ہے سرکاری سطح پر سیلابوں کی روک تھام کے لئے کروڑوں روپیہ وقف کیا جاتا مگر یہ رقم ٹھیکیداروں اور سرکاری عملہ کی ملی بھگت کی نذر ہو جاتی ہے' عوام کو دکھانے کے لئے غیر محفوظ اور کمزور سے بندھ بنا دیئے جاتے ہیں اور اگلے سال جب پھر سیلاب آتا ہے تو بچارے نشیبی علاقوں کے لوگ' پھرپانی میں گھر جاتے ہیں اور ہوائی جہاز ان پر اوپر سے غذائی سامان گراتا ہوا پایا جاتا ہے۔ المختصر! ما خلق اللّٰه فی السموت و الارض کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے متقی لوگ ہر چیز کے خطرناک پہلو سے بچنے کے سامان ہر آن خود کرتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے ہر چیز میں بہت سے نشانات موجود ہیں جن کی وضاحت سطور بالا میں صراحتاً" کر دی گئی ہے۔ آئت مجیدہ سے عیاں ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو دن رات کے ارضی اور سماوی خطرات کا انسداد کرتے ہیں' ہر آن مصروف عمل رہتے ہیں۔ متقی وہ نہیں جو خود ہی خطرات کا موجب بھی بنتے ہیں اور خود ہی خطرات میں مبتلا بھی رہتے ہیں۔

اگلی آیت مجیدہ میں ان لوگوں کے متعلق جو قیامت کی جوابدہی کے منکر ہیں۔ مکرر ارشاد ہوا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا
وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ۝ ۷
أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ ۸

بلاشبہ وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے امید وار نہیں (یعنی جو ہمارے حضور جوابدہی کے منکر ہیں) اور وہ اس دنیا ہی کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو چکے ہیں اور وہ لوگ جو ہماری مذکورہ بالا (کائناتی) آیات مبارکہ سے غافل ہیں۔ یہ سب لوگ وہ ہیں کہ انکا ٹھکانہ آگ ہے انکی ان کرتوتوں کی عوض جو وہ خود کرتے رہے تھے۔

لقاءنا کا لفظی معنی ہے ہماری ملاقات۔ لیکن قرآن مجید میں لقاء اللّٰه' لقاء رب' لقائه اور لقاءنا کا مرکب اضافی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جس کا مفہوم ہے "اس دنیا کی زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے قیامت کی عدالت الہیٰ میں حاضر ہونا" جیسے سورہ سجدہ میں لقاء رب کی وضاحت منکرین قیامت کے ذکر میں بالفاظ ذیل کر

د ی گئی ہے:-

وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ بَلۡ هُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّهِمۡ كٰفِرُوۡنَ (32/10) وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَسَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ (32/12) اور کہتے ہیں کیا جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے (یعنی جب مرنے کے بعد ہمیں مٹی کھا جائیگی اور ہم مٹی میں ملکر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم کو نئے سرے سے پھر پیدا کر لیا جائیگا؟ (ہاں ضرور پیدا کر لیا جائیگا) حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ (یعنی اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے قیامت کی عدالت باری تعالیٰ میں حاضر ہونے کے انکاری ہیں) اور اے مخاطب! کاش کہ تو مجرموں کو (بنگاہ تصور) دیکھے جب وہ اپنے رب کے حضور میں سر اوندھے کئے (حاضر) ہوں گے (اور کہیں گے کہ) اے رب ہمارے ہم نے سمجھ لیا ہے اور سن لیا ہے۔ پس تو ہمیں (ایک مرتبہ پھر دنیا میں) لوٹا دے' ہم اعمال صالح بجالائیں گے۔ بیشک (اب ہم قیامت کی عدالت عالیہ میں اعمال کی جوابدہی پر) یقین رکھنے والے ہیں۔

دیکھا آپنے کہ آیات بالا 32/10' 32/12 میں کس طرح کھل کر بیان کر دیا گیا ہے جو لوگ قیامت کے منکر ہیں یعنی مر کر مٹی میں مٹی ہو جانے کے بعد دوسری زندگی کے انکاری ہیں' وہ دراصل لقاء رب کے منکر ہیں۔ اور لقاء رب کی تفسیر ان لفظوں میں کر دی گئی ہے۔ کہ وہ اپنے برے اعمال کی بدولت قیامت کی عدالت میں اپنے رب کے حضور سر جھکائے کھڑے ہونگے اور کہہ رہے ہونگے کہ بار الٰہی! ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں بھیج' اب ہم نے قیامت پر یقین کر لیا ہے۔ اب ضرور نیک عمل بجالائینگے۔

رَضُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِهَا کے الفاظ میں اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں آرام و آسائش حاصل ہو جانے پر صرف اسی زندگی پر راضی اور مطمئن نہیں ہونا چاہئے' بلکہ اگلی زندگی کی کامیابی کی فکر میں لگے رہنا چاہئے' جس کی عملی صورت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اعمال صالح بجالائیں تاکہ قیامت کی عدالت الٰہی میں شرمساری کیساتھ سر جھکا کر کھڑا نہ ہونا پڑے اور نہ یہ التجا کرنی پڑے جو ہرگز قبول نہیں ہوگی کہ ہمیں دوبارہ دنیامیں بھیجئے تاکہ ہم اعمال صالحہ بجالا کر تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ بلکہ آج جو موقعہ دیا گیا ہے' اس میں زیادہ سے زیادہ صلاحیت بخش اعمال بجالا کر قیامت کا مسئلہ حل کر لینا چاہئے۔

وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ کے الفاظ میں جو اٰيٰتِنَا سے غفلت کی خبر دیگئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی تنزیلی اور تکوینی دونوں قسم کی آیات مبارکہ سے باخبر رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تنزیلی آیات مبارکہ وہ ہیں جو بطریقہ تنزیل قرآن حکیم کے اندر جمع کر دیگئی ہیں اور تکوینی آیات مبارکہ وہ ہیں جو اس کائنات کے چپے چپے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند بڑی بڑی آیات کا ذکر پہلے کئی آیتوں میں گذر چکا ہے۔ سورج اور چاند کی منزلوں کا تقرر' اختلاف لیل و نہار' یعنی دن رات کا سلسل ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے آتے چلے جانا' اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے سب کی سب اللہ تعالیٰ کی تکوینی آیتیں ہیں وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَّقُوۡنَ (10/6)

اولٰئک ماوٰہم النار کے الفاظ میں ان لوگوں کے متعلق خبر دیگئی ہے جو اس دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو جاتے ہیں اور اخروی زندگی کی کامیابی کے لئے اعمال صالح بجا لانے کی فکر نہیں کرتے' انہیں اس زندگی میں بھی آگ کا عذاب ملتا ہے۔ یہاں بھی ناہموار و غیر متوازن معاشرہ کی آگ میں جلتے ہیں اور دوسری زندگی میں بھی انہیں ناکامی و نامرادی کی آگ میں جلنا پڑیگا۔ انہیں ایسے طبقوں میں پھینکا جائیگا جن کی فضا مجسم آگ ہوگی۔ جس کی بدولت پینے کو گرم پانی میسر آئیگا اور ان طبقوں میں کھانے کیلئے تھوہر وغیرہ کے سوا کوئی چیز پیدا ہی نہ ہوتی ہوگی۔

بما کانوا یکسبون کے الفاظ میں کھل کر اعلان کر دیا گیا ہے کہ قیامت کے منکروں بد عملوں اور بد کرداروں کو جو مذکورہ سزا دنیا میں دی جارہی ہے او جو قیامت کے دارالجزا میں دیجائیگی یہ انکے اپنے برے عملوں ہی کی ہے اور ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم بھی ہے اور عزیز ذوانتقام بھی ہے۔ یعنی نیک عمل بجالانیوالوں کے لئے شفقت کرنیوالا مہربان ہے اور برے عمل بجالانیوالوں کے لئے انہیں پوری پوری سزا دینے پر غالب ہے۔

آیات بالا میں بد کردار منکرین قیامت کی سزا بیان کرنے کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں نیکو کار' یعنی عملاً" قائلین قیامت کی جزا بیان ہوئی ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿۹﴾

بیشک جو لوگ (لقاء رب قیامت کی جوابدہی پر) ایمان رکھتے' اور صلاحیت بخش عمل بجالاتے ہیں' انکا رب انکے باعمل ایمان کی بدولت' انکی رہنمائی کرتا ہے' ان کے ماتحت نعمتوں والے باغوں میں نہریں بہ رہی ہوتی ہیں۔

تجری من تحتہم الا نہر کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں:۔

قرآن مجید میں عموماً" یہ الفاظ آئے ہیں جنت تجری من تحتہا الا نہر کہ قیامت کے باعمل قائلین کو انکے نیک اعمال کی جزا کے طور پر ایسے باغات عطا کئے جائینگے جن کی سطح میں نہریں بہتی ہیں۔ یہاں من تحتہا میں ھا ضمیر کا مرجع جنت ہے۔ مگر آیت زیر بحث 10/9 میں اس کے برعکس من تحتہم کے الفاظ آئے ہیں جن میں ھم ضمیر کا مرجع الذین امنوا وعملوا الصلحت ہے یعنی وہ لوگ جو لقاء رب پر ایمان بھی لائیں اور اس ایمان کی تصدیق کے لئے صالح اعمال بھی بجالاتے رہیں' یعنی ایسے عمل کریں جن سے معاشرے کی اصلاح ہوتی چلی جائے۔ ان کے متعلق یہ الفاظ لائے گئے ہیں کہ انکے ماتحت نہریں بہتی ہونگی۔

کسی کے ماتحت نہروں کی بہنے کی اصطلاح قرآن مجید میں آزاد' طاقتور حکومت کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ جیسے کہ سورہ زخرف میں آیا ہے جب موسیٰؑ نے فرعون کو مصر کا غاصب حاکم قرار دیا تو اسکے متعلق آیا ہے:۔ وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي (43/51) اور فرعون نے اپنی قوم

کو بلایا اور کہا اے میری قوم کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ (مصر میں بہنے والے) دریا میرے ماتحت نہیں چلتے۔ پس آیت بالا میں ایمان لانیوالے اور نیک اعمال بجالانیوالوں کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ انہیں آزاد اور طاقتور حکومت میسر آئیگی جس میں انکے ماتحت دریا بہتے ہونگے۔ واضح رہے کہ دریاؤں کا بہنا زراعت کی زیادتی اور رزق کی فراوانی کا نشان ہے۔

جنت النعیم کی اصطلاح متوازن معاشرہ کے لئے بھی آتی ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں بہتی نہروں والی حکومت کے مالک مومنوں کی دعا اور انکے اعلان عام کی خبر دی گئی ہے:۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾

اس (بہتی نہروں والی حکومت) میں (اپنے رب کے حضور مومنوں کی پکار دعا یہ ہوتی ہے کہ اے اللہ تو (ہر قسم کے عیوب و نقائص سے) پاک ہے اور اس حکومت میں انکی باہمی دعا ہوتی ہے " سَلٰمٌ" (یعنی سلامتی کا پیغام) اور اُن کی آخری دعا ہے کہ سب تعریف اللہ کیلئے جو جہانوں کا رب ہے۔

اس آیت مجیدہ میں دعا اور تحیت کا فرق یہ ہے کہ حضور الٰہی میں دعا کے الفاظ ہیں سبحنک اللھم اے اللہ تو ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ اور تحیت باہمی ہے "سلم" یعنی مکمل سلامتی کا اعلان عام۔ بالفاظ دیگر جو نظام بہتی نہروں والی ریاست میں نافذ کیا گیا ہے وہ مکمل طور پر امن و سلامتی کی اساس پر قائم ہے۔ اور:۔

واخر دعوھم ان الحمد للّٰہ رب العلمین کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ امن سلامتی کے لئے آخری پکار دعا صرف یہ ہے کہ سب اچھی تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو عالمین کا رب ہے۔ بالفاظ دیگر امن و سلامتی کی اساس پر قائم کردہ معاشرہ کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ کہ اسکا نقطہ ماسکہ ربوبیت عالمینی ہوگا۔ اس میں ہر ایک متنفس کی ربوبیت کی ذمہ داری مرکزی نظام پر عائد رہے گی۔ تاریخ اسلام میں مذکور عمرؓ خلیفہ ثانی کے الفاظ ذیل اسی قرآنی نظریہ ربوبیت عالمینی کے مظہر ہیں کہ:۔

اگر دریائے دجلہ تک کوئی کتیا بھی بھوکی رہ گئی تو مجھ سے پوچھا جائیگا کہ کیوں بھوکی رہی؟

نوع انسانی بڑی جلد باز ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا توبہ اور اصلاح کی مہلت دیتا ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو سزا دینے میں جلدی کرے، جیسے کہ وہ بھلائی طلب کرنے میں جلدی

کرتے ہیں تو (غلط کاروں کی سزا کا) وقت کبھی کا پورا ہو چکا ہو۔ (مگر ہم مہلت دیتے ہیں) پس ہم
ان لوگوں کو انکی سرکشی میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں جو ہمارے حضور اعمال کی جوابدہی کے
امیدوار نہیں ہیں۔

لفظ استعجال کا سہ حرفی مادہ ع-ج-ل= عجل ہے۔ اسکا بنیادی معنی ہے جلدی کرنا۔ استعجال باب استفعال سے ہے جو یہاں مفعول مطلق کے طور پر آیا ہے اور لوگوں کی بھلائی کی طلب میں جلدی کرنے کیساتھ تشبیہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اسکا فعل بھی حذف ہے اور حرف کاف تشبیہ بھی محذوف ہے۔

اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے لئے مہلت دیتا ہے سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا

لقضی الیھم اجلھم کے الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے اگر اللہ تعالیٰ سزا دینے میں جلد باز ہوتا تو انسان جس طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں' سرکشیاں اور طغیانیاں کرتا ہے' ہر نافرمان کو ساتھ کے ساتھ سزا دیتا چلا جائے۔ مگر اسکا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر سرکش بد کردار کو ایک معقول وقت کی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔

نوع انسان کے جرائم' سرکشیوں اور طغیانیوں کی دو قسمیں ہیں۔ **انفرادی اور اجتماعی**

1- انفرادی جرائم کی سزا میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت

انفرادی طور پر ہر شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے انفرادی جرائم کا جوابدہ ہے اور عدم توبہ و اصلاح کی صورت میں اپنی نافرمانیوں کی سزا کا مستحق بھی ہے۔ بعض انفرادی جرم ایسے ہیں کہ مجرم ان کی ریاستی سزا سے بچ جاتا ہے کہ یا تو اسکے معاشرتی وسائل اتنے وسیع ہیں کہ ایک غلط قسم کی حکومت کا ہاتھ ہی اس تک نہیں پہنچ سکا اور یا اگر وہ پکڑا بھی گیا ہے تو جھوٹی شہادتیں پیش کر کے بری ہو گیا ہے۔ اسکے باوجود بھی للہ تعالیٰ مجرم کو مہلت عطا فرماتا ہے کہ اب بھی توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔ بصورت دیگر قیامت کی عدالت عالیہ میں ضرور ضرور حاضر ہونا ہو گا۔ اور سزا بھی ضرور مل کر رہیگی۔ اس پاک عدالت میں نہ کوئی نفس کسی نفس کے کام آسکے گا' نہ اسکی رہائی کے لئے کسی کی شفاعت قبول کیجائیگی' نہ اس سے رشوت لیجائیگی اور نہ ہی مجرموں کی کسی قسم کی کوئی اور مدد کی جائے گی۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (2/48)

پس اس طرح ہر شخص کی پوری زندگی توبہ اور اصلاح کے لئے للہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت ہے۔

2- اجتماعی جرائم کی سزا میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مہلت

واضح رہے کہ جس طرح ہر شخص انفرادی طور پر بلا توبہ اپنے اپنے جرائم کی سزا کا مستحق ہے اسی طرح اجتماعی طور پر ہر قوم بھی قومی جرائم کی سزا کی مستوجب ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ اور اصلاح کے لئے افراد کو مہلت عطا کی گئی ہے اسی طرح قوموں کو بھی توبہ اور اصلاح کے لئے مہلت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ جلدی نہیں کرتا۔ مثلاً قوم نوحؑ کو ساڑھے نو سو برس کی مہلت عطا ہوئی مگر یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ قومی جرائم کی سزا کے لئے اگرچہ صدیوں کی مہلت عطا فرماتا

ہے مگر جب مجرموں کے جرائم کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو پکڑتا اسی دنیا میں ہے۔ جیسے قوم نوحؑ اور اسکے بعد قوم عاد و ثمود کو بھی الگ الگ مہلت دی گئی۔ مگر جب پکڑا تو قوم نوحؑ کی طرح نیست و نابود کر دیا۔ اور آج درس عبرت کے لئے ان کے قصے صرف کتابوں میں باقی ہیں۔

قوم یونسؑ بصمیم قلب توبہ اور فوری اجتماعی اصلاح کی بدولت قومی جرائم کی سزا سے بچ گئی۔ صرف یہ ایک اکیلی قوم ہے جس نے قرآنی شہادت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے قانون توبہ واصلاح سے فائدہ اٹھایا' جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے انتہائی منفرد انداز کیساتھ فرمایا ہے۔ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَا اِيْمَانُهَا اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ (10/98) واضح رہے کہ اس آیت مجیدہ میں امنت کے بعد واصلحت کا لفظ محذوف ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے 6/53 اور 16/119 میں بصورت قانون بتکرار اعلان فرمارکھا ہے۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ پھر بلاشبہ تیرا پروردگار ان لوگوں کے لئے جو نادانی کے ساتھ برے عمل کریں۔ پھر اسکے بعد توبہ کر کے اصلاح کر لیں تو بیشک تیرا پروردگار اسکے بعد غفور رحیم ہے○ ان آیات مجیدہ نے انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے جرائم کی سزا سے بچنے کی ایک ہی صورت بتائی ہے توبہ اور اصلاح۔ اوراسکے لئے باری تعالیٰ نے افراد و اقوام دونوں کی اتمام حجت کے لئے عطاء مہلت کا مستقل قانون مقرر کر دیا ہے۔

فنذر ـــــ فی طغیانهم یعمهون کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں۔ جن میں کہاگیا ہے کہ ہم انہیں انکی سرکشی میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں۔ یعنی انسان کو جب اسکی سرکشیوں میں ڈھیل ملتی ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ اب مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کا اصل نقشہ یہ پیش کیا ہے کہ وہ اپنی سرکشیوں میں حیران و سرگرداں پھر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں قلبی اطمینان و سکون ہرگز میسر نہیں ہوتا۔ حرام کا مال جمع کر لیا تو قانون کی گرفت کا کھٹکا الگ لگا رہتا ہے۔ پھراس مال کے چوری ہونے کی فکر الگ دامنگیر رہتی ہے۔ ادھر بیوی بچوں سے جھگڑا ہے۔ ان پر برس رہے ہیں' ادھر ملازموں کی بے پناہ خیانتوں سے خائف ہیں۔ تیسری طرف سرکاری ٹیکس نہ ادانہ کرنے کی فکر میں شبانہ روز سرگرداں ہیں۔ قرآنی الفاظ یعمهون کی تفسیران الفاظ میں پیش کیجا سکتی ہے کہ "ایک سر اور سینکڑوں دردیں" جن کی بدولت ہمہ جہتی پریشانیاں ہر آن سرگرداں رکھتی ہیں۔

انسان کی مطلب پرستی

اگلی آیت مجیدہ میں نوع انسانی کے متعلق خبردی گئی ہے کہ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسے رفع کرانے کے لئے اللہ کے حضور میں کھڑے' بیٹھے اور لیٹے ہر وقت دعائیں کرتا ہے۔ مگر جب وہ رفع ہو جاتی ہے تو ایسا ہوتا ہے جیسے کہ نہ اس پر کوئی تکلیف آئی تھی اور نہ اس نے اللہ کے حضور دعا کی تھی۔ بلکہ جن بد عملیوں کی بدولت وہ تکالیف آئی تھیں انہی میں دوبارہ منہمک ہو جاتا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا
عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞ ۱/۱۲

اور جب انسان کو (اسکی اپنی کرتوتوں کی بدولت) کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے' بیٹھے اور کھڑے (ہر حالت میں) ہمیں پکارتا ہے۔ پھر جب ہم (اپنے قانون کے مطابق) اسے رفع کر دیتے ہیں تو اس طرح چلتا ہے جیسے کہ اس نے اس تکلیف کے لئے جو اسے پہنچی تھی' ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح اسراف کرنیوالوں کے لئے ہم ان کے ان عملوں کو وہ جو کرتے ہیں' زینت دیا ہوا پاتے ہیں۔

مس الانسان الضر میں انسان کو پہنچنے والی تکلیف کے آنے کی وجہ محذوف ہے جو سورہ شوریٰ میں مذکور ہے۔ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (42/30) اور اے نوع انسانی! تمہیں جو بھی مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو تمہاری بہت سی خطائیں معاف کر دیتا ہے۔

اسی طرح کشفنا کے الفاظ میں بھی دفع ضرر کا سبب "مطابق قانون الٰہی" محذوف ہے۔ جیسے کہ ارشاد باری ہے ان اللّٰہ مع الصبرین (3/146) بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو مصائب کا مقابلہ مستقل مزاجی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہر مصیبت کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ قوانین کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ آیت بالا کے الفاظ دعانا کے مطابق جو اللہ کے حضور دعا کی جاتی ہے۔ اسکی غرض ہی اپنے آپکو حصول مقصد کے لئے اس سے متعلقہ قوانین الٰہی پر عمل کرنے کی تحریک ہے۔ واضح رہے کہ دعا کے تین مقام ہیں۔

1- مطلوبہ مقصد کے حصول کے لئے اس سے متعلقہ قوانین الٰہی کے مطابق حتی المقدور انتھک کوشش کرتے چلے جانے کی اپنے آپکو تحریک مسلسل (3/146)

2- حصول مقصد کے لئے امکان بھر کوشش کرنے کے بعد حضور الٰہی میں دعا کرنا کہ باری الٰہا اگر ہم اپنی کوشش میں کہیں بھول گئے' یا خطا کر گئے ہیں تو ہمیں معاف فرمائیو! اور اپنے جنود السموت و الارض کے ذریعہ ہماری کمی پوری کر دیجیو! (2/286)

3- تیسرے نمبر پر دعا کا مقام وہ ہے جب حصول مقصد کے لئے حتی المقدور کوشش کرنے کے بعد اسباب و ذرائع کے تمام دروازے بند ہو جائیں تو صرف ایک دروازہ اللہ تعالیٰ کا کھلا ہوتا ہے۔ اسوقت کسی بھی پیر فقیر اور ولی بلکہ کسی نبی تک سے بھی مدد مانگنا حرام ہے کیونکہ خود نبیوں پر بھی مشکل وقت آیا کرتے تھے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگا کرتے تھے (19/5' 21/78)

فلما کشفنا یعنی جب ہم مشکل کے بند کھولدیتے ہیں' کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے مشکل کشائی کو صرف اپنے لئے مختص کر رکھا ہے۔

مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ کے الفاظ میں انسان کی خصلت جتائی گئی ہے کہ جب ہم اسکی مشکل حل کر دیتے ہیں تو پھر

اس طرح اکڑ کر چلتا ہے، جیسے نہ اس پر کوئی مشکل آئی تھی اور نہ ہی اس نے اللہ تعالیٰ کو پکارا تھا۔

زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو نہ صرف یہ اپنی اس روش کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ وہ روش انکے لئے مزین کر دی گئی ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشکل کشائی کے بعد دیگ پکار کر رشتہ داروں میں بانٹ دیتے ہیں، یا کسی مزار پر غلاف چڑھا کر اور یا محلے کی مسجد میں صفیں بچھا کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشکل کشائی کی قیمت ادا کر چکے ہیں۔ اور اسکے بعد پھر حسب سابق مسلسل اعمال بد میں لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ چاہئے تو یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے مشکل سے نجات عطا فرمائی ہے تو آئندہ کے لئے برے عملوں سے بصدق ذہن تائب ہو کر ضابطہ الٰہی پر صد فیصد عامل ہو جائیں اور گذشتہ مشکل و مصیبت کو ایک تازیانہ عبرت تصور کریں۔

اگلی آیت مجیدہ میں ان سابقہ اقوام کی ہلاکت کاملہ کی خبر دی گئی ہے جنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کر کے آیات باری تعالیٰ کا انکار کیا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

البتہ تحقیق ہم نے تم سے پہلے زمانوں کے لوگوں کو اسوقت ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی، حالانکہ انکے پاس انکے رسول (اللہ کی طرف سے) واضح دلائل لے کر آئے مگر وہ ان پر ایمان نہ لائے۔ ہم مجرم قوموں کو اسی طرح (ہلاک کر کے ان کے جرائم کی) سزا دیتے ہیں۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت جاریہ کی خبر دی ہے کہ وہ کسی بھی مجرم قوم کو اس کے جرائم کی سزا سے مستثنیٰ نہیں کرتا۔ یعنی اے امتِ محمدیہ اگر تم بھی سابقہ اقوام کی بد کرداریوں کی راہ اختیار کرو گے تو تمہیں بھی جرائم کی سزا ضرور ضرور دیجائیگی۔ کیونکہ اللہ کا قانون کبھی نہیں بدلتا۔ چنانچہ اسی سزا سے باخبر کرنے کے لئے اگلی آیت مجیدہ میں براہ راست مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

پھر (اے وہ قوم جنہیں قرآن دیا گیا ہے) ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفے بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل بجا لاتے ہو۔

یہ تنبیہہ قیامت تک کی پوری امت مسلمہ کو کی گئی ہے۔ کتاب الٰہی کے اولین مخاطب مسلمان کتاب اللہ قرآن مجید پر صد فیصد عمل کرنے سے نہ صرف یہ کہ دنیا میں کامیاب ہوئے اور طاقتور اسلامی حکومت نصیب ہوئی بلکہ انہیں رضی اللہ عنہم اور رضوا عنہ کی عظیم سند خوشنودی بھی عطا کی گئی۔

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (9/100) اور مہاجرین و انصار صحابہ میں سے جنہوں نے ہجرت و نصرت میں سبقت کی اور اولیت اختیار کی' اور وہ بھی جنہوں نے انکی حسن کارانہ پیروی کی۔ یعنی جنہوں نے سابقین و اولین کے بعد ہجرت و نصرت کی' ان سب پر اللہ راضی ہو گیا اور وہ سب اللہ پر راضی ہو گئے' اللہ نے انکے لئے ایسے باغات تیار کئے ہیں جن کی سطح میں نہریں بہتی ہیں' وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی تو عظیم کامیابی ہے۔

انہی مہاجر و انصار نے مکہ فتح کیا اور انہی کی خلافت راشدہ میں قرآنی نور نے دور دور کے اندھیرے دور کئے۔ امامت امم انکے حصے میں آئی۔ انکے بعد والے اہل اسلام کو ایک طرف سندھ کی اور دوسری طرف سرزمین چین کی حکومت عطا ہوئی مگر جب قرآن سے منہ موڑ لیا تو ان سے قوموں کی امامت چھن گئی۔

اگلی آیت مجیدہ میں زمانہ رسالت کے منکرین قیامت کا ایک مطالبہ اور اسکا جواب بالفاظ ذیل بیان ہوا ہے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ ١٠/

اور جب ان (منکرین قیامت) پر ہماری خود بیان کرنیوالی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہماری ملاقات کے (یعنی ہمارے حضور حاضر ہونے سے) ناامید ہیں' کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لا۔ یا اسے بدل دے۔ اے رسول کہہ دیجئے گا کہ مجھے یہ لائق نہیں کہ میں اسے اپنی خواہش سے بدل دوں۔ میں نہیں اتباع کرتا مگر اسکی جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (یعنی نہ میں قرآن کا غیر لا سکتا ہوں اور نہ اسے بدل سکتا ہوں)۔

مثلہ معہ کی تردید

ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ نبی اکرمؐ کی مدمقابل قوم نے یہ مطالبہ کیا کہ آپ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لائیں یا اسے بدل دیں۔ مگر انکا یہ مطالبہ ذات باری نے خود اپنے الفاظ میں اس طرح نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے مسترد کرا دیا کہ اس سے اس وضعی روایت کی تردید ہوتی ہے جو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب ہے انی اوتیت القران و مثلہ معہ بیشک میں قرآن دیا گیا ہوں اور اسکے ساتھ اس جیسا کچھ اور بھی دیا گیا ہوں۔ نیز کہا جاتا ہے۔ كَانَ جِبْرَئِيلُ يَنْزِلُ بِالسُّنَّةِ كَمَا يَنْزِلُ بِالْقُرْآنِ جبریل جس طرح قرآن لیکر نازل ہوتا تھا اس طرح سنت لیکر نازل ہوتا تھا۔ اب غور فرمائیں کہ نبی اکرمؐ سے آپ کے مدمقابلین نے یہ مطالبہ کیا کہ آپ اس قرآن کے سوا کوئی

اور قرآن لائیں یا اسے بدل دیں تو اگر قرآن کے سوا بھی کچھ نبی اکرم پر نازل ہوا ہوتا۔تو جواب یہ ہونا چاہئے تھا کہ لیجئے' اسکے سوا بھی موجود ہے جو مثله معه -ن بالکل قران جیسا منزل من اللہ ہے۔ مگر وہاں آپکا کوئی اور وحی پیش نہ کرنے سے کھل کر ثابت ہوا کہ انی اوتیت القران و مثله معه والی روائت صد فیصد وضعی اور منگھڑت ہے نبی اکرم پر قرآن کریم کے سوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اور چیز ہرگز نازل نہیں ہوئی تھی نیز یہ جملہ بھی محض خود تراشیدہ ہے۔ کان جبریل ینزل بالسنة کما ینزل بالقران

اَوْبَدِّلْهُ کا جو نبی اکرم سے یہ جواب دلوا دیا گیا ہے۔ مایکون لی ان ابدله من تلقای نفسی کہ میری یہ شان نہیں ہے کہ میں اسے (قرآن کو) اپنی خواہش سے بدل دوں۔ یہ الفاظ اس روائتی نظریہ کی تردید کرتے ہیں جو کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم وحی کے سوا بولتے ہی نہیں تھے۔ کیونکہ اگر نبی اکرمؐ کا ہر نطق وحی الہی ہوتا تو بدله کا جواب یہ ہونا چاہئے تھا کہ میری طرف سے قرآن حکیم کو بدلنے کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا میں تو وحی کے بغیر بولتا ہی نہیں۔ کیونکہ میرے ہر نطق میں اللہ تعالیٰ اپنی وحی ہی کو میری زبان پر جاری کرتا ہے۔ اسکے برعکس یہ جواب دلواتا کہ میرے لئے یہ لائق نہیں کہ میں اپنی خواہش کے ساتھ قرآن کو بدل دوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ کے جملہ بشری اقوال آپ کی اپنی خواہش کے مظہر ہوتے تھے۔ مگر اس صادق و مصدوق سلام علیہ کے بشری اقوال کی بھی یہ مخصوص حالت تھی کہ پوری نبوت کی زندگی میں ایک ہی قول ایسا فرمایا جس پر تنبیہ نازل ہوئی۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (9/43) اللہ آپکو معاف کرے آپنے انہیں جنگ میں عدم شرکت کی اجازت کیوں دی ہے؟ اسکے سوا آپکی زبان مبارک سے 23 سال کے عرصہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہ نکلا جس پر کوئی تادیب نازل ہوئی ہو۔ اور یہ اجازت بھی نبی اکرم کی انتہائی شرافت طبع کی دلیل ہے کہ منافقوں نے جو جو عذر پیش کئے۔ مثلاً" میرا گھر اکیلا ہے یا میرے مویشی بھوکے ہیں یا میرا فلاں عزیز بیمار ہے۔ نبی اکرمؐ نے انکے عذروں کو صحیح جانا اور اجازت دیدی۔ اسکے علاوہ جو نبی اکرم پر کتب روایات نے جو ذیل کے بہتان باندھ رکھے ہیں کہ نبی اکرم نے شہد حرام قرار دیا تھا اور تنبیہ نازل ہوئی تھی لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (66/1) ان الفاظ میں تو نبی اکرم کو اس فعل سے بری قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ لم تحرم استفہام انکاری ہے اور معنی یہ ہے کہ آپ اس چیز کو کیوں حرام کریں گے جو اللہ نے آپکے لئے حلال فرمائی ہے۔ یعنی آپ ہرگز ہرگز ایسا نہیں کرینگے۔ یہی حال روائتی تفاسیر کے لگائے گئے باقی بہتانوں کا ہے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا (18/23) کے الفاظ میں تادیب نہیں بلکہ ہدایت کی گئی ہے کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑیں جس طرح اصحاب کہف بر وقت غار میں پہنچ گئے تھے۔ اور قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ (58/1) سے یہ ہرگز ثابت نہیں کہ نبی اکرم نے یہ کہا ہو کہ طلاق ہو گئی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جھگڑنیوالی عورت کے حق میں اور نبی اکرم کے خلاف فیصلہ دیا ہو۔ بلکہ نبی اکرم نے اپنی عظیم قرآنی بصیرت کے مطابق یہی فرمایا کہ طلاق نہیں ہوئی۔ عورت کہتی رہی ہو گئی ہے - چنانچہ وحی الہی نے نبی اکرم کے ارشاد ہی کے مطابق فیصلہ دیا کہ جو لوگ بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ انکی مائیں نہیں بن جاتیں۔

انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم کے الفاظ سے عیاں ہے کہ آپ بڑے دن کے عذاب سے اسلئے ڈرتے تھے کہ قرآن کو کہیں اپنی خواہش سے بدل نہ دیں۔ اگر نبی اکرم کا ہر قول وحی ہوتا تو قرآن کو اپنی خواہش سے بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ کے ہر قول وحی کے نظریہ کے مطابق آپکی خواہش کی مطلقاً" نفی ہو جاتی

(فاعتبروا یا ولی للابصار)

نگہ بازگشت

آیت مجیدہ 15 میں خبر دی گئی ہے کہ زمانہ رسالت کے وہ لوگ جو اس دنیا کے اعمال کی قیامت کی عدالت الٰہی میں جوابدہی کے منکر ہیں' جب ان پر ہماری آیات بیّنٰت خود بیان کرنیوالی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ (انہیں اپنے عقائد کے خلاف پاکر) یہ کہتے ہیں کہ (اے مدعی نبوت) اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لائیں اور (اگر ایسا کرنا ممکن نہیں تو) اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیجئے (تاکہ ہمارے لئے قابل قبول ہو جائے)

مگر منکرین قیامت کے اس مطالبے کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو حکم دیا کہ آپ کہہ دیجئے گا۔ میری یہ شان نہیں ہے کہ اس قرآن میں اپنی خواہش کے ساتھ کوئی تبدیلی کر لوں (ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی عظیم نا فرمانی اور موجب عذاب عظیم ہے) میں تو صرف اسکی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتاہے) اگر میں (قرآن میں تبدیلی کر کے) اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بلاشبہ میں بھی بڑے دن (قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

اس آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کی شان امانت و دیانت اجاگر فرمائی گئی ہے کہ آپنے اللہ کی کتاب میں نہ کسی قسم کی کمی بیشی ہی فرمائی تھی نہ ردوبدل۔ بلکہ بلغ ما انزل الیک من ربک (5/67) کے مطابق جو کچھ نبی اکرمؐ کی طرف رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا من وعن اہل عالم تک پہنچا بھی دیا تھا۔ اور خود زندگی بھر اسی ما انزل اللّٰہ کی اتباع فرما کر اپنی شان رسالت اور شان عبدیت کا بھی پورا پورا ثبوت بہم فرما دیا تھا۔

اگلی آیت مجیدہ میں قل ہی کے تکرار کیساتھ نبی اکرمؐ سے منکرین قیامت کو یہ جواب بھی دلوایا گیا ہے کہ میں تم لوگوں کے سامنے جو (قرآن) تلاوت کرتا ہوں وہ منشاء الٰہی کے مطابق ہے۔ تم لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہو کہ اس سے پہلے میں نے نہ کبھی جھوٹ بولا ہے نہ کسی پر جھوٹ باندھاہے۔ میں تمہارے درمیان زندگی کا ایک حصہ گزار چکا ہوں۔ چالیس سال۔ میں اللہ کے ذمہ کس طرح جھوٹ لگا دوں۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑯

(اے رسولؐ!) کہہ دیجئے گا کہ اگر اللہ چاہتا تو میں اسے (قرآن مجید کو) تم پر نہ پڑھتا۔ اور نہ وہ تمہیں (میرے ذریعہ) اسکا علم دیتا۔ (یہ سب کچھ اسکی منشا کے مطابق ہے۔ پھر میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں۔ پس کیا تم عقل نہیں کرتے (کیا میں نے کبھی کسی پر جھوٹ باندھا تھا۔ کہ اب اللہ پر جھوٹ باندھوں)

اَدْرٰىكُمْ کا سہ حرفی مادہ د۔ر۔ی = دری ہے اور کم ضمیر جمع مخاطب کی ہے۔ اس مادہ کابنیادی معنیٰ ہے کسی چیز سے واقف کرنا' روشناس کرنا' کسی چیز کا علم دینا۔ لَا اَدْرٰىكُمْ میں فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور اسکا معنیٰ یہ ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ

تمہیں اس قرآن سے واقف کرتا' نہ اسکا تمہیں علم دیتا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ کے الفاظ میں منکرین قیامت کے اس مطالبے کا جواب دلوایا گیا ہے جو انھوں نے کہا کہ اسکے سوا کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں تبدیلی کر لیجئے' تم کیوں عقل نہیں کرتے کہ میں نے تمہارے اندر چالیس سال اپنی عمر کا ایک طویل حصہ گزارا ہے۔ کیا تم نے کبھی میری دیانت و امانت پر کوئی حرف رکھا تھا۔ جس نے اتنی مدت میں کسی انسان پر جھوٹ نہیں بولا۔ کسی انسان کی طرف جھوٹ منسوب نہیں کیا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لا کر یا اس میں ردوبدل کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کرے۔ واضح رہے کہ پہلے نمبر پر تو یہ دلیل ان لوگوں کے لئے انکے مطالبے کے جواب میں تھی۔ جو نبی اکرم چالیس سالہ اخلاق و عادات سے پوری طرح واقف تھے۔ اور جنھوں نے آپؐ کے اعلیٰ کردار کی بدولت آپؐ کو صادق و امین کے لقب کے خود ملقب کر رکھا تھا

دوسرے نمبر پر اس آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کی قبل نبوت کی پوری زندگی کے سفید چادر کی طرح بے داغ ہونے کا اعلان کروایا گیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کے اس چیلنج کے جواب میں کسی طرف سے بھی کوئی جواب نہ آیا کہ آپنے اپنی سابقہ زندگی میں فلاں وقت پر فلاں جھوٹ بولا تھا یا فلاں آدی کی طرف فلاں جھوٹ منسوب کیا تھا۔ بلکہ نبی اکرمؐ کی سوانح حیات لکھنے والے غیر مسلم مورخین تک نے بھی اس عبد کامل کی قبل نبوت کی زندگی پر کوئی معمولی ساحرف بھی نہیں رکھا اگرچہ وہ ذاتی طور پر نبی اکرمؐ کے مخالف ہی تھے۔ البتہ غیر مسلم سوانح نگاروں نے آپکے زمانہ رسالت کے متعلق جو سوقیانہ حملے کئے ہیں وہ ان وضعی روایات کی بدولت ہیں جن میں ناموس رسالت کو خود ذخیرہ روایت نے داغدار کر رکھا ہے۔ اس میں زیادہ قصور منکرٹت روایتوں کا ہے' غیر مسلم سوانح نگاروں کا کم ہے۔

الختصر! آیت زیر بحث 10/16 میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کی یہ شان نہیں تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی جھوٹ افتریٰ کر کے غیر قرآن لاتے یا اس میں ردوبدل کر لیتے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اس سے بڑھ کر کون بڑا ظالم ہے جو اللہ کے ذمہ جھوٹ لگائے' اسکی آیتوں کا انکار کرے۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾ ۱۰/۱۷

پس اس سے بڑھ کر کون بڑا ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ افتریٰ کرے (اسکی طرف جھوٹ منسوب کرے) وہ اسکی (نازل کردہ) آیتوں کو جھٹلائے بلاشبہ مجرم کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

اس آیت مجیدہ میں اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹ لگانے اور اسکی آیتوں کو جھٹلانیوالوں کو بہت بڑے مجرم قرار دیا گیا ہے۔ اور پچھلی آیت میں اسی جرم کی سزا بتائی گئی ہے بڑے دن کا عذاب عظیم۔ اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کی مد مقابل قوم کے مخصوص عقیدے کی خبر بالفاظ ذیل دی گئی ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ

شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ قُلۡ اَتُنَبِّـُٔوۡنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۞ ۱۰/۱۸

اور وہ اللہ کیساتھ ان لوگوں کی فرمانبرداری بھی کرتے ہیں جو نہ انہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ کوئی نفع دے سکتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفاعتی ہیں۔ (یہ شفاعت کر کے ہمیں گناہوں کی سزا سے بچالینگے۔ اے رسولؐ!) کہہ دیجئے گا کہ کیا تم (اللہ کے ہاں شفاعتی ٹھہرا کر) اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں کی خبر دو گے (گویاکہ) وہ انہیں آسمانوں اور زمین میں جانتا ہی نہیں۔ وہ (اللہ ایسے مشرکانہ تصور سے) پاک ہے۔ جو یہ لوگ (اسکے ہاں شفیع ٹھہرا کر) شرک کرتے ہیں۔

اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین مکہ غیر اللہ کی فرمانبرداری کرتے تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے شفاعتی قرار دے رکھا تھا۔ مگر الفاظ بالا میں شفاعت کے معنے بتا دیئے گئے ہیں اس چیز کی خبر دینا جسے قاضی یا جج جانتا نہ ہو۔ جیسے کہ سفارش کرنیوالے دنیوی حاکموں کو یہ بتاتے ہیں کہ جناب! اس شخص کو پولیس والوں نے محض شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا ہے۔ یہ بیچارہ تو بیگناہ ہے۔ لہٰذا اسے چھوڑ دیجئے گا۔

واضح رہے کہ لفظ شفاعت کا سہ حرفی مادہ ش۔ف۔ع= شفع ہے۔ جس کا بنیادی معنی ہے۔ کسی کے ساتھ مساویانہ انداز سے کھڑا ہونا۔ جوڑا ہونا۔ چنانچہ 89/2 میں شفع کا لفظ وتر (طاق) کی ضد کے طور پر آیا ہے۔ وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ 89/2 اور شہادت ہے جفت کی اور طاق کی۔ حق شفع بھی اسی مادہ سے مستعمل ہے۔ ہمسایہ کو شفع کا حق اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہمسائے کے ساتھ مساوی کھڑا ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے نظریہ شفاعت کو آئت بالا زیر بحث 10/18 میں اس لئے شرک قرار دیا ہے کہ اس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شفیع اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن معاذ اللہ معاذاللہ! مجرموں کے متعلق وہ خبریں بتائیگا جن کا اسے علم نہ ہو گا۔ قُلۡ اَتُنَبِّـُٔوۡنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ 10/18 مگر قرآن حکیم نے اس نظریہ کو اس لئے باطل اور غیر اسلامی قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر ایک مجرم کے ایک ایک جرم کا خود آپ عینی گواہ ہے۔ اسے کسی شفاعتی کی ضرورت ہی نہیں جو اسے یہ بتائے کہ فلاں شخص مجرم نہیں' یونہی دھر لیا گیا ہے۔

اسکے برعکس شفاعت کے جو معنے روائتی تفاسیر نے لئے ہیں کہ باری تعالیٰ! میری امت کے فلاں فلاں افراد ہیں تو سچے مجرم' مگر تو اپنے قانون مکافات عمل پر خط تنسیخ کھینچ کر انہیں انکے جرموں کی سزا سے بچالے۔ ایسا تصور کسی صورت میں بھی قابل قبول صحیح اور مبنی بر انصاف قرار نہیں دیا جاسکتا" جس سے اللہ تعالیٰ غیر عادل اور غیر منصف بھی ثابت ہوتا ہے' اور جانبدار بھی' کہ باقی انبیاء کرام کی امتوں کو تو یہ رعائت نہ دی جائے مگر امت محمدیہ کو مکمل جانبدارانہ انداز سے عطا کر دی جائے کہ نبی اکرمؐ اپنی امت کے ان افراد تک کی بھی نجات کروالیں جنہیں دوزخ میں بھیج بھی دیا گیا ہو۔ انکے پاس کوئی نیک عمل بھی نہ ہو' صرف انہوں نے کلمہ پڑھا ہو۔ چونکہ اس غیر قرآنی نظریہ کے مطابق نہ ناموس باری تعالیٰ محفوظ رہتی ہے نہ ناموس رسول' اس لئے یہ نظریہ صد فیصد غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی بھی شفیع نہیں ہو سکتا۔ نہ اسے یہ بتانے کے لئے کہ یہ

شخص بیگناہ ہے (اور نہ اللہ تعالیٰ کے جزا سزا کے قانون میں جانبدارانہ استثنٰی پیدا کرنے کے لئے۔

واضح رہے کہ سورہ زمر میں نظریہ شفاعت کی بالفاظ ذیل جڑ کاٹ کر رکھدی گئی ہے۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ○ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (39/44-43) کیا لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شفیع مقرر کر لئے ہیں۔(اے رسولؐ!) کہہ دیجئے گا اگرچہ وہ کسی چیز کے مالک ہی نہ ہوں اور نہ ہی عقل سے کام لیتے ہوں (کہ اللہ تعالیٰ کو شفیع کی ضرورت ہی نہیں) آپ اعلان فرما دیجئے گا کہ شفاعت تو ساری کی ساری صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت صرف اسی کی ہے۔ پھر یہ شفیع ٹھہرانے والے اور شفیع ٹھہرائے گئے) سبھی لوگ' اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے اسی کی طرف لوٹائے جائینگے۔

دیکھئے! ان آیات کریمہ میں للّٰہ الشفاعۃ جمیعا کے الفاظ میں للہ جار مجرور مقدم کے حصر کے ساتھ ببانگ دہل اعلان کر دیا گیا ہے کہ شفاعت کلی طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ کیونکہ نہ شفاعت کے روایتی معنوں کے مطابق' حقے بچے مجرموں دوزخیوں کو دوزخ سے نکال کر قانون مکافات عمل میں جانبدارانہ استثنٰی پیدا کرنے کا غیر منصفانہ اور غیر عادلانہ عمل ہی ذات باری کے شایان شان ہے۔ اور نہ شفاعت کے قرآنی معنوں کے مطابق جو پیچھے 10/18 میں اجاگر کر دیئے گئے ہیں' اللہ تعالیٰ کو کسی شفاعتی کی ضرورت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو یہ بتائے کہ یہ شخص یونہی دھر لیا گیا ہے یہ تو بے چارہ بے گناہ ہے اسے چھوڑ دیجئے۔ یہ ضرورت اس لئے نہیں کہ ہر مجرم کے ایک ایک جرم کا خود اللہ تعالیٰ آپ ہی موقع کا عینی گواہ ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں جہاں شفاعت کا ذکر آیا ہے' وہاں عموماً" الا باذنہ کے الفاظ میں اسکی نفی کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو شفاعت کا قانون ہی کوئی نہیں۔ اور ساتھ ہی اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مجرموں کے آگے پیچھے کو خود اچھی طرح جانتا ہے اسے شفیع کی کیا ضرورت ہے۔ 2/255 میں ارشاد ہوا ہے۔ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ کون ہے جو اس کے حضور (مجرموں کی) شفاعت کر سکے سوائے اسکے قانون کے (اور شفاعت کا قانون ہے کوئی نہیں۔ شفاعت ساری کی ساری خود اس کے اپنے لئے ہے 39/44 کیونکہ) وہ خود جانتا ہے جو کچھ انکے آگے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے) 10/3 میں بھی ما من شفیع الا من بعد اذنہ آیا ہے۔ اسکے ہاں اس کے قانون کے بغیر کوئی شفاعت کرنیوالا نہیں۔

سورہ انبیاء میں ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ 21/28 وہ اللہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے (یعنی جو انہوں نے آگے بھیجا ہے) اور اسے بھی جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے ہے (یعنی جو کچھ انہوں نے پیچھے چھوڑا ہے۔ اس لئے اسے کسی شفیع کی ضرورت ہی نہیں)۔ اور وہ (مزعومہ شفاعتی) شفاعت نہیں کریں گے سوائے اس کے جس کے لئے وہ راضی ہو' اور حقیقت یہ ہے کہ (وہ لوگ شفاعت کیا کریں گے) وہ تو اس دن سب اللہ کے خوف سے خود ڈرتے ہونگے۔ اس طرح سورہ طٰہٰ میں ہے۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ○ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَ

مَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا (20/110) قیامت کے دن شفاعت نفع نہ دیگی سوائے اس کے کہ جس کے لئے رحمن کا قانون ہو۔ اور وہ اس سے (شفاعت کی) بات کے لئے راضی ہو۔ (مگر ایسا ہو کس طرح سکتا ہے جبکہ) وہ اللہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ لوگوں کے آگے ہے (یعنی جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے) اور وہ اسے بھی جانتا ہے جو انکے پیچھے ہے (یعنی جو کچھ انہوں نے پیچھے چھوڑا ہے) اور وہ ٹھہرائے گئے شفاعتی اللہ تعالیٰ کے علم پر محیط نہیں ہیں۔ (بلکہ جب اللہ کا علم سب پر محیط ہے تو اسے شفیع کی کیا ضرورت ہے؟)

دیکھئے! ان آیات مجیدہ میں جہاں شفاعت کا ذکر ہے ساتھ ہی الا باذنہ اور یعلم ما بین ایدیھم و ما خلفھم کے الفاظ میں شفاعت کی نفی کر دیگئی ہے۔ اذن بمعنی قانون کے لئے قرآنی لغت حاضر ہے۔ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا (7/58) اور اچھی زمین کی پیداوار اپنے رب کے قانون کے مطابق اچھی نکلتی ہے اور جو خراب زمین ہے اسکی پیداوار نہیں نکلتی مگر خراب ہی نکلتی ہے۔ دیکھئے! اس آیت میں اذن کا معنی قانون کے سوا کچھ اور لگ ہی نہیں سکتا۔اور قرآن بھر میں شفاعت کا قانون کہیں موجود ہی نہیں۔ بلکہ جار مجرور کے حصر کے ساتھ خود نبی اکرمؐ سے شفاعت کی کلی نفی کا اعلان کرا دیا گیا ہے۔ قل للّٰہ الشفاعۃ جمیعا (39/44) کہہ دیجئے گا کہ شفاعت ساری کی ساری صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اس کے ہاں کوئی شفیع نہیں ہو سکتا۔ (حقیقت یہ ہے کہ اس نظریہ ہی نے مسلمانوں کو جرائم پر دیدہ دلیر کر رکھا ہے)۔

اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ پوری کی پوری نوع انسانی ہر لحاظ سے ایک ہی جماعت ہے۔ پھر انہوں نے ذاتی مفاد میں پڑ کر اجتماعیت کو توڑ دیا اور آپس میں اقتصادی اختلافات پیدا کر لئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بداعمالیوں کی جوابدہی کے لئے قیامت کی عدالت مخصوصہ کا فیصلہ نہ کر دیا ہوتا تو یہ اختلاف اللہ تعالیٰ کو اسقدر ناگوار ہے کہ وہ انکا یہیں فیصلہ کر دیتا۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٩﴾

اور نہیں ہے نوع انسانی مگر ایک ہی جماعت ہے۔ پھر انہوں نے (آپس میں) اختلاف کر لیا۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے (قیامت کا) پہلے سے فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو ان کا یہ اختلاف اس قدر ناگوار ہے کہ (اے رسولؐ!) انکے درمیان اس امر کا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں تیرے رب کی طرف سے یہیں فیصلہ کر دیا جاتا

امۃ واحدۃ کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں۔ کیونکہ اسکا یہ معنیٰ ہے کہ نوع انسانی ہر لحاظ سے ایک ہی گروہ ایک ہی جماعت ہے۔پس نوع انسانی چونکہ پورے کرہ ارض پر آباد ہے۔ اس لئے انسانی وحدت کا دائرہ نہ تو کسی بھی جغرافیائی حدود میں محدود ہو سکتا ہے اور نہ کرہ ارض پر پھیلی ہوئی نوع انسانی کے جدا جدا رنگ اور زبانیں ہی اس عالمگیر وحدت میں حائل ہو سکتی ہیں۔ مگر قرآن کریم کا وحدت انسانی کا اعلان صرف اس لئے نہیں کہ انسان کو صرف اسکی نوعی ایکتا کی خبر دیگئی ہے۔ بلکہ اس پر واضح کر دیا گیا ہے کہ تم سب کے سب کے حقوق و فرائض مطلقاً ایک سے ہیں۔

پوری نوع انسانی کے قرآنی حقوق

قرآن کریم نے پورے کرہ ارض پر بسنے والی نوع انسانی کے متعلق اعلان عام کر رکھا ہے وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (2/36 + 7/24) اور (اے نوع انسانی!) زمین میں تمہارے مرتے دم تک کے لئے تمہارا حق استقرار بھی ہے اور حق ضروریات زندگی بھی ہے۔ یعنی تمہارے ہر فرد کا انسانی حق ہے کہ اسے زندگی کے آخری دم تک کے لئے زمین میں بلا کرایہ مکان بھی میسر رہے اور ضروریات زندگی خوراک لباس اور علاج بھی آخری دم تک کے لئے بلا توقف ملتی رہیں۔ اور واضح رہے کہ جب تک نوع انسانی کو مذکورہ بالا قرآنی حقوق باقاعدہ میسر نہ آئیں۔ اسوقت تک قرآن مجید کے اولین درس الحمد للہ رب العلمین (1/1) کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔ جس کا معنٰی یہ ہے کہ سب اچھی تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو پورے عالمین کی ربوبیت کرنیوالا ہے۔ اور ربوبیت کا بنیادی معنی ہے نقطہ آغاز سے شروع کر کے نقطۂ انجام تک پوری پوری نشوونما کرنا۔ چونکہ ہر فرد انسانی کی دنیوی زندگی کا نقطۂ آغاز اسکی پیدائش ہے اور نقطۂ انجام موت ہے۔ اسی لئے ذات باری نے اعلان بالا 2/36 + 7/24 میں بتکرار فرمایا ہے کہ اے نوع انسانی یہ تمہارا پیدائشی حق ہے کہ تمہیں مرتے دم تک کے لئے رہنے کا مکان بھی میسر رہے اور ضروریات زندگی بھی۔

پوری نوع انسانی کے ذمہ قرآنی فرائض

ذات باری نے اپنی مبارک کتاب میں جہاں نوع انسانی کے مندرجہ بالا حقوق کا اعلان فرمارکھا ہے۔ وہاں اسکے ذمہ فرائض کی وضاحت بھی بالفاظ ذیل کر دی ہے۔

- لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ 90/4 بیشک انسان کو اللہ نے محنت و مشقت کے لئے پیدا کیا ہے۔
- قرآن حکیم میں حرف جار فی کے ذیل کے متعدد معنے مذکور ہیں۔

○ فی معنی میں 14/131 ○ فی معنی کی وجہ سے 12/32 ○ فی معنی مقابلے پر 9/38 فی معنی کے ذریعہ 5/91 ○ فی معنی کے لئے 2/234 آیت بالا لقد خلقنا الانسان فی کبد 90/4 میں اسی طرح فی معنی کے لئے آیا ہے جس طرح آیت ذیل 2/234 میں بیوہ عورتوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ 2/234 پھر جب بیوہ عورتیں اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو تمہارے لئے اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اپنی جانوں کے لئے بطریق معروف (نکاح ثانی) کر لیں۔

المختصر ہر انسان کے ذمہ قرآنی واجبات میں سرفہرست یہ ہے کہ اسے پوری محنت کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ اور اسلامی حکومت اسکی ضروریات زندگی کی ضامن ہوگی۔ اسلامی معاشرہ میں کوئی ایک فرد بھی بیکار نہیں پایا جائیگا۔ نہ پیران عظام کی صورت میں اور نہ نکما نکھٹو کی صورت میں۔ ہر فرد معاشرہ حسب طاقت و صلاحیت کام کریگا اور اسے کم از کم اجرت اتنی میسّر آئیگی کہ اسکی کوئی بھی انسانی ضرورت مرتے دم تک کے لئے کبھی بھی نہ رکنے پائے یہ ہے قرآن کریم کی روشنی میں پوری نوع

انسانی کے امت واحدہ ہونے کا صحیح مفہوم کہ جملہ افراد انسانیہ حق تکریم انسانی سے سرفراز ہونے (17/70) کے ساتھ ساتھ اقتصادی لحاظ سے بھی باہم دوش بدوش چل رہے ہوں۔ کسی ایک کی بھی کوئی ایک بھی انسانی ضرورت مرتے دم تک کے لئے رکنے نہ پائے (2/36 + 7/24) سے عیاں ہے۔

وحدت صرف نماز کے لئے نہیں۔

مذکورہ بالا صحیح تصور کے برعکس یہ تصور غیر قرآنی ہے کہ جب ہم صف نماز میں ہوں تو ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ یعنی حالت یہ ہو کہ :-

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے — تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اور جب مسجد اور صف نماز سے باہر نکلیں توپھر؟ پھر غلام بدستور غلام ہو اور آقا آقا۔ محتاج بدستور محتاج ہو اور غنی غنی واضح رہے کہ آقا و غلام اور محتاج غنی کا تصور غیر قرآنی اور غیر اسلامی ہے۔ وحدت انسانیہ کی قرآنی اساس انسان کے قرآنی حقوق و واجبات پر قائم ہے کہ سب کے سب انسان واجب التکریم ہیں 17/70 اور سب کے سب انسان کام بھی کریں گے اور مرتے دم تک کے لئے ضروریات زندگی مکان' خوراک' لباس اور علاج سے بھی پوری طرح بہرہ ور ہوتے رہیں گے

وحدت انسانیہ میں اختلاف پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔

ذات باری نے پوری نوع انسانی کو ہر لحاظ سے ایک ہی امت قرار دینے کے بعد خبردی ہے۔ فاختلفوا پھر لوگوں نے انسانی وحدت میں اختلاف پیدا کر لیا۔ یعنی آقا و غلام اور محتاج و غنی کا تصور پیدا کر کے اسے عملاً'' رائج کر دیا۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ محتاج و غنی کی فرعونی تقسیم کو الہی تقسیم قرار دیکر مطمئن ہو گئے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا کیا دھرا ہے۔ حالانکہ انسان کے پیدائشی مساویانہ حقوق ربوبیت تو اوپر آیات مجیدہ 1/1 + 2/36 + 7/24 کی روشنی میں وضاحتا'' بیان کئے جا چکے ہیں۔ اور محتاج و غنی کی ابلیسی اور فرعونی تقسیم کی وضاحت ذات باری نے آیت ذیل 28/4 میں کر رکھی ہے۔

"اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ" (28/4) بلاشبہ فرعون نے زمین میں سرکشی اختیار کی اور اپنی رعایا کے (وحدت انسانیہ کے خلاف غریب و امیر) کے طبقے بنا دیئے۔ اس نے ایک طبقے کو غریب کر دیا تھا" پس عوام کو غریب و امیر کے طبقات میں تقسیم کرنا فرعونی تقسیم ہے الہی نہیں

آیت مجیدہ زیر بحث 10/19 میں فاختلفوا کے الفاظ میں اسی چیز کی خبر دیگئی ہے کہ انسانی وحدت میں اختلاف خود غرض انسانوں نے خود پیدا کر لیا ہے اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا۔ اور آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ ذیل میں اس اختلاف کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی ناپسند فرمایا ہے۔ ولو لا کلمة سبقت من ربک لقضی بینهم فیما فیه یختلفون○ (اور اے رسولؐ !) اگر آپ کے رب کی طرف سے (قیامت کی باز پرس کے) قانون کا فیصلہ پہلے سے نہ ہو چکا ہوتا تو جس چیز (یعنی وحدت انسانیہ) میں لوگوں نے اختلاف پیدا کر لیا ہے انکا فیصلہ یہیں کر دیا جاتا

پس وحدت انسانی کو تکریم انسانیت یا اقتصادی' کسی بھی لحاظ سے پارہ پارہ کرنا غضب الہی کے لئے دعوت عام ہے۔ اور

یہی وجہ ہے کہ نوع انسانی باوجود اس کے کہ اسوقت تسخیر کائنات کے ضمن میں بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ قدرت کی بڑی بڑی مہیب قوتوں کے منہ میں لگام دیکر ان سے حسب منشا کام لے رہی ہے۔ چاند پر پہنچ چکی اور مریخ پر پہنچنے کی تیاریوں میں ہے۔ مگر اسوقت اطمینان قلب نامی چیز پورے روئے زمین پر ناپید ہے۔ کہ ارض کی دونوں سپر طاقتیں امریکہ اور روس' دائمی عدم اطمینان کے جہنم میں ہر آن جل رہی ہیں اور یہ سب کچھ اسی چیز کا کرادھرا ہے کہ انسانی وحدت و مساوات کے کھوکھلے دعووں کے سوا عملی میدان میں دونوں طرف وہی آقا و غلام اور محتاج و غنی کا تصور پوری طرح عملاً" مسلط کر دیا گیا ہے۔ قرآنی شواہد اور کائناتی مشاہدات کیمطابق اسوقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ تکریمی اور اقتصادی ہر لحاظ سے وحدت انسانی کو عملاً" قائم نہ کیا جائے۔

آیت زیر بحث 10/19 میں وحدت انسانی کی وضاحت کے بعد اگلی آیت مجیدہ 10/20 کا تعلق ان منکرین رسالت کے ساتھ ہے جن کا ذکر سابقہ آیت 10/18 میں گزر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر اللہ کو شفیع ٹھہرا کر کہتے ہیں۔ ویقولون ھو لاء شفعاؤ نا عند اللّٰہ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے معبود اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفاعتی ہونگے انہی غیر اللہ کو اللہ کے ہاں شفاعتی ٹھہرانیوالوں کے متعلق اگلی آیت مجیدہ 10/20 میں بالفاظ ذیل خبر دیگی ہے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿٢٠﴾

اور (وہ منکرین رسالت) کہتے ہیں کہ اس (مدعی رسالت) پر اسکے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں کی گئی۔ پس (اے رسولؐ!) آپ کہہ دیجئے گا کہ بلا شبہ غیب صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ پس تم بھی (نتیجے کا) انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ (نتیجے کا) منتظر ہوں (دیکھیں الٰہی فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے)

- انبیا سلام علیہم پر نشانیوں کے نازل ہونے کا نظریہ بھی منکرین رسالت کا ہے' قرآنی نظریہ نہیں۔
- ذات باری نے قرآن کریم کے دلائل قاطعہ کو برہان و بیّنات کے نام سے اپنی آیات یعنی نشانیاں قرار دیا ہے۔
- يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا (4/174) "اے نوع انسانی! تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے دلائل قاطعہ آگئے ہیں اور ہم نے تم پر خود بیان کرنیوالی اپنی نورانی کتاب نازل فرمائی ہے جو انسانی زندگی کی تمام تاریک راہوں کو نمایاں کر دیتی ہے" نیز فرمایا۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ (2/99) "اور (اے رسولؐ!) ہم نے آپ کی طرف اپنی آیات بینات نازل فرمائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہیں انکار کرتے انکا مگر وہ لوگ جو حدوں کو پھاندنے والے ہیں"۔

پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم سمیت انبیا پر جو انکے رب کی طرف سے آیتیں نازل ہوا کرتی تھیں وہ اسکے برہان یعنی وہ دلائل قاطعہ تھے جن کا مخالفین کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ ہوتی تھیں اللہ تعالیٰ کی خود بیان کرنیوالی

آیات بینات۔ مگر زمانہ نزول قرآن کے منکرین رسالت نے سابقین منکرین کی طرح یہ عقیدہ تراش رکھا تھا کہ اللہ کا رسولؐ وہ ہوتا ہے کہ اس پر ذات باری کی طرف سے حسّی معجزے نازل ہوتے ہوں۔ چنانچہ آیت زیر بحث میں اسی چیز کی خبر دیگئی ہے کہ نبی اکرم کے منکروں نے یہ کہاکہ اگر یہ نبوت کا دعویدار اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس پر کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں ہوا مگر نبی اکرم سے یہ جواب دلایا گیا ہے کہ تم حسّی معجزہ طلب کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں آخری فتح و کامرانی اسکی واضح آیت ہے۔ اسکی نشانی ہے' اسکا معجزہ ہے۔ تم بھی نتیجہ کا انتظار کرو اور میں بھی اسی کا انتظار کرتا ہوں۔ رسل انبیا سلام علیہم کے متعلق ذات باری رب العزت کا دائمی فیصلہ یہ ہے:۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (58/21) اللہ تعالیٰ نے فرض کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسولؐ ضرور ضرور غالب رہیں گے (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ انتہائی قوت والا اور غالب ہے۔ اس آیت کے مطابق رسولوں کا غلبہ اور ان پر نازل کئے گئے برہان قاطعہ اور آیات بینات اسکی آیتیں (معجزے) تھے۔ مگر زمانہ نزول قرآن کے منکرین رسالت نے اپنے مطلوبہ معجزات کی ایک طویل فہرست پیش کر دی۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے کہ انہوں نے کہا۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا۔ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِیْلًا۔ اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا 17/93-90

(مفہوم) اور ان (منکرین رسالت) نے کہاکہ ہم تجھ پر اسوقت تک ایمان نہیں لائیں گے جبتک کہ تو ہمارے لئے زمین سے چشمہ نہ جاری کر دے۔ یا تیرے لئے کھجوروں اور انگوروں کا باغ تیار نہ ہو جائے۔ پھر اس باغ کی خالی جگہوں میں تو نہریں نہ بہا دے یا جیساکہ تو خیال کرتا ہے ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا نہ گرا دے۔ یا تو اللہ اورملائکہ کو ہمارے سامنے نہ لے آئے۔ یا تیرا گھر سونے کا نہ بن جائے اور یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور ہم تیرے آسمان پر چڑھنے پر بھی اسوقت تک ایمان نہیں لائینگے جب تک کہ تو لکھی لکھائی کتاب نہ نازل کر دے جسے ہم خود پڑھ لیں۔ (اے رسولؐ!) کہہ دیجئے گا کہ میرا رب اس چیز سے پاک ہے کہ وہ ایسے خوارق عادات کے ذریعہ اپنا قانون منوائے۔ وہ تو اپنے دلائل و براہن نازل کرتاہے تمہیں ہوں میں مگر صرف بشر رسول ہوں۔ (مجھ میں ان خوارق کی طاقت نہیں اور اللہ تعالیٰ جو ان کی طاقت رکھتاہے وہ اپنے مستقل قانون کے مطابق ایسا کرتا نہیں)۔

فقل انما الغیب للّٰہ کے الفاظ میں منکرین رسالت کے ایک اور باطل عقیدے کی نفی کر دیگئی ہے۔ وہ لوگ انبیا کرام کی عدم بشریت پر ایمان رکھتے اور انہیں عالم الغیب مانتے تھے چنانچہ نبی اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ خود اعلان فرما دیجئے گا کہ غیب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ نہ سابقہ انبیاء کرام غیب دان تھے اور نہ ہی میں غیب دان ہوں سورہ اعراف میں نبی اکرم سے ذیل کا اہم اعلان کروا دیا گیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (7/188) کہہ دیجئے

گا کہ میں خود اپنے لئے بھی نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ ضرر کا' سوائے اللہ تعالٰی کے قانون مشیت کے (کہ مجھے بھی نفع اور ضرر اسکے قانون مشیت کے مطابق آتا ہے) اور اگر میں غیب دان ہوتا تواپنے لئے بہت سی بھلائیاں سمیٹ لیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں تو نہیں ہوں مگر صرف ماننے والی قوم کے لئے برے کاموں کی بری سزا سے ڈرانیوالا اور اچھے کاموں کی اچھی جزا کی خوشخبری دینے والا ہوں

افسوس ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے بعض لوگوں نے نبی اکرم پر ایمان لانے سے اس لئے انکار کر دیا کہ نبی اکرمؐ بندے بشر تھے نہ آپکو ظہور خوارق کی طاقت دیگئی تھی نہ آپ غیب دان تھے اور نہ کسی نفع یا نقصان کے مالک۔ اور ان جملہ امور کی تصدیق و تائید اللہ تعالٰی نے 7/88 میں خود نبی اکرمؐ سے کروا کر قیامت تک کے لئے اپنی پاک کتاب قرآن مجید میں محفوظ کر دی ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ خود اہل اسلام کا ایک مکتب فکر ایسا ہے جو نبی اکرمؐ سے کروائے گئے اعلانات کے خلاف نبی اکرمؐ کو عالم غیب' مختار کل اور اللہ تعالٰی کی طرح حاضر و ناظر تک مانتا ہے ہم ان حضرات کی خدمت میں مودبانہ گزارش کریں گے کہ زمانہ رسالت کے منکرین رسالت کی ہمنوائی نہ کریں اور قرآن کریم میں محفوظ خود نبی اکرمؐ کے اعلانات پر ایمان لانے کے لئے اپنے عقائد پر نظر ثانی کی کوشش فرمائیں۔

انسانی جبلت

اگلی آیت مجیدہ میں باری تعالٰی نے نوع انسانی کی ایک عمومی عادت و حالت بیان فرمائی ہے کہ جب اسے کسی تکلیف کے بعد راحت پہنچتی ہے تو ہماری جن کائناتی آیات (قوانین جاریہ) کے ذریعہ تکلیف رفع ہوتی ہے انکے متعلق مخالف تدبیریں کرتی ہے۔

وَإِذَآ أَذَقْنَا ٱلنَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ ٱللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾

اور جب ہم انسان کو اس تکلیف کے بعد رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں جو اسے پہنچتی ہے تو وہ ہماری ان آیتوں میں (جن کے ذریعہ اسے رحمت کا مزہ چکھایا گیا) مخالف تدبیریں کرنے لگتا ہے۔ (اے رسولؐ) کہہ دیجئے گا کہ اللہ تعالٰی سب سے جلد تدبیر کرنیوالا ہے۔ بلاشبہ ہمارے بھیجے ہوئے لکھتے جاتے ہیں جو تدبیریں تم کرتے ہو

آیت ماقبل میں چونکہ منکرین رسالت کے طلب معجزہ کا ذکر ہے۔اس لئے اس آیت میں خبر دیگئی ہے کہ جب ان لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے جو فبما کسبت اید یکم 42/30 کے قرآنی فیصلے کے مطابق انکے اپنے کسی غلط عمل کی بدولت پہنچی ہوتی ہے۔ اور اسے ہم اپنے قانون جاریہ کے مطابق دور کر کے رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو یہ لوگ اس میں مخالف تجویزیں کر کے اسے اپنے باطل عقیدہ کی تسکین کے لئے اپنے زندہ یا مردہ بزرگوں کی کرامت قرار دیتے ہیں۔

قل اللہ اسرع مکرا کے الفاظ میں اعلان کرا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالٰی بہت جلد تدبیر کرنیوالا ہے مگر وہ اپنے وعدہ

قیامت کے خلاف نہیں کرتا۔ ورنہ تمہارا یہ فعل جو تم اللہ تعالٰی کے قوانین جاریہ کے اٹل اثرات کو اپنے بزرگوں کی کرامت ٹھہراتے ہو' اسقدر ناپسندیدہ ہے کہ تمہارے خلاف فوراً سزا کا حکم نافذ کر دیا جائے۔

ان رسلنا یکتبون ما تمکرون کے الفاظ میں ہے کہ اپنے وعدہ قیامت کے مطابق تمہاری بری تجویزوں کی سزا قیامت کے دارالجزا پر اٹھا رکھی گئی ہے۔ مگر جو بُرے اعمال تم بجالاتے ہو انہیں ہمارے بھیجے ہوئے ہر وقت لکھتے جاتے ہیں تاکہ قیامت کی عدالت میں تمہارے خلاف تمہارے اعمال کی ایک مکمل فائل تیار ہو جائے' تاکہ تم اپنے جرائم سے انکار نہ کر سکو۔

یہ لکھنے والے کون ہیں۔

انسانی اعمالنامہ لکھنے والوں کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ دو فرشتے ہر وقت انسان کے دائیں بائیں موجود ہیں' دائیں طرف والا نیک اعمال لکھتا ہے اور بائیں طرف والا برے اعمال۔ اس نظریئے کے مطابق فی زمانہ دائیں طرف والا تو عموماً بیکار بیٹھا رہتا ہو گا اور بائیں طرف والے کو معمولی سا آرام کرنے کی بھی فرصت میسر نہیں ہوگی۔ قرآن مجید میں انسانی اعمالنامہ کے متعلق سورہ بنی اسرائیل میں بالفاظ ذیل وضاحت کی گئی ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝(17/14'13) "بلا شبہ ہم نے ہر انسان کا اعمالنامہ اسکی گردن میں باندھ دیا ہے۔ (جب چاہے گردن جھکا کر پڑھ لے) اور اسے ہم قیامت کے دن اسکے لئے ایک کھلی کتاب کی صورت میں نکال دیں گے۔ اور (اسے کہا جائیگا کہ) اپنی کتاب کو خود پڑھ لے۔ آج کے دن تیرے حساب کتاب کے لئے یہ تیرا اعمالنامہ ہی کافی ہے۔"

اس آیت مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی دماغ کے ریکارڈ روم میں جو ایک مخصوص کتاب رکھی گئی ہے جس میں دماغی قوت جامعہ و قوت حافظہ انسان کا ہر نیک و بد عمل لکھتی چلی جاتی ہیں وہ ہر انسان کا اعمالنامہ ہے۔ اور اس اعمالنامہ کو لکھنے والی قوتوں حافظہ اور جامعہ وغیرہ کو آیت زیر بحث میں رسلنا کہا گیا ہے اور انکی صفت بیان ہوئی ہے یکتبون کہ وہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان انسانی اعمالناموں کی صورت موجود بالکل ایسی ہی ہے کہ ہر اچھا یا برا شخص خواہ وہ پڑھا ہوا ہو یا ان پڑھا ہو' جب چاہے اپنا اعمالنامہ اس دنیا میں بھی پڑھ سکتا ہے یہ لکھنے والے ذرا سی سستی نہیں کرتے' سب کچھ لکھتے چلے جاتے ہیں۔

اگلی آیات مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ انسان جب پانی کا سفر کرتے ہوئے طوفان میں گھر جاتے ہیں تو خالصاً اللہ کے حضور دعائیں کرتے ہیں کہ تو نجات دے تو ہم تیرے شکرگزار ہونگے۔ مگر جب نجات مل جاتی ہے تو زمین میں ناحق فساد برپا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

دَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

"وہ اللہ ہی ہے جو (اے نوع انسانی!) تمہیں (اپنے قوانین جاریہ کے مطابق) خشکی اور سمندر کی سیر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو۔ اور وہ انہیں لیکر باد موافق کے ساتھ چلتی ہیں۔ وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ (کہ اچانک) ان پر باد مخالف آجاتی اور ان پر ہر طرف سے موجیں امنڈ آتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بلاشبہ وہ اس (طوفان میں) گھر چکے ہیں تو پھر اللہ کو اسکے دین کو اسکے لئے خالص کرنیوالے ہو کر پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دیدی تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہونگے۔"

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؗ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

"پھر ہم جب انہیں اپنے (قانون جاریہ کے مطابق) نجات دیتے ہیں تو پھر وہ زمین میں ناحق بغاوت کرتے ہیں۔ اے نوع انسانی! سوائے اسکے اور کوئی بات نہیں کہ تمہاری بغاوت کا وبال تمہاری اپنی ہی جانوں پر ہوگا۔ دنیا کی زندگی کا فائدہ ہے (جو تم اٹھا لو) پھر تمہارا لوٹ کر آنا ہماری ہی طرف ہے۔ پھر ہم تم کو خبر دیں گے اسکی جو تم عمل بجا لاتے رہے تھے۔"

بحر و بر کی سیر و سیاحت الہی قوانین جاریہ ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ خشکی کا سفر تو پیدل یا سواری پر ہوتا ہے۔ مگر سمندر کا سفر کشتیوں کے بغیر نا ممکن ہے۔ پھر بادبانی کشتیوں کے لئے باد موافق کا ہونا لازمی ہے' ورنہ باد مخالف ہو تو زنجیریں پھینک کر کھڑے رہنے ہی میں عافیت میسر آتی ہے۔ پس واضح رہے کہ جہاں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی آیا ہے کہ فلاں فلاں کام ہم کرتے ہیں۔ وہاں یہی مراد ہوتی ہے کہ ہم اپنے خود مقرر کردہ قوانین جاریہ کے مطابق کرتے ہیں۔

باد موافق و مخالف اللہ تعالیٰ کے قوانین جاریہ کے مطابق ہی چلتی ہیں۔ علم طبیعات کے ماہرین سے مخفی نہیں کہ خشکیوں اور سمندروں میں ہواؤں کے چلنے کے اٹل قوانین الہی ہیں۔ جن میں سرفہرست یہ ہے کہ جس خطے کی ہوا گرم اور ہلکی ہو کر اوپر اٹھ جاتی ہے تو اس خلا کو پر کرنے کے لئے ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں۔ یہ ہوائیں چلتی تو ہیں مستقل قوانین الہی کیمطابق مگر کسی کشتی کے لئے بیک وقت موافق ہوتی ہیں اور کسی کے لئے مخالف۔ اگر باد مخالف کا ریلہ انتہائی تند و تیز ہو تو کشتیاں اور جہاز ڈوب بھی جاتے ہیں۔ اور اگر باد مخالف کی سمت بدل کر موافق ہو جائے تو طوفان سے نجات مل جاتی ہے۔ جو مسافر طوفان کے عذاب سے بچ جاتے ہیں انہیں نیک اعمال کی مزید مہلت مل جاتی ہے آیات بالا میں بتایا گیا ہے کہ انسان جب طوفان میں گھر جاتا ہے تو اللہ کا خالص فرمانبردار بننے کا عہد کرتا ہے۔ مگر جب عمل کرنے کی مزید مہلت مل جاتی ہے تو پھر

بغاوت شروع کر دیتا ہے۔

مگر انما بغیکم علی انفسکم کے الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ اے نوع انسانی! تمہاری بغاوتوں اور شقاوتوں کا وبال خود تمہاری جانوں پر پڑتا ہے اور پڑیگا تمہاری بغاوتوں سے اللہ تعالیٰ کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا یہ تم ہی ہو کہ تمہارا معاشرہ بد سے بدتر اور بدترین ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور تم اسی زندگی میں جہنم کے عذاب سے دوچار ہو جاتے ہو۔
پھر متاع الحیٰوۃ الدنیا کے الفاظ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ نوع انسانی کی بغاوت کا مرکزی سبب صرف چند روزہ زندگی کا فائدہ اٹھانا ہے۔ حالانکہ نوع انسانی کا ہر ایک فرد اس امر سے صد فیصد واقف اور دانائے راز ہے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ یہاں سے لازماً" کوچ کرنا ہے اور وہ مال جو بغاوت کے ذریعہ حاصل کر رکھا ہے اسے لازماً" چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اسی لئے تادیب کے طور پر کہا گیا ہے۔ متاع الحیٰوۃ الدنیا دنیا کی چند روزہ زندگی کے مال کے لئے بغاوت کرتے ہو جسے یقیناً" یقیناً" یہیں چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ یہ کس قدر نا عاقبت اندیشی ہے تمہاری۔

پھر ثم الینا مرجعکم کے الفاظ میں متنبہ کیا گیا ہے کہ تم جو دنیا کی چند روزہ زندگی کے لئے قوانین الٰہی کی نافرمانی اور آپس میں ایک دوسرے کی بغاوت کر کے مال جمع کرتے ہو یاد رکھو کہ تم نے ان برے اعمال کی جوابدہی کے لئے ہمارے حضور میں ضرور حاضر ہونا ہے۔ تمہارے لوٹ کر آنے کی جگہ ہماری ہی طرف ہے یعنی تم قیامت کی جوابدہی سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔

آیت مجیدہ کے اخیر میں فننبئکم بما کنتم تعملون کے الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ قیامت کی عدالت عالیہ ایسی مکمل عدالت ہوگی کہ اس میں ہر مجرم کو اسکے جرائم سے متعدد طریقوں سے آگاہ کر دیا جائیگا۔

(ا) پہلے نمبر پر تو ہر شخص کا نامہ اعمال اسکے گلے میں بندھا ہو گا۔ (17/13) جسے پڑھکر سب پکار اٹھینگے وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۚ (18/49)" اور وہ کہیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی یہ کتاب کیسی ہے کہ اس نے نہ کوئی ہمارا بڑا عمل چھوڑا ہے نہ چھوٹا' سب کو جمع کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس میں ہر عمل کو موجود پائیں گے جو وہ بجالایا کرتے تھے۔"

(ب) پھر ہر فرد مجرم کے ہاتھ پاؤں اسکے جرم کی گواہی دیں گے۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (36/65)" اس دن ہم انکے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ کلام کریں گے اور ان کے پاؤں ان کی ان کرتوتوں کی گواہی دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے"۔ پس جب ہم نے مذکورہ قسم کی عدالت میں پیش ہونا ہے جہاں نہ جرم چھپ سکیں گے اور نہ رشوت سفارش اور دوستی وغیرہ کے ذریعہ سزا سے بچ سکیں گے (2/48) تو چند روزہ زندگی کے ناپائیدار فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ کی بغاوت کرنا کہاں کی عقلمندی ہے

اگلی آیت مجیدہ میں صرف دنیوی زندگی کے طلبگاروں کی مثال کھیتی پر برسنے والے پانی کے ساتھ دی گئی ہے۔ جسکے ساتھ زمین کی وہ مختلف نباتات پیدا ہوتی ہے جس میں سے انسان اور مویشی کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین اسے پکا کر زرد رنگ کر دے اور اسے پھل کے ساتھ مزین کر دے اور اس کے مالک یہ گمان کرنے لگیں کہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت

رکھتے ہیں۔ (مگر) اس پر ہمارا (تباہی کا) حکم رات کیوقت یا دن کیوقت آجائے۔ پھر ہم اسے کٹی ہوئی فصل کی مانند کر دیں گویا کہ وہ کل موجود ہی نہیں تھی۔ گویا کہ جو لوگ صرف اس زندگی کا مال سمیٹنے کے لئے ضابطہ الٰہی کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں دوسری زندگی میں انکا مال کوئی فائدہ نہیں دیگا یعنی انہوں نے کھیتی میں پوری محنت کی مگر جب وہ تیار ہوئی تو کام نہ آئی۔ تباہ ہوگئی دیکھئے ارشاد باری:۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ۲۴

سوائے اسکے اور کوئی بات نہیں کہ (صرف) دنیا کی زندگی (کی طلب) کی مثال پانی جیسی ہے کہ ہم اسے آسمان سے نازل کرتے ہیں پھر اسکے ساتھ زمین کی مختلف فصلیں نکل آتی ہیں۔ جن میں سے انسان اور مویشی کھاتے ہیں۔ حتی کہ جب زمین اسکے ساتھ سنہری ہو جاتی اور مزین ہو جاتی ہے اور اسکے مالک خیال کرتے ہیں کہ وہ اس پر پوری طاقت رکھتے ہیں۔ (مگر) ہمارا تباہی کا حکم رات کے یا دن کے وقت آجاتا ہے پھر ہم اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیں گویا کہ وہ کل تھی ہی نہیں۔ اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو غور کرنیوالی قوم کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

مثال کی حقیقت

واضح رہے کہ مثال وہ ہوتی ہے۔ جس سے مخاطب پہلے ہی اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ اوپر کی مثال کو پورے اہل عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب کھیت کی فصل تیار ہو کر سنہری ہو جاتی یعنی سونے کی طرح چمک اٹھتی ہے' کھیتی کا مالک دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ وہ کل کو اسے کاٹے گا' گاہے گا اور جنس کی بوریاں بھر بھر کر گھر لے جائیگا۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ رات کے یا دن کیوقت طوفان بادو باراں آجاتا ہے اور اسے اس طرح برباد کر دیتا ہے کہ گویا وہ کل موجود ہی نہیں تھی۔ اور اس کھیتی میں سے مالک کو اس میں ڈالا ہوا بیج بھی حاصل نہیں ہوتا۔

یہی مثال ہے اس دنیا کی زندگی میں ناجائز طریقوں سے حصول زر کے لئے کیئے گئے اعمال کی

جس طرح اوپر کی مثال میں انسانی زندگی کی اللہ کے عطا کردہ بارش کے پانی کے ساتھ مثال دیگئی ہے۔ کہ وہ پانی اپنا پورا کام کرتا ہے۔ کھیتوں میں مختلف قسم کی فصلیں پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی مختلف اقسام کے کاروبار کے ذریعہ مال پیدا کرتی ہے۔ مگر جو لوگ ضابطہ الٰہی کے اولین سبق ربوبیت عالمینی کو فراموش کر کے عوام کا استحصال کرتے اور ذاتی عیش

کوششوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں انکی اس دنیا کی یہ کھیتی قیامت کو کوئی فصل نہیں دیگی۔ اسی طرح اجڑی ہوئی ہوگی جس طرح اولوں یا بارش اور آندھی کے طوفان سے پکی پکائی کھیتی اجڑ جاتی ہے۔ گویا کہ وہ کل موجود ہی نہیں تھی۔ اسی طرح قیامت کا کل گزشتہ اس دنیا کی زندگی ہے۔ قیامت کو یہ حالت ہوگی کہ ضابطہ الٰہی کی مخالفت کر کے عوام کا خون چوس کر پیدا کیا ہوا مال کل یعنی دنیا میں موجود تھا ہی نہیں۔ آیت بالا کے اخیر پر یہ جملہ لایا گیا ہے۔ کذالک نفصل لایت لقوم یتفکرون ہم اسی طرح غور کرنیوالی قوم کے لئے اپنی آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ ان الفاظ باری تعالیٰ کے مطابق لازم ہے کہ مذکورہ مثال پر پوری توجہ کے ساتھ غور کیا جائے اور اس زندگی میں ضابطہ الٰہی کی مخالفت سے بچ کر اس دنیا میں کئے گئے اعمال کو پکی پکائی کھیتی کی طرح تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا جائے

مال کمانا لازم ہے۔ مگر سنت صحابہؓ پر عمل کرتے ہوئے عین رضاء الٰہی کیمطابق

سورہ فتح میں صحابہؓ کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ سب کے سب خود کما کر کھاتے تھے اور کماتے تھے اللہ کی رضا کیمطابق۔ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (48/29) مال کے بغیر دنیوی زندگی کا گزرنا محال ہے۔ کیونکہ ہر انسان کو ضروریات زندگی ہر آن مستلزم ہیں۔ مگر مال کمایا جانا چاہئے سنت صحابہؓ پر عمل کرتے ہوئے عین رضاء الٰہی کیمطابق' جس میں نہ استحصال کا عمل دخل ہو اور نہ کسی قسم کی ہیرا پھیری' جھوٹ اور دغا فریب کا' معاشی نظام کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہر شخص نوع انسانی کی خدمت کے جذبہ سے معمور ہو۔ ملک کے صدر' اسکے عملہ اور فصلیں پیدا کرنیوالے سے لیکر عام مزدور تک کو ہر آن یہ آرزو بیقرار رکھتی ہو کہ نوع انسانی کو سب سے زیادہ فائدہ مجھ ہی سے پہنچنا چاہئے۔ اس طرح یہ ہو گا کہ ہر شخص خواہ وہ کاشتکار ہو یا دوکاندار' صنعت کار ہو یا مزدور' ملک کا سربراہ ہو یا اسکا عملہ' اپنے کام میں نہ ہیرا پھیری کریگا نہ دغا فریب کو قریب بھٹکنے دیگا۔

چنانچہ نہ وہ ملاوٹ کریگا نہ کم تولیگا۔ نہ ذخیرہ اندوزی اسکا شعار ہوگا نہ بلیک اور سمگل۔ نہ وہ کام چور ہوگا اور نہ رشوت خور۔ پس اسطرح کا کمایا ہوا مال جو رضاء الٰہی کے مطابق نوع انسانی کی خدمت کے جذبہ کے ماتحت حاصل کیا جائے سنت صحابہؓ کے مطابق بھی ہو گا اور اسی جذبہ کے ماتحت اس میں سے سائل و محروم' یعنی حاجتمندوں اور معذوروں کا حق بھی ادا کیا جائیگا تو دنیا کی یہ کھیتی کل قیامت کے دارالجزاء میں فائدہ بھی دیگی' اور وہاں کامیابی و کامرانی کا موجب بھی ہوگی' کٹی ہوئی اور بربادشدہ نہیں ہوگی۔

اگلی دو آیات مجیدہ میں ایسے لوگوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ اسے سیدھے راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو خود (عملاً) چاہتا ہے۔

واضح رہے کہ من یشاء میں یشاء کی فاعل ضمیر مستقر ہے جو من کی طرف پھرتی ہے اللہ کی طرف نہیں پھرتی۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی کرتا ہے جو خود رہنمائی کا عملاً" طلبگار ہو۔ جیسے کہ (42/13) میں ارشاد ہوا ہے۔ یَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ وہ (اللہ) اپنی طرف اسکی رہنمائی کرتا ہے جو خود اسکی طرف (عملاً") رجوع کرتا ہے۔ یاد رہے کہ رجعت الی اللہ عملاً" ہوتی ہے زبانی زبانی نہیں پس آیت بالا میں ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کے گھر کی دعوت ہے جو سیدھے راستے کے خود عملاً" طلبگار ہوں۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں اسی عملی طلب کی جزا بیان کی گئی ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۶

واسطے ان لوگوں کے جو خود نیک عمل کریں نیک جزا ہے اور زیادتی ہے اور ان کے مونہوں کو نہ سیاہی ڈھانپے گی نہ ذلت یہی جنت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

نیک اعمال کی جزا میں اضافہ

اس آیت مجیدہ میں پہلا غور طلب یہ امر ہے کہ للذین احسنوا فعل با فاعل ہے جو الذین کا صلہ ہو کر مبتدا ہے اور الحسنی وزیادۃ معطوفین خبر ہے۔ جس سے کھل کر ثابت ہو رہا ہے کہ نیکی کرنا خود انسان کا اپنا کام ہے اور اسی طرح اگلی آیت مجیدہ میں یہ الفاظ آرہے ہیں وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جن میں کسبوا السیات کا فاعل بھی الذین ہے۔ جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ برے کام کرنا بھی خود انسان کا اپنا کام ہے پس کھل کر ثابت ہو چکا کہ پچھلی آیت مجیدہ میں جو یھدی من یشاء الی صراط مستقیم کے الفاظ آئے ہیں انکا کھلا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی رہنمائی کرتا ہے جو خود اپنے اعمال کے ذریعہ سیدھی راہ کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق آیت بالا نمبر 26 میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ خود نیک عمل بجالاتے ہیں انکے لئے انکا نیک بدلہ ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں انکی جزا میں زیادتی عطا فرمائیگا۔ یعنی نیک اعمال کی جو جزا انکا حق ہے' وہ انہیں اس سے کئی گنا زیادہ بدلہ دیگا۔ اور قیامت کے دارالجزا میں انکے چہروں پر ناکامی و نامرادی کی سیاہی اور ذلت ہرگز نہیں چھائیگی۔

اسکے برعکس اگلی آیت مجیدہ میں برے کام کرنیوالوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ انہیں انکے عمل کے عین برابر سزا دیجائے گی انکی سزا میں زیادتی نہیں کی جائے گی مگر ان کے اپنے برے عملوں کی بدولت قیامت کو ان کے چہروں پر ناکامی کی سیاہی اور ذلت چھا جائیگی۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷

اور وہ لوگ جو خود برائیاں کرتے ہیں۔ ہر برائی کا بدلہ اس برائی کی مثل ہے۔ اور ان پر ذلت چھا جائیگی۔ اور کوئی بھی انہیں اللہ سے بچانیوالا نہ ہو گا۔ گویا کہ انکے مونہوں پر رات کا سیاہ ٹکڑا اڑھا دیا گیا ہے۔ یہی لوگ آگ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

یہ قیامت کی جزا سزا کا تذکرہ ہے۔

واضح رہے کہ نیکی کی نیک جزا اور برائی کی بُری سزا دنیا میں بھی ملنی لازم ہے مگر چونکہ دنیوی حکومتوں میں رشوت اور سفارش کے ذریعہ برائی کرنیوالے چھوٹ جاتے اور ناکردہ گناہ پکڑ لئے جاتے ہیں اس لئے آیات بالا میں خبر دیگئی ہے کہ قیامت کی عدالت عالیہ میں نیکو کاروں کو انکے نیک اعمال کی نیک جزا دیجائیگی' بلکہ انہیں انکی جزا کو کئی گنا بڑھا دیا جائیگا مگر برے عمل کرنیوالوں کو اس عدالت میں صرف اتنی سزا کا مستحق قرار دیا جائیگا' جتنا انکا جرم ہوگا۔ اس دن نیکو کاروں کے چہروں پر ناکامی اور ذلت کی سیاہی نہیں چھائیگی مگر برے اعمال کرنیوالوں کے چہرے ناکامی اور ذلت کیساتھ سیاہ ہوئے ہوئے ہونگے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ۝ ۱۰/۲۸

اور جس دن ہم ان (شریک ٹھہرانیوالوں اور شریک ٹھہرائے گئے) سب کو اکٹھا کر لینگے پھر ہم شریک ٹھہرانیوالوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے (ٹھہرائے ہوئے) شریک اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے۔ اور انکے (ٹھہرائے ہوئے) شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبودیت نہیں کرتے تھے۔

ویوم نحشر هم جمیعا کے الفاظ میں کھل کر قیامت کی حاضری کی خبر دیگئی ہے۔ جب سارے کے سارے مردے زندہ کر لئے جائینگے اور پہلے پچھلے سب لوگ زندہ کر کے اپنے حضور حاضر کر لئے جائینگے۔ ان الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اس دن وہ لوگ بھی حاضر عدالت ہونگے جنہوں نے دنیا میں غیر اللہ کو اللہ کے شریک ٹھہرایا ہوا ہے اور وہ لوگ جنہیں شریک ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ بھی حاضر کر لئے جائینگے۔ اور انہیں کہا جائیگا کہ تم دونوں فریق شریک ٹھہرانیوالے اور شریک ٹھہرائے گئے الگ الگ اپنی جگہ پر کھڑے رہو

پھر کیا ہو گا؟

پھر وہ دونوں آپس میں جھگڑنے لگیں گے۔ جنہیں دنیا میں اللہ کا شریک ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ لوگ شریک ٹھہرانے والوں سے کہیں گے کہ تم ہماری عبودیت (ہماری فرمانبرداری) نہیں کرتے تھے۔ یعنی ہم نے تمہیں ہرگز نہیں کہا تھا کہ تم ہماری

عبودیت کرو۔ بلکہ تم نے ہمارے مرنے کے بعد ہمیں معبود ٹھہرا لیا تھا۔ قرآن مجید میں اسکی مثال عیسیٰ مسیحؑ کی دی گئی ہے کہ انہوں نے مسیحی حضرات کو ہر گز نہ کہا تھا کہ تم مجھے اور میری ماں کو اللہ کیساتھ دوالٰہ اور بنا لو۔ بلکہ انکی وفات کے بعد عیسائیوں نے تثلیث کا عقیدہ خود اپنے اذہان سے تراش لیا۔ سورہ مائدہ میں آیا ہے کہ قیامت کو اللہ تعالیٰ مسیحؑ سے پوچھیں گے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
(5/116)"اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے ساتھ دو الٰہ اور ٹھہرالو" اس پر عیسیٰ مسیحؑ جواب دیں گے۔

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ (5/116) "عیسیٰ مسیح کہے گا کہ تو ہر قسم کی شراکت سے پاک ہے۔ مجھے یہ لائق ہی نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق ہی نہیں ہے"۔ اسی طرح جن جن نبیوں یا دیگر صالحین کو انکی وفات کے بعد لوگوں نے شریک ٹھہرا لیا ہوا ہے۔ قیامت کے دن سب کو جمع کیا جائیگا اور وہ سب کے سب' شریک ٹھہرانیوالوں کو کہیں گے کہ تم ہماری عبودیت نہیں کرتے تھے۔ یعنی ہم نے تمہیں ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ ہمیں اللہ کے شریک ٹھہرانے کا عقیدہ تم نے از خود ہمارے بعد ایجاد کر لیا تھا۔ چنانہ اگلی آیت مجیدہ میں انہی کا قول درج ہے کہ ہمیں تو اس چیز کی خبر بھی نہیں کہ تم نے ہمیں اللہ کے شریک ٹھہرالیا ہوا ہے۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ ۲۹

پس ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے کہ بیشک ہم اس سے بلا شبہ بے خبر تھے جو تم ہماری عبودیت کرتے تھے۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ یہ انبیاء اور صالحین لوگ ہیں جنہیں لوگوں نے اللہ کے شریک ٹھہرایا ہوا ہے۔ کسی کو مشکل کشا اور کسی کو دستگیر و حاجت روا ٹھہرا رکھا ہے۔ آیت بالا میں اللہ تعالیٰ کی کفائت شہادت کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ سب بزرگ جنہیں مشکل کشا اور حاجت روا یا دستگیر وغیرہ ٹھہرا لیا گیا ہے۔ انہیں اس چیز کی بالکل خبر ہی نہیں کہ انکے ماننے والوں نے انہیں اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا لیا ہوا ہے۔ حالانکہ کوئی نبی بھی الٰہی اختیار کا مالک ہر گز نہیں ہے۔ جیسے کہ۔

قرآن مجید میں خود نبی اکرمؐ خاتم النبین سے اعلان کروا دیا گیا ہے کہ لوگو! میں نہ تو خود اپنے لئے کسی نفع یا نقصان کا مالک ہوں اور نہ تمہارے لئے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (7/188) "(اے رسولؐ!) اعلان کر دیجئے گا کہ لوگو! میں تو اپنی جان کے لئے بھی کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ سوائے اسکے کہ مجھے بھی نفع یا نقصان اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہی پہنچتا ہے"

قُلْ لَآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ (10/49) "(اے رسولؐ!) اعلان کر دیجئے گا کہ لوگو! میں تو اپنی جان کے لئے بھی کسی نقصان یا نفع کا مالک نہیں ہوں۔ سوائے اسکے کہ مجھے بھی نقصان یا نفع اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہی پہنچتا ہے"

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (72/20) "(اے رسولؐ!) اعلان کر دیجئے گا کہ لوگو! بلاشبہ میں تمہارے لئے بھی کسی نقصان یا فائدے کا مالک نہیں ہوں"

اور اسی طرح کا اعلان تمام انبیاء سے بھی کرادیا گیا ہے۔ پھر عملی صورت میں حالت یہ ہے کہ لوگ اپنے زندہ یا مردہ بزرگوں سے بیٹے مانگتے ہیں۔ اور یہ عقیدہ گھڑ لیا گیا ہے کہ انکے بزرگ بیٹے دے سکتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو یہ اختیارات سونپ دیئے ہوئے ہیں۔ وہ جسے چاہیں بیٹے دے سکتے ہیں۔ مگر بیٹے دینے کے ضمن میں دو اولو العزم نبیوں ابراہیم اور زکریا کے متعلق قرآن حکیم میں مذکور ہے کہ یہ دونوں نبی اپنے اپنے وقت میں بوڑھے ہوگئے بال سفید ہوگئے۔ بڑھاپے کی کمزوری غالب آگئی۔ مگر اولاد سے محروم تھے۔ نہ ابراہیم کے ہاں بڑھاپے تک بیٹا پیدا ہوا نہ زکریاؑ کے ہاں۔

ابراہیمؑ اور زکریاؑ نے الگ الگ بیٹے کے لئے اللہ کے حضور میں دعا کی

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ و صالحین کو اپنے اختیارات سونپ رکھے ہیں کہ جسے چاہیں بیٹے عطا فرمائیں تو چاہئے تھا کہ ابراہیمؑ و زکریاؑ مذکورہ بالا اختیارات کے مطابق اپنے آپکو بیٹے عطا فرماتے۔ مگر حالت یہ ہے کہ ابراہیمؑ نے بھی حضور الٰہی میں دعا فرمائی۔ رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (37/100) "اے میرے پروردگار مجھے اپنی جناب سے صالحین میں سے ایک بیٹا عطا فرما" اسکے جواب میں ارشاد ہوا ہے۔ فَبَشَّرْنٰہُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ 37/101 "پھر ہم نے اسے ایک حلم والے، بردبار بیٹے کی خوشخبری دی"

الختصر! ابراہیمؑ اولو العزم نبیؑ کے ہاں بیٹا نہیں تھا تو انہوں نے حضور الٰہی ہی میں عرض کی اور انہیں حضور الٰہی ہی سے بیٹا عطا ہوا، تو اس قرآنی واقعہ سے بصورت نصف النہار ثابت ہوا کہ ابراہیم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ جسے چاہیں بیٹے عطا فرمائیں اسی طرح زکریاؑ بوڑھے ہو گئے مگر بیٹا نہیں تھا۔ تو حضور الٰہی میں عرض کیا قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَکُنْ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا۝ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا۝ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْہُ رَبِّ رَضِیًّا (19/6-4) "(زکریاؑ) نے کہا اے میرے رب بیشک میں ہوں کہ میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں۔ اور میرا سر شعلہ مار چکا ہے۔ (یعنی بال سفید ہو چکے ہیں۔ اور میں اپنے پیچھے اپنے وارث کا خوف رکھتا ہوں۔ حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے۔ پس تو مجھے اپنی جناب سے میرا وارث عطا فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو"

اسکے جواب میں ارشاد ہوا ہے۔ یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ اِسْمُہٗ یَحْیٰی (19/7) "ہم نے فرمایا، اے زکریاؑ بے شک ہم تجھے ایک بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحیٰی ہوگا"

ولادت یحییٰ کے متعلق ایک اہم سوال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر والی آیات مجیدہ میں زکریاؑ کی دعا سے عیاں ہے کہ آپ کے بال سفید اور ہڈیاں کمزور ہو چکی تھیں۔ اور آپکی بیوی بانجھ تھی۔ تو پھر اگر انہیں اسی حالت میں بیٹا دیا گیا تھا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ فریقین' دونوں ہی اولاد پیدا کرنے کے قابل بھی نہ ہوں اور بیٹا بھی پیدا ہو پڑے۔ اس سوال کا جواب سورہ انبیاء میں دیا گیا ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (21/90)

پس ہم نے (زکریاؑ) کی دعا قبول فرمائی اور اسے یحییٰؑ عطا فرمایا۔ اس حالت میں کہ ہم نے اسکے لئے اس کی بیوی کی اصلاح کر دی۔ اس آیت مجیدہ سے ثابت ہے کہ زکریاؑ کی بیوی کا علاج کر کے اس کے بانجھ پن کی اصلاح کر دیگئی تھی۔ اور یہ اصلاح زکریاؑ کے لئے کی گئی تھی۔ یعنی اگر چہ زکریاؑ بوڑھے ہو چکے تھے' ہڈیاں کمزور اور بال سفید ہو چکے تھے۔ مگر ان میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اولاد پیدا کرنے کے ناقابل تھی ان کی زوجہ محترمہ' اسکا علاج کر کے اصلاح کر دیگئی اور یحییٰؑ عین قانون الٰہی کے مطابق ماں باپ کے ملاپ ہی سے پیدا ہوئے تھے۔

رجوع الی المقصود

آیت مجیدہ یونس 29 زیر بحث میں بتایا گیا ہے کہ جن انبیاء و صالحین کو ان کی وفات کے بعد دنیا میں اللہ کے شریک بنا کر مشکل کشا اور حاجت روا ٹھہرا لیا گیا ہے۔ قیامت کو وہ سب اللہ تعالیٰ کی کفائت شہادت کے ساتھ اعلان کریں گے کہ انہی بالکل کوئی خبر نہیں تھی کہ انہیں اللہ کے شریک بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ وہاں قیامت کے دارالجزآء کی عدالت عالیہ میں ہر شخص اس چیز کی خبر پالیگا جو کچھ اس نے آگے بھیجا تھا۔ اور ہر شخص اپنے سچے مولا کی عدالت میں اس دنیا کے اعمال کی جوابدہی کے لئے لوٹایا جائیگا۔ اور ان سے وہ سب کچھ گم ہو جائے گا۔ جو وہ اپنے ذہن میں افترا کیا کرتے تھے۔ یعنی جنہیں انہوں نے افترا کر کے اپنے حاجت روا اور شفیع بنا رکھا ہے قیامت کو کسی کے کام نہیں آئینگے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ
وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

وہاں (قیامت میں) ہر شخص اسکی خبر پالیگا جو کچھ اس نے آگے بھیجا تھا اور وہ اپنے سچے مولیٰ کی طرف لوٹائے جائینگے اور جو کچھ وہ افترا کرتے تھے وہ ان سے گم ہو جائیگا۔

مشرکوں کی پہچان

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں ان لوگوں کی پہچان بتائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کیساتھ غیر اللہ بزرگوں کو شریک ٹھہرا کر ان سے مدد مرادیں مانگتے رہتے ہیں۔ وہ دراصل اللہ کے اختیارات میں اپنے بزرگوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ

وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ ۳۱

(اے رسولؐ!) ان سے پوچھئے کہ تمہیں آسمان اور زمین سے رزق کون دیتا ہے۔ یا کون کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے۔ اور کون مردہ میں سے زندہ نکالتا ہے اور زندوں میں سے مردہ نکالتا ہے۔ اور کون ہے جو ہر کائناتی امر کی تدبیر کرتا ہے۔ پس وہ ضرور یہ جواب دیں گے' اللہ تعالیٰ پھر آپ کہہ دیجئے گا کہ پھر تم (اللہ کے شریک کیوں ٹھہراتے ہو اور مذکورہ حقائق کی مخالفت سے کیوں نہیں بچتے۔

اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا صفات کے خصوصی اظہار کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں اعلان عام کر دیا گیا ہے کہ۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ ۳۲

''پس مذکورہ بالا صفات والا ہے تمہارا سچا رب پس نہیں ہے حق کے بعد مگر صرف گمراہی۔ پھر تم کس طرف کو پھرے جا رہے ہو''

آیت بالا میں اللہ تعالیٰ ہی کو جو مذکورہ بالا صفات مخصوصہ کا مالک ہے' لوگوں کا سچا رب کہا گیا ہے۔ پس سیاقِ کلام کے مطابق ثابت ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو حاجت روا' مشکل کشا اور دستگیر ٹھہرا کر انہیں جھوٹے رب ٹھہرا لیا جاتا ہے جو آیت بالا کیمطابق خالصاً" گمراہی ہے۔ اسکے باوجود لوگ جس طرف کو اندھے بہرے ہو کر بھاگے جا رہے ہیں اس سے روک دیا گیا اور وضاحت کر دیگئی ہے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ۳۳

(اے رسولؐ!) اسی طرح تیرے رب کے کلمات (قوانین) ان لوگوں پر واجب ہو چکے ہیں جو اللہ کی حدیں پھاندتے ہیں۔ بلا شبہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

سیاقِ کلام کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے بزرگوں کو اسکے اختیارات خصوصی میں شریک کرنیوالے اللہ کی حدیں پھاندنے والے ہیں۔ اور باوجود اسکے کہ وہ اللہ ہی کو رزق دینے والا' زندے سے مردہ اور مردے سے زندہ نکالنے والا اور کائناتی امور کی تدبیر کرنے والا کہتے ہیں مگر الٰہی فیصلہ کے مطابق بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے۔

اس سے اگلی دو آیات کریمات میں پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں سے نبی اکرمؐ کو ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے متعلق کچھ سوالات کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور ان سوالوں کے جواب بھی خود ہی دیدیئے ہیں۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

(اے رسولؐ! ان شریک ٹھہرانے والوں سے) کہے گا کہ کیا تمہارے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں میں کوئی ہے جو (کسی مخلوق کو) پہلی مرتبہ پیدا کرتا اور پھر اسکا اعادہ کرتا ہے (انکا جواب ہو گا کوئی نہیں آپ کہہ دیجئے گا اللہ پہلی مرتبہ پیدا کرتا اور پھر اسکا اعادہ کرتا ہے۔ تو پھر جب ان میں ایسا کرنے والا ہے ہی کوئی نہیں تو' پھر تم کس طرف الٹے پھرے جا رہے ہو۔

اس آیت مجیدہ میں هل من شرکائکم من یبدؤ الخلق ثم یعیدہ کا جواب جو خطوط وحدانیوں میں لکھا گیا ہے۔ محذوف ہے کہ انکے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو کسی بھی چیز کو پیدا کرتا اور پھر اسکا اعادہ کرتا ہو۔ اسی لئے شریک ٹھہرانے والوں کو کہا گیا ہے۔ فانی توفکون کہ پھر تم کس طرف کو الٹے پھرے جارہے ہو۔ یعنی اس اللہ کیساتھ جو مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کرنے اور پھر اسکے اعادہ کرنے کی بھی طاقت اور قدرت رکھتا ہے اوروں کو شریک کرتے ہو۔

یبدؤ الخلق کا مصدری مفہوم ہے کسی مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کرنا اور ثم یعیدہ کے مصدری مفہوم دو ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ پہلی مرتبہ پیدا کی ہوئی مخلوق کو پھر افزائش نسل کی صورت میں بار بار پیدا کرتے رہنا۔ اور دوسرا یہ کہ قیامت کو دوبارہ پیدا کر کے اس زندگی کے اعمال کی جزا سزا کے لئے اپنے حضور حاضر کر لینا۔ یہ صورت صرف انسان کیساتھ مختص ہے کیونکہ پوری کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اعمالی صورت میں صاحب اختیار وارادہ بھی ہے اور اپنے خالق و مالک کے حضور جوابدہ بھی۔ اس سے اگلی آیت میں مزید ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۚ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۚ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

(اے رسولؐ!) ان شریک ٹھہرانیوالوں سے) کہئے گا' کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کہدیجئے گا اللہ حق کی رہنمائی کرتا ہے (اسکے سوا کوئی نہیں کرتا) تو پھر کیا وہ جو حق کی رہنمائی کرتا ہے وہ زیادہ حقدار ہے کہ اسکی اتباع کی جائے یا وہ جو رہنمائی نہیں کرتا۔ بلکہ یہ کہ اسکی رہنمائی کی جائے (یعنی جو خود ہی رہنمائی کا محتاج ہے) پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے' تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔

کیف تحکمون کے الفاظ میں زور دار انداز میں کہدیا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہرانے کے تمہارے فیصلے مطلقاً غلط ہیں۔ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانیوالے حق کی نہیں بلکہ محض ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾

اور انکی اکثریت صرف ظن (قیاس) ہی کی پیروی کرتی ہے۔ بلاشبہ ظن' حق کے مقابلے پر کوئی کام نہیں دیتا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت بڑھ کر جاننے والا ہے جو جو وہ فعل کرتے ہیں۔

یہاں پر غیر اللہ کو اللہ کے شریک ٹھہرانے کی اساس صرف ظن و قیاس بتائی گئی ہے۔ یعنی اس چیز میں ہرگز ہرگز کوئی حقیقت نہیں ہوتی' صرف قیاس کر لیا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ مشکلیں حل کر سکتا ہے۔ مرادیں پوری کر سکتا ہے۔ دستگیری کہہ سکتا اور بگڑے ہوئے کام سنوار سکتا ہے۔ حالانکہ جب مشکل کشا و حاجت روا ٹھہرائے ہوئے افراد کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو وہ لوگ خود مشکلوں میں گھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ انکی اپنی درجنوں مرادیں نامراد پڑی ہوتی ہیں۔ اور انکے اپنے سینکڑوں کام بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں قرآن مجید کے متعلق اعلان کیا گیا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے اس پر افتریٰ نہیں کیا گیا۔

وَمَا كَانَ هَٰذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٣٧﴾

اور نہیں ہے یہ قرآن ایسا کہ اللہ کے سوا کسی اور کا اِفترٰی کردہ ہو۔ ولیکن یہ اسکی (یعنی ان کتابوں کی) تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہیں۔ اور یہ ہماری کتاب (صحیفہ فطرت) کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ (قرآن کریم افترٰی نہیں بلکہ) رب العلمین کی طرف سے (نازل کردہ) ہے۔

قرآن مجیدہ کے متعلق متعدد مقامات پر آیا ہے کہ یہ افترٰی کردہ نہیں' بلکہ خاص اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے۔ مخالفین کہتے تھے کہ یہ رسولؐ مقبول کا خود افترای کردہ ہے اس آیت میں اسکے منزّل مِنَ اللہ ہونے کی یہ دلیل دی گئی ہے کہ یہ سابقہ منزّل من اللہ کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ سابقہ کتابوں تورات و انجیل میں جو غیر محرف ہیں خود نبی اکرمؐ کی تشریف آوری کی خبر دی گئی ہے۔

يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ (7/157) وہ اس رسول نبی امی کو اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ تو آیت بالا میں بتایا گیا ہے کہ سابقہ کتابوں میں نبی اکرمؐ کی آمد کی پیش گوئیاں نبی اکرمؐ نے نہیں

لکھی تھیں۔ قرآن مجید نے سابقہ کتب میں درج پیش گوئیوں کی صحیح صحیح خبردیکر انکی تصدیق کر دی ہے۔

اسکے علاوہ دوسرے یہ کہ قرآن مجید نے سابقہ تمام نبیوں اور تمام کی تمام کتابوں کی صداقت کی خبردیکر بھی انکی تصدیق کر رکھی ہے۔ تفصیل الکتب کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ قرآن اپنی تفصیل خود آپ کرتا ہے۔ اور الکتب سے مراد خود قرآن کریم ہے اسکی تائید اس آیت میں موجود ہے۔ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (25/33)(اور اے رسولؐ!) لوگ آپ کے پاس اس کتاب کی مثل نہیں لائیں گے۔ مگر ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس اپنا حق (قرآن بھی) لاتے ہیں اور اسکی احسن تفسیر بھی لاتے ہیں اور اسکا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن مجید صحیفہ فطرت کی تفسیر ہے۔ اس پر یہ دو آیتیں دلیل ہیں۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (3/3) (اے رسولؐ! اللہ نے) آپ پر اپنی کتاب قرآن مجید کو بھی بالحق نازل فرمایا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (16/3) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین (یعنی صحیفہ کائنات) کو بھی بالحق پیدا فرمایا ہے تو اس طرح قرآن و کائنات جو دونوں بالحق ہیں دونوں ایک دوسرے کے عین مطابق ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تفسیر ہیں۔ اس طرح آیت بالا میں الکتب سے مراد صحیفہ فطرت ہے اور قرآن کریم اسکی تفسیر ہے۔

لا ریب فیہ من رب العلمین یہاں یہ قرآن کریم کی تفسیر ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ محمد رسول اللہ کا افتری نہیں بلکہ جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اسی چیز پر اگلی آیت مجیدہ شاہد ہے۔ جسمیں ارشاد ہوا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۸

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے (قرآن کو رسولؐ نے) خود افتریٰ کر لیا ہے۔ (آپ انہیں) کہدیجئے گا کہ تم بھی ایک سورت اس جیسی لے آؤ۔ اور تم میں جتنی استطاعت ہے اسکے مطابق جس جس کو بلا سکتے ہو اللہ کے سوا بلا لو۔ اگر تم اپنے (دعوے میں) سچے ہو۔

فاتو بسورة مثله کا چیلنج مخالفین رسولؐ کے اس دعوے پر دیا گیا ہے جو وہ یہ کہتے تھے کہ اس قرآن کو اس مدعی نبوت نے خود گھڑ کر اللہ کے ذمہ لگا دیا ہے۔ اسلئے کہا گیا ہے کہ اگر وہ قرآن گھڑ سکتا ہے تو تم بھی اس جیسے بشر انسان ہو تم اس جیسی ایک سورت ہی گھڑ کر لے آؤ

وادعوا من استطعتم کے الفاظ میں اسی چیلنج کو اور وسیع کر دیا گیا ہے کہ تم جتنی بھی طاقت رکھتے ہو اس کے مطابق جس جس کو چاہو اپنی مدد کے لئے بلا لو۔ مگر اس جیسی ایک سورت بھی نہ بنا سکو گے۔ سورہ بنی اسرائیل میں اسی عنوان

کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (17/88) (اے رسولؐ!) "کہدیجئے گا کہ اگر انسان و جن(مدنی اور بدوی) سب لوگ بھی اس امر پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل لے آئیں تو ہرگز نہیں لائینگے۔ اور اگر چہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار بھی ہو جائیں"۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم کی مثل سے مراد اس جیسی جامع اور بلیغ کلام ہونے کے علاوہ ایسے قوانین اور ایسے ضابطہ حیات پر مشتمل ہو کہ اس میں قیامت تک کے بدلتے ہوئے حالات میں کبھی بھی کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہ پڑے۔ ایسی کلام پورے کرہ ارض پر کہیں بھی نہ آجتک پائی گئی ہے اور نہ قیامت تک پائی جائیگی۔ مگر قرآن حکیم کے پیش کردہ قوانین میں نہ آج تک کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت لاحق ہوئی ہے نہ قیامت تک لاحق ہوگی۔ اسکے برعکس بڑے بڑے فلاسفروں' دانشوروں اور مفکروں کے بنائے ہوئے قوانین پورے کرہ ارض پر ہمارے سامنے ہیں' مگر مشاہدہ گواہ ہے کہ وہ آج قانون بناتے ہیں اور کل اس میں ترمیم کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ بیچارے نہیں جانتے کہ چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد حالات کس طرف کو کروٹ لے جائینگے۔ اس لئے جب زود یا بدیر حالات بدل جاتے ہیں تو انکے بڑے غور و فکر کے بعد کے بنائے ہوئے قوانین فیل ہو جاتے ہیں۔ اسکے برعکس اللہ تعالیٰ چونکہ قیامت تک کے بدلتے ہوئے حالات سے پورا پورا باخبر ہے۔ اس لئے اس کے نازل کردہ قرآن کریم کے قوانین میں نہ چودہ سو سال سے کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پڑی ہے نہ قیامت تک پڑیگی۔

اگلی آیت مجیدہ میں کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کو جھٹلانے والے دراصل اس اللہ کو جھٹلاتے ہیں' جس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

(یہ لوگ قرآن کو نہیں جھٹلاتے) بلکہ اس (اس کے نازل کرنیوالے) کو جھٹلاتے ہیں اس لئے کہ اسکے علم کا احاطہ نہیں کر سکے۔ اور ابھی تو انکے پاس اسکی حقیقت نہیں آئی (جب یہ تمام ضابطوں پر غالب آئیگا (48/28 + 9/33) اور اسکے مخالفوں کو شکست فاش ہو جائیگی (3/12) تو پھر انہیں پتہ چلے گا) اسی طرح پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا پھر اے مخاطب! غور کر کہ (جھٹلانیوالے) ظالموں کا کیا انجام ہوا۔

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه کے الفاظ میں قرآن کو جھٹلانے کی وجہ بیان کر دیگئی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے علم تک نہیں پہنچ سکے یعنی اسکے نازل کردہ ضابطے کی حقیقت کو نہیں پا سکے' بلکہ اپنے آپکو بڑے دانشور اور مدبّر و مفکر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ انکے بنائے ہوئے ضابطے ہر آن فیل ہوتے رہتے ہیں اور وہ خود سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

مگر ان میں کچھ لوگ سمجھدار بھی ہیں

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ انکے اپنے قوانین کے آئے دن کی ناکامی کو نگاہوں کے سامنے رکھ کر انہی میں سے کچھ لوگ اس نہ بدلنے والے قرآنی قانون پر ایمان لے آئینگے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾

اور ان میں سے کچھ لوگ تو اس (قرآنی ضابطہ حیات) کے ساتھ ایمان لے آئینگے' اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ایمان نہیں لائینگے۔ (آپ انہیں نہیں جانتے) آپکا رب ان مفسدوں کو خوب خوب جاننے والا ہے۔

ضابطہ الٰہی پر ایمان نہ لانیوالوں کو مفسدین یعنی فسادی اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ قرآن کریم کے متوازن اور ربوبیت بدوش ضابطہ کے نفاذ کیساتھ ان لوگوں کو انکے حقوق ربوبیت پہنچنے دینا نہیں چاہتے جن کا وہ دن رات استحصال کر کے انکا خون چوستے اور اپنی جیبیں بھرتے رہتے ہیں۔

واضح رہے کہ دنیا بھر میں صرف قرآنی ضابطہ حیات ہی وہ رحمت بھرا قانون ہے جس کی اساس ربوبیت عالمینی پر قائم ہے اور اس ضابطہ حیات کا اولین اعلان ہی ربوبیت عالمینی کا ہے۔

الحمد اللہ رب العلمین (1/1) سب اچھی تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کی ربوبیت کرنیوالا ہے مگر جو لوگ عوام کے استحصال پر گلچھرے اڑاتے ہوں' یعنی جن کے منہ کو عوام کا خون لگ چکا ہو' نہ وہ سابقہ زمانوں میں بھی الٰہی نظام ربوبیت کا نفاذ برداشت کرتے تھے نہ آج کرتے ہیں۔

اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا ہے کہ آپ مخالفوں سے بر ملا کہدیجئے گا کہ اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو لب حق و باطل کا فیصلہ آخری انجام پر ہو گا۔ تم اپنے ضابطوں پر عمل کرتے چلے جاؤ اور میں الٰہی ضابطے پر عمل کرتا چلا جاتا ہوں۔

وَ اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَ لَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور (اے رسولؐ!) اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کوئی بات نہیں) آپ ان سے کہدیجئے گا کہ میرا عمل میرے لئے ہے تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور تمہارا عمل تمہارے لئے ہے میں اس سے بری ہوں جو عمل تم کرتے ہو۔

لی عملی سے مراد یہ ہے کہ میرے عمل کا اچھا یا برا نتیجہ میرے لئے مرتب ہو گا یعنی میرے اعمال میرے ہی لئے اچھے برے نتائج برآمد کر کے رہیں گے تمہارے لئے نہیں۔ اور لکم عملکم کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے اعمال تمہارے ہی لئے اچھا یا برا نتیجہ برآمد کر کے رہیں گے میرے لئے نہیں۔

اور اسی طرح انتم بریٔون مما اعمل سے مراد یہ ہے کہ جو عمل میں کرتا ہوں انکا نتیجہ تمہارے لئے نہیں مرتب ہوگا میرے ہی لئے مرتب ہوگا اور انا بری مما تعملون سے مراد یہ ہے کہ جو عمل تم بجالاتے ہو انکا نتیجہ میرے لئے مرتب نہیں ہوگا تمہارے ہی لئے مرتب ہوگا۔ اور بالآخر ہمارے الگ الگ اعمال سے برآمد شدہ نتائج بشکل مشہود سامنے آجائیں گے کہ کون غالب اور کون مغلوب ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر کونسا ضابطہ حیات اپنے عامل کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کرتا ہے اور کونسا ضابطہ اپنے عامل کو شکست و ناکامی کے قعرمذلت میں پھینک دیتا ہے۔

فتح و نصرت کی خوشخبری

قرآن کریم نے اس سلسلے کا آخری نتیجہ یہ بتایا ہے کہ ضابطہ الٰہی قرآن حکیم کے عامل نبی اکرمؐ اور صحابہؓ اکرام آخرالامر کامیاب و کامران ہونگے۔ اور قرآنی دین میں لوگ فوج در جوج شامل ہوجائیں گے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًا (110/3-1)

جب (تمہارے قرآنی اعمال کے نتیجہ کے طور پر) اللہ کی مدد اور فتح آجائیگی تو (اے رسولؐ!) آپ دیکھیں گے کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونگے۔ آپ اپنے رب کی حمد کیساتھ ساتھ اپنافرض منصبی ادا کرتے رہیں اور اس سے عملاً" بچاؤ طلب کرتے رہیں۔ بلاشبہ وہ رجوع برحمت ہونیوالا ہے۔

فتح عظیم آگئی

سورہ فتح میں ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (48/1) بیشک ہم نے (اے رسولؐ!) آپکو فتح مبین' (ظاہر فتح عطا فرمائی۔ یہ فتح مبین کیا تھی؟ اسکی وضاحت اسی سورہ فتح میں اسطرح کیگئی ہے کہ جب نبی اکرمؐ فتح مکہ کے لئے صحابہؓ کرام کا لشکر جرار لیکر وادی مکہ میں پہنچے تو وہی دشمن جو متعدد بار مدینہ منورہ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ نبی اکرمؐ کی فوجی تیاری سے اسقدر مرعوب ہوا کہ بلا جنگ و جدال شکست تسلیم کر لی۔ چنانچہ انتہائی واضح الفاظ میں ارشاد ہوا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ کَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَکَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَکُمْ عَلَیْهِمْ وَکَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا 48/24

اور وہ اللہ وہ ہے جس نے وادی مکہ میں ان (تمہارے دشمنوں) کے ہاتھ تم سے روکدیئے اور تمہارے ہاتھ ان سے روکدیئے پیچھے اسکے کہ ان پر تمہارا رعب ڈالدیا۔ اور اللہ تمہارے ان اعمال کو دیکھتا تھا جو تم (فوجی تیاری کے ضمن میں) کرتے رہے تھے۔

بلا جنگ و جدال فتح بھی قرآنی آئین پر عمل ہی کا نتیجہ ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس سوال کا جواب ضروری ہے کہ نبی اکرمؐ کو بلا جنگ و جدال فتح کیوں ہوئی۔ اور دشمن پر کس

چیز کا رعب طاری ہو گیا تھا۔ اسکے جواب کے لئے آیت مجیدہ زیر بحث کے الفاظ لِیْ عَمَلِیْ کو پھر نگاہوں کے سامنے لائیے کہ میرے عمل میرے ہی لئے ہیں وہ ضرور ضرور اپنا نتیجہ بر آمد کر کے رہیں گے۔ چونکہ نبی اکرمؐ کے اعمال سب کے سب قرآن کریم کے عین مطابق تھے اسلیئے ظاہر ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لئے جو حکم باری تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ لاریب کتاب میں درج فرمایا اس پر بھی نبی اکرمؐ کا صد فیصد عمل تھا۔

اس سلسلے میں ارشاد باری ہے کہ ایمان والو! دشمن کے مقابلہ کے لئے استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ اتنی فوجی قوت تیار کرتے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ کا اور تمہارا دشمن گھر بیٹھے کا نپتا رہے۔ چنانچہ سورہ انفال میں نہائت بلیغ انداز کے ساتھ کھلے لفظوں میں ارشاد ہوا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (8/60)

(مفہوم) اور (ایمان والو!) ان (دشمنوں کے مقابلہ) کے لئے تم میں جتنی بھی استطاعت ہے زیادہ سے زیادہ فوجی عسکری قوت تیار کرتے رہو۔ خصوصاً (الخیل) یعنی تیز رفتار ذرائع رسل و رسائل کی تمہارے ہاں بہتات ہو۔ تم اس عسکری قوت کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمن کو دہلاتے رہو گے۔ اور (جن دشمنوں کو تم جانتے ہو) انکے سوا اور بھی تمہارے دشمن ہیں تم انہیں نہیں جانتے۔ اللہ انہیں جانتا ہے۔ اور تم (اس فوجی قوت کی تیاری کے لئے) جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے (یعنی اسلامی نظام کو جو کچھ بطور قرضہ دو گے) وہ تمہیں واپس کر دیا جائیگا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔

دیکھئے اس آیت مجیدہ (8/60) میں فوجی قوت تیار کرنے کا کتنا اہم حکم دیا گیا ہے اور اسکا عملی دائرہ کسقدر وسیع قرار دیا گیا ہے کہ اگر اسکے لئے عوام سے قرضہ جات بھی حاصل کرنے پڑیں تو حاصل کر لئے جائیں۔ پس نبی اکرمؐ جب ضابطہ الٰہی کے حکم بالا 8/60 کے مطابق استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت تیار کر کے فتح مکہ کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر وادی مکہ میں پہنچے تو دشمن نے آپ کی بے پناہ فوجی قوت سے مرعوب ہو کر بلا جنگ و جدال شکست قبول کر لی۔ یہ فتح مبین 48/1 بھی لِیْ عَمَلِیْ کے مطابق تھی جو نبی اکرمؐ کے قرآنی عمل کے مطابق ہی نصیب ہوئی تھی۔ اور دشمنوں کو لَكُمْ عَمَلُكُمْ کے مطابق انکے اعمال کے نتیجہ کے طور پر ہی شکست نصیب ہوئی تھی۔

آیت نمبر 40 میں خبر دیگئی ہے۔ اور ان میں سے کچھ لوگ تو (قرآنی ضابطہ حیات) کے ساتھ ایمان لے آئیں گے۔ اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے۔ (آپ انہیں نہیں جانتے) آپکا رب ان مفسدوں کو خوب خوب جاننے والا ہے۔

آیت مجیدہ نمبر 41 میں ارشاد ہوا کہ۔ (اے رسولؐ!) اگر یہ لوگ آپکو جھٹلاتے ہیں تو (کوئی بات نہیں) آپ ان سے کہدیجئے گا کہ میرا عمل میرے لئے ہے تم اس سے بری ہو جو میں کرتا ہوں اور تمہارا عمل تمہارے لئے ہے، میں اس سے بری ہوں: جو عمل تم کرتے ہو۔ یعنی تمہارے اعمال تمہارے ہی لئے اچھے یا برے انجام کا موجب بنیں گے۔ اور میرے اعمال میرے ہی لیے اچھے یا برے انجام کا سبب ہونگے۔ جب نتیجہ برآمد ہو گا تو پتہ چل جائیگا کہ کس کے اعمال اچھے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہیں۔ تم میرے اعمال کے نتیجہ سے بری ہو اور میں تمہارے اعمال کے نتیجہ سے بری ہوں۔

اس آخری اور دو ٹوک فیصلے کے بعد نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے اگلی دو آیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہ آپکی طرف توجہ کر کے سنتے ہیں مگر انہوں نے کانوں میں تعصب کے ڈاٹ لگا رکھے ہیں تو کیا آپ بہروں کو قرآن سنائینگے؟

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو آپ کی طرف بظاہر سنتے ہیں (لیکن حقیقت میں وہ سنتے نہیں) پھر کیا آپ بہروں کو سنائینگے۔ اور اگرچہ وہ لوگ عقل سے کام ہی نہ لیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو آپکی طرف دیکھتے ہیں (مگر وہ عقل کے اندھے ہیں)۔ پھر کیا آپ اندھوں کو راہ بتائیں گے۔ اگر چہ وہ کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں۔

تعصب کے بہرے اور تعصب کے اندھے

اوپر آیت نمبر 42 میں بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ نبی اکرمؐ کا تبلیغی کلام سنتے تو تھے، مگر وہ دراصل سن ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ عقل سے کام ہی نہیں لیتے تھے۔ ایسے لوگوں نے عقل پر تعصب کے دبیز پردے ڈال رکھے ہوتے ہیں اسلئے وہ سننے کے باوجود ایسے ہوتے ہیں کہ کچھ سناہی نہیں - اس قسم کے افراد تعصب کے بہرے ہوتے ہیں۔نہ عقل سے کام لیا اور نہ قرآنی حقائق کی روشنی سے دماغ منور ہونے پایا۔

آیت نمبر 43 میں ایسے ہی لوگوں کو عقل کے اندھے کہا گیا ہے۔ کیونکہ نبی اکرمؐ کے اعلیٰ ترین کردار کو خود آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود آپکی عظمت شان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ ایسے لوگوں کی عقل پر پڑے ہوئے تعصب کے پردوں ہی کا اثر ہوتا ہے۔ کہ انہیں آنکھوں کے ہوتے ہوئے قرآنی نور دکھائی نہیں دیتا۔ اس قسم کے لوگ تعصب کے بہرے اور تعصب کے اندھے ہونے کی بدولت نہ قرآنی حقائق کو سنتے ہیں اور نہ انکے بابرکت اثرات کو دیکھتے ہیں۔ اور اس طرح خود ہی ہدائت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ لوگ ہدائت سے دور رہکر خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو کسی پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔ و لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر آپ ظلم کر لیتے ہیں۔

اس آیت مجیدہ میں منفی اور مثبت دونوں انداز میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ کسی بھی صورت میں محروم پائے جاتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے محروم نہیں کیا ہوتا بلکہ وہ خود اپنی ہی غلط کاریوں اور بد اعمالیوں کی بدولت محروم ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔

اوپر والی آیات کریمات کے سیاق کلام میں ذکر ہے نبی اکرمؐ کی تبلیغ سننے کے باوجود اور نبی اکرمؐ کے عظمت کردار و اخلاق کو دیکھنے کے باوجود ہدایت سے خود محروم رہنا۔ اس عنوان کی قرآن کریم میں متعدد مقامات پر وضاحت فرمائی گئی ہے کہ ہم نے اپنا نصیحت نامہ کھلے اور واضح الفاظ میں نازل کر دیا ہے' جو خود چاہے اپنے پروردگار کی طرف خود راستہ اختیار کرے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (73/19 + 76/29) "بلاشبہ اس (قرآن کی آیتیں) ایک نصیحت نامہ ہیں۔ پس جو کوئی خود چاہے (انکی اتباع کر کے) اپنے رب کی طرف سیدھی راہ خود اختیار کرے"۔

۔ سورہ کہف میں ارشاد ہوا ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18/29) "اے رسولؐ کہدیجئے گا کہ حق (قرآن مجید) تمہارے رب کی طرف سے (نازل ہوا) ہے۔ پس جو کوئی خود چاہے اس پر ایمان لائے اور جو کوئی خود چاہے اسکا انکار کر دے۔" پس جو لوگ محرومین ہدائت پائے جاتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے گمراہ نہیں کیا ہوتا۔ بلکہ وہ خود ہی عقل سے کام نہ لیکر محروم ہدائت ہو چکے ہوتے ہیں۔ پس اہل اسلام میں جو یہ عقیدہ راہ پاچکا ہے' جسے ہر مجلس میں انتہائی بیباکانہ انداز کے ساتھ دہرایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدائت دے اور جسے چاہے معاذ اللہ گمراہ کر دے' یہ نظریہ و عقیدہ صد فیصد قرآن کریم کے خلاف اور ذات باری کی انتہائی توہین پر مبنی ہے۔ جس پر معمولی سی عقل بھی خرچ نہیں کی جاتی کہ جس ذات مقدس نے نوع انسانی کی ہدائت کے لئے اپنی مقدس کتاب نازل فرمائی ہے۔ اور جس کی غرض نزول ہی یہ ہے کہ نوع انسانی اس پر عمل کر کے دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں کے جملہ مخطرات سے بچ جائے' کیا وہ خود ہی بعض کو ہدائت دیتا ہے اور بعض کو خود ہی گمراہ کر دیتا ہے؟ العیاذ باللہ! نوع انسانی کی طرف پے در پے ہدائت کی 114 چٹھیاں بھیجنے والے اللہ تعالیٰ کی ایسی شان ہرگز ہرگز نہ ہے ہی' اور نہ ہو ہی سکتی ہے کہ وہ بعض کو خود ہدائت دے اور بعض کو خود گمراہ کر دے

اسی سورہ یونس زیر بحث میں نوع انسانی کی ہدائت و گمراہی کے عنوان کی بالفاظ ذیل وضاحت کر دی گئی ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ (10/108) "اے رسولؐ! کہدیجئے گا کہ اے نوع انسانی! بیشک تمہارے رب کی طرف سے حق (قرآن مجید) تمہارے پاس آگیا ہے۔ پھر جو کوئی اس سے ہدایت حاصل کرتا ہے۔ اپنی ہی جان کے لئے حاصل کرتا ہے۔ اور جو کوئی گمراہ ہو جاتا ہے سوائے اسکے اور کوئی بات نہیں کہ اسکے گمراہ ہو جانے کا وبال اسکی اپنی جان پر پڑیگا۔ اور میں تمہارے اوپر کوئی وکیل نہیں کہ تمہیں زبردستی ہدائت دیدوں"۔ پس تکراری آیات بالا 73/19 + 76/29 + 18/29+ 10/108 کے مطابق کھل کر ثابت ہو چکا کہ ہدائت پانا یا گمراہ ہو جانا ہر انسان کا اپنا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو زبردستی مومن بناتا ہے نہ کافر۔ پس یہ عوامی مقولہ یکسر غلط ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدائت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے العیاذ باللہ!

اچھے یا برے عمل بھی انسان خود کرتا ہے' اللہ اس سے برے عمل نہیں کرواتا

سورہ حم سجدہ میں ارشاد ہوا ہے۔ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ اِنَّہٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ (41/40) مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ؕ وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ (41/46)(اے نوع انسانی) اچھے یا برے عمل جیسے بھی تم خود چاہو خود کرو۔ بیشک وہ (اللہ) جو عمل تم بجالاتے ہو انہیں اچھی طرح دیکھنے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔ جو کوئی اچھے اعمال بجالائے انکا فائدہ اسکی اپنی ہی جان کے لئے ہو گا اور جو کوئی برے اعمال بجالائیگا' انکا وبال اسکی اپنی ہی جان پر پڑیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ (اے رسولؐ!) آپکا رب (لوگوں سے زبردستی برے اعمال کروا کر) اپنے بندوں پر ظلم کرنیوالا نہیں۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ خود ہی بندوں سے برے اعمال کرائے اور خود ہی دائمی جہنم کی سزا سنا دے۔ آیات بالا میں کھل کر اعلان کر دیا گیا ہے کہ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنا کر اعلان کر دیا گیا ہے۔ اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ (41/40) جیسے عمل تم خود چاہو خود کرو۔ جیسے عمل اچھے یا برے تم خود کرو گے ویسا ہی اچھا یا برا بدلہ ہمارے قانون عدل کے مطابق تمہیں مل جائیگا' مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ وَمَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا (41/46)پس یہ عوامی مقولہ بھی یکسر غلط ہے کہ اللہ جس سے چاہتا ہے نیک عمل کرواتا ہے جس سے چاہتا ہے برے عمل کرواتا ہے العیاذ باللہ!

دُکھ سُکھ بھی انسان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔

سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوا ہے۔

وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ (42/30) اور اے نوع انسانی!) تمہیں جو بھی مصیبت دکھ تکلیف پہنچتی ہے۔ پس وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ (اللہ تعالیٰ) تو تمہاری بہت سی غلطیوں سے درگزر کرتا چلا جاتا ہے۔

سورہ روم میں ارشاد ہوا ہے۔ ظَہَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ لِیُذِیۡقَہُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ (30/41) خشکی اور سمندر میں جو فساد ظاہر ہوتا ہے وہ انسان کے اپنے ہاتھوں کا کمایا ہوا ہوتا ہے۔ اس سبب سے اللہ تعالیٰ انکے بعض برے اعمال کا مزہ (اسی دنیا میں) چکھا دیتا ہے تاکہ وہ اپنی غلط کاریوں اور بد کرداریوں سے باز آجائیں۔

اس سے آگے (30/45-44) میں ارشاد ہوا ہے۔ مَنۡ کَفَرَ فَعَلَیۡہِ کُفۡرُہٗ ۚ وَمَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنۡفُسِہِمۡ یَمۡہَدُوۡنَ ﴿ۙ﴾ لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ○ (30/45-44) (لوگ خود کفر کرتے ہیں) جو کوئی کفر کرتا ہے۔ اسکا وبال اسی کے اوپر پڑتا ہے۔ اور جو کوئی صالح عمل بجالاتا ہے (خود بجالاتا ہے) پس ایسے لوگ اپنے ہی لئے سامان کرتے ہیں۔ تاکہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے ان لوگوں کو بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ جو اسکے نازل کردہ ضابطہ حیات پر ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں۔ بلاشبہ وہ انکار کرنیوالوں (اور بد عملوں) کو پسند نہیں کرتا۔ پس آیات بالا 42/30 + 30/45-44 کے مطابق یہ عوامی مقولہ بھی یکسر غلط ہے کہ اللہ جسے چاہے دکھ مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سُکھوں پر سُکھ عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ دُکھ اور سُکھ انسان کے اپنے ہی عملوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

رجوع الی المقصود

ہم آیت مجیدہ (10/44) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ کی قرآنی تفسیر میں دور نکل گئے ہیں۔ اب اس سے اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں جو جزا سزا ملتی ہے اسکے علاوہ اس اخروی زندگی کی جزا سزا الگ ہے جب قیامت کے دن پوری مخلوق کو دوبارہ زندہ کر لیا جائیگا۔ اس دن ایسا معلوم ہو گا کہ دنیا میں دن کی صرف ایک ساعت ہی رہے تھے۔ ایک ساعت کے بعد مرگئے تھے اور فوراً ہی اٹھا لئے گئے ہیں۔ اس دن لوگ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ اور اعمال کی جزا سزا کے ضمن میں گھاٹے میں وہ لوگ رہیں گے جو اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے دوسری زندگی میں اللہ کے حضور حاضری کا عملاً انکار کر کے برے عمل کرتے رہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝ ۴۵

اور جس دن وہ اللہ ان (سب کو) جمع کر لے گا انہیں ایسا معلوم ہو گا کہ) وہ دنیا میں نہیں رہے تھے مگر دن کی صرف ایک ساعت بھر۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ بیشک گھاٹے میں وہ رہیں گے جنہوں نے اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے اللہ کے حضور حاضری کو جھٹلایا (اور برے عمل بجلائے وہ اپنی ہی بداعمالیوں کی بدولت) خود ہی ہدائت پانیوالے نہ ہوئے۔

قیامت کے دن سب کو جمع کر لیا جائیگا

قیامت کی اخروی زندگی کی خبر قرآن بھر میں متعدد مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ سورہ مومنون کی آیات (23/16-12) میں آیا ہے۔ اور بیشک ہم نے انسان کو ابتداءً مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر اسکی افزائش نسل ایک مقام پر ٹھہرنے والے نطفہ سے مقرر فرمائی۔ پھر ہم نطفہ کو خون کا لوتھڑا بناتے ہیں۔ پھر لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی بنا دیتے ہیں۔ پھر ہم اس میں ہڈیاں پیدا کرتے اور پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں پھر ہم اسے رحم مادر سے نکال کر دوسری مخلوق (یعنی بشری صورت میں) پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ (23/15) پھر تم (اے نوع انسانی!) اس دنیا کی زندگی گزار کر (اور اچھے یا برے عمل خود بجالا کر) مرجاتے ہو۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (23/16) پھر تم (اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے) قیامت کے دن دوبارہ پیدا کر کے اٹھائے جاؤ گے (اور اپنے حضور حاضر کر لئے جاؤ گے)

اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ایک کر کے اٹھائے جائیں گے یا سب کے سب یکبارگی پیدا کر لئے جائیں گے۔ اس کا جواب سورہ یاسین میں دیا گیا ہے۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (36/51) اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (36/53) اور صور پھونکا جائیگا۔ پھر وہ اپنی اپنی قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑتے ہوئے آئینگے۔ نہیں ہوگی وہ مگر ایک زور کی آواز یکبار گی۔ پھو وہ

سب کے سب ہمارے حضور حاضر کر لئے جائینگے۔

دوبارہ کس طرح پیدا کئے جائینگے۔

مذکورہ بالا تصور پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوبارہ پیدا کرنے کی صورت کیا ہوگی۔ اسکا جواب سورہ طٰہ میں دیا گیا ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى (20/55) "(اے نوع انسانی!) ہم نے تمہیں اسی (زمین میں) سے پیدا کیا تھا۔ اور (تمہاری موت کے بعد) اسی زمین میں لوٹا دیتے ہیں اور (اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے) ہم تمہیں اسی زمین میں سے دوبارہ نکال لیں گے"۔ واضح رہے کہ قرآنی تعلیم میں قیامت کی عدالت عالیہ میں اعمال کی باز پرس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اور اسکا تکرار بھی بار بار کیا گیا ہے۔ جس کی غرض صرف اور صرف یہ ہے کہ نوع انسانی ایک ایسی عدالت میں حاضری کے خوف سے برے اعمال سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر کے اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی گزارتے ہوئے قیامت کے دن بھی حضور باری تعالیٰ میں سرخروئی حاصل کرے۔ اور دنیوی جنت کے علاوہ اخروی جنت کی بھی حقدار ہو۔

قیامت کو دنیا کی صد سالہ زندگی بھی ایسی معلوم ہوگی کہ دن کی صرف ایک ساعت گزاری تھی۔

جس طرح آج ہمارے ہر فرد کو خواہ وہ ستر اسّی سال کی زندگی گزار چکا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ بچپن کی کھیلیں کھیلا کرتے تھے۔ چشم زدن میں اسّی سال گزر چکے ہیں۔ یہ اسّی سال ایک کل گزرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اِسی طرح آیت بالا 10/45 میں بتایا گیا ہے قیامت کو سو سو سال کی زندگی پانیوالے بھی یہی سمجھیں گے کہ وہ دنیا میں دن کی ایک ساعت ہی رہے تھے۔ اور اسی طرح موت اور قیامت کا درمیانی وقفہ خواہ لاکھوں برس کا بھی کیوں نہ ہو گا۔ وہ بھی ایک ثانیہ کے برابر معلوم ہوگا کہ ابھی مرے تھے اور ابھی اٹھالئے گئے ہیں۔

قیامت انتہائی قریب ہے

پس لازم ہے کہ قیامت کی باز پرس اور اللہ کے حضور حاضری کو اس طرح قریب تر سمجھا جائے کہ ہم قیامت کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ کوئی خبر نہیں کہ موت کب آجائے اور مرنے کے بعد تو چونکہ زمانے کے گزرنے کا شعور ہی نہیں ہوگا۔ اس لئے برزخ کے ہزاروں برس بھی ایک ثانیہ کے برابر معلوم نہ ہوں گے۔ موت کا مزہ ابھی منہ میں ہو گا کہ حاضر عدالت کر لئے جائیں گے۔ اس لئے چاہئے کہ زندگی کا جو حصہ میسر ہے اس میں زیادہ سے زیادہ نیک اعمال بجا لا کر قیامت کا مسئلہ حل کرتے چلے جائیں۔ تاکہ حضور الٰہی میں شرمساری نہ ہو اور اپنے ہمعصروں میں جو اسے اچھی طرح پہچان لینگے ندامت نہ اٹھانی پڑے۔ ما علینا الا البلاغ

یتعارفون بینھم کی الٰہی خبر کو ہر آن نگاہوں کے سامنے رکھیئے اور اس منظر کو تصور کی نگاہ سے دیکھئے! کہ جب قیامت میں ہمارے ہمعصر جن میں ہم بڑے نیکو کار بنے ہوئے ہیں پہچان لینگے کہ یہ تو وہی ذات شریف ہیں جو اپنی نیک اعمال کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے مگر آج ان کی پاکبازی کی قلعی کھل گئی ہے۔ انکا ظاہر کیا تھا اور یہ اندر سے کیسے ثابت ہوئے ہیں۔ معاذ اللہ استغفر اللہ!

لقاء اللّٰہ کا معنی ہم نے لکھا ہے قیامت کی عدالت میں اس دنیا کے اعمال کی جوابدہی کے لئے حاضر ہونا۔ ان الفاظ کا ایک معنی اللہ کی ملاقات بھی ہے اور ایک معنی اللہ کا دیدار بھی ہے۔ اللہ تعالٰی کی ملاقات تو قیامت کی عدالت عالیہ ہی میں ہوگی جس میں اپنے اچھے برے عملوں کی جوابدہی کے لئے ہی حاضر ہونا ہے۔ مگر لقاء اللہ سے یہ مراد از روئے قرآن حکیم ہرگز نہیں ہے کہ قیامت کو اللہ تعالٰی کا دیدار ہو گا۔ کیونکہ سورہ انعام میں دو ٹوک فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ نہ انسانی آنکھ اللہ تعالٰی کو دیکھ سکتی ہے اور نہ انسانی بصیرت اسے سمجھ ہی سکتی ہے کہ وہ کیا ہے۔

لَا تُدْرِکُہُ الْاَ بْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَ بْصَارُ (6/103) اس آیت مجیدہ کا دوہرا ترجمہ اور مفہوم یہ بنتا ہے کہ اس اللہ کو نہ کوئی عقل سمجھ سکتی ہے اور نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اس مفہوم کی صحت کے لئے جملہ لا تدرکہ الابصار میں آمدہ فعل اور فاعل کی باہمی مناسبت پر غور کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس جملے میں فعل مضارع مونث آیا ہے۔ تدرک جس پر لا کے درود نے اسے نفی کے معنی دیئے ہیں۔ اس کے بعد مفعول ہے ضمیرہٗ راجع بسوئے اللہ۔ اور لا تدرکہ کا یہ معنی ہوا کہ۔ ”نہیں سمجھ سکتیں اس اللہ کو“ کون نہیں سمجھ سکتیں؟ اس فعل کا فاعل آیا ہے الابصار جو بصر بمعنی آنکھ کی جمع ہے۔ تو اس طرح پورے جملہ لا تدرکہ الابصار کا معنی ہوا۔ اس (اللہ) کو آنکھیں نہیں سمجھ سکتیں۔ مگر ان معنوں پر کھلا اعتراض وارد ہوتا ہے کہ آنکھوں کا کام تو دیکھنا ہے، سمجھنا نہیں سمجھنا تو کام ہے عقل و بصیرت کا۔ اس لئے فعل تدرک کی مناسبت سے یہاں آنا چاہئے تھا۔ لَا تُدْرِکُہُ الْعُقُوْلُ کہ اسے عقلیں سمجھ نہیں سکتیں

اور یا جملہ زیر بحث میں آمدہ فاعل الابصار کی مناسبت سے فعل آنا چاہئے تھا تُبْصِر اور جملہ اسطرح ہوتا لَا تُبْصِرُہُ الْاَ بْصَارُ کہ اس (اللہ) کو آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔ مگر برادران عزیز ذات باری نے فعل نفی لا تدرکہ کا فاعل الْاَبصار لا کر بیک وقت دو اعلان کر رکھے ہیں۔ پہلا اعلان ہے، فعل نفی لا تدرکہ کے مطابق کہ نہ اس اللہ کو کوئی ادراک کوئی عقل سمجھ سکتی ہے اور دوسرا ہے الابصار فاعل کے مطابق کہ نہ ہی اسے کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ الابصار کا سہ حرفی مادہ بھی ب۔ص۔ر= بصر ہے جس کا معنی ہے آنکھ اور اسی سہ حرفی مادہ سے لفظ بصیرت بمعنی عقل بھی مشتق ہے۔ تو اس طرح لغت کی رو سے بھی مذکورہ بالا معنی اور مفہوم صحیح ہے کہ نہ اس اللہ کو کوئی عقل سمجھ ہی سکتی ہے اور نہ کوئی آنکھ اسے دیکھ ہی سکتی ہے۔

کسی چیز کو سمجھنے کے لئے مثال کی ضرورت لاحق ہوتی ہے

جب کسی نے کوئی چیز دیکھی ہوئی نہ ہو تو اسے سمجھانے کے لئے اسکی کوئی مثال دی جاتی ہے۔ مثلاً جب ابھی بجلی کے بلب برصغیر میں مستعمل نہیں تھے۔ صرف مغربی ممالک میں ان سے روشنی کا کام لیا جاتا تھا۔ تو انکے متعلق کسی شخص کو سمجھانے کے لئے کسی روشن ترین لیمپ یا فانوس کی مثال دی جایا کرتی تھی۔ مگر اللہ تعالٰی کی مثال کسی چیز سے کس طرح دی جا سکتی ہے کہ جس نے خود اعلان کر رکھا ہے۔

لیس کمثلہ شیئی 42/11 اللہ کی مثل کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ پس چونکہ وہ ذات بے مثل و بے مثال ہے اس لئے اس کے سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے۔ اسی لئے (6/103) میں کہدیا گیا ہے لا تدرکہ الابصار کہ

اس بے مثل و بے مثال ذات کو کوئی عقل سمجھ ہی نہیں سکتی۔ اب آیئے اسے دیکھنے کے سوال کی طرف سورہ اعراف میں آیا ہے موسیٰؑ نے اپنے ساتھیوں کے کہنے پر سوال کر دیا تھا۔

رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ (7/143) اے میرے رب مجھے اپنا آپ دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ مگر ذات باری کی طرف سے جواب ملا لن ترانی تو مجھے ہرگز ہرگز نہیں دیکھے گا۔ غور فرمائیں کہ یہاں ترانی فعل مضارع پر لن داخل ہوا ہے۔ جس نے اسے تاکید منفی مستقبل کے معنے دیئے ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ تو مجھے ہرگز ہرگز نہیں دیکھے گا۔

برادران عزیز! اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کا جو تعلق ہے اسکی خبر قیامت کے مسئلے میں اوپر گزر چکی ہے کہ وہ حاکم ہے اور انسان محکوم ہے۔ پس اسے اپنی قیامت کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اسکی فرمانبرداری کرنی چاہئے۔ آیت مجیدہ 6/103 کے آخری الفاظ میں ارشاد ہوا ہے۔ وھو اللطیف الخبیر (6/103) اور وہ اللہ تعالیٰ ایک لطیف ذات ہے اور بہت بہت باخبر ہے۔ پس جب انسان ہوا جیسی معمولی سی لطیف چیز کو نہیں دیکھ سکتا تو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا سوال کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ فلھذا لقاء اللّٰہ کا معنی و مفہوم اللہ کا دیدار تو صد فیصد غلط ہے۔ بلکہ اسکا صحیح معنی اللہ کی ملاقات ہے جو اسکے حضور میں اعمال کی جوابدہی کے لئے ہوگی ہر شخص کا اعمالنامہ اسکی گردن میں بندھا ہو گا اور اس امر کا حالی اعلان ہو رہا ہو گا۔

اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ ؕ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا (17/14) "اپنا اعمالنامہ خود پڑھ لے۔ آج کے دن تیرے حساب کے لئے یہی کافی ہے"

سورہ یونس میں آمدہ لقاء اللہ کی تشریح قیامت کی جوابدہی ہے جو بالفاظ ذیل موجود ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِهَا وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ○ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ (7-8/10) فَنَذَرُ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ ○ (10/11) "بیشک جو لوگ (قیامت کی) ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہوگئے ہیں اور وہ بھی جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں انکا ٹھکانہ آگ ہے اسکے ان برے اعمال کی بدولت جو وہ کیا کرتے تھے (7-8-/10) پس ہم نے انہیں چھوڑ دیا ہے جو ہماری قیامت کی ملاقات کی امید نہیں رکھتے (یعنی جو قیامت کی جوابدہی کے منکر ہیں) وہ اپنی (بد اعمالیوں) کی سرکشیوں میں سرگردان پھرتے ہیں۔"

دیکھئے! ان آیات مقدسہ میں لقاء نا کی اصطلاح سے اللہ کے حضور میں اعمال کی جوابدہی ہی مراد ہے۔ جیسے کہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ قیامت کی عدالت الہٰی سے بے امید یعنی منکر ہیں وہ اپنی بد اعمالیوں کی سرکشیوں میں اسلئے بد مست ہیں کہ انکا گمان یہ ہے کہ اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے نہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور نہ وہ کسی عدالت میں پیش کئے جائینگے۔

اللہ تعالیٰ کے وعدے نبی اکرمؐ کے دنیا سے تشریف لیجانے کے بعد بھی پورے ہوتے رہے۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ کا ربط پیچھے آیت نمبر 39 کے ساتھ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ابھی ان لوگوں پر اس قرآنی ضابطہ حیات کی حقیقت ظاہر نہیں ہوئی۔ جب ظاہر ہوگی تو انہیں شکست فاش ہوگی اور قرآنی دین ہر طرف غالب آجائے گا۔ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے جو انہیں ناکامی و تباہی کی وعید دے رکھی ہے۔ ان میں سے ہو سکتا ہے کہ بعض تو

آپ کی زندگی میں پوری ہوجائیں۔ اور بعض آپ کی وفات کے بعد پوری ہوں۔ مگر آپ کے مخالفین کا لوٹ کر آنا ہماری ہی طرف ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ﴿٤٦﴾

اور (اے رسولؐ!) ہم نے جو وعدے ان (آپکے مخالفوں) سے کر رکھے ہیں، انکا بعض حصہ آپکی زندگی میں دکھا دیں یا ہم آپکو فوت کر دیں (اور بعض کا وقوع آپکے بعد ہو) پس انکے لوٹ کر آنے کی جگہ ہماری ہی طرف ہے۔ پھر جو عمل وہ بجا لاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر خود گواہ ہے۔

اس آیت مجیدہ میں ایک انتہائی اعلان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مخالفین اسلام کے لئے سزا کا قانون تو اٹل ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔ مگر دنیا کی زندگی میں فوری سزا ان مخالفوں کے لئے مرتب ہوتی ہے جو مخالفت میں اس قدر شدت اختیار کر لیں کہ انکے ظلم کا پیمانہ چھلک جائے۔ اسکے برعکس اگر مخالفین کی مخالفت اس حد تک رہے کہ وہ قرآنی ضابطے کو تسلیم تو نہ کریں۔ مگر تمدنی اور معاشرتی زندگی میں مل جل کر رہیں تو ایسے لوگوں کے لئے دنیوی زندگی میں تو عذاب کا حکم الٰہی صادر نہیں ہوتا۔ مگر قیامت کی دوسری زندگی کا اخروی عذاب ہرگز نہیں ٹلے گا۔

دنیوی عذاب میں تاخیر کے متعدد اسباب ہیں۔

نبی اکرمؐ کے مخالفین نے اگرچہ آپ کی اس قدر مخالفت کی کہ آپ کو وطن مالوف سے نکلنا پڑا۔ مگر ہجرت سے پہلے تو عذاب الٰہی اسلئے نہ آیا کہ نبی اکرمؐ خود ان کے اندر موجود تھے۔ اس چیز کی خبر اس طرح دیگئی ہے کہ جب آپ خود انکے اندر موجود ہیں تو ہم ان پر کس طرح عذاب نازل کریں۔ اور نبی اکرمؐ کی ہجرت مبارکہ کے بعد اللہ کے عذاب میں اسلئے تاخیر ہوتی گئی کہ بہت سے مومن کمزور اصحابؓ اور صحابیاتؓ رسولؐ ہجرت نہ کر سکے اور وہ فتح مکہ تک مکہ ہی میں رہے۔ اس چیز کی خبر سورہ فتح میں اسوقت کے متعلق دیگئی ہے کہ جب نبی اکرمؐ پوری عسکری تیاری کے ساتھ مکہ واپس لینے کے لئے مشرکین مکہ پر حملہ آور ہوئے تو دشمن نے نبی اکرمؐ کی بے پناہ فوجی تیاری سے مرعوب ہو کر بلا جنگ و جدال شکست تسلیم کر لی۔ اس طرح جنگ کا عذاب اہل مکہ پر سے ٹل گیا۔ اسکے ٹلنے کی ایک وجہ سورہ فتح میں بالفاظ ذیل بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا

(48/25)

(مفہوم) اور (مکہ معظمہ میں) کچھ مومن مرد اور کچھ مومنہ عورتیں موجود تھیں جنہیں تم اے صحابہؓ رسولؐ نہیں جانتے تھے۔ (اگر مکہ پر جنگ کا عذاب نازل کیا جاتا) تو تم بے خبری کی بدولت ان مومنوں پر جا پڑتے۔ پھر تم پر انہیں نادانستگی میں پامال کرنے کا الزام

آجاتا۔ مگر ہم نے جنگ روک دی تاکہ کافروں میں سے بھی جو خود چاہے ایمان لاکر اللہ کی رحمت میں داخل ہو جائے۔ اور اگر وہ مومن مرد اور مومنہ عورتیں وہاں سے ٹل گئے ہوتے تو پھر ہم ان لوگوں کو جنہوں نے ہمارے ضابطے کا انکار کر کے (آپ پر مکہ کی فضا تنگ کر دی تھی جنگ کا) درد ناک عذاب دیتے۔

ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ جن افراد یا اقوام پر دنیا میں بھی عذاب آجاتا ہے وہ بلا وجہ نہیں آتا۔ جب ان کا پیمانہ ظلم چھلک جاتا ہے تو پھر دنیوی عذاب آجاتا ہے۔ کیونکہ اعمال کی سزا مرتب کرنے والا اللہ ظالموں کے ظالمانہ افعال کا خود عینی گواہ ہے۔ وہ کسی پر ہرگز ہرگز ظلم نہیں کرتا جیسے کہ پیچھے آیت نمبر 10/44 میں اعلان کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (10/44) "بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ اپنی جانوں پر خود ظلم کر لیتے ہیں"۔ یعنی دنیا میں عذاب بھی خود ان کے اپنے ہاتھوں ہی کے لائے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ دنیا کے عذاب میں تو بعض وجوہ سے تاخیر بھی ہو جاتی ہے جیسے کہ اہل مکہ پر ہجرت رسول سے ماقبل عذاب اس لئے نہ آیا کہ خود نبی اکرم مجسم رحمت رحمتہ للعلمین بنفس نفیس ان کے اندر موجود تھے۔ اور ہجرت مبارکہ کے بعد اس لئے نہ آیا کہ ان میں کچھ مومن مرد اور مومنہ عورتیں صحابہؓ اور صحابیاتؓ موجود تھیں۔ مگر واضح رہے کہ اخروی عذاب ہرگز ہرگز ٹلنے والا نہیں چنانچہ۔

فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ کے الفاظ میں اسی چیز کی خبر دی گئی ہے کہ اگر دنیا کا عذاب بعض وجوہ سے جو عین انصاف کی اساس پر مبنی ہیں ملتوی ہو جائے تو مجرم لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ انہیں ان کے جرائم کی سزا نہیں دیجائیگی فالینا مرجعھم کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ پھر بالاخر انکے لوٹ آنے کی جگہ ہماری ہی طرف ہے۔ یعنی اخروی زندگی میں انہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے ضرور ضرور ہمارے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ اس عدالت عالیہ میں کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ہر کسی کو اس کے اعمال ہی کا صحیح صحیح بدلہ دیا جائے گا۔ نہ کسی سے رشوت لی جائے گی نہ سفارش قبول ہو گی اور نہ ہی کسی بھی قسم کی مدد کی جائے گی جیسے کہ ارشاد ہوا ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (2/48) اور اس دن سے ڈر جاؤ کہ کوئی شخص کسی شخص کے ذرا بھی کام نہ آئے گا۔ اور نہ اس (یعنی کسی فرد مجرم) کے لئے شفاعت قبول کی جائے گی۔ اور نہ ان سے جرم کی سزا کے عوض رشوت چٹی وغیرہ لیجائیگی اور نہ ہی اس (فرد مجرم) کی کسی بھی قسم کی مدد کی جائے گی۔

2/254 میں اخروی عدالت عالیہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ "اس دن جرائم کی سزا کے عوض نہ کوئی سودا بازی ہوگی اور نہ کسی دوست کی دوستی کام آسکے گی اور نہ کوئی سفارش قبول کی جائے گی۔ المختصر! دنیوی عدالتوں میں جن ناجائز ذرائع کے ساتھ مجرم کو سزا سے بچالیا جاتا ہے رشوت' سفارش' دوستی اور اخیر پر رحم سلطانی وغیرہ سب کی نفی کر دی گئی ہے تاکہ جرائم کی ہرگز نہ ٹلنے والی سزا کے خوف سے ہر فرد معاشرہ صد فیصد ضابطہ الٰہی کے تحت زندگی

گزارے۔ اس طرح پورے کا پورا معاشرہ امن و سلامتی کا گہوارہ بنا ہوا ہو۔ ہر طرف اور ہر آن سلاما" سلاما" کی گونج اٹھ رہی ہو۔ نہ انسان انسان کے خون میں ہاتھ رنگتا ہوا پایا جائے۔ نہ ایک دوسرے کے حق پر غاصبانہ قبضہ جمانے کی کوششیں کی جارہی ہوں۔ ورنہ یاد رہے کہ اگر نوع انسانی قیامت کی اخروی عدالت کا ہزار بار بھی انکار کر دے تو پھر بھی وہ برپا ہو کر ہی رہے گی۔ جس کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (99/8-7) اس دن پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے بھی دیکھ لے گا اور اگر ذرہ بھر برائی بھی کی ہو گی تو اسے بھی دیکھ لیگا۔

آیت نمبر 46 میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے۔ (اے رسول) ہم نے جو وعدے ان(آپکے مخالفوں)سے دنیوی عذاب و سزا کے کر رکھے ہیں۔ انکا بعض حصہ ہم آپکی زندگی میں دکھادیں یا ہم آپ کو فوت کردیں (اور بعض حصے کا وقوع آپکے بعد ہو) پس انکے لوٹ کر آنے کی جگہ ہماری ہی طرف ہے (وہ لوگ اخروی سزا بھی پائیں گے) پھر جو عمل وہ بجالاتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ خود گواہ ہے۔ اسلئے ان کا سزا سے بچ جانا ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔ اگلی آیت مجیدہ میں اصول بیان کر دیا گیا ہے۔ کہ ہر امت کے لئے ایک رسول ہے' پھر جب انکے پاس انکا رسولؑ آیا کرتا تو انکے درمیان انصاف کیساتھ فیصلہ کر دیا جاتا اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا تھا۔ نبی اکرم کے - مخالفین کیساتھ بھی اسی طرح انصاف ہی کیا جائیگا۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

حقیقت یہ ہے کہ ہر امت کے لئے ایک رسول ہے۔پھر جب ان (افراد امت) کے پاس انکا رسولؑ آیا تو انکے درمیان انصاف کیساتھ فیصلہ کر دیا گیا۔ اور وہ ظلم نہیں کئے جاتے تھے۔

ولکل امة کے الفاظ میں جو اولین واؤ ہے وہ اظہار حقیقت کے لئے آئی ہے۔ جس میں اس حقیقت ثابتہ کا اعلان کیا گیا ہے کہ جتنی بھی امتیں گزر چکی ہیں' ان سب کے پاس الگ الگ انکے رسولؑ آئے تھے۔ اسی اظہار حقیقت کی بدولت واؤ کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ "حقیقت یہ ہے"

ھم لا یظلمون میں لا یظلمون بصیغہ مضارع آیا ہے۔ جس کا یہ معنی ہے کہ وہ ظلم نہیں کئے جاتے۔ اس لئے اس سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے بعد رسولؑ آتے رہیں گے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔ لیکن چونکہ 33/40 کے مطابق نبی اکرمؐ کے بعد کوئی نبی رسولؑ آنیوالا نہیں ہے۔اور قرآن مجید میں سابقہ متعدد امتوں کی اور انکی طرف بھیجے گئے انبیاء کی خبریں موجود ہیں۔ اسلئے لا یظلمون بصیغہ منفی مضارع حکائی ہے جو ماضی کے معنے دیتا ہے۔ اسلئے آیت مجیدہ زیر بحث کے ترجمہ میں سابقہ امتوں کے متعلق خبردی گئی ہے کہ ہر امت کی طرف اسکا رسولؑ بھیجا گیا تھا۔ اور ہر امت کا فیصلہ اسکے اپنے اعمال کے مطابق انصاف کیساتھ کیا گیا تھا وہ ظلم نہیں کئے گئے تھے۔

سابقہ امتوں کے تذکرے سے یہ امر کھل کر عیاں ہو رہا ہے کہ جس طرح سابقہ امتوں' اور سابقہ انبیاءؑ کے مدمقابلین

کے ساتھ صد فیصد انصاف کیا گیا تھا۔ اسی طرح نبی اکرمؐ خاتم النبین کی امت اور انکے مد مقابلین کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کیا جائیگا جو لوگ ایمان لا کر نبی اکرمؐ کے معاون بنیں گے' وہ کامیاب و کامران ہوں گے اور جو لوگ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ ضابطہ الہٰی اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کریں گے وہ اپنی ہی بداعمالیوں کی بدولت اس دنیا میں بھی شکست یاب ہو جائینگے اور آخرت میں بھی خسارہ اٹھانے والے ہونگے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے مخالفین کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اس دنیوی عذاب کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ وہ وعدہ کب آئیگا۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ (وہ عذاب کا) وعدہ کب پورا ہو گا۔ اگر تم (عذاب کی خبر دینے میں) سچے ہو تو بتاؤ۔

اسکے جواب میں باری تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے یہ جواب دلوایا کہ میں ذاتی طور پر تو خود اپنے لئے بھی کسی ضرر یا فائدے کا مالک نہیں ہوں۔ سوائے اس کے مجھے بھی ضرور نفع اللہ تعالیٰ کے قانون مشیت کے مطابق ہی ملتا ہے۔ اسی طرح تمہاری بداعمالیوں کی بدولت جو تم سے عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ بھی باری تعالیٰ کے مقررہ قانون ہی کے مطابق اس وقت آئیگا جب اسکے تقاضے خود تمہاری طرف سے پورے ہو جائیں گے۔ ہر امت کے لئے اللہ تعالیٰ کا ایک ہی قانون ہے۔ جب کسی امت کی بداعمالیوں کی بدولت مہلت ختم ہو جاتی ہے تو وعدہ الہٰی فوراً آجاتا ہے۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾

(اے رسولؐ!) کہدیجئے گا کہ میں اپنے لئے بھی ضرر یا نفع کا مالک نہیں سوائے (اسکے کہ مجھے بھی ضرر و نفع) اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہی پہنچتا ہے۔ (تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ) ہر امت کے لئے (باری تعالیٰ کے قانون مشیت کے مطابق ایک مہلت ہے۔ جب (کسی قوم کی بد اعمالیوں کی بدولت مہلت کی) انتہا آجاتی ہے تو پھر وہ نہ ایک ساعت پیچھے رہتے ہیں نہ ایک ساعت آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اجل کے لغوی معنے ہیں مہلت' وقفہ' انتہا۔ اس لئے لکل امۃ اجل کا معنیٰ لکھا گیا ہے کہ ہر امت کے لئے باری تعالیٰ کے قانون مشیت کے مطابق ایک مہلت ہے۔ اور اذا جاء اجلھم ---- الخ کا معنیٰ لکھا گیا ہے کہ جب کسی امت کی اپنی بد اعمالیوں کی بدولت اسکی مہلت کی انتہا آجاتی ہے تو پھر وہ نہ ایک ساعت پیچھے رہتے ہیں اور نہ ایک ساعت آگے بڑھ سکتے ہیں۔ واضح رہے اس آیت مجیدہ سے روایاتی تراجم نے یہ غلط تصور پیدا کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لئے الگ الگ مہلت متعین کر دی ہے کہ فلاں امت ایک ہزار سال باقی رہیگی اور فلاں امت ایک سو سال میں ختم ہو جائیگی۔ بلکہ حقیقت حال وہی ہے جو اوپر عرض کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لئے مہلت کا ایک ہی قانون متعین فرما دیا ہے جو اسکے نیک اعمال کی بدولت بڑھتی چلی جاتی ہے اور خود اسکی اپنی بد اعمالیوں کی بدولت ختم ہو جاتی ہے۔ اسکی انتہا آجاتی

ہے اور وہ قوم مٹ جاتی ہے۔

اگلی آیات مجیدہ میں نبی اکرم کو حکم ہوا ہے کہ ان سے کہدیجئے گا کہ غور کرو' اگر تمہیں اللہ کا عذاب رات کو سوتے وقت یا دن کے وقت آجائے تو یہ کونسی چیز ہے جس کے لئے مجرم جلدی کرتے ہیں۔ جب عذاب آجائیگا تو اس وقت انکا ایمان لانا کام نہیں آئیگا کیونکہ وہ عذاب کے لئے خود جلدی کرتے تھے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

(اے رسولؐ!) کہدیجئے گا' اگر اسکا عذاب تمہیں رات کیوقت یا دن کیوقت آجائے (تو پھر تم بچ نہ سکو گے) مجرم لوگ اس (اللہ کے) عذاب میں سے کس چیز کے لئے جلدی کرتے ہیں۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ۭ اٰۗلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

کیا پھر جب وہ (عذاب) واقع ہو جائیگا تو پھر تم اس (ضابطہ حیات) کے ساتھ ایمان لاؤ گے۔ (کہا جائیگا کہ) اب تم ایمان لاتے ہو حالانکہ بلاشبہ تم اس (عذاب) کے لئے جلدی کرتے تھے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر ان لوگوں سے کہا جائیگا جنہوں نے ظلم کیا کہ دائمی عذاب کا مزہ چکھو۔ تم نہیں بدلہ دیئے جاتے ہو مگر یہ انہی (بداعمالیوں کا بدلہ ہے) جو تم خود کرتے رہے تھے۔

وَيَسْتَنْۢبِــُٔـوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ڼ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ڼ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾

اور (اے رسولؐ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ (عذاب کی خبر) سچ ہے۔ کہدیجئے گا ہاں میرے رب کی قسم ہے کہ بلاشبہ وہ سچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم اسے روکنے والے نہیں ہو۔ (وہ آکر رہیگا)۔

اگلی آیت مجیدہ میں عذاب کے نہ ٹلنے کی خبر ان الفاظ میں دیگئی ہے کہ اگر ان نافرمانوں کے پاس روئے زمین کی چیزیں موجود ہوں۔ پھر وہ انہیں فدیہ میں دیدیں تو پھر بھی ان سے عذاب ہرگز ہرگز نہیں ٹلے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور اگر ہر اس شخص کے پاس روئے زمین کی چیزیں ہوں جس نے ظلم کیا ہے۔ وہ (انہیں اپنے جرموں کی سزا سے بچنے کے لئے) فدیہ میں دیدے (تو پھر بھی عذاب نہیں ٹلے گا) اور جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائینگے اور انکے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائیگا۔ اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے

اس سے اگلی آیات مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ۔

آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ ان لوگوں کے پاس ہے کیا جسے وہ فدیہ میں دیں۔ فدیہ یا رشوت تو دنیوی عدالتوں کے حاکم طلب کرتے ہیں جو مال کے بھوکے ہیں' جو مال لے کر قانون کا خون کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ تو ارض و سماوات کی جملہ موجودات کا خالق و مالک بھی ہے اور اپنے قانون کی مخالفت کرنیوالا بھی نہیں (50/29) ایسی ذات پاک سے یہ توقع کرنا کہ وہ فدیہ' رشوت یا سفارش کے ذریعہ اپنے قانون کی مخالفت کرکے مجرموں کو بری کر دیگا' مطلقاً غلط بھی ہے اور صد فیصد ناممکن بھی چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

خبردار (بگوش ہوش سن لو کہ) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ خبردار (بگوش ہوش سن لو کہ) اللہ کا وعدہ (عذاب کا) سچا ہے۔ مگر ان لوگوں کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

واضح رہے کہ نوع انسانی کی اکثریت نے جرائم کی سزا سے بچنے کے لئے قسم قسم کے عقیدے واضع کر رکھے ہیں کہیں مسیح کو مصلوب مان کر ان کے مصلوب ہونے کو اپنے جرائم کا کفارہ قرار دے رکھا ہے۔ کہیں سفارش و شفاعت کے نظریہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مجرم و گنہگار لوگ اپنے جرائم اور گناہوں کی سزا سے بچ جائیں تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ انصاف کا کیا بنے گا۔ جس کا آیات بالا میں بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اور انکے درمیان بالکل انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائیگا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ 10/54-47) اور وہ ظلم نہیں کئے جائینگے۔ انہیں اپنے کئے گئے اعمال ہی کی سزا دیجائیگی۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں اس امر کی خبر دید یگئی ہے کہ اللہ ہی زندگی دیتا ہے اور اسی کا موت کا قانون اس دنیا میں جاری و ساری ہے۔ اس نے اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے دوسری زندگی کا قانون بنا دیا ہے۔ جس کے مطابق وہ

دوبارہ زندہ بھی' اور ہر نیک وبد کو اپنے حضور حاضر بھی کرلیگا۔ یعنی دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہر فرد بشر نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور اپنے اعمال کے حساب کتاب کے بعد اپنے اچھے یا برے اعمال کی جزا سزا پانی ہے۔

هُوَ يُحْيِ وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ ۵۶

وہ اللہ ہی (تمہیں) زندگی دیتا اور موت دیتا ہے۔ اور تم (اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے دوسری زندگی میں) اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

چونکہ اوپر کی آیات مجیدہ میں عموما" اور آیت بالا نمبر56 خصوصا" قیامت کی جوابدہی کے نہ ٹلنے کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے اگلی آیت مجیدہ میں مسئلہ قیامت کا حل بیان کر دیا گیا ہے کہ اے نوع انسانی تمہارے پاس ایک ایسی جامع کتاب کی صورت میں ہمارا ضابطہ حیات آگیا ہے' جس پر عمل کرنے سے قیامت کی باز پرس میں تم کامیاب ہو سکتے ہو۔ وہ ضابطہ ایک نصیحت نامہ بھی ہے اور تمہاری ذہنی بیماریوں کی شفا بھی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝

اے نوع انسانی! بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت نامہ آگیا ہے۔ اور وہ تمہاری ذہنی بیماریوں کی شفا ہے اور وہ ماننے والوں کے لئے ہدائت اور رحمت ہے۔

تعارف قرآن بزبان قرآن آیت بالا میں قرآن کریم کا تعارف خود قرآن کریم ہی کی زبان میں کرایا گیا ہے۔ جس میں سرفہرست ارشاد ہوا ہے کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے۔اسی چیز کو مزید کھلے لفظوں میں سورہ شعراء میں لایا گیا ہے۔

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ (26/192) اور بلاشبہ اس (قرآن کریم) کا نازل ہونا ضرور ضرور رب العلمین کی طرف سے ہے۔ یہی خبر ذات باری کی طرف سے متکلم کے صیغے سورہ دہر میں دیگئی ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا (76/23) (اے رسول!) بلاشبہ ہم ہی نے آپ پر قرآن نازل فرمایا ہے ٹھیک ٹھیک نازل کرنا۔

آیت بالا میں دوسرے نمبر پر قرآن کریم کا **موعظة من ربکم** کے الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک نصیحت نامہ ہے۔ اسی چیز کے متعلق سورہ مزمل اور سورہ دہر میں ارشاد ہا ہے۔ إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (76/29 + 73/19) بلاشبہ یہ (قرآن) ایک نصیحت نامہ ہے۔ پس جو خود چاہے (اس قرآن کے ذریعہ) اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے۔

تیسرے نمبر پر قرآن کریم کو **شفاء لمافی الصدور** فرمایا ہے یعنی یہ انسان کی ذہنی بیماریوں کی شفا ہے۔ ان الفاظ جلیلہ میں قرآن کریم کے متعلق وہ غلط فہمی دور کر دیگئی ہے جو سورہ بنی اسرائیل کی آیت ذیل سے خود اہل اسلام کو

ہوئی ہے کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی بیماریوں کی شفا ہے۔ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (17/82) اور ہم نے قرآن کو نازل فرمایا جو ماننے والوں کے لئے شفا بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔ اس آیت مجیدہ سے "اہل اسلام" نے یہ غلط تاثر لیا ہے کہ قرآن کریم کی آئتیں انسان کی جسمانی بیماریوں کی شفا ہیں۔ چنانچہ رفع امراض جسمانی کے لئے ہر قسم کے لوگ تعویذ لکھتے اور انہیں یا تو گلے میں یا بازو پر بندھواتے ہیں اور یا پانی میں گھول کر پلواتے ہیں۔ حالانکہ مشاہدہ گواہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ زعم مشاہدۃ" باطل ثابت ہو چکا ہوا ہے کہ نزلہ زکام' نمونیہ' ٹائیفائیڈ چیچک اور ٹی بی وغیرہ پر دواؤں کے ذریعہ قابو پایا جا سکتا ہے قرآنی آیات کے تعویذوں کے ساتھ نہیں۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت بالا 17/82 میں شفاء کے بعد لما فی الصدور کے وہ الفاظ محذوف ہیں جو آیت مجیدہ 10/57 میں مظہر موجود ہیں۔ کہ قرآن کریم جسمانی امراض کی نہیں بلکہ ذہنی بیماریوں حسد بغض کفر شرک وغیرہ کی شفا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کو 10/57 کے خلاف غلط طور پر جسمانی بیماریوں کی شفاقرار دے کر اللہ کی کتاب کو ان اقوام کے سامنے بدنام کر کے رکھ دیا گیا ہے جو آئے دن لاعلاج بیماریوں کے علاج دریافت کرتے چلے آرہے ہیں۔اور بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ دیکھ لوا تم چودہ سو سال میں قرآنی آیات مجیدہ کے ساتھ ٹائیفائیڈ' چیچک اور تپدق وغیرہ کا علاج نہیں کر سکے' ہم نے ان لا علاج مرضوں کا علاج اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ جڑی بوٹیوں کے ذریعہ گولیوں' لوشنوں اور انجکشنوں کی صورت میں ایجاد کر دیا ہے۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ آنکھوں کے موتیا بند کا علاج تعویذوں اور دموں کے ساتھ تو آجتک ہو نہیں سکا مگر اپریشن کے ذریعہ موتیا بند کے لکھو کھا مریض' اس اندھا کر دینے والی مرض سے شفا یاب ہو کر آنکھوں جیسی نعمت عظمیٰ سے بہرہ یاب ہوتے چلے جارہے ہیں۔

المختصر! (17/82) سے جو غلط فہمی خود "اہل اسلام" کو ہوئی ہے وہ 10/57 میں دور کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم انسان کی ذہنی بیماریوں کی شفا ہے جسمانی بیماریوں کی نہیں۔ اور 17/82 میں جو الفاظ لما فی الصدور کے محذوف و مقدر ہیں وہ 10/57 میں مظہر لا کر مذکورہ غلط فہمی کو دور کر دیا گیا ہے۔

تعویذوں کا نقصان

مشاہدات و تجربات کے مطابق تعویذوں اور دم کردہ پانی کا نقصان اظہر من الشمس ہے کہ ٹائیفائیڈ' نمونیا اور تپدق جیسی مہلک بیماریوں کا اگر شروع ہی میں علاج نہ کیا جائے تو یہ مرضیں دوسرے اور تیسرے درجے میں پہنچ کر جان لیوا ثابت ہو جاتی ہیں۔ تعویذ اور دم صرف یہی کام کرتے ہیں کہ مرض پر قابو پانے کے ابتدائی ایام ضائع کر کے مرض کو اس مرحلے میں پہنچا دیتے ہیں کہ مریض جب تعویذوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ مریض کا ایک ہاتھ ملک الموت کے ہاتھ میں جا چکا ہوتا ہے اور اسکا دوسرا ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں دیا جا رہا ہوتا ہے۔ مگر مرض اسوقت اپنا کام پورا کر چکی ہوتی ہے۔ ان بے وقت کے علاجوں سے شفا تو نصیب ہوتی نہیں' مریض اور اسکے ورثاء کی نہ صرف یہ کہ جیبیں خالی ہوجاتی ہیں۔ بلکہ مریض مقروض ہو کر قبر داخل ہوتا ہے اور اسکے ورثاء برسوں بعد تک اسکا قرضہ اتارتے رہتے ہیں۔

اب پھر آیئے آیت مجیدہ زیر بحث 10/57 کی طرف اس آیت مجیدہ میں چوتھے اور پانچویں نمبر پر قرآن کریم کو ہدائت و رحمت کہا گیا ہے۔ قرآن کریم کی اس تعریف کو خود قرآن کریم کی زبان میں اسکے اندر' اور بھی بہت سے مقامات پر لایا گیا ہے۔

اختصار کے پیش نظر ہم صرف ایک مقام پیش کر کے آگے بڑھنے کی اجازت چاہیں گے سورہ نحل میں ارشاد ہوا ہے۔

وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً وَّبُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ (16/89) اور (اے رسولؐ!) ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے جو تبینا لکل شی ہے۔ یعنی ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کرنے والی ہے۔ اور عملاً" فرمانبرداری کرنے والوں کے لئے ہدایت بھی ہے' رحمت بھی ہے اور خوشخبری دینے والی بھی ہے۔

سورہ نحل کی اس آیت مجیدہ (16/89) میں قرآن کریم کے تعارف میں اس کی ایک مخصوص صفت کا اضافہ کیا گیا ہے۔ وہ ہے تبیانا لکل شی جس کا معنی ہے ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کرنے والی۔ قرآن فہمی کے سلسلے میں بعض لوگ قرآن کریم کی اس مخصوص صفت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا بیان' تفسیر و تشریح اسکے اندر نہیں ہے بلکہ کتب روایات میں ہے۔واضح رہے کہ قرآن کریم کو خود بزبان قرآن تبیانا کے مترادف الفاظ میں بار ہا مبین بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مبین (15/1) کتب مبین (27/1) کہ قرآن کریم خود بیان کرنیوالی کتاب ہے۔ نیز سورہ بقرہ میں کھل کر اعلان کر دیا گیا ہے کہ قرآن کریم کے تعارف بزبان قرآن کریم میں اسکی یہ مخصوص صفت بھی موجود ہے کہ اسکابیان خود اسکے اندر موجود ہے۔ باہر کہیں نہیں چنانچہ ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالۡهُدٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الۡكِتٰبِ اُولٰٓـئِكَ يَلۡعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلۡعَنُهُمُ اللّٰعِنُوۡنَ (2/159) بلاشبہ ہم نے جو واضح آیتیں یعنی اپنا ہدایت نامہ نازل فرمایا ہے۔ پیچھے اسکے کہ ہم نے اسے لوگوں کے لئے کتاب کے اندر کھول کھول کر بیان کر دیا ہے' جو لوگ اسکے بعد اسے چھپاتے ہیں وہ وہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ اس آیت مجیدہ کے الفاظ فی الکتب سے کھل کر ثابت ہو چکا کہ قرآن کریم کا بیان خود اس کتاب کے اندر موجود ہے باہر نہیں۔

قرآن کریم کا نزول اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا نشان ہے اسکے نزول پر خوشیاں مناؤ

آیت بالا نمبر 57 میں قرآن کریم کے تعارف کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن مجید کے توازن بدوش ضابطۂ حیات کا نزول اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و رحمت ہے' جس پر عمل کرنے سے معاشرہ کی جملہ ناہمواریاں دور ہو کر معاشرہ جنت بدوش ہو جاتا ہے۔ پس نوع انسانی کے لئے اس ہموار و متوازن قانون کا نزول مقامِ مسرّت ہے۔ اس پر خوشیاں مناؤ۔

قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَبِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾

(اے رسولؐ!) کہدیجئے گا (قرآن کا نزول) اللہ کے فضل و رحمت سے ہے۔ پھر چاہیئے کہ لوگ اس پر خوش ہوں۔ وہ (قرآن) اس (دنیوی مال) سے بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے ہیں۔

قرآن کریم حرام مال جمع کرنے سے منع کرتا ہے اور حلال مال کو معاشرہ کے ہموار کرنے کے لئے خرچ کرنے کا حکم دیتا

ہے۔ دیکھئے ارشاد باری ہے۔ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۲۴) اور وہ ان کے لئے طیب (پاکیزہ) چیزوں کو حلال اور خبیث (ناپاک) چیزوں کو حرام بتاتا ہے۔ حرام مال چونکہ خبائث میں شامل ہے اسلئے اسکا جمع کرنا حرام ہے۔ اسکے برعکس جو مال حلال طریقے سے پیدا اور جمع کیا جائے' اسکے متعلق ارشاد ہوا کہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کردو۔ سورہ بقرہ میں آیا ہے۔

ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو (2/219) اور لوگ آپ سے سوال کریں گے کہ وہ کتنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں _(اے رسولؐ!) کہدیجئے گا' ضرورت سے زائد سارا۔ وہ مال جو اصلاح معاشرہ سے چھپا کر یعنی معاشرہ کو جہنم بدوش رکھ کر جمع کیا جائے آیت نمبر58 کے مطابق اس سے قرآن کریم کا قانون بہتر ہے جس میں معاشرہ کو جنت بدوش کرنے کے لئے حلال مال کمانے اور اسے اصلاح معاشرہ کے لئے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگلی آیت مجیدہ میں مسلۂ حلال و حرام میں دخل دینے سے مطلقاً" منع کر دیا گیا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝۶۰

(اے رسولؐ!) کہدیجئے گا کیا تم لوگوں نے اس چیز پر غور کیا ہے کہ جو پاک رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا فرمایا ہے' پھر تم اس میں سے کچھ حصے کو حرام کر لیتے ہو اور کچھ کو حلال۔ (اے رسولؐ!) کہدیجئے گا کہ کیا تمہیں اللہ نے اسکی اجازت دی ہے یا تم اللہ پر اسکا افترٰی کرتے ہو۔

اَنْزَلَ کا معنیٰ لکھا گیا ہے پیدا فرمایا۔ اس مادہ کا معنیٰ پیدا کرنا خود قرآن کریم کے اندر سورہ حدید میں بالفاظ ذیل موجود ہے۔ و انزلنا الحدید (57/25) اب ظاہر ہے کہ لوہا آسمان سے نازل نہیں ہوتا' بلکہ پیدا کیا گیا ہے۔ اسلئے اسکا معنی صاف ہے کہ ہم نے لوہے کو پیدا فرمایا ہے۔

حلال و حرام ٹھہرانے کا حق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس نے چوپایوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ (5/1) تمہارے لئے بہیمۃ الانعام یعنی صرف جگالی کرنیوالے چوپائے حلال کئے گئے ہیں اب چونکہ جگالی کرنیوالے چوپایوں کے دو معدے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ ایک معدے سے لقمے نکال نکال کر جگالی کرتے ہیں اور لقمے کو چبا چکنے کے بعد دوسرے معدے میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ اسلئے آیت مجیدہ (5/1) سے حلال و حرام جانوروں کے متعلق یہ اصول میسر آیا کہ پرندوں میں سے بھی وہ پرندے حلال ہیں۔ جن کے مرغی وغیرہ کی طرح دو پوٹ ہوتے ہیں۔ ایک پوٹ حلق کے پاس باہر کی طرف لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اور دوسرا پیٹ کے اندر ہوتا ہے جس طرح گائے بھینسیں چارہ کھاتے وقت اسے جلدی جلدی سمیٹتی ہوئی ایک معدے میں ڈالتی چلی جاتی ہیں۔ اور بعد میں جگالی کرتی ہیں۔ اسی طرح مرغی کی قسم کے دو پوٹ والے پرندے جلدی جلدی دانے چگ کر اپنے باہر والے پوٹ میں ڈالتے چلے جاتے ہیں پھر جب وہ سیر ہو جاتے ہیں تو باہر کا پوٹ خاصہ لٹک پڑتا ہے۔ بعد میں ان دانوں کو جگالی کی صورت میں باہر والے پوٹ سے نکالکر اندر والے معدے میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ دو

پوٹ والے پرندوں میں سے قرآن مجید میں اَلسَّلْوٰی (بٹیر) کی حلت موسیٰؑ کے ذکر 2/57 میں آئی ہے اَلسَّلْوٰی میں الف لام عہدی مثلی ہے۔ پس اس قسم کے دو پوٹ والے پرندے حلال باقی سب حرام ہیں۔

پس الٰہی فیصلے کے مطابق چوپایوں میں سے جگالی کرنیوالے حلال اور باقی سب حرام ہیں' اسی طرح پرندوں میں سے دو پوٹ والے حلال اور باقی سب حرام۔ اسکے ضمن میں کسی فرد بشر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسکے برخلاف کسی کو حلال اور کسی کو حرام قرار دے۔

اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ کی تفسیر سورہ نحل میں بالفاظ ذیل درج ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ (16/116) تم اپنی زبانوں کے جھوٹ کے ساتھ مت کہا کرو کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے تاکہ تم اللہ کے ذمہ جھوٹ افتریٰ کرو بیشک جو لوگ اللہ کے ذمہ جھوٹ افتریٰ کرتے ہیں انہیں ہرگز فلاح نصیب نہیں ہوتی۔
اس آیت مجیدہ میں حلال و حرام کے قرآنی اصولوں کے خلاف یہ کہنے سے منع کر دیا گیا ہے کہ فلاں جانور حلال ہے اور فلاں حرام ہے۔ مثلاً" یہ کہنا کہ کتا حرام ہے۔ کتا چونکہ جگالی نہیں کرتا اسلئے وہ قرآنی اصول حلال و حرام کے مطابق از خود حرام ٹھہرتا ہے اور بکری چونکہ جگالی کرتی ہے اسلئے وہ قرآنی اصول حلال و حرام کے مطابق از خود حلال قرار پاتی ہے۔ واضح رہے کہ مذکوہ بالا قرآنی اصول کو چھوڑ دینے ہی کی بدولت خود اہل اسلام کے ہاں گھوڑے' گدھے اور خرگوش وغیرہ کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض کے ہاں انہیں حلال کہا جاتا ہے اور بعض کے ہاں حرام۔ یہی حال ہے پرندوں کے متعلق کہ ایک مکتب فکر کوّے اور طوطے وغیرہ کو حلال ٹھہراتا ہے اور دوسرے حرام۔ اگر حلال و حرام کے قرآنی اصول کو نگاہ میں رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیرجگالی والے چوپایوں اور ایک پوٹ والے پرندوں میں سے کسی کی بھی حلت و حرمت میں اختلاف پیدا ہو سکے۔

حلت و حرمت کے ضمن میں چوپایوں اور پرندوں کی وضاحت تو اوپر گزر چکی ہے' اسکے تحت ہے تیسری قسم آبی جانوروں کی جن میں سے قرآن کریم میں صرف مچھلی کی حلت موسیٰؑ کے ذکر میں آئی ہے' جب آپنے ایک سفر میں اپنے ساتھی سے بھنی ہوئی مچھلی ناشتہ کے لئے طلب فرمائی فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا○ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ (18/63-62) پھر جب دونوں آگے بڑھے تو (موسیٰؑ نے) اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لا۔ بیشک ہمیں اس سفر میں تکان ہو گئی ہے۔ (ساتھی نے) کہا کیا آپ نے دیکھا تھا کہ جب ہم اس پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو وہاں بھول آیا تھا۔

پس آیت زیر بحث (10/59 + 16/116) میں حلال و حرام کے قرآنی اصولوں کے خلاف حلال وحرام کی فہرستیں بنانے اور یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہنے کو افتریٰ علی اللہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں ظن و قیاس کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر افتریٰ کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝٦٠

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ افتریٰ کرتے ہیں انکا قیامت کے دن کے متعلق کیا خیال ہے؟ (اگر وہ افتریٰ علی اللہ سے توبہ کر لیں تو وہ انہیں معاف کر دیگا) بلا شبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر فضل کرنیوالا ہے۔ مگر انکے اکثر لوگ شکر نہیں کرتے (یعنی ناشکری کر کے خود محروم فضل و رحمت ہو جاتے ہیں)

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اے نوع انسانی تم جس حالت میں بھی ہوتے ہو اور تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے پاس موجود ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں کہ جب تمہارے ہر عمل کا وہ خود گواہ ہے تم قیامت کی عدالت عالیہ میں اپنے جرائم کی سزا سے کس طرح بچ سکتے ہو□

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٦١﴾

اور نہیں ہوتے تم کسی حال میں اور نہیں پڑھتے تم اسکی طرف سے (نازل کئے گئے) قرآن میں سے کچھ' اور نہیں تم کرتے کوئی عمل مگر ہم تمہارے اوپر خود موجود گواہ ہوتے ہیں اس وقت جب تم مصروف ہوتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے پوشیدہ (اے رسولؐ!) تیرے رب سے ذرہ بھر بھی کوئی چیز نہ زمین میں اور نہ آسمان میں' اور نہ اس (ذرہ سے) چھوٹی (یعنی ایٹم) اور نہ کوئی بڑی مگر وہ اللہ تعالیٰ کے ظاہر علم میں موجود ہے (کیونکہ وہ ہر جگہ خود حاضر و ناظر اور شاہد ہے)

یہاں کتاب مبین کا معنی اللہ تعالیٰ کا علم ہے' اسکی کتاب قرآن حکیم نہیں کیونکہ آیت مجیدہ کے الفاظ یہ ہیں کہ تم جس حال میں بھی ہوتے ہو' یا اللہ کا قرآن پڑھ رہے ہوتے ہو یا تم کوئی بھی عمل کرنے میں مصروف ہوتے ہو تو وہ خود تمہارے پاس موجود ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہر فرد انسانیہ کا جب بھی اور جس جس حال میں بھی ہونا اور جو جو عمل بجالا رہے ہونا قرآن مجید میں درج نہیں' بلکہ علم الہٰی میں موجود ہے۔ اور اسی طرح زمین اور آسمانوں میں موجود ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کہ وہ کہاں کہاں موجود ہے یہ چیز بھی قرآن مجید میں درج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اسلئے کھل کر ثابت ہو چکا کہ یہاں (10/61) میں کتاب مبین سے مراد صرف اور صرف علم الہٰی ہے۔

آیت بالا میں آمدہ الفاظ وَمَا يَعْزُبُ ـــــ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ سورہ سبا میں بھی آئے ہیں۔ اور جس طرح یہاں ماقبل قیامت کی جوابدہی اور جزا سزا کا ذکر ہے اسی طرح وہاں علم الہٰی میں ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کے موجود ہونے کے ذکر جمیل کے بعد ارشاد ہوا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نیک اعمال بجالانے والوں کو انکے اعمال کی بہتر جزا عطا فرمائے اور برے عمل کرنے والوں کو ان کے برے عملوں کی سزا دے۔ دیکھئے سورہ سبا میں اس علیم و خبیر اللہ تعالیٰ نے خود اپنے

متعلق بالفاظ ذیل اعلان فرمایا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ أَلِيمٌ ۝ ۳۴ ۲ تا ۵

(مفہوم) وہ اللہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو اس میں سے نکلتا ہے۔ اور جو آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں اوپر کو چڑھتا ہے۔ اور وہ رحمت فرمانے والا بچاؤ عطا فرمانے والا ہے۔ اور کافر کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئیگی۔ (اے رسولؐ!) کہدیجئے گا کہ بلکہ آئیگی۔ قسم ہے میرے رب غائب کے جاننے والے کی' کہ وہ ضرور تم پر آئیگی۔ نہیں پوشیدہ اس سے ذرہ بھر بھی کوئی چیز نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی مگر وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہے۔ تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اصلاح کے کام کئے جزا دے۔ وہی لوگ ہیں کہ انکے لئے بچاؤ اور عزت کی روزی ہے۔ اور جو لوگ ہماری آیتوں کی مخالفت کی کوشش کر کے (برے عمل بجالاتے ہیں) وہ وہی ہیں کہ انکے لئے رسوا کرنیوالا درد ناک عذاب ہے۔

آیات بالا میں ضابطہ الٰہی کے نافرمانوں مجرموں' اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے تذکرہ کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں ضابطہ الٰہی قرآن مجید کے فرمانبرداروں' نیکو کاروں یعنی اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی ضد اس کے دوستوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ۶۲

(62) خبردار! (بگوش ہوش سن لو کہ) بلاشبہ جو اللہ کے دوست[عـــــہ] ہیں ان پر نہ آئندہ کے لئے کوئی خوف[عـــــہ] ہے اور نہ وہ ماضی میں کئے گئے اعمال پر غمگین[عـــــہ] ہونگے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ ۶۳

(63) یہ وہ لوگ ہیں[عـــــہ] جو ضابطہ الٰہی پر ایمان لاتے اور اسکی مخالفت سے بچتے[عـــــہ] ہیں۔

لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ ۶۴

(64) انکے لئے[عـــــہ] دنیا کی زندگی میں بھی کامیابی[عـــــہ] کی' اور آخرت کی زندگی میں نجات کی خوشخبری ہے اللہ کے قانون کے لئے بدلنا ہے ہی نہیں[عـــــہ] (دنیا اور آخرت کی فلاح و نجات کی خوشخبری) یہی تو بہت بڑی کامیابی[عـــــہ] ہے۔

اولیاء اللہ کون ہیں؟ آیات صدر 62 تا 64 میں اولیاء اللہ کی 6 قرآنی نشانیاں بیان ہوئی ہیں جن کی تفصیل و تشریح خود

قرآن کریم کی تصریف آیات کے ساتھ آگے چل کر پیش کی جائے گی۔ پہلے ایک طویل تمہید کے طور پر یہ چیز ذہن نشین کر لیجئے کہ عرف عام میں اہل اسلام کے ہاں اولیاء اللہ کا ایک مخصوص گروہ تصور کر لیا گیا ہے۔ جس کی نشانیاں یہ ہیں کہ وہ حجرہ یا خانقاہ نشین ہوتے ہیں' چلّہ کشی کرتے ہیں۔ انکا کاروبار پیری مریدی ہوتا ہے' مریدوں سے نذریں نیازیں وصول کرتے ہیں۔ خود مقرر کردہ مخصوص قسم' یا مخصوص رنگ کا لباس پہنتے ہیں۔ اپنے آپ کو عارف کے نام سے متعارف کرتے ہیں۔ لوگ انہیں مرادیں پوری کرنیوالے اور حاجت روا تصور کرتے ہیں۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو مرادیں دینے والے قرار دیتے ہیں جسکی ظاہر دلیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص مراد یا حاجت لیکر انکے پاس جاتا ہے تو وہ یہ نہیں کہتے کہ ہمیں تو کوئی اختیار حاصل نہیں' جیسے کہ نبی کریمؐ کو حکم دیا گیا تھا۔ قُلۡ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ (72/21) کہدیجئے گا کہ میں تمہارے لئے نہ کسی نقصان کا مالک ہوں نہ کسی فائدے کا۔ بلکہ یہ بھی بتکرار ارشاد ہوا قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ 7/188 + 10/49 اے رسولؐ کہدیجئے گا کہ میں تو خود اپنے لئے بھی نہ کسی نفع کا مالک ہوں۔ نہ نقصان کا سوائے اسکے کہ مجھے بھی نفع یا نقصان اللہ تعالیٰ کے قانون مشیت کے مطابق ہی پہنچتا ہے۔ مگر ان لوگوں کو ان قرآنی حدود سے ماوری سمجھ لیا گیا ہے۔

شریعت' طریقت' حقیقت اور معرفت پھر اس گروہ کے لئے شریعت الٰہی کی پابندی خاص ضروری نہیں سمجھی جاتی' کیونکہ ان لوگوں کے ہاں شریعت کے علاوہ کچھ مزید خانہ زاد اصطلاحیں طریقت' حقیقت اور معرفت کے نام سے متعارف ہیں۔ جب ان سے کوئی فعل خلاف شریعت سرزد ہوتا پایا جائے تو اسے طریقت حقیقت یا معرفت کے دائرہ میں داخل کر کے نہ صرف یہ کہ اس سے صرفِ نظر کر لی جاتی ہے' بلکہ اسے اس گروہ کے ہاں مزید مروجہ اصطلاحات جذب و سلوک اور وجد و حال سے متعلق قرار دیکر حدود شریعت سے تجاوز کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کا مقرب سمجھا جارہا ہوتا ہے۔

عالمِ امر اور عالمِ مثال لیکن یاد رہے کہ شریعت الٰہی سے صرفِ نظر کرنیوالے اس گروہ کے ہاں مروجہ مذکورہ بالا اصطلاحوں' نہ طریقت' حقیقت اور معرفت کا قرآن کریم میں ذکر تک موجود ہے۔ نہ جذب و سلوک اور وجد و حال کا۔ اسی طرح کی دو اصطلاحیں اور بھی ان حضرات کے ہاں مروّج ہیں عالم امر اور عالم مثال وغیرہ جنہیں قرآنی عقائد اور شریعت الٰہی سے آزادی حاصل کرنے کی سند قرار دے لیا جاتا ہے۔ طریقت نامی مروجہ اصطلاح سے تو ان لوگوں کا طریقہ اور راستہ ہی الگ قرار دے دیا گیا ہے۔ اور حقیقت نامی اصطلاح میں کائنات کی ہر چیز اور ہر شرعی حکم تک کی حقیقت کو ظاہریّت سے مختلف قرار دے لیا جاتا ہے۔ جیسے کہ اسی اصطلاح سے اشیاءِ کائنات کے متعلق ہمہ اوست کا عقیدہ ایجاد ہو چکا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی اللہ ہے۔ یہ چیزیں ظاہر میں اینٹ' پتھر' آگ پانی' مٹی ہوا یا کتّا بلاّ گھوڑا گدھا اور بندر سور وغیرہ ہیں حقیقت میں سب اللہ ہی اللہ ہیں انسان بھی خود اللہ ہی ہے۔ اور اسی چیز کو اس سے اگلی سٹیج میں معرفت کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا سمجھنے والے معرفت الٰہی کو پالیتے اور عارف باللہ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ انہی میں سے بعض یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

ہُن بُلھاناں دھرایا سَو۔ یہ بلھے شاہؒ صاحب کا دعوی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ نے اپنا نام بُلھا رکھ لیا ہے۔ اور بعض اناالحق کا دعوٰی کرتے ہیں کہ میں اللہ ہوں۔ یہ شریعت الٰہی کے اولین عقیدہ وحدت کے شجر سدابہار کی جڑوں پر کلھاڑا چلانے کا دعوی شاہ منصور صاحب کا ہے' جنہیں اسکی پاداش میں موت کی سزا دیگئی۔ مگر پورے عالم اسلام میں آج تک شاہ منصور کو سچا قرار

دیا جا رہا ہے اور انہیں سزا دینے والوں کو جھوٹا' بے انصاف اور ظالم۔

مگر قرآنی اولیاء اللہ کی تعریف بالترتیب 9 ضمنی نوٹس میں) آگے آرہی ہے' بتکرار عرض کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں ایسے شریعت الٰہی کے مخالف اور خود اللہ بننے والے گروہ کو اولیاء اللہ ہرگز نہیں کہا گیا۔ قرآن مجید کی رو سے وہ شخص اللہ کا ولی ہے جو ضابطہ الٰہی پر صدقِ ذہن کے ساتھ ایمان لائے اور پھر اس کی مخالفت سے بچتا رہے۔

لفظ اولیاء اللہ کی لغوی تحقیق | لفظ اولیاء کا سہ حرفی مادہ ہے و-ل-ی = ولی۔ اس مادہ کا بنیادی معنٰی ہے قریب ہونا۔ اس طرح ولی (جس کی جمع اولیاء ہے) دوست کو کہتے ہیں۔ عربی لغت میں اس لفظ کے یہ متعدد معنے لئے جاتے ہیں۔ غلبہ' اقتدار' حکومت' محافظت' نگرانی اور سرپرستی وغیرہ۔ قرآن مجید میں ولی کا لفظ دو طرح سے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کا ولی ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ 2/257 اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے (اور تقوی اختیار کیا 10/63 (وہ انہیں غلط عقائد و اعمال کے) اندھیروں سے نکال کر (صحیح عقائد و اعمال کی) روشنی میں لے آتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہوتا ہے خود انسان کے اپنے اعمال کے ساتھ جیسے کہ ارشاد ہوا ہے۔ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○ 6/127 وہ اللہ انکا (بندوں کا) ولی ہے ان عملوں کے ذریعہ جو وہ خود مسلسل بجالاتے ہیں۔

2- مومن متقی اللہ کے ولی ہیں۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ○ 10/63-62 خبردار! بلاشبہ جو اللہ کے ولی ہیں ان پر نہ آئیوالا کوئی خوف ہے اور نہ انہیں ماضی کا کوئی غم ہوگا (کیوں ؟ اسلئے کہ) وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے تنزیلی اور تکوینی قوانین پر بصدق ذہن) ایمان لاتے ہیں انکی مخالفت سے بدستور بچتے چلے جاتے ہیں۔ برداران عزیز! آپ سطور بالا میں وهو وليهم بما كانوا يعملون کے الفاظ میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کا ولی انکے اپنے اعمال کے ذریعہ بنتا ہے تو ثابت ہوا کہ بندوں کا اللہ کے ولی ہونا اور اللہ کا بندوں کا ولی ہونا دونوں صورتیں بندوں ہی کے اعمال کے ساتھ وابستہ ہیں۔ بالفاظ دیگر جب بندے اللہ تعالیٰ کے تنزیلی اور تکوینی ضابطے پر بصدق ذہن ایمان لا کر اس پر صد فیصد عامل ہو جاتے ہیں تو وہ اللہ کے ولی بن جاتے ہیں 6/127 اور اللہ انکا ولی بن جاتا ہے۔ اور انہیں غلط عقائد و اعمال کے اندھیروں سے نکال کر صحیح عقائد و اعمال کی روشنی میں لے آتا ہے 2/257

آیات مجیدہ 62 تا 10/64 کے نو ضمنی نوٹ | لفظ ولی کی قرآنی لغوی تحقیق کی اس طویل تمہید کے بعد اب آیات صدر 62 تا 10/64 کے نو ضمنی نوٹ ملاحظہ فرمائیں اور ساتھ کے ساتھ قرآنی اولیاء للہ کا' مروجہ اولیاء اللہ کے ساتھ تقابل بھی کرتے چلے جائیں۔

پیدائشی ولی کا عقیدہ خلاف قرآن ہے | عـ۱ اولیاء اللہ مرکب اضافی ہے جس کا لفظی معنی ہے اللہ کے دوست۔ سطور بالا میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ اللہ کے دوست (اولیاء اللہ) وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے اعمال کے ساتھ درجہ ولائت حاصل کرتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوا کہ کوئی شخص پیدائشی ولی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اہل تصوف کے ہاں جو یہ نظریہ مدتوں سے مروج چلا آرہا ہے صد فیصد غلط ہے کہ فلاں بزرگ پیدائشی ولی تھے' ان سے والدہ محترمہ کے بطن مبارک ہی میں کرامات کا ظہور شروع ہو گیا تھا۔ اس سے اگلے ضمنی نوٹوں میں قرآن مجید کی رو سے ثابت کیا جائے گا کہ کرامات کا چکر بھی محض ایجاد

بندہ ہے جو پیراں نہ پرند و مریداں پرانید کے مصداق ان لوگوں کا چلایا ہوا ہے جو کسی بزرگ کے حاشیہ بردار بن کر بے پر کی قطاریں اڑانا دین کی عظیم خدمت سمجھتے ہیں۔

یے 3-2 لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کے جملہ میں لا خوف علیھم کے الفاظ میں اولیاء اللہ کی پہلی صفت (پہلی نشانی) یہ بتائی گئی ہے کہ انہیں آنیوالے خطرات کا خوف نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس کیوں کا سیدھا صاف اور مشاہداتی جواب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مستقبل پر نگاہ رکھتے ہیں اور ہر آنیوالے خطرے کا انسداد حفظ ماتقدم کے طور پر زمانہ حال میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح انکا حال بھی تابناک ہوتا ہے اور مستقبل بھی بے خوف و خطر۔ نیز اولیاء اللہ کی دوسری نشانی ولا ھم یحزنون کے الفاظ میں بتائی گئی ہے کہ انہیں ماضی کا غم بھی نہیں ہو گا۔ واضح رہے کہ عربی لغت کے مطابق خوف آئندہ آنیوالے خطرات کا ہوتا ہے اور حزن ماضی میں کئے گئے غلط اعمال کے غلط نتیجے کا غم ہوتا ہے پس ولا ھم یحزنون کے مطابق اولیاء اللہ کے اعمال اللہ تعالیٰ کے تنزیلی اور تکوینی ضابطے کے عین مطابق ہوتے ہیں اسلئے نہ انکا غلط نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور نہ انہیں اس حزن رنج و ملال میں مبتلا ہونا پڑتا ہے کہ فلاں غلط کام نہ کرتے تو آج یہ غلط نتیجہ برآمد نہ ہوتا۔ بالفاظ دیگر اولیاء اللہ کا ہر قدم اللہ تعالیٰ کے تنزیلی اور تکوینی ضابطے کے مطابق اٹھتا ہے۔ جیساکہ نبی اکرمؐ کی زندگی بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہے کہ آپ کی حیات اطہر میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں آیا کہ اپنے مستقبل میں آنیوالے کسی خوف کا پہلے ہی انسداد نہ کر رکھا ہو حتی کہ مشرکین مکہ نے جب نبی اکرمؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا تو آپ نے اسکا بھی انسداد پہلے سے کر رکھا تھا۔ آپ کے ساتھ جانیوالا ایک جاں نثار ساتھی بھی ہر آن حکم کا منتظر موجود تھا۔ اور مقام ہجرت کا تعین بھی پہلے سے کر کے وہاں پر ایسی جماعت پیدا کر رکھی تھی جو نبی اکرمؐ کی آمد کے لئے ہر لحظہ چشم براہ تھی اس سے آگے جو خطرہ نبی اکرمؐ کے صحیح سلامت مکہ معظمہ سے نکل جانے کے بعد مکہ کے غریب اور کمزور مسلمانوں پر مشرکین مکہ میں وقتی طور پر پیدا ہونیوالے غیض و غضب کی صورت میں سامنے آنیوالا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اسکا انسداد بھی کر دیا کہ آپ کے بعد کمزور مسلمانوں میں عمرؓ جیسے با رعب صحابی موجود تھے جنکے دبدبہ کی بدولت کمزور مسلمان محفوظ بھی رہے اور انکی نگرانی میں پُر امن ہجرت کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔

اولیاء اللہ مومن اور متقی ہوتے ہیں یے 5-4 الذین امنوا وکانوا یتقون کے الفاظ امنوا میں اولیاء اللہ کی تیسری نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ایمان لاتے ہیں۔ کس چیز پر ایمان لاتے ہیں؟ اس کا جواب انکی چوتھی نشانی وکانوا یتقون کے الفاظ میں دیا گیا ہے کہ وہ ہر خطرے سے بچاؤ کا عملاً" اہتمام کرتے ہیں۔ تو اب یہ امر مسلم ہے کہ خطرات انسان کی دونوں زندگیوں کے ساتھ وابستہ ہیں اس دنیا کی زندگی کے ساتھ بھی اور مرنے کے بعد قیامت والی زندگی کے ساتھ بھی۔ اس زندگی کے خطرات میں سر فہرست ہے غذائی ضروریات کے قحط کا خطرہ جس سے بچاؤ اللہ تعالیٰ کے تنزیلی اور تکوینی دونوں ضابطوں کے ذریعہ ہی ممکن ہے اللہ تعالیٰ کا تکوینی ضابطہ وہ ہے جو اس بھری کائنات میں اٹل قوانین جاریہ کی صورت میں جاری و ساری ہے جن کے مطابق اجناس پیدا کرنے سے غذائی قحط کا خطرہ ٹل سکتا ہے اور تنزیلی ضابطہ وہ ہے جو قرآن مجید کی کتاب لاریب میں موجود و محفوظ ہے۔ جس پر عمل کرنے سے نوع انسانی مصنوعی قحط کے خطرے سے محفوظ رہ سکتی ہے اس تنزیلی ضابطہ حیات پر عمل کرنے سے جہاں نوع انسانی اس زندگی کے خطرات سے محفوظ ہو جاتی ہے وہاں دوسری

زندگی کا اہم ترین خطرہ عدم نجات بھی رفع ہو جاتا ہے۔

پس قرآنی فیصلے الذین امنوا و کانوا یتقون کے مطابق اولیاء اللہ وہ ہیں جو اللہ کے ہر دو ضابطوں پر بصدق ذہن ایمان بھی رکھتے ہیں اور ان دونوں ضابطوں کی مخالفت سے بچتے بھی رہتے ہیں تو برادران عزیز! بتایئے کہ غذائی قحط کے خطرے کا تکوینی یعنی کائناتی حل کیا ہے؟ کیا یہ کہ ہم چِلّہ کشی کے ذریعے اپنے اندر ایسا زور کرامات پیدا کر لیں کہ ریت کا آٹا بنا سکیں جیسے کہ اہل تصوف نے بعض بزرگوں کی طرف یہ کرامت منسوب کر رکھی ہے کہ انہوں نے ریت کا آٹا بنا دیا۔ اس کے ضمن میں تکوینی یعنی کائناتی ضابطہ الٰہی کا اٹل اور غیر متبدل مشاہداتی جواب تو یہ ہے کہ۔

آٹا ریت سے ہرگز حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اسکے حصول کے لئے سب سے پہلے زمین میں ہل چلانا پڑتا ہے پھر اس میں بیج بونا اور پانی دینا پڑتا ہے پھر کھیت کی نلائی اور رکھوالی کرنے کے ساتھ ساتھ چھ ماہ بعد گندم کی فصل پک کر تیار ہوتی ہے مگر کاٹنے اور گاہنے کے بعد ہی گندم حاصل ہوتی ہے اور پھر اسے چکی میں پیسنے کے بعد آٹا میسر آتا ہے۔ یہ وہ مشاہدات ہیں جنہیں جھٹلانا اور ریت سے آٹا بننے کا تصور پیش کرنا دوپہر کے وقت سورج کے انکار کے مترادف ہے۔ العیاذ باللہ۔

وہ مومن اولیا اللہ ہیں جو قحط کے خطرہ سے بچا سکتے ہیں

پس وہ مومن جو عین وقت پر گندم بونے اور اسکے پکنے تک کے تمام مراحل میں کائناتی قوانین کے ساتھ ساتھ چل کر فصل کو کاٹ اور گاہ کر عوام کو قحط کے خطرہ سے بچاتے ہیں اولیاء اللہ ہیں بشرطیکہ انکی باقی زندگی بھی اللہ تعالیٰ کے تنزیلی قوانین قرآن مجید کے مطابق ہو۔ اور یہی حال ہے باقی خوردنی اجناس کا کہ چاول' جو' جوار چنا کئی وغیرہ ہر جنسی قحط کے خطرے کا کائناتی' مشاہداتی حل یہ ہے کہ ہر فصل کو اسکے بونے کے موسم پر بویا جائے بروقت پانی دیا جائے نلائی اور رکھوالی کی جائے اور جب فصل پک جائے تو کاٹ گاہ کر منڈی میں پہنچا دیا جائے۔ پس جیسے کہ پیچھے بھی عرض کیا گیا ہے کہ نوع انسانی کو جنسی قحط کے خطرہ سے بچانیوالے مومن سب اولیاء اللہ ہیں بشرطیکہ انکی باقی روزہ عرہ کی زندگی بھی اللہ تعالیٰ کے تنزیلی ضابطہ قرآن مجیدہ کے مطابق ہو

یہ تو ہوئے کاشتکار مومن اولیاء اللہ۔ اور یہی حال ہے معاشرہ کے باقی تمام مومن کارندوں لوہار' ترکھان' موچی' جلاہا' حجام وغیرہ کا جو شبانہ روز نوع انسانی کی خدمت نہایت دیانتداری کے ساتھ بجالائیں وہ بھی سب اولیاء اللہ ہیں بشرطیکہ انکی باقی روز عرہ کی زندگی بھی رب تعالیٰ کے تنزیلی ضابطہ قرآن حکیم کے مطابق ہو۔ اور اسی شرط کے ساتھ اگر دکاندار ملاوٹ نہ کریں۔ کم نہ تولیں اور ناجائز منافع خوری سے پرہیز کریں تو سب اولیاء اللہ ہیں مسلمان پولیس والے اگر رشوت نہ لیں اور اپنا فرض منصبی ہمہ جہتی دیانتداری کے ساتھ ادا کریں' نیز اگر سرکاری حکام رشوت سے پرہیز کریں اور ملک و قوم کی خدمت پوری تندہی کے ساتھ بجالائیں تو مذکورہ شرط کے مطابق سب کے سب اولیاء اللہ ہونگے۔ انکا یہ منصب انکی اپنی پاکبازی کا نتیجہ ہو گا۔

الغرض! زیر بحث مسئلہ تو مختصر الفاظ میں اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ ضابطہ الٰہی قرآن کریم کا ہر مومن ولی اللہ ہے جو اپنی پوری زندگی کو اس ضابطہ کے قوانین کے قالب میں ڈھال کر اپنے آپ کو دائمی طور پر قرآنی احکام کے خول میں بند کر

دے۔ اس کے برعکس قرآن مجید کسی ایسے الگ گروہ کو ہرگز ہرگز اولیاء اللہ قرار نہیں دیتا جس کے ہاں شریعت الٰہیہ پر غیر قرآنی اصطلاحوں طریقت، حقیقت اور معرفت کو سوار بھی کر رکھا ہو۔ اور شریعت قرآنیہ کو پس پشت پھینک کر متوفی بزرگوں کے ملفوظات کو عقائد و اعمال کا مرکز و محور بھی قرار دیدیا ہو۔ اسطرح ان کے ہاں سند و حجت تو ہوں صرف سابقہ حجرہ و خانقاہ نشین بزرگوں کے ملفوظات اور قرآن کریم صرف و محض متوفی مشائخ کے عرسوں پر ختم کر کر کے ایصال ثواب کے لئے رہ گیا ہو۔

مسئلہ ایمان اور کرامات اولیاء اللہ کے قرآنی تعریفی الفاظ الذین امنو و کانو ایتقون میں سرفہرست ہے امنو جس کے متعلق اوپر عرض کیا جا چکا ہے اولیاء اللہ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کائناتی اور تنزیلی قوانین پر ایمان لاتے ہیں۔ اسکی قرآنی دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنی لاریب کتاب میں کائناتی اور تنزیلی ہر دو قوانین کے ایک دوسرے کے صد فیصد مترادف و موافق ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔ دونوں کو حق قرار دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ارشادات الٰہی :۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ 3/3 (اے رسول! اللہ تعالیٰ نے) آپ پر اپنی کتاب حق حق نازل فرمائی ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ 16/3 (اللہ تعالیٰ نے) آسمانوں اور زمین کو حق حق پیدا فرمایا ہے۔

پس غور فرمائیں کہ ان ہر دو اعلانات باری تعالیٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تنزیلی قولی کتاب قرآن مجید بھی اپنے جملہ تنزیلی قوانین سمیت حق ہے اور پورے آسمان اور زمین یعنی اسکی فعلی تخلیقی کتاب بھی اپنے جملہ قوانین جاریہ سمیت حق ہے۔ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن مجید کے ایک ایک قانون کو تسلیم کئے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ارض و سماوات یعنی اللہ تعالیٰ کی فعلی تخلیقی کتاب میں جاری و ساری کسی ایک قانون کا انکار کرنے سے بھی ایمان ناقص ہو جاتا ہے۔ پس مومن اولیاء اللہ کا ایمان یہ ہے کہ ریت سے آٹا کبھی بن ہی نہیں سکتا اور نہ کبھی بھی نمک شکر میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ جس کے ضمن میں ارشاد باری ہے۔

لا تبدیل لکلمت اللّٰہ 10/64 اللہ تعالیٰ کے قولی اور فعلی قوانین کے لئے تبدیل ہونا ہے ہی نہیں۔

لا مبدل لکلمتہ 6/115 اللہ تعالیٰ کے قولی اور فعلی قوانین کو بدلنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔

مایبدل القول لدی 50/29 میرا قانون خود میری طرف سے بھی ہرگز ہرگز نہیں بدلا جاتا۔

سطور بالا میں مندرج قرآنی حقائق کے مطابق جب بنظر تعمق غور کیا جائے تو دوپہر کے سورج کی طرح عیاں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے قوانین کے لئے بدلنا ہے ہی نہیں۔ جب اسکے قوانین کو بدلنے والا کوئی موجود ہی نہیں۔ اور جب خود اللہ تعالیٰ کی اپنی طرف سے بھی اسکے قوانین ہرگز نہیں بدلے جاتے تو عقیدہ کرامات صد فیصد قرآن حکیم کے خلاف اور غیر قرآنی نظریہ ہے۔ واضح رہے کہ نظریہ کرامات کی حقیقت یہ ہے کہ آج کے پیروں میں سے کوئی ایک بھی آپکو ریت کا آٹا یا نمک کی شکر بنانے کی کرامت ہرگز ہرگز نہیں دکھا سکتا۔ مگر کل کو جب یہی "اللہ کو پیارے ہو جائیں گے" تو انکی سوانح حیات میں انکی طرف قسم قسم کی کرامتیں منسوب کر دیجائیں گی یہی حال سابقہ بزرگوں کا ہے کہ ہر گزشتہ آج کے بزرگ، گزشتہ کل کو، جب "وہ اللہ کو پیارے ہوگئے" تو ان کی طرف گوناگون کرامتیں منسوب ہوگئیں۔

نبی اکرمؐ کی زندگی اسوہ حسنہ ہے اسی عنوان کے ضمن میں نبی اکرمؐ صاحب نور کا اسوہ حسنہ بطور نمونہ پیش خدمت ہے ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی توحید روڈ کراچی کی کتاب توحید خالص میں خواجہ معین الدین اجمیری کی کتاب انیس الارواح کے صفحہ 17-18 کے حوالہ سے ابراہیم ادہم کے متعلق درج ہے کہ آپ حج کے ارادہ سے عازم سفر ہوئے ہر قدم پر دو نفل ادا کرتے اس طرح چودہ برس میں کعبہ مکرمہ پہنچے مگر کعبہ شریف کو اپنی جگہ پر نہ پایا۔ ہاتف غیب نے ندا دی کہ ابراہیم! ٹھہرو خانہ کعبہ ایک بڑھیا کا طواف کرنے گیا ہے جنگل کی طرف چل پڑے دیکھا کہ خانہ کعبہ رابعہ بصری کا طواف کر رہا ہے اس پر ڈاکٹر صاحب نے بڑی پتے کی بات کہی ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو خانہ کعبہ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نبی اکرم کا طواف کرنے کے لئے چند میل آگے بڑھ کر حدیبیہ تک کیوں نہ آیا کہ نبی اکرمؐ اور آپ کے اعلیٰ ترین اولیاء اللہ صحابہؓ اکرام کو بلا عمرہ واپس لوٹنا نہ پڑتا؟ اب اسوہ رسولؐ تو یہ ہے کہ وقت کے تقاضہ، صلح حدیبیہ کے مطابق بلا عمرہ واپس لوٹ گئے۔ مگر اگلے سال جب قرآنی حکم 8/60 کے مطابق بے پناہ فوجی قوت کے ساتھ مکہ معظمہ کی بازیابی کے لئے تشریف لائے تو کفار مکہ نے بلا مقابلہ شکست قبول کر کے بیت اللہ شریف کی چابیاں نبی اکرم کی خدمت اقدس میں پیش کر دیں۔ غور فرمایئے گا کہ فتح مکہ عین قرآنی اور کائناتی قوانین کے مطابق ہوئی تھی کسی معجزہ یا کرامات کے ذریعہ نہیں۔

اسی طرح کہا جاتا ہے فلاں بزرگ نے دیوار پر سوار ہو کر اسے دوڑا دیا۔ مگر اسوہ رسولؐ مقبول یہ ہے کہ انتہائی خطرہ کے وقت بھی جب آپ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو سفر کے کائناتی وسائل ہی کا سہارا لیا کسی دیوار کی کراماتی سواری ہر گز نہ فرمائی نبی اکرمؐ اور دیگر انبیاءؑ کرام کی طرف معجزات بھی منسوب محض ہیں۔ ابراہیم اور زکریا سلام علیہما دونوں کے متعلق قرآن مجید میں خبر دی گئی ہے کہ بوڑھے ہو گئے مگر بیٹا کوئی نہیں تھا۔ حضور الٰہی ہی میں عاجزانہ دعا فرمائی۔ نبی اکرمؐ کو درجنوں جنگیں پیش آئیں اور ہر جنگ میں جنگ سے متعلقہ کائناتی قوانین ہی کا راستہ اختیار فرمایا۔ جنگ احد میں جب صحابہؓ کے ایک دستہ سے جنگی اصولوں کے خلاف غلطی ہوگئی تو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پس ان قرآنی حقائق و شواہد کی روشنی میں اظہر من الشمس ہے کہ سطح آب پر چلنے، دیواروں کو دوڑانے، آنکھ بند کر کے دور دراز کے سفر طے کرنے وغیرہ کرامات متوفی بزرگوں کی طرف منسوب محض ہیں، قرآن کریم میں انکی صحت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

ابراہیم اور موسیٰ سلام علیہما کی طرف منسوب معجزات کی دلیل بھی قرآن مجید کی جن آیات مجیدہ سے پکڑی جاتی ہے وہ متشابہات ہیں محکمات نہیں۔ پیچھے 10/64 کی محکم آیت کی شہادت سے ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کے لئے بدلنا ہے ہی نہیں۔ لا تبدیل لکلمت اللّٰہ اور 6/115 کی محکم آیت مجیدہ کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے کہ اسکے قوانین کو تبدیل کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں لا مبدل لکلمتہ اور 50/29 کی محکم آیت کی شہادت الٰہی کے ساتھ ثابت کیا جا چکا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے قوانین تبدیل نہیں کئے جاتے ما یبدل القول لدی ابراہیمؑ کے خلاف جو آپ کے دشمنوں نے مخالفت کی آگ بھڑکائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ٹھنڈا کر دیا اور موسیٰؑ کا عصا وہ قانون ربوبیت عامہ تھا جس کے سامنے فرعون کے بلائے ہوئے سحر بیان دانشوروں نے ہتھیار ڈالدیئے تھے۔ عصا وید بیضا کی مکمل تفصیل بلاغ القرآن کے شمارہ مارچ 1973ء میں درج ہے اور نار ابراہیم کی قرآنی وضاحت اپریل 1968 کے باب المراسلات میں گزر چکی ہے۔

نگاہ بازگشت یہاں تک قرآن کریم کی روشنی میں اولیاء اللہ کی چار نشانیاں بیان ہو چکی ہیں۔

پہلی یہ کہ انہیں آنیوالے خطرات کا خوف نہیں ہوتا 10/62 یعنی وہ آنیوالے ہر خطرے کا انسداد پہلے ہی سے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔

دوسری یہ کہ وہ ماضی میں کئے گئے اعمال پر غمگین نہیں ہوتے یعنی وہ ایسا کوئی عمل نہیں کرتے جس پر انہیں غمگین ہونا پڑے۔

تیسری یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تنزیلی اور تکوینی قوانین پر صد فیصد ایمان رکھتے ہیں 10/63 اور

چوتھی یہ کہ جن قوانین پر وہ ایمان لائے ہیں ان کی مخالفت سے بچتے ہیں صد فی صد پرہیز کرتے ہیں 10/63 پانچویں اور چھٹی ہے دنیا و آخرت کی بشارت جس کی وضاحت اگلے ضمنی نوٹ نمبر6-7 میں یہ ہے۔

اولیاء اللہ کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کی بشارت دیدی گئی ہے

ح6-7 اس سے آگے پانچویں اور چھٹی نشانی بتائی گئی ہے دنیوی زندگی میں کامیابی اور اخروی زندگی میں نجات کی خوشخبری کی، جو قرآن کریم میں پہلے ہی سے درج کر دیگئی لھم البشریٰ فی الحیواۃ الدنیا ولاٰخرۃ پس ثابت ہوا کہ اولیاء اللہ نہ تو بھکاری ہوتے ہیں اور نہ دوسروں کی کمائی پر پلتے ہیں۔ انکی دنیوی زندگی بھی کامیاب ہوتی ہے اور انکے قرآنی اعمال اخروی زندگی میں نجات کا موجب ہوں گے۔

ح8 آیت زیر بحث کے اخیر پر وہی جملہ موجود ہے لا تبدیل لکلمت اللّٰہ جس کی مکمل بحث پیچھے گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین میں تبدیلی کا امکان تک موجود نہیں۔ اسی کی تائید میں پیچھے دو آیات کریمہ مزید پیش کی جاچکی ہیں 6/115 کہ اللہ کے قوانین کو بدلنے والا ہے ہی کوئی نہیں، اور 50/29 ما یبدل القول لدی کہ خود میری طرف سے بھی میرا قانون ہرگز نہیں بدلا جاتا۔

ح9 اولیاء اللہ سے متعلق آیات زیر بحث کا آخری ضمنی نوٹ ہے ذلک ھو الفوز العظیم کے متعلق کہ اولیاء اللہ کی مذکورہ بالا نشانیاں، جن کی بدولت انہیں دنیوی اور اخروی، دونوں زندگیوں کی کامیابی کی خوشخبری دائمی طور پر قرآن مجید میں درج کر دیگئی ہے یہی تو عظیم کامیابی ہے۔ پس اولیاء اللہ کے مذکورہ بالا قرآنی نشانات کے، خود ذات باری کی طرف سے اعلان عام کے بعد بھی اگر ہمارا کوئی مکتب فکر آوارہ حال بھک منگوں، پرائی کمائی پر پلنے والے حجرہ اور خانقاہ نشینوں، نیز لٹکتے چیتھڑوں والے مخبوط الحواس اور بھنگیوں چرسیوں کو اولیاء اللہ قرار دے۔ اور غیر اللہ سے مرادیں مانگنے کی اسلام و ایمان دشمن روش ترک نہ کرے تو اسے اس قوم کی انتہائی بدبختی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ (ما علینا الا البلغ)

اس سے اگلی آیت میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو ان لوگوں کا یہ قول غمگین نہ کرے کہ ابھی تک آپ کو غلبہ تو میسر آیا ہی نہیں۔ جو یقیناً" یقیناً" میسر آنیوالا ہے، کیونکہ غلبہ تو سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے اور اسی کے قوانین پر عمل کرنے سے میسر آتا ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾

(65) اور اے رسولؐ آپکو انکا (ہنوز عدم میسر غلبہ کا) قول غمگین نہ کرنے۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ غلبہ اور عزت و وقار سارے کا سارا صرف اللہ ہی کے لئے ہے (اسی کے قوانین کے مطابق آپ کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو گا) اور وہ اللہ خوب خوب سننے والا ہے ان باتوں کو جو یہ لوگ کہتے ہیں اور خوب خوب جاننے والا ہے (انکے ارادوں کو جو وہ ذہنوں میں چھپاتے ہیں)

اس سے اگلی آیت مجیدہ کا تعلق اصلی اولیاء اللہ' انبیاء کرام اور صحابہ رسولؐ کے ساتھ ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ان سے بھی مدد مرادیں مانگنا انہیں اللہ کے شریک ٹھہرانا ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

(66) خبردار! (بگوش ہوش سن لو) جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے' صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ (کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں) اور جو لوگ مدد مرادوں کے لئے اللہ کے سوا اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو پکارتے ہیں وہ نہیں پیروی کرتے مگر ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور نہیں وہ مگر انکل پچو دلیلیں دیتے ہیں۔

انکل پچو دلیلیں غیراللہ سے مرادیں مانگنے کی یوں تو بہت سی دیجاتی ہیں جن میں سرفہرست یہ کہا جاتا ہے کہ اگر کسی حاکم کے حضور کوئی درخواست دینی ہو تو پہلے اسکے ریڈر یا نائب کو وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ مگر ان حضرات کو یاد نہیں رہتا کہ اھدنا الصراط المستقیم کی درخواست تو وہ روزانہ بلاوسیلہ اللہ کے حضور پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ایک گمراہ کن دلیل یہ دیجاتی ہے کہ لوہے کا ٹکڑا آگ میں پڑکر آگ ہو جاتا ہے اور جو کام آگ کرتی ہے وہی کام وہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح بزرگ اللہ کے ساتھ واصل ہو کر وہی کام کر سکتے ہیں جو اللہ کرتا ہے۔ العیاذ باللہ! ان حضرات کو کون بتائے کہ آگ اور لوہا دونوں کا اصل مادہ ہے۔ دونوں' واحد الاصل ہونے کی بدولت ایک دوسرے سے صفات حاصل کر سکتے ہیں۔ اللہ اور بندہ جب واحد الاصل ہی نہیں اور بندے کا اللہ میں لوہے اور آگ کی طرح پڑنا ہی ممکن نہیں تو اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو اس نے صرف اپنے لئے مختص کر رکھی ہیں انسان میں کس طرح پیدا ہو سکتی ہیں جیسے کہ اگلی آیت مجیدہ میں ارشادہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کو پیدا کیا ہے۔ کیا ان لوگوں کے بزرگ دن رات پیدا کر سکتے ہیں؟ ارشاد باری ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

(67) (مدد مرادوں کے لئے پکارے جانے کے لائق) وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی ہے تاکہ تم اس میں آرام کرو۔ اور دن کو روشنی دینے والا بنایا ہے۔ یقیناً" اس (بیان) میں اس قوم کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو (قرآنی حقائق کو بغور) سنتے ہیں (سنی کو ان سنی نہیں کر دیتے)

لقوم یسمعون کے الفاظ میں جس سننے کی خبر دیگئی ہے وہ عام سننا نہیں بلکہ خالی الذہن اور تعصب سے کنارہ کش ہو کر بغور سننا مراد ہے۔ انسان کی پوری زندگی گردش لیل و نہار میں ختم ہو جاتی ہے۔ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن بدستور آتے چلے جا رہے ہیں۔ اب جو لوگ آیت صدر کو بصدق اور بغور سنتے ہیں وہ اس امر پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا یہ نظام لیل و نہار ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے جن سے ناوان لوگ غائبانہ مدد مرادیں مانگتے ہیں؟ دن اور رات کے مسلسل و متواتر بدل بدل کر آنے کا تعلق ہے سورج کی روشنی کے ساتھ کہ جس خطہ ارض پر ہم موجود ہیں جب زمین کا یہ حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے تو ہمارے ہاں دن ہوتا ہے اور جب یہ حصہ سورج کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو ہمارے ہاں رات ہوتی ہے۔ جس ذات پاک نے آفتاب عالمتاب کا اتنا بڑا نوری کرہ پیدا کیا ہے اور کرہ ارضی کو مداری اور محوری گردش کے دائمی قانون کی زنجیروں میں جکڑ کر اسکی ایک گردش کے ذریعہ موسموں کی تبدیلی اور دوسری کے ذریعہ دن رات کے مسلسل بدل بدل کر آنے کا سامان فرمایا ہے' کیا مدد مرادیں وہ ذات دے سکتی ہے یا وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے سورہ نحل میں اسی عنوان استمداد غیراللہ کے ضمن میں ارشاد ہوا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۞ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۞ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ 16/22-20 اور وہ لوگ جنہیں لوگ اللہ کے سوا مدد مرادوں کے لئے پکارتے ہیں وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ تو خود پیدا کئے گئے ہیں۔ (اور جن متوفی بزرگوں کو لوگ مدد مرادوں کے لئے پکارتے ہیں) وہ مردے ہیں ہرگز زندہ نہیں ہیں۔ اور وہ (انکے متوفی بزرگ انکی مدد کیا کریں انہیں تو) شعور تک نہیں ہے کہ وہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے۔ (غائبانہ مدد مرادوں کے لئے پکارے جانے کے لائق) تمہارا الہ' الہ واحد ہے۔

اب غور فرمایئے گا کہ:۔

ان آیات کریمہ میں قرآنی حقائق کو تعصب اور ضد سے الگ ہو کر سننے والوں کے لئے حقائق ذیل کا اعلان کیا گیا ہے کہ:۔

1- غائبانہ مدد مرادوں کے لئے پکارے جانے کے لائق صرف اور صرف وہ ہے جو خالق ہے جو پیدا کرنیوالا ہے خود پیدا ہوا ہوا نہیں 16/20

2- غائبانہ مدد مرادوں کے لئے پکارے جانے کے لائق مخلوق میں سے ہرگز کوئی نہیں ہے' جو خود پیدا کیا گیا ہے 16/20

3- جو بزرگ فوت ہو چکے ہیں انہیں زندہ سمجھنا ازروئے قرآن حکیم صد فیصد غلط ہے۔ وہ ہرگز ہرگز زندہ نہیں ہیں 16/21

4- جو بزرگ فوت ہو چکے ہیں وہ شعور سے صد فیصد عاری ہیں 16/22

5- غیراللہ کو مدد مرادوں کے لئے پکارنا انہیں اللہ تعالٰی کے شریک ٹھہرانا ہے 10/66 (ما علینا الا البلغ)

نگاہ بازگشت

آیت نمبر 62 تا 64 میں ارشاد ہوا ہے' بگوش ہوش سن لو کہ بلاشبہ جو اللہ کے دوست ہیں ان پر نہ آئندہ کے لئے خوف ہو گا اور نہ وہ ماضی میں کئے گئے اعمال کے لیے غمگین ہونگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ضابطہ الٰہی پر ایمان لاتے اور اس کی مخالفت سے بچتے ہیں۔ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں کامیابی کی اور آخرت کی زندگی میں نجات کی خوشخبری ہے۔ اللہ کے قانون کے لئے بدلنا ہے ہی نہیں۔ دنیا و آخرت کی فلاح و نجات کی خوشخبری ہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ ان آیات کریمہ میں اولیاء اللہ کی چھ قرآنی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔

پہلی یہ کہ انہیں آنیوالے خطرات کا خوف نہیں ہوتا 10/62 یہ اس لیے کہ وہ آنیوالے ہر خطرہ کا انسداد پہلے ہی کیئے ہوئے ہوتے ہیں۔

دوسری یہ کہ وہ ماضی میں کیے گئے اعمال پر غمگین نہیں ہوتے یعنی وہ عمداً ایسا کوئی عمل کرتے ہی نہیں جس پر انہیں غمگین ہونا پڑے 10/62

تیسری یہ کہ وہ اللہ تعالٰی کے تکوینی اور تنزیلی قوانین پر صد فیصد ایمان رکھتے ہیں 10/63 اور

چوتھی یہ کہ جن قوانین الٰہی پر وہ ایمان لاتے ہیں ان پر صد فیصد عمل کرتے اور ان کی مخالفت سے بچتے ہیں

ان کی پانچویں اور چھٹی نشانی یہ ہے کہ انہیں دنیا و آخرت کی کامیابی کی خوشخبری دیدی گئی ہے مشاہدہ کے مطابق ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ دشمنوں کے مقابلے پر دنیا میں آخری فتح و کامرانی ان کے حصے میں آتی ہے اور آخرت کی دوسری زندگی میں بھی انہیں سرخروئی نصیب ہو گی۔

آیت نمبر 65 میں نبی اکرمؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ کو تا حال کلی فتح میسر نہ آنے کا مخالفوں کا طعنہ غمگین نہ کر دے۔ بلاشبہ غلبہ سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے ہے (کیونکہ ہر چیز اللہ کے متعینہ قوانین کے ساتھ وابستہ ہے) اور وہ اللہ خوب خوب سننے والا اور خوب خوب جاننے والا ہے۔ جو طعنے مخالفین دیتے ہیں انہیں سنتا ہے اور تم لوگ ان کے مقابلہ اور انہیں آخری شکست فاش دینے کے لئے جو اعمال بجالا رہے ہو یعنی جو جنگی تیاری تم کر رہے ہو اسے جاننے والا ہے۔

آیت نمبر 66 میں ارشاد ہوا ہے کہ بگوش ہوش سن لو بلاشبہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سارے کا سارا صرف اللہ ہی کی ملکیت ہے مگر جو لوگ غیر اللہ کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر ان سے مرادیں مانگتے ہیں' وہ نہیں اتباع کرتے مگر صرف ظن و گمان کی اور وہ انکل پچو باتیں کرتے ہیں۔ یعنی ان کے ٹھہرائے ہوئے شریک کسی بھی چیز کے نہ مالک ہیں اور نہ وہ ان لوگوں کی مرادیں پوری کر سکتے ہیں۔

آیت نمبر 67 میں اعلان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے اے نوع انسانی تمہارے لئے رات کو آرام کے لئے ٹھہرایا ہے اور دن کو روشن بنایا ہے تاکہ تم کسب معاش کرو۔ بلاشبہ مذکورہ بالا آیتوں میں اس قوم کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو حقائق کو سننے والے ہیں اللہ تعالٰی کی تکوینی یعنی کائناتی نشانیاں اسکی ہستی کے لئے نا قابل انکار دلائل ہیں مگر اس آیت میں اس کے لئے شرط اول قرار دی گئی ہے خالی الذہن ہو کر سننا۔ اسکے بعد نمبر آتا ہے ان پر غور و فکر کرنے کا= اور پھر نمبر آتا ہے ان پر عمل کرنے کا۔ جو قوم

ان حقائق کو سن کر سمجھ کر کائناتی قوانین کے سربستہ رازوں کو معلوم کرتی ہے اس کے لئے زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے۔ ہوا، فضا اور خلا ان کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ کائناتی قوانین سے صرف نظر کر کے صرف مردہ بزرگوں سے سب کچھ کرانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ کائناتی قوانین کے خلاف بیماریوں سے شفاء رزق میں کثرت اور دشمنوں پر فتح کے طلبگار ہوتے ہیں تاکہ انہیں خود کچھ نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ وہ اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو اللہ کے برگزیدہ اور اس کے محبوب و معشوق قرار دیتے ہیں تاکہ اس چیز کا جواز مہیا ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ اپنے معشوقوں کی خاطر اس حالت میں ان کی مرادیں پوری کر دے کہ وہ بیماریوں کے لئے صحیح دوائیں تو ایجاد نہ کریں صرف پانی دم کر کے پلانے سے مریض شفایاب ہو جائیں۔ زراعت کے الہٰی قوانین نہ معلوم کریں نہ ان پر عمل کریں، صرف کھیت میں تعویذ دبانے سے ستر اسّی من فی ایکڑ پیداوار میسر آجائے۔ اور اسی طرح وہ جدید اسلحہ تو تیار نہ کریں، صرف دعاؤں یا درود و ظائف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انہیں دشمن پر فتح اور غلبہ عطا کر دے کیونکہ وہ اللہ کے حضور میں اسکے محبوبوں اور معشوقوں کا واسطہ و وسیلہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کے طفیل اپنا قانون توڑ کر ان کی مرادیں پوری کرتا رہے۔ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں شکست و ذلت اور آخرت میں ناکامی و روسیاہی لازم ہو جاتی ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں اللہ تعالیٰ سے قانون شکنی کرانے کے لئے ایک قدم آگے بڑھنے والوں کی خبر دی گئی ہے۔ ان کے مانے ہوئے بزرگ کو اللہ نے اپنا بیٹا بنا لیا ہوا ہے۔ اسلئے وہ اسکی خاطر اپنے ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جن کے متعلق پیچھے آیت نمبر 64 میں غیر مبہم الفاظ میں اس نے خود اعلان عام کر دیا ہے۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ 10/64 اللہ تعالیٰ کے قوانین کے لئے بدلنا ہے ہی نہیں چنانچہ اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو اللہ کے بیٹے ٹھہرانے والوں کے متعلق خبر دیگئی ہے۔

(68)

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ هُوَ الْغَنِيُّ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِهٰذَا ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۸

ان (اللہ کا شریک ٹھہرانے والوں نے) کہا کہ اللہ نے (فلاں کو) بیٹا بنایا ہے۔ حالانکہ وہ اس (بیٹا بنانے) سے پاک ہے۔ وہ بے محتاج ہے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے صرف اسی کا ہے۔ تمہارے پاس اس نظریئے کی کوئی دلیل نہیں ہے کیا تم اللہ پر جھوٹ کہتے ہو جسے تم جانتے ہی نہیں۔

سُبْحٰنَهٗ کے الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ باری تعالیٰ بیٹے کی ضرورت و احتیاج سے پاک ہے۔ کیونکہ بیٹے کی ضرورت انسان کو ہے جسے بڑھاپا بھی لازم ہے اور موت بھی۔ بیٹا ہو گا تو بڑھاپے کا سہارا بنے گا اور باپ کی موت کے بعد اسکا جانشین ہو گا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کو نہ بڑھاپا ہے نہ موت ہے اس لئے وہ بیٹے کی ضرورت و احتیاج کے تصور تک سے پاک و منزہ ہے بت پرست اقوام اپنے دیوتوں کو اللہ کے بیٹے اور دیویوں کو اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام میں بالفاظ ذیل نفی کر رکھی ہے۔ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۝ 6/101 اور انہوں نے اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں قرار دیدی ہیں بغیر علم کے جو صفت وہ بیان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بلند و بالا ہے۔ نصاریٰ نے مسیح کو اور یہود نے عزیر کو اللہ کے بیٹے قرار دے رکھا ہے۔ سورہ توبہ میں آیا ہے۔ وَقَالَتِ

الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرٰی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِکَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ 9/30 اور یہودیوں نے کہا۔ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاری نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ محض ان کے منہ کی فضول بات ہے یہ ان لوگوں کے قول کی نقل ہے جو ان سے پہلے کافر ہوئے تھے۔ اللہ انہیں برباد کرے وہ کس طرف کو الٹے پھرے جاتے ہیں۔"

دیکھیے! اس آیت مجیدہ 10/30 میں بتایا گیا ہے کہ یہود و نصاری سے پہلی قومیں بھی اپنے نبیوں اور بزرگوں کو اللہ کے بیٹے کہا کرتی تھیں۔ غرض صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے لوث و بے لچک قانون کو اسکے خود تراشیدہ بیٹوں کے ذریعے توڑا جائے اس میں لچک اور لوچ کا تصور پیدا کیا جائے۔ جیسے کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ انہیں ان کے جرموں اور گناہوں کی سزا سے اللہ کا بیٹا مسیح بچا لیگا۔ لیکن یاد رہے کہ باری تعالیٰ کے کسی بھی قانون میں کوئی شگاف پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں نے گناہوں کے کفارہ اور شفاعت کا تصور پیدا کر رکھا ہے۔ باری تعالیٰ نے انکے لئے ارشاد فرما دیا ہے۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ 2/48 "اور بچ جاؤ اس دن (کے عذاب) سے جب کوئی شخص کسی شخص کے ذرہ بھی کام نہیں آئے گا اور نہ اس سے سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے رشوت لی جائے گی اور نہ ہی وہ کسی بھی قسم کی مدد کیے جائیں گے۔" المختصر! اللہ کے محبوب و معشوق اور اسکے بیٹے ٹھہرانے کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ دنیا میں محض ان کے بیٹا یا محبوب ہونے کے تصور سے مرادیں حاصل کی جائیں اور قیامت کی عدالت میں سفارش ہو جائے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ نہ دنیا میں کوئی بھی کام عمل کے بغیر کھوکھلے تصورات سے سر انجام ہوتا ہے اور نہ قیامت کو سفارش کے ساتھ گناہ معاف ہو سکیں گے۔ گناہوں کی معافی اسی دنیا میں توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لینے کے ساتھ وابستہ ہے۔

هو الغنی کے الفاظ میں باری تعالیٰ کی خصوصی تعریف کی گئی ہے کہ وہ ہر لحاظ سے بے نیاز و بے محتاج ہے۔ پیچھے عرض کیا جا چکا ہے کہ نہ اسے بڑھاپا ہے کہ لاٹھی پکڑنے کے لئے بیٹے کی ضرورت لاحق ہو اور نہ اسے موت ہے کہ اس کے لئے جانشین کے طور پر بیٹے ہونا لازم ٹھہرے۔ اسی طرح نہ اسے بھوک ہے نہ پیاس' نہ اسے بیماری ہے نہ اونگھ ہے نہ نیند یعنی جتنی بھی محتاجیاں انسان کے لئے ہیں وہ ان سب سے پاک و منزہ ہے۔

اللہ نے کوئی بیٹا نہیں پکڑا له ما فی السموات وما فی الارض سے عیاں ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا وہ خود مالک ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر چیز کا وہ خود خالق ہے سورہ فرقان میں آیا ہے۔ الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ○ 25/2 "اللہ وہ عظیم الشان ذات ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اور صرف اسی کی ہے۔ اور اس نے کوئی بیٹا بھی نہیں بنایا اور اس کی حکومت میں اسکا کوئی شریک و ساجھی بھی نہیں ہے۔ اور اس نے خود ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور پھر اسی نے خود ہر چیز کے لئے اندازے پیمانے اور قانون مقرر کر دیے ہیں۔" پس برادران عزیز! اس ہمہ جہتی وحدہ لاشریک کے لئے نہ بیٹے کا تصور پیدا ہوتا ہے اور نہ خود اپنے متعینہ قوانین کو توڑنے کا۔

ان عندکم من سلطن بهذا کے الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ کا بیٹا ٹھہرانے والو! تمہارے پاس اسکی

کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اتقولون علی اللّٰہ مالا تعلمون کے الفاظ میں جتا دیا گیا ہے کہ اللہ کا بیٹا ٹھہرا کر اللہ کے قانون میں لچک پیدا کرنیوالو' تم اللہ کے ذمہ وہ کچھ لگاتے ہو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ بالفاظ دیگر انہیں اس چیز کا علم حاصل کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین تکوینی اور تنزیلی میں کوئی معمولی سی لوچ بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بیٹے کی تو نہ اسے احتیاج و ضرورت ہے اور نہ اس نے کسی کو بیٹا بنایا ہی ہے۔ باقی رہا اسکے محبوبوں کا مسئلہ۔

سیسہ پلائی دیوار بنکر لڑنیوالے اللہ کے محبوب ہیں۔

سورہ صف میں ارشاد ہوا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○ 61/4 بلاشبہ اللہ تعالیٰ انہیں محبوب بناتا ہے جو اللہ کی راہ میں صفیں باندھ کر لڑتے ہیں۔ گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی دیوار ہیں۔ واضح رہے کہ خود نبی اکرم اور آپ کے جملہ صحابیؓ اللہ کی راہ میں دشمنوں کے مقابلے پر شمشیر بکف لڑتے تھے۔ اسلئے وہ سب اللہ کے محبوب تھے۔ مگر ان محبوبوں کی مقدّس جماعت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون نہیں بدلا تھا۔ جنگ احد میں صحابہؓ کے ایک دستے سے جنگی غلطی ہو گئی' یعنی جب انہوں نے میدان جنگ کے عقبی درّہ کو غیر محفوظ چھوڑ دیا تو دشمن نے پیچھے کی طرف سے حملہ کر کے لشکر صحابہؓ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے اپنے ان مقدس محبوبوں کی خاطر بھی اپنے قانون میں ہرگز تبدیلی نہ فرمائی۔ چنانچہ اللہ کا یہ قانون آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا کہ اگر کسی میدان جنگ کی پیٹھ غیر محفوظ ہو گی تو دشمن اس طرف سے نقصان پہنچا سکے گا۔ تو اس طرح جب اپنے محبوبوں کے لئے ایسے نازک مقام پر بھی قانون الٰہی میں لچک پیدا نہ ہو سکی تو ثابت ہوا کہ یہ عقیدہ صد فیصد باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کے لئے دنیا میں اپنا قانون بدل دیتا ہے اور قیامت کو بدل دیگا۔

اگلی آیت مجیدہ میں جتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ پر قانون کو بدل دینے کا بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی فوز و فلاح سے ہمکنار نہیں ہونگے۔

(69)

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

اے رسول کہدیجئے گا کہ جو لوگ اللہ کے ذمہ (قانون بدلنے کا) افترا باندھتے ہیں جو سراسر جھوٹ ہے۔ وہ فلاح نہیں پائیں گے۔

(70)

مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ ثُمَّ نُذِیْقُھُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

دنیا کا (چند روزہ) فائدہ ہے پھر انہوں نے (دوسری زندگی میں) ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے پھر ہم انہیں سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے اس انکار کے بدلے جو وہ مسلسل کرتے رہے تھے۔

یفترون علی اللّٰہ الکذب سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ پر اپنا قانون بدلنے کا افتریٰ ہے کیونکہ ماقبل 10/64 میں

اعلان کیا گیا ہے لا تبدیل لکلمت اللّٰہ اللہ کے قانون کے لئے بدلنا ہے ہی نہیں' خواہ وہ کائناتی ہو یا تنزیلی۔

لا یفلحون کے الفاظ میں ایسے لوگوں کے لئے جو اللہ کے قوانین کی محکمیت پر یقین نہیں رکھتے۔ عدم فلاح کی خبر دی گئی۔ بالفاظ دیگر بتایا گیا ہے کہ دنیوی فلاح تکوینی قوانین کے سربستہ رازوں کو بے نقاب کر کے ان پر صد فیصد عمل کرنے میں ہے اور اخروی فلاح اللہ کے تنزیلی قوانین قرآن حکیم پر عمل کرنے سے میسر آئیگی۔

متاع فی الدنیا کے الفاظ میں ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے کائناتی تکوینی قوانین پر عمل کر کے دنیوی فلاح تو حاصل کر لیتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے تنزیلی قوانین سے روگردانی کر کے عطاء ربّانی پر ذاتی تسلط جما کر بیٹھ جاتے' خود تو عیش و عشرت میں بسر کرتے مگر باقی نوع انسانی کو ان کی جائز ضروریات زندگی تک سے محروم کئے رہتے ہیں۔ انہیں کہا گیا ہے کہ دنیا کا مال و متاع صرف دنیا کی چند روزہ زندگی کے لئے ہے اخروی زندگی میں یہ عمل فائدہ دے سکے گا کہ ضرورت سے زائد اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں صرف کیا جائے۔ کیونکہ حقیقت حال کے مطابق اس بھری کائنات کی ساری نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی ہیں اور ساری مخلوق بھی اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور اس نے اعلان عام کر رکھا ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ○ 2/36 + 7/24 اور اے پوری نوع انسانی! تم سب کے سب کے لئے زمین میں حق رہائش بھی مسلّم ہے (یعنی زمین میں تم سب کے سب کا گھر بھی بلا کرایہ اپنا ہو) اور آخری دم تک کے لئے تم سب کے سب کو ضروریات زندگی کا حق بھی حاصل ہے نیز فرمایا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ○ 2/29 وہ اللہ ہی عظیم الشان ذات ہے جس نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے وہ سب کا سب تم سب کے لئے پیدا کیا ہے۔ پس آیات بالا 2/36 + 7/24 + 2/29 کے مطابق نعماء باری تعالیٰ پر نہ کسی واحد فرد کی اجارہ داری قابل قبول ہے اور نہ کسی واحد قوم کی تکوینی یعنی کائناتی قوانین الٰہی کے سربستہ رازوں کو بے نقاب کرنے کا حق بھی ہر فرد و قوم کو حاصل ہے اور ان پر عمل کر کے زیادہ سے زیادہ نعماء الٰہی حاصل کرنے کا حق بھی ہر فرد و قوم کا مصدق ہے۔ مگر ان کے ماحصل پر ازروئے قرآن حکیم پوری نوح انسانی کا حق مسلّم ہے۔ پوری نوع انسانی کے اس پیدائشی اور بنیادی حق پر غاصبانہ طور پر مسلط ہونے والوں کے لئے غور فرمائیں۔

قیامت کی جوابدہی ثم الینا مرجعھم کے الفاظ میں ان لوگوں کے متعلق جو نعماء الٰہی کو اللہ تعالیٰ کی پوری مخلوق تک پہنچنے میں روک بن جاتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ ان کا لوٹ کر آنا ہماری ہی طرف ہے۔ واضح رہے کہ اس زندگی میں انسان کو بجا آوری اعمال کی رو سے فعل مختار ٹھہرایا گیا ہے۔ اعملو ما شئتم 41/40 اچھے یا برے' فرمانبرداری کے یا نافرمانی کے جیسے بھی اعمال تم خود چاہو کرو لیکن اس دنیا میں بجالائے گئے اچھے یا برے اعمال کی جوابدہی کے لئے یوم القیامت کے نام سے ایک دن مقرر کر دیا گیا ہے مرنے کے بعد برزخ کا زمانہ ہے یعنی موت کے بعد اور بعثت قیامت کا درمیانی وقفہ جس میں کوئی زندگی نہیں ہے۔ دوسری زندگی وقفہ برزخ کے بعد میسر آئے گی' جس میں ہر کسی کو رب تعالیٰ کی عدالت عالیہ میں حاضر ہو کر اپنے اس زندگی کے اعمال کا جوابدہ ہونا ہے۔ اسی جوابدہی کے لئے حضور باری تعالیٰ میں حاضری کو ثم الینا

مرجعھم کے الفاظ میں رجعت الی اللہ کہا گیا ہے۔ اور جس کے متعلق اعلان عام کر دیا گیا ہے کہ اس دن پورا پورا انصاف کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جس کسی نے ذرہ بھر نیک عمل کیا ہو گا اسے بھی دیکھ لے گا۔ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ○ 99/7 اور جس کسی نے ذرہ بھر برا عمل کیا ہو گا اسے بھی دیکھ لے گا۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ○ 99/8 پس ذرہ ذرہ کے حساب کے بعد ارشاد ہوا ہے۔

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ○ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ○ 101/7-6 پھر جس کا موازنہ اعمال نیکیوں کا بھاری ہو گا وہ خوشی کی زندگی میں ہو گا۔ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ○ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ○ 101/9-8 اور جس کا موازنہ اعمال نیکیوں کا ہلکا ہو گا اسکا ٹھکانہ جہنم کا گڑھا ہو گا۔

چنانچہ آیت زیر بحث 10/70 میں مذکور ان افراد کے متعلق جو اللہ کی نعمتوں کو اللہ کی پوری مخلوق تک پہنچنے میں روک بنجاتے ہیں' ارشاد ہوا ہے ثم نذیقھم العذاب الشدید پھر ہم انہیں سخت ترین عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ اور اس برے عمل کے ضمن میں انہوں نے جو ذرہ برابر بھی برا عمل کیا ہو گا ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ 99/8 کے مطابق اسے بھی دیکھ لیں گے۔ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔
بما کانوا یکفرون سے ظاہر ہے کہ انہیں ان کے انہی اعمال بد کا بدلہ دیا جائیگا جو وہ خود ہی مسلسل بجالاتے رہے تھے۔ اور ان اعمال بد کی اساس انکاوہ انکار تھا جو وہ حقائق ثابتہ سے بدستور کرتے رہے۔ بما کانو ایکفرون کے الفاظ میں یکفرون فعل مضارع پر کانوا فعل ناقصہ داخل ہوا ہے۔ جس نے عربی قواعد کے مطابق فعل مضارع کو ماضی استمراری بنا دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے انکار حقائق کو اپنا مستقل شعار بنا رکھا تھا۔ اور اس مستقل انکار کی بدولت مستقل و مسلسل بداعمالی پر جس میں سرفہرست نعماء الہی کو اللہ کی مخلوق تک پہنچنے سے روکنا تھا' جمے رہے۔ بد اعمالیوں سے توبہ کرکے اپنی اصلاح کرنے کے لئے زندگی کا جو پورا وقفہ عطا کیا گیا تھا' اسے ضائع کر دیا' یعنی آخری دم تک انکار حقائق اور اصرار غصب حقوق انسانی پر جمے رہے۔ العیاذ باللہ! ان آیات کریمہ سے سبق حاصل کرکے حقائق کا اقرار اور برے عملوں سے توبہ اور اپنی اصلاح کرنا لازم ہے۔

نگاہ بازگشت آیت نمبر68 میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں کا ایک انداز یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں کو اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے۔ جیسے کہ نصاریٰ نے مسیحؑ کو اور یہود نے عزیر کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا ہوا ہے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بیٹے کے طفیل ان لوگوں کے گناہ معاف کر دے اور انہیں اس دنیا میں من مانیاں کرنے کی کھلی چھٹی ملی رہے۔ لیکن ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ بیٹے کی احتیاج سے پاک ہے نہ اسے بڑھاپا ہے کہ اسے لاٹھی پکڑنے کی ضرورت لاحق ہو اور نہ اسے موت ہے کہ کوئی اس کا جانشین بنے وہ ہر لحاظ سے بے محتاج ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب اسی کا ہے۔ شریک ٹھہرانیوالوں کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ تمہارے پاس اللہ کا بیٹا ٹھہرانے کی کوئی دلیل نہیں۔ کیا تم لوگ وہ کچھ اللہ کے ذمے لگاتے ہو (یعنی بیٹا بنانا) جسے تم جانتے ہی نہیں۔

آیت نمبر69-70 میں انہی لوگوں کے متعلق نبی اکرمؐ سے اعلان کرادیا گیا ہے کہ بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ افتریٰ

باندھتے ہیں وہ ہرگز کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتے۔ وہ دنیا کا چند روزہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس کے بعد انہوں نے اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لئے اللہ کی طرف لوٹ کر جانا' اسی کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ پھر جو جو کرتوتیں وہ کر رہے تھے ان کے بدلے انہیں اللہ تعالیٰ دردناک عذاب کا مزہ چکھائے گا۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کو نوحؑ کی خبر پڑھ کر سنایئے کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم پر میری نصیحت گراں گزرتی ہے تو میرے خلاف اپنی تمام طاقت اور اپنے سب شریکوں کو جمع کر لو اور مجھے ڈھیل نہ دینا مگر یاد رکھو میرا پروردگار تمہارے شر سے مجھے محفوظ رکھے گا۔

(۷۱)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِىْ وَ تَذْكِيْرِىْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَىَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾

(اے رسولؐ) ان لوگوں پر نوحؑ کی خبر پڑھیئے گا۔ ان کا وہ وقت قابل ذکر ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اگر تم پر میرا مقام نبوت اور میرا اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا گراں گزرتا ہے تو میں نے اللہ پر توکل کیا ہے پھر تم (میری مخالفت کی) اپنی مہم پر اکٹھے ہو جاؤ اور اپنے شریکوں کو بھی جمع کر لو۔ تاکہ تمہاری مہم میں کوئی شبہ باقی نہ رہے پھر تم (سب جمع ہو کر) میرے خلاف فیصلہ کر لو اور مجھے ڈھیل نہ دینا۔

اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جب نوحؑ نے قوم کو ان کے باطل عقائد اور برے اعمال سے آگاہ اور منع فرمایا تو وہ سیخ پا ہو گئے اس پر آپ نے انہیں وارننگ دیدی کہ میں خالص للہ کے حکم کے مطابق تمہیں وعظ و نصیحت کا فریضہ ادا کر رہا ہوں۔ اس پر بجائے اس کے تم اپنے باطل عقائد اور برے اعمال کی اصلاح کرتے' الٹی میری مخالفت کا بیڑا اٹھا لیا ہے تو بے شک تم میری مخالفت پر سب کے سب اکٹھے ہو جاؤ اور اپنے شریکوں کو بھی جمع کر لو تاکہ میرے خلاف تمہاری مہم ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے اور پھر مجھے مہلت نہ دو۔ جو بھی کر سکتے ہو کر ڈالو۔ مگر یاد رکھو کہ میرا پروردگار جس نے مجھے مقام نبوت پر مبعوث فرمایا ہے وہ ضرور میری مدد کرے گا۔ اور تم اپنے شریکوں سمیت ناکام و نامراد ہو جاؤ گے۔

سورہ نوحؑ میں خود نوحؑ ہی کے الفاظ میں خبر دی گئی ہے۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِىْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ○ وَ مَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ○ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ○ 71/23-21

نوحؑ نے کہا اے میرے رب بے شک انہوں نے میری نافرمانی کی ہے اور اتباع اس کی کی ہے جس کو اس کے مال اور اولاد نے نہیں زیادہ کیا مگر گھاٹے ہی میں زیادہ کیا ہے اور انہوں نے (میرے خلاف) بہت بڑی تجویزیں کی ہیں اور انہوں نے قوم سے کہا کہ تم اپنے الاہوں کو مت چھوڑنا۔ خصوصاً" نہ چھوڑنا ود سواع یغوث یعوق اور نسر کو۔

قوم نوحؑ کے پانچ پیر ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر قوم نوح کے ٹھہرائے ہوئے اللہ کے شریک پانچ پیر تھے جن سے وہ مدد' مرادیں' مانگا کرتے تھے۔ انہیں اللہ کے اختیارات مخصوصہ میں شریک بنا رکھا تھا کہ وہ بارشیں برساتے' کھیتیاں اگاتے' مویشیوں کو بڑھاتے اور اولادیں دیتے ہیں نوحؑ نے فرمایا کہ میرے خلاف تم سب پیر اور مرید جمع ہو جاؤ اور مجھے ڈھیل نہ دو نیز فرمایا۔

(72)

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾

پھر اگر تم روگردانی کرو تو میں تم سے (اس تبلیغ پیغامات باری تعالیٰ کا) کوئی اجر طلب نہیں کرتا نہیں ہے میرا اجر' مگر صرف اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ (خود بھی احکام الٰہی کا) فرمانبردار بنا رہوں)

چونکہ علماء و مشائخ کا دائمی دستور یہ ہے کہ وہ اپنے وعظوں اور تقریروں کی اجرت طلب کرتے۔ (یعنی خود منہ سے مانگ لیتے' بلکہ سودا بازی کے انداز میں) اجرت طے کر لیتے ہیں اس لیے قوم نوحؑ کو خیال ہوا کہ یہ شخص بھی اپنے وعظ کی اجرت طلب کرے گا لیکن آپ نے اعلان کر دیا کہ اگر تم اس لئے روگردانی کرتے ہو کہ میں تم سے اس کی اجرت مانگوں گا تو اس سے بے فکر ہو جاؤ کہ میں تم سے ہرگز اجر رسالت نہیں مانگوں گا میرا اجر صرف اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے جس نے خود مجھے منصب و رسالت پر مامور فرمایا ہے لیکن اس کے باوجود قوم کے غربا کے سوا کسی نے بھی نوحؑ کی تبلیغ وحدت و ربوبیت پر توجہ نہ دی۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔

(73)

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىِٕفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

پھر انھوں نے (اللہ کی آیتوں کو) جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے اسے (نوحؑ کو) اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے کشتی کے ذریعہ (عظیم طوفان سے) نجات دی اور انہیں (نوحؑ کا) جانشین بنایا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا' غرق کر دیا پھر غور کر (اے مخاطب) کہ جنہیں ڈرایا گیا تھا (ان کی نافرمانی) کی بدولت' ان کا کیا انجام ہوا (سب غرق کر دیئے گئے)

فی الفلک کا معنی لکھا گیا ہے' کشتی کے ذریعہ طوفان عظیم سے نجات دی۔

مادی اسباب خود اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اللہ تعالیٰ کے اپنے پیدا کردہ اسباب کے ذریعہ اس کے اپنے لائے ہوئے طوفان سے بچنے کا ذریعہ بھی اس کا اپنا پیدا کردہ سبب کشتی ہی تھی۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے لئے طوفان کا مقابلہ اپنی تنزیلی آیتوں کے ساتھ کرنا اس کے بے پایاں اختیارات سے باہر نہیں مگر چونکہ وہ اپنے قوانین کے خلاف ہرگز ہرگز نہیں کرتا 50/29 اس

لیے اس نے طوفان نوحؑ کی آمد سے بہت پہلے نوحؑ کو اپنے کائناتی قانون کے مطابق کشتی تیار کرنے کا حکم دیا جو سورہ ہود میں آیا ہے۔

وَاصۡنَعِ الۡفُلۡكَ بِاَعۡيُنِنَا وَوَحۡيِنَا وَلَا تُخَاطِبۡنِىۡ فِى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ۝
11/37 (اے نوحؑ) ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی (یعنی ہمارے کائناتی قانون) کے مطابق ایک کشتی تیار کریں اور ظالموں کے لئے مجھے مخاطب نہ کرنا۔ بلاشبہ وہ غرق ہونے والے ہیں۔

تسخیر آب کا کائناتی اصول | اس آیت مجیدہ 11/37 میں ووحینا جس کی تقدیر کلام بوجہ واؤ عاطفہ کا معنی ہے ہماری وحی کے مطابق نیز واضح رہے کہ یہاں وحی الٰہی سے اللہ تعالیٰ کا وہ کائناتی قانون مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے پانی کو انسان کے لیے مسخر کرنے کی خاطر اس کے اندر خود پیدا کر دیا ہے کہ جو چیز اپنے حجم کے پانی کے وزن سے ہلکی ہو۔ پانی اسے اپنی چھاتی پر سوار کر کے تیراتا چلا جاتا ہے اور جو چیز اپنے حجم کے پانی کے وزن سے بھاری ہو اسے فوراً ڈبو دیتا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اس کے جملہ کائناتی قوانین سمیت اس قدر اٹل ہے کہ اس نے خود نوحؑ کو طوفان سے بچانے کے لئے اپنے قانون تسخیر آب کے مطابق جسے اس نے اپنی وحی ہی فرمایا ہے ے مطابق کشتی تیار کرنے کا حکم دیا۔

وہ کشتی اس دور کی سائنسی ترقی کے مطابق لکڑی کے بہت موٹے موٹے پھٹوں اور مضبوط لوہے کے کیلوں سے بنائی گئی تھی جس کی خبر سورہ قمر میں دی گئی ہے کہ نوحؑ کو طوفان آب سے اس طرح نجات دی گئی تھی۔

وَحَمَلۡنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلۡوَاحٍ وَّدُسُرٍ۝ 54/13 اور ہم نے اسے لکڑی کے مضبوط پھٹوں اور لوہے کے کیلوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کیا اور ان کے ساتھیوں سمیت عظیم طوفان آب سے نجات دی۔

جب نوحؑ کشتی تیار کروا رہے تھے اس وقت قوم کے سردار آپ کا مذاق اڑاتے تھے سورہ ہود میں بتایا گیا ہے۔
وَيَصۡنَعُ الۡفُلۡكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيۡهِ مَلَاٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ سَخِرُوۡا مِنۡهُ قَالَ اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡكُمۡ كَمَا تَسۡخَرُوۡنَ۝ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ يَّاۡتِيۡهِ عَذَابٌ يُّخۡزِيۡهِ وَيَحِلُّ عَلَيۡهِ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ
۝ 11/39-38

(مفہوم) اور نوحؑ کشتی تیار کرتے تھے مگر جب ان کی قوم کے سرواران کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے آپ فرماتے جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو اسی طرح ہم تمہارے مذاق کا جواب دیں گے پھر تم جان لو گے کہ وہ کون ہے جس پر عذاب آئے گا جو اسے ذلیل خوار کر دے گا اور کس پر دائمی عذاب لازم ہو جائے گا۔

قوم نوح کا عقیدہ اور مطالبہ | سورہ ہود سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ ہستی باری تعالیٰ کی منکر نہیں تھی بلکہ اسے آباؤ اجداد سے یہ عقیدہ وراثتاً ملا تھا کہ نبی رسول بشر نہیں ہوا کرتے فوق البشر ہوتے ہیں جیسے کہ قوم نوحؑ کے سرداروں کا قول بیان کیا گیا ہے۔

فَقَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ‌ۚ وَمَا نَرٰى لَـكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۢ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ۝ 11/27 قوم نوح

کے سرداروں نے کہا جنہوں نے انکار کیا تھا کہ اے نوحؑ نہیں دیکھتے ہم تجھے مگر یہ کہ تو صرف ہمارے جیسا بشر ہے اور ہم نہیں دیکھتے مگر یہ کہ نہیں اتباع کی تیری مگر ان لوگوں نے جو ہمارے رذیلے ہیں جن کی رائے صرف صدا بصرا ہے اور ہم اپنے اوپر تیری کوئی فضیلت نہیں پاتے بلکہ ہمارا گمان یہ ہے کہ (تو اور تیرے ساتھی) تم سب جھوٹے ہو۔

اس آیت مجیدہ سے یہ ثابت ہے کہ قوم نوح کے انکار کی دو وجہیں تھیں پہلی یہ کہ ان کے آبائی متوارث عقیدہ کی رو سے اللہ کے نبی رسول بشر نہیں ہوتے اور دوسری یہ کہ رسولوں کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ ان پر سب سے پہلے قوم کے ادنیٰ لوگوں کی بجائے سرداران قوم ایمان لائیں اور پھر ان کے کہنے پر غریب لوگ ایمان لانا شروع کریں با الفاظ دیگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ امیر غریب اور اعلیٰ ادنیٰ کی طبقاتی تقسیم بالکل صحیح ہے۔ اللہ کے نبیؑ کو اس کی تائید کرنی چاہیے۔ تاکہ پہلے اعلےٰ طبقوں کے لوگ ایمان لائیں مگر جب ان کی منشاء کے خلاف نوحؑ نے طبقاتی تقسیم کو غلط قرار دیا اور معاشرہ کے ضعیف و کمزور لوگ ان کے گرد جمع ہوگئے تو اب سرداران قوم کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم اس وقت تک آپ کے پاس نہیں آسکتے جب تک آپ ان ادنیٰ لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا نہ دیں لیکن چونکہ بعثت انبیا کی غرض ہی اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز کو ختم کرنا ہوتی ہے اس لیے آپؑ نے جواباً ارشاد فرمایا۔

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْـهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ 11/30-29 حقیقت یہ ہے کہ میں ان لوگوں کو ہرگز اپنے پاس سے دور کرنے والا نہیں ہوں بیشک یہ (معاشرہ کے ستائے ہوئے لوگ) اپنے رب کی ملاقات کرنیوالے ہیں (وہ اپنے حقوق ربوبیت ضرور پالیں گے) مگر میں سمجھتا ہوں کہ تم اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز کو برقرار رکھنے پر ضد کرنے والے لوگ ایک جاہل قوم ہو اور اے میری قوم حقیقت یہ ہے کہ اگر میں انہیں اپنے پاس سے ہٹا دوں تو کون ہے جو مجھے اس جرم عظیم کی سزا سے اللہ تعالیٰ سے بچانے میں میری مدد کر سکے پھر تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

تم بشر محض ہو سورہ مومنون میں بھی قوم نوحؑ کے الفاظ ذیل بیان ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ اس عقیدہ کی حامل تھی کہ اللہ تعالیٰ کے نبی رسول بشر نہیں ہوتے۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ 23/24-23 قوم نوحؑ کے ان سرداروں نے کہا جنہوں نے انکار کیا کہ لوگو! نہیں ہے یہ (نوحؑ) مگر ایک بشر ہے تمہارے جیسا جو تم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے (چونکہ یہ بشر ہے اس لیے نبی نہیں ہو سکتا) اگر اللہ تعالیٰ نبی بھیجنا چاہتا تو ملائکہ نازل کر دیتا ہم نے یہ (یعنی نبی کا بشر ہونا) اپنے پہلے آباؤ اجداد سے سنا ہی نہیں۔

مسئلہ بشریت انبیاء قرآن کریم کی روشنی میں سورہ مومنون کی آیات بالا میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قوم نوحؑ کے سردار نہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر تھے اور نہ انہیں سابقہ انبیاءؑ کا انکار تھا۔ انہیں نوحؑ کی نبوت سے انکار صرف اس لیے تھا کہ آپ بشر تھے نور نہیں تھے۔ ملک نہیں تھے قوم نوحؑ کے عقیدہ کے مطابق نبی کے لئے غیر بشر ہونا ضروری تھا۔

افسوس ہے کہ اہل اسلام میں بھی نبی اکرم رحمتہ للعلمین کے متعلق یہی عقیدہ راہ پا چکا ہے کہ آپ بشر نہیں نور تھے اور اسی قوم نوحؑ کے منکروں کے عقیدہ کو منوانے کے لئے آئے دن باہمی سر پھٹول جاری ہے اور نبی اکرمؐ کو غیر بشر منوانے کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نبیوں کو بشر کافر کہتے تھے جیسے کہ قوم نوحؑ نے کہا تھا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ 23/24 ما نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا 11/27 یہ نوحؑ تمہارے جیسا بشر ہے۔ اے نوحؑ نہیں دیکھتے ہم تجھے مگر اپنے جیسا بشر دیکھتے ہیں۔

مگر افسوس اس امر کا ہے کہ نبی اکرمؐ کو غیر بشر ثابت کرنے کے لئے قرآنی الفاظ کا انتہائی غلط مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ قوم نوح یا دیگر منکر اقوام نے اپنے اپنے نبیوں کا یہ کہہ کر انکار کیا کہ چونکہ یہ بشر ہیں اس لئے یہ نبی نہیں ہو سکتے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان کا یہ عقیدہ از روئے قرآن حکیم غلط تھا یا صحیح۔ قرآن حکیم اس سلسلہ میں کیا رہنمائی کرتا ہے؟ کیا قرآن کریم انبیاؑ کی بشریت کا اعلان کرتا ہے یا عدم بشریت کا؟ اس کا جواب سورہ ابراہیم کی آیات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد باری ہے۔ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ○ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ـــــ 14/10-9

کیا تمہاری طرف ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں' قوم نوحؑ' قوم عاد اور قوم ثمود کی اور ان لوگوں کی جو ان کے بعد ہوئے کہ انہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ان جملہ اقوام کی طرف الگ الگ ان کے رسول کھلے آئین لے کر آئے لیکن ہوا یہ کہ ان اقوام نے اپنے ہاتھ منہ میں ٹھونس لیے اور کہا کہ جس۔ (ضابطہ وحدت و ربوبیت) کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اسے ہم نہیں مانتے اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہم اس کے متعلق شک میں ہیں ان کے رسولوں نے کہا کیا تم آسمان اور زمین کو پیدا کرنے والے اللہ کے متعلق شک میں ہو جو تمہیں اس لئے اپنی طرف بلاتا ہے کہ تمہارے گناہ معاف کر دے اور تاکہ وہ تمہیں ایک مقررہ وقت تک مہلت دے انہوں نے کہا کہ (یہ سب کچھ صحیح ہے) مگر نہیں ہو تم مگر ہمارے جیسے بشر ہو (اس لیے تم نبی رسولؑ نہیں ہو سکتے) ہم نے آباؤ اجداد سے کسی بشر کا نبی رسول ہونا سنا ہی نہیں۔

سب کے سب نبی رسول صرف بشر رسول تھے منکرین انبیاء کے اس عقیدے کو کہ نبی رسولؑ بشر نہیں ہو سکتے باری تعالیٰ نے خود انبیاء ہی کے جواب کے ساتھ باطل کر دیا ہے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ 14/11

ہر قوم کے رسولوں نے اپنے اپنے وقت پر اپنی اپنی قوم کو یہ جواب دیا کہ بلاشبہ نہیں ہم مگر صرف تمہارے جیسے بشر ہی ہیں۔ لیکن اللہ اپنے بندوں ہی میں سے جس پر چاہتا ہے اپنی مشیت کے مطابق ہی احسان کرتا ہے (اسے نبوت عطا کر دیتا ہے)۔

دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں الفاظ بشر اور عباد کے تکرار کے ساتھ جملہ انبیاءؑ کا خود اپنا اعلان عام درج فرما دیا ہے' جس میں سب کے سب نے خود اقرار فرمایا ہے کہ ہم سب کے سب تمہارے جیسے بندے ہیں بشر ہیں۔ مافوق البشر ہرگز نہیں ہیں

افسوس ہے کہ بعض مفسرین کرام نے عدم بشریت انبیاء کا عقیدہ منکرین انبیاء سے حاصل کیا اور جملہ انبیاء کرام کے متفقہ مشترکہ اعلان عام کو پس پشت پھینک دیا ہے جو انہوں نے فرمایا کہ ہم بشر بھی ہیں اور رسول بھی سابقہ منکر اقوام بھی اپنے اپنے رسولوں کی ان دو باتوں میں سے ایک بات پر ایمان لائے اور دوسری کا انکار کر دیا یعنی انہیں بشر مانا اور رسول نہ مانا۔

اور اسی طرح اہل اسلام کے ایک عظیم گروہ نے بھی نبی اکرمؐ کی دو باتوں انما انا بشر مثلکم یوحی الی 18/110 + 41/6 کہ میں تمہارے جیسا بشر بھی ہوں اور رسول بھی ہوں میری طرف وحی ہوتی ہے۔ کہ آپ بشر نہیں ہیں العیاذ باللہ۔!

انبیاء کا بشر ہونا ہی ان کے لئے وجہ فضیلت ہے۔ واضح رہے کہ انبیاءؑ کو بشر ماننا ہی ان کی فضیلت شان ہے۔ جیسے کہ یوسفؑ کو جب ایک عورت بد کاری کے ارادے سے پچھلی کوٹھری میں لے گئی تو آپ کا بشر اور کامل مرد ہوتے ہوئے پاک صاف بچ کر نکل آنا ہی وجہ فضیلت ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ بشر نہیں تھے یعنی ان میں بشری جنسی خواہش موجود ہی نہیں تھی تو آپ کا اس عورت کے چنگل سے بچ کر نکل آنا کوئی خوبی قرار نہیں دی جا سکتی اسی طرح جملہ انبیاؑ میں جو الگ الگ خوبیاں پائی گئی تھیں اگر وہ بشر تھے ہی نہیں اور ان میں نفس امارہ اور دیگر بشری عوارض موجود ہی نہیں تھے تو ان کا برے اعمال سے صد فیصد محفوظ رہنا ہرگز فضیلت کا موجب نہیں ہو سکتا وجہ فضیلت ان کا بشر ہونا ہی ہے کہ یوسفؑ نے باوجود اس کے کہ آپ ایک کامل نوجوان جنسی جذبات اور نفس امارہ کے جملہ عوارض سے صد فیصد معمور تھے مگر نفس امارہ اور تلاطم خیز جنسی جذبات پر قابو پایا اور برائی کی دعوت دینے والی جنسی جذبات میں اندھی ہوئی عورت کے آگے آگے بھاگ کے پیچھے کی طرف سے قمیض پھڑوالی۔ ان کی یہ چاک دامانی آج تک ان کی پاک دامانی کی شہادت دیتی چلی آرہی ہے۔

طوفان نوح پورے کرہ ارض پر نہیں آیا تھا۔ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ طوفان نوحؑ پورے کرہ ارض پر آیا تھا اور اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نوحؑ نے حضور الٰہی میں عرض کیا تھا۔ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ 71/26 اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ نوح نے عرض کی تھی کہ اے میرے رب تو پورے کرہ ارض پر کافروں کی کوئی بستی باقی نہ چھوڑ۔ حالانکہ یہاں الارض کے الف لام عہدی ذکری کی بدولت ارض کا وہ خطہ مراد ہے جس میں اس قوم کی بستیاں آباد تھیں جس کی طرف نوح مبعوث کیے گئے تھے۔ الارض کے مفہوم کی ایسی مثال ان فرعون علا فی الارض 28/3 میں موجود ہے یہاں الارض سے مراد وہ خطہ زمین ہے جس میں فرعون کی حکومت موجود تھی اور اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ فرعون نے ساری زمین پر سرکشی اختیار کر رکھی تھی بلکہ اس کی سرکشی کی حدود الارض کے اس حصے تک محدود تھیں جس پر وہ حکمران تھا پس یہ سطح مرتفع کا وہ نشیبی خطہ ارض تھا جس میں قوم نوح آباد تھی جس نے نوحؑ کی نافرمانی کی اس قوم کے لیے آپ نے حضور الٰہی میں عرض کیا چنانچہ اس نشیبی وادی میں اسی قوم پر طوفان آیا پوری زمین پر نہیں۔

طوفان نوحؑ کے سب اسباب مادی تھے۔ واضح رہے کہ سطح مرتفع میں جگہ بہ جگہ چشمے پھوٹے ہوئے

ہوتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں طوفان نوح کے اسباب کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَمِرٍ وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ○ 54/12-11 پس ہم نے موسلا دھار بارش کے ساتھ آسمان کے دروازے کھول دیئے۔ اس طرح اوپر اور نیچے کا پانی اس کام کے لیے باہم مل گیا جس کا اندازہ' پیانہ اور قانون مقرر کر دیا گیا تھا۔

پس آیت بالا کے مطابق آسمان سے موسلا دھار بارش اور زمینی چشموں کے پانی کے مادی ذرائع ہی کے ساتھ طوفان لایا گیا۔ کسی غیر مادی ذریعہ سے نہیں لایا گیا تھا مفسرین کرام کا کہنا ہے کہ روٹی پکانے کے تنور سے معجزاتی طور پر پانی پھوٹ نکلا تھا۔ حالانکہ فار التنور 11/40 + 23/37 کے الفاظ (عیونا") کے متبادل آئے ہیں۔ یعنی چشمہ ہی کو تنور کہا گیا ہے تنور کا مطلق معنیٰ ہے۔ گڑھا' چشمہ بھی ایک گڑھا ہوتا ہے۔ جب آسمان سے بے پناہ پانی برسا تو روٹیاں پکانے کے تنور بھی پانی سے بھر گئے۔

کشتی نوحؑ میں ہر نوع کے جوڑے سوار کرنے کا تصور

مفسرین کرام کا دیا ہوا تصور یہ ہے کہ کشتی نوحؑ میں بحکم باری سانپ' بچھو' کرلی' گوہ مکھی مچھر سمیت ہر نوع کے جوڑے سوار کئے گئے تھے جو غلط ہے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے۔ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ 11/40 + 23/37اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو کہا کہ ہر ضروری نوع کے دو دو جوڑے سوار کر لیں یہ اس لیے کہ اس نشیبی وادی میں عظیم طوفان کی بدولت کوئی جانور زندہ بچنے والا نہ تھا۔ اس لیے پانی کے اترنے کے بعد جب دو بارہ زندگی شروع کی جائے تو وہ انواع جو انسانی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ گائے' بھینس' بھیڑ' بکری' گھوڑا' گدھا وغیرہ کی نسل کشی کی جا سکے۔ اس کے سوا موذی جانوروں' شیر چیتا' بھیڑیا وغیرہ اور حشرات للارض کیڑوں مکوڑوں کی نہ انسانی زندگی کو کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی انہیں محفوظ کرنے کے حکم دیا گیا تھا۔ مفسرین کرام کو کل زوجین اثنین میں کل کے لفظ سے دھوکا لگا ہے حالانکہ کل کا لفظ موقع محل کے مطابق ضروری اشیاء کا حامل ہوتا ہے غیر ضروری اشیا' اس کے دائرہ سے ازخود خارج ہو جاتی ہیں جیسے کہ ملکہ "سبا" کے متعلق ہدہد نے سلیمان کو خبر دی۔

إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ 27/23 میں نے بے شک ایک عورت کو دیکھا جو عوام کی حاکم ہے اور اسے ہر چیز دی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہاں کل شی کا مطلق معنی ضروریات سلطنت کے دائرہ میں محدود ہے اس کے علاوہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اس کے پاس موجود نہیں تھی۔

نوحؑ کی بسائی ہوئی متوازن بستیاں۔ نوحؑ جن بستیوں کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے اوپر بتایا جاچکا ہے کہ ان کے باشندے اعلیٰ و ادنیٰ کی ناہموار تقسیم میں منقسم تھے چنانچہ جب نوحؑ نے ہموار ضابطہ حیات پیش کیا تو مفلوک الحال لوگ آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ مگر بڑے بڑے سرداروں نے مطلقاً" انکار کر دیا جس کی بدولت انہیں نوحؑ کے کافر بیٹے سمیت طوفان میں غرق کرنے کے بعد حکم دیا گیا۔

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ 11/44 اور اللہ کے قانون کی زبان

سے کہا گیا اے زمین قانون باری تعالیٰ کے مطابق پانی کو نگل جا اور اے آسمان تھم جا اور پانی جذب ہو گیا۔ قانون قدرت ہی یہی ہے بارش کا بے پناہ پانی بارش کے تھم جانے کے بعد زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور زمین خشک ہو جاتی ہے آپ کی کشتی جودی پہاڑ پر جا رکی تھی نوحؑ اپنے ساتھیوں سمیت زمین پر تشریف لائے۔ پرانی بستیاں سب بہہ کر ختم ہو چکی تھیں اس لئے نوحؑ نے نئی قرآنی بستی بسائی۔ اس کا اندازہ توازن بدوش تھا یا عدم توازن کا مرقع؟ کیا آپ نے اپنے بھائیوں' بھتیجوں' سالوں ہم زلفوں کو جو آپ پر ایمان لائے تھے زمین کے بڑے بڑے پلاٹ الاٹ کر دیئے تھے اور ان ایمان لانے والوں کو جن سے آپ کا کوئی تعلق نہیں تھا انہیں کوئی زمین نہیں دی گئی تھی تاکہ نوحؑ کے رشتہ داروں کے کرایہ دار بننے پر مجبور ہوں۔ آپ نے ہرگز ہرگز ایسا نہیں کیا تھا۔ کیونکہ انبیاء کرام کا دائمی مشن ہی یہ تھا کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے تھے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز نہ ہو اور ہر کسی کو اس کی ضروریات زندگی متوازن انداز میں آخری دم تک بدستور ملتی رہیں۔

اگلی آیت مجیدہ نمبر 74 میں ارشاد ہوا ہے کہ پھر ہم نے نوحؑ کے بعد بہت سے رسولؑ الگ الگ ان قوموں کی طرف بھیجے جو واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے مگر وہ لوگ ایمان نہ لائے۔

(۷۴)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ؀

پھر اس (نوحؑ) کے بعد ہم نے الگ الگ قوموں کی طرف اپنے رسولؑ بھیجے وہ ہمارے رسولؑ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے مگر وہ نہ ہوئے کہ اس (کتاب اللہ) پر ایمان لاتے جسے وہ پہلے جھٹلا چکے تھے' اس طرح ان کے جھٹلانے کی بدولت جو لوگ ہماری حدوں کو توڑتے ہیں ہم ان کے ذہنوں پر (عدم تفقہ) کی مہریں لگی ہوئی پاتے ہیں۔

نطبع علی قلوب المعتدین کا لفظی ترجمہ مفسرین کرام نے یہ لیا ہے کہ۔ ہم (اللہ تعالیٰ) حدیں پھاندنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ تاکہ وہ راہ راست کی طرف نہ آسکیں۔ لیکن واضح رہے کہ اگر مہر لگانے کے عمل کا فاعل اللہ تعالیٰ کو ٹھہرایا جائے تو یہ مفہوم بنتا ہے کہ جب نافرمان لوگ اللہ تعالیٰ کی حدیں پھاندتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی اس سرکشی کی بدولت ان کے اذہان پر مہر لگا دیتے ہیں مگر جیسے کہ عام تصور یہ ہے کہ جن لوگوں کے قلوب پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دے وہ کبھی بھی ہدایت نہیں پاسکتے۔ کبھی راہ راست پر نہیں آسکتے اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو حدیں پھاندنے والے نافرمانوں سرکشوں کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ اور بخشش خاصہ کے صد فیصد خلاف ہے اور معاذ اللہ معاذ اللہ' اللہ تعالیٰ ظالم ٹھہرتا اور سرکش لوگ بری ہو جاتے ہیں حالانکہ۔ ارشاد باری ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّ

نُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ○ وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ 39/54,53

(مفہوم) اے رسول کہہ دیجئے گا کہ (ارشاد باری ہے کہ میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے بے امید نہ ہو جاؤ' بے شک اللہ تعالیٰ سب قصور معاف کر دیتا ہے بلاشبہ وہی معاف کرنے والا ہے' مہربان ہے۔ اور (سرکشی و نافرمانی کرنے کے بعد) اس وقت سے پہلے پہلے اس کی طرف رجوع کر کے اس کے فرمانبردار ہو جاؤ کہ جب تم پر عذاب آجائے پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہے | ان آیات مجیدہ سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کے بعد اس نافرمانی کا عذاب آنے سے پہلے پہلے توبہ کر کے اللہ کا فرمانبردار بن جانے کی مہلت دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہو جانا بھی رب تعالیٰ کی عظیم نافرمانی ہے اللہ تعالیٰ کسی کے ذہن پر کفر کی مہر لگا کر اس کے لیے توبہ کا دروازہ ہرگز ہرگز بند نہیں کرتا۔

توبہ کا دروازہ کب بند ہوتا ہے؟ ارشاد باری ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ط 4/18 اور ان لوگوں کے لیے توبہ کا کوئی موقعہ نہیں جو برائیاں کرتے رہیں حتیٰ کہ ان میں سے کسی پر موت کا وقت آجائے اور وہ کہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور ان کے لئے بھی توبہ نہیں جو کفر ہی کی حالت میں مرجائیں۔

موت کے وقت کی توبہ اس لیے مردود قرار دی گئی ہے کہ توبہ اور اصلاح' رجعت اور اطاعت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ توبہ کی تصدیق یہ ہے کہ اس کے بعد آخری دم تک برے اعمال سے اجتناب کیا جائے۔ لیکن موت کے وقت پر توبہ کرنے سے برے اعمال سے اجتناب کا عملی ثبوت پیش کرنے کا موقعہ باقی نہیں رہتا اس لیے آخری وقت کی توبہ نا مقبول ہے فرعون جب غرق ہونے لگا اور موت کا وقت سامنے آگیا تو اس نے کہا۔

حَتَّىٰ إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○ 10/90 "جب وہ غرق ہونے لگا تو کہا کہ میں ایمان لایا' یہ کہ اس کی ذات کے سوا کوئی فرمانبرداری کے قابل نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں" واضح رہے۔

کہ فرعون کا امنت کا تعلق صرف زبان کے ساتھ تھا۔ مگر من المسلمین کا تعلق زبانی توبہ کے بعد اعمال کے ساتھ تھا۔ عملاً" فرمانبردار بن کر دکھانا تھا لیکن چونکہ موت کا حملہ ہو چکا تھا اور عملی فرمانبرداری کا وقت گزر چکا تھا' اس لیے ذات باری نے اپنے نمائندہ موسیٰؑ کے ذریعے جواب دیا۔

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ 10/91 اب ایمان لاتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے تو نے نافرمانی کی' اور تو فسادیوں میں سے تھا۔ فرعون کی توبہ اس وقت مقبول ہو سکتی تھی جب اس کے پاس اتنا وقت موجود تھا کہ نافر

مانیوں کو فرمانبرداریوں میں تبدیل کر کے دکھاتا اور ناہموار معاشرہ کے فساد کو ہمواریت کے امن کے ساتھ بدل کر فسادی کی بجائے امن دینے والا ثابت ہوتا۔

رجوع الی المطلب توبہ کی قرآنی تفسیر میں ہم دور نکل گئے ہیں اس لئے اپنے اصل عنوان کی طرف لوٹتے ہوئے عرض خدمت یہ ہے کہ نطبع علی قلوب المعتدین کے الفاظ سے یہ مفہوم اخذ کرنا مطلقاً" غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نافرمانوں کے اذہان پر مہریں لگا دیتا ہے کہ وہ کبھی راہ ہدایت پر نہ آئیں بلکہ یہ کہ رب تعالیٰ کے مستقل قانون کے مطابق اس وقت تک توبہ مقبول ہو سکتی ہے جب تک کہ توبہ کرنے والا توبہ کی' اصلاح اعمال کے ساتھ عملاً" تصدیق کر کے دکھا دے اللہ تعالیٰ کی طرف نافرمانوں کے ذہنوں پر مہریں لگا کر توبہ کا دروازہ بند کرنے کا تصور چونکہ رب تعالیٰ کی شان تولہا" رحیما کے خلاف ہے اس لیے ہم نے - نطبع علی قلوب المعتدین کا معنیٰ یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو لوگ ہماری حدیں پھاندتے ہیں ہم ان کے اذہان پر عدم تفقہ کی مہریں لگی ہوئی پاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے ذہنوں پر عدم تفقہ کی مہریں خود لگا لیتے ہیں اللہ نہیں لگاتا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نطبع کا لفظی معنی یہ ہے کہ ہم (اللہ) مہریں لگاتے ہیں تو اس کا یہ مفہوم کس طرح لیا جا سکتا ہے کہ ہم مہریں لگی ہوئی پاتے ہیں؟

اہل قواعد پر بھی حکم قرآن کریم ہی ہے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اہل قواعد کی بھی غلطیاں نکالتا ہے مثلاً" اہل قواعد کے ہاں مزید فیہ کے بعض ابواب کا خاصہ وجدان تو مانا گیا ہے' ثلاثی مجرد کا مطلقاً" نہیں مانا گیا۔ مگر قرآن مجید ثلاثی مجرد کے ابواب کا بھی خاصہ وجدان بتاتا ہے جیسے کہ سورہ یٰسین کی آیت ذیل نے کھل کر فیصلہ کر دیا ہے کہ ابواب ثلاثی مجرد میں خاصہ وجدان موجود ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ○ 36/9 اس آیت کا ترجمہ خاصہ وجدان کے بغیر یہ لیا گیا ہے۔

اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دیوار کھینچ دی ہے پھر ہم نے انہیں اوپر سے ڈھانپ دیا پھر وہ دیکھتے نہیں۔

اب ظاہر ہے یہ ترجمہ جو باب ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان تسلیم کئے بغیر کیا گیا ہے اگر ٹھیک ہے تو جن لوگوں کے آگے بھی اللہ نے دیوار کھینچ دی ہے اور ان کے پیچھے بھی خود اللہ نے دیوار کھینچ دی ہے اور انہیں خود اسی نے اوپر سے ڈھانپ دیا ہے وہ دیکھیں گے خاک؟ اس ترجمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ ظالم ٹھہرتا ہے جو خود ہی دیکھنے کے تمام ذرائع ختم کر دیتا ہے اس لئے زیر بحث آیت مجیدہ 36/9 کا صحیح مفہوم ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کے مطابق جس کی رو سے نہ اللہ تعالیٰ ظالم ٹھہرتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی حدیں پھاندنے والے بری ہو جاتے ہیں یہ ہے۔

اور ہم نے ان کے آگے بھی عدم تفقہ کی دیوار کھچی ہوئی پائی ہے اور ان کے پیچھے بھی اور ہم نے انہیں عدم تفقہ یعنی عدم غور و فکر کے پردوں میں ڈھنپا ہوا پایا ہے اس لیے وہ نہیں دیکھتے"

پس اسی طرح باب ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کی رو سے سورہ یونس کی آیت مجیدہ 10/74 کا یہ معنی صحیح ہے کہ:۔۔۔

"جو لوگ بلا سوچے سمجھے ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ہماری حدوں کو پھاندتے ہیں ہم ان کے ذہنوں پر عدم تفقہ (عدم غوروفکر) کی مہریں لگی ہوئی پاتے ہیں" یعنی ان کے اذہان پر اللہ مہریں نہیں لگاتا بلکہ وہ خود لگا لیتے ہیں جنہیں وہ خود ہی توڑ کر یعنی توبہ اور اصلاح کرکے راہ راست پر آسکتے ہیں' ان کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے اللہ تعالیٰ ظالم نہیں کہ مجرموں کے قلوب پر نہ ٹوٹنے والی مہریں جڑ دے اور **تواب و رحیم** ہوتے ہوئے خود ہی ان کے لیے ہمیشہ کے لئے توبہ کا دروازہ بند کر دے۔ العیاذ باللہ۔

عدم تفقہ کا تصور کہاں سے لیا گیا ہے؟ اب اس سلسلے کا آخری سوال یہ ہے کہ آیت ۱۰/۷۵ کے ترجمہ میں عدم تفقہ کے الفاظ کہاں سے لائے گئے ہیں جب کہ عربی متن میں ایسے الفاظ ہرگز موجود نہیں ہیں جن کا معنی عدم تدبر یا عدم تفقہ لیا جاسکے۔

اس سوال کا جواب خود قرآن کریم نے اپنے مستقل اسلوب بیان تصریف آیات کے ذریعہ ۷/۱۷۹ میں ان لوگوں کے متعلق ذیل کا اعلان کرکے دیدیا ہے جو عدم تفقہ کی بدولت خود گمراہ ہو جاتے ہیں نہ اللہ ان کے ذہنوں پر مہریں لگاتا ہے نہ گمراہ کرتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۷/۱۷۹

ان کے پاس قلوب و اذہان ہیں وہ ان کے ساتھ تفقہ نہیں کرتے ان کے پاس آنکھیں ہیں وہ ان کے ساتھ دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں وہ ان کے ساتھ سنتے نہیں' وہ ڈنگروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے عدم تفقہ کی بدولت وہ گمراہ ہو جاتے ہیں خود۔

دیکھا آپ نے؟ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا کے الفاظ نے کھل کر وضاحت کر دی ہے کہ ان کے قلوب پر اللہ نے مہر نہیں لگائی بلکہ ان کے اذہان میں تفقہ و تدبر یعنی غوروفکر کی صلاحیت موجود ہے اور اس صلاحیت کے موجود ہوتے ہوئے وہ خود عدم تفقہ کی بدولت گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو گمراہ کرتا ہے اور نہ کسی کی غوروفکر کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے بلکہ ارشادات باری تعالیٰ یہ ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا" ۷۳/۱۹ + ۷۶/۲۹ یہ قرآن ایک نصیحت نامہ ہے جو کوئی خود چاہے اپنے رب کی طرف خود سیدھا راستہ اختیار کرے اور جو خود چاہے اپنے رب کی راہ چھوڑ کر گمراہ ہو جائے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا" ۷۶/۳ بلاشبہ ہم نے سیدھی راہ کی طرف راہنمائی فرمادی ہے خواہ (خود سیدھی راہ اختیار کرکے) شکرگزاری کرے اور خواہ خود (بے راہ رو ہوکر) کفر کرے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۱۰/۴۵ بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

پس آیات بالا کے مطابق لوگ اذہان اور ان میں غوروفکر کی صلاحیت موجود ہوتے ہوئے خود تفقہ نہیں کرتے اللہ ان

کے قلوب پر مہریں نہیں لگاتا بلکہ وہ خود لگا لیتے ہیں۔

نگاہ بازگشت

ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے نوحؑ کے بعد الگ الگ قوموں کی طرف اپنے رسول بھیجے۔ وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے۔ مگر وہ قومیں اس قابل نہ ہوئیں کہ ضابطہ الٰہی پر ایمان لائیں' جسے وہ پہلے جھٹلا چکی تھیں۔ پھر اسے جھٹلانے کی بدولت جو لوگ ہماری حدوں کو پھاندتے ہیں ہم ان کے ذہنوں پر عدم تفقہ کی مہریں لگی ہوئی پاتے ہیں۔ عام تصور یہ ہے کہ باری تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں پر کفر کی مہریں لگا دیتا ہے۔ اس لیے وہ بھی راہ راست پر نہیں آسکتے۔ یہ نظریہ مطلقاً" غلط ہے۔ بلکہ صحیح قرآنی نظریہ یہ ہے کہ لوگ ضابطہ الٰہی پر خود ہی تفقہ نہیں کرتے۔ یعنی اپنے ذہنوں پر خود ہی عدم تفقہ کی مہریں لگا لیتے ہیں۔ اس لیے چونکہ وہ خود غور ہی نہیں کرتے اس لیے خود ہی راہ راست پر نہیں آتے۔

نوحؑ کے بعد والی قوموں قوم عاد اور ثمود وغیرہ کی بے فرمانی کا سرسری تذکرہ' ان کے نام لیے بغیر کرنے کے بعد اگلی آیت نمبر 75 سے موسیٰؑ اور ہارونؑ کا ذکر اور بنی اسرائیل کی فرعون کے ظلم سے نجات کا تذکرہ بالفاظ ذیل شروع ہوا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵

(75) پھر ہم نے اس کے بعد موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ مگر انہوں نے تکبر کیا حقیقت یہ ہے کہ وہ مجرموں کی قوم تھی (اس نے بنی اسرائیل کے حقوق ربوبیت غصب کر لیے تھے)

اس آیت مجیدہ میں بھی فرعون اور اس کے سرداروں کے متعلق یہی وضاحت کی گئی ہے کہ وہ خود مجرم تھے انہوں نے خود ہی سرکشی اور بغاوت کی راہ اختیار کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اذہان پر کفر و سرکشی کی مہریں نہیں لگائی تھیں۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ نمبر 76 میں بتایا گیا ہے کہ جب ان کے پاس ہمارا سچا ضابطہ آیا تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا جھوٹ ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶

(76) پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے سچا ضابطہ حیات آیا تو انہوں نے کہا۔ بلاشبہ یہ کھلا جھوٹ ہے (جس میں سب کو برابر کر دیا گیا ہے۔)

فرعونیوں کے لئے' جو ملک مصر کے قدیمی باشندے تھے۔غیر ملکی بنی اسرئیل' یعنی شامیوں کو اپنے برابر شہری حقوق دینا نامقبول تھا۔ ان کے اذہان میں وطن کا بت بھی موجود تھا۔

لفظ سحر کا معنیٰ جادو نہیں بلکہ جھوٹ ہے' جیسے کہ اس لفظ کا لغوی معنی مفردات القرآن امام راغب نشر کردہ اہل حدیث اکاڈمی کشمیری بازار لاہور صفحہ 461 کے مطابق ہے دھوکا' بے حقیقت تخیلات' جو سراپا جھوٹ ہوتے ہیں' سحر کا معنی جھوٹ

تقابل ضدین کے ذریعہ خود باری تعالیٰ نے اگلی آیت مجیدہ میں بتا دیا ہے۔

(77)

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۞

موسیٰؑ نے کہا کیا تم حق کو (یعنی سچ کو) جھوٹ کہتے ہو کیا یہ (سحر ہے) جھوٹ ہے جب وہ تمہارے پاس آچکا ہے حقیقت یہ ہے کہ (ساحر) جھوٹے کبھی فلاح نہیں پاتے (کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

اس پر انہوں نے کہا۔

(78)

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۞

انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے ہٹا دے جس پر ہم نے باپ دادوں کو پایا ہے اور تم دونوں کے لئے ملک میں بڑائی ہو (ملک میں تمہاری حکومت قائم ہو جائے) اور تم دونوں پر ہم ایمان لانے والے نہیں۔

چونکہ اوپر تقابل ضدین کے ذریعے خود قرآن حکیم سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ سحر حق کی ضد یعنی جھوٹ ہے' اس لیے ساحر کا معنی ہوا جھوٹا۔ جھوٹی باتیں گھڑنے والا۔ اور ساحرین کا معنی ہوا جھوٹے۔ جھوٹی باتیں گھڑنے والے۔ اگلی آیت مجیدہ میں ہے۔ فرعون نے حکم دیا کہ تمام ساحر علماء (جھوٹی باتیں گھڑنے والے علماء) کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ وہ حاضر کئے گئے۔ موسیٰؑ نے انہیں کہا۔ کہ لاؤ تم کیا پیش کرتے ہو تو انہوں نے وہ خود تراشیدہ جھوٹ پیش کیا۔ جس کی رو سے بنی اسرائیل کے حقوق ربوبیت سلطنت مصر میں قانوناً" غصب کر دیئے گئے تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس چیز کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے گا۔

فرعون نے بنی اسرائیل کے حقوق ربوبیت سمیت ان کے ادنیٰ شہری حقوق تک اس لیے غصب کر رکھے تھے۔ کہ وہ غیر ملکی تھے یوسفؑ کے زمانہ اقتدار میں کنعان' شام سے مصر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ فرعون نے ملکی اور غیر ملکی کی شیطانی تقسیم ایجاد کر کے ان کا فریضہ صرف بیگار مقرر کر رکھا تھا اور اجرت صرف اتنی دی جاتی تھی جس سے وہ فرعونیوں کی کل کی بیگار کے لیے زندہ رہ سکیں۔ اس ملکی اور غیر ملکی کی تقسیم کو ملکی قانون میں شامل کرنے کے لئے فرعون نے ایسے علماء کی خدمات حاصل کی تھیں جو جھوٹ تراشنے میں ماہر تھے۔ قرآن کریم نے انہیں ساحرین کہا ہے۔ یہ نظریہ یکسر غلط ہے کہ صرف ملک کے قدیمی باشندوں کو شہری حقوق سے نوازا جائے اور نئے وفادار باشندوں کو شہری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ موسیٰؑ کا فرعون سے اختلاف ہی یہی تھا اور آپ کا مطالبہ ہی یہ تھا' کہ بنی اسرائیل کو مصریوں کے ساتھ مساوی حقوق ربوبیت دیئے جائیں ورنہ انہیں پر امن ہجرت کی اجازت دی جائے چنانچہ موسیٰؑ کا اولین مطالبہ ہی یہ تھا جو آپؑ نے فرعون سے کہا:۔ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ قَدْ

جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۱۰۴-۱۰۵/۷

موسیٰؑ نے کہا اے فرعون بلاشبہ میں رب العالمین کا بھیجا ہوا ہوں۔ اس پر قائم ہوں کہ اللہ کی طرف حق کے سوا کچھ منسوب نہ کروں۔ بے شک میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلائل لے کر آیا ہوں۔ (کہ ربوبیت کا حق ہر فرد بشر کا مساوی ہے اگر تو) بنی اسرائیل کو ان کا حق ربوبیت نہیں دیتا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے یعنی انہیں پر امن ہجرت کی اجازت دیدے (تاکہ وہ کسی اور جگہ اپنا حق ربوبیت حاصل کر لیں)۔

اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے الفاظ میں پورے عالمین کا حق ربوبیت محفوظ ہے مگر فرعون بنی اسرائیل کے غیر ملکی ہونے کی بدولت انہیں قدیمی باشندوں کے برابر حق دینے کو تیار نہ تھا اس لئے اس نے اپنے ساحروں' جھوٹ تراش علماء کو بلایا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾

(۷۹) اور فرعون نے (اپنی کابینہ سے) کہا کہ تمام جادو بیان علماء کو میرے پاس لاؤ۔

جب وہ ساحرین فرعون جھوٹ تراشنے والے علماء حاضر ہوئے' جنہوں نے اپنے فتووں کے ساتھ بنی اسرائیل کو محروم ربوبیت کر رکھا تھا۔ تو:

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾

(۸۰) پھر جب وہ جھوٹے علماء (جھوٹ تراش) آئے تو موسیٰؑ نے انہیں کہا کہ پیش کرو وہ (دلائل) جو تم پیش کرتے ہو۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

(۸۱) پھر جب انہوں نے اپنے (باطل دلائل) پیش کئے تو موسیٰؑ نے کہا تم جو جھوٹ لائے ہو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ فسادیوں کے عمل کو صالح نہیں ٹھہراتا۔ اور وہ اپنے قوانین کے مطابق سچ کو سچ کر دکھائے گا اور اگرچہ مجرم اسے برا ہی منائیں (حقوق ربوبیت غصب کرنا کھلا فساد ہے)

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾

(۸۲) اور وہ اپنے قوانین کے مطابق سچ کو سچ کر دکھائے گا اور اگرچہ مجرم اسے برا ہی منائیں (حقوق ربوبیت غصب کرنا کھلا فساد ہے۔

سورہ اعراف' طہٰ' شعراء' نمل اور قصص میں ساحرین فرعون کے بودے دلائل کو' جو انہوں نے بنی اسرائیل کے حقوق ربوبیت کے غصب کے حق میں دیئے' رسیوں اور سوٹیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ۲۰/۶۷ میں بتایا گیا ہے کہ موسیٰؑ نے خیال کیا کہ ان میں جان ہے وزن ہے یہ ساحرین فرعون کی سحربیانی تھی ان کے جواب میں آپ نے جو رب العالمین کی ربوبیت عالمینی کی جاندار' انتہائی وزن دار دلیل پیش کی' اس کے متعلق ارشاد ہوا ہے **تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا** ۲۰/۶۹ وہ اسے

نگل گئی جو انہوں نے تصنع کیا تھا۔ قرآن مجید میں السید موسیٰؑ کی ربوبیت عالمینی کی دلیل قاطعہ کو عصا بھی کہا ہے اور اسے اژدہا کے ساتھ تشبیہ بھی دی گئی ہے۔ اور سورہ نمل اور قصص میں دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ کاف حرف تشبیہ کے ساتھ وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ عصا سانپ نہیں بن گیا تھا' بلکہ اس میں سانپ جیسی صفت آموجود ہوئی تھی کہ اگر پر سکون مجمع میں سانپ چھوڑ دیا جائے تو ہلچل مچ جاتی ہے اسی طرح جب موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے حقوق ربوبیت کی دلیل قاطعہ الحمد للہ رب العالمین پیش کی تو فرعونی معاشرہ میں جہاں خود بنی اسرائیل بھی اپنے حقوق (غصب شدہ) پر مطمئن تھے اور سمجھتے تھے کہ مصریں ہمارا یہی حق ہے کہ ہم فرعونیوں کی بیگاریں کریں اور ان کا بچا کھچا کھانا کھائیں نیز فرعونی اس چیز پر نہایت فخر کے ساتھ مطمئن تھے کہ بنی اسرائیل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے بے دام خدمت گار بنے رہیں گے۔ مگر جب السید موسیٰ نے ربوبیت عالمینی کا مساوی الہٰی قانون (عصاء) پیش کیا تو بنی اسرائیل نے مساوی حقوق ربوبیت کا مطالبہ کر دیا اور معاشرہ میں ہلچل مچ گئی۔

عصا کا معنی قانون بھی ہے اور ڈنڈا بھی اور مشہور یہ ہے کہ ڈنڈا سانپ بن گیا تھا مگر سورہ قصص 28/31 میں دو مرتبہ تکرار کے ساتھ کہا گیا ہے کہ سانپ نہیں بن گیا تھا بلکہ اسے سانپ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ 27/10 + 28/31 اور تو اپنا عصا' قانون ربوبیت عامہ پیش کر۔ جب پیش کیا گیا تو اسے دیکھا تو وہ حرکت کرتا تھا۔ گویا کہ وہ سانپ تھا۔

اہل علم سے مخفی نہیں کہ كَاَنَّهَا میں کاف حرف تشبیہ آیا ہے' جس سے ثابت ہے اس میں سانپ جیسی ہلچل مچا دینے والی صفت تھی۔ فی الحقیقت نہ وہ سوٹا تھا۔ اور نہ ہی سانپ بن گیا تھا۔ بلکہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے حقوق ربوبیت دلانے والا انقلابی قانون ربوبیت تھا۔ جس نے فرعونی معاشرہ میں ہلچل پیدا کر دی۔ جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون کی حکومت ختم ہو گئی اور اس کے وارث وہی بنی اسرائیل ہوئے جنہیں فرعون نے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنا رکھا تھا۔ چنانچہ وہ فرعون سے اس قدر خائف تھے کہ جب موسیٰؑ نے انہی کی آزادی کے لیے آواز بلند کی' تو بنی اسرائیل کے صرف نوجوان آپ پر ایمان لائے' بڑے بوڑھوں پر فرعون کا خوف اس قدر غالب تھا کہ انہیں اس چیز پر یقین ہی نہ آیا۔ کہ انہیں بھی فرعونیوں کے برابر کے حقوق کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے۔

(83)

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر مگر صرف اس کی قوم کے نوجوان ایمان لائے' فرعون اور ان کے سرداروں کے خوف کے باوجود کہ وہ ان پر زیادتی کریں گے حقیقت یہ ہے کہ فرعون سرزمین مصر میں یقیناً" سرکش (اور ظالم) تھا۔ اور بلاشبہ وہ زیادتی کرنے والوں سے تھا۔

(84)

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝

اور موسیٰؑ نے کہا اے میری قوم اگر تم واقعی اللہ پر ایمان لائے ہو تو اس پر بھروسہ کرو۔ اگر تم اس کے فرمانبردار ہو تو (وہ ضرور

ضرور تمہیں فرعون کے ظلم سے نجات عطا فرمائے گا)

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾

(۸۵) پس انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب تو ہمیں ظالم قوم کے ظلم کا تختہ مشق نہ بنا رہنے دیجیو۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

(۸۶) اور ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ متوازن ضابطہ حیات کی منکر قوم سے نجات دلائیو (یعنی ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس کے لیے مقدور بھر کوشش کریں گے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

(۸۷) اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو وحی فرمائی کہ تم اپنی قوم کے لیے شہر میں گھر بنا لو (اپنی ایک الگ بستی بساؤ) اور اپنے گھروں کو آمنے سامنے تعمیر کرو۔ اور اجتماعی نظام قائم کرو (جو صلوۃ موقت سے شروع ہوتا ہے) او اس حکم کے ماننے والوں کو خوش خبری دیدو۔

اس آیت مجیدہ میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کو حکم دیا گیا ہے کہ:۔

مظلوم قوم بنی اسرائیل جو مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہے اور فرعونیوں کے مظالم کا تختہ مشق بنی ہوئی ہے' اسے ایک الگ بستی میں اکٹھا کر کے جمع کر لیں۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا اجتماعی نظام قائم کریں تاکہ فرعون اور اس کی ظالم قوم کے مظالم کے سامنے تمہارا اجتماعی نظام ایک حفاظتی دیوار بن جائے۔ شہر میں بستی بسانے کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ دیہات میں قانون کی عملداری بہت کم ہوتی ہے۔ دیہات میں قانون بڑے بڑے زمیندار اپنے ہاتھ میں لیے ہوتے ہیں جو غریبوں اور کمزوروں پر ایسے ایسے ستم توڑتے ہیں جن کی مثال ممکن نہیں ہوتی۔ چنانچہ حکم بالا کے مطابق موسیٰؑ اور ہارونؑ نے شہر میں الگ بستی بسائی اور مخصوص اجتماعی نظام قائم کیا' جس کی بدولت بنی اسرائیل میں جو کئی پشتوں سے غلام اور مظلوم چلے آرہے تھے' اور ان میں اتنی جرات نہیں تھی کہ اپنے انسانی حقوق ربوبیت کے لیے آواز بلند کر سکیں) اتنی جرات پیدا ہوگئی کہ اپنے چھنے ہوئے شہری اور انسانی حقوق کی بازیابی کے لیے کھلے بندوں میدان عمل میں نکل آئے۔

موسیٰؑ و ہارونؑ کو ایک ہی فریضہ سونپا گیا تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائیں۔ یعنی السید یعقوبؑ کی اولاد جنہیں السید یوسفؑ نے اپنے زمانہ اقتدار میں کنعان' شام سے منتقل کر کے مصر میں آباد کیا تھا اور ضابطہ الٰہی کے مطابق انہیں مصر کے قدیمی باشندوں کے ساتھ برابر کے شہری حقوق اور انسانی حقوق عطا فرمائے تھے' ایک زمانہ گزرنے کے بعد جب یوسفی نظریات ربوبیت عامہ کی جگہ نظریات ملوکیت نے لے لی۔ تو وطن کابت تراش لیا گیا۔ ملکی اور غیر ملکی کی کافرانہ تمیز قائم ہوئی اور بنی اسرائیل کو جو شام سے منتقل ہو کر مصر جا آباد ہوئے تھے غیر ملکی ٹھہرا کر ان کے حقوق ربوبیت چھین لیے گئے۔ مصر میں ان کی حیثیت صرف بیگاریوں کی متعین ہوئی کہ صرف قوت لایموت حاصل کریں اور فرعونیوں کی خدمت گذاری کرتے رہیں۔

اقیموا الصلوۃ کا لفظی معنی یہ ہے کہ الصلوۃ قائم کرو۔ لفظ صلوۃ کا سہ حرفی مادہ ص-ل-و= صلو ہے۔ جس کا معنی ہے پیچھے پیچھے آنا۔ عربوں کے ہاں اس گھوڑے کو مصلّی کہتے ہیں جو گھڑ دوڑ میں اوّل آنے والے گھوڑے کے عین پیچھے پیچھے آیا ہو۔ اس طرح اس اجتماعی نظام کو جس میں افراد معاشرہ ہر آن اجتماعی قوانین کے پیچھے پیچھے چل رہے ہوں' الصلوۃ یعنی نظام صلوۃ کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہر جاندار اور بے جان چیز کے فرض منصبی کو بھی الصلوۃ کہا گیا ہے ملاحظہ ہو آیت ذیل:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ 24/41 (اے مخاطب) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین میں ہر جاندار چیز اللہ تعالٰی کی تسبیح کر رہی ہے۔ خصوصاً صفیں باندھ کر اڑنے والے پرندے' سب کے سب اپنی صلوۃ اور تسبیح (یعنی اپنے اپنے فرض منصبی) کو جانتے ہیں' جو جو وہ کام کرتے ہیں' وہ ان کی صلوۃ و تسبیح ہے۔

اس آیت مجیدہ میں ہر جاندار کے کام کو اس کی صلوۃ و تسبیح کہا گیا ہے۔ جانداروں میں گھوڑے کی صلوۃ ہے۔ مسافت طے کرنا۔ گدھے کی بوجھ اٹھانا' گائے بھینسوں کی دودھ دینا اور بھیڑ بکریوں کی صلوۃ نسل بڑھاتے چلے جانا' اور گوشت مہیا کرنا ہے۔ ہر جاندار کتا' بلا' شیر' گیدڑ لومڑ وغیرہ سب انسان کے فائدوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ان سے جو جو کام انسانی فلاح کے لئے لیا جا سکتا ہے وہ ان کی الگ الگ صلوۃ ہے۔ صرف انسان فعل مختار ہے باقی ہر جاندار ایک ہی کام کر سکتا ہے' جو اس کا فرض منصبی یعنی جو اس کی صلوۃ خود باری تعالٰی نے مقرر فرمائی ہے۔

قرآن مجید کتاب لاریب میں متعدد بار آیا ہے یسبح للّٰہ ما فی السموت و ما فی الارض آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں یعنی اپنا اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں عربی ادب میں من جاندار کے لئے اور ما ہر جاندار اور بے جان سب کے لئے آتا ہے پس یسبح للّٰہ ما فی السموت و ما فی الارض کے مطابق ہر چیز کا فرض منصبی اس کی صلوۃ ہے۔ مثلاً سورج کی صلوۃ ہے اپنے خاندان سمیت اپنے مدار میں گردش کرنا۔ اور نوع انسانی کو روشنی اور گرمی پہنچانا' اس کی فصلیں اور پھل پکانا۔ چاند کی صلوۃ ہے بدستور اپنی منزلیں طے کرتے چلے جانا اور اپنی چاندنی' یعنی ٹھنڈی روشنی کے ساتھ فصلوں اور پھلوں میں رس پیدا کرنا اور ان کی افزائش کرنا' اسی طرح تمام ستارے اور سیارے اپنے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ آگ پانی مٹی ہوا بھی اپنی اپنی ادائے صلوۃ میں مصروف عمل ہیں۔

نوع انسانی کی ایک صلوۃ تو ہے صلوۃ موقت' جو دن رات میں تین وقتوں پر فرض ہے جس میں ایاک نعبد و ایاک نستعین کے الفاظ میں اللہ تعالٰی کے حضور اقرار کیا جاتا ہے' ہمارا فرض منصبی یہ ہے کہ ہم تیری ہی فرمانبرداری کریں گے' اور تجھ ہی سے مدد مانگیں گے اور دوسری صلوۃ ہے اسی وعدہ کو وفا کرتے ہوئے ہر آن حکم الٰہی پر عامل رہنا۔ بنی اسرائیل کو صلوۃ موقت سے شروع کر کے معاشرہ کے' فرائض منصبی کے علاوہ اپنی آزادی کی مہم کی تکمیل کا فرض ادا کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے' یہ بھی ان کی صلوۃ تھی جسے وہ ادا کر کے کامیاب ہوئے اس مہم کا ذکر آئندہ آئے گا

الگ بستی بسانا چوں کہ مال و دولت کے بغیر ممکن نہیں جبکہ بنی اسرائیل ایک مظلوم اور نادار قوم تھی اس لئے تعمیل حکم کی صورت اس کے سوا ممکن نہ تھی کہ جھونپڑیوں کی الگ بستی آباد کی جا سکے چنانچہ بکھرے ہوئے بنی اسرائیل کو شہر میں یکجا کرنے کے لئے کہ وہ محفوظ ہو جائیں السید موسیٰؑ نے اللہ کے حضور عرض کی:۔

(۸۸)

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

اور موسیٰؑ نے کہا اے ہمارے پروردگار! بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور بہت سا (حرام) مال حاصل کئے ہوئے پایا ہے تاکہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بہکائیں۔ (ہمارے پاس مال نہیں اس لئے ہم جھونپڑیاں ہی بنا سکتے ہیں) اے ہمارے رب تو ان سے ان کے مال چھنے ہوئے پائے۔ اور ان کے اذہان تو نے سخت ہوئے ہوئے پائے' (پس وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ) کہ نہیں ایمان لائیں گے حتٰی کہ دردناک عذاب دیکھ لیں"

۱۔ فعل **اٰتَيْتَ** میں خاصہ وجدان موجود ہے کیوں کہ حرام مال اور ناجائز حکومت اللہ نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا قانون مشیت یہ ہے کہ جو کوئی حرام مال یا ناجائز حکومت حاصل کرتا ہے خود کرتا ہے اس کا قانون رضا تنزلی حکم یہ ہے کہ حلال طریقے سے کمایا جائے اور جائز طریقے سے حکومت حاصل کی جائے۔ فرعون کی حکومت بھی ناجائز یعنی استبدادی حکومت تھی اور اس کا مال بھی حرام مال تھا۔ پس قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی کسی ناجائز چیز کا دینا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، وہاں ہر جگہ خاصا وجدان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ پاتا ہے کہ لوگوں نے خود ناجائز طریقہ سے مال حاصل کر لیا ہوتا ہے اور ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے والے لوگوں کو گمراہ بھی خود ہی کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ گمراہ نہیں کرتا۔

۲۔ یہاں طمس کا مصدری معنی تباہ و برباد کرنا بلکہ چھن جانا ہے کیوں کہ فرعون اور اس کے سرداروں کی زینت و اموال کے متعلق ۷/۱۳۷ + ۲۶/۵۹ + ۴۴/۲۵ میں تین مرتبہ تکرار کے ساتھ اعلان باری ہے کہ ان کا وارث بنی اسرائیل کو کر دیا گیا تھا اس لئے طمس کا جو معنی یہاں فٹ آتا ہے وہ چھن جانا ہی ہے۔

نیز فعل طمس میں خاصہ وجدان موجود ہے کیوں کہ فرعون سے حکومت کا چھن جانا السید موسیٰ اور بنی اسرائیل کی طرف سے تحریک آزادی کو ثابت قدمی کے ساتھ جاری رکھنے پر موقوف تھا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں جیسے کہ ارشادی باری ہے:۔ **وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ** ۲۲/۴۰ "اور اللہ تعالیٰ ضرور ضرور ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"۔ چنانچہ سیدنا موسیٰؑ کی زیر نگرانی شروع کی گئی تحریک آزادی پر بنی اسرائیل ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہے تو فرعون سے حکومت چھن کر بنی اسرائیل کو میسر آئی ارشاد الٰہی ہے:۔

○ **فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ** ○ ۵۷ تا ۲۶/۵۹ "پس ہم نے (ان کی بداعمالیوں کی بدولت) انہیں لدے پھدے باغوں' بہتے چشموں بھرے خزانوں اور نفیس محلات میں سے نکال باہر کیا۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا اور ہم نے ان (چیزوں کا) وارث بنی اسرائیل کو بنا دیا"۔ پس اللہ تعالیٰ کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا۔ جس سے کوئی نعمت چھن جاتی ہے اس کی اپنی بد اعمالیوں کی بدولت چھن جاتی ہے اور جس کو کوئی نعمت ملتی ہے اس کی مسلسل اور صحیح

کوشش کے عوض ملتی ہے۔

○ ۳۔ **وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** میں بھی خاصہ وجہ ان موجود ہے کہ منکرین ضابطۂ ربوبیت کے اذہان کو اللہ تعالیٰ سخت نہیں کرتا بلکہ وہ خود سخت کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذہنوں کو سخت ہوئے ہوئے پاتا ہے۔ اگر کسی کے ذہن کو اللہ تعالیٰ سخت کر دے اور وہ راہ راست کو قبول نہ کرے تو اس کا کیا قصور؟ اس طرح قصور اس کا ثابت ہوتا ہے جس نے اس کے ذہن کو سخت کر دیا ہے۔ پس چونکہ یہ تصور توہین باری کا حامل ہے اس لئے غلط ہے اور صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنوں کو خود سخت کر لیتے ہیں۔

○ ۴۔ سیدنا موسیٰؑ غیب دان نہیں تھے کہ آپ نے پہلے ہی بتا دیا کہ یہ لوگ دردناک عذاب دیکھ کر ہی ایمان لائیں گے۔ بلکہ آپ کا تجربہ تھا کہ آپ نے ایک لمبی مدت ان کے سامنے ربوبیت عامہ کے دلائل قاطعہ پیش کئے مگر چونکہ فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی شان و شوکت اور ایک مضبوط حکومت میسر تھی اس لئے انہیں یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ بنی اسرائیل کے حقوقِ ربوبیت غصب کرنے کے عوض ان سے حکومت چھن جائے گی۔ چنانچہ آگے آرہا ہے کہ جب فرعون موت کے عذاب میں مبتلا ہو گیا تو پکار اٹھا کہ میں ایمان لاتا ہوں (تفصیل آگے آرہی ہے)۔

○ سیدنا موسیٰ سلام علیہ نے جو آیت زیر بحث نمبر۸۸ میں دعا فرمائی کہ فرعون کی حکومت چھن جائے اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ آپ کی دعا منظور، مگر اس شرط پر کہ آپ اپنی تحریک کو مستقل مزاجی، ثابت قدمی اور تسلسل کے ساتھ جاری رکھیں۔

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾	(۸۹) اللہ نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول (اس شرط پر کہ) پس تم دونوں (اپنی تحریک پر) قائم رہو اور ان لوگوں کے راستے کی پیروی نہ کرنا جو نہیں جانتے (کہ حقوق ربوبیت غصب کرنا کھلی گمراہی ہے۔)

○ دیکھئے اس آیت مجیدہ میں پہلے قبولیتِ دعا کی سند عطا فرمائی گئی ہے مگر ساتھ ہی حکم دے دیا گیا ہے کہ اب یہ نہیں ہوگا کہ تم کوشش چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤ کہ دعا قبول ہو چکی ہے۔ بلکہ اپنی تحریک کو مستقل مزاجی کے ساتھ جاری رکھو اور اس کی راہ میں حائل ہونے والے مصائب کا سینہ تان کر مقابلہ کرتے چلے جاؤ۔ (یہ ہے فَاسْتَقِيْمَا کا صحیح مفہوم) چنانچہ انبیاء موسیٰ و ہارون سلام علیہما چونکہ امنِ عالم کے علمبردار تھے اس لئے آپ نے شروع ہی اس تحریک کو پُر امن ہجرت کے مطالبہ سے کیا تھا۔

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۷/۴/۳۰(جب تو بنی اسرائیل کو ان کے انسانی بنیادی حقوقِ ربوبیت نہیں دیتا) تو انہیں ہمارے ساتھ بھیج دے پُر امن ہجرت کی اجازت دے دے۔ مگر بنی اسرائیل کے مصر سے چلے جانے میں فرعون کی موت تھی۔ کیونکہ عرصہ دراز سے فرعونی نسل انگار اور تن آسان ہو چکے تھے۔ محنت مشقت کے تمام کام جن پر کاروبار ریاست کا انحصار ہوتا ہے بنی اسرائیل انجام دیتے تھے۔ اس لئے ان کے چلے جانے سے کاروبارِ حکومت ٹھپ ہو جاتا تھا اس لئے فرعون اور اس کے سردار جب ضد پر اڑے رہے اور بنی اسرائیل کو پُر امن ہجرت کی اجازت نہ دی تو بحکمِ باری سیدنا موسیٰ نے ایک رات کو اپنی انقلابی جماعت کے نوجوانوں کے ساتھ ہجرت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون نے اپنے لشکروں سمیت تعاقب کیا۔ سیدنا موسیٰؑ معہ ساتھیوں کے بحرِ قلزم کی آبناء سے بخیریت گزر گئے۔ کیوں کہ وہ اس وقت جذر کی حالت میں خشک تھی مگر جب فرعون معہ لاؤ لشکر اس کے پاٹ میں داخل ہوا تو مد آگئی اور وہ سب غرق ہو گئے ارشاد باری ہے:۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَآءِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدْوًا حَتَّى إِذَا أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَآءِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۹۰﴾

(۹۰)اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا پھر فرعون اور اس کے لشکروں نے شرارت اور دشمنی کی بنا پر ان کا تعاقب کیا (مگر جب وہ سمندر کی آبناء میں داخل ہوئے تو مد آگئی) حتیٰ کہ فرعون غرق ہونے لگا تو اس نے کہا میں ایمان لایا یہ کہ اس کے سوا کوئی فرمانبرداری کے لائق نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

○ غرق فرعون کے ضمن میں مدوجذر کے ثبوت کے لئے آیت ذیل ملاحظہ فرمائیں۔

○ سورہ طٰہٰ میں سیدنا موسیٰ کے پار ہوجانے اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:۔

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ ○ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ○ طٰ ۷۷۔ ۲۰/۷۸ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰؑ کو وحی فرمائی کہ میرے بندوں کو سمندر (کی آبناء) میں خشک راستے پر لے جا۔ نہ تجھے پکڑے جانے کا خوف ہوگا اور نہ تجھے (غرق ہونے کا) ڈر ہوگا۔ پھر فرعون نے اپنے لشکروں سمیت ان کا تعاقب کیا (یعنی اسی خشک راستے پر آبناء میں داخل ہو گیا) پھر انہیں پانی کے بہاؤ (مد) نے جس طرح ڈھانپنا تھا ڈھانپ لیا۔ (اس طرح سب کے سب غرق ہوگئے)

دیکھا آپ نے ○ **طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا**" کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ بحر قلزم کی آبناء کو جب سیدنا موسیٰؑ نے پار کیا اس وقت وہ خشک تھی اور ظاہر ہے کہ سمندر کی آبناء اسی وقت خشک ہوتی ہے جب وہ جذر کی حالت میں ہو۔ یہ تو ہوا قرآنی الفاظ سے جذر کا ثبوت۔ اب ملاحظہ ہو مد کا قرآنی ثبوت جب فرعون موسیٰؑ کے تعاقب میں آبناء کے اندر داخل ہوگیا تو ارشاد ہوا: **فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ** پھر انہیں پانی کے بہاؤ (مد) نے جس طرح ڈھانپنا تھا ڈھانپ لیا۔ **یم** کا معنی ہے پانی کا بہاؤ یعنی مد اور ڈھانپ لینا کے الفاظ مد کی زور دار آمد کی عملی صورت کی تفسیر ہیں۔ کہ جب وہ آتی ہے تو زد میں آنے والوں کو پوری طرح ڈھانپ کر غرق کر دیتی ہے اس کے برعکس روایات کا دیا ہوا تصور یکسر غلط اور سنت اللہ کے خلاف ہے کہ پانی پر ڈنڈا مارنے سے اس میں راستے بن گئے۔ جب السید موسیٰؑ کے بعد ان میں فرعون داخل ہوا ٹھہرا ہوا پانی رواں ہوگیا۔ یہ تصور ۲۰/۷۷ کے مطابق ہرگز صحیح نہیں۔

○ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ غلطی کہاں لگی ہے؟ واضح رہے کہ مذکورہ تصور **اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ** ۲۶/۶۳ سے لیا گیا۔ لیکن یہاں **اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ** کا معنی ہے' لے جا اپنی جماعت کو۔ عصا کا معنی ہے جماعت اور اس آیت مجیدہ کا معنی ہے اپنی جماعت کو سمندر کی طرف لے جا اور ۲۰/۷۷ سے ثابت ہے کہ خشک سمندر کی طرف لے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔اب آیت نمبر۲۰/۷۷ اور ۲۶/۶۳ کا تقابل ملاحظہ فرمائیں۔

○ **وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا**" ۲۰/۷۷

○ **فَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ** أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۲۶/۶۳

○ دیکھئے! دونوں آیتوں میں ایک ہی واقعہ بیان ہوا ہے چنانچہ:

○ نمبر۱ میں **أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ** دونوں آیتوں میں متقابل آیا ہے نمبر۲ میں **اِضْرِبْ اِضْرِبْ** متقابل موجود ہے۔ نمبر۳ میں

ھُمْ ضمیر برائے بنی اسرائیل کا متبادل عَصَاکَ آیا ہے۔ جس سے موسیٰؑ کی جماعت بنی اسرائیل مراد ہے۔ اور نمبر ۴ میں البحر البحر متقابل موجود ہے۔ ۷۷/۲۰ میں البحر کی حالت بصورت حال بتائی گئی ہے یبسا " یعنی خشک سمندر' لیکن سمندر کبھی خشک نہیں ہوتا۔ سوائے سمندر کی کسی آبناء کے جو صرف جذر کے وقت خشک ہوتی ہے اور مدّ کے وقت زد میں آنے والوں کو ڈھانپ کر غرق کر دیتی ہے۔ اور یہی کچھ فرعون کے ساتھ ہوا کہ اسے یَمّ ' یعنی پانی کے بہاؤ (مدّ) نے ڈھانپ کر غرق کر دیا۔

مرتے وقت ایمان ○ فرعون مرتے وقت ایمان لایا جو قبول نہ ہوا۔ کیوں کہ ایمان کی عملی تصدیق کا وقت نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بے وقت ایمان لانے کے اقرارِ ایمان کا جواب السید موسیٰؑ کے ذریعہ یہ دیا:۔

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾

(۹۱) (اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی موجود موسیٰؑ کے ذریعہ جواب دیا) اب ایمان لاتا ہے حالانکہ تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تو فسادیوں سے ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

(۹۲) پس آج کے دن ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والے لوگوں کے لئے ایک کھلی نشانی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بے شک نوع انسانی کے اکثر لوگ ہماری نشانیوں کی پرواہ نہیں کرتے' (چاہئے یہ کہ ان سے عبرت حاصل کریں مگر وہ عبرت حاصل نہیں کرتے۔)

فرعون کی لاش ○ آیت بالا میں آج سے چودہ سو سال پیشتر بتا دیا گیا تھا کہ باری تعالیٰ نے فرعون کی لاش آنے والی نسلوں کی عبرت کے لئے بچایا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ لاش مصر کے عجائب گھر میں سامان عبرت کے لئے حاضر موجود ہے۔ مگر جیسے کہ آیت بالا میں بتا دیا گیا ہے کہ لوگ ان نشانیوں سے سبق حاصل نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی السید موسیٰؑ کا مدّ مقابل اور یہ کہنے والا کہ چھوڑو میں موسیٰؑ کو خود قتل کرتا ہوں اب چاہیئے کہ وہ اپنے رب کو پکارے کہ وہ اسے میرے ہاتھ سے بچائے:

قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ج ۲۶/۴۰ لیکن ہوا یہ کہ وہ السید موسیٰؑ کو قتل نہ کر سکا۔ کیوں کہ آپؑ حفاظت باری تعالیٰ میں تھے۔ اس کا سارا آمرانہ دبدبہ اور جھوٹا شاہی جلال دھرا کا دھرا رہ گیا۔ السید موسیٰؑ نے اس کی قتل کی دھمکی کے بعد بھی اپنی تحریک بدستور جاری رکھی اور اللہ کے نبی کو قتل کرنے کا دعویدار خود انہی آنکھوں کے سامنے اپنے لاؤ لشکر سمیت سمندر میں غرق ہو گیا۔ مگر افسوس کہ نوع انسانی اس کی لاش سے عبرت حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یا للعجب!

قرآن کریم کا ناقابل انکار معجزہ ○ قران مجید نے فرعون کی لاش کو پانی سے باہر پھینکنے اور پھر اسے ممّی کرکے قیامت تک کے لئے محفوظ کر لینے کی خبر آج سے چودہ سو سال قبل اس وقت دی تھی جب کسی کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ حتیٰ کہ یہ خبر بائبل میں بھی موجود نہیں۔ واقعات و مشاہدات نے قرآنی صداقت کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ لاریب کتاب واقعی اس عالم الغیب کی ہے جس نے خود فرعون کی لاش کو سامان عبرت بنا کر محفوظ کر دیا تھا۔

بنی اسرائیل نے بھی اختلاف شروع کر دیئے ○ فرعون کی پرشکوہ حکومت کا خاتمہ السید موسیٰؑ و ہارونؑ کے ذریعہ

ہوا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکومت بنی اسرائیل کو عطا فرمائی۔ لیکن انہوں نے بھی ضابطہ باری تعالیٰ سے اختلاف شروع کر دیا۔ اور ضابطہ باری تعالیٰ مل چکنے کے بعد اختلاف کیا وہ بھی فرعون والی ہی رو میں بہہ گئے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ فَمَا ٱخْتَلَفُوا۟ حَتَّىٰ جَآءَهُمُ ٱلْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ فِيمَا كَانُوا۟ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۹۳﴾

(۹۳) اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو مقام صدق عطا فرمایا (یعنی انہیں زمین میں حکومت دے دی گئی) اور انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ پھر انہوں نے اس وقت اختلاف کیا کہ ان کے پاس ہمارا علم (متوازن و مساوی ضابطہ حیات) آگیا۔ بے شک تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا اس چیز میں جس میں (ہمارے ضابطہ حیات سے) اختلاف کرتے تھے۔

○ رزق طیب سے مراد ارضی حکومت ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم یہاں پر اس کا نازل کردہ ضابطہ حیات ہے جس کے آچکنے یعنی اس کے بعد اس سے اختلاف سے مراد ناہموار طبقاتی نظام کا نفاذ ہے۔ یہی روش فرعون اور اہل فرعون کی تھی اور طبقاتی نظام کے نفاذ کے ذریعہ یہی روش بنی اسرائیل نے اپنا لی جس کی پاداش میں ذلت و خواری ان کے گلے کا ہار ہو گئی۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۲/۶۱ اور ان پر ذلت و مسکنت لازم کردی گئی۔ العیاذ باللہ

○ سابقہ آیات مجیدہ میں السید موسیٰؑ کے ذریعے فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی آزادی کی عظیم مہم کے تذکرہ اور غلام قوم بنی اسرائیل کو حکومت مل جانے کی عجیب و غریب خبر دینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ قوم بنی اسرائیل نے بھی حکومت میسر آنے کے بعد ضابطۂ الٰہی کے ساتھ اختلاف شروع کر دیا۔ اس پر ذہن انسانی میں تردد سا پیدا ہوتا ہے کہ پہلے نمبر پر تو فرعون جیسے طاقتور حکمران سے پشتوں پرانی مضبوط حکومت السید موسیٰؑ اور قوم بنی اسرائیل کے ہاتھوں چھن جائے جن کے پاس نہ اسلحہ تھا نہ فوج' بلکہ جو غذائی ضروریات تک سے فرعون اور فرعونیوں کے محتاج تھے کیا ایسا ہو گیا تھا؟ اور

○ دوسرے نمبر پر اس خبر کے تسلیم کرنے میں بھی محال سا پیدا ہوتا ہے کہ جو قوم بنی اسرائیل خود پشتہا پشت سے غلامی کے درد ناک عذاب میں مبتلا رہی تھی اور جس نے ایک لمبی صبر آزما تحریک کے بعد غلامی اور طبقاتی تقسیم کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا تھا کیا حکومت ملنے کے بعد خود اس نے بھی وہی ظالمانہ طبقاتی نظام نافذ کر دیا ہو جو اس کے دور غلامی میں خود اس کے لئے ناقابل قبول تھا اس قسم کے ذہنی محالات جو نہتے عوام کے ہاتھوں بڑی بڑی مضبوط حکومتوں کا تختہ الٹ جانا تسلیم کرنے میں تردد پیدا کرتے ہیں۔ اگلی آیت مجیدہ میں اس کے متعلق مخاطب تو کیا گیا ہے نبی اکرمؐ کو اور سمجھانا مطلوب ہے عوام کو کہ اگر تمہیں ان عجیب و غریب خبروں کے تسلیم کرنے میں کوئی تردد ہو تو جو لوگ قرآن سے پہلے تورات و انجیل کے قاری ہیں ان سے پوچھ لو کہ ان کتابوں میں بھی یہ خبریں نازل کر دی گئی ہیں چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔

فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْـَٔلِ ٱلَّذِينَ يَقْرَءُونَ ٱلْكِتَٰبَ مِن

(۹۴) پھر اے رسولؐ (آیات بالا میں) جو کچھ ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے (بفرض محال) آپ اس کے متعلق شک میں ہوں تو ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں بے شک آپ

قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے سچی خبر آگئی ہے پس آپ شک کرنے والوں سے نہ ہو جانا۔

○ نبی اکرمؐ صاحب قرآن کے متعلق تو یہ تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کو تنزیل رب العالمین کے متعلق ذرہ بھر بھی شک ہو۔ جیسے کہ سورہ النجم میں آپ کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے کہ آپ پر جو کچھ وحی کیا گیا آپ کے ذہن نے جو سمجھا اسے ہرگز جھٹلایا نہیں۔۔ آپ کی بصیرت میں کوئی کجی آئی نہ طغیانی:۔

○ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ○ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ○ ۱۰۔ ۱۱/۵۳ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۱۷/۵۳ اس طرح چونکہ نبی اکرمؐ کے متعلق اس امر کا تصور تک بھی ممکن نہیں کہ آپ کے ذہن میں تنزیلِ الٰہی کے متعلق شک پیدا ہوا ہو۔ اس لئے بدرجہِ اتم ثابت ہوا کہ آیت زیر بحث ۹۴/۱۰ میں فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ کے الفاظ میں اِنْ شرطیہ تفریض محال کے لئے آیا ہے۔ اس کی مثال سورہ انعام میں ملاحظہ فرمائیں' جہاں اٹھارہ نبیوں کے نام لے کر ارشاد ہوا ہے وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ ۸۹/۶ اور بفرض محال اگر وہ بھی شرک کرتے تو انکے اعمال بھی جو وہ کرتے تھے ان سے ضائع ہو جاتے۔ دیکھئے یہاں بھی لَوْ شرطیہ تفریض محالؔ کے لئے آیا ہے۔ ورنہ انبیاء سلام علیہم کے لئے ارتکاب شرک کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اسی طرح کے ذہن مبارک میں تنزیلِ الٰہی کے متعلق شک و شبہ کا گزر تک بھی محالِ تام ہے پھر پڑھئے گا کہ۔

○ آیت بالا ۸۹/۶ میں اپنے قانون مکافات عمل کے انتہائی اٹل ہونے کے ثبوت میں ارشاد ہوا کہ ہمارا قانون اس قدر اٹل اور ہر قسم کے لوچ و لچک سے بری ہے کہ عوام تو عوام اگر ہمارا کوئی نبی بھی شرک کر بیٹھتا تو ہم اسے بھی معاف نہ کرتے۔ اس کے بھی اعمال ضائع کر دیتے۔ اور ۹۴/۱۰ میں اس شک کے امکان کا ذکر کیا گیا ہے جو مصر کی مضبوط حکومت کے نیتے عوام کے ذریعے چھن جانے اور مٹ جانے کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ پیش کیا گیا ہے۔ کہ اگر اے رسول! بفرض محال آپ کے ذہن میں شک کا گزر ہو تو ان لوگوں سے تصدیق کر لیجئے گا۔ جو آپ سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں۔ اور وہ اسے پڑھتے ہیں۔ چوں کہ آپ کے ذہن مبارک میں تو شک کا نہ گذر ہونا تھا نہ ہوا اس لئے نہ آپ کو سابقہ اہل کتاب سے پوچھنے کی ضرورت پیش آئی نہ آپ نے پوچھا البتہ عامتہ المسلمین میں سے جسے شک گزرتا وہ اپنے شک کو اہل کتاب سے پوچھ کر رفع کر سکتا تھا۔ فرعون سے حکومت چھن جانے کی خبر تو محرّف بائیبل میں بھی موجود ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں بھی خطاب نبی اکرم کی طرف ہے اور سمجھانا مقصود ہے عامتہ المسلمین کو:۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ (۹۵) اور آپ ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں ورنہ آپ بھی خسارہ پانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔

○ اس طرح قانون مکافات کی حکمیت کے قطعی اظہار کے بعد ان لوگوں کے متعلق اظہار ہوا ہے جو اپنی مسلسل بے پناہ نافرمانیوں کی بدولت اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ان کے لئے لازم ہوجاتا ہے وہ اس کے بعد ایمان نہیں لاتے۔ ایسے لوگوں کے ضمیر مردہ اور نفس لوامہ روک روک کر ناکام ہوچکا ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ (۹۶۔۹۷) بے شک جن (لوگوں کی انتہائی نافرمانیوں کی بدولت ان) پر اللہ کا عذاب لازم ہوچکا ہے وہ ایمان نہیں لاتے۔ اگرچہ ان کے پاس

وَلَوْجَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

آمدِ عذاب کے تمام نشان آجائیں۔ یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب کو دیکھ بھی لیں۔

○ ان آیات مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ قوموں کی بداعمالیوں' طغیانیوں اور نافرمانیوں کی بدولت اللہ تعالیٰ کے قانون مکافات کی رُو سے عذاب لازم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر ان کے ضمیر مردہ ہوجاتے ہیں اور نفس لوامہ انہیں برائیوں سے روک روک کر ناکام بلکہ مایوس ہوچکا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ اس وقت بھی ایمان نہیں لاتے' جب الٰہی عذاب کی آمد کے تمام نشان ظاہر بھی ہو چکے ہوں۔

○ آیات بالا سے اظہر من الشمس ہے کہ قانون الٰہی کے مطابق قوموں کی نافرمانیوں کی سزا بتدریج مرتب ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ اگر کوئی قوم اپنی دائمی نافرمانیوں میں ایک خاص مقام تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ اس کا لوٹنا ناممکن ہوجاتا ہے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی سزا واجب ہوجاتی ہے اور وہ درد ناک عذاب کو دیکھ کر بھی واپس نہیں لوٹتے۔ نہ ایمان لاتے ہیں اور نہ برے اعمال سے باز آتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ **حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ** کے الفاظ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ قانون رب العالمین میں اس وقت تک توبہ اور اصلاح اعمال کی گنجائش موجود ہے جب عذاب کو دیکھ بھی لیں۔ یعنی عذاب کے آثار نمایاں ہوچکے ہوں چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ ماضی میں صرف قوم یونس تھی جو عذاب کو دیکھ کر ایمان لائی اور فوری طور پر اصلاح اعمال کر لی اس لئے قانون باری تعالیٰ کے مطابق ان سے عذاب یکسر ٹل گیا۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

(۹۸) پس کیوں کوئی بستی ایسی نہ ہوئی کہ وہ ایمان لاتی پھر اسے اس کا ایمان لانا فائدہ پہنچاتا سوائے قوم یونس کے (جب وہ آثار عذاب دیکھ کر) ایمان لے آئے تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب دور کر دیا اور انہیں ہم نے ایک مدت تک فائدہ دیا۔

○ بعض تفاسیر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عذاب کے آثار آچکنے کے بعد جب قوم یونس نے توبہ اور اصلاح کر لی تو عذاب کا ٹال دینا صرف قوم یونس کے لئے ایک خصوصی رعایت تھی۔ یہ تصور مطلقاً غلط ہے۔ قوانین الٰہی کے متعلق آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ تفریضِ محال کے طور پر ۶/۸۹ میں انبیاء سلام علیہم کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے کہ اگر وہ بھی شرک کرتے تو ہمارا قانون ان کی رعایت بھی نہ کرتا۔ ان کے اعمال بھی ضائع کر دیے جاتے۔

○ پس اس آیت مجیدہ سے ثابت ہوا کہ قوم یونسؑ کو کوئی خصوصی رعایت نہیں دی گئی تھی۔ بلکہ قانون الٰہی میں ہر بستی اور قوم کے لئے عذاب الٰہی کے آثار دیکھ کر توبہ اور اصلاح اعمال کی گنجائش موجود ہے اس سے عذاب ٹل جاتا ہے۔ آیت زیر بحث ۱۰/۹۸ میں یہ خبر دی گئی ہے کہ ماضی میں صرف ایک قوم ایسی گذری ہے جس نے عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ اور اصلاح کر لی۔ تو ہم نے ان سے عذاب ٹال دیا۔ عذاب کو دیکھ کر بھی رجوع نہ کرنے والی قوم عاد کے متعلق بتایا گیا ہے: **فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا** ۴۶/۲۴ پھر جب انہوں نے اسے بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو کہا یہ بادل ہم پر مینہ برسانے والا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے عذاب کو دیکھ کر بھی توبہ اور اصلاح نہ کی۔ اس لئے بتایا گیا ہے کہ اس میں سخت آندھی تھی جس نے ہر چیز کو تباہ کردیا۔ اور بستی کے کھنڈرات کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

السید یونس نے جب اپنی قوم کو شبانہ روز سمجھانے کے بعد دیکھا کہ یہ لوگ نافرمانیوں میں اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ اب ان پر عذاب آیا ہی چاہتا ہے تو آپؑ ہجرت فرما کر چلے گئے۔ لیکن آپؑ کے جانے کے بعد جب عذاب رب العالمین کے آثار نمایاں ہوئے۔ تو آپ کی قوم اپنے غلط عقائد سے تائب ہو کر اصلاح اعمال میں لگ گئی۔ یعنی وہ طبقاتی نظام ختم کر کے جس میں ربوبیت عامہ کے خلاف بعض لوگ ضروریات زندگی سے محروم پائے جاتے ہیں' ختم کر کے ربوبیت عامہ کا ہموار و متوازن نظام بھی نافذ کیا۔ اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب ٹل گیا۔ یہ عین قانونِ رب العالمین کے مطابق ہوا تھا۔ قوم یونس کے لئے کوئی الگ مخصوص رعایت نہیں تھی۔

○ السید یونس کے متعلق سورہ قلم میں نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا ہے : **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ إِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۗ لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۚ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ** ○ ۴۸ تا ۶۸/۵۰ (اے رسول) آپ اپنے رب کے حکم کے لئے مستقل مزاج رہیں اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جانا۔ وہ وقت قابل ذکر ہے جب اس نے پکارا اور وہ غصے کو پیئے ہوئے تھا۔ اگر اسے اس کے رب کی نعمت نہ پالیتی (تو اسے مچھلی لقمہ بنا لیتی) یقیناً" اسے کھلے میدان میں پڑے ہوئے پایا گیا تھا اور وہ ذمہ میں لیا گیا تھا پھر اسے اس کے رب نے دوبارہ چن لیا اور اسے اصلاح کرنے والوں سے ٹھہرایا (وہ دوبارہ قوم کی طرف بھیج دیا گیا تھا)

○ مذموم بصورت مفعول مادہ ذ۔ م۔ م ذم سے بمعنی اللہ کے ذمہ لیا گیا ہے۔ مذمت کیا گیا نہیں۔

○ ان آیات مجیدہ کے ابتدائی الفاظ **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ** سے ثابت ہوتا ہے کہ السید یونسؑ کا ہجرت کا فیصلہ ذاتی تھا۔ الہی نہیں تھا۔ اسی لئے نبی اکرم سلام علیہم کو حکم ہوا کہ آپ مچھلی والے کی مانند نہ ہو جانا' ہجرت کے لئے اللہ کے حکم کا انتظار فرمائیں۔ نیز سوال پیدا ہوتا ہے کہ مچھلی کا کیا قصہ تھا؟ اور یونسؑ کو مچھلی والا کیوں کہا گیا ہے۔ نیز مذکورہ نعمت باری تعالیٰ کیا تھی اور آپ کو کھلے میدان میں پڑے ہوئے پانے کا قصہ کیا ہے۔ ان واقعات کی تفصیل آیات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

○ **وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۗ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ۚ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ○ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۙ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۚ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۚ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ○ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ○ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۗ** ۱۳۹ تا ۳۷/۱۴۸ (مفہوم) اور بے شک یونسؑ ہمارے بھیجے ہوؤں میں سے تھے۔ وہ وقت قابل ذکر ہے جب وہ قوم سے ناراض ہو کر ۲۱/۸۷ غصے کو پیئے ہوئے ۶۸/۴۸ بھری ہوئی کشتی کی طرف دوڑ کر گئے پھر کشتی میں اپنا حصہ (جگہ) حاصل کرنے (یعنی سوار ہونے کی کوشش کی) پھر وہ پھسلنے والوں میں سے ہو گئے (ان کا پاؤں پھسل گیا) پھر انہیں مچھلی نے لقمہ بنانے کی کوشش کی اور وہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے' پھر اگر وہ تیراکوں میں سے نہ ہوتے تو ضرور (انہیں مچھلی لقمہ بنا لیتی اور) وہ قیامت کے دن تک پانی کے پیٹ میں رہتے (یعنی اس سے ہرگز نہ نکل سکتے۔) پھر ہم نے کھلے میدان میں انہیں پڑے ہوئے پایا۔ (اس وقت مچھلی کی زد سے نکلنے کی کوشش میں تیز تیرنے کی بدولت) نڈھال ہو گئے تھے۔ اور ہم نے ان پر ایک درخت اگا ہوا پایا' جس پر کدو کی بیل چڑھی ہوئی تھی اور ہم نے انہیں دوبارہ ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ افراد کی طرف بھیجا پس وہ ایمان لا چکے تھے (اور اعمال کی اصلاح کر لی تھی) اس لئے ہم نے انہیں

ایک مدت تک فائدہ دیا۔

○ **اَبَقَ** کا معنی تفسیروں میں لیا گیا ہے مالک سے بھاگ جانا غلام کا اور السید یونس کو اپنے اللہ کے مقرر کردہ فرضی منصبی سے بھاگا ہوا بتایا گیا ہے جو یکسر غلط ہے۔ آپ سے ہجرت کے لئے فیصلہ کرنے میں سہو ہو گئی تھی۔ آپ اپنے مالک کے بھاگے ہوئے غلام نہیں تھے مادہ ا۔ ب۔ ق۔ ابق کا مطلق معنی دوڑنا ہے۔ جو عربوں کے ہاں غلام کے بھاگ جانے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر آیاتِ بالا میں اس کا معنی یہ ہے کہ آپ جب قوم سے ناراض ہو کر آئے تو آپ کو کشتی پر سوار ہونا تھا' لیکن جب آپ پہنچے تو وہ مشحون ہوچکی تھی بالکل بھر چکی تھی۔

○ **سَاهَمَ** باب مفاعلہ سے ہے جس کا خاصہ ہے طلب ماخذ کے لئے کوشش کرنا اس مادہ کا بنیادی معنی ہے اپنا حصہ حاصل کرنا۔ چنانچہ حصہ دار کو عربی سہیم کہا جاتا ہے۔ اس مادہ کا معنی قرعہ ڈالنا بھی ہے لیکن یہاں سیاق و سباق کے مطابق قرعہ اندازی کا کوئی مقام نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس بناوٹی قصے کو سامنے رکھ کر ناموس رسالت کو مجروح کیا جائے۔ جس کا قرآن مجید میں کوئی ذکر موجود نہیں۔ صرف گھڑ لیا گیا ہے کہ جب کشتی دریا کے درمیان میں پہنچی تو لڑکھڑانے لگی۔ اہل کشتی نے کہا کہ ہم میں کوئی غلام اپنے مالک سے بھاگا ہوا موجود ہے' اس لئے لڑکھڑا رہی ہے' اسے اتار دو تاکہ باقی اہل کشتی غرق ہونے سے بچ جائیں۔ لیکن کشتی میں سے کسی نے بھی تسلیم نہ کیا کہ وہ اپنے مالک سے بھاگا ہوا غلام ہے۔ اس لئے قرعہ ڈالا گیا جو معاذ اللہ السید یونسؑ کے نام نکلا۔ اہل کشتی نے آپؑ کو پانی میں گرا دیا اور مچھلی نے آپؑ کو نگل لیا۔

○ لیکن سیاق کلام اور ترتیب الفاظ کے مطابق یہ سارا قصہ غلط اور من گھڑت ثابت ہوتا ہے کیوں کہ **اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ** یعنی جب آپ بھری ہوئی کشتی میں سوار ہونے کے لئے بھاگے تو آگے آیا ہے۔ **فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ** یعنی آپ نے کشتی میں اپنا حصہ لینے کی یعنی سوار ہونے کی کوشش کی تو آپ کا پاؤں پھسل گیا اور آپ پانی میں گر گئے۔ پس قرعہ اندازی کا تصور یکسر غلط ہے۔

○ **مُدْحَضِيْنَ** کا معنی مترجمین نے لکھا ہے کہ السید یونسؑ مغلوب ہو گئے یعنی قرعہ ان کے نام نکل آیا۔ مولوی احمد علی لاہوری نے **فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ** ۱۴۱/۳۷ کا معنی لکھا ہے: پھر قرعہ ڈالا تو وہی خطاکاروں میں تھا۔ العیاذباللہ واضح رہے کہ **مُدْحَضِيْنَ** کا سہ حرفی مادہ د۔ ح۔ ض' دحض ہے جس کا بنیادی معنی ڈھلنا' پھسلنا۔ **وَحَضَتِ الشَّمْسُ** کا معنی ہے سورج ڈھلا اور **اَوْحَضَ الرَّجُلُ** کا معنی ہے آدمی پھسل پڑا۔ چنانچہ پھسلنی جگہ کو **مدحضہ** کہتے ہیں الختصر سیاق کلام اور ترتیب الفاظ کے مطابق **اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ○ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ** کا معنی یہ ہے کہ جب آپ بھری ہوئی کشتی کی طرف بھاگ کر آئے تو اس میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے لئے کوشش کی۔ یعنی جب سوار ہونے لگے تو آپ کا پاؤں پھسل گیا اور آپ پانی میں گر گئے۔

○ **فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ** کے الفاظ میں **التقم** باب افتعال سے آیا ہے جس کا خاصہ طلبِ ماخذ کی کوشش کرنا ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ مچھلی نے آپ کو لقمہ بنانے کی کوشش کی' لقمہ بنا نہ سکی' کیوں کہ آپ تیراک تھے تیر کر نکل گئے۔ اگر **لَقِمَهُ الْحُوْتُ** ہوتا تو اس کا معنی ہو سکتا تھا کہ آپ کو مچھلی نے لقمہ بنا لیا' یعنی آپ کو مچھلی نگل گئی۔

○ **هُوَ مُلِيْمٌ** میں لفظ **مليم** فعیل کے وزن پر صفت مشبّہ ہے جس کا معنی یہ ہے کہ آپ اس وقت اپنے آپ کو ملامت کرنے والے تھے۔ یعنی اپنے آپ کو جی ہی جی میں کہہ رہے تھے کہ اگر دوسری کشتی کا انتظار کر لیتا تو نہ پانی میں گرتا اور نہ

مچھلی کی زد میں آتا۔

○ فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ کے جملہ میں الْمُسَبِّحِيْنَ کا معنی مترجمین نے یہ لکھا ہے کہ اگر آپ اس جملہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا ورد نہ کرتے یعنی اگر یہ تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ حالانکہ یہاں الْمُسَبِّحِيْنَ کا معنی تیراک ہے اور مفہوم یہ ہے کہ اگر آپ تیراک نہ ہوتے تو مچھلی آپ کو لقمہ بنا لیتی۔ اور اس سے آپ کبھی نہ نکل سکتے یہ لفظ مادہ س۔ ب۔ ح سَبَحَ سے ہے جس کا معنی ہے تیرنا۔ سورہ یاسین میں موجود ہے جہاں چاند ستاروں کے متعلق بتایا گیا ہے كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ ۳۶/۴۰ وہ سب کے سب فضا میں تیر رہے ہیں (اپنے اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں)

○ هُوَ سَقِيْمٌ کا معنی مترجمین نے لکھا ہے کہ وہ بیمار تھے۔ حالانکہ سیاق کلام کے مطابق کہ آپ کو مچھلی کی زد سے آزاد ہونے کے لئے انتہائی تیزی کے ساتھ تیرنا پڑا تھا۔ اس لئے آپ نڈھال ہوگئے تھے' بیمار نہیں تھے۔

○ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ کا معنی مترجمین نے لکھا ہے کہ کدو کا درخت جو مشاہدۃً غلط ہے کہ کدو کا درخت نہیں ہوتا' بیل ہوتی ہے۔ پس اس کا صحیح مفہوم ہے ایسا درخت جس پر کدو کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔

○ السید یونس ؑ کا ذکر سورہ انبیاء میں بھی آیا ہے جس میں یونس ؑ کا تسبیح پڑھنا قرار دے کر یہ تصور پیدا کر لیا گیا ہے کہ جب آپ کو مچھلی نگل گئی تو رات پانی کی تہ اور مچھلی کے پیٹ کے تین اندھیروں میں آپ نے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا ورد کیا تو مچھلی نے ساحل پر آکر آپ کو اگل دیا۔ سورہ انبیاء کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

○ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ط وَكَذٰلِكَ نُـنْجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ۸۷۔ ۲۱/۸۸

اور مچھلی والا جب غصے ہو کر چلا گیا تو اسے یقین تھا کہ اس نے صحیح وقت پر ہجرت کی ہے اس لئے ہم اس سے باز پرس نہیں کریں گے۔ پھر اس نے مشکلات میں پکارا یہ کہ تیرے سوا کوئی فرمانبرداری کے لائق نہیں۔ بے شک میں مشکلات میں گھر جانے والوں سے ہوں پس ہم نے اس کی دعا قبول کر کے غم سے نجات دی ہم اسی طرح مومنوں کو مصائب سے نجات دیتے ہیں۔

○ الظُّلُمٰتِ کا عمومی معنی ہے اندھیرے' مگر چونکہ اندھیرا کئی قسم کی مشکلات کا موجب ہوتا ہے اس لئے اس کا معنی مشکلات بھی مستعمل ہے۔ چنانچہ عربوں کے ہاں يَوْمٌ مُّظْلِمٌ اس دن کو کہتے ہیں جس میں بہت سی مشکلات و مصائب پیش آئیں۔ اس لئے چونکہ آپ کا مچھلی کے پیٹ میں جانا از روئے قرآن ثابت نہیں اس لئے یہاں الظُّلُمٰتِ کا معنی اندھیرے نہیں مشکلات ہے۔

○ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ میں بھی الظّٰلِمِيْنَ بصورت فاعل کا معنی مصائب میں گھر جانے والوں میں سے ہے' ظلم کرنے والوں میں سے نہیں۔ واضح رہے کہ انبیاء ظالم نہیں ہوتے۔ ظالموں پر تو اللہ تعالیٰ نے لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۱۱/۱۸ کے الفاظ میں لعنت برسائی ہے۔ یونس ؑ اللہ کے برگزیدہ نبی تھے جن سے ہجرت کے تعین کے وقت میں سہو ہوگئی آپ کی قوم آثار عذاب دیکھ کر تائب ہوگئی اور عذاب ٹل گیا۔

○ اگلی آیت مجیدہ سے عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہی نہیں ہے کہ وہ زبردستی گمراہ کرے یا زبردستی سیدھے راستے پر

چلائے۔ اللہ تعالٰی نے ہدایت و گمراہی کی وضاحت کر دی ہے۔ دونوں میں سے کوئی سا راستہ اختیار کرنا ہر کسی کا اپنا کام ہے چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

(۹۹) اور اگر آپ کے رب کا قانون مشیت یہ ہوتا (کہ وہ زبردستی مومن بنائے) تو جو افراد بھی زمین میں ہیں وہ سب کے سب ضرور ایمان لے آتے (اے رسول!) کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ ایمان لے آئیں۔

○ اس آیت مجیدہ سے یہ تصور اخذ کرنا مطلقاً" غلط ہے کہ اللہ تعالٰی نے چاہا ہی نہیں کہ سب لوگ ایمان لے آئیں **لَوْ شَآءَ** کے الفاظ میں اللہ تعالٰی کے قانون مشیت کی خبر دی گئی ہے کہ زبردستی مومن یا کافر بنانا اللہ تعالٰی کا قانون ہی نہیں بلکہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ قوم یونسؑ نے انکار بھی خود کیا تھا۔ اور عذاب کو دیکھ کر ایمان بھی خود لے آئی تھی۔ اور جو قومیں عذاب کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائی تھیں وہ خود ہی ایمان نہیں لائی تھیں۔ ابتداءِ آفرینش سے لے کر آج تک اور آگے قیامت تک کے لئے کفر و ایمان کا یہی اللہ تعالٰی کا قانون چلا آرہا ہے اور چلا جائے گا چنانچہ اگلی آیت میں بتا دیا گیا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

(۱۰۰) اور کسی بھی شخص کے لئے نہیں کہ وہ ایمان لائے۔ سوائے اللہ کے قانون کے (کہ وہ خود ہی ایمان لائے گا اللہ تعالٰی زبردستی مومن نہیں بناتا) اور اللہ تعالٰی بدعقیدگی کی ایسی گندگی ان لوگوں پر مسلط پاتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (کیا یہ چیز عقل کے مطابق ہے کہ اللہ تعالٰی خود گمراہ کرے اور پھر سزا دے)

○ **اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** کا معنی عام تراجم میں یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالٰی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا۔ یعنی جو لوگ ایمان نہیں لاتے انہیں اللہ تعالٰی نے ایمان لانے کی اجازت ہی نہیں دی ہوتی۔ مگر اس طرح چونکہ ایمان نہ لانے والے کفر کے جرم سے بری ہوجاتے ہیں اور حرف اللہ پر آتا ہے۔ اس لئے یہ معنی غلط ہے۔ اوپر **اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** کا معنی لکھا گیا ہے۔ سوائے اللہ کے قانون کے۔ اذن بمعنی قانون ۵۸/۷ خود اللہ تعالٰی نے بالفاظ ذیل بتا دیا ہے:۔

○ **وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ج وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا**" ط ۵۸/۷ اور جو صحت مند زمین ہے اس کی پیداوار عمدہ اور زیادہ نکلتی ہے۔اپنے رب کے (اذن) قانون کے مطابق اور جو زمین ناکارہ ہے اس کی پیداوار اس کے رب کے (اذن) قانون کے مطابق ناقص ہی نکلتی ہے۔ دیکھئے اس آیت میں وضاحتاً" بتا دیا گیا ہے کہ قرآنی لغت کے مطابق اذن کا معنی قانون بھی ہے۔

○ **وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ** کے الفاظ میں وضاحتاً" بتادیا گیا ہے کہ جو لوگ اس غلطی کا شکار ہیں کہ اللہ تعالٰی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے گمراہی میں رکھتا ہے۔ وہ اللہ تعالٰی کی عطا کردہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالٰی ہدایتِ انسانی کے لئے اپنی کتابیں بھی بھیجتا رہا ہے اور نذیر بھی۔ مگر وہ لوگ خود ہی ایمان نہ لائے انہیں اللہ کی کتابوں اور رسولوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

(۱۰۱) (اے رسول) کہہ دیجئے گا کہ غور کرو آسمانوں اور زمین میں (اللہ

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا) کیا کچھ ہے؟ مگر اس کی کائناتی اور تنزیلی آیتیں اور اس کے بھیجے ہوئے ڈرانے والے ان لوگوں کے جو خود ایمان نہیں لاتے کچھ کام نہیں آتے۔

○ اس آیت مجیدہ میں:-
اَلْاٰيٰت کا معنی اللہ تعالیٰ کی کائناتی یعنی صحیفۂ فطرت کی آیتیں اس لحاظ سے ہے کہ اس آیت کے شروع میں آسمانوں اور زمین کی ایک ایک چیز پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تنزیلی آیتیں اس لحاظ سے ہے کہ اسی آیت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ڈرانے والے رسل انبیاً کی خبریں دی گئی۔ اور واضح کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ نہ اللہ تعالیٰ کی ان گوناگوں نشانیوں سے جو کائنات بھر میں بکھری پڑی ہیں فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ اس کی نازل کردہ آیتوں سے حقائق تک پہنچ پاتے ہیں۔ وہ غور و فکر سے کام نہ لیتے ہوئے خود ہی دولتِ ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں' انہیں اللہ تعالیٰ گمراہ نہیں کرتا۔
○ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں خبر دی گئی ہے کہ جو لوگ باری تعالیٰ کی تکوینی یعنی کائناتی اور تنزیلی آیات مجیدہ پر غور کرتے ہی نہیں اور من مانی روش پر قائم رہتے ہیں وہ ان لوگوں کی طرح عذاب کے منتظر ہوتے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ ان پر بھی عذاب ان کی اپنی نافرمانیوں کی بدولت آئے گا اور ان پر بھی ان کی اپنی نافرمانیوں کی بدولت آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم پر بلاوجہ عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ اپنے فرمانبرداروں کو بچا لیتا ہے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

(۱۰۲) پس یہ (اللہ تعالیٰ کی کائناتی اور تنزیلی آیتوں پر غور نہ کرنے والے) نہیں انتظار کرتے مگر ان لوگوں کے دنوں کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں (اے رسول) کہہ دیجئے گا کہ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

(۱۰۳) پھر ہم نے اپنے رسولوں کو اور جو لوگ ایمان لائے عذاب سے بچا لیا۔ بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ مومنوں کو عذاب سے نجات دینا (بچا لینا) ہمارے اوپر لازم ہے۔

○ ان آیات مجیدہ میں عذاب الٰہی کی آمد کے انتظار کی خبر نہایت اہم ہے۔ انتظار کے لفظ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی دائمی سنت کی خبر دی ہے کہ وہ انزالِ عذاب میں جلدی نہیں کرتا۔ مہلت پر مہلت دیتا چلا جاتا ہے تاکہ سرکش قومیں اس کی نافرمانی سے باز آجائیں۔ عذاب اس وقت آتا ہے جب کسی قوم کا پیمانہ ظلم و عصیان لبریز ہو کر چھلک جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قوم یونس کا واقعہ پیچھے قریب ہی کی آیت نمبر ۹۸ میں گزر چکا ہے۔ اگر کوئی قوم عذاب کے آثار دیکھ کر بھی باز آجائے توبہ کر کے اپنی اصلاح شروع کر دے تو باری تعالیٰ آیا ہوا عذاب بھی ٹال دیتا ہے۔ غفور الرحیم جو ہوا۔
○ آمد عذاب کی انتظار میں اللہ کے نبی بھی اس کی سنت و قانون سے واقف تھے۔ بلکہ جب وہ سرکش قوم کو عذابِ الٰہی سے ڈراتے تو قوم انہیں مذاق کیا کرتی کہ جس عذاب کی تم خبر دے رہے ہو لاؤ وہ کہاں ہے کب آئے گا؟ اس پر اللہ کے نبی ارشاد فرماتے کہ میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ساتھی مومنوں کو عذاب سے بچا لے گا چنانچہ **نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** کے الفظ میں باری تعالیٰ نے اعلان کر رکھا ہے کہ ہم اپنے

رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو عذاب سے بچا لیتے ہیں۔ اور انہیں بچا لینا ہم پر لازم ہے **حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ** ○ ۱۰/۱۰۳

○ اسی چیز کی عملی تصدیق آیات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں کہ قوم نوح کو غرق کر دیا گیا مگر انہیں اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ط ۷/۶۴ پس ہم نے بچا لیا نوح کو اور اس کے ساتھیوں کو کشتی کے ذریعہ اور غرق کر دیا ان لوگوں کو جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا (اور اپنی اصلاح نہ کی۔)

○ اسی طرح جناب ہودؑ اور ان کی قوم کے متعلق خبر دی گئی ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۷/۷۲ پس ہم نے بچا لیا ہودؑ کو اور اس کے ساتھیوں کو اپنی رحمت کے ساتھ اور جڑ کاٹ دی ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا (اور اپنی اصلاح نہ کی۔)

○ جناب صالحؑ اور انکی قوم کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّىْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ○ ۷/۷۹ پس قوم صالح کو زلزلے نے پکڑ لیا پھر وہ اپنے اپنے گھروں میں مونڈھے پڑے رہ گئے۔ پھر ہمارا رسول صالح ان سے یہ کہتا ہوا مڑ گیا کہ اے میری قوم بے شک میں نے تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچایا اور تمہیں نصیحت کی مگر تم نے نصیحت کو چاہا ہی نہیں۔

○ لوطؑ کی قوم کے متعلق خبر دی گئی ہے:۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ○ ۸۳-۷/۸۴ پس ہم نے لوطؑ اور اس کے اہل کو بچا لیا سوائے اس کی بیوی کے وہ پیچھے رہنے والوں سے تھی اور ہم نے (قوم لوط کو پتھروں کا) برساؤ برسا کر ختم کر دیا' پھر (اے مخاطب) غور کر کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا؟

○ اسی طرح قوم شعیبؑ کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ○ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۹۱ تا ۷/۹۳

پھر قوم شعیبؑ کو زلزلے نے پکڑ لیا۔ جنہوں نے جھٹلایا وہ ایسے تھے کہ گویا وہ اس بستی میں تھے ہی نہیں۔ پھر شعیبؑ ان سے یہ کہتے ہوئے مڑ گیا کہ اے میری قوم میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور تمہیں نصیحت کی۔ مگر ہوا یہ کہ جناب شعیبؑ کی قوم نے نہ اپنے پیغمبر کی نصیحتوں سے کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ پیغامات الٰہی سے' بلکہ نافرمانیوں پر اڑے رہنے کی بدولت عذاب الٰہی کو مسلسل دعوت دیتے رہے اور جب ان کی سرکشیوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو عذاب الٰہی نے انہیں گھیر لیا اور وہ ختم ہو گئے اللہ تعالیٰ نے جناب شعیب اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا۔

○ آخر پر نبی اکرم خاتم النبین رحمتہ اللعالمینؐ کی قوم کا حال ملاحظہ فرمائیں جس نے نبی اکرمؐ کی ۱۳ سالہ نبوت کی مکی زندگی میں آپؐ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ آپؐ کے مدمقابل تین گروہ تھے۔ ملا پیر اور سرمایہ دار۔ قرآن کریم ان تینوں کی اجارہ داری کے خلاف فتویٰ دیتا ہے:۔

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۹/۳۴ بے شک بہت سے مُلّا اور پیر لوگوں کا مال جھوٹ کے ذریعے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان سب کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیجئے۔

سورہ یونس میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ج اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۱۰/۱۵

اور جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ ہمارے حضور حاضری کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لائیے یا اسے بدل دیجئے۔ آپ کہہ دیجئے گا کہ میں اس کا مجاز نہیں کہ اسے اپنی مرضی سے بدل ڈالوں' میں تو صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اگر میں نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

○ اس پر آپ کے مخالفین نے جو یہود و نصاریٰ اور مشرکین پر مشتمل تھے یعنی جو اللہ کی ہستی کے منکر نہیں تھے کہا: وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ ۸/۳۲ وہ وقت قابل ذکر ہے جب انہوں نے کہا کہ اے ہمارے اللہ اگر یہ قرآن واقعی تیری طرف سے نازل کردہ حق ہے (اگر ہم نے تیری نازل کردہ کتاب کا انکار کیا ہے) تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب نازل کر دے۔

○ اس کے باوجود کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے چونکہ قرآن مجید ان کے ہر سہ گروہ مُلاّ پیر اور سرمایہ داروں کی کھلی مخالفت کرتا ہے اس لئے انہوں نے قرآنی ضابطہ ربوبیت کو تسلیم نہ کیا اور نبی اکرمؐ کے خلاف یہ فیصلہ کر دیا:۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ط ۸/۳۰ وہ وقت قابل ذکر ہے جب ضابطہ الٰہی کا انکار کرنے والوں نے یہ تجویز کی یا آپ کو عمر قید کر دیا جائے یا قتل یا جلا وطن کر دیا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کروا کر آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ان کے شر سے بچا لیا۔ لیکن مخالفین نے عذاب الٰہی کو اس طرح دعوت دی کہ جنگ بدر' احد اور احزاب کی شکل میں بھاری جنگی تیاریوں کے ساتھ نبی اکرمؐ پر حملے شروع کر دیئے مگر ہر بار ذلت آمیز شکست کا شکار ہوتے رہے۔

نبی اکرمؐ کے بڑے بڑے دشمن ان جنگوں میں مارے گئے اور جو باقی بچے وہ فتح مکہ کے موقعہ پر شکست تسلیم کر کے مسلمان ہو گئے۔ نبی اکرمؐ کو معہ ان کے ساتھیوں کے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف بچا لیا بلکہ انہیں ایک عظیم آزاد قرآنی حکومت بھی عطا فرما دی۔

نبی اکرمؐ نے ایک ایسا معاشرہ قائم فرمایا ہے جسے صحیح معنوں میں قرآنی اور اصلاحی معاشرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں نہ کوئی بھوکا تھا نہ ننگا' نہ کوئی بے علاج تھا نہ بے مکان خود کتب روایات میں بھی اس چیز کی تصدیق موجود ہے کہ آپ کے عہد سعادت مہد میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں ملتا تھا کیوں؟

○ صرف اور صرف اس لئے کہ نبی اکرمؐ رحمتہ اللعالمین نے جو رحمت بھرا معاشرہ قائم فرمایا اور جس قرآنی نہج پر آپ نے کاروبار کو گامزن کیا اس میں ہر کس و ناکس کو نہ صرف یہ کہ ضرورت زندگی باقاعدہ میسر تھیں' بلکہ ہر شخص آسودہ حال تھا۔

غریب و امیر، اعلیٰ و ادنیٰ اور آقا و غلام کی تمیز پوری طرح ختم ہو چکی تھی۔

سَلَامٌ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ وَرَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ ○

اگلی آیت مجیدہ ۱۰۴ میں نبی کریمؐ سے اعلان کرا دیا گیا ہے کہ لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق شک میں ہو کہ یہ سچا ہے یا جھوٹا۔ تو سن لو کہ مجھے اس امر میں کوئی شک نہیں۔ میرا دین یقیناً اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ اور سچا دین ہے اور تمہارا دین یقیناً غیر منزل من اللہ اور جھوٹا ہے اس لیے میں ان لوگوں کی فرمانبرداری نہیں کرتا جن کی تم کرتے ہو بلکہ میں اس ذات بے ہمتا کی فرمانبرداری کرتا ہوں جس کے قانون حیات و ممات کے مطابق تمہیں زندگی اور موت ملتی ہے یعنی جو تمہیں زندگی دیتا اور موت دیتا ہے۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ دِیْنِیْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۵﴾

(۱۰۴) (اے رسولؐ) کہہ دیجئے گا کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کے متعلق شک میں ہو (تو میں شک میں نہیں ہوں اسی لئے) میں ان کی فرمانبرداری نہیں کرتا جن کی تم اللہ کے ساتھ شریک بنا کر کرتے ہو ولیکن میں اللہ کی فرمانبرداری کرتا ہوں جو تمہیں فوت کرتا ہے۔ اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ مومنوں میں سے رہوں۔

(۱۰۵) اور (مجھے حکم دیا ہے) کہ اپنے آپ کو دین خالص پر قائم رکھ (اور اللہ کے حکم میں غیر کا حکم شامل کر کے) مشرکوں سے نہ ہو جانا

○ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنی قرآنی لغت کے مطابق اللہ کے سوا بھی ہے اور اللہ کے ساتھ شریک کرکے بھی ہے جیسے کہ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے۔

○ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط ۵/۱۱۶ اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے شریک بنا کر دو الٰہ اور بنا لو۔ پس تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنی اوپر آیت نمبر۱۰۴ میں یہ مراد نہیں کہ وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی فرمانبرداری کرتے تھے بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی فرمانبرداری کے ساتھ ساتھ غیروں کی بھی کرتے تھے۔ احکام الٰہی میں غیر اللہ کے حکموں کو ملا لیتے تھے۔ یعنی کچھ حکم اللہ کے اور کچھ غیر اللہ کے۔ بالفاظِ دیگر وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہیں تھے۔ جیسے کہ سورہ انفال میں ان کا قول بالفاظ ذیل درج ہے۔

○ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ ۸/۳۲ اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب انہوں نے یہ کہا کہ اے ہمارے اللہ اگر یہ قرآن تیری طرف سے حق ہے (اور ہم نے تیری نازل کردہ کتاب کا انکار کیا ہے تو) تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا اور یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب لے آ۔

○ پس نبی اکرمؐ کے مدمقابل اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہیں تھے۔ انہوں نے احکام الٰہی میں غیر اللہ کے احکام کی ملاوٹ کر کے اللہ کے دین کو خالص نہیں رکھا تھا۔ شرک فی الحکم کے بھی مرتکب ہوتے تھے اور شرک فی الصفات کے بھی۔ چنانچہ اوپر والی آیت نمبر۱۰۵ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے خالص دین حنیف پر قائم رکھیں اور اس میں غیر اللہ احکام کی ملاوٹ کر کے مشرک نہ ہو جائیں۔

اللہ کے سوا کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتا: اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی

اور کو مدد کے لئے نہ پکارنا' ورنہ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

(۱۰۶) اور آپ اللہ کے ساتھ ساتھ کسی اور کو (مدد مراد کے لئے) نہ پکاریں جو آپ کو نہ نفع دے سکتا ہے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے۔ پھر اگر آپ نے ایسا کیا تو ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۚ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

(۱۰۷) اور اگر اللہ تعالیٰ (اپنے قانون مشیت کے مطابق) آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو خود اس کے سوا اسے کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ آپ کے لیے کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے بھلائی پہنچاتا ہے اپنے قانون مشیت کے مطابق پہنچاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بچاؤ دینے والا مہربان ہے۔

غیر اللہ سے مدد مرادیں مانگنا شرک ہے: وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ پر دلعہ لگائی گئی ہے۔ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ کی۔ ظلم کا معنی ہے بے ٹھکانہ کام کرنا۔ سورہ لقمان میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے **اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ** ۳۱/۱۳ بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔

○ **مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ** کے الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ غیراللہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ نفع نقصان کے پورے اختیارات اللہ تعالی کے اپنے قوانین مشیت میں مرکوز ہیں۔ غیراللہ کو پکارنے سے شرک کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالی کے اختیارات مخصوصہ میں غیر اللہ کو شریک کرنے کے مجرم ٹھہرتے ہیں جس کے مختلف انداز ہیں۔

○ اللہ تعالی وہ ذات گرامی ہے جس نے عظیم کائنات تخلیق فرمائی ہے جس کی وسعتوں کا اندازہ تک لگانا بھی انتہائی مشکل ہے جس نے مختلف عناصر کے ساتھ اس کارگاہ حیات کو ترتیب دے کر نوع انسانی کی ضروریات زندگی کی ہر چیز کا سامان مہیا کر دیا ہے جو ہر کسی کا کارساز ہے۔ جس نے اپنی بے پایاں رحمت کے ساتھ نوع انسانی کو اشرف المخلوقات ٹھہرا کر اس پوری کائنات کو اس کے لئے مسخر کر دیا ہے:۔

○ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ** ۴۵/۱۳ اور اے نوع انسانی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اس کائنات کی ایک ایک چیز سے اپنی خدمت لینا تیرا کام ہے یہ ساری کائنات تیرے لئے ہے اور تو میری فرمانبرداری کے لئے ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی اولین سورت مجیدہ میں نوع انسانی سے وعدہ لے لیا ہے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ ۱/۴

○ بار الہی! ہم صرف تیری ہی فرمانبرداری کریں گے اور صرف تجھ ہی سے مدد مرادیں مانگیں گے۔

○ اس آیت مجیدہ میں قرآن مجید کے ہر قاری سے پختہ وعدہ لے لیا گیا ہے کہ عبادت بھی اللہ تعالی کی کی جائے گی اور مدد و مرادیں بھی سب اسی سے مانگی جائیں گی۔

نفع و ضرر قانون مشیت کے مطابق پہنچتا ہے ○ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَّشَآءُ کے الفاظ میں قانون مشیت کا اعلان کیا گیا ہے اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی قاعدہ و قانون کے جسے چاہتا ہے اپنی رحمت و فضل عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے تکلیف و ضرر پہنچاتا ہے بلکہ صحیح مفہوم وہی ہے جو اوپر لکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے بھلائی یا ضرر پہنچاتا ہے اپنے قانون مشیت کے مطابق پہنچاتا ہے۔ سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوا ہے۔

○ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ۴۲/۳۰ اے نوع انسانی! تمہیں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے' اسی طرح سورت روم میں ارشاد ہوا ہے۔

○ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ ۳۰/۴۱ خشکی اور اجتماعی اور انفرادی آرام و آلام کے اسباب انسان خود پیدا کرتا ہے۔

مثلاً اگر انفرادی طور پر کوئی شخص پہلی تاریخ کو تنخواہ لے کر جوئے میں ہرا دے تو مہینہ بھر کی تنگدستی اور پریشان حالی اس کے لئے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوگی۔ اللہ کی نہیں' اجتماعی تکلیف کی مثال قرآن مجید میں موجود ہے کہ جنگ احد میں جب عقبی درّے کو غیر محفوظ چھوڑ دیا گیا تو صحابہؓ کی اس غلطی کی بدولت دشمن نے پیچھے سے حملہ کر کے لشکر اسلام کو کاٹنا شروع کر دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی فتح مبدّل بہ شکست ہوگئی۔ اس واقعہ کے مطابق سورہ آل عمران میں بالفاظ ذیل خبر دی گئی ہے۔

○ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ط قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○ ۳/۱۶۵ اور کیا جب تمہیں شکست کی مصیبت پہنچی حالانکہ تم نے اس سے دگنی شکست انہی کو (جنگ بدر میں) دی تھی۔ تم نے کہا کہ ہمیں یہ شکست کہاں سے آئی ہے۔ اے رسولؐ کہہ دیجئے گا کہ یہ تمہارے اپنے ہی افراد کی طرف سے آئی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تو فتح و شکست سمیت ہر چیز کے اندازے پیمانے اور قانون مقرر کرنے والا ہے' پس قرآن کریم کی رو سے ثابت ہے کہ ہر رنج و راحت رب تعالیٰ کے متعینہ قوانین مشیت کے مطابق ہی آتی ہے۔

ہدایت وگمراہی بھی ہر شخص خود اختیار کرتا ہے:۔ اگلی آیات مجیدہ میں قرآن مجید کو ذریعہ ہدایت بتا کر اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہدایت یا گمراہی اختیار کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾

(۱۰۸) (اے رسولؐ) کہہ دیجئے گا کہ بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق قرآن آگیا ہے پس جو کوئی اس سے ہدایت پائے سوائے اس کے نہیں کہ وہ اپنے ہی لیے ہدایت پاتا ہے اور جو کوئی خود گمراہ ہوجائے تو سوائے اس کے نہیں کہ اس گمراہی کا وبال اس کی اپنی جان پر ہوگا اور میں تم پر داروغہ نہیں (کہ زبردستی ہدایت دوں۔)

○ بالکل یہی الفاظ سورۃ زمر میں آئے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ج فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○ ۳۹/۴۱ (اے رسول) بے شک ہم نے آپ پر لوگوں کے لئے اپنی سچی کتاب نازل فرمائی ہے پس جو کوئی خود ہدایت

پائے وہ اپنے ہی لئے ہدایت پائے گا۔ اور جو کوئی خود گمراہ ہوجائے تو سوائے اس کے نہیں کہ اس کی گمراہی کا وبال اس کی اپنی جان پر ہوگا۔ اور آپ ان پر داروغہ نہیں (کہ انہیں زبردستی ہدایت دیں۔) ان آیات مجیدہ میں **اِنَّمَا** کلمہ حصر لا کر اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہدایت پانا یا گمراہ ہوجانا انسان کا اپنا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو زبردستی ہدایت دیتا ہے اور نہ کسی کو زبردستی گمراہ کرتا ہے یہی اس کا قانون مشیت ہے۔

محکمات و متشابہات ○ ہدایت و گمراہی کے ضمن میں بعض آیات مجیدہ متشابہات ہیں جن کی اساس پر بعض علماء کرام ہدایت و گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے اور بر سر منبر اعلان کرتے ہیں **مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ** یعنی جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرنے والا ہے اور جسے گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ ادھر باری تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ گمراہوں کو دردناک عذاب میں گرفتار کیا جائے گا۔ لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی گمراہ کرے اور خود ہی گمراہ کردہ کروڑوں افراد کو سزا بھی دے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر ہرگز ہرگز ذات باری کے شایان شان نہیں۔

○ یہ غلط نظریہ اس قدر زبان زد عوام ہے کہ ہدایت و گمراہی کے متعلق جہاں بھی ذکر آجائے تو اچھے بھلے پڑھے لکھے افراد جھٹ کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی مرضی ہے جسے چاہے ہدایت دے' جسے چاہے گمراہ کر دے۔ معاذ اللہ! استغفراللہ!

○ یہ ٹھیک ہے کہ مذکورہ قسم کے الفاظ ذیل سورہ زمر میں آئے ہیں **وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ** ○ **وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ** ط ۳۶۔ ۳۹/۳۷ لیکن یہ دونوں آیتیں متشابہات ہیں جن کا مفہوم محکمات کے ماتحت رکھنا لازم ہے تاکہ ایک تو آیات قرآنیہ میں تضاد ثابت نہ ہونے پائے کیوں کہ ۴/۸۲ کے مطابق ہر وہ تدبر غلط ہے جس سے قرآن مجید میں اختلاف ثابت ہوتا ہو۔ جیسا کہ اسی سورہ زمر کے الفاظ صرف چار آیتیں آگے ۳۹/۴۱ کے پیچھے گزر چکے ہیں جو ۱۰/۱۰۸ کے عین مطابق ہیں کہ ہدایات پانا اور گمراہ ہونا انسان کا اپنا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں کہ لوگوں کو پہلے تو خود گمراہ کرے اور پھر خود ہی سزا دے۔ نہ ہی زبردستی ہدایت دیتا ہے نہ زبردستی گمراہ کرتا ہے۔

○ واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیتیں ۳۹/۴۱ + ۱۰/۱۰۸ محکمات ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ یہ عدل وانصاف کے عین مطابق ہیں کہ جو کوئی ہدایت پائے وہ اس کی جزا کا مستحق ہو اور جو گمراہ ہوجائے وہ خود گمراہ ہو اور اس کی بدولت سزا کا مستوجب ہو۔ پس آیات بالا ۳۶۔ ۳۹/۳۷ متشابہات ہیں جنہیں محکمات کے ساتھ ٹکرانے کی بدولت ان کے ماتحت رکھا جائے گا۔ متشابہ آیات کا مفہوم مع متن یہ ہے:۔

○ **وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ** ○ **وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ**○ ۳۶۔ ۳۹/۳۷ اور جسے اللہ تعالیٰ (اس کی انتہائی نافرمانیوں کی بدولت) گمراہ ٹھہرا دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں نیز جس کو اللہ تعالیٰ اس کی کمال اطاعت کی بدولت ہدایت یافتہ قرار دیدے۔ اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ اسی ہدایت اور گمراہی کے ضمن میں

محکم آیت مجیدہ ○سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوا ہے : **وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ** ○ ۴۲/۱۳ اور وہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف اسے ہدایت دیتا ہے اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ جو خود اس کی طرف رجوع کرتا ہے یہ آیت محکم ہے کہ عدل و انصاف کے بھی مطابق ہے اور قواعد عرب کی رو سے بھی اس کے صرف مذکورہ بالا ایک ہی معنی برآمد ہوتے ہیں۔

متشابہ آیت مجیدہ ○ سورہ حج میں ارشاد ہوا ہے : **وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ** ○ ۲۲/۱۶ یہ آیت مجیدہ متشابہ ہے کیوں کہ قواعد عرب کی رو سے اس کے دو معنی برآمد ہوتے ہیں:۔

۱۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دیتا ہے کہ ہدایت حاصل کرنے کا وہ خود ارادہ کرتا ہے۔

۲۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دیتا ہے جسے ہدایت دینے کا خود (اللہ) ارادہ کرتا ہے۔

○ قواعد عرب کی رو سے یہ دونوں معنی صحیح ہیں۔ یعنی فعل **يُرِيْدُ** کا فاعل **مَنْ** بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اس کا فاعل اللہ کو بنانے سے ناموس باری داغدار ہوتی ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے خود ہدایت دینے کا ارادہ نہیں کیا تو اس کے ہدایت نہ پانے میں معاذ اللہ قصور اللہ تعالیٰ کا ہے۔ بندے کا نہیں۔ اس لئے اس آیت ۲۲/۱۶ متشابہ کو محکم آیت ۴۲/۱۳ کے ماتحت رکھ کر یہ مفہوم لینا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے ہی ہدایت دیتا ہے۔ جو ہدایت حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اگلی سورہ یونس کی آخری آیت مجیدہ میں ہے جس میں نبی اکرمؐ کو صرف وحی الٰہی قرآن کریم کی اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ واجب الاتباع صرف قرآن مجید ہے:

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝	(۱۰۹) اور آپ اس کی اتباع کریں جو آپ کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ (قرآن کریم) اور مستقل مزاجی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھیں حتیٰ کہ اللہ آخری فیصلہ کر دے۔ وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

○ سورہ یونس کی آخری آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ کی کامیابی آپ کی مستقل مزاجی اور انتھک محنت کا نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا آخری فیصلہ فتح مکہ تھی جس کے متعلق خوش خبری دی گئی تھی **اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا** ○ ۱۱۰/۱-۲ جب اللہ کی مدد یعنی فتح آجائے گی تو آپ دیکھیں گے کہ اللہ کے دین میں لوگ فوج در فوج داخل ہوں گے۔ **سَلٰمٌ عَلٰى مُحَمَّدٍ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ**

یہ سورہ مجیدہ ۱۲۳ آیات مجیدہ پر مشتمل ہے۔ پوری سورہ مجیدہ عالمگیر نصائح اور سابقہ نافرمان قوموں کے ذکر سے معمور ہے تاکہ اس کے قاری ان کے حالات سے عبرت پکڑیں۔

سابقہ سورہ مجیدہ کے ساتھ ربط

سابقہ سورہ یونس اس حکم پر ختم ہوئی ہے **واتبع مایوحی الیک** یعنی اے رسول! اس چیز کی اتباع فرمائیں جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ اور اس سورہ مجیدہ کی ابتدا میں اس وحی کی گئی چیز کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہ وہ ایک اکلوتی کتاب ہے جس کی متشابہ آیتیں بھی محکم آیات کے ذریعہ محکم کر دی گئی ہیں اور پھر بڑھ کر صاحب حکمت اور بڑھ کر خبر رکھنے والی ذات مقدس اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفصل کر دی گئی ہیں یعنی کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔

سورہ ہود کا نفس مضمون بھی سابقہ سورہ مجیدہ یونس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس میں موسیٰ اور یونس کا ذکر آیا ہے اور اس میں نوح، ہود، ابراہیم، لوط، شعیب اور موسیٰ سلام علیہ کے حالات بیان ہوئے ہیں انبیاء سلام علیہم کے عزم و استقلال کی خبریں بھی دے دی گئی ہیں۔ سورہ مجیدہ کے شروع میں حروف مقطعات کے ذریعہ نبی اکرمؐ کو خطاب کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۝۱	اللہ رحمان و رحیم کے نام سے پڑھ تو اے امین۔ لین القلب راکع! ایک اکلوتی کتاب (جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے) اس کی آیتیں محکم کر دی گئی ہیں اور پھر وہ بڑھ کر حکمت والے اور بڑھ کر خبر رکھنے والے کی طرف سے مفصل کر دی گئی ہیں۔

حروف مقطعات کی بحث دیباچہ میں گزر چکی ہے کہ یہ نبی اکرمؐ کے وہ القاب گرامی ہیں، جن کے ساتھ باری تعالیٰ نے آپ کو مخاطب فرمایا تھا۔ الف سے مراد ہے امین۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو امانت داری کے ساتھ بغیر کسی کمی و بیشی کے لوگوں تک پہنچانے والا۔ لام سے مراد ہے لین القلب یعنی انتہائی گداز ذہن والا، جو عوام کی بدحالی میں گھلتا رہتا تھا۔ اور جس کی ہمہ وقت کوشش یہ تھا کہ نوع انسانی مصائب و آلام کے جہنم سے نکل کر خوشحالی اور فارغ البالی کی جنت میں داخل ہو جائے۔ اور را سے مراد ہے راکع یعنی قانون الٰہی کے سامنے ہر وقت عملاً" جھکا رہنے والا، یعنی اپنی خواہشات پر احکام الٰہی کو مقدم قرار دینے والا۔

ان گرانقدر خطابات کے ساتھ نبی اکرمؐ کو مخاطب کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کِتٰبٌ ایک اکلوتی کتاب ہے۔ یعنی پیچھے صرف مایوحی کے الفاظ میں جس چیز کے وحی کئے جانے کی خبر اور جس کی اتباع کا حکم کیا گیا ہے وہ ایک کتاب ہے (قرآن مجید) نہ اس کے سوا کوئی اور چیز وحی کی گئی ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور چیز وحی ہوئی ہے۔ اکیلا قرآن مجید کتاب مقدس ہی وحی الٰہی ہے۔

احکمت أیته کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اس کتاب قرآن مجید کی آیتیں محکم کر دی گئی ہیں اس سے ظاہر ہے کہ سورہ آل عمران ۷/۳ میں جو خبر دی گئی ہے۔ **مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ**

فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ ۳/ ۔
(وقف لازم)

قرآن مجید میں کچھ آیتیں محکمات ہیں وہی اصل کتاب ہیں اور دوسری قسم متشابہات ہیں (یعنی جن سے محکمات کے خلاف شبہ پیدا ہوتا ہے) وہ محکمات کی مثل و مانند ہیں۔ مگر جن لوگوں کے ذہنوں میں ٹیڑھا پن ہے وہ اس مفہوم کی اتباع کرتے ہیں جس سے محکمات کے خلاف شبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی غرض فتنہ و فساد اور من مانی تاویل کی تلاش ہے اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

آیت مجیدہ کے ان الفاظ **احکمت اٰیٰتہ** میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی متشابہ آیات مجیدہ کو خود محکم کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ بہت بڑھ کر حکمت والا اور بہت بڑھ کر خبر رکھنے والا ہے۔ محکمات کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہے **ھن ام الکتب** کہ قرآن مجید کی اصل و بنیاد محکمات ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ متشابہ آیتیں جن سے محکمات کے خلاف شبہ پیدا ہوتا ہے انہیں ان محکم آیتوں کے ماتحت رکھا جائے گا یعنی ان کا وہ مفہوم لیا جائے گا جو محکمات کے مطابق ہو پس آیت بالا کے واضح **احکمت اٰیٰتہ** کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ متشابہ آیات مجیدہ کو محکمات کے مفہوم کے ساتھ محکم کر دیا گیا ہے ورنہ وہ متشابہ تو ہیں ہی۔ مگر وہ لوگ جو ان کا فتنہ انگیز مفہوم اخذ کرتے ہیں ان کے اذہان ٹیڑھے ہیں وہ دین میں فتنہ پیدا کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر بلاغ القرآن کے صفحات میں بارہا لکھا جا چکا ہے کہ یہ عقیدہ جو زبان زد عوام ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کر دے یہ انتہائی فتنہ پرور نظریہ ہے جس سے ہر گمراہ اور بدکار شخص یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ میں جو بدکار ہوں تو مجھے اللہ تعالیٰ نے خود بدکار اور گمراہ رکھا ہے۔ اتنی دیدہ دلیری کہ اپنی بدکاریوں کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ کو قرار دے دیا جائے۔ یہ صرف متشابہات کے فتنہ انگیز مفہوم کی بدولت ہے۔ حالانکہ آیات محکمات کے ذریعہ اعلان کر دیا گیا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۝ ۴۱/۴۶ جو کوئی اچھے عمل کرتا ہے۔ پس وہ اس کی اپنی جان کے لیے ہے اور جو کوئی برے عمل کرتا ہے ان کا وبال اس کی اپنی جان پر ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب (خود برے عمل کروا کر) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ اب بتایئے! کیا اس محکم آیت کی موجودگی میں یہ تصور بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت دے جسے چاہے گمراہ کر دے۔ کیا وہ ظلّام ہے جو بندوں سے زبردستی برے عمل کرواتا ہے؟ پس جن آیتوں سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے وہ متشابہات ہیں۔ اللہ نے انہیں اپنی آیات محکمات کے ذریعے محکم کر دیا ہے۔ ان کا مفہوم محکمات کے ماتحت رکھنا لازم ہے۔ تاکہ نہ فتنہ انگیزی کے مجرم ہوں اور نہ اپنے جرم اللہ کے ذمہ لگانے کا ارتکاب کیا جاسکے۔

احکمت اٰیٰتہ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس کی آیتیں پُر حکمت کر دی گئی ہیں۔ یہ مفہوم بھی صحیح ہے مگر اول الذکر مفہوم اس سے بہتر ہے۔ جو فتنہ انگیزی کے انسداد کا ضامن ہے اور جس قدر بھی نئے یا پرانے فتنے سامنے آتے ہیں، وہ سب کا واحد قرآنی حل ہے۔

فصلت من لدن حکیم خبیر کے الفاظ میں ایک اہم حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کی تفصیل اللہ ہی کر سکتا ہے کیونکہ وہی صاحب علم و حکمت ہے۔ سورہ فرقان میں ارشاد ہوا ہے **وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا** ۲۵/۳۳۔ اور اے رسولؐ! لوگ آپ کے پاس قرآن کی مثل نہیں لائیں گے۔ مگر ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس قرآن حکیم بھی لاتے ہیں اور اس کی احسن تفسیر بھی لاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کتاب کی تفسیر و تشریح وہ شخص کر سکتا ہے جو یا تو صاحب کتاب کے علم سے زیادہ علم رکھتا ہو اور یا کم از کم اس کے برابر کے علم کا مالک ہو۔ مگر چونکہ قرآن مجید کتاب ہے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے علم سے زائد علم ہونا تو درکنار اس کے علم کے برابر بھی کوئی علم نہیں رکھتا۔ اسی لیے اپنی کتاب کا مفسّر اور مشرّح وہ خود آپ ہے کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی قرآن کریم کی تفسیر و تشریح کرنے کا مجاز نہیں۔

سورہ شوریٰ میں خبر دی گئی ہے کہ اپنے دین کی تشریح خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ **شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ** ۴۲/۱۳۔ تمہارے لیے دین کی تشریح خود اللہ تعالیٰ نے کر دی ہے جو لوگ غیر اللہ سے قرآن کی تشریح کرواتے ہیں وہ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے **أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ** ۲۱/۴۲۔ کیا انہوں نے اللہ کے شریک ٹھہرا لئے ہیں جو ان کے لیے دین کی تشریح کریں۔ جس کی اللہ تعالیٰ نے ہرگز اجازت نہیں دی۔ بلکہ دین کی تشریح اس نے خود کر دی ہے۔ (۴۲/۱۳) نیز غیر اللہ سے دین کی تشریح کرانا اس قدر غیر پسندیدہ عمل ہے کہ ارشاد ہوا ہے۔ **وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ**○ ۴۲/۲۱۔ اگر قیامت تک کی مہلت کا فیصلہ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان کا یہیں فیصلہ کر دیا جاتا۔ بیشک دین اللہ کی غیر اللہ تشریح کرنے والے ظالموں کے لیے درد ناک عذاب ہے' دیکھا آپ نے ایک طرف غیر اللہ شارعین دین کو شرک کے مرتکب قرار دیا گیا ہے ۴۲/۲۱' اور دوسری طرف ان کے لیے درد ناک عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ ۴۲/۲۱

اگلی آیات مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو خطاب جاری کرتے ہوئے آپ کے ذریعہ نوع انسانی کو حکم دیا گیا ہے۔

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ○	(یہ کہہ دیجئے گا) اللہ کے سوا کسی کی فرمانبرداری نہ کرو بیشک میں تمہیں نافرمانی کی سزا سے ڈرانے والا اور اطاعت کی جزا کی خوشخبری دینے والا ہوں۔
وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُم مَّتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ○	اور یہ کہ اپنے رب کے حضور بخشش مانگو پھر برے کاموں سے باز آکر اس کی طرف رجوع کرو۔ وہ تمہیں وقت مقررہ تک اچھا فائدہ دے گا اور وہ ہر نیک عمل کرنے والے کو اس کے اچھے عملوں کی جزا دیگا اور اگر تم روگردانی کرو تو میں تم پر بڑے دن کا عذاب آنے سے ڈرتا ہوں۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ④ تمہارا قیامت کو اعمال کی جواب دہی کیلئے حاضر ہونا اسی کی عدالت میں ہے وہ ہر چیز کے ٹھیک ٹھیک انداز سے پیمانے اور قانون مقرر کرنے والا ہے۔

○ ۱۔ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ یعنی رب تعالیٰ سے بخشش مانگنے کا یہ تصور مطلقاً غلط ہے کہ محض زبان سے توبہ توبہ کر لی جائے یا اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ کا ورد کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ توبہ اس کی قبول ہوتی ہے جو آئندہ کے لیے برے اعمال یکسر ترک کر دے' اور آئندہ کے لیے نیک عمل بجا لانے شروع کر دے' جیسے کہ سورہ نحل میں ارشاد ہوا ہے:۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۱۶/۱۱۹ پھر بے شک تمہارا رب ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے برے عمل کرتے ہیں۔ پھر وہ اس کے بعد توبہ کریں یعنی برے کاموں سے باز آجائیں اور اصلاح کے کام (یعنی نیک کام) کرنے لگیں۔ تو بے شک تیرا پروردگار اس کے بعد غفور رحیم ہے۔ یعنی برے کاموں سے باز آنے اور نیک کام شروع کر دینے کے بعد بخشنے والا مہربان ہے۔

۲۔ وَیُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ کا لفظی معنیٰ یہ ہے کہ وہ اللہ ہر بزرگی والے کو اس کی بزرگی عطا کرے گا یہ ایک محاورہ ہے۔ اور اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی بھی بزرگی والے یعنی نیک کام کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس کے نیک کاموں کی نیک جزا دے گا۔

۳۔ الی اللہ مرجعکم کا لفظی معنیٰ یہ ہے کہ تمہارا لوٹ کر جانا اسی یعنی اللہ ہی کی طرف ہے لیکن اس کا روایتی مفہوم غلط ہے کہ انسان اللہ ہی میں سے نکلا ہوا ہے۔ اور اس نے اسی میں لوٹ کر چلے جانا ہے۔ چنانچہ اسی نظریہ کی رو سے بزرگوں کی وفات کو وصال کے الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ کا وصال ہو گیا ہے' واصل باللہ ہو گئے ہیں یہ تصور مطلقاً غلط ہے الی اللہ مرجعکم کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ نوع انسانی کے ہر فرد کو قیامت کو دوبارہ اٹھنا اور اور اس کے اعمال کی جواب دہی کے لیے' اللہ تعالیٰ کی عدالت عالیہ میں حاضر ہونا ہے۔ جس کے متعلق محکم آیات مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ ﹰالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَظْلِمُوْنَ ○ ۹/۷-۸ اور یاد رکھو موازنہ اعمال قیامت کا حق ہے پس جن کا موازنہ اعمال نیکیوں کا بھاری ہو جائے گا۔ وہ کامیاب ہوں گے اور جن کا موازنہ اعمال نیکیوں کا ہلکا ہو جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹا پہنچایا۔ وہ اس لیے ناکام ہو جائیں گے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ ظلم:۔ باری تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں۔

۱۔ سرفہرست یہ ہے کہ اس کی آیتوں کو پڑھنا اور ان پر عمل نہ کرنا۔

۲۔ اس کی آیتوں کا ورد تو کرنا' ان کی تلاوت کو روز مرہ کا وظیفہ تو ٹھہرانا مگر یہ نہ سمجھنا کہ ان میں کیا حکم دیئے گئے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی بجائے صرف گھول کر پینا۔

۴۔ بعض آیتوں کو منسوخ الحکم قرار دینا۔ کہ یہ صرف تلاوت کے لیے ہیں ان کا حکم ختم کر دیا گیا ہے۔
۵۔ آیات قرآنیہ کے خلاف عقیدہ رکھنا اور ان کے خلاف عمل کرنا اس کی آیتوں پر صریح ظلم ہے جس کی سزا اخروی زندگی کی ناکامی بتائی گئی ہے۔

ھو علی کل شی قدیر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے صحیح صحیح اندازے پیمانے اور قانون مقرر کرنے والا ہے۔ قیامت کی عدالت عالیہ میں اعمال کی جواب دہی کا قانون صد فیصد صحیح اور درست ہے یعنی جو لوگ اس زندگی میں اپنے گناہوں کی سزا اس لیے نہ پاسکیں کہ انہیں بے پایاں وسائل میسر ہیں۔ کیا انہیں ان کے گناہوں کی سزا نہیں ملنی چاہیئے؟ اور اسی طرح جن لوگوں پر اس زندگی میں ظلم ہوا اور ان کی مظلومیت کی جزا اس دنیا میں نہیں ملی' تو کیا انہیں جزا نہیں ملنی چاہئے؟ ایسا ہونا چونکہ عدل و انصاف کے خلاف ہے اس لیے قیامت کی عدالت عالیہ کی حاضری کا قانون مقرر کرنا صد فیصد صحیح اور درست ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں ضابطہ الٰہی کے منکروں کے متعلق خبردار کیا گیا ہے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

خبردار رہو اور سنو کہ بیشک یہ روگردانی کرنیوالے اپنے ذہنوں کو کوتہ کرتے لپیٹتے ہیں تاکہ اس سے چھپے رہیں سنو جس وقت وہ اپنے کپڑے لپیٹتے ہیں (یعنی بھاگ جانے کی تیاری کرتے ہیں) تو وہ (اللہ) جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں بلا شبہ وہ ذہنی پوشیدگیوں تک کو بہت بڑھ کر جاننے والا ہے۔

۱۔ **يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ** کا لفظی معنی یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنوں کوتہ کرتے یعنی لپیٹ لیتے ہیں۔ ذہنوں کوتہ کرنا محاورہ ہے جو کسی بات کو ارادۃً نہ سننے کے لیے آتا ہے۔ ضابطہ حیات۔ چونکہ سرمایہ داروں' جاگیرداروں اور کارخانہ داروں وغیرہ استحصالی لوگوں کے خلاف ہے۔ اس لیے بتایا گیا ہے کہ وہ اسے سننا چاہتے ہی نہیں تھے' وہ اپنے ذہنوں کو اس کے لئے کشادہ نہیں کرتے تھے تنگ ذہنی اور تنگ نگہی سے سنتے تھے۔

۲۔ **لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ** کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اس سے ان کی غرض یہ تھی۔ کہ اس ضابطہ قانون سے چھپے رہیں جو ان کے استحصالی نظریہ' تصور اور اعمال کی مخالفت کرتا اور انہیں غلط قرار دیتا ہے۔

۳۔ **يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ** کا لفظی معنی ہے وہ اپنے کپڑے لپیٹتے ہیں۔ یہ بھاگ جانے اور فرار ہو جانے کے لئے محاورۃً آتا ہے۔ کیونکہ کوئی شخص جب کسی جگہ سے بھاگ جانا چاہتا ہے تو پہلے اپنے کپڑوں کو لپیٹتا اور سمیٹتا ہے وہ لوگ جو عوام کا استحصال کرتے تھے۔ جب وہ نبی اکرمؐ کے درس قرآن میں آتے یا کسی طرح لے آئے جاتے تو پہلے تو وہ یثنون صدورھم کرتے یعنی کشادہ ذہنی کے ساتھ اللہ کا کلام سنتے ہی نہ تھے اور پھر وہاں سے بھاگ جانے کی تیاری کرکے بھاگ جاتے۔

ہر جاندار کے لیے رزق پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ ○ اگلی آیت مجیدہ انتہائی اہم ہے۔ جس سے یہ غلط تصور لے لیا گیا ہے کہ دنیا میں جن لوگوں کو تنگی کے ساتھ رزق میسر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اپنے نظام کے مطابق ہے اور جسے

فراخی میسر ہے یہ بھی اسی کی طرف سے ہے۔ اور اس طرح استحصالی لوگ دل کھول کر عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ اگلی آیت میں حضرت انسان سمیت زمین پر رہنے والے ہر جاندار کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ﴿٦﴾

(۶) اور زمین میں نہیں کوئی بھی جاندار مگر سب کیلئے (رزق کے سامان پیدا کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہ اللہ خوب جانتا ہے اس کے رہنے کی جگہ کو اور وہ اس کے سونپے جانے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔ یہ سب کچھ بصورت مشہود اس کی کھلی کتاب کائنات میں موجود ہے۔

حیوانات اور حصول رزق **اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا** کا مفہوم گیا یہ ہے کہ جب:۔

ہر کسی کا رزق اللہ کے ذمہ ہے تو اب کسی کو حصول رزق کے لیے کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟ **مَامِنْ دَابَّةٍ** میں ہر جاندار شامل ہے اور رزق سے متعلقہ حقائق کے لیے اعلان کر دیا گیا ہے' **كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ**' یعنی ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری کا مشاہدہ اللہ کی کھلی کتاب کائنات میں ہر آن موجود ہے۔ آیئے! کائنات میں ملاحظہ فرمائیں کہ ہر صبح کو ہر جاندار روزی کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتا ہے۔ چڑیا' کوے' فاختائیں' بلیاں' کتے حتیٰ کہ چیونٹیاں تک رزق کے تلاش میں نکل پڑتی ہیں۔ جنگلی جانور شیر' چیتے' بھیڑیئے' لومڑ شکاری جانور بھی تلاش رزق میں کوشاں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہرن' جنگلی بکرے اور خرگوش تک سب خود تلاش رزق کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رزق کی ذمہ داری کے مطابق ہر قسم کے جنگلی جانوروں کے لیے جنگل میں ان کے رزق کا سامان مہیا کر رکھا ہے۔ شکاری جانوروں کے لیے جنگل میں شکار کا سامان موجود ہے اور غیر شکاری جانوروں' ہرن' بکری' بارہ سینگوں اور گایوں وغیرہ کے لیے جنگل کی پوری چراگاہیں' اللہ تعالیٰ کا بچھا ہوا دسترخوان ہے' مگر ہر جانور کو حصول معاش کے لیے خود اٹھنا پڑتا ہے جنگل میں جانا اور خوراک حاصل کرنی ہوتی ہے۔ مشاہدہ یہی ہے جس کے متعلق باری تعالیٰ نے اعلان کر رکھا ہے **كل فى كتاب مبين**' یعنی کہ رزق کی الٰہی ذمہ داری کا مشاہدہ کتاب کائنات کے کھلے اوراق میں موجود ہے کہ اللہ نے رزق مہیا کر دیا ہے' اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد ہر جاندار کو اپنے گھر سے اپنی غار سے نکل کر خود کرنی ہوتی ہے کسی کی غار میں رزق کبھی نہیں پہنچتا۔

انسان اور حصول رزق اب آیئے حضرت انسان کی طرف! جب تک انسان غاروں میں رہتا تھا اس وقت تک جنگل کے خود رو میوے اس کی خوراک اور بہتے چشموں کا پانی اس کا مشروب تھا۔ لیکن جب اس نے غاروں سے نکل کر بستیوں میں رہنا شروع کر دیا۔ رہائش کے لیے پہلے جھونپڑیاں بنائیں پھر کچے اور پکے مکان بنائے۔ غذا کے لیے ہر قسم کے اجناس حاصل کرنے کے لیے زراعت کا سلسلہ جاری کیا۔ جنگلی گایوں' بھینسوں اور بھیڑ بکریوں سے دودھ حاصل کیا۔ تو اس کی ان ضروریات کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنگلوں میں مذکورہ قسم کے دودھ دینے والے جانوروں کی وافر مقدار پہلے ہی پیدا کر رکھی تھی۔ انہیں پکڑنا اور جنگلی مزاج سے شہری مزاج میں ڈھالنا' اس کا اپنا کام تھا جو اسے خود ہی کرنا پڑا اور اس نے خود ہی کیا۔

زراعت کے لیے باری تعالیٰ نے رزق کی فراہمی کے تمام ذرائع مہیا کر رکھے ہیں۔ زمین کے اندر فصلوں کو اگانے کی

خصوصیت مہیا کر دی ہوئی ہے۔ انہیں بڑھانے اور پکانے کے لیے سورج کی بہت بڑی بھٹی دہکا رکھی ہے پھر موسموں کی تبدیلی اور دن رات کے بدل بدل کر آنے کا انتظام' فصلوں ہی کے پیدا کرنے بڑھانے اور پکانے کے لیے ہے فصلوں کو سیراب کرنے کے لیے بارشوں اور دریاؤں کا اہتمام کر دیا ہوا ہے کہ فصلوں کو بارش کے پانی سے بھی سیراب کیا جاسکتا ہے اور دریاؤں سے نہریں نکال کر بھی یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی رزق کی ذمہ داری کہ اس نے اس کے حصول کے لئے مکمل سامان مہیا کر دیئے ہیں حصول رزق میں فصلیں بونا کاٹنا اور گاہنا انسان کا اپنا فرض ہے۔

○ **یعلم مستقرھا** کے الفاظ میں ہر جاندار کی رہائش کو جاننے کی خبر دی گئی ہے۔ پرندے درختوں پر رہتے ہیں' ان کے لیے درخت مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن گھونسلا بنانا ان کا اپنا کام ہے۔ جنگلی جانور غاروں یا خود کھودی ہوئی کھچاروں میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے پتھریلی غاریں بھی مہیا کر دی گئی ہیں اور نرم زمین بھی۔ اس کے علاوہ انسان کو چونکہ ترقی پسند پیدا کیا گیا ہے جو نہ غاروں پر اکتفا کر سکتا ہے نہ کچے مکانوں اور نہ عام پختہ مکانوں پر۔ اس لیے اس کے لیے سیمنٹ' بجری' لوہا وغیرہ ہر چیز کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔ نئے سے نئے اعلیٰ مکانوں کا مشاہدہ کائنات کی کھلی کتاب میں موجود ہے۔

مستودعھا میں مستودع کا سہ حرفی مادہ ۔ و۔د۔ ع ہے جس کا بنیادی معنی ہے وداع کرنا امانت میں دینا سونپنا۔ وداع کرتے وقت کہا جاتا ہے فی امان اللہ۔ یعنی مسافر کو اللہ تعالیٰ کو سونپا جاتا ہے۔ مستودع ظرف مکان ہے یعنی امانت میں دیئے جانے اور سونپے جانے کی جگہ۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں آمدہ لفظ مستقر بھی ظرف مکان ہے' یعنی قرار پکڑنے اور رہنے کی جگہ۔ سابقہ مفسرین نے مستقر کا معنی لیا ہے ماں کا پیٹ' جہاں بچہ صرف نو ماہ قرار پکڑتا ہے اور مستودع کا معنی لیا ہے قبر۔ لیکن یاد رہے چونکہ یہ الفاظ **مامن دابة فی الارض الا علی اللہ رزقھا** کے ضمن میں آئے ہیں' اسلیے مستقر اور مستودع کا تعلق ہر جاندار کی زمینی زندگی کے ساتھ ہے۔ اور اس کے رزق اور مستقر یعنی اس کی خوراک اور رہائش سے متعلق ہے۔ اس لیے مستقر اور مستودع کا معنی ماں کا پیٹ اور قبر صحیح نہیں ہے بلکہ زمین کے ہر جاندار کی زمینی زندگی میں اس کی ضروریات رہائش اور خوراک کو اللہ کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

نیز باری تعالیٰ نے ہر جاندار کے مسئلہ مستقر اور مستودع کو سمجھنے کے لیے اعلان کر دیا ہے **کل فی کتب مبین** زمین کے ہر جاندار کے مستقر (جائے قرار۔ رہائش) اور مستودع (سونپے جانے کی جگہ) کا مشاہدہ کائنات میں اس کھلی کتاب میں موجود ہے۔ بالفاظ دیگر مشاہدہ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہر جاندار کے مستقر کا مسئلہ حل کر دیا ہے اور کس طرح بعض جاندار انسانوں کو' اور انسان ریاستی نظام کو سونپے گئے ہیں۔ غور فرمائیں کہ گائے بھینس بھیڑ بکریاں اور گھوڑے گدھے وغیرہ سب جنگلی جانور ہیں' جو جنگل سے نکال کر انسان کو سونپے جاچکے ہیں۔ جب تک یہ جنگل میں تھے اللہ تعالیٰ کی رزق کی ذمہ داری یہ تھی کہ اس نے چراگاہیں اور چشمے پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ خود رزق کی تلاش میں نکلتے اور کھلی چراگاہوں سے پیٹ بھرتے اور قدرتی چشموں سے سیراب ہوتے تھے۔ مگر جب حضرت انسان نے انہیں اپنی سونپ میں لے لیا' اور اپنے کھونٹے پر باندھ دیا تو اب ان کے رزق کی ذمہ داری انسان کو سونپی گئی ہے۔ اب ان کے لیے چارہ لانا اور ان کے آگے ڈالنا خود انسان کا کام ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی گائے بھینس دھوپ میں بندھی ہو' پیاس کی شدت سے اس کی بالشت بھر زبان نکلی ہوئی ہو۔ مالک نے اسے صحن میں باندھ کر تالا لگا دیا ہو۔ تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ اسے پانی پلا دے۔ یا چارہ کھلا

دے۔ وہی پانی پلاتا ہے اور چارہ کھلاتا ہے جس نے اسے اپنے کھونٹے پر باندھا ہوتا ہے یہ ہے ان کا مستودع۔ یہی حال ریاستی کھونٹوں کا ہے کہ ہر ریاست کے عوام الگ الگ ریاستی کھونٹوں پر بندھے ہوئے ہیں یہ انکا مستودع ہے وہ ریاست کے جائز و ناجائز سب ٹیکس ادا کرتے ہیں جس طرح گائے بھینس اور گھوڑے گدھے اپنے کھونٹے پر باندھنے والا ان سے کام لینے کا مستحق بھی ہے اور ان کے رزق کا ذمہ دار بھی اسی طرح ہر ریاستی نظام' ریاستی کھونٹے پر بندھے ہوئے عوام سے ٹیکس وصول کرنے کا حق دار بھی ہے' اور ان کی ضروریات زندگی کا ضامن بھی کہ کوئی فرد ریاست نہ بھوکا ہو نہ ننگا نہ بے علاج ہو نہ بے مکان۔

اگلی آیت مجیدہ میں تخلیق سماوات و ارض کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ چھ وقفوں میں مکمل کی گئی تھی۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِن قُلْتَ إِنَّكُم مَّبْعُوثُونَ مِن بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ⑦

(اللہ ہی) وہ عظیم الشان ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ وقفوں میں پیدا فرمایا ور اس نے نے ربوبیت (کا مدار) پانی پر رکھا ہے۔ تاکہ وہ تمہیں ظاہر کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل بجا لاتا ہے۔ اور (اے رسول ؐ) اگر آپ انہیں کہیں کہ تم موت کے بعد (قیامت کو) زندہ کئے جاؤ گے تو وہ کہیں گے' جو انکار کرنے والے ہیں کہ یہ کھلا جھوٹ ہے

ارض و سماوات کی تخلیق کے چھ مرحلوں کی تفصیل قرآنی یہ ہے۔

ابتدائی اولین مرحلہ میں زمین و آسمان ملے جلے تھے۔ ان کا ایک ہی ہیولہ تھا۔ دوسرے مرحلے میں انہیں جدا جدا کر دیا گیا۔ ارشاد باری ہے۔ **أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط** ۲۱/۳۰ اور کیا ضابطہ الٰہی کا انکار کرنے والے غور نہیں کرتے یعنی انہیں غور کرنا چاہیے کہ سارے آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انہیں جدا جدا کر دیا۔ اور ہم نے ہر چیز کی زندگی کا مدار پانی پر رکھا۔ یہ ہیں تخلیق ارض و سماوات کے پہلے دو مرحلے۔

اس کے بعد کے دو مرحلوں میں زمین کی تخلیق فرمائی گئی' جس کی خبر آیت ذیل میں دی گئی ہے۔ **قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ** ۴۱/۹ (اے رسولؐ) ان سے فرمایئے گا کہ کیا تم اس عظیم الشان ذات کا انکار کرتے ہو جس نے (زمین و آسمان کو جدا جدا کرنے کے بعد) زمین کو دو مرحلوں میں پیدا کیا۔ یہ ہوگئے چار ایام۔ ایام کا معنی ہے وقفہ' مرحلہ۔ ۲۴ گھنٹے کا بھی چونکہ ایک نپاتلا وقفہ ہے اس لیے اسے بھی یوم کہا جاتا ہے تخلیق ارض و سماوات کے ان چار ایام کی تفصیل کے بعد باقی دو ایام کی خبر بالفاظ ذیل دی گئی ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا ط قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ○ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِي يَوْمَيْنِ ۴۱/۱۱-۱۲۔ پھر (زمین کو دو مرحلوں میں تیار کرنے کے بعد) اللہ تعالیٰ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس وقت دھواں ہی دھواں تھا۔ پھر انہیں اور زمین کو کہا کہ آجاؤ تم دونوں فرمانبردار ہو کر یا ناخوش۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم آگئے ہیں فرمانبردار ہو کر۔ پھر اللہ نے انہیں یعنی آسمانوں کو بیشمار فضاؤں (اور خلاؤں) میں متعین فرما دیا' دو یوم یعنی دو وقفوں' دو مرحلوں میں' بالفاظ دیگر تخلیق ارض و سماوات کے چھ یوم' چھ وقفے از روئے قرآن حکیم یہ ہیں۔

پہلے وقفہ میں زمین اور تمام کرہ جات سماوی ملے جلے تھے۔ ان کا ایک ہی ہیولہ تھا۔ (۲۱/۲۰)
دوسرا وقفہ وہ ہے جس میں انہیں جدا جدا کر دیا گیا تھا۔ (۲۱/۳۰)
تیسرا اور چوتھا' وقفے وہ ہیں جن میں باری تعالیٰ نے زمین کو موجودہ صورت میں لانے کے جملہ درمیانی مراحل سے گزار کر مکمل کیا (۴۱/۹)
پانچواں اور چھٹا دو وقفے وہ ہیں جن میں باری تعالیٰ نے زمین کو مکمل کرنے کے بعد آسمانوں کی طرف توجہ فرمائی جب وہ دھواں ہی دھواں تھے۔ یعنی وہ تمام گیسیں اس وقت فضا میں پھیلی ہوئی تھیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق بالارادہ کے ذریعہ مادہ کی اقسام ٹھوس' مائع گیس کی تیسری قسم گیس کی صورت میں پیدا کی جاچکی تھیں۔ خلاق عالم نے آخری دو مرحلوں میں ان گنت کرہ ہائے سماوی کو ان گنت فضاؤں اور خلاؤں میں متعین فرمایا۔ ہر کرہ سماوی اپنی الگ کشش ثقل کے ذریعہ اپنی الگ فضا رکھتا ہے' اور ہر فضا کے بعد ایک خلا رکھ دیا گیا ہے تاکہ ہر کرہ سماوی اپنے مدار پر گردش کرتا رہے اور یہ آپس میں متصادم نہ ہونے پائیں۔ ارشاد باری ہے۔
وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰) اور جملہ کرہ جات سماوی فلک میں اپنے اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں کوئی بھی اپنا مدار چھوڑ کر کسی دوسرے کرہ کے مدار میں نہ داخل ہوتا ہے نہ متصادم۔
سورہ سجدہ میں ارشاد ہوا ہے:۔ **اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ...... يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ** ○ (۳۲/۵-۴)
اللہ وہ عظیم الشان ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں میں ہے' چھ یوم یعنی چھ وقفوں میں پیدا کیا۔ وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر کرتا ہے۔ پھر وہ مکمل ہوکر اس کی طرف عروج کرتی ہے ایک یوم (یعنی ایسے وقفے میں) کہ اس کی مقدار وہ ایک ہزار سال ہے۔ جو تم شمار کرتے ہو۔ اس آیت مجیدہ سے ثابت ہوا' آسمان اور زمین جن چھ وقفوں میں پیدا کئے گئے تھے ان کی مقدار ہمارے چھ ہزار سال کے برابر ہے۔
آیت مجیدہ نمبر ۷ کے تحت غور فرمائیں' جس میں ارشاد ہوا ہے **وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ**۔ اس کے صحیح مفہوم کے لیے لازم ہے پہلے یہ سمجھا جائے کہ نہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مادی جسم ہے اور نہ اس کا کوئی مادی تخت ہے' جس پر وہ بیٹھتا تھا اور اس کا تخت پانی کے اوپر تیرتا پھرتا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے عرش سے مراد اس کی سلطنت ہے' جس میں موجودہ ارض و سماوات میں رہنے والے جانداروں کے علاوہ ہر چیز کی زندگی کا انحصار پانی پر رکھا گیا ہے۔ جیسے کہ (۲۱/۳۰) کے حوالہ سے پیچھے گزر چکا ہے۔ **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَىٍّ** (۲۱/۳۰)
مردہ زمین پانی کے ساتھ زندہ ہوتی۔ حیوانات' نباتات اور جمادات سب کے سب پانی ہی کے ذریعہ زندہ ہیں۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ جن کرہ جات میں پانی موجود نہیں' وہاں زندگی نہیں ہے۔ تو اس طرح **کان عرشہ علی الماء** کے الفاظ میں **حکومت الہی** کا بنیادی مسئلہ پانی بتایا گیا ہے جس کی فراوانی کی مشاہداتی صورت یہ ہے کہ زمین پر تین حصے پانی اور ایک حصہ خشکی ہے۔ پھر خشکی کے اوپر بھی دریاؤں کے جال بچھا دیئے گئے ہیں اور زیر زمین بھی پانی کی وہ بہتات مہیا کر دی گئی ہے کہ جہاں سے چاہو' کنوؤں' ہینڈ پمپوں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعہ جتنا چاہو' پانی حاصل کر سکتے ہو'

آیت نمبر ۷ زیر بحث میں سلطنت الہی کے بنیادی مسئلہ پانی کی وضاحت کے بعد ارشاد ہوا ہے **لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا** تاکہ ظاہر کرے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے احسن ہے۔ چونکہ اس کا تعلق پانی سے بھی عیاں ہے کہ اعمال کے لحاظ سے احسن وہ لوگ ہیں جو پانی پر غاصبانہ قبضہ نہیں جماتے۔ جیسے کہ صالحؑ کی قوم نے پانی کے چشمے پر اور چراگاہ پر ذاتی قبضہ جما کر غریب افراد اور ان کے مویشیوں کو پانی اور چارے سے محروم کر رکھا تھا۔ صالحؑ نے سب کی باریاں مقرر فرمائیں۔ آپ کا یہ عمل احسن تھا جس میں ہر خاص و عام کو چشمے کے پانی اور چراگاہ کے چارے میں برابر کا حقدار قرار دیا گیا۔

آج بھی بعض علاقوں میں جہاں پانی کی قلت ہے' یا پانی مضر صحت ہے' وہاں پائپ لائن کے ذریعہ صحت بخش پانی پہنچانا احسن عمل ہے۔

قیامت کی بعثت کو جھٹلانے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ اسے کھلا جھوٹ قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کو زبانی یا عملی لحاظ سے وہی لوگ جھٹلاتے ہیں جو دنیا میں من مانیاں کرتے اور برے اعمال کی جوابدہی کو ناپسند کرتے ہیں۔ دنیا میں تو اپنی وجاہت اور اثرورسوخ کی بدولت بُرے عملوں کی سزا سے بچ جاتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اسی طرح دوسری زندگی میں بھی انہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ لیکن یاد رہے کہ دوسری زندگی کو جھٹلا دینے سے برے اعمال کی سزا سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہر عمل کا رد عمل ازروئے مشاہدات ثابت ہے۔ لہٰذا جس شخص کو برے عملوں کی سزا اس زندگی میں نہیں ملی' اگلی زندگی میں ضرور ضرور مل کر رہے گی اور اسی طرح جس کسی کو اس کے نیک عملوں کی جزا اس زندگی میں نہیں ملی' اگلی زندگی میں ضرور ضرور مل کر رہے گی۔

واضح رہے کہ قوموں پر دنیا کی زندگی میں عذاب اس وقت آتا ہے جب ان کی نافرمانیوں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اس طرح مجرم اقوام کو جب مہلت ملتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اگر عذاب کی آمد ناگزیر ہے تو آتا کیوں نہیں' کس نے اسے روک رکھا ہے۔ اگلی آیت مجیدہ میں اسی چیز کی خبر دی گئی ہے۔

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٨﴾	اور اگر ہم عذاب کو (اپنے قانون مشیت کے مطابق) ایک معدود وقفہ کے لیے موخر کر دیں تو (یہ سرکش لوگ) ضرور کہیں گے کہ اسے کس نے روک رکھا ہے۔ سنو (وہ ہمارے قانون مشیت کے مطابق رکا ہوا ہے) جس وقفے میں وہ ان پر آئے گا تو ٹلے گا نہیں اور انہیں وہ چیز گھیرنے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔

جس کسی قوم کا بُرے عملوں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو اس پر دنیا ہی میں عذاب آجاتا ہے ۔ آمد عذاب میں تاخیر کو غنیمت جانتے ہوئے توبہ کرکے اپنی اصلاح کر لینی چاہیے' نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عطا فرمودہ مہلت کا مذاق اڑایا جائے۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں نوع انسانی کی ایک دائمی اور قدیمی روش کی خبر دی گئی ہے کہ خوشحالی میں اس کی حالت کچھ اور ہوتی ہے اور جب اس سے عطا کردہ نعمت اس کی اپنی بد عملی کی بدولت چھن جاتی ہے تو پھر کچھ اور ہوتی ہے۔

(۹) وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ﴿٩﴾	اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت (کی فراوانیوں) کا مزہ چکھائیں (تو اترانے لگتا ہے) پھر اگر (اس کی بد عملیوں کی بدولت) اس سے چھین لیں تو ناشکرا ہو جاتا ہے۔

اور اگر اس کے بعد پھر نعمت عطا فرمائی جائے تو پھر اترانے لگتا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۙ﴿۱۰﴾

اور اگر ہم اسے تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو، اپنی نعمت عطا فرمائیں تو ضرور کہے گا کہ مجھ سے سب سختیاں چلی گئی ہیں۔ بے شک وہ اترانے والا فخر کرنے والا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

سوائے ان لوگوں کے جو مستقل مزاج ہوں اور معاشرہ میں اصلاح کے کام کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے بچاؤ ہے اور ان کے اعمال کا بہت بڑا بدلہ ہے۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے مخالفین کے ایک طعن کا ذکر کیا گیا، جس سے آپؐ کو رنج پہنچتا تھا۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾

پھر (اے رسولؐ!) کیا آپ اس کا کچھ حصہ چھوڑ دینے والے ہیں جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے (ہرگز چھوڑنے والے نہیں ہیں) اس پر کہ وہ کہتے ہیں اس پر کیوں کوئی خزانہ نازل نہیں کیا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا اور کیا آپ اس پر اپنا ذہن تنگ کرنے والے ہیں (ہرگز نہیں) آپ ڈرانیوالے (آگاہ کرنے والے) ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر کارساز ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

یا وہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے قرآن افترئی فرمایا ہے تو آپ کہہ دیجئے گا کہ تم بھی دس سورتیں افتریٰ کی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا بلا لو جنہیں بلا سکتے ہو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو (ایسا کر دکھاؤ)

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

پھر اگر وہ تمہارے لیے (یہ چیلنج قبول نہ کریں تو (ایمان والو!) جانتے رہو کہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ یہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے۔ اور یہ کہ اس اللہ کے سوا کوئی فرمانبرداری کے قابل نہیں۔ پھر کیا تم فرمانبردار ہوتے ہو؟

سورہ ہود گیارہویں سورہ مجیدہ ہے۔ چونکہ اس سے پہلے دس سورتیں نازل ہوچکی تھیں، اس لیے ان لوگوں کو دس سورتیں افتریٰ کردہ پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا ہے جو یہ کہتے تھے کہ آپؐ نے قرآن کریم کو خود اپنی طرف سے بنا کر اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگا دیا ہے۔ لیکن پوری دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ دس سورتیں تو گیا، آج تک دشمنان اسلام ایک سورت یا ایک آیت تک بھی قرآن کریم کی مثل بنا کر نہیں لا سکے۔ یہ قرآن کریم کا زندہ اعجاز آج تک قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔

اگلی آیت مجیدہ میں دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت میں کھو جانے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ کرتے ہیں، ہم ان کے اعمال (کا صلہ) اسی دنیا میں دیدیتے ہیں اور وہ اس میں کم نہیں دیئے جاتے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے اُخروی زندگی میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور ضائع ہو جائیں گی جو بناوٹ بنائی اور جو عمل وہ کرتے تھے سب باطل ہونے والے ہیں۔

یہاں ایک دھوکا لگتا ہے کہ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کے چاہنے والے تو بہت ہیں مگر ان میں سے بعض وہ ہیں جنہیں دنیا کا مال اور اس کی زینت میسر ہے لیکن ان کی اکثریت وہ ہے جو دنیا کے مال اور اس کی زینت سے محروم ہیں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ وہ دھوکا دہی اور فریب کاری بھی ایسے طریقے سے نہیں کر سکے کہ اچھے بھلے سمجھ دار آدمی دھوکا کا شکار ہو جائیں۔ جو لوگ انتہائی صفائی کے ساتھ حرام مال اکٹھا کرتے ہیں' لوگ ان کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور فریب کاروں کو دنیا کا مال و زینت میسر آجاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے۔

لیس لھم فی الاخرۃ الا النار یعنی اخروی زندگی میں ان کے لیے ناکامی کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ نیز ارشاد فرمایا ہے:

وحبط ماصنعوا' وہ لوگ تھے تو دنیا ہی کے طلب گار' لیکن دکھاوے کے طور پر کچھ نیک کام بھی کیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ان کاموں کو بناوٹ قرار دیا ہے یعنی وہ نمائش و نمود کے لیے بعض کام ایسے بھی بجا لاتے ہیں' جن کا اجر اس دنیا کے علاوہ اگلی زندگی میں بھی ملتا ہے' لیکن بتا دیا گیا ہے جو لوگ بناوٹی طور پر بھلائی کرتے ہیں انہیں اس کا صلہ یہیں دیدیا جاتا ہے۔ کہ لوگ انہیں سخی وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں اخروی زندگی میں ان بناوٹی اعمال کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔

ان کے علاوہ جو لوگ دنیا کی زندگی اور زینت چاہتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے' وہ یہاں بھی ذلیل و خوار اور محروم و نامراد ہیں اور اُخروی میں بھی محروم و ناکامیاب ہوں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی ہمیشہ نگاہوں میں رکھئے گا کہ جو لوگ ناجائز طریقے سے دنیا کا مال اور زیب و زینت حاصل کرتے ہیں ان کا ضمیر ہر لمحہ انہیں ملامت کرتا رہتا ہے۔ بظاہر تو وہ نفیس بنگلوں میں مرصع پلنگ پردراز پائے جاتے ہیں' لیکن ان کے اندر ملامت کا لاوا کھول رہا ہوتا ہے۔ جن غریبوں' بیکسوں اور بے بسوں کے مالوں پر ہاتھ صاف کیا تھا' ان کی شکلیں ہر آن سانپ اور بچھو بن بن کر ذہن کو ڈس رہی ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کی ظاہری عیش پر نہ جایئے گا۔

وہ لوگ ان سے بہتر اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی محبوب و مقبول ہیں جو حلال کمائی کے ذریعہ ضروریات زندگی حاصل کرتے ہیں' خواہ وہ سادہ سی بھی کیوں نہ ہوں۔ ان کے اذہان میں جنت الفردوس کی شادابیاں بکھری ہوتی ہیں۔ اور ساتھ ہی اخروی زندگی کی کامیابی کی خوشخبریاں بھی دماغ کے لیے وجہ سرور بنی رہتی ہیں۔

سورہ نساء میں ارشاد ہوا ہے:

مَّن كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِندَ اللَّهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ (۴/۱۳۴) جو کوئی رضائے الٰہی کے مطابق حلال طریقے سے) دنیا کے فائدے کا ارادہ کرے تو (یاد رکھو کہ ایسے لوگوں کے لئے' اللہ تعالیٰ کے پاس دنیا کا فائدہ بھی موجود ہے اور آخرت کا فائدہ بھی موجود ہے۔

بالفاظ دیگر جو کوئی رضاء الٰہی کے مطابق دنیا کا فائدہ حاصل کرے اسے آخرت کے فائدے کی خوشخبری بھی دی گئی ہے۔ باری تعالیٰ نے ایمان والوں کو ایک ایسی ہی دعا بھی سکھلائی ہے۔ **رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔** (۳) اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دنیا اور آخرت کے آگ کے عذاب سے بچالے۔ واضح رہے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی اللہ کے حکم کے مطابق حلال کمائی کے ذریعہ ضروریات حاصل کرنے میں ہے' خواہ وہ سادہ ترین صورت ہی میں میسر آئیں۔ اور اگر حلال کمائی میں زندگی کی زیب و زینت اور وافر ضروریات زندگی میسر آئیں تو پھر بھی ٹھیک ہے' اخروی زندگی کا فائدہ حلال کمائے اور حلال کھانے ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔

جو لوگ حرام کمائی کے ذریعہ اس زندگی کی زیب و زینت حاصل کرتے ہیں انہیں نہ اس زندگی میں امن و سکون میسر آتا ہے اور نہ اگلی زندگی میں جنت کی فراوانیاں نصیب ہوں گی۔ یہاں بھی پریشانیوں کے بحر عمیق میں مستغرق رہیں گے اور اخروی زندگی میں بھی محرومیوں اور ناکامیوں کی آگ میں جلنا نصیب ہوگا۔ پس لازم ہے کہ دنیا و آخرت کی سرفرازیوں کے حصول کے لیے لقمہ حرام سے پرہیز کی جائے۔

اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ وَیَتْلُوْہُ شَاھِدٌ مِّنْہُ وَمِنْ قَبْلِہٖ کِتٰبُ مُوْسٰۤی اِمَامًا وَّرَحْمَۃً ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُہٗ ۚ فَلَا تَکُ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْہُ ۚ اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

(۱۷) کیا پھر جو گروہ اپنے رب کی طرف سے دلائل قاطعہ پر ہے اور اس گروہ میں سے ایک گواہ ان کے پیچھے آیا ہے اور اس (گواہ کی کتاب) سے پہلے موسیٰ کی کتاب امام و رحمت تھی وہ اس (گواہ محمدؐ اور اس کی) کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور گروہوں میں سے جو گروہ اس کا انکار کرتا ہے اس کی وعدہ گاہ آگ ہے پس (اے مخاطب) تو اس سے شک میں نہ ہونا۔ بے شک وہ (قرآن تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے۔

واضح رہے کہ یہ وہ آیتہ مجیدہ ہے کہ قادیانیوں نے اس کے شروع میں آمدہ لفظ من کا مصداق محمد رسول اللہ کو ٹھہرایا اور لفظ شاھد سے مرزا غلام احمد مراد لیا ہے العیاذ باللہ ! اس سلسلہ میں پہلی غلطی یہ کی گئی ہے کہ لفظ من کو واحد کے لیے سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ یہ جمع کے لیے ہے اگلے الفاظ **اولئک یومنون بہ** میں **اولئک** اسم اشارہ بھی صیغہ جمع آیا ہے اور فعل مضارع **یومنون** بھی جمع ہے واحد نہیں **اولئک** کا **مشار الیہ** چونکہ **من** ہے اس لیے یہاں **من** جمع کے لیے آیا ہے اس لیے اس کا معنیٰ جو شخص نہیں بلکہ جو گروہ ہے اس کی مثال ماقبل آیات نمبر۱۵'۱۲ میں بالفاظ ذیل گزر چکی ہے۔

من کان یرید الحیوۃ الدنیا وزینتھانوف الیھم اعمالھم ۱۱/۱۵ اس جملہ میں بھی **من** موصولہ برائے جمع آیا ہے' کیونکہ **الیھم اعمالھم** میں دو مرتبہ کی آمدہ ضمیر جمع ھم کا مرجع من ہے اور مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کا ارادہ کرتے ہیں انہیں بھی ہم ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔ کمی نہیں کرتے۔

لہٰذا آیت زیر بحث ۱۱/۱۷ میں **افمن** میں آمدہ **من** موصولہ جمع کے لیے ہے اس لیے نبی اکرمؐ مراد لینا مطلقاً" غلط ہے کیونکہ یہ **اولئک** اسم اشارہ مشار الیہ ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بعثت محمدی کے وقت مومن موجود تھے۔ وہ جملہ انبیاء اور ان کی کتب پر ایمان رکھتے تھے۔

یتلو کا سہ حرفی مادہ ت ـ ل ـ و۔ تلو ہے اس کا بنیادی معنی ہے پیچھے آنا۔ بعثت محمدی کے وقت جملہ انبیاء اور ان کی کتب پر صحیح ایمان رکھنے والا ایک قدیمی مومن گروہ پہلے ہی موجود تھا۔ موجود چلا آرہا تھا نبی اکرمؐ اس کے پیچھے آئے تھے۔

شاھد منه کے الفاظ میں ہ کی ضمیر موجود مومن گروہ کی طرف پھرتی ہے جس سے ثابت ہوا کہ محمد رسول اللہ مذکورہ مومن گروہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یعنی آپ کا خاندان خصوصاً والدین قدیمی مومن خاندان کے افراد تھے۔ موجود مومن جماعت کی تائید سورہ بقرہ میں دعا ابراہیم میں ملاحظہ فرمائیں۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ (۲/۱۲۸) اے رب ہمارے ہم دونوں (ابراہیم و اسماعیل) کو اپنے فرمانبردار بنائے رکھ اور ہم دونوں کی اولاد (شاخ اسماعیل) میں سے ایک امت مسلمہ بنائیو۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ (۲/۱۲۹) اے رب ہمارے اس امت مسلمہ میں سے ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمائیو جو ان پر تیری آیتوں کی تلاوت کرے۔

پس تصریف آیات کی دلائل قاطعہ کی رو سے آیات مجیدہ (۲/۱۲۸-۱۲۹) کے مطابق زمانہ بعث محمدیؐ میں دعا ابراہیمؑ کی مصداق ایک قدیمی امت مسلمہ بھی موجود تھی اور اسی مومن گروہ میں سے محمد رسول اللہ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ **یتلوہ شاھد منه** کے الفاظ السید ابراہیمؑ کی دعا **وبعث فیھم رسولا منھم** کی تصدیق کرتے ہیں یہ مقدس گروہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد میں سے مسلسل چلا آرہا تھا۔

ومن قبله کتب موسیٰ اماما ورحمة (۱۱/۱۷) میں **قبله** کی ہ ضمیر کا مرجع شاھد یعنی محمدؐ رسول اللہ ہیں اور چونکہ کتاب کی قائم مقام کتاب ہی ہوتی ہے اس لیے کتاب موسیٰ کے بعد کتاب محمدؐ امام و رحمت بتائی گئی ہے۔ اسی حقیقت کی خبر (۴۶/۱۲) میں بھی دی گئی ہے۔ **ومن قبله کتب موسیٰ اماما ورحمة ط وهذا کتب مصدق لسانا عربیا۔** "اس سے پہلے کتاب موسیٰ امام و رحمت تھی اور اب یہ کتاب جو عربی زبان میں اس کی تصدیق کرتی ہے امام و رحمت ہے"

اولئک کی بحث گزر چکی ہے کہ **اولئک** اسم اشارہ جمع کا **مشار الیه** ہے۔ **من** جو کسی ایک فرد کے لیے نہیں آیا۔ چنانچہ **اولئک** اسم اشارہ جمع کی سند کے مطابق ایک گروہ اور جماعت کے لیے آیا ہے۔

من یکفر به من الاحزاب کے الفاظ میں بھی **من** گروہ کے لیے آیا ہے جو **من الاحزاب** کے الفاظ سے ثابت ہے نیز یہاں **الاحزاب** کا لفظ لا کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ ان آیات کریمہ ۱۲ تا ۱۷ میں کافر یا مومن گروہوں کا ذکر ہے' افراد کا نہیں پس آیت زیر بحث (۱۱/۱۷) میں **افمن کان علی بینة** سے مراد وہ مومن گروہ ہے جو دعاء ابراہیمؑ کے مطابق ان کی ذریت میں اسماعیلؑ سے لے کر زمانہ بعثت محمدی تک مسلسل موجود تھا نبی اکرمؐ اسی گروہ میں پیدا بھی ہوئے اور مبعوث بھی ہوئے۔ شاہد نبی اکرمؐ تھے جو **منه** کی قرآنی خبر کے مطابق مذکورہ بالا پاکیزہ گروہ میں سے تھے اس سے مرزا غلام احمد مراد لینا پورے کے پورے سیاق و سباق کو جھٹلانے کے مصداق ہے۔ العیاذ باللہ۔

آیہ مجیدہ ۱۷/۱۱ میں نبی اکرمؐ کی تشریف آوری کی خبر دی گئی ہے کہ آپ کا دعویٰ نبوت صد فی صد سچا تھا۔ چنانچہ اگلی آیہ مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتیں کہ وہ اللہ سے خبریں پاتے ہیں وہ بہت بڑھ کر ظالم ہیں۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾

(۱۸) اور ان لوگوں سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ پر اسی سے خبریں پانے کا افترٰی باندھتے ہیں وہ اپنے رب کے حضور میں پیش کیے جائیں گے اور گواہ کہیں گے کہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا خبردار (اللہ پر جھوٹ باندھنے والے) ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے

الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾

(۱۹) یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ (اس کے نازل کردہ ضابطہ قرآن مجید) سے روکتے اور اس میں کجیاں تلاش کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہی تو کافر ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے خبریں پانے کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے جو صرف نبیوں پر آتی تھی۔ محمد رسول اللہ پر چونکہ آمد انبیاء ختم کر دی گئی ہے اس لیے نزول وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ آپؐ کے بعد الہام اور کشف کے نام سے اللہ تعالیٰ سے خبریں پانے کا دعویٰ افترٰی علی اللہ ہے۔ الہام کا قرآنی معنی جبلت میں رکھ دینا ہے۔ چنانچہ انسان کے متعلق ارشاد ہوا ہے **وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا** ○ (۹۱/۸'۷) اور شہادت ہے فرد انسانی کی اور اس حقیقت کی جو اسے صحیح سالم کیا پھر اس (اللہ) نے اس کا اللہ کی نافرمانی کرنا اور اس سے بچ جانا اس کی جبلت میں رکھ دیا۔" بالفاظ دیگر ہر شخص میں نافرمانی کا مادہ بھی موجود ہے اور فرمانبرداری کا بھی۔ خود چاہے تو فرمانبرداری کرے اور خود چاہے تو نافرمانی کرے نیز انسان کے اندر نفس لوامہ اور نفس امارہ دو قوتیں بھی ودیعت فرما دی ہیں۔ امارہ نافرمانی پر اکساتا ہے اور لوامہ روکتا ہے پس قرآن کریم نے تو الہام کا یہ معنی بتایا ہے۔ اسے وحی کے علاوہ اللہ سے خبریں پانے کا ذریعہ قرار دینا یکسر غلط ہے آمد انبیاء کے ختم ہو چکنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ سے خبریں پانے کا ایک ہی ذریعہ موجود ہے قرآن کریم جس میں ہر مسئلہ کا جواب اور ہر عمل کا نتیجہ بتا دیا گیا ہے۔

سابقہ آیت میں مفتریوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کتاب الٰہی میں کجیاں تلاش کرتے ہیں اگلی آیت میں انہی کے متعلق خبر دی گئی ہے۔

أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾

(۲۰) یہ لوگ زمین میں اللہ تعالیٰ کا کچھ بگاڑنے والے نہیں اور اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں۔ ان کے لئے عذاب دوگنا ہوگا وہ سن بھی نہیں سکتے اور وہ دیکھتے بھی نہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾

(۲۱) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود نقصان میں رکھا (قیامت کو) ان سے وہ گم ہو جائے گا جو اللہ پر افترٰی کرتے تھے۔

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾

(۲۲) یہ لازمی امر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ سے مراد یہ ہے کہ زمین میں بڑے بڑے اختیارات کے دعویدار قانون باری تعالیٰ کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون میں کسی کو بھی شریک نہیں کیا۔

لَا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے زعم باطل میں اس قدر گم ہو جاتے ہیں کہ ان کے دماغ میں حق بات سننے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی اور نہ وہ روز مرہ کے مشاہدات کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنے والے رہ جاتے ہیں ان کے باطل تصورات ان کے اذہان میں اس شدت کے ساتھ ٹھنسے ہوئے ہوتے ہیں کہ نہ وہ حق سن سکتے ہیں اور نہ مشاہداتی حقائق کو دیکھ سکتے ہیں۔ العیاذ باللہ!

آیات بالا میں ضابطہ باری تعالیٰ کے منکروں کے ذکر کے بعد اگلی آیات کریمہ میں قرآن مجید پر ایمان لانے اور اس پر عمل کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾

(۲۳) بے شک جو لوگ (قرآن کریم پر) ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں اور اپنے رب کے حضور عاجزی کریں وہی لوگ اہل جنت ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں اہل نار اور اہل جنت کی تقابلی مثال پیش کی گئی ہے بغور ملاحظہ فرمائیں۔

مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

(۲۴) ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے (ایک) اندھا اور بہرا ہو اور (دوسرا) دیکھنے والا اور سننے والا ہو کیا دونوں کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ پھر تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

اس آیت مجیدہ میں قرآن مجید کا انکار کرنے والوں کو اندھے اور بہرے کہا گیا ہے کیونکہ نہ وہ مشاہداتی حقائق کو دیکھتے ہیں۔ اور نہ قرآنی حقائق کو سنتے ہیں لیکن اس کے برعکس قرآن حکیم پر ایمان لانے والوں کو دیکھنے اور سننے والے کہا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ کائناتی حقائق کو بغور دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کارخانہ کائنات کی ہر چیز جب شبانہ روز ایک ہی طے بندھے قوانین کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اپنے اپنے راستے پر چلی جا رہی ہے تو کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ ارض و سماوات کا پیدا کرنے والا یقیناً موجود ہے۔ اور اس کارخانہ کائنات کی ہر چیز کے لیے الگ الگ قوانین بھی اسی نے متعین فرما رکھے ہیں اور ہر چیز کو اس کی الگ الگ جبلت کے مطابق انہی قوانین میں جکڑ رکھا ہے۔

مشاہدہ کائنات تو ہوا ان کے بصیر (یعنی دیکھنے والے) ہونے کا ثبوت اور انہیں سمیع یعنی سننے والے اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ قرآن کریم کو بغور سنتے ہیں۔ اسے سنا ان سنا نہیں کر دیتے اللہ تعالیٰ کی کتاب لاریب میں ہر چیز کی الگ الگ جبلت اور الگ الگ فرائض منصبی کی خبر بالفاظ ذیل دی گئی ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۲۰/۵۰ "ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا اور پھر اس کی رہنمائی کر دی" ہر چیز اسی راہ پر چل رہی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے جبلی طور پر چلا دیا ہے۔

یاد رہے کہ نوع انسانی کی حالت اس سے مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے برے کی تمیز کے لیے آنکھیں' کان اور دماغ عطا فرما کر عملی لحاظ سے فعل مختار کر دیا ہے۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ ۴۱/۴۰ اچھے یا برے جیسے عمل تم خود چاہو کرو۔ بے شک تم جو عمل کرو گے اللہ انہیں دیکھنے والا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۝ ۴۱/۴۶

جو کوئی صالح عمل بجا لائے گا بدلہ اس کی اپنی ہی جان کے لیے ہے اور جو کوئی برے عمل کرے گا ان کا وبال اس کی اپنی جان پر ہوگا۔ اور (اے رسول) آپ کا رب (خود برے عمل کروا کر) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

آیات بالا میں اس امر کی وضاحت کرنے کے بعد کہ جو لوگ راہ راست کو قبول نہیں کرتے وہ اندھوں اور بہروں جیسے ہیں وہ دیکھنے اور سننے والوں کی مثل نہیں ہیں۔ اگلی ۲۵ آیات مجیدہ میں نوح سلام علیہ کی قوم کا ذکر درج ہے کہ جو لوگ آنکھوں کانوں اور دماغ سے کام لینے والے تھے وہ تو آپ پر ایمان لے آئے اور جو اندھوں بہروں جیسے تھے وہ ایمان نہ لائے بلکہ آپ کی مخالفت اور ایذا رسانی میں ایک طویل عرصہ تک سرگرم عمل رہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

(۲۵) اور بے شک ہم نے (اپنے نبی) نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس نے کہا) بے شک میں تمہارے لیے برے عملوں کے نتائج سے کھلا آگاہ کرنے والا ہوں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝

(۲۶) یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو بیشک میں تمہارے لیئے درد ناک عذاب والے دن سے خوف کھاتا ہوں۔

اس پر آنکھوں کانوں اور عقل سے کام لینے والے تو ایمان لاکر آپ کے ساتھ ہوگئے مگر قوم کے سرداروں نے متکبرانہ انداز میں کہا۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىکَ اتَّبَعَکَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا نَرٰی لَکُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّکُمْ کٰذِبِیْنَ ۝

(۲۷) اس پر آپ کا انکار کرنے والے آپ کی قوم کے سرداروں نے کہا ہم تجھے نہیں دیکھتے مگر تو ہمارے جیسا ہی ایک بشر ہے اور ہم نہیں دیکھتے انہیں' جو تجھ پر ایمان لائے ہیں۔ مگر وہ سرسری نظر میں بھی ہمارے رذیلے ہیں اور ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی فضیلت نہیں دیکھتے بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا گمان کرتے ہیں۔

اس کے جواب میں نوحؑ نے انتہائی حتم و یقین کے ساتھ فرمایا کہ میں جھوٹا نہیں بلکہ میں اپنے رب کی طرف سے

دلائل قاطعہ پر ہوں۔ اور مجھے میرے رب نے اپنی طرف سے رحمت (ہدایت) عطا فرمائی ہے۔ جو تمہارے اندھے پن کی بدولت تم سے اوجھل ہو چکی ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

(۲۸) نوحؑ نے کہا کیا تم دیکھتے ہو (اور تمہیں دیکھنا چاہیے) کہ بے شک میں اپنے رب کی طرف دلیل قاطعہ پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت (ہدایت) عطا فرمائی ہے۔ مگر وہ تم سے (عقل کے اندھے ہونے کی بدولت) اوجھل ہو چکی ہے۔ کیا ہم اسے زبردستی تمہارے گلے مڑھ دیں۔ جبکہ تم اس سے (صرف تعصب کی بدولت) نفرت کرتے ہو۔

اس آیت مجیدہ میں اِنْ، اِنَّ کا مخفف ہے اور مفہوم یہ ہے کہ بلاشبہ میں ہدایت کے دلائل قاطعہ پر ہوں۔ پوری نوع انسانی کو واجب التکریم قرار دیتا ہوں۔ جبکہ تم نے بعض کو اپنے رذیلے قرار دے رکھا ہے۔ میں سب کو یکساں طور پر ضروریات ربوبیت کا حقدار گردانتا ہوں' مگر تم بعض کو بھوکے ننگے رکھ کر اپنے زیر دست رکھتے ہو۔ اگر اس آیت میں ان شرطیہ تسلیم کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ نوحؑ نے اپنی صداقت کو مشکوک انداز میں پیش فرمایا جو ہرگز ممکن نہیں۔ آپ نے اپنی طرف الٰہی ضابطہ یعنی ہدایت کا نزول یقینی قرار دیا۔ جس پر **فعمیت علیکم** کے الفاظ گواہ ہیں کہ وہ بوجہ تعصب اندھے ہوگئے تھے۔ اس لیے کھلے کھلے دلائل قاطعہ انہیں دکھائی ہی نہیں دیتے تھے۔ العیاذ باللہ۔

چونکہ ناہموار معاشرہ میں ہر کسی کے ہر کام کی غرض حصول زر ہوتی ہے اس لیے نوحؑ نے اپنے مخالفین سے ارشاد فرمایا کہ میں اجر رسالت کے طور پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا۔ نیز جن لوگوں کو تم اپنے رذیلے کہتے ہو جو عقل و خرد سے کام لے کر ضابطہ حیات پر ایمان لے آئے ہیں۔ میں انہیں اپنے پاس سے ہرگز ہرگز دور کرنے والا نہیں۔ وہ عقل والے ہیں تم جاہل ہو۔ اس پورے مضمون کو اگلی آیت مجیدہ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

(۲۹) اور نوحؑ نے کہا اے میری قوم میں اس (تبلیغ رسالت کے اجر کے طور پر) تم سے کوئی مال نہیں مانگتا میرا اجر نہیں ہے مگر اللہ کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اپنے پاس سے ہٹانے والا نہیں ہوں۔ بلا شبہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں و لیکن میں تو تمہیں ایک جاہل قوم دیکھتا ہوں۔

جملہ انبیاء سلام علیہم کا ایک ہی شعار تھا کہ ان کا قبلہ مقصود مال کمانا نہیں' صرف اللہ کا پیغام بلا کم وکاست لوگوں تک پہنچانا تھا' جو مال ان کے پاس ہوتا وہ سب کا سب حاجت مندوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ میں یہی چیز بدرجہ اتم پائی جاتی تھی کہ آپ نے وہ مال بھی غربا میں تقسیم کر دیا جو آپ کو اپنے والدین کے ترکہ سے میسر آیا اور وہ ڈھیر سارا مال بھی مفلسوں اور ناداروں کو قدموں پر کھڑے کرنے پر خرچ کر دیا جو آپ کی زوجہ محترمہ خدیجۃ الکبریٰ نے آپ کی نذر کر دیا تھا۔ جملہ انبیاء کے متعلق قرآن کریم نے مال کی عدم رغبت کی خبر دی ہے۔ اور یہی الفاظ **ما اسئلکم علیہ من**

اجر ان اجری الا علی رب العالمین کہ "میں تم سے بطور اجر رسالت کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر رب العالمین کے ذمہ ہے" اور ۲۶/۱۰۹ میں نوحؑ کے متعلق آئے ہیں ۲۶/۱۲۷ میں ہود کے متعلق ۲۶/۱۴۵ میں صالحؑ کے متعلق' ۲۶/۱۶۵ میں لوط کے متعلق اور ۲۶/۱۸۰ میں شعیبؑ کے متعلق آئے ہیں۔

انهم ملقوا ربهم کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں لقاء رب سے مراد ہے دنیوی زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لیے قیامت کی عدالت عالیہ میں حاضر ہونا جیسے کہ ۱۸/۱۱۰ میں ارشاد ہوا ہے۔ **فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا** " جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے پس چاہئے کہ صالح عمل بجا لائے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی ایک کو بھی شریک نہ کرے" یہاں امید رکھنا سے مراد ہے یقین رکھنا۔ چنانچہ جو لوگ اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لیے قیامت کی عدالت عالیہ میں حاضر ہونے پر یقین نہیں رکھتے ان کے متعلق اشاد ہوا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی پر مطمئن اور آیات الہیہ سے غافل ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ○ (۱۰/۷) "بے شک جو لوگ (دنیوی اعمال کی جواب دہی کے لیے ہمارے حضور حاضر ہونے **لقاء نا** پر یقین نہیں رکھتے' ان کی حالت یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی پر مطمئن ہو چکے ہیں اور وہ لوگ بھی جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔"

قیامت کی عدالت عالیہ میں اس زندگی کے اعمال کی جوابدہی پر پختہ یقین کی عملی تصدیق ہے اعمال صالح بجا لانا اور اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا۔ نوحؑ نے اپنے صحابہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یہ قیامت کی عدالت عالیہ میں حاضری پہ پختہ ایمان رکھتے ہیں' صالح اعمال بجا لانیوالے ہیں۔ اس لئے میں انہیں اپنے پاس سے ہٹانے والا ہرگز نہیں ہوں۔

ولکنی ارٰکم قوما تجهلون کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ نوحؑ کے مخالفین کی ایک جماعت تھی اور تھی حقیقت ناشناس جاہل' جس نے ایمان لانیوالوں کو رذیلے قرار دیا اور نوحؑ سے مطالبہ کیا کہ انہیں اپنے پاس سے دور کر دیجئے۔ مگر آپؑ نے فرمایا کہ ایسے بصیرت مآب مومنوں کو اپنے سے صرف اس لئے دور کرنا کہ یہ لوگ تمہاری طرح حرام مال اکٹھا کرکے مالدار نہیں بنے' ایسا جرم عظیم ہے کہ اگر میں اس کا ارتکاب کروں تو مجھے اللہ سے کوئی چھڑا نہیں سکتا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں اپنی قوم پر انتہائی بلیغ انداز میں واضح فرمایا ہے:

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(۳۰) اور اے میری قوم! اگر میں انہیں اپنے سے دور کر دوں تو کون ہے جو اللہ کے مقابلے پر میری مدد کرے۔ پھر تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

اگلی آیت مجیدہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوم نے صحابہؓ نوح پر یہ الزام لگایا کہ یہ رذیلے اور مفلس و نادار لوگ مال حاصل کرنے کے لیے ایمان لائے ہیں۔ مگر انہیں کبھی بھی خیر' یعنی دنیوی اور اخروی بھلائی نصیب نہ ہوگی۔ اس لیے نوحؑ نے فرمایا میرے پاس کوئی شے نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ مال کے طلب گار ہیں۔ یہ حقیقت شناس لوگ خالص اللہ کی فرمانبرداری اور وحدت باری کی اساس پر میرے ساتھ متفق ہوئے ہیں نیز معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مخالفین اس چیز کے قائل تھے کہ اللہ کے نبی بشر نہیں ہوتے۔ جیسے کہ پیچھے ۱۱/۲۷ میں ان کا قول گزر چکا ہے کہ تو تو ہمارے جیسا بشر ہے۔ ان کے خیال کے مطابق

کوئی نبی ملک ہونا چاہئے' جو مٹی کی پیداوار کی بجائے نور کی پیداوار ہو' نوحؑ کی طرف سے ان تمام سوالوں کا جواب بالفاظ ذیل مذکور ہے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(۳۱) اور میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں (اس لئے غریب مجھ پر ایمان لائیں ہیں) اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ ملک ہوں (یقیناً بشر ہوں) اور نہ میں ان لوگوں کے لیے جنہیں تمہاری نظریں حقیر دیکھتی ہیں' یہ کہتا ہوں کہ اللہ ان کو بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ خوب جانتا ہے جو ان کے ذہنوں میں ہے۔ اگر انہیں اپنے پاس سے دور کر دوں تو میں ظالموں سے ہو جاؤں گا۔

نوحؑ اور آپ کی قوم کا تذکرہ اس سورت مجیدہ ہود کے علاوہ سورت اعراف' سورہ شعراء سورہ قمر' نیز نوح نامی ایک الگ سورہ میں آیا ہے۔ سورہ نوحؑ میں بتایا گیا ہے کہ آپ کی قوم نے اپنے پانچ متوفی بزرگوں ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر کو اللہ کے ساتھ ساتھ الٰہ قرار دے رکھا تھا۔ سورہ اعراف میں بھی بتایا گیا ہے کہ قوم نوحؑ آپ پر اس لئے ایمان نہ لائی کہ وہ بشر رسول کی قائل نہ تھی۔ جیسے کہ آپ نے فرمایا:

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاۗءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

○ ۷/۶۳ "کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہاری طرف تمہیں میں سے ایک آدمی پر تمہارے رب کی طرف سے نصیحت نامہ آیا ہے۔ کہ وہ تمہیں فرائض سے آگاہ کرے اور تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ اور تاکہ تم رحم کئے جاؤ۔" ان قرآنی خبروں سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم نوحؑ ہستی باری تعالٰی کی منکر نہیں تھی۔ بلکہ اس نے پانچ متوفی بزرگوں کو اللہ تعالٰی کی صفات مخصوصہ میں شریک کرکے الٰہ بنا رکھا تھا وہ نبیوں کے بشر ہونے کے منکر تھے۔ آپ کی نصائح مبارکہ کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آپ سے کہنے لگے کہ بحث تو بہت ہو چکی ہے۔ اگر تو سچا ہے تو جس عذاب کا وعدہ دیتا ہے اس کو لے آ۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوم کے سردار جب لاجواب ہو گئے تو آپ سے کہا:

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

(۳۲) انہوں نے کہا! اے نوحؑ بے شک تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور تو ہمارے ساتھ بکثرت جھگڑا ہے (ہم نہیں مانتے) پس تو جس (عذاب) کا وعدہ دیتا ہے اگر تو سچوں سے ہے تو اسے لے آ۔

السید نوحؑ نے قوم سے کس قدر مغز مارا اور کس کس انداز سے انہیں تبلیغ کی اسی کی تفصیل سورہ نوح میں بالفاظ ذیل درج ہے۔ **قَالَ رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِىْ لَيْلًا وَّنَهَارًا فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاۗءِىْٓ اِلَّا فِرَارًا وَاِنِّىْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ثُمَّ اِنِّىْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ○ ثُمَّ اِنِّىْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭاِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا** ○ (۵ تا ۱۰/۷۱)

(مفہوم) "کہا اے میرے ربؑ میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی (تیری طرف) بلایا اور دن کو بھی۔ مگر میری پکار سے وہ اور زیادہ بھاگتے

رہے۔ اور بے شک میں نے جب بھی انہیں بلایا کہ تو ان کو معاف کر دے' انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑے لپیٹ لیے اور ضد کی اور ایسا تکبر کیا جو تکبر کرنے کا حق ہے۔ پھر میں نے انہیں کھلم کھلا بھی بلایا۔ پھر میں نے انہیں اعلانیہ بھی تبلیغ کی اور مخفی طور پر بھی۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ اپنے رب کے حضور توبہ کرو (اور بداعمالیوں سے باز آجاؤ) بے شک وہ بڑھ کر معاف کرنے والا ہے)

سورہ قمر میں انہیں لوگوں کے متعلق خبر دی گئی ہے۔ **كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝** (۹-۱۰/۵۴) (کی نبی کو جھٹلانے والوں) سے پہلے قوم نوحؑ نے بھی جھٹلایا تھا۔ پس انہوں نے ہمارے بندے نوحؑ کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ پاگل ہے اور اسے جھڑک دیا گیا۔ اس نے اپنے رب کے حضور دعا کی بے شک میں مغلوب ہوگیا ہوں تو میری مدد کرے۔

پوری مہلت = قوم نوحؑ نے تو کھل کر عذاب کا مطالبہ کر دیا۔ جیسے کہ آپ اوپر آیت نمبر ۳۲ کے الفاظ **فاتنا بما تعدنا** میں دیکھ چکے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس وقت تک کے لیے مہلت کا قانون متعین ہے جب تک کہ پوری اتمام حجت نہ ہو جائے۔ چنانچہ قوم کے مطالبہ عذاب کے جواب میں نوحؑ نے فرمایا:

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝

(۳۳) نوحؑ نے کہا سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ اسے تو اللہ ہی لائے گا جب وہ چاہے گا اور تم اسے روک نہ سکو گے۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

(۳۴) اور اگر میں تمہیں نصیحت کرنا چاہوں تو اگر (تمہاری انتہائی سرکشی کی بدولت) اللہ نے تمہیں گمراہ قرار دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو پھر میری نصیحت تمہیں کوئی فائدہ نہیں دیگی۔ وہ تمہارا پالنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے (اعمال کی جواب دہی کے لیے) اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ کا یہ معنی صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گمراہ کرنا چاہے۔ کیونکہ یہ معنی صحیح تسلیم کئے جائیں تو اللہ تعالیٰ نے جو نوع انسانی کی ہدایت کے لیے سلسلہ انبیاء جاری فرمایا تھا۔ فریب محض بن کر رہ جاتا ہے کہ انبیاء لوگوں کو ہدایت کی طرف بلاتے رہیں اور اللہ انہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا رہے۔ معاذ اللہ' استغفراللہ! اس لیے اس کا جو معنی اوپر متن کے سامنے لکھا گیا ہے صحیح ہے کہ نوحؑ نے اپنی قوم کو دن کو بھی تبلیغ کی اور رات کو بھی ظاہر بھی کی مخفی بھی۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی لیکن قوم پر مطلقاً" کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی بدکاریوں سے باز نہ آئے بلکہ عذاب کا مطالبہ کر دیا۔ تو اس طرح اللہ نے انہیں گمراہی کی اسی حد پر پایا جہاں اس کی طرف سے گمراہی کا فتوٰی صادر ہو جاتا ہے۔ یہاں فعل یغوی کا مصدری معنی گمراہ قرار دینا ہے۔ گمراہ کرنا نہیں جس کا اللہ تعالیٰ کے لیے تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

اگلی آیت مجیدہ میں نبی علیہ السلام پر قوم کے لگائے ہوئے ایک الزام کا جواب خود آپ سے دلوایا گیا:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ

(۳۵) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (قرآن) کو اس (محمدؐ) نے اللہ پر خود افتری کر لیا ہے۔ کہہ دیجئے گا کہ (اگر ایسا ہے) تو اس کا گناہ مجھ پر

ﻓَﻌَﻠَﻲَّ اِﺟْﺮَاﻣِﻲْ وَاَﻧَﺎ ﺑَﺮِيْٓءٌ ﻣِّﻤَّﺎ ﺗُﺠْﺮِﻣُﻮْنَ ﴿۳۵﴾

ہے' مگر میں اس جرم سے بری ہوں جو تم میرے ذمہ لگاتے ہو۔ (میں نے افتریٰ نہیں کیا۔ اس بہتان تراشی کے تم مجرم ہو)

اوپر آیت نمبر۳۳ میں قوم نوحؑ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی بداعمالیوں کی بدولت اسی مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی کا فتویٰ صادر ہو جاتا ہے یعنی وہ ایمان لانے کی حدود کو پھاند چکے ہوئے تھے۔ اگلی آیت مجیدہ میں نوحؑ کو اسی کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکے لا چکے۔ بد عملوں کے لیے آپ غمگین نہ ہوں:

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

(۳۶) اور نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا سوائے اس کے جو ایمان لا چکا ہے۔ پھر منکر لوگ جو عمل کرتے ہیں آپ اس پر افسوس نہ کریں۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

(۳۷) ان پر طوفان کا عذاب آنیوالا ہے۔ اس سے بچاؤ کے لیے' آپ ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہماری جبلی وحی کے مطابق کشتی بنائیں۔ اور مجھے ظالموں کے متعلق مخاطب نہ کرنا۔ بے شک وہ سب غرق ہونے والے ہیں۔

باعیننا ووحینا کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی تھی کہ فلاں قسم کی لکڑی کا انتخاب فرمائیں۔ اتنے موٹے پھٹے چروائیں۔ پھر اتنے اتنے موٹے لوہے کے کیلوں کے ساتھ پھٹوں کو فلاں فلاں ڈیزائن کے مطابق آپس میں جوڑیں۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جبلت میں یہ چیز محفوظ کر رکھی ہے کہ وہ اپنے دماغ میں ایک چیز کا ڈیزائن تیار کرتا ہے اور کائناتی آیات کریمہ کے مطابق اسے تیار کرکے عالم وجود میں لاتا ہے۔ جیسے کہ اہل مغرب آئے دن نئی سے نئی ایجادات کرتے چلے جا رہے ہیں جن کے ڈیزائن اپنے دماغ میں تیار کرتے ہیں اور اس کے مطابق وہ ایجاد عالم وجود میں لائی جاتی ہے۔

ایسے تصور میں نوحؑ کے انتہائی توہین پائی جاتی ہے کہ اہل مغرب تو ریلیں' کاریں' بحری اور ہوائی جہاز ہر مرحلے پر تنزیلی وحی کی رہنمائی کے بغیر تیار کرلیں اور نوحؑ کشتی بھی اس کے بغیر نہ بنا سکیں کہ اس کی تیاری کے ہر مرحلے پر اللہ تعالیٰ کو وحی کرنی پڑے۔ واضح رہے کہ کائنات کے ہر گوشے میں صحیفہ فطرت کی آیات کریمات انسان کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔ جیسے کہ مختلف گوشوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی کتاب کائنات کی آیتیں ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۔ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ○ ۷۹-۸۱ / ۴۰

اللہ وہ عظیم الشان ذات ہے جس نے تمہارے لیے چارپایوں کو بنایا تاکہ تم ان میں سے بعض پر سواری کرو اور بعض کو کھاؤ۔ اور اس نے ان میں تمہارے لیے بہت فائدے ٹھہرائے ہیں تاکہ ان پر سوار ہوکر اپنی حاجت کو پہنچو جو تمہارے ذہنوں میں ہے اور تم ان پر اور کشتی پر سوار کیے جاتے ہو۔ اور اللہ تم کو اپنی آیتیں دکھاتا ہے۔ پھر تم اس کی کون کونسی آیت

فطرت کا انکار کرو گے۔

اس آیت مجیدہ میں چارپایوں اور کشتیوں کو اللہ کی آیتیں بتایا گیا ہے۔ چارپایوں پر سواری کرنے کے لیے گھوڑے کے اوپر زین اور اس کے منہ میں لگام دینا' انسان نے اللہ تعالیٰ کی وحی جبلی کے مطابق ایجاد کیا ہے۔ بیل' بھینسا اور گدھا وغیرہ لدو چارپایوں سے کھیتی اور باربرداری کے فوائد حاصل کرنے کے طریقے ہل پنجالی اور گڈے چھکڑے وغیرہ ایجاد کیے ہیں۔ اسی طرح نوحؑ نے اللہ تعالیٰ کی جبلی وحی اور کائناتی وحی یعنی سائنسی اصولوں کے مطابق کشتی بنائی۔ **واصنع الفلک باعیننا ووحینا** کا مفہوم یہ ہے کہ کشتی کو سائنٹفک اصولوں کے مطابق تیار کریں سورہ قمر میں خبر دی گئی ہے کہ وہ موٹے پھٹوں اور مضبوط آہنی کیلوں کیساتھ تیار کی گئی تھی: **وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ** (۵۴/۱۳) اور ہم نے نوح کو لوہے کے کیلوں کے ساتھ مضبوطی سے جڑے ہوئے پھٹوں والی کشتی پر سوار کیا۔ مگر اگلی آیت مجیدہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

(۳۸) اور وہ (نوحؑ) کشتی بناتے تھے اور جب اس پر ان کی قوم کے سردار گزرتے تو ان پر ہنستے تھے۔ آپؑ نے کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو (جب طوفان آئے گا تو) اسی طرح ہم تم پر ہنسیں گے جس طرح تم ہنستے ہو۔

قوم کے سردار یہ کہتے ہوئے گزرتے تھے کہ لو جناب اس سطح مرتفع پر ہمارے لئے طوفان کا عذاب آنیوالا ہے اس کے جواب میں نوحؑ نے انتہائی یقین ایمان کے اندر میں قوم کے متکبر سرداروں کو برملا کہہ دیا۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

(۳۹) پس تم ضرور جان لوگے کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کرے اور کس پر قائم رہنے والا عذاب نازل ہوتا ہے۔

ادھر کشتی تیار ہو گئی ادھر نزول عذاب کا وقت آگیا۔ جس کی خبر اگلی آیت مجیدہ میں بالفاظ ذیل دی گئی ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾

(۴۰) یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور گڑھوں نے جوش مارا' ہم نے کہا کہ کشتی میں تمام (ضروری) جانوروں کے جوڑے اور اپنے اہل کو سوار کر لیجئے' سوائے ان کے جن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور جو ایمان لایا ہے اسے بھی سوار کر لو۔ اور اس (نوحؑ) کیساتھ نہ ایمان لائے مگر تھوڑے سے لوگ۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

(۴۱) چنانچہ آپنے (ضروری جوڑے سوار کر لیے اور اپنے اہل کو) کہا اس میں سوار ہو جاؤ اس کا چلنا بھی اللہ کے قانون کے مطابق ہے اور اس کا رکنا بھی اللہ کے قانون کے مطابق ہے بے شک میرا رب بچاؤ عطا کرنے والا مہربانی فرمانے والا ہے۔

من کل زوج اثنین سے مراد جانوروں کے ضروری جوڑے ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی چل نہیں سکتی مثلاً گھوڑے' گدھے' گائے' بھینس' بھیڑ' بکری وغیرہ۔ کل کے لفظ سے ضروری چیزوں کا کل مراد ہے۔ جیسے کہ ملکہ سبا کے متعلق

قرآن مجید میں بتایا گیا ہے اُوتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (۲۷/۲۳) کہ اسے ہر ضروری چیز دی گئی ہے مثلاً" مال' دولت' خزانہ اسلحہ' فوج وغیرہ نہ کہ اس کے پاس سانپ' بچھو' مینڈک' کچھوے مگرمچھ اور انبار در انبار کیڑے مکوڑے حشرات موجود تھے۔ پس جس طرح ملکہ سباء کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اسے سلطنت سے متعلقہ ہر ضروری چیز دی گئی تھی۔ اسی طرح نوحؑ کو انسانی زندگی سے متعلقہ ہر ضروری جوڑے کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بسم اللہ مجرھا ومرسھا کے الفاظ میں اسم بمعنی اللہ کا قانون ہے نوحؑ نے اعلان فرمایا کہ اس کا چلنا اور رکنا اللہ کے قانون کے مطابق ہے۔ اگر یہاں اسم بمعنی نام لیا جائے تو اگر کشتی اللہ تعالٰی کے قانون کے خلاف بنائی گئی ہو کہ اس کی درزوں میں سے پانی کشتی کے اندر داخل ہو رہا ہو تو اس پر اللہ کے نام کا ورد کرنے سے وہ ہرگز ہرگز نہیں چلیگی' بلکہ ڈوب جائے گی۔ یا بالفاظ دیگر اللہ کے نام میں اس کا قانون موجود ہے۔ جس طرح یہاں اللہ کے اسم کا ایک معنی اللہ کا قانون ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں اللہ کے امر کا ایک معنی بھی اللہ کا قانون ہے جیسے کہ سورہ ابراہیم میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۱۴/۳۲ اور اس نے کشتیوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ اللہ کے امر (اس کے قانون) کے مطابق سمندر میں چلتی رہیں۔ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ کشتی سمندر میں وہ چلتی ہے جو اللہ تعالٰی کے قانون فطرت کے مطابق بنائی گئی ہو۔ اور اس کے چلنے میں قانون فطرت کی سازگاری بھی میسر ہو۔ پس مشاہدات کی شہادت کے مطابق قانون فطرت اور اس کی سازگاری ہی اللہ تعالٰی کا امر ہے جس کے مطابق کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں۔

اس طرح قرآن کریم میں اللہ کی نعمت کا بھی ایک معنی اللہ کا قانون ہے۔ جیسے کہ سورہ لقمان میں کشتیوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے **أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ** ۳۱/۳۱ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک سمندر میں کشتیاں اللہ کی نعمت (اس کے قانون) کے مطابق چلتی ہیں ۔ تاکہ وہ تمہیں اپنی آیتیں دکھائے۔)

مُجْرٖهَا کی ر کے نیچے زیر اس امر کی تاکید کیلئے ہے کہ اللہ کے قانون کی موافقت کے بغیر کشتیاں ہرگز نہیں چل سکتیں۔ مثلاً جب کشتی میں سوراخ ہو جائے اور پانی اس کے اندر داخل ہو کر اسے قانونی حد سے زیادہ بوجھل کر دے تو وہ چل نہیں سکے گی بلکہ ڈوب جائیگی۔ یہی حال ہر سواری کا ہے' سائیکل' موٹر' ریل اور ہوائی جہاز وغیرہ ہر چیز میں جب کوئی خرابی پیدا ہو جائے جو قانون الٰہی کے خلاف ہو تو وہ رک جاتی ہے۔ مثلاً تیل ختم ہو جائے یا کوئی اور فنی خرابی ہو جائے تو موٹر' ریل اور ہوائی جہاز فوراً" رک جائے گا۔ اور جب تک وہ کمی پوری نہ کی جائے چل نہیں سکے گا پس **مجرھا** کی ر زیر کو لمبا کرکے پڑھنے میں قوانین فطرت کے اٹل ہونے پر خصوصی توجہ دلائی گئی ہے اور ہمہ جہتی ترقی کا راز یہی ہے کہ جو قومیں قوانین فطرت کی اتباع کرتی ہیں وہ کامیاب و کامران ہوتی ہیں جو قوانین قدرت کی مخالفت کرکے عمل کو چھوڑ کر صرف دعاؤں پر اکتفا کرتی ہیں وہ اقوام عالم کی ترقی کی دوڑ میں پسماندہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ العیاذ باللہ !

اگلی آیت مجیدہ میں قوانین باری تعالٰی کے مطابق سائنٹفک طریقے پر تیار کردہ کشتی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ پہاڑوں جتنی بڑی بڑی لہروں کا مقابلہ کرتی ہوئی طوفان کے پانی میں چل رہی تھی کہ وہاں یہ واقعہ پیش آیا کہ نوحؑ نے اپنے

بیٹے کو ایک کنارے پر کھڑا پایا' آپ نے اسے کہا کہ ہمارے ساتھ سوار ہو جا:

وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ﴿۴۲﴾

(۴۲) اور وہ (کشتی) انہیں لے کر پہاڑوں جیسی لہروں میں چلتی تھی (کہ آپ کو بیٹا دکھائی دیا) نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا کہا جب وہ ایک کنارے پر تھا کہ ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا اور انکار کرنے والوں کا ساتھی نہ بن۔

قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ﴿۴۳﴾

(۴۳) اس نے کہا میں ابھی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا۔ وہ مجھے پانی سے بچا لے گا۔ آپ نے فرمایا کہ آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں۔ سوائے ان کے جن پر اللہ نے رحم کیا (جو کشتی میں سوار ہو چکے ہیں) ان دونوں کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی اور وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا۔

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۴۴﴾

(۴۴) اور (بزبان قانون) کہا گیا کہ اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور اے آسمان تھم جا۔ اس طرح پانی خشک ہوگیا۔ اور حکم ختم ہوگئی اور کشتی جودی پہاڑی پر جا لگی اور کہا گیا کہ ظالموں کے لیے (اللہ کی رحمت سے) دوری ہے۔

آمد طوفان کے متعلق آیت نمبر۴۰ میں بتایا گیا ہے **(فار التنور)** کہ گڑھوں یعنی چشموں سے پانی جوش مار کر پھوٹ پڑا لیکن اس آیت نمبر۴۴ سے پتہ چلتا ہے کہ نیچے سے زمین کا پانی گڑھوں سے زور مار کر طوفان لے کر آیا اور اوپر سے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ چنانچہ جب قوم نوحؑ کے سرکش و بدکار لوگ غرق ہوگئے تو نیچے سے زمینی چشموں کا پانی خشک کر دیا گیا اور اوپر سے بارش کو تھما دیا گیا۔

عالمگیر طوفان: آگے بڑھنے سے پہلے ذہن میں ابھرنے والے دو سوالوں کے جوابات ضروری ہیں۔ پہلا یہ کہ طوفان نوحؑ کے متعلق زبان زد عوام یہ ہے کہ یہ طوفان پورے کرہ ارض پر آیا تھا۔ لیکن حقیقت حال کو سمجھنے میں کوئی دقت موجود نہیں کہ اوپر قوم نوحؑ کی سرکشیوں اور نافرمانیوں کا ذکر ہے۔ نیز عذاب کا مطالبہ اسی قوم نوحؑ نے کیا تھا اور اسی قوم کے لیے یہ طوفان لایا گیا تھا۔ پس اسی علاقے پر آمد طوفان لازم تھی جس پر قوم نوحؑ آباد تھی۔ باقی رہا یہ سوال نوحؑ نے یہ کہا تھا رب **لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا** ۷۱/۲۶ اس میں الارض سے مراد ساری زمین نہیں بلکہ زمین کا وہ حصہ ہے جس پر قوم نوح کی بستیاں آباد تھیں۔ اس کی طرح مثالیں قرآن کریم میں بہت سی موجود ہیں۔ مثلاً فرعون کے متعلق آیا ہے:

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ ۲۸/۴ بے شک فرعون نے زمین کے اس حصے میں سرکشی اختیار کی تھی جس پر اس کی حکومت تھی۔ اسی طرح یوسفؑ کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۵۶/۱۲ اسی طرح ہم نے یوسفؑ کو مصر کی سرزمین میں اقتدار عطا فرمایا۔ جس طرح ان دونوں آیتوں میں الارض کا الف لام عوض مضاف الیہ ہے اور الارض سے مراد ارض المصر ہے یعنی فرعون نے مصر کی زمین میں سرکشی کی تھی اور یوسفؑ کو مصر کی سرزمین میں اقتدار عطا کیا گیا تھا۔ اسی طرح ۲۶/۷۱ **رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا**" میں بھی **الارض** کا الف لام عوض مضاف الیہ ہے اور اس سے مراد ہے **ارض القوم نوح** قوم نوحؑ کی زمین ۔ گویا زمین کا وہ حصہ جس میں قوم نوح کی بستیاں تھیں جنہیں ان کے باسیوں سمیت غرق کر دیا گیا۔

ذہن میں ابھرنے والا دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا قوم نوح پر طوفان کا عذاب فطری قوانین کے خلاف لایا گیا تھا؟ اس کا جواب ہے نہیں' بلکہ فطری قوانین کے مطابق ہی لایا گیا تھا۔ زمین میں پانی ہر جگہ موجود ہے جس کے ذخیرے اونچے اونچے پہاڑوں پر ہیں۔ زمین کا پانی اس اصول کے مطابق کہ مائعات اپنی سطح ہموار رکھتے ہیں' ہر وقت اپنے منبع کی بلندی تک پہنچنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اس کوشش میں سطح مرتفع کی گھاٹیوں میں عموماً" چشموں کی صورت میں پھوٹ پڑتا ہے چنانچہ قوم نوح کے لیے طوفان کا عذاب ایک طرف تو زمین اور سطح مرتفع کے چشموں کے ذریعہ لایا گیا اور دوسری طرف آسمان سے موسلا دھار بارش برسائی گئی۔ قوانین فطرت کے دونوں پانی مل کر جودی کی چوٹی تک جا پہنچے۔ بارشوں کے برسنے اور تھمنے کا مشاہدہ فطرت ہر شخص کے سامنے ہے اور اسی طرح چشموں کے پھوٹنے اور رخ بدل کر ان کے خشک ہو جانے کے مشاہدات سے بھی نوع انسانی انکار نہیں کر سکتی۔ بعض قوموں پر آندھی اور زلزلوں کا عذاب لایا گیا۔ یہ چیزیں بھی قانون فطرت سے خارج نہیں۔ بالفاظ دیگر نوع انسانی کی سرکشیوں کی سزا کے سامان خالق کائنات نے گوشے گوشے میں پیدا کر رکھے ہیں جو قانون فطرت کے مطابق ہی آتے رہتے ہیں۔

پیچھے آیت ۴۳ میں بتایا گیا ہے کہ نوحؑ کا بیٹا آپ کی آنکھوں کے سامنے غرق ہوگیا۔ آپ کو اس کا صدمہ ہوا۔ اسے اپنا اہل سمجھ کر کشتی ہی میں باری تعالی سے عرض کی وہ میرا اہل تھا۔ تیرا وعدہ میرے اہل کو بچا لینے کا تھا:

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿٤٥﴾

(۴۵) اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا۔ پس کہا میرے ربؐ بے شک میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا۔ اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو ہی حاکموں کا حاکم ہے۔

قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٤٦﴾

(۴۶) فرمایا (اللہ نے) اے نوحؑ! بے شک وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا (تیرے اہل صالحین ہیں) بلاشبہ وہ مجسم غیر صالح عمل تھا۔ پس تو اس کے۔ متعلق مجھ سے سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔ بیشک میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو بے خبروں میں نہ رہ۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ

(۴۷) (نوحؑ نے) کہا اے میرے رب بیشک میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں سوال کروں اس کا جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو

مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

مجھے معاف نہ کرے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓي اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(۴۸) کہا گیا کہ اے نوحؑ! ہماری طرف سے سلامتی اور برکت کے ساتھ جو تجھ پر اور ان گروہوں پر ہے جو تیرے ساتھ ہیں' کشتی سے اتر اور دوسرے گروہوں کو بھی ہم ضرور فائدہ دیں گے۔ پھر (جو سرکشی کریں گے) انہیں ہماری طرف سے درد ناک عذاب پہنچیگا۔

امید نوحؑ نے جو اپنے بیٹے کے لیے یہ کہہ کر سوال کیا تھا کہ وہ میرے اہل سے تھا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ وہ تیرے اہل میں سے نہ تھا۔ کیونکہ وہ بالکل غیر صالح عملوں والا تھا' یعنی مطلقاً" بد عمل آدمی خواہ وہ کوئی ہو اللہ کے نبیؑ کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس کا یہ جواب تو ممکن ہی نہیں کہ آپ اتنی معمولی سی بات بھی نہیں جانتے تھے۔ مگر اس پر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کیوں ارشاد ہوا کہ تو مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کرنا جس کی تجھے خبر نہ ہو۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے اہل کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ مگر اس پر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی بے خبری تو مقام نبوت تک کے خلاف ہے۔

برادران عزیز! حقیقت یہ ہے کہ یہاں نبی کے اہل سے بے خبری کی اطلاع نہیں دی گئی' بلکہ اس چیز سے مطلع کیا گیا ہے کہ آپ اپنے بیٹے کی بداعمالیوں سے بے خبر تھے۔ چنانچہ آپ کو باندازِ تحدید ارشاد ہوا ہے:

اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ ۱۱/۴۶ تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو بے خبروں سے نہ رہ (تیرا بیٹا بد عمل تھا۔ نہ وہ نیکو کار تھا اور نہ تیرا اہل تھا) بالفاظ دیگر بدکردار بیٹے نے اپنے آپ کو منافقانہ طور پر نیکو کار ظاہر کر رکھا تھا۔ اور اس لیے نوح اسے اپنا اہل سمجھے ہوئے تھے نہ یہ کہ آپ کو لفظ اہل کے معنی ہی نہیں آتے تھے۔ استغفراللہ۔

نوحؑ نے بد عمل بیٹے کے لیے رب تعالیٰ سے دعا کرنے پر پناہ طلب فرمائی۔ لیکن یاد رہے۔ کہ آپ کا یہ عمل آیات بالا کے مطابق بیٹے کی بد اعمالیوں سے بے خبری کی بدولت تھا۔ لفظ اہل کے معنی اور مفہوم سے بے خبری کی وجہ نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی سلامتی اور برکت نوحؑ اور ان نیکوکار مومنوں پر تھی جو اپنے نیک اعمال کی بدولت آپؑ کے اہل ثابت ہوئے اور کشتی میں سوار ہو کر ایک عظیم طوفانی عذاب سے محفوظ رہے۔ اس کے برعکس آپ کا بیٹا بد عملیوں کی بدولت نہ اہل ثابت ہوا اور نہ عذاب سے محفوظ رہا۔ ان آیات کریمات میں نسلی برتری کی مطلقاً" نفی کر دی گئی ہے اور باعث شرف صرف اعمال صالح بتائے گئے ہیں۔

آیت نمبر ۴۸ کے اخیر پر قیامت تک کے لیے اعلان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ کشتی نوح میں سوار ہو کر عذاب سے محفوظ رہے یہ عذاب سے محفوظ رہنے اور آپؑ کے اہل ثابت ہو چکنے کے باوجود قانون الٰہی کی زد سے آزاد نہیں بد عملی کی سزا سے نہ یہ آزاد ہیں اور نہ قیامت تک کی دوسری اقوام بری ہیں بد عمل لوگ اگر توبہ اور اصلاح نہ کریں وہ ضرور ضرور سزا کے مستحق ہوں گے۔ نوحؑ کے ذکر جلیل کے خاتمہ پر نبی اکرمؐ کو ارشاد ہوا ہے کہ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ پر وحی کرتے

ہیں۔ آپ اس سے پہلے ان خبروں کو نہ جانتے تھے۔ آپ غیب دان نہیں۔ اگر غیب دان ہوتے تو ان خبروں کے نزول کی ضرورت نہیں تھی۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ۠ ﴿۴۹﴾

(۴۹) (اے رسول عربی) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے نہ آپ انہیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔ پس آپ بھی ثابت قدم رہیئے گا۔ بلاشبہ بہتر انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو قوانین الٰہی کی مخالفت سے بچنے والے ہیں۔

ماکنت تعلمها ولا قومک من قبل هذا کے الفاظ میں امت کے ایک قدیمی متنازعہ مسئلہ کا حل موجود ہے کہ نبی اکرمؐ نزول وحی سے ماقبل نوحؑ کے صحیح حالات کو نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح کفالت مریمؑ کے حالات بیان کرنے کے بعد ۳/۴۴ میں ارشاد ہوا ہے: **ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ** ۞ ۳/۴۴ مذکورہ بالا غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اور اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ (ہیکلوں والے) وستخط کر رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے گا۔ اور نہ آپ اس وقت ان کے پاس موجود تھے جب وہ کفالت مریم کے متعلق آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

اسی طرح یوسفؑ کے پورے حالات بیان کرنے کے بعد سورہ یوسف میں ارشاد ہوا ہے: **ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ** ۱۲/۱۰۲ مذکورہ بالا غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ برادران یوسفؑ اپنی بری تجویز پر جمع ہوئے تھے۔ اور بری تجویزیں کر رہے تھے۔

آیات کریمہ سے ثابت ہوتا ہے نبی اکرمؐ غیب دان نہیں تھے۔ کیونکہ آپ کو صحیح خبروں سے بذریعہ وحی مطلع کیا جاتا تھا۔ اور سلسلہ وحی آپ پر آخری ایام تک جاری رہا۔ نیز **ما کنت لدیهم** کے الفاظ میں مسئلہ حاضر و ناظر کا بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ نہ کفالت مریمؑ کے تنازعہ کے وقت موجود تھے نہ طوفان نوحؑ کے وقت اور نہ آپ برادران یوسفؑ کے پاس موجود تھے جب وہ بری تجویزیں کر رہے تھے۔

آیات بالا میں نوحؑ کی مشکلات بیان کرنے کے بعد **فاصبر** کے خصوصی حکم میں نبی اکرمؐ کو نوحؑ کی طرح مستقل مزاج رہنے کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ فرمائی مگر قوم کے افراد کے سوا کوئی ایمان نہ لایا بلکہ آپ کا مسلسل تمسخر اڑاتے رہے۔ چونکہ نبی اکرمؐ کا بھی یہ کہہ کر کہ یہ دیوانہ ہے مذاق اڑایا جاتا تھا۔ اس لیے **فاصبر** کے الفاظ میں آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ بھی مستقل مزاج رہیں اور ہمارے تنزیلی اور کائناتی قوانین پر جم کر عمل کریں۔ آخری فتح ان کی ہوتی ہے جو قوانین الٰہی کے مخالفت سے بچتے ہیں۔

چنانچہ **ان العاقبة للمتقین** کے الفاظ میں اسی چیز کی خبر دی گئی ہے کہ جس طرح نوحؑ کے مخالف ان کی آنکھوں کے سامنے ختم کر دیئے گئے تھے اسی طرح نبی اکرمؐ کے دشمن ابوجہل وغیرہ بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے ختم کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ وہ جنگ بدر میں آپ کے سامنے قتل ہوئے اور آخری فتح بھی فتح مکہ کے نام سے نبی اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ ہی

کے حصے میں آئی۔

ایک اہم نکتہ: نوح کے ذکر جمیل میں ایک اہم ترین قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ نوحؑ کی مخالفت جب ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی تو آپ نے حضور الٰہی میں دعا کی **رب انی مغلوب فانتصر** ۵۴/۱۰ اے میرے رب میں مغلوب ہوگیا میری مدد کر۔ آپ کی دعا قبول ہوئی کہ ہم ان پر ایک عظیم طوفان آب کا عذاب لاکر انہیں غرق کر دیں گے۔ لیکن اس کے ضمن میں آپ کو اپنے اور اپنے اہل کے بچاؤ کے لیے ہمارے قوانین فطرت یعنی سائنسی اصولوں کے مطابق کشتی تیار کرنا ہوگی۔ چنانچہ کشتی تیار کی گئی۔ اور اس کے ذریعہ نوحؑ اور آپ کے اہل کو طوفان سے بچایا گیا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو ذات مقدس نوحؑ کی قوم کو ختم کرنے کی طاقت رکھتی تھی کیا وہ نوحؑ اور آپ کے اہل کو کشتی کے بغیر بچا نہیں سکتی تھی؟ اس سوال کا جواب بچا سکنے کے لحاظ سے تو یہ ہے کہ وہ بچا سکتی تھی۔ لیکن وہ خود اپنے اعلان کے مطابق ایسا نہیں کرتی کہ اپنے خود متعینہ قوانین فطرت کے خلاف عمل کرے ۲۹/۵۰ چنانچہ جملہ سرکش اقوام کو قوانین فطرت ہی کے ذریعہ کسی کو آندھی کے ساتھ' کسی کو زلزلے کے ذریعہ اور کسی کو میدان جنگ میں ختم کیا گیا۔ اسی طرح قوم نوحؑ کو طوفان آب کے ساتھ ختم کیا اور خود نوحؑ کو اپنے قانون فطرت کے مطابق کشتی ہی کے ذریعے طوفان سے محفوظ رکھا۔ کیونکہ طوفان آب سے بچانے کیلئے اس کے قانون میں کشتی یا بحری جہاز ہی مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے متعینہ قوانین کے خلاف ہرگز نہیں کرتا ۲۹/۵۰ اور نہ ہی قوانین فطرت کی مخالفت کرکے کوئی قوم کامیاب ہوسکتی ہے جنگ احد میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم سے قوانین فطرت کی معمولی سی مخالفت سرزد ہوئی تو اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس پاکیزہ لشکر کو بھی زک اٹھانا پڑی جس کے سپہ سالار خود خاتم النبین تھے۔ نوحؑ کے مبارک ذکر میں آخری چیز سمجھنے کی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قوم نوحؑ کو طوفان آب کے ساتھ ختم کرنے کا ارادہ فرمایا تو نوحؑ کو طوفان آب سے محفوظ رہنے کے لیے کشتی بنانے کا حکم دیا۔ اسی طرح جب قوم لوطؑ پر پتھراؤ کا ارادہ فرمایا تو انہیں حکم دیا کہ آپ اپنے اہل کو لیکر اس بستی سے نکل جائیں۔ مگر قوم عاد و ثمود کو جو زلزلہ اور آندھی کے ساتھ ختم کیا گیا تو ہودؑ و صالحؑ کو اپنے اور اپنے اہل کے بچاؤ کے لیے کیا حکم دیا؟ واضح رہے کہ ہودؑ اور صالحؑ کے اذکار جلیلہ میں یہ چیز محذوف ہے ان سے بھی قوانین فطرت کے مطابق محفوظ پناہ گاہیں تیار کروائی گئی تھیں اور انہیں اسی طرح اپنے متعینہ قوانین فطرت کے مطابق ان اسباب ہی کے ذریعہ بچایا تھا جو زلزلوں اور طوفان باد سے بچاؤ کیلئے اس نے خود مقرر فرمائے ہیں' جس طرح نوحؑ کو اس سبب کے ذریعہ بچایا تھا جو طوفان آب سے بچنے کے لیے اس نے خود مقرر فرما رکھا ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں ھودؑ کا ذکر لایا گیا ہے۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝۵۰

(۵۰) اور (ہم نے قوم عاد) کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ نہیں ہو تم مگر اللہ پر افتریٰ باندھنے والے ہو۔

وَاِلٰی عَادٍ کا عطف پیچھے آیت نمبر ۲۵ کے الفاظ **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ** پر ہے اس لئے **وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا** کا صحیح معنی یہ ہے "اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔" اگرچہ اس آیت میں **اَرْسَلْنَا** کے الفاظ موجود نہیں۔ مگر معطوف معطوف علیہ کے اصول قواعد کے مطابق یہاں **اَرْسَلْنَا** موجود ہے۔ نیز یہاں **عَادٍ** کی تنوین عوض مضاف ہے' اور ترکیب کلام یہ ہے **وَاَرْسَلْنَا اِلٰی قَوْمِ عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا** ○۔

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ میں **اعْبُدُوا اللّٰهَ** کے الفاظ میں اللہ کی عبودیت کرنے کا حکم دیا ہے اس کا صحیح مفہوم اللہ تعالیٰ کا بندہ بنا لینی صرف اسی کا حکم ماننا ہے۔

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ کے الفاظ میں ہودؑ نے قوم پر یہ واضح فرمایا کہ تم لوگوں نے جو اللہ کے ساتھ ساتھ اپنے متوفی بزرگوں کا حکم ماننے کا تصور پیدا کر رکھا ہے۔ یہ تمہارا افتریٰ محض ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنے حکم میں شریک نہیں کیا۔ **لَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا** ○ (۱۸/۲۶) اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی ایک کو بھی شریک نہیں کرتا۔

اگلی آیت مجیدہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہودؑ نے اپنی قوم پر وہی کچھ واضح فرمایا جس کا اعلان اپنی قوم کے سامنے نوحؑ نے فرمایا تھا۔ کہ میں تم سے کوئی اجر رسالت نہیں مانگتا' میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے۔

یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱

(۵۱) اے میری قوم میں تم سے اس (تبلیغ دین) کا کوئی اجر نہیں مانگتا۔ نہیں ہے میرا اجر مگر اس ذات پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پھر تم کیوں عقل نہیں کرتے۔

وَیٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّیَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝۵۲

(۵۲) اور اے میری قوم اپنے رب سے حفاظت طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ وہ تم پر زور سے برستا ہوا آسمان بھیجے گا (یعنی باران رحمت کی کثرت کے ساتھ رزق کی فراوانی عطا فرمائے گا) اور تم اللہ کے مجرم بن کر برگشتہ نہ ہو جاؤ۔

لیکن قوم ہودؑ نے بھی قوم نوحؑ کی طرح اپنے پیروں کو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ میں شریک کر رکھا تھا۔ اس لئے انہوں نے کہا:

قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِیْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۳

(۵۳) انہوں نے کہا' اے ہودؑ! تو ہمارے پاس کوئی کھلی دلیل نہیں لایا۔ اور ہم تیرے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہی ہم تجھ پر ایمان لانیوالے ہیں۔

إِنْ نَّقُوْلُ إِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ إِنِّيْٓ أُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا أَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۙ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾

(۵۵-۵۴) ہم نہیں کہتے مگر صرف یہ کہ ہمارے کسی معبود (پیر) نے تجھے ذلیل کر دیا ہے۔ آپؑ نے فرمایا' میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو۔ بیشک میں اس سے بیزار ہوں جو تم (اپنے پیروں کو) اس اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ پھر تم سب اکٹھے ہو کر میرے خلاف تجویز کرو پھر مجھے مہلت نہ دینا۔

پانچ دلیلیں:۔ آیات بالا میں پانچ دلائل قاطعہ ایسی گزر چکی ہیں جن سے کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ قوم ہودؑ ہستی باری کی منکر نہیں تھی۔ اور دوپہر کے سورج جیسی کھلی چھٹی دلیل سورہ اعراف نمبر۷ کی ہے۔ بالترتیب ہر چھ دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ پہلے نمبر پر اوپر ۵۰/۱۱ میں ہود نے قوم کو کہا:۔ **قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ** اے میری قوم اکیلے اللہ کی فرمانبرداری کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ آپ نے یہ نہ فرمایا کہ اللہ پر ایمان لاؤ بلکہ یہ کہا کہ اکیلے اللہ کی فرمانبرداری کرو۔ اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی قوم اللہ تعالیٰ کی ہستی کی قائل تھی مگر اپنے بزرگوں کو اس کی صفات مخصوصہ میں شریک کر رکھا تھا۔

۲۔ دوسرے نمبر پر اسی آیت ۵۰/۱۱ میں آپ نے قوم سے کہا **إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُوْنَ** ○ نہیں ہو تم مگر اللہ پر افتریٰ باندھنے والے ہو۔ بزرگوں کو صفات الٰہی میں شریک ٹھہرانے والی قومیں اللہ تعالیٰ پر یہ افتریٰ باندھتی ہیں کہ ہمارے بزرگوں کو خود اللہ تعالیٰ نے یہ صفات عطا فرمائی ہیں کہ وہ مشکلیں حل کرتے ہیں۔ بیٹے دیتے ہیں' بارش برساتے ہیں' کھیتیاں پیدا کرتے ہیں' مویشیوں میں برکت ڈالتے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی بے نیازی کا بھی حصہ دے رکھا ہے۔

۳۔ تیسرے نمبر پر آیت نمبر ۵۲ میں ہودؑ نے قوم سے کہا **وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا إِلَيْهِ** اور اے میری قومؑ اپنے رب سے حفاظت مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ گنہگار تھے' اسلئے انہیں اللہ تعالیٰ سے طلب حفاظت کا حکم دیا گیا' نیز وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے دور ہٹ چکے تھے' اس کے منکر نہیں تھے۔ اسی لئے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔

۴۔ چوتھے نمبر پر آیت نمبر۵۴ میں آپنے قوم سے کہا **إِنِّيْٓ أُشْهِدُ اللّٰهَ** بیشک میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں۔ اگر وہ لوگ ہستی باری تعالیٰ کے منکر ہوتے تو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا ہی نہیں جاسکتا تھا۔

۵۔ اور پانچویں نمبر پر اسی آیت نمبر۵۴ میں آپ نے فرمایا **وَاشْهَدُوْٓا أَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ** ○ اور تم بھی گواہ ہو جاؤ کہ میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم اللہ کے شریک ٹھہراتے ہو۔ **مِمَّا تُشْرِكُوْنَ** کے الفاظ سے کھل کر ثابت ہو چکا کہ قوم ہودؑ اللہ کی منکر نہیں تھی بلکہ مشرک تھی' اللہ تعالیٰ کی صفات مخصوصہ میں غیر اللہ کو شریک کئے ہوئے تھی العیاذ باللہ!

۶۔ چھٹے نمبر پر اسی چیز کی تائید سورہ اعراف کی آیت نمبر۷۰ میں بالفاظ صریح موجود ہے کہ ہودؑ کی قوم نے آپ کی تبلیغ وحدت کے جواب میں کہا:۔ **قَالُوْٓا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا** (۷/۷۰) انہوں نے کہا کہ

(اے ھودؑ!) کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی فرمانبرداری کریں اور اس کے علاوہ جن کی فرمانبرداری ہمارے باپ دادا کرتے تھے' انہیں چھوڑ دیں۔

رجوع الی المطلب:۔ ھودؑ کی مشرک قوم اللہ تعالیٰ کیساتھ شرک کرنے سے باز نہ آئی۔ پچھلی آیت نمبر ۵۴ میں آپ نے ان کے شرک کے فعل سے بیزاری کا اعلان فرمایا:۔ **اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ** اور ساتھ ہی چیلنج کیا کہ تم سب اکٹھے ہو کر میرے خلاف جو تجویز چاہو کرو۔ اور مجھے مہلت نہ دینا۔ میرا محافظ میرا اللہ ہے۔ چنانچہ اگلی آیت نمبر ۵۶ میں آپ کا ایک یادگاری اعلان بھی موجود ہے اور ایک اہم اعتقادی مسئلہ کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے:

اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾

(۵۶) بیشک میں نے اللہ اپنے رب اور تمہارے رب (کے قانون) پر بھروسہ کیا ہے۔ کوئی جاندار نہیں مگر وہ (اللہ) اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑے ہوئے ہے (یعنی ہر جاندار اس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے) بیشک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔ (ہر کسی سے انصاف کرنیوالا ہے)

○ نمبرا توکل علی اللہ کا یہ مفہوم یکسر غلط ہے کہ عمل تو کیا جائے قانون الٰہی کے خلاف اور توکل علی اللہ کہہ کر برے عمل کے اچھے نتیجے کی امید رکھی جائے۔ قانون الٰہی یہ ہے کہ جَو بونے سے جَو ہی اگیں گے توکل علی اللہ جَو بو کر گندم اگنے کی امید رکھنا' لفظ توکل کے مفہوم سے بے خبری کی دلیل ہے۔ توکل کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ پیش آمدہ کام کے متعلق قانونِ جاریہ کے مطابق پروگرام بنا کر اس پر عمل شروع کیا جائے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے:

○ **وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِیْنَ** ○ (۳/۱۵۹)

اور اے رسول! پیش آمد مہم کیلئے صحابہ کیساتھ مشورہ فرمایا کریں۔ پھر جب آپ (مشورہ کے بعد قانون الٰہی کے مطابق صحیح راستے پر چلنے کا ارادہ فرمائیں) تو پھر قانون الٰہی پر بھروسہ کرکے عمل شروع کر دیں۔ صحیح مشورہ وہی ہوتا ہے جو قانون الٰہی کے مطابق ہو' اور وہی مشورہ مجلس شوریٰ میں پاس ہوتا اور واجب العمل ہوتا ہے۔ اگر قوانین الٰہی پر صحیح عمل کیا جائے تو یقیناً کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ کا قانون کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقررہ اور معینہ قوانین کے خلاف کبھی نہیں کرتا) ۲۹/۵۰ توکل کا لغوی معنی ہے بھروسہ اور اعتماد کرنا اور قابل بھروسہ و اعتماد صرف قوانین الٰہی ہیں جو نہ آج تک تبدیل ہوئے ہیں اور نہ قیامت تک تبدیل ہوں گے۔ الختصر اللہ پر توکل کا قرآنی مفہوم ہے اس کے سو فیصد باعتماد' غیر متبدل قوانین جاریہ پر اعتماد و بھروسہ کرنا۔

○ توکل علی اللہ کے ان معنوں میں یہ الجھن سامنے آتی ہے کہ لفظ اللہ کا معنی اللہ کا قانون کس طرح صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ الجھن قرآن کریم کے اسلوب تصریف آیات کے مطابق فوراً دور ہو جاتی ہے۔ لفظ اللہ بمعنی اللہ کا قانون ۱۶/۷۹ میں مذکور ہے: **اَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ** کیا لوگوں نے پرندوں پر غور نہیں کیا جو فضاء آسمانی میں مسخر کئے ہوئے (اڑتے پھرتے) ہیں انہیں فضا میں نہیں تھامتا مگر اللہ کا قانون۔ یہاں **مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ** کا یہ معنی لینا کہ پرندوں کو فضا میں اللہ تعالیٰ تھامے رکھتا ہے' اس وقت عملاً غلط ہو جاتا ہے

جب اڑتے پرندے کو شکاری نشانہ بناتا ہے اور وہ دھڑام سے نیچے آگرتا ہے۔ اس مشاہدے سے معاذ اللہ ! معاذ اللہ شکاری کی گولی اللہ تعالیٰ کے تھامنے سے زیادہ طاقتور ثابت ہوتی ہے جو حقیقت حال کی صد فیصد خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرندوں کو فضا میں اللہ کا قانون تھامے رکھتا ہے کہ جب تک پرندوں کے پر ہوا پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں وہ فضا میں اڑتے پھرتے ہیں' سوائے اس کے کہ ان کے پروں میں کوئی نقص پیدا ہو جائے یا شکاری نشانہ بنالے۔

○ **مَامِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا** کا یہ مفہوم غلط ہے کہ کوئی جاندار ایسا نہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ پیشانی سے پکڑے ہوئے ہے۔ یعنی جو کام بھی وہ کرتا ہے خود اللہ ہی کرا رہا ہوتا ہے اس طرح اگر ہر اچھا برا عمل خود اللہ تعالیٰ ہی کراتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات عمل غلط ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی برے عمل کرواتا ہے اور خود ہی سزا دیتا ہے۔ العیاذ باللہ ! بالفاظ دیگر خود غیر محرم مرد عورت کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر بد فعلی کراتا ہے اور خود ہی حکم دیتا ہے کہ دونوں کو سر بازار سو سو کوڑے لگاؤ۔ پس **اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا** کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہر جاندار اللہ تعالیٰ کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر جاندار معہ انسان طبعی قوانین میں جکڑا ہوا مجبور محض ہے۔ مگر صرف انسان اپنے کئے ہوئے نیک اعمال کی اس بہتر جزا کا اور برے اعمال کی اس بری سزا کا خود مستحق ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما رکھی ہے۔ کیونکہ انسان اچھے یا برے عمل خود کرتا ہے۔

○ **اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** کے الفاظ بھی مذکورہ بالا مفہوم کی تائید کرتے ہیں کہ رب تعالیٰ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے' کیا وہ کسی راہ پر چل کر کسی منزل کی طرف جا رہا ہے؟ چونکہ وہ ذات مقدس اس قسم کے تصورات تک سے بری ہے' اسلئے سیاق کلام کے مطابق کہ پیچھے ھودؑ نے ۱۱/۵۲ میں قوم سے ارشاد فرمایا **يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ** اے میری قوم اللہ سے حفاظت مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ جو لوگ گناہ کرنے کے بعد استغفار کریں اور اپنے رب کی طرف رجوع کرکے برائیوں سے باز آجائیں' اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کر دیتا ہے۔ وہ سیدھے راستے پر ہے کہ برے اعمال کی سزا دیتا ہے اور نیک اعمال کی جزا دیتا ہے' مگر جو گنہگار توبہ کرکے اپنی اصلاح کر لے تو اسے معاف کر دیتا ہے۔ وہ غلط راہ پر نہیں کہ نیکوں کو سزا دے اور بروں کو جزا۔ اور جو کوئی تائب ہو کر اصلاح بھی کرے تو اسے معاف نہ کرے۔

○ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ ھودؑ نے اپنی قوم سے فرمایا اگر تم روگردانی کرو تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں نے اللہ کا پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے۔ اگر تم باز نہ آئے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَـيْـــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝	(۵۷) پھر اگر تم روگردانی کرو تو بلاشبہ میں وہ پیغام جو تمہاری طرف دیکر بھیجا گیا ہوں' تمہیں پہنچا چکا ہوں۔ اللہ تمہاری قائم مقام کوئی اور قوم لے آئے گا (تمہیں ختم کر دے گا) تم اسے ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکو گے بیشک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔

○ قوم ھودؑ نے بھی قوم نوحؑ کی طرح نافرمانی اور سرکشی اختیار کی' جس کی بدولت ان پر بھی اللہ کا عذاب آگیا۔

(۵۸) اور جب ہمارا حکم آگیا (تو نافرمانوں کو ختم کر دیا گیا اور) ہم نے

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

ہودؑ کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت کیساتھ نجات دی اور انہیں ہم نے ایک گاڑھے عذاب سے بچا لیا۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

(۵۹) اور وہ قوم عاد کے لوگ تھے جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کی مخالفت کی اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش اللہ کے دشمن کے حکم کی پیروی کی۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

(۶۰) اور (ان کی نافرمانیوں کی بدولت) دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے گی اور قیامت کے دن بھی (لگیگی) سنو بیشک قوم عاد نے اپنے رب (کی ربوبیت عالمینی) کا انکار کیا۔ سنو ہودؑ کی قوم عاد پر پھٹکار ہے۔

نمبر۱۔ یہاں **كَفَرُوْا رَبَّهُمْ** کا معنی لکھا گیا ہے کہ قوم عاد نے اپنے رب کی ربوبیت کا انکار کیا' جس سے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا انکار مقصود نہیں۔ پیچھے آیت نمبر۔۵۰۔۵۲۔۸۴ کی پانچ دلیلیں دی گئی ہیں کہ قوم عاد اللہ کی ہستی کی منکر نہ تھی۔ وہ اللہ کی ربوبیت عالمینی کے منکر تھے۔ معاشرے کے بعض افراد کو محرومِ ربوبیت کرکے ذلیل اور اپنے زیرِ دست بنا رکھا تھا۔

(سورہ حم سجدہ)

طوفانِ باد کا عذابِ عظیم:۔ اوپر عذاب کا صرف ذکر ہے' جس کی سورہ حم سجدہ میں یوں وضاحت کی گئی ہے۔ **فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ** ○(۴۱/۱۵) **فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ** ○ (۴۱/۱۶)

(مفہوم) پھر جو قوم عاد تھی' انہوں نے اس زمین میں ناحق تکبر کیا' جس میں انہیں اقتدار حاصل تھا۔ اور وہ کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے اور کیا انہوں نے غور نہ کیا کہ جس اللہ نے انہیں پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوت والا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ہماری آیتوں کے متعلق جھگڑتے رہتے تھے۔ پس ہم نے تکلیف دہ ایام میں ان پر ایسی تندوتیز اور لگاتار چلنے والی ٹھنڈی ہوا بھیجی' جس سے انتہائی ہیبت ناک آوازیں نکلتی تھیں۔ تاکہ ہم انہیں دنیا میں رسوائی کا عذاب چکھائیں اور آخرت کا عذاب بہت زیادہ رسوا کرنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ ان کی دنیا میں کوئی مدد کی گئی تھی اور نہ آخرت میں کی جائیگی۔

○ نمبر۱ ریحا" صَرْصَرًا" کا معنی ہے لگاتار چلنے والی تندوتیز ہوا' جس میں ٹھنڈک ہو اور اس سے خوفناک آوازیں' چیخیں سی نکل رہی ہوں۔ مادہ ص۔ ر۔ ر = صرر کا بنیادی معنی ہے کسی کام میں ہمیشگی اور دوام پایا جانا۔ اسی مادہ سے مشتق ہے لفظ اصرار' یعنی کسی چیز کی طلب میں نہ ٹوٹنے والا تسلسل۔ نیز **صَرَّ يَصِرُّ وَ صَرِيْرًا** کا معنی سخت آواز نکالنا بھی ہے۔ پس قوم عاد پر بھیجا گیا عذاب ایسی شدید و مہیب آندھی کی صورت میں تھا جس سے ہیبت ناک آوازیں اور خوفناک چیخیں نکل رہی تھیں۔

سورہ قمر:۔ سورہ قمر میں مذکورہ آندھی کی شدت بالفاظ ذیل بیان کی گئی ہے:۔ **كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ○ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ○ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ○** ۱۸-۲۰/۵۴ قوم عاد نے (ہماری آیتوں کو) جھٹلایا۔ پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ بیشک ہم نے ان پر ایک تکلیف دہ مسلسل وقفے میں سخت آندھی بھیجی۔ وہ لوگوں کو اس طرح اٹھا اٹھا کر پھینکتی تھی گویا کہ وہ کھجور کے جڑ سے اکھڑے ہوئے پیڑ ہیں۔

سورہ ذاریت:۔ سورہ ذاریت میں ارشاد ہوا ہے:۔ **وَفِيْ عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ○ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ○** ۴۱-۴۲/۵۱ اور قوم عاد میں (بھی عبرت ہے) جب ہم نے ان پر بے خیر ہوا بھیجی۔ وہ جس چیز پر آتی تھی تو نہیں چھوڑتی تھی مگر اسے بوسیدہ ہڈیوں کی مانند کر دیتی تھی (یعنی اس آندھی میں ایسے خطرناک کیمیاوی اثرات موجود تھے' جن کے زیر اثر آکر ہر چیز بوسیدہ ہڈیوں کی مانند ہوگئی تھی)

نمبر۲ **رِيْحَ الْعَقِيْمَ** کا معنی ہے وہ ہوا جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو۔ بانجھ عورت کو اسلئے عقیم کہا جاتا ہے کہ اس سے کھیتی کا پھل' خیر اور بھلائی میسر نہیں آتی اس سے اولاد پیدا نہیں ہوتی۔

سورہ احقاف:۔ سورہ احقاف میں قوم عاد پر لائے گئے عذاب کے متعلق بتایا گیا ہے ابتدا میں وہ ایک ابر کی صورت میں آیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔ **فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ط رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ أَلِيْمٌ ○ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوْا لَا يُرٰى إِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ط كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○** (۲۴-۲۵/۴۶) پس جب ان (قوم عاد) نے دیکھا کہ وہ ایک ابر ہے جو ان کی وادیوں کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے تو انہوں نے کہا یہ تو ایک بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے۔

(ھودؑ نے فرمایا نہیں) بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کیلئے تم جلدی کرتے تھے۔ یہ ایک آندھی ہے جس میں درد ناک عذاب ہے۔ یہ آندھی اپنے رب کے امر (قانون) کے مطابق ہر چیز کو تباہ کر دیگی۔ پھر وہ ان کے ساتھ ایسے نابود ہوگئے کہ ان کے گھروں کے کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسی طرح ہم مجرم اقوام کو ان کے جرموں کی سزا دیتے ہیں (یعنی ماضی میں بھی دیتے تھے' حال میں بھی دیتے ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ قوم عاد نے جسے باران رحمت سمجھا وہ لگاتار چلنے والی تباہ کن آندھی تھی۔)

مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن آندھی چلتی رہی:۔ تصریف آیات کے قرآنی اسلوب بیان کے مطابق وضاحت ہوچکی ہے کہ قوم عاد پر مسلسل چلنے والی چیخوں بھری آندھی کا عذاب لایا گیا تھا۔ سورہ حاقہ میں اس امر کی خبردی گئی ہے کہ وہ خوفناک آندھی مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن چلتی رہی۔ **وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ○ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ أَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ○ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ○** (۶ تا ۸/۶۹)

(مفہوم) اور جو قوم عاد تھی' پس وہ لوگ اپنی بد اعمالیوں کی بدولت خوفناک آوازوں والی' جڑوں سے کاٹتی ہوئی مہلک آندھی

کیساتھ ہلاک کیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان پر لگاتار سات راتیں اور آٹھ دنوں کیلئے مسلط کر دیا۔ پھر اے مخاطب تو نے اس قوم کو (بنگاہ تصور) دیکھ لیا ہے کہ وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھوکھلے تنوں کی طرح گرے پڑے ہیں۔ پھر کیا تو نے دیکھا ہے کہ انکا کوئی ایک متنفس بھی باقی بچا ہے؟

قوم عاد کے جرائم:۔ یہ وہی قوم ہے جو کہتے تھے کہ ہم سے طاقتور کون ہے۔ وہ اپنی فتحوں کی یادگار کے طور پر بڑے بڑے مینار بنایا کرتے تھے۔ سورہ شعراء کی آیات نمبر۱۲۸ تا ۱۳۰ میں ہودؑ کے یہ الفاظ مذکورہ ہیں جو آپ نے اپنی قوم سے فرمایا:۔**اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِيۡعٍ اٰيَةً تَعۡبَثُوۡنَ ۝ وَتَتَّخِذُوۡنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ ۝ وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِيۡنَ ۝** (۱۲۸ تا ۲۶/۱۳۰) کیا تم ہر بلندی پر ایک یاد گار تعمیر کرتے ہو۔ یہ تم بالکل بیکار عمل کرتے ہو اور محل اور مینار بناتے ہو گویا کہ تم یہاں ہمیشہ رہو گے۔ اور جب تم کسی قوم پر پنجہ مارتے ہو (ناجائز تسلط جماتے ہو) جابرانہ انداز سے انتہائی سختی کرتے ہو۔

نمبر۱ **تَبۡنُوۡنَ** کا سہ حرفی مادہ ب۔ ن۔ ی = بنی ہے جس کا بنیادی معنیٰ ہے عمارتیں بنانا۔

نمبر۲ **رِيۡعٍ** کا معنیٰ ہے بلندی' اونچی زمین' قوم عاد اونچی جگہوں پر اپنی ظالمانہ فتحوں کی یادگاریں تعمیر کرتے تھے۔

نمبر۳۔**اٰيَةً** کا معنیٰ ہے نشانی۔ **اَتَبۡنُوۡنَ بِكُلِّ رِيۡعٍ اٰيَةً** کے الفاظ کے مطابق اونچی جگہ پر کی گئی تعمیر مینار وغیرہ کو نشانی کہا گیا ہے۔ جسے عرف عام میں یاد گار کہا جاتا ہے۔

نمبر۴ **تَعۡبَثُوۡنَ** کا مادہ ع۔ ب۔ ث عبث ہے' جس کا بنیادی معنیٰ ہے ہر وہ کام جس میں انسانی توانائی' دولت اور وقت بے فائدہ خرچ کیا جا رہا ہو۔ پرانی یادگاریں جو ماضی میں بنائی گئی تھیں۔ اور وہ بھی جو زمانہ حال میں بنائی جا رہی ہیں۔ ان پر خرچ کیا جانیوالا کروڑوں روپیہ' ھودؑ کے قرآنی الفاظ کے مطابق عبث یعنی بیکار اور فضول کے زمرہ میں شامل ہے۔ یہ یادگاریں رات کے اندھیرے میں' گناہوں کے اڈوں اور مجرموں کو پناہ دینے کا کام دیتی ہیں۔ اور دن کی روشنی میں ان لوگوں کی یاد دلاتی ہیں جو ختم ہو چکے' مٹ چکے ہیں' جن کا اقتدار مٹی میں مل چکا ہے۔ انہی پرانی یادگاروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:**قُلۡ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانْظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ۝** (۲۷/۶۹) (اے رسول !) کہہ دیجئے گا کہ زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ مجرم اقوام کا کیا انجام ہوا۔ جو عوام کے حقوق ربوبیت غصب کرکے یاد گاریں' قلعے اور محلات تعمیر کرتے رہے گویا کہ وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ آج وہاں الّو بول رہے ہیں !اسی تصور کو ہودؑ کے ان الفاظ میں اجاگر کیا گیا ہے **لَعَلَّكُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ** کہ تم عوام کے حقوق ربوبیت پر غاصبانہ قبضہ کرکے یادگاریں' محلات اور مینار بناتے چلے جا رہے ہو' جیسے کہ تم اس فانی زندگی میں ہمیشہ رہنے والے ہو۔

انبیاء سلام علیہم کی کوئی یادگار' محل' مینار یا قلعہ وغیرہ کرہ ارض پر ہرگز نہیں پائی جاتی' حالانکہ قرآنی شہادت کے مطابق ان میں سے موسیٰؑ نے ایک لمبی تحریک کے بعد فرعون پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ داؤدؑ' سلیمانؑ' مسیحؑ اور نبی اکرمؐ خاتم النبینؐ عظیم الشان حکومتوں کے مالک تھے۔ نبی اکرمؐ نے نہ جنگ بدر کی بے مثال فتح کی کوئی یاد گار تعمیر فرمائی نہ جنگ خندق کی' جس میں حجاز بھر کے مشرکین سب اکٹھے ہوکر حملہ آور ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ نے فتح مکہ جیسی دائمی اور آخری فتح کی بھی کوئی یادگار نہ بنائی۔ کیوں؟ اسلیئے کہ از روئے قرآن حکیم یہ سب کچھ عبث اور بیکار کے زمرہ میں داخل ہے۔ کیونکہ عوام

بیچارے ضروریات زندگی خوراک' لباس اور مکان سے محروم ہوتے ہیں۔ انہیں جھونپڑی تک میسر نہیں ہوتی اور ادھر اس عمارت پر لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہوتا ہے' جو کسی بے گھر کے سر چھپانے' کے لئے خرچ نہیں کیا جا رہا ہوتا۔

یادگار مسجدیں:۔ قرآن کریم کی رو سے یادگار کے طور پر صرف مسجد تعمیر کی جاسکتی ہے۔ جیسے کہ نبی اکرمؐ کی یادگار مسجد نبوی موجود ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اصحاب کہف کی عظیم کامیابی کی یاد میں مسجد بنائی گئی تھی: **قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا** " (۱۸/۲۱) جو لوگ اپنی عظیم مہم میں کامیاب ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم ان کی یاد میں ایک مسجد کو یادگار ٹھہرائیں گے۔

نمبر۵ مصانع کا سہ حرفی مادہ ص-ن-ع= صنع ہے جس کا معنی ہے صنعکاری۔ مصانع **مَصْنَعَةٌ** کی جمع ہے' جس کا معنی ہے محل' قلعہ' مضبوط عمارت وغیرہ۔ ان چیزوں کی تعمیر ان حکمرانوں کی سنت ہے جو قرآن کریم کے اولین سبق **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (۱/۱) کو بھلا کر حکومت کو اپنی جاگیر قرار دیتے اور عوام کے بنیادی انسانی حقوق خوراک' لباس' علاج اور مکان' پر غاصبانہ قبضہ جما لیتے تھے۔ جو حکمران اپنے فرض منصبی پر نگاہ رکھتے' انہیں داؤدؑ سلیمانؑ اور خاتم النبین کی طرح عوام کی ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ محلات' قلعے اور دیوانخانے کس طرح بنا سکتے تھے؟

نمبر۶ قوم عاد کے متعلق اخیر پر بتایا گیا ہے۔ **اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ**(۲۶/۱۳۰) **بَطَش** کا مصدری معنی ہے پنجہ مارنا۔ چونکہ اس کے بعد جبارین آیا ہے اسلئے اس سے مراد ہے جارحانہ حملہ کرنا۔ پرائے حقوق پر جابرانہ قبضہ جمانا۔ اس سے ثابت ہوا کہ قوم عاد جابر اور جارح قوم تھی۔ سورہ شعراء کی اگلی آیات مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ ھودؑ نے انہیں کہا: **فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۚ ○ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ○ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ○ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ** ○ ۱۳۱ تا ۲۶/۱۳۵ پس اے قوم اللہ تعالٰی کے قوانین کی مخالفت سے بچ جاؤ اور میری اطاعت کرو (یعنی جس طرح میں اس کے قوانین تنزیلی اور تکوینی کی مخالفت سے بچتا ہوں' تم بھی میری اطاعت میں) اس ذات کے قوانین کی مخالفت سے بچو' جس نے ان چیزوں کیساتھ تمہاری مدد فرمائی ہے جنہیں تم جانتے ہو' اس نے تمہاری مدد کی ہے (قوانین جاریہ کے مطابق) چارپایوں' بیٹوں' باغوں اور چشموں کیساتھ۔ (میں تمہاری طرف سے ان **نعمائے الٰہی** کے غلط استعمال کی بدولت) تمہارے لئے بڑے دن کے عذاب سے خوفزدہ ہوں۔ (اگر تم ان نعمتوں میں پورے عوام کو عملاً" حصہ دار ٹھہرا لو تو عذاب سے بچ سکتے ہو)

لیکن قوم عاد اللہ تعالٰی کے قوانین جاریہ کے مطابق میسر آمدہ نعمتوں اور اپنے متکبرانہ اعمال پر اسقدر نازاں تھی کہ اس نے جواب دیا: **قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ** ○ (۲۶/۱۳۶) انہوں نے کہا ہمارے لئے برابر ہے کہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نہ کرے **اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ** ○ **وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ** ○ (۲۶/۱۳۷-۱۳۸) نہیں ہے مگر یہ ہمارے پہلے لوگوں کی روش ہے (جو بڑوں کے تواتر سے ملی ہے۔ اس لئے ہم اسے چھوڑنیوالے نہیں اور ہم ناجی ہیں) ہم عذاب کئے جانیوالے نہیں ہیں۔

خُلُق کا معنی ہے عادت' خصلت' روش۔ قوم عاد نے اپنے اعمال کو احکام الٰہی کے عین مطابق ثابت کرنے کیلئے یہ دلیل دی کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ **خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ** ہے جو ہمارے باپ دادا' پر دادا سے مسلسل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ آبائی

تواتر ہے جو غلط نہیں ہوسکتا۔ یہ عین احکام الہیٰ اور سابقہ نبی کی سنت کے مطابق ہے۔ لیکن یاد رہے کہ دین الہیٰ میں تواتر کی کوئی قیمت نہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول و منظور ہے اپنا نازل کردہ ضابطہ' چنانچہ ھودؑ نے ان کے آبائی تواتر کو ضابطۂ الہیٰ کے خلاف ہونے کی بدولت رد کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آبائی تواتر کو صداقت کی دلیل قرار دینے والی قوم کو طوفانِ باد کے عذاب کیساتھ بالکل ختم کر دیا۔

قوم عاد کی فہرستِ جرائم:۔ قومِ عاد کے تذکرہ میں مذکورہ آیاتِ کریمہ کے مطابق اس کے جرائم کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ قومِ عاد کے لوگ اس عقیدے کے حامل تھے کہ اللہ کے رسول بشر نہیں ہوتے۔ اور اسی بنا پر انہوں نے ھودؑ کی نبوت کا انکار کیا۔ ھودؑ نے فرمایا۔ **اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ** (۷/۶۹)

۲۔ وہ اکیلے اللہ کی عبودیت' فرمانبرداری نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کو اللہ کیساتھ شریک کر رکھا تھا۔ انہوں نے خود کہا **قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا** (۷/۷۰)

۳۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کے ایسے نام رکھ لئے تھے جن کی سند اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں کی گئی' جیسے اوتار' ابدال' اقطاب وغیرہ ناموں کی الہیٰ سند موجود نہیں آپؑ نے فرمایا' **اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ** (۷/۷۱)

۴۔ اس قوم نے اللہ تعالیٰ پر افتریٰ باندھ رکھا تھا۔ یعنی جو اعمال وہ بجا لاتے تھے' احکام الہیٰ' آیات الٰہیہ کے مفہوم کو ان کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ ھودؑ نے فرمایا' **اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝** (۱۱/۵۰)

۵۔ قومِ عاد جابر اور جارح تھی۔ ھودؑ نے فرمایا' **وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ** (۲۶/۱۳۰)

۶۔ اونچی جگہوں پر وہ اپنی جارحانہ اور ظالمانہ فتحوں کی یادگاریں تعمیر کرتے تھے (یعنی عوام کے حقوقِ ربوبیت کو بھلا دیا اور انہیں محتاج بنا کر اپنے زیردست کر رکھا تھا۔ ھودؑ نے فرمایا' **اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ**

۷۔ بڑے بڑے محل' قلعے اور مینار بناتے تھے گویا کہ انہوں نے ہمیشہ یہاں رہنا ہے' آپؑ نے فرمایا **وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝** (۲۶/۱۲۹)

۸۔ وہ بڑے مالوں' باغوں' اولادوں اور چشموں والے تھے۔ لیکن ان نعمتوں کو باپ دادا کی جاگیر قرار دیکر ان پر عوام سے الگ قابض ہوکر عذابِ الہیٰ کے مستحق ہوئے۔ ھودؑ نے فرمایا' **اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝** (۱۳۳ تا ۲۶/۱۳۵)

۹۔ وہ اپنی جارحیت' عوام پر اپنی فضیلت اور عوام کو غریب و محتاج رکھ کر ان پر اپنی بالا دستی قائم رکھنے اور انکا دائمی استحصال کرتے رہنے کے جواز کیلئے اپنے آباؤ اجداد کے ان اعمال کو جو تواتر سے ہوتے چلے آرہے تھے بطور سند پیش کرتے اور کہتے تھے' **اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝** (۲۶/۱۳۷)

۱۰۔ وہ اپنے مذکورہ بالا اعمال کو جو صد فیصد ربوبیت عالمینی کے خلاف تھے عین احکامِ الہیٰ اور سابقہ نبی کی سنت قرار دیکر باعثِ نجات جانتے تھے۔ اس لئے وہ کہتے تھے چونکہ یہ اعمال تواتر سے ہوتے چلے آرہے ہیں اسلئے ہماری نجات ہو جائیگی

ہمیں عذاب نہیں ہوگا۔ **وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ**○ (۲۶/۱۳۸)

مضمون بالا میں قرآن کریم کی رو سے ثابت کیا گیا ہے کہ بد اعمال قومِ عاد کو شدید و مہیب آندھی کے عذاب کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ مگر ھودؑ اور آپ کے ساتھیوں کو اس عذاب سے بچا لیا گیا۔ اس پر لازمی اور اہم سوال یہ ہے کہ انہیں کس طرح بچایا گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے انہیں عجائباتی طور پر بچایا تھا یا اپنے غیر متبدل قوانین جاریہ کے مطابق بچایا تھا؟ قابل غور ہے۔

ھودؑ اور آپ کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے قانونِ جاریہ کے مطابق ہی نجات دی تھی:۔ اس سوال کے ضمن میں غور طلب امر یہ ہے کہ جب قوم نوحؑ کیلئے اللہ تعالیٰ نے طوفان آب کا عذاب تجویز فرمایا تو نوحؑ کو حکم دیا۔ **اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا** (۲۳/۲۷) کہ ہماری نگرانی میں ہماری جبلی تعلیم کے مطابق ایک مضبوط کشتی تیار کریں۔ کیوں؟ کشتی بنانے کا حکم کیوں دیا؟ اس کا جواب آیات صحیفہ فطرت کی زبان میں بالکل سیدھا اور صاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعینہ قوانین میں طوفان آب سے بچاؤ کیلئے ہمیشہ ہمیشہ کشتی ہی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نافرمان قوم نوحؑ کو اپنے قانونِ جاریہ کے مطابق غرق کر دیا۔ اور نوحؑ اور آپ کے ساتھیوں کو اپنے قانونِ جاریہ کے مطابق کشتی ہی کے ذریعہ پانی کے طوفانِ عظیم سے بچایا۔

اس کے بعد باری آئی قومِ عاد کی، جس کیلئے طوفانِ باد یعنی شدید آندھی کا عذاب تجویز کیا گیا، جس میں خوفناک آوازیں بھی تھیں۔ پھر آندھی کی شدت کا یہ عالم کہ وہ کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہر آدمی کو جڑوں سے اکھڑے ہوئے کھجور کے درختوں کی طرح پچھاڑ کر رکھ دے۔ تو ایسی حالت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عظیم و شدید طوفانِ باد سے ھودؑ اور آپ کے ساتھیوں کو بچانے کی کیا تجویز فرمائی گئی؟

اس کا جواب بھی بالکل سیدھا اور صاف ہے کہ جس طرح طوفانِ آب سے بچاؤ کے خود اپنے مقررہ قانون جاریہ کے مطابق نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا گیا تھا، اسی طرح ھودؑ کو ہوا کے طوفان سے بچاؤ کیلئے بھی اپنے اس قانون پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا جو اس کے لئے باری تعالیٰ نے خود مقرر فرما رکھا ہے اور جو اس کی کتابِ کائنات، صحیفہِ فطرت میں ہمیشہ آزمودہ اور اٹل ہے، وہ ہے ایسی زمین دوز پناہ گاہیں بنانا جو نہ صرف طوفانِ باد کی زد سے محفوظ ہوں بلکہ وہاں اس کی ہیبت ناک آواز کی شدت بھی خطرناک نہ رہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان پناہ گاہوں کی تیاری یا ان کے حکم کا ذکر قرآن بھر میں نہیں ہے۔ اس کا جواب اہل عقل و بصیرت کیلئے نوحؑ کو کشتی کے تیار کرنے کے حکم میں موجود ہے کہ قیامت تک کیلئے جس جس قسم کے خطرات پیدا ہوتے چلے جائیں اسی اسی قسم کے بچاؤ کے سامان تیار کرتے چلے جاؤ۔ بندوق کی گولی اور توپ کے گولے کیلئے زمین دوز مورچے بنائے جائیں گے۔ بمباری سے بچاؤ کیلئے زمین دوز پناہ گاہوں کی تیاری لازم ہے۔ نبی اکرمؐ کو دشمن کے مقابلے کیلئے جدید سے جدید اسلحہ بنانے کا حکم اسلئے دیا گیا ۸/۶۰ تاکہ مسلمان ہر آنیوالے خطرہ کے مادی بچاؤ تیار کرنے سے غافل ہوکر پسماندگی کا شکار نہ ہو جائیں۔

اگلی آٹھ آیات مجیدہ میں قوم ثمود اور صالحؑ کا ذکر لایا گیا ہے۔ اس قوم نے بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عالمینی کا انکار کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولؑ اور اس کے پیغام کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے۔ دیکھئے ارشاد باری:۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾

(۶۱) اور (ہم نے قوم) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ (کو بھیجا) اس نے کہا کہ اے میری قوم (خالص) اللہ تعالیٰ کی عبودیت کرو۔ تمہارے لئے اس کے سوا کوئی عبودیت (بندگی) کے لائق نہیں۔ وہ وہی ہے جس نے تمہیں (یعنی تمہارے ابتدائی باپ دادوں کو) زمین میں سے پیدا کیا اور اسی پر آباد کر دیا۔ پس تم اس سے حفاظت طلب کرو۔ اور اس کی طرف رجوع کرو بے شک میرا رب قریب ہے (اور دعائیں) قبول کرنے والا ہے۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ کے وہی الفاظ ہیں جو ہودؑ نے اپنی قوم سے کہے تھے کہ اے میری قوم اکیلے اور خالص اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو' تمہارے لیئے اس کے سوا کوئی فرمانبرداری کے لائق نہیں۔

اصلاحِ عقائد و اصلاحِ معاشرہ:۔ فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ کے الفاظ بھی وہی ہیں جو ہودؑ نے اپنی قوم سے کہے کہ اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو اور اس کی طرف رجوع ہو جاؤ' یعنی آئندہ گناہوں سے توبہ کرکے اپنی اصلاح کر لو۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے کے سارے انبیاء سلام علیہم کا ایک ہی مشن تھا' اصلاحِ عقائد اور اصلاحِ معاشرہ۔ اصلاحِ عقائد یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس کی ذات' اس کی صفات اور اس کے حکم میں شریک نہ کیا جائے اور اصلاحِ معاشرہ یہ کہ ہر فردِ انسانی کو ایک جیسا واجب التکریم بھی مانا جائے اور معاشی لحاظ سے سب کے حقوق کو بھی مساوی تسلیم کیا جائے۔ معاشی عدم مساوات ہی سے معاشرہ میں جرائم جنم لیتے ہیں اور اسی کے قیام سے جرائم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ صالحؑ کی قوم ثمود نے آپؑ کو یہ عجیب و غریب جواب دیا کہ اے صالحؑ! ہم تو تم پر امیدیں لگائے ہوئے تھے کہ تم ہمارے سابقہ مذہب اور ہماری سابقہ معاشی روش میں ہمارے معاون بنو گے۔ مگر تم تو ہمیں ہمارے سابقہ مذہب اور معاشی طریقوں سے منع کرتے ہو' دیکھئے ارشاد باری:

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

(۶۲) انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان امید کیا جاتا تھا کہ (ہمارے مذہب و معاش میں ہماری معاونت کرے گا) کیا تو (ہی) ہمیں منع کرتا ہے کہ ہم ان کی عبودیت چھوڑ دیں جن کی بندگی ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اور بیشک تو ہمیں جس چیز کی طرف بلاتا ہے ہمیں اس میں شک ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً

(۶۳) (صالحؑ نے) فرمایا' اے میری قوم کیا تم نے دیکھا ہے' بے شک میں اپنے رب کی طرف سے دلائل قاطعہ پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت (نبوت) عطا فرمائی ہے۔

فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝ ۶۳

پھر اگر میں اس کی نافرمانی کروں (یعنی اس کا پیغام تمہیں نہ پہنچاؤں) تو کون ہے جو اللہ کے مقابلے پر میری مدد کرے۔ اس طرح تم مجھے گھاٹے کے سوا کسی چیز میں زیادہ نہیں کرو گے۔

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ میں اِنْ شرطیہ نہیں بلکہ اِنَّ کا مخفف' بمعنی بے شک ہے۔ کیونکہ اِنْ شرطیہ میں شک پایا جاتا ہے مگر صالحؑ کو اپنی نبوت پر اور اپنے دلائل قاطعہ پر ہونے میں ہرگز کوئی شک نہیں تھا۔ اس لیے آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ "اگر میں دلائل قاطعہ پر ہوں" بلکہ آپ نے یہ یقین کامل ارشاد فرمایا کہ' بے شک میں دلائل قاطعہ پر ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی ہے۔

اہلِ قواعد کے لیے لمحۂ فکریہ:۔ عربی قواعد میں اِنْ کو اس وقت اِنَّ کا مخفف مانا جاتا ہے جب اس کا صلہ لام آئے۔ جیسے **اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ** ۝ ۳/۱۶۴ میں اِنْ پر لَفِيْ کی لام کا صلہ آیا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ قرآن کریم اہل قواعد کی غلطیاں بھی نکالتا ہے۔ جس طرح آیت زیر بحث ۱۱/۶۳ میں اِنْ بلا درود صلہ لام' اِنَّ بمعنی بے شک کا مخفف ہے۔ اسی طرح آیت ذیل ۲۴/۳۳ میں بھی اِنْ بلا درود صلہ لام اِنَّ کا مخفف ہے۔ **وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا** ۝ یہاں بھی اِنْ بلا درود صلہ لام آیا ہے اگر اِنْ کو شرطیہ مانا جائے تو اس کا یہ معنی بنتا ہے: دنیا کا مال حاصل کرنے کے لیے اپنی زیر دست ملازمہ عورتوں کو اگر وہ بچنا چاہیں تو انہیں بدکاری پر مجبور نہ کرو۔ اور اگر وہ نہ بچنا چاہیں تو پھر کیا ان سے معاذ اللہ استغفراللہ! بدکاری کرانے کی اجازت دے دی گئی ہے؟ واضح رہے کہ یہاں بھی اِنْ بلا درود صلہ لام' اِنَّ کا مخفف ہے اور یہاں عورتوں کی جبلت کا اظہار کر دیا گیا ہے۔ **اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا** وہ تو بلاشبہ بدکاری سے بچنے کا ہی ارادہ رکھتی ہیں۔ تم انہیں دنیا کے مال کے لیے اس پر مجبور نہ کرنا۔

مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ کے الفاظ سے بھی عیاں ہے کہ صالحؑ کو اپنی نبوت پر یقین کامل تھا جو فرمایا کہ اگر میں اس کا وہ پیغام جو تمہیں برا لگا ہے' تمہیں نہ پہنچاؤں تو کون ہے جو مجھے اس نافرمانی کی سزا سے بچا لے۔ اگلی آیات ذیل میں قوم ثمود کا تذکرہ اختصاراً" بیان ہوا ہے صالحؑ نے قوم سے فرمایا۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝ ۶۴

(۶۴) اے میری قوم یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی ہے پس اسے چھوڑ دو کہ وہ اللہ کی زمین سے کھائے (اور چشموں سے پانی پیئے ۲۶/۱۵۵) اور اسے تم برائی کے ساتھ مس نہ کرنا۔ ورنہ تمہیں قریب کا (یعنی فوری) عذاب پکڑ لے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝ ۶۵

(۶۵) پھر انہوں نے اس کے پاؤں کاٹ دیئے۔ آپ نے (بارشاد الٰہی) کہا کہ اپنے گھروں میں تین دن کے لیے فائدہ اٹھا لو۔ یہ وعدۂ عذاب جھٹلایا جانے والا نہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ

(۶۶) پھر جب ہمارا عذاب آیا تو ہم نے صالح کو اور ان کو جو اس کے

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾

ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت کے ساتھ نجات دی۔ اور اس دن کی ذلت سے بچا لیا۔ بے شک تیرا رب' وہی قوت والا غالب ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾

(۶۷) اور پکڑ لیا ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا ایک ہولناک آواز نے اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

نَاقَةُ اللّٰهِ :۔ ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ صالحؑ نے قوم کے سامنے ایک اونٹنی کو اللہ کی اونٹنی کے نام سے بطور نشانی پیش فرمایا۔ اور نشانی یہ بتائی کہ اسے عام اجازت ہوگی کہ وہ اللہ کی زمین (اس کی چراگاہوں سے) گھاس کھائے گی (اور اللہ کے چشموں سے پانی پیئے گی) اسے نہ کوئی روکے اور نہ کوئی تکلیف پہنچائے۔ اور ساتھ ہی کہہ دیا گیا کہ ورنہ فوری عذاب آجائے گا۔ مگر ہوا یہ کہ قوم ثمود نے مذکورہ اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ حضور باری کی طرف سے تین دن کی مہلت دی گئی' پھر ان پر ایسی ہیبت ناک آواز کا عذاب نازل کیا گیا' جس سے وہ پوری قوم گھروں میں اوندھے گر کر مرگئی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اونٹنی کیا تھی۔ اسے اللہ کی اونٹنی کیوں کہا گیا؟ اور اسے کیوں آزاد چھوڑا گیا کہ وہ چراگاہوں سے آزادانہ گھاس کھائے اور چشموں سے پانی پیے۔ مگر اسے روکا نہ جائے۔ سورہ شعراء میں قوم ثمود کے مذکورہ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ قوم ثمود کے سرداروں نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چراگاہوں اور اس کے پیدا کردہ چشموں پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا تھا۔ غریب عوام کو نہ چراگاہوں میں مویشی چرانے کا حق حاصل تھا نہ چشموں سے پانی پلانے کا۔

صالحؑ نے ان کے سامنے اس ظلم سے باز رہنے کے لیے دلائل قاطعہ پیش کرکے اللہ کی چراگاہوں اور اس کے چشموں میں غریب عوام کا مساوی حق ثابت کیا۔ اور انہیں متنبہ کیا کہ اگر تم اس روش سے باز نہ آئے تو تم پر الٰہی عذاب نازل ہوگا۔ اس طرح ان کے درمیان ایک اونٹنی بطور نشانی مقرر کی گئی کہ یہ غریب عوام کے مویشیوں کی نمائندگی کریگی' چنانچہ اس کے لیے ایک آزمائشی وقفہ مقرر کیا گیا۔

هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ○ ۲۶/۱۵۵ یہ تمہارے لیے اللہ کی نشانی اونٹنی ہے۔ وقفہ معلومہ میں سے بھی (یعنی غریب عوام کے جن مویشیوں کی یہ نمائندہ ہے انہیں بھی) پانی پینے کا مساویانہ حق حاصل ہے اور تمہارے مویشیوں کو بھی مساویانہ حق ہے۔ پس اس طرح جو اونٹنی قیامِ ربوبیت میں عوام کے مویشوں کی نمائندہ مقرر کی گئی تھی۔ اسے اللہ کی اونٹنی کہا گیا اور اس کا آزادانہ چراگاہوں میں چرنا' اور چشموں سے سیراب ہونا اس امر کی نشانی مانا گیا کہ چراگاہوں اور چشموں میں غریب عوام کے مویشیوں کا مساویانہ حق ہے' سورہ قمر میں بتایا گیا ہے کہ صالحؑ کو حکم ہوا:

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ○۲۸/ ۵۴ اور ان (جابر سرداروں) کو خبردار کر دیجئے گا۔ کہ بلاشبہ اللہ کے پانی کی' اللہ کی مخلوق میں مساویانہ تقسیم ہے۔ ہر پینے والے کو پینے کے لیے حاضری کا حق حاصل ہے۔ اس آیت مجیدہ نے اوپر بیان کی گئی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ' صالحؑ اور آپ کی قوم کے درمیان طے پایا کہ چشموں اور چراگاہوں میں غریب عوام کے مویشیوں کا مساویانہ حق ہے ۲۸/ ۵۴ اور معلومہ مقررہ وقفے میں صالحؑ کی اونٹنی کو اس قیامِ ربوبیت کی نشانی ٹھہرایا گیا ہے ۲۶/۱۵۵۔ مگر ہوا یہ کہ قوم نے اس معاہدے کو توڑ دیا۔ اس عہد کو توڑنے کی

حسب ذیل تفصیل سورۂ نمل میں بیان ہوئی ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ○ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ○ ۴۸-۴۹/۲۷ اور شہر میں نو فسادی سردار تھے جو اس میں فساد پھیلاتے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم اس صالحؑ پر' اس کے اہل (صحابہؓ) پر شبخون مار کر انہیں ہلاک کر دیں گے' پھر اس کے وارث کو کہہ دیں گے کہ ہم اس کے قتل کے وقت موجود نہیں تھے۔ اور بلاشبہ ہم سچے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس تجویز کو ناکام کر دیا ہے۔ مگر اپنے وعدے کے مطابق عذاب اس وقت لایا گیا جب ان قوم میں سے ایک بدبخت نے عہد مساوات کو توڑ کر اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ اس کی تفصیل بالفاظ ذیل بیان فرما دی گئی ہے:۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ○ إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا ○ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ○ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ○ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا ○ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا (۱۱ تا۱۵/۹۱ قوم ثمود نے اپنی سرکشی کے ساتھ صالحؑ کو جھٹلایا۔ وہ وقت قابل ذکر ہے جب ان میں کا ایک انتہائی خبیث (سردار اونٹنی کو قتل کرنے کے لیے) اٹھا۔ حالانکہ ان کے رسولؑ (صالحؑ) نے کہا تھا کہ اونٹنی (غریبوں کے مویشیوں کی نمائندہ) بھی اللہ کی ہے اور اس کے (ذریعہ عوامی مویشیوں کے لیے پینے کا پانی بھی اللہ ہی کا ہے۔ (اسے ضرر نہ پہنچانا) مگر انہوں نے اسے جھٹلایا پس اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ پھر ان کی (اس عہد شکنی اور غصب ربوبیت کے) جرم کے عوض اللہ تعالیٰ نے ان پر ہلاکت نازل فرمائی پھر انہیں برابر کر دیا (ختم کر دیا) اور اس نے اس قوم کے اس عبرتناک انجام کی (ذرہ بھر) پروا نہ کی سورہ قمر میں بتایا گیا ہے:

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ○ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ○ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ○ ۲۹ تا ۳۱ /۵۴ پھر انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو بلایا۔ پھر اس نے (اونٹنی کی طرف) ہاتھ بڑھایا اور اس کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور ڈرانا۔ بے شک ہم نے ان پر ایک ہی ہیبت ناک چیخ بھیجی جو ان پر یکبارگی آئی پھر وہ روندی ہوئی باڑ کے چورے کی مانند ہو گئے۔ پوری قوم گھروں میں اوندھی پڑی رہ گئی۔ (جن چٹانوں کا اندرونی لاوا چوٹی پر سوراخ کر کے انتہائی شدت کے ساتھ نکلتا ہے' اسی سے ایسی زور کی چیخ برآمد ہوتی ہے کہ انسان اس کی تاب نہ لا کر فوراً" ہلاک ہو جاتے ہیں)

صالحؑ اور آپؑ کے صحابہؓ کو کس طرح بچایا گیا: یہاں پہنچ کر جو یہ سوال پیدا ہوتا ہے اس کا جواب از روئے قرآن یہ ہے کہ جب قوم نوحؑ کے لیے پانی کے طوفان عظیم کا فیصلہ کیا گیا تو آپؑ کو حکم دیا گیا کہ آپ کشتی تیار کر لیں۔ یہ حکم کیوں دیا؟ اس لیے کہ باری تعالیٰ کے قانون میں سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے کشتی مقرر ہے۔ اسی طرح قوم عاد پر آندھی کے عذاب عظیم کا فیصلہ فرمایا تو جناب ہودؑ اور آپ کے ساتھیوں کے بچانے کے لیے لازمی طور پر ایسی زمین دوز پناہ گاہوں کی ضرورت تھی' جو طوفان باد سے محفوظ رکھ سکیں۔ اسی طرح جب قوم ثمود کے لیے ایک ہیبت ناک چیخ کے عذاب کا فیصلہ ہوا تو صالحؑ اور آپ کے ساتھیوں کے بچاؤ کے لیے ایسے ایئر ٹائٹ مقامات کی ضرورت تھی جہاں ہلاکت خیز چیخ کی آواز نہ پہنچ سکے۔ اسی کے ضمن میں چونکہ نبی اکرمؐ کے دشمنوں پر جنگ کا عذاب مسلط فرمایا گیا تھا' اس لیے ان کے مقابلے کے لیے نبی

اکرمؐ کو زیا... سے زیادہ فوجی قوت تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ اب اگر کوئی صاحب یہ اعتراض کرے کہ قرآن کریم میں نہ ہودؑ کو طوفانِ باد سے بچنے کے لیے پناہ گاہیں تیار کرنے کا حکم موجود ہے اور نہ ہیبت ناک چیخ سے بچنے کے لیے صالحؑ کو ایئر ٹائٹ مقامات کا حکم درج ہے۔ واضح رہے کہ ایسے تمام حکم نوحؑ کے نام طوفانِ آب سے بچنے کے لیے کشتی بنانے کے حکم ہی میں موجود ہیں کہ قیامت تک کے لیے جس قسم کے خطرے کا خوف ہو اسی قسم کے سامان تیار کرتے چلے جانا چیے کہ سامنے سے بندوق اور توپ کے فائر سے مورچے' اور اوپر کی بمباری سے بچاؤ کے لیے خندقیں درکار ہیں۔

قومِ ثمودؑ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر نہیں تھی: صالحؑ نے قوم کے سامنے مذکورہ اونٹنی کو **نَاقَةُ اللّٰهِ** ○ یعنی اللہ کی اونٹنی کے نام سے ایک نشانی کے طور پر پیش کیا۔ اگر قومِ ثمود اللہ کی ہستی کی منکر ہوتی تو صاف جواب دیتی کہ ہم تو تیرے' اللہ ہی کو نہیں مانتے' ہمارے لیے تیرے اللہ کے نام کی اونٹنی کی کیا قدر و قیمت ہے۔

دوسرے نمبر پر ۱۴۳-۲۶/۱۴۴ میں آیا ہے کہ صالحؑ نے قوم سے کہا: **اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ** ○ بے شک میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا امانت دار رسول ہوں۔ پس تم اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچو' اور میرا کہا مانو۔ اگر وہ قوم اللہ تعالیٰ کی منکر ہوتی تو اس کے جواب میں فوراً" یہ کہہ دیتی کہ ہم تو تیرے اللہ کو مانتے ہی نہیں' تو اپنے آپ کو اس کا رسول ظاہر کرتا ہے اور ہمیں اللہ کے قانون کی مخالفت سے بچنے کا وعظ کرتا ہے۔

تیسرے نمبر پر قوم نے صالحؑ کی نبوت کا یہ کہہ کر انکار کیا: **مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا** ۲۶/۱۵۴ (قوم نے کہا کہ اے صالحؑ! تو کس طرح نبی رسولؑ ہو سکتا ہے) تو تو ہمارے جیسا ایک بشر ہے۔ یعنی وہ لوگ اللہ کو بھی مانتے تھے اور اس چیز کے بھی قائل تھے کہ اللہ اپنے نبیؑ رسول بھیجتا ہے' مگر ان کا آبائی عقیدہ یہ تھا کہ نبی رسولؑ بشر نہیں ہوتے۔

چہارم صالحؑ نے قوم سے کہا: **يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ** ۱۱/۶۱ اے میری قوم اکیلے اللہ کی فرمانبرداری کرو۔ اس کے سوا تمہارے لیے کوئی اور فرمانبرداری کے لائق نہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کو ماننے نہ ہوتے تو انہیں اکیلے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا وعظ بے محل تھا۔

ساتھ ہی آپؑ نے فرمایا **فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ** ۱۱/۶۱ پس تم اس اللہ سے بخشش طلب کرو اور اس کی طرف رجوع کرو۔ یعنی اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لو۔ اس پر اگر قوم اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر ہوتی تو اس کا جواب یہ ہوتا کہ ہم تو اللہ کو مانتے ہی نہیں اور تو ہمیں کہتا ہے کہ اس سے بخشش مانگو اور اس کے حضور توبہ کر لو۔ صرف ان پانچ دلائل پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ اور بھی بہت سے دلائل موجود ہیں کہ قومِ ثمود اللہ کی ہستی کی منکر نہیں تھی۔ بلکہ اس نے اپنے بزرگوں (پیروں وغیرہ) کو اللہ کی صفات میں شریک کر رکھا تھا۔ واضح رہے کہ یہی حال جملہ انبیاء کی مقابل قوموں کا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر نہیں تھی۔

قومِ ثمود کے عقائد:۔ ا۔ قوم ثمود' انبیاء سلام علیہم کو بشر نہیں مانتی تھی' یعنی ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ کے نبی رسول بشر نہیں ہوتے۔ وہ مافوق البشر (نوری فرشتے) ہوتے ہیں' حالانکہ قرآن مجید میں انسان کو مسجود ملائکہ بنا کر اعلان کر دیا گیا ہے کہ نوع بشر ملائکہ سے افضل ہے' ملائکہ اس سے افضل نہیں۔

۲۔ قوم ثمود اکیلے اللہ کی عبودیت نہیں کرتی تھی اس نے اپنے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات مخصوصہ میں شریک کر

رکھا تھا۔ جیسے کہ ۶۲/۱۱ میں ان کا قول درج ہے: **اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا** (اے صالحؑ!) کیا تو ہمیں منع کرتا ہے کہ ہم اپنے ان بزرگوں کی عبودیت نہ کریں، جن کی بندگی ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے۔

۳۔ اسی آیت مجیدہ ۶۲/۱۱ سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم ثمود آبائی متوارث تواتر کو، یعنی اس روش کو صداقت کی دلیل تسلیم کرتے تھے، جس پر انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا تھا۔ اسی لیے انہوں نے تعجب کے ساتھ کہا کہ تو ہمیں اس راہ سے روکتا ہے، جس پر ہمارے باپ دادا یکے بعد دیگرے چلے آرہے ہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے زندہ رسول کے مقابلے پر مردوں کے تواتر کو صحیح اور قابل سند مانتے تھے۔

قوم ثمود کے جرائم:۔ قرآن کریم نے قوم ثمود کے جرائم کو اس طرح اجاگر کیا ہے:۔

قوم ثمود کے سردار اپنے لیے بڑائی چاہتے تھے، یعنی انتہائی متکبر تھے، جیسے کہ سورہ اعراف میں بتایا گیا ہے۔ **قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ** ۷۵/۷ قوم ثمود کے سردار جنہوں نے تکبر کیا (اپنی بڑائی چاہی) انہوں نے قوم کے ان لوگوں کو کہا جنہیں انہوں نے معاشی طور پر کمزور کرکے زیر دست بنا دیا تھا، کیا تم جانتے ہو کہ بے شک صالحؑ اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہے؟ اس آیت مجیدہ کے الفاظ **اَلْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا** سے کھل کر عیاں ہوتا ہے کہ قوم ثمود میں سرداری نظام قائم تھا۔ قوم کے سردار اپنے لیے بڑائی چاہتے تھے۔ اور اپنی نام نہاد سرداری پر فخرو تکبر کیا کرتے تھے۔

۲۔ اسی آیت مجیدہ کے الفاظ **اَلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا** ○ سے بالصراحت ثابت ہوتا ہے کہ قوم کے متکبر سرداروں نے عوام کے طبقات قائم کر رکھے تھے۔ ایک طبقے کو معاشی طور پر کمزور کرکے اپنے زیر دست بنا دیا تھا۔ جس کی غرض اس کے سوا نہیں، کہ ان سے بیگاریں لی جائیں یعنی ان کا استحصال کیا جائے۔ بالفاظ دیگر وہ لوگ عوام کے حقوق ربوبیت کے غاصب تھے۔

۳۔ قوم ثمود زمین پر اور پہاڑوں پر چٹانیں تراش تراش کر محلات بنایا کرتے تھے۔ اور یہ مسلمہ امر ہے کہ مشقت کے کام سرداری نظام میں بیگار کے طور پر، یا کم سے کم اجرت پر ان لوگوں سے لئے جاتے ہیں، جنہیں سرداروں نے معاشی طور پر خود کمزور کر رکھا ہوتا ہے۔ ان کی اس روش کی خبر صالحؑ نے انہیں بالفاظ ذیل دی تھی۔ **وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ** ○ ۷۴/۷ (صالحؑ نے اپنی قوم کے سرداروں سے کہا) اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے تمہیں قوم عاد کا جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں ٹھکانا دیا۔ تم زمین کی نرم مٹی سے محل تیار کرتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر عالیشان گھر بناتے ہو۔ پس تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور (اس کے قانونِ مساواتِ انسانی کی مخالفت کرکے) زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

۴۔ **لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ** ○ کے الفاظ سے ثابت ہوا کہ قوم ثمود فسادی تھی اور اس خبر کے عین متصل ماقبل بتایا گیا ہے کہ تم زمین میں بڑے بڑے محلات تیار کرتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔ واضح رہے کہ اولین فساد فی الارض یہ ہے کہ ایک طرف نفیس محلات تعمیر ہو رہے ہوں اور دوسری طرف سر چھپانے کے لیے

جھونپڑی بھی میسر نہ ہو۔ اور وہ عظیم و نفیس محلات انہی افراد سے بیگار کے طور پر یا معمولی اجرت پر بنوائے جا رہے ہوں' جنہیں جھونپڑی تک رہنے کو میسر نہیں۔ اور ضروریاتِ زندگی میں سے نہ حسب ضروریات لباس میسر ہے نہ خوراک' بیمار ہو جائیں تو بروقت اور مناسب علاج سے محروم ہوں اور بالآخر بلا علاج ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہوں۔ العیاذ باللہ !

۵۔ قوم ثمود نے صالحؑ اور آپؑ کے صحابہؓ کو منحوس قرار دیا۔ یہ اس لیے کہ صالحؑ کو بعثت مبارکہ کے بعد جب قوم ثمود کے کمزور کئے گئے افراد کو ان کے مساویانہ معاشی حقوق کا احساس دیا گیا تو معاشرہ میں عارضی بدامنی رونما ہوگئی۔ یعنی غریب عوام سابقہ روش کے خلاف بالادست افراد کے لیے بیگاریں کرتے اور ان کے لیے ذریعہ استحصال بننے میں تامل کرنے لگے۔ اس طرح جب صاحب ثروت سرداروں کے استحصالی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو انہوں نے صالحؑ کو کہا: **قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ** ۴۷/۲۷ انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ ہم نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو منحوس پایا ہے۔ (کہ تم نے ہمارے اچھے بھلے چلتے ہوئے استحصالی کاموں میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں) آپؑ نے فرمایا کہ تم پر نحوست تمہاری اپنی بداعمالیوں کی بدولت اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق مسلط ہوئی ہے۔ بلکہ اب تم اپنے استحصالی کاموں کی رو سے ظاہر کر دیئے گئے ہو۔ تُفْتَنُوْنَ مادہ فتن سے ہے جس کا معنی ظاہر کرنا بھی ہے' اسی مادہ سے فتانہ کسوٹی کو کہتے ہیں جو سونے کی کھوٹ کو ظاہر کر دیتی ہے۔

استحصالی نظام کی خاصیت یہ ہے کہ بالادست متکبر لوگ ان لوگوں پر جنہیں انہوں نے خود کمزور کر دیا ہوتا ہے' احسان جتلاتے ہیں کہ ہم تمہاری بھلائی چاہتے ہیں' لیکن صالحؑ کی بعثت سے ثمودی سرداروں کے فریب کا پردہ چاک ہوگیا۔ اور غریب عوام کو پتہ چل گیا کہ وہ تو ان کے بنیادی پیدائشی حقوق ربوبیت کے ڈاکو ہیں۔

۶۔ قوم ثمود کے تو متکبر سرداروں نے صالحؑ اور آپ کے ساتھیوں (صحابہؓ) کو شبخون مار کر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اس لیے کہ وہ چشموں اور چراگاہوں کی معاشی مساوات کے منکر تھے اور چاہتے تھے کہ چشمے اور چراگاہیں بدستور ان کے غاصبانہ تسلط میں رہیں' غریب عوام کے مویشی صرف ان کے رحم و کرم کے محتاج ہوں اور غریب عوام بدستور ان کے استحصال کا ذریعہ بنے رہیں۔ دیکھئے آیت ۴۸/۲۷۔

۷۔ سورہ اعراف ۷۷/۷' سورہ ہود ۶۵/۱۱' سورہ شعراء ۱۵۷/۲۶' سورہ قمر ۲۹/۵۴ اور سورہ الشمس ۱۴-۱۳/۹۱ بتکرار کثیر قوم ثمود کا یہ جرم مذکور ہے کہ جس اونٹنی کو چشموں اور چراگاہوں کو عالمی مساوات کی نشانی قرار دیا گیا تھا اس کے پاؤں کاٹ کر عہد مساوات کو توڑ دیا۔ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ ایک ہیبت ناک چیخ کے عذاب سے ان کی حالت یہ ہوگئی:-

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۗ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۠ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۗ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

(۶۸) گویا کہ وہ اپنے گھروں میں کبھی تھے ہی نہیں۔ خبردار قوم ثمود نے اپنے رب (کی ربوبیت عامہ) کا انکار کیا خبردار قوم ثمود پر پھٹکار ہے۔

اوپر کی آیات کریمہ میں جناب صالحؑ اور قوم ثمود کے تذکرہ کے بعد اگلی آیات مقدسہ میں السید ابراہیمؑ اور لوط سلام علیہم کا ذکر جمیل لایا گیا ہے اور قوم لوط کی نافرمانی اور ان کی تباہی کا مخصوص بیان درج ہے:۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾

(۶۹) اور بے شک ہمارے رسول ابراہیمؑ کے پاس (ان کے بیٹے اسماعیلؑ) کی خوشخبری لے کر آئے۔ انہوں نے کہا آپ پر سلام ہو۔ (ابراہیمؑ نے) کہا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر وہ نہ ٹھہرے (یعنی دیر نہ کی) کہ (ان کے لیے جلدی ہی) تلا ہوا بچھڑا لے آئے۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾

(۷۰) پھر جب آپ نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے تو آپ نے انہیں غیر سمجھا اور اپنے جی میں خوف کھایا (کہ جو کھانا نہیں کھاتے ان کا ارادہ اچھا نہیں) انہوں نے کہا ڈرو مت۔ بیشک (آپ کی طرف تو بشارت کے لیے اور تباہی کے لیے تو) ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

السید ابراہیمؑ کے پاس خوشخبری کے لیے جو لوگ بھیجے گئے تھے' ان کے لیے قرآن کریم میں **رُسُلُنَا** کے الفاظ آئے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول تھے۔ اور یا ۵۱/۱۵ + ۵۱/۲۴ میں ان کا تعارف **ضَیفِ** ابراہیم یعنی ابراہیم سلام علیہ کے مہمانوں کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ جناب خلیل جلیل کے مذکورہ مہمانوں کے متعلق مشہور یہ ہے کہ وہ فرشتے تھے۔ مگر واضح رہے کہ ان کا ذکر قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے' ہر جگہ پر یا تو انہیں اللہ کے رسول کہا گیا ہے اور یا ابراہیمؑ کے مہمان' کسی ایک مقام پر بھی ان کے لئے **ملائکہ** کا لفظ ہرگز نہیں آیا۔ اس لیے وہ اللہ کے رسول اور ابراہیمؑ کے مہمان تھے۔ رہا یہ سوال کہ انہوں نے کھانا کیوں نہ کھایا۔ اس کی کئی وجہ ہوسکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ کھاکر آئے ہوں یا جس مہم پر وہ بھیجے گئے تھے۔ یعنی قوم لوط کو تباہ کرنے کے لیے اس کی بدولت وقت کی کمی ہو۔ ان کے پاس کھانا کھانے کا وقت ہی نہ ہو۔ اور یا چونکہ انہیں فی الحقیقت قوم لوط کی طرف بھیجا گیا تھا' ابراہیمؑ کو صرف اللہ کی طرف سے خوشخبری دینا تھا اس لیے ان کا پروگرام ہی لوطؑ کے ہاں جاکے کھانا کھانے کا ہو نیز مہمان کے کھانا نہ کھانے سے مراد بہت تھوڑا کھانا بھی ہوسکتا ہے ایسے وقت پر میزبان عموماً" کہتا ہے کھانا کیوں نہیں کھایا۔ ۵۱/۲۷ میں آیا ہے کہ ابراہیمؑ سلام علیہ نے مہمانوں سے کہا کھاتے کیوں نہیں؟ **اَلَا تَاْكُلُوْنَ**○ ۵۱/۲۷

ابراہیمؑ کی شان مہمان نوازی ملاحظہ ہوکہ آپ نے دیر نہ کی اور مہمانوں کی مہمان نوازی کیلئے فوراً" روغن' گھی میں تلا ہوا۔ بچھڑا پیش کر دیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں مہمان نوازی کے لیے عموماً" سالم بچھڑا تیار رہتا تھا۔ ورنہ مہمانوں کی آمد پر بچھڑا ذبح کرنا' اس کی کھال اتارنا' اور گوشت بنا کر پھر گھی میں تل کر مہمانوں کے سامنے لانا **فَمَا لَبِثَ** یعنی دیر نہ کی کے زمرہ میں نہیں آتا۔ نیز مہمانوں کے سامنے سالم بچھڑا پیش کرنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مہمانوں کی تعداد دو نہیں تھی بلکہ کم از کم دس بارہ کی تعداد تھی۔ سالم بچھڑا پیش کرنے سے یہی کچھ ثابت ہوتا ہے۔ بعض قوموں کے ہاں ایک مہمان کے آگے صرف سالم مرغ یا سالم دنبہ بھنا ہوا پیش کرنے کا رواج ہے لیکن بچھڑا ایک دو کے آگے نہیں۔ **اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً** کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ جب مہمانوں نے کھانا نہ کھایا' یا کم کھایا تو آپ کے جی میں آیا کہ

جو لوگ کھانا نہیں کھاتے' وہ دوست نہیں ہوسکتے مخالف ہوسکتے ہیں۔ لیکن مہمانوں نے وضاحت کر دی کہ آپ ڈریں مت۔ ہم سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ البتہ ہم سے خطرہ قوم لوط کو ضرور ہے جس کی تباہی کے لیے ہم بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ جب انہوں نے آپ کو اسماعیل سلام علیہ کی بشارت دی تو آپ کی بڑھیا بیوی ہنس پڑی چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾

(۷۱) اور اس کی (ابراہیمؑ کی) بیوی پاس کھڑی تھی۔ وہ (بیٹے کی خوشخبری پر) ہنس پڑی[۱]۔ اس پر ہم نے اسے (ایک اور بیٹے) اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی[۲-۳]۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ ھٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

(۷۲) اس نے کہا تعجب ہے[۴] مجھ پر کیا میں جنتی جاؤں گی حالانکہ میں بڑھیا ہوں[۵] اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے[۶] بے شک یہ (میرا جننا تو) ایک تعجب خیز چیز ہے[۷]

نمبر۱۔ **فَضَحِكَتْ** مادہ ض۔ ح۔ ک= ضحک سے ہے۔ اس کا مصدری معنی ہے تعجب انگیز ہنسی ہنسا۔ ابراہیمؑ کی بیوی بیٹے کی خوشخبری پر تعجب کے ساتھ ہنس پڑی۔ یہ اسماعیلؑ کی خوشخبری تھی۔

نمبر۲-۳۔ جب اس نے اس پر تعجب کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بیٹے کے بعد دوسرے بیٹے اسحاق کی خوشخبری بھی دی اور ساتھ ہی' ان کے بیٹے یعنی مائی صاحبہ کو ان کے پوتے یعقوب سلام علیہ کی بشارت بھی دے دی۔ کہ تمہاری زندگی ہی میں تمہیں پوتا بھی عطا کر دیا جائے گا۔ ان آیتوں سے کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیلؑ بڑے تھے اور اسحاق چھوٹے تھے۔ اور دونوں بیٹے آپ کو بڑھاپے ہی میں دیئے گئے تھے جیسے کہ ۳۹/۱۴ میں ابراہیمؑ کا قول درج ہے۔ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ** سب اچھی تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے ہی میں اسماعیل (اور اس کے بعد) اسحاق عطا فرمایا ۳۹/۱۴ یہاں دونوں بیٹوں کا بڑھاپے میں عطا کیا جانا بھی ثابت ہے اور پہلے اسماعیل اور پھر اسحاق کا پیدا ہونا بھی عیاں کر دیا گیا ہے۔

نمبر۴۔ **قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى** میں وَیل کا لفظ بہت گہرے تعجب کے لئے لایا گیا ہے **وَيْلَ** کا معنی برائی اور تباہی ہے مگر جب اس کے ساتھ یا حرف ندا آئے جیسے یہاں آیا ہے **يٰوَيْلَتٰٓى** تو گہرے تعجب پر بولا جاتا ہے۔ مائی صاحبہ ایک بیٹا جننے کی خوشخبری پر ہنس پڑیں۔ مگر جب ساتھ ہی دوسرے کی خوشخبری دے دی تو گہرے تعجب کے ساتھ فرمایا **ءَاَلِدُ** کیا میں جنتی جاؤں گی۔ حالانکہ میں بھی بڑھیا (بہت بوڑھی) ہوں اور یہ میرا خاوند بھی بہت ہی بوڑھا ہے۔

۵-۶۔ عجوز اور شیخ دونوں لفظ عورت اور مرد کے بہت بوڑھا ہونے پر تو بولے جاتے ہیں' لیکن ان الفاظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان میں نسائیت اور مردمیت نہیں تھی۔ ایسے افراد کی کمزوری کا دفعیہ غذا اور دوا کے ساتھ ممکن ہے' جو عمل میں آیا اور اسمٰعیل و اسحاق سلام علیہما دونوں بھائی یکے بعد دیگرے اپنے والدین کے بڑھاپے ہی میں پیدا ہوئے۔

نمبر۷۔ **اِنَّ ھٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ** کے الفاظ میں بڑھیا عورت نے بوڑھے شوہر سے یکے بعد دیگر دو بچوں کا جننا انتہائی تعجب خیز قرار دیا ہے۔ اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ بوڑھے مرد اور بڑھیا عورتیں قابل علاج ہوتی ہیں۔ جیسے کہ زکریاؑ اور آپ کی بیوی بھی بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ لیکن زکریا سلام علیہ میں اولاد پیدا کرنے کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں تھی۔ آپ کی زوجہؑ محترمہ میں کمی تھی جس کا علاج کرکے اصلاح کر دے گئی۔ ارشاد باری ہے۔ **وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ** ۲۱/۹۰ اور

ہم نے زکریا کے لیے اس کی بیوی کی اصلاح کر دی۔

اسلام میں لونڈی کی کوئی گنجائش نہیں ○ آیت بالا ۱۱/۷۲ سے ثابت ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کی ایک ہی بیوی تھی اور اسماعیلؑ و اسحاقؑ دونوں اسی کے بطن مبارک سے پیدا ہوئے تھے۔ اسماعیلؑ کا لونڈی کے بطن سے پیدا ہونے کا تصور یہود و نصاریٰ کا پیدا کردہ ہے، جس کی غرض محمد رسول اللہ کی توہین کے لیے آپ کو لونڈی کی اولاد سے ثابت کرنا ہے۔ محرف بائبل کا دیا ہوا تصور یہ ہے کہ ابراہیمؑ کی ایک بیوی سارہؓ اور ایک لونڈی تھی حاجرہؓ۔ اسحاقؑ آپ کی بیوی سے پیدا ہوئے تھے اور اسماعیلؑ آپ کی لونڈی سے پیدا ہوئے۔ یہ تصور دو وجوں سے غلط ہے:

نمبر۱۔ پہلی یہ کہ اسلام میں لونڈی غلام کا تصور ہی موجود نہیں۔ ارشاد باری ہے **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ** ۱۷/۷۰ اور بے شک ہم نے پوری نوع آدم کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اللہ کے نبی اللہ کے احکام کی تائید و تکمیل کے لیے آتے تھے، اس کی مخالفت اور اسے ناکام کرنے کیلئے نہیں آتے تھے کہ خود انہی کے گھروں میں لونڈی اور بیوی کی خلاف اسلام تمیز موجود ہو۔

نمبر۲۔ دوسری یہ آیت بالا ۱۱/۷۲ میں ایک ہی عورت کو دونوں بیٹوں اسماعیل و اسحاق کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی ہے۔ پھر اسماعیلؑ کی پیدائش کا محرف بائبل کا بیان کردہ قصہ از روئے قرآن کریم یکسر غلط ہے کہ ابراہیمؑ کی ایک لونڈی بھی تھی۔ جب آسماعیل آپؑ کی لونڈی کے ہاں پیدا ہوئے تو آپؑ کی بیوی ناخوش ہوگئی۔ ابراہیمؑ کو کہا کہ ان ماں بیٹوں کو ایسے مقام پر چھوڑ آؤ جہاں پانی تک موجود نہ ہو۔ چنانچہ محرف بائبل کہتی ہے کہ آپ زچہ اور بچہ کو لے کر چل پڑے۔ یہ نہ بتایا کہ کہاں لے جا رہے ہیں۔ شام سے چل کر مکہ معظمہ کے ریگستان آئے اور ریت کے ایک ٹیلے کے پاس انہیں چھوڑ کر چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام اسوہ حسنہ ابراہیم سلام علیہ کے خلاف ہے کہ زچہ اور بچہ کو بے آب و گیاہ ریگستان میں چھوڑ کر چلے جائیں۔

المختصر! ۱۱/۷۲ میں بتایا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کی ایک ہی بیوی تھی آپ کے ہاں خلافِ اسلام کوئی لونڈی موجود نہیں تھی۔ جب اللہ کے رسولوں نے ابراہیمؑ کے بیٹے (اسماعیل) کی خوشخبری دی تو آپ کی بیوی جو پاس ہی کھڑی تھی ہنس پڑی کہ بوڑھے میاں بیوی کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ دوسرے بیٹے اسحاق کی مزید خوشخبری بھی دیدی اور ساتھ ہی ان کے بیٹے یعنی مائی صاحبہ کے پوتے یعقوب کی خوشخبری کا اعلان بھی کر دیا۔ اس طرح مائی صاحبہ نے انتہائی تعجب سے کہا **ءَ اَلِدُ ...... اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ** ایک بڑھیا کا ایک بوڑھے خاوند سے ایک نہیں بلکہ یکے بعد دیگر دو بیٹے جن دینا بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے براہ راست مائی صاحبہ کو مخاطب کرکے اللہ کی رحمت و برکت کی خبر دی:

قَالُوٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ؀	(۷۳) اللہ کے رسولوں نے کہا کیا تو اللہ کے امر (قانون) پر تعجب کرتی ہے۔ اے (ابراہیمؑ کے) گھر والو! تم پر اللہ کی رحمت اور برکت ہے بے شک وہ بڑھ کر تعریفوں والا اور بڑھ کر شان والا ہے۔

اس طرح جب اللہ کے رسولوں نے ابراہیمؑ کے اہل بیت یعنی آپ کی بیوی کو مزید ایک بیٹے اور ایک پوتے کی خوشخبری دی تو اس طرح جب ابراہیمؑ پر سے مہمانوں کی اجنبیت کا اثر دور ہوگیا تو اپنے مہمانوں کے ساتھ قوم لوط کے بارے میں جھگڑنا شروع کیا، کیونکہ آپ انتہائی نرم طبیعت والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾

(۷۴) پھر جب ابراہیمؑ سے مہمانوں کی اجنبیت دُور ہوگئی اور آپ کو (دو بیٹوں اور ایک پوتے کی) خوشخبری پہنچ گئی تو آپ (ہمارے رسولوں کے ذریعے) قومِ لوط کے متعلق ہم سے جھگڑنے لگے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾

(۷۵) بیشک ابراہیمؑ بہت بُردبار (نرم طبیعت والا)[1] اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔

نمبرا۔ قوم لوط کے متعلق جب آپ نے جھگڑا کیا کہ وہ اللہ کے نبی لوطؑ کی امت ہے تو اللہ کے رسولوں نے کہا کہ آپ اس سے اعراض فرمائیں:

يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

(۷۶) (اللہ کے رسولوں نے کہا) اے ابراہیم اس سے اعراض فرمائیں۔ بے شک شان یہ ہے کہ آپ کے رب کا حکم آچکا ہے۔ اور بے شک وہ لوگ وہ ہیں کہ ان پر نہ رد ہونے والا عذاب آچکا ہے۔

قوموں پر عذاب[2] خود ان کے اعمالِ بد کی بدولت آتا ہے اور عذاب لمبی مہلت اور مکمل طور پر اتمام حجت کے بعد آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قومِ لوط کو ان کی بد اعمالیوں سے باز کرنے اور انہیں بُرے اعمال کی سزا سے ڈرانے کے لیے اپنے نبی رسول لوط سلام علیہ کو بھیجا۔ لیکن برسہا برس کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا' بلکہ اس بدبخت قوم نے لوطؑ کو اپنی بستی میں اس قدر بے اثر کر دیا کہ آپ پر یہاں تک پابندی لگا دی کہ آپ کے پاس کوئی نہ آیا کرے ۱۵/۷۰ اور انہوں نے کھلے بندوں اغلام بازی کی بدفعلی اجتماعی طور پر شروع کر دی تو پھر ان کے لیے عذاب کا فیصلہ صادر ہوا۔ اور جب اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے تو پھر عذاب آجانے پر بھی اگر اجتماعی قوم تائب نہ ہو تو عذاب واپس نہیں لوٹتا۔ صرف قوم یونس ایک ایسی قوم تھی جس نے عذاب آنے پر اجتماعی طور پر توبہ کرکے اپنی اصلاح کر لی تو آیا ہوا عذاب ان کی توبہ اور اصلاح کی بدولت ٹل گیا۔

کتبِ تفاسیر میں آیا ہے کہ قومِ لوط پر عذاب دو فرشتوں کی معرفت بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے قوم لوط کی بستی کو اٹھا کر الٹ دیا۔ اور قوم تباہ ہوگئی۔ مگر قرآن کریم سے ایسا کوئی تصور پیدا نہیں ہوتا۔ قومِ لوط پر عذاب کس طرح آیا؟ اس کا جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ قریب کے پہاڑ میں اس قدر شدید زلزلہ آیا کہ قومِ لوط پر اس کے ذریعہ پتھراؤ کیا گیا۔ مگر قومِ لوط کے عذاب کی تفصیل سورہ ذاریات میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے:

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝ ۳۱ تا ۵۱/۳۴ ابراہیمؑ نے کہا اے اللہ کے بھیجے ہوؤ! تمہاری مہم کیا ہے انہوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان کی طرف مٹی کے (پکائے ہوئے) پتھر بھیجیں۔ جو تیرے رب کے نزدیک حدیں پھاندنے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں۔ سورۃ حجر میں ان مٹی کے پتھروں کے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں۔ **فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ○ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ○** ۷۳۔۱۵/۷۴ پھر انہیں ایک تیز آواز نے سورج نکلنے کے وقت پکڑ لیا۔ پھر ہم نے اس بستی کے سرکشوں کو ذلیل کر دیا اور ہم نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ان پر (مٹی کے پکے ہوئے) کنکروں کی بارش برسائی (اور اس مجرم قوم کو ختم کر دیا) **سجیل** کہتے ہیں آگ میں پکے ہوئے مٹی کے کنکروں کو۔ جنہیں یہاں **حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ** کہا ہے اور سورہ ذاریات میں انہی کو **حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ** فرمایا ہے۔ یہ مٹی کے پکے ہوئے کنکروں کے نشان زدہ پتھر کیا تھے اور وہ اللہ کے رسولوں کے ذریعہ کس طرح مجرم قوم

پر برسائے گئے تھے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ العزیز لوط سلام علیہ کے ذکر جلیل میں پیش کی جائے گی۔ ابھی تو ابراہیمؑ کا ذکر جمیل چل رہا ہے۔ جس سے متعلقہ بعض چیزوں کی تفصیل بیان کرنا ضروری ہے۔

ہجرت ابراہیمؑ ○ جب قوم اور آپ کے اَبْ (یعنی باپ یا چچا آزر) نے آپ کو اپنے وطن سے نکال دیا۔ جیسے کہ سورہ مریم میں آیا ہے کہ آزر نے کہا **اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ج لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا** ○ ۱۹/۴۶ کہا اے ابراہیمؑ! کیا تو میرے معبودوں کا انکار کرتا ہے۔ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھر مار مار کر مار ڈالوں گا۔ یا تو ایک مدت کے لیے مجھ سے ہجرت کر جا۔ سورہ صفت میں آیا ہے کہ آپنے فرمایا: **اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ** ○ ۳۷/۹۹ بے شک میں اپنے رب کے طرف جانیوالا ہوں (تجھ سے ہجرت کر رہا ہوں) وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا۔ ہجرت کے بعد آپ نے، جب آپ بوڑھے ہوگئے اور بیٹا کوئی نہیں تھا تو، حضور الٰہی میں عاجزانہ دعا فرمائی:۔ **رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰى فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ** ۱۰۰ تا ۳۷/۱۰۲ ابراہیمؑ نے دعا فرمائی کہ مجھے صالح بیٹا عطا فرما۔ تو ہم نے اسے ایک بردبار بیٹے کی خوشخبری دی۔ پھر جب وہ اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ تو انہوں نے کہا کہ اے میرے پیارے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔

اسمٰعیلؑ بڑے تھے ○ ان آیات مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے اسمٰعیلؑ تھے۔ اسحاقؑ نہیں تھے کیونکہ دعا کے جواب میں جس پہلے بیٹے کی بشارت دی گئی، اس کے متعلق آیا ہے کہ وہ جب بالغ جوان ہوگیا تو اسی کے متعلق ذبح کرنے کا حکم آیا۔ اور یہ آپ کے بیٹے اسماعیلؑ تھے اسحاقؑ نہیں تھے۔ چنانچہ اپنے خواب کی تعبیر کی عملی صورت میں آپ نے اسماعیلؑ کو شام کے سبزہ زار سے اٹھا کر مکہ کے ریگزار میں لا آباد کیا ۳۷/۱۴۔ بعض تفسیریں اسماعیلؑ کو اسحاقؑ سے چھوٹا ثابت کرنے کی یہ دلیل لائی ہیں کہ ابراہیم نے انہیں کہا **یٰبُنَیَّ** اے میرے چھوٹے بیٹے! واضح رہے کہ **یٰبُنَیَّ** کا لفظ اسم تصغیر ہے جو محض پیار کے لیے بولا جاتا ہے اسماعیلؑ کے بڑے ہونے کی دلیل قاطعہ تو آیات بالا ۱۰۰ تا ۳۷/۱۰۳ میں موجود ہے کہ جب ابراہیمؑ نے بیٹے کی دعا کی تو ارشاد ہوا کہ ہم نے انہیں ایک حلیم بیٹے کی بشارت دی۔ پھر جب وہ آپ کا ہاتھ بٹانے لگا تو آپ کو خواب آیا، جسے آپ نے اسے بتایا کہ میں نے خواب میں تجھے ذبح کرتے دیکھا ہے۔ بیٹے نے جواباً عرض کیا۔ **یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ** ○ اے ابا جان آپ کیجئے گا جو اس خواب کی تعبیر کی صورت میں آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ آپ مجھ پر خواہ کتنی مشکل مہم ڈالیں گے تو آپ مجھے مستقل مزاج پائیں گے۔ (میں اسے پوری محنت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچادوں گا۔)

بیت اللہ شریف کی مرکزیت کا قیام ○ اور یہ مہم کیا تھی؟ وہ تھا بیت اللہ شریف کو عملی صورت میں عالمی امن مرکز بنانا۔ جیسے کہ بیت الحرام کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

نمبر۱ **وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا** ۲/۱۲۵ اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب ہم نے بیت الحرام کو پوری نوع انسانی کے لیے فائدوں کی جگہ اور امن کا مرکز ٹھہرایا۔

نمبر۲۔ **جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ** ۵/۹۷ اللہ تعالیٰ نے کعبہ مکرمہ اپنے حرمت والے گھر کو پوری نوع انسانی کو اس کے قدموں پر کھڑا کرنے کے لیے (عالمی امن مرکز) ٹھہرایا۔

نمبر۳۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ○ ۳/۹۶ ...... وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ۳/۹۷ بے شک اولین گھر جو نوعِ انسانی (کی بھلائی) کے لیے مقرر کیا گیا وہ مکہ معظمہ میں ہے۔ بابرکت ہے اور تمام جہانوں کے لیے مقام ہدایت ہے (یعنی تمام ملکوں کے نام یہاں سے ہدایت نامے جاری ہونے چاہئیں)
..... اور جو کوئی فرد، ملک یا قوم اس کے نظام میں داخل ہو گیا وہ امن میں آگیا۔

نمبر۴۔ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا ۲۹/۶۷ کیا لوگوں نے غور کیا کہ ہم نے حرم شریف کو امن دینے والا قرار دیا ہے (امن کا ضامن، عالمی امن مرکز قرار دیا ہے) ان آیاتِ کریمہ سے کھل کر ثابت ہو چکا کہ بیت الحرام از روئے قرآن کریم عالمی امن مرکز ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنی خواب کی تعبیر کے مطابق بیت اللہ شریف کے پاس اسی غرض کے لیے آباد کیا ۱۴/۳۶ اور جب باپ بیٹے نے اس عالمی مرکز کے قواعد و ضوابط کو رفع کیا، چاروں طرف حج کا اعلان کر دیا تو حضور الٰہی میں عرض کی:۔

وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ○ ۲/۱۲۷ اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے بیت الحرام کے قواعد و ضوابط کو رفع کیا (ہر چہار طرف حج کا اعلان کر دیا ۲۲/۲۷) تو عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے اس عمل کو قبول فرما۔ بے شک تو بڑھ کر سننے والا ہے کہ ہم نے تیری رضا کے مطابق صحیح اعلان کیا ہے۔ اور تو بڑھ کر جاننے والا ہے (کہ اس میں ہم نے کوئی ذاتی مفاد ملحوظ نہیں رکھا۔ بلکہ پوری نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے اسے بے لوث عالمی امن مرکز قرار دیا ہے)

پس حج عالمی امن مرکز کی سالانہ امن کانفرنس ہے۔ جس میں ہر ممبر ملک اپنی سالانہ کاروائی پیش کرنے کا مکلف ہے اور بیت الحرام کا عالمی امن مرکز ہر ممبر ملک کے مسائل حل کرنے کا ذمہ دار بھی ہے اور حج کے عالمی امن اجتماع ہر ممبر ملک کو آئندہ سال کے لیے ہدایات دینے کا مجاز بھی۔ عام مسلمانوں میں سے جو لوگ سفر کی طاقت اور مالی استطاعت رکھتے ہوں ان پر اس سالانہ اجتماع کی رونق کو دوبالا کرنے کے لیے حج کرنا یعنی اس سالانہ عالمی امن کانفرنس میں حاضر ہونا فرض ہے۔ اور ساتھ ہی ہر حاجی پر فرض ہے کہ وہ بیت الحرام کے عالمی امن مرکز کو مضبوط اور مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ ہدی اور قلائد کے تحائف ساتھ لے جائے۔ ہدی میں ہر قسم کے تحائف شامل ہیں، خواہ وہ از قسم نقدی، سونا، چاندی اور بین الاقوامی سکے ہوں، یا از قسم جنس گندم چینی چاول وغیرہ ہوں۔ اور قلائد میں ہر قسم کے حلال جانور گائے، بیل، اونٹ، بھیڑ، بکری، دنبے شامل ہیں۔ ہر قسم کی ہدی اور قلائد بیت الحرام کے بیت المال میں جمع کرائے جائیں گے، حلال جانور صرف مہمانوں کی ضرورت کے مطابق ذبح ہوں گے اور وہ کھائے جائیں گے۔ ذبح کر کے ریت میں دبا کر ضائع ہرگز نہیں کیے جائیں گے۔ کیونکہ ذات باری کا حکم عام ہے۔ کُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا ۷/۳۱ کھاؤ پیو، مگر ضائع نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم عام سے بھی ثابت ہے کہ کھانے کا حکم ہے ضائع کرنے کی اجازت نہیں۔

اس کے علاوہ حج کے موقعہ پر ذبح کئے جانوروں کے متعلق دو مرتبہ کے تکرار تاکیدی کے ساتھ انہیں کھانے ہی کا حکم دیا گیا ہے:۔

وَیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَہُمۡ مِّنۡۢ بَہِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ ج فَکُلُوۡا مِنۡہَا وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ ○ ۲۲/۲۸ اور چاہئے کہ وہ حج کے معلومہ (دس ۲/۱۹۶) دنوں میں جگالی کرنے والے چوپایوں پر اللہ کے نام کا ذکر کریں (انہیں اللہ کے نام کیساتھ ذبح کیا کریں) پھر ان میں سے خود بھی کھائیں اور بھوکے محتاج کو بھی

کھلائیں۔ حج کے موقعہ پر ذبح ہونے والے اونٹوں کے متعلق بھی اسی کھانے اور کھلانے کے حکم کا تاکیدی تکرار بالفاظ ذیل لایا گیا ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ط ۲۲/۳۶ اور اونٹ کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانی قرار دیا ہے۔ تمہارے لیے اس میں بہت سے فائدے ہیں۔ پھر (حج کے ایام معلومہ میں) ان پر اللہ کے نام کا ذکر کیا کرو۔ (یعنی انہیں اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کیا کرو) پھر ذبح کے بعد جب ان کی کروٹیں ٹھنڈی ہو جائیں تو ان میں سے خود بھی کھاؤ اور قناعت شعاروں اور سوالیوں کو بھی کھلاؤ۔ ان ہر دو آیات کریمہ میں حج کے موقعہ پر ذبح کئے گئے جانوروں کے متعلق کھل کر بتکرار تاکیدی حکم دیا گیا ہے **فَكُلُوْا مِنْهَا** ان مذبوحہ جانوروں میں سے کھاؤ اور کھلاؤ۔ پس حج کے موقعہ پر ذبح کئے گئے جانوروں کو ریت میں دبا دینا حکم الٰہی نہیں۔

نیز سورہ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ** ۵/۲۔ ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرنا اور نہ حرمت والے (چار مہینوں) کی بے حرمتی کرنا اور نہ تحائف کعبہ کی بے حرمتی کرنا اور نہ ایام حج میں ذبح کئے جانیوالے جانوروں کی بے حرمتی کرنا۔ حرمت والے چار مہینوں کی بے حرمتی کرنا یہ ہے کہ ان میں جنگ کی جائے۔ اور تحائف کعبہ کی بے حرمتی یہ ہے کہ انہیں بے جا خرچ کیا جائے اور قلائد یعنی حج کے موقعہ پر ذبح کئے گئے جانوروں کی بے حرمتی یہ ہے کہ انہیں اللہ کے حکم کے خلاف کھایا نہ جائے بلکہ انہیں ذبح کر کے ریت میں دبا کر ضائع کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ضیاع یقیناً یقیناً نہ سنت ابراہیمؑ ہے اور نہ سنت خاتم النبین و رحمۃ للعالمین ہو سکتی ہے۔ کیونکہ نبی اکرم سلام علیہ صد فیصد اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور اول درجے کے وحی الٰہی کے پابند تھے۔ جیسے کہ قرآن کریم میں بتکرار کثیر ذیل کا حکم آپ کے نام جاری کیا گیا ہے:

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ ۷/۱۰۶ + ۱۰/۱۰۹ + ۲/۳۳ اور اے رسول! اس کی اتباع کریں جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے۔ اسی طرح بتکرار کثیر نبی اکرمؐ کا اقرار درج قرآن کر دیا گیا ہے کہ میں صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے:

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۶/۵۰ + ۷/۲۰۳ + ۱۰/۱۵ - ۴۶/۹ میں نہیں اتباع کرتا مگر صرف اس کی جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ تو اس طرح جب نبی اکرمؐ کی طرف دو مرتبہ کے تکرار کے ساتھ وحی کیا گیا ہے **فَكُلُوْا مِنْهَا** ۲۲/۲۸ + ۲۲/۳۶ پس حج کے موقع پر ذبح کئے گئے جانوروں کو کھاؤ۔ تو کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ کروڑوں جانوروں اور اربوں روپے کی مالیت کو ذبح کر کے ریت میں دبا دینا سنت رسول ہو سکتی ہے۔

پھر قرآن کریم سے یہ بھی ثابت ہے کہ جتنی بھی نذریں مانی جائیں وہ صرف اللہ کے نام کے مانی جائیں اور انہیں حج کے موقعہ پر بیت الحرام میں پہنچایا جائے۔ اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی نذر ماننا بھی ازروئے قرآن کریم صحیح نہیں اور بیت الحرام کے سوا کسی اور مقام پر نذریں چڑھانا' یا پہنچانا بھی منع ہے۔ نذر صرف اللہ کے نام کی مانی جائے گی اور صرف اللہ کے گھر بیت اللہ شریف ہی میں پہنچائی جائے گی۔ حاجیوں کو حکم دیا گیا ہے: **وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ** ۲۲/۲۹ اور چاہئے کہ وہ اپنی نذریں ادا کیا کریں۔

کاش کہ کرۂ ارض کے تمام مسلمانوں کی نذروں کا بے پناہ مال' جو بیت اللہ شریف کے عالمی امن مرکز کے سوا دوسرے مقامات پر چڑھاووں کی صورت میں چڑھایا جاتا ہے اگر حکم الٰہی کے مطابق اس کا ایک ایک پیسہ بیت الحرام پہنچایا جاتا تو اسلامی عالمی امن مرکز اتنا مضبوط ہوتا کہ وہ نہ صرف اقوام عالم کے تنازعوں کے فیصلے کرتا بلکہ وہ اپنے فیصلوں پر بھی عمل در آمد کراسکتا۔ نہ اس کے خلاف کسی ملک کو ویٹو کا حق حاصل ہوتا اور نہ عالمی امن مرکز کے فیصلے کے خلاف کشمیر اور عرب علاقوں پر کسی کا غاصبانہ قبضہ موجود ہوتا' نہ فلسطین پر اور نہ بیت المقدس پر۔ یہ ہے بیت اللہ شریف کے بے لوث عالمی امن مرکز کے قیام کی وہ مہم جس کو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے مل کر انجام دیا تھا۔ **سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ** ○

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ اللہ کے مذکورہ رسول لوط سلام علیہ کے پاس پہنچ گئے' مگر ان پر ان کا آنا بہت گراں گزرا۔ کیونکہ آپ کی قوم مہمانوں اور مسافروں کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کیا کرتی تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾

(۷۷) اور جب ہمارے رسول لوط کے پاس پہنچے تو آپ (ان کے آنے سے) مغموم ہوئے۔ اور انہوں نے ان کے آنے سے گہری تنگی محسوس کی اور کہا آج کا دن بڑا سخت ہے۔

نمبر۱ سِيْٓءَ بِهِمْ۔ **سُوْٓءَ** کا معنی ہے بدی۔ برائی' غم بیماری وغیرہ۔ اور **سُوْٓءَ** کا مصدری معنی ہے غمگین کرنا۔ اس لئے یہاں **سِيْٓءَ بِهِمْ** کا معنی ہے لوط سلام علیہ مہمانوں کے آنے سے غمگین ہوگئے۔ کیونکہ قوم لوط مہمانوں کے ساتھ غیر فطری فعل کا ارتکاب کرتی تھی۔

نمبر۲۔ **ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا**" میں **ضَاقَ** ماضی کا معنی ہے تنگ پایا اور **ذراع** کہتے ہیں کہنی سے لیکر درمیانی انگلی کے اگلے سرے تک کے فاصلے کو۔ اور مجازی طور پر طاقت کے معنوں میں آتا ہے۔ اس طرح **ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا** کا معنی ہے لوطؑ نے اپنے مہمانوں کو قوم کے برے ارادوں سے بچانے کے ضمن میں اپنی طاقت کو کمزور پایا۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں اسی چیز کی خبر دی گئی ہے:

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۙ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

(۷۸) اور اس کی قوم (کے لوگ) اس طرف دوڑتے ہوئے آئے[۱] اور وہ اس سے پہلے بھی بدکاریاں کیا کرتے تھے۔[۲] آپ نے فرمایا کہ یہ (تمہاری بیویاں) میری بیٹیاں[۳] تمہارے لئے (جنسیت کے لئے) بہت پاکیزہ ہیں[۴] پس تم اللہ (کے عذاب) سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی ایک بھی بھلا آدمی نہیں ہے۔

نمبر۱ **يُهْرَعُوْنَ** کے لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ جب قوم کو پتہ چلا کہ لوط سلام علیہ کے ہاں مہمان آئے ہیں تو وہ انہیں جنسی شکار جان کر بھاگ کر آگئے بالفاظ دیگر بغلیں بجاتے ہوئے آئے۔

نمبر۲۔ **وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ** کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے' یہ قوم اس بدکاری کی بے حد رسیا تھی۔ یہاں جو **سیات** کا لفظ لایا گیا ہے اس کی وضاحت ۸۰-۸۱/۷ میں بالفاظ ذیل کی گئی ہے کہ لوط نے قوم سے فرمایا:

اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَاۗءِ

کیا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ بے شک تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت رانی کے لیے مردوں کے پاس آتے ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ لوگ اغلام بازی کے ارادے سے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔

نمبر۳ بَنَاتِیْ کا لفظی معنی ہے میری بیٹیاں۔ لیکن یہاں لوطؑ کی اپنی بیٹیاں مراد نہیں۔ کیونکہ اللہ کا نبی اپنی بیٹیاں مذکورہ قسم کے بدکاروں کو نہیں دے سکتا۔ خواہ نکاح کیلئے کیوں نہ ہو۔ اس لئے قوم کی بیٹیاں چونکہ سب کی مشترکہ بیٹیاں ہوتی ہیں' اس لئے قوم کا ہر بڑی عمر کا آدمی ہر لڑکی کو اپنی بیٹی کہہ سکتا ہے۔ کسی لڑکی کو بیٹی کہنے کو نہ لڑکی کے ماں باپ برا مناتے ہیں نہ اس کے بہن بھائی۔ اس لئے آنیوالوں کی بیویوں ہی کو آپ نے بیٹیاں کہا۔ اپنی سگی بیٹیوں کو نہیں کہا تھا۔

نمبر۴۔ اَطْهَرُ کا لفظ اسم تفصیل بھی ہے جس کا معنی ہے سب سے زیادہ پاکیزہ۔ نیز لفظ اَطْهَرُ فعل مضارع واحد متکلم بھی ہے جس سے یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ لوط سلام علیہ نے قوم سے کہا کہ میری نرینہ اولاد نہیں۔ میرے پاس صرف اور صرف بیٹیاں ہیں' تم مجھے رسوا کرنے کے لئے حملہ کرکے آگئے ہو۔ میں انہیں تمہارے مقابلے پر نہیں لاتا' دور رکھتا ہوں' کچھ شرم کرو' لیکن قرین قیاس یہ معنی ہے کہ لوط نے قوم کی بیٹیوں کو جو حملہ آوروں کی بیویاں تھیں اپنی قوی بیٹیاں قرار دے کر ارشاد فرمایا کہ جنسیات کے واسطے تمہارے لئے وہ بہت ہی پاکیزہ ہیں۔ لیکن اگلی آیت مجیدہ میں مذکورہ بد عملوں کا یہ جواب درج ہے:۔

قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿٧٩﴾

(۷۹) انہوں نے کہا کہ بے شک تو جانتا ہے کہ (اپنی بیویوں) تیری بیٹیوں کے ساتھ (غیر فطری فعل کا) ہمارا کوئی حق نہیں۔ کیونکہ تو جانتا ہی ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔

نمبر۱۔ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ سے کھل کر عیاں ہو رہا ہے کہ وہ بدکار لوگ اغلام بازی چاہتے تھے' جس پر عورتیں کبھی بھی راضی نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ غیر فطری فعل سے وہ بچاریاں جنسی تسکین حاصل کرنے کی بجائے' الٹی بدنی اور ذہنی تکلیف کے ساتھ ساتھ احساس حقارت و ذلت میں بھی مبتلا ہوکر رہ جاتی ہیں۔

نمبر۲۔ السید لوطؑ نے قوم کے بارے ارادوں اور اپنی دفاعی کمزوری کے پیش نظر مہمانوں کے تحفظ کے لیے انتہائی حسرت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ﴿٨٠﴾

(۸۰) (آپ نے) کہا کاش میرے پاس تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی۔ پس میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لیتا ہوں۔

نمبر۱۔ رُكْنٍ شَدِيْدٍ یعنی مضبوط سہارا صرف اور صرف ذات باری کی مدد ہے۔ جو اپنے نیکو کار بندوں' خصوصاً انبیاء کرام کی ہر وقت مدد فرماتا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ خود مہمانوں ہی نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ ۖ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ ۖ إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ ۚ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۚ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ﴿٨١﴾

(۸۱) (مہمانوں نے کہا) اے لوط! بیشک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں' یہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اپنی بیوی کے سوا اپنے اہل کے افراد کو لے کر رات کے ایک حصے میں یہاں سے نکل جائیں۔ اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ بیشک جو عذاب ان بدکاروں پر آنیوالا ہے وہ آپ کی بیوی کو بھی پہنچے گا۔ بلاشبہ ان کے عذاب کا مقررہ وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟ (یقیناً قریب ہے' آیا ہی چاہتی ہے)

آپ اپنی نافرمان بیوی کے سوا اپنے جملہ اہل کے ساتھ بستی سے ہجرت کر گئے اور حسب وعدہ' صبح کے وقت اللہ تعالیٰ

کا عذاب باندازِ ذیل آگیا۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾

(۸۲) پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اس بستی کو پیوند خاک کر دیا حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اس پر مٹی کے پکے ہوئے کھنگروں کے پتھر بارش کی طرح پے در پے لگاتار برسائے۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

(۸۳) جن پر تیرے پروردگار کے ہاں سے ایک ہی نشان کندہ تھا۔ اور (اے رسول) وہ بستی (آپ کے مخالف) ظالموں سے کچھ دور نہیں۔

نمبر۱۔ **جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا** کا مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ بستی کی اونچی اونچی عمارتیں پیوند زمین کر دی گئیں۔

نمبر۲۔ **مَطَرٌ** بارش کو کہتے ہیں اور **مَطَرٌ** کا معنی ہے برسنا۔ اس طرح **اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً** کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس بستی پر پتھر برسائے۔

نمبر۳۔ **حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ** کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں۔ **سِجِّيْل** کا معنی ہے آگ میں مٹی کے کھنگر کی حد تک پکائے ہوئے پتھر۔ سورہ ذاریات میں انہی پتھروں کو کہا گیا ہے۔ **حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ** ۵۱/۳۳ یعنی مٹی کے پتھر۔ اور مشاہدہ گواہ ہے کہ مٹی میں پتھر جیسی سختی صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے آگ میں کھنگر کی حد تک پکایا جائے۔

مَنْضُوْدٍ کا لفظ مادہ نضد سے ہے' جس کا مصدری معنی ہے تہ بہ تہ ہونا۔ اور **مَطَرٌ** کی حالت میں اس کا مصدری معنی ہے پے در پے لگاتار برسنا۔ پس ثابت ہوا کہ قوم لوط پر مٹی کے کھنگر کی حد تک پکائے ہوئے پتھر' بارش کی طرح لگاتار برسائے گئے تھے۔

یہاں **حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ** ہی کے لئے بصورت حال آیا ہے **مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ** یعنی ان کھنگروں کی حد تک پکائے ہوئے مٹی کے پتھروں کی حالت یہ تھی کہ ہر ایک پر ایک ہی نشان کندہ تھا۔ اور **عِنْدَ رَبِّكَ** کے الفاظ میں رب تعالیٰ کے قانون کا اظہار کیا گیا ہے کہ ہر ایک پتھر پر ایک ہی نشان کندہ کرنا رب تعالیٰ کے کائناتی قانون کے عین مطابق تھا (تفصیل یہ ہے)

○ پس آیت مجیدہ ۸۲-۸۳/۱۱ کے الفاظ کی حاکمیت کے مطابق قوم لوط پر لائے گئے عذاب کی حقیقت بصورت نصف النہار عیاں ہو چکی ہے کہ اس بدکار قوم کی بستی پر اس دور کی حد ایجاد کے مطابق منجنیقوں کے ساتھ کھنگروں کے گولے برسائے گئے تھے۔ اور چونکہ منجنیق کے دہانے میں ایک ہی سائز کے گولے آسکتے ہیں' اس لئے انہیں ایک ہی سائز کے سانچوں میں اینٹیں تھاپی جاتی ہیں۔ اور سانچے میں کھدا ہوا ایک ہی نشان سب اینٹوں پر کندہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح مذکورہ گولے گیلی مٹی کے تھاپ کر بنائے جاتے تھے' منجنیق کے دہانے کے مطابق بنائے گئے سانچے میں کھدا ہوا ایک ہی نشان ہر گولے پر کندہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اور پھر انہیں آگ میں پکا کر کھنگر کر لیا جاتا تھا۔ تاکہ جہاں گریں خود نہ ٹوٹیں اور مقام مضروب پر تباہی لے آئیں۔ سابقہ زمانوں میں ایسی ہی منجنیقوں کے ساتھ گولے برسائے جاتے تھے۔ گولوں پر الگ الگ منجنیقوں کے الگ الگ نشان کندہ ہونے کو **مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ** یعنی تیرے رب کے قانون کے مطابق کہا گیا ہے۔ یہاں رب سے مراد رب تعالیٰ کا کائناتی قانون ہے اور **عِنْدَ** مضاف حرف جار قرآن مجید میں "کے مطابق" کے معنوں میں مستعمل ہے:

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ هُمْ

دَرَجٰتٌ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ ○ ۱۶۲-۱۶۳/۳ کیا وہ شخص جس نے رضا الٰہی کی اتباع کی' اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس کے غصے کا مستحق ہوا۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ پھر جانے کی بہت بری جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون مکافات کے مطابق ان کے الگ الگ درجے ہیں اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

المختصر! یہاں تک یہ ثابت ہو چکا کہ قوم لوط کی بستی پر مٹی کے بنے ہوئے ایک ہی نشان والے' اللہ کے قانون کے مطابق پکائے گئے کنکروں کے پتھر منجنیقوں کے ذریعہ لگاتار برسائے گئے تھے جو **اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہَا حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۬ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ○ مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ** ۸۲-۸۳/۱۱ کے الٰہی ارشاد سے عیاں ہے۔ اب اس عنوان کا آخری سوال یہ ہے کہ یہ کنکر کے نشان کندہ گولوں کی بارش کس سے کروائی گئی تھی۔

اس کا جواب ۳۱ تا ۳۴/۵۱ سے ثابت ہے کہ یہ بارش بد لائل ذیل اللہ کے رسولوں اور ابراہیم و لوط سلام علیہما کے مہمانوں سے کرائی گئی تھی۔ جب ابراہیم سلام علیہ نے ان سے پوچھا **فَمَا خَطۡبُکُمۡ اَیُّہَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ** کہ اے اللہ کے رسولو! تمہاری مہم کیا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ **اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ○ لِنُرۡسِلَ عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ طِیۡنٍ ○ مُّسَوَّمَۃً عِنۡدَ رَبِّکَ لِلۡمُسۡرِفِیۡنَ ○** بے شک ہم مجرموں کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم حد سے نکلنے والوں کے لئے تیرے رب کے قانون کے مطابق مٹی کے بنائے گئے نشان کندہ پتھر لگاتار برسائیں۔

یہ باری تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول داؤد و سلیمان سلام علیہما کی طرح رسول ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب اقتدار بھی تھے۔ ان کا منجنیق بردار فوجی دستہ پیچھے خفیہ مقام پر محفوظ تھا' جسے وعدہ والی صبح سے پہلے پہلے رات کے موقعہ پر لایا گیا اور لوط سے راتوں رات ہجرت کروا کر صبح کے وقت نشان کندہ کنکروں کے پتھروں کی لگاتار بارش کے ساتھ بدکار قوم کی بستی کو پیوند خاک کر دیا۔ چنانچہ حکم باری تعالیٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے مذکورہ مقتدر رسولوں نے پہلے ابراہیم سلام علیہ کو دو بیٹوں اور ایک پوتے کی خوشخبری دی اور پھر قوم لوط پر منجنیقوں کے ذریعے پتھراؤ کر کے اسے کیف کردار تک پہنچا دیا۔

قوم لوط پر عذاب بھیجنے کا ذکر سورہ اعراف' سورہ ہود' سورہ حجر' سورہ انبیاء' سورہ شعراء' سورہ نمل' سورہ عنکبوت' سورہ صفت' سورہ ذاریات' سورہ قمر اور سورہ لیل میں آیا ہے۔ عذاب کی تفصیل کے طور پر سورہ قمر میں کہا گیا ہے۔ **اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ حَاصِبًا** ۳۴/۵۴ بے شک ہم نے ان پر پتھر پھینکے۔

سورہ اعراف' شعراء اور نمل میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق ایک ہی الفاظ آئے ہیں **وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الۡمُنۡذَرِیۡنَ ○** ۸۴/۷ + ۱۷۳/۲۶ - ۵۸/۲۷ ہم نے ان پر مینہ برسایا۔ پھر کیسا برا مینہ تھا جو متنبہ کئے گئوں پر برسایا گیا۔

سورہ عنکبوت میں آیا ہے کہ اللہ کے رسل سلام علیہم نے لوط سلام علیہ سے کہا **اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَہۡلِ ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ** ۳۴/۲۹ اس بستی کے رہنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں۔

سورہ حجر میں آیا ہے **وَاَمۡطَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ سِجِّیۡلٍ** ۷۴/۱۵ اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھروں کا مینہ برسایا۔

سورہ ذاریات ۳۲ تا ۳۴/۵۱ میں آیا ہے کہ اللہ کے رسل سلام علیہم نے ابراہیم سلام علیہ سے کہا **قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ○ لِنُرۡسِلَ عَلَیۡہِمۡ حِجَارَۃً مِّنۡ طِیۡنٍ ○ مُّسَوَّمَۃً** انہوں نے کہا بے شک ہم مجرموں کی قوم کی طرف اس لئے بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر مٹی کے (پکائے ہوئے نشان کندہ) پتھر برسائیں ــــــ اور

سورہ ہود میں ارشاد ہوا **وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ مَّنۡضُوۡدٍ ○ مُّسَوَّمَةً** ۸۲-۸۳/۱۱ اور ہم نے اس قوم پر (مٹی کے پکے ہوئے) کھنگروں کے نشان کندہ پتھروں کی لگاتار بارش برسا دی۔

قرآن بھر میں پھیلی ہوئی مذکورہ بالا آیات کریمات کی شہادت اور قرآن کریم کے مستقل اسلوب بیان تصریف آیات سے کھل کر ثابت ہو چکا کہ بدکار قوم لوط پر مٹی کے پکے ہوئے نشان کندہ پتھر بارش کی طرح پے در پے لگاتار برسائے گئے تھے۔ اور وہ اس دور کی عسکری اسلحی صنعت کے مطابق ایجاد کردہ منجنیقوں کے ذریعہ برسائے گئے تھے۔ اور برسانے والے اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ رسل سلام علیہم داؤد و سلیمان سلام علیہما کی طرح اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کے علاوہ ایک حصہ زمین میں صاحب اقتدار بھی تھے۔

دو اہم سوالات ○ ایک اہم سوال تو یہاں پہنچ کر یہ پیدا ہوتا ہے کہ قوم لوط پر کھنگریالے پتھروں کی بارش برسانے والوں کے متعلق تو یہ مشہور ہے کہ وہ فرشتے تھے' اس کا جواب ازروئے قرآن کریم یہ ہے کہ جیسا پیچھے عرض کیا جاچکا ہے کہ قوم لوط پر بھیجے گئے عذاب کا ذکر گیارہ سورتوں میں آیا ہے۔ کسی ایک سورت میں بھی ان کے لئے ملائکہ کے الفاظ مطلقاً نہیں آئے۔ یا تو ان کے لئے **رُسُلُنَا** کے الفاظ آئے ہیں ہمارے رسول اور ضیف ابراہیم اور ضیف لوط **ضَيۡفِهٖ** کے الفاظ آئے ہیں یعنی ابراہیم کے مہمان لوط کے مہمان۔ رسل اور مرسلون کے الفاظ آیات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:۔

سورہ ہود میں آیا ہے **وَلَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ بِالۡبُشۡرٰى** ۶۹/۱۱ اور بے شک ابراہیم کے پاس ہمارے رسول خوشخبری لے کر آئے۔ اور اسی سورہ مجیدہ میں آیا ہے **وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا** ۷۷/۱۱ اور جب ہمارے رسول لوط کے پاس آئے۔

سورہ حجر میں آیا ہے کہ ابراہیم سلام علیہ نے آنیوالوں سے پوچھا **قَالَ فَمَا خَطۡبُكُمۡ اَيُّهَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ** ۵۷/۱۵ اے اللہ کے رسولو! تمہاری مہم کیا ہے؟ عین یہی الفاظ سورہ ذریات میں ابراہیمؑ کے آئے ہیں **قَالَ فَمَا خَطۡبُكُمۡ اَيُّهَا الۡمُرۡسَلُوۡنَ** ۳۱/۵۱ سورہ حجر میں آیا ہے **فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوۡطِ اۨلۡمُرۡسَلُوۡنَ** ۶۱/۱۵ پھر جب اللہ کے بھیجے ہوئے آل لوط کے پاس آئے۔

ابراہیم اور لوط سلام علیہما کے ضیف یعنی مہمانوں کے الفاظ آیات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:۔

سورہ حجر میں آیا ہے **وَنَبِّئۡهُمۡ عَنۡ ضَيۡفِ اِبۡرٰهِيۡمَ** ۵۱/۱۵ اور (اے رسول سلام علیہ) ان لوگوں کو ابراہیم کے مہمانوں کی خبر دیجئے۔ سورہ ذاریات میں ارشاد ہوا **هَلۡ اَتٰٮكَ حَدِيۡثُ ضَيۡفِ اِبۡرٰهِيۡمَ** ۲۴/۵۱ کیا آپ کے پاس ابراہیمؑ کے مہمانوں کی خبر پہنچی ہے (یقیناً سابقہ سورتوں میں پہنچ چکی ہے)

سورہ ہود میں آیا ہے کہ جب قوم لوط برے ارادے کے ساتھ آپ کی طرف آئی تو لوط سلام علیہ نے فرمایا **وَلَا تُخۡزُوۡنِ فِىۡ ضَيۡفِىۡ** ۷۸/۱۱ مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو ----- سورۃ حجر میں ہے کہ لوطؑ نے فرمایا **اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ ضَيۡفِىۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِ** ○ ۶۸/۱۵ بے شک یہ میرے مہمان ہیں۔ مجھے (ان میں) رسوا نہ کرو۔ سورہ قمر میں ارشاد ہوا ہے **وَلَقَدۡ رَاوَدُوۡهُ عَنۡ ضَيۡفِهٖ** ۳۷/۵۴ اور ان (بدکاروں) نے لوط کے مہمانوں کو بدکاری کے لیے پھسلانا چاہا۔

پس مذکورہ بالا آیات مقدسات میں جب متعدد بار بتکرار کثیر رسل اور ضیف کے الفاظ آئے ہیں اور ملائکہ کا لفظ ایک مرتبہ بھی نہیں آیا۔ اور ان اللہ کے رسولوں سے قوم لوطؑ پر منجنیقوں کے ذریعہ مٹی کے پکے ہوئے کھنگریالے پتھروں کی بارش برسوائی گئی۔ اس سے ثابت ہوا وہ ملائکہ نہیں تھے' اللہ تعالیٰ کے صاحب اقتدار رسول تھے نیز واضح رہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی حاکیت قائم رکھتے ہوئے اس کا مستقل اسلوب بیان ہے۔ تصریف آیات' جس امر کی رہنمائی کرے اس کے خلاف کسی ایسے امر کی طرف رخ کرنا درست نہیں جس کا قرآن بھر میں لفظ تک موجود نہ ہو۔ قرآن مجید سے ملائکہ پر

سلام بھیجنا ثابت نہیں ہے لیکن ابراہیم سلام علیہ نے اپنے مہمانوں کو سلام کہا تھا جس سے اظہر من الشمس ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے ملائکہ نہیں تھے بلکہ بشر تھے۔

دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سابقہ نافرمان اقوام کو طوفان آب' طوفان باد' طوفان برق اور زلزلوں کے ذریعہ ختم کیا گیا تھا' تو قوم لوط پر مٹی کے کھنگریالے پتھروں کی بارش کیوں کرائی گئی تھی' جبکہ اللہ تعالیٰ کے یہ لشکر قوم لوط کے عذاب کے وقت بھی موجود تھے؟ اس کا جواب قوم نوح پر لائے گئے عذاب طوفان آب میں موجود ہے کہ نوح سلام علیہ کو آمد طوفان کی خبر دینے کے ساتھ ہی حکم دیدیا گیا کہ آپ کشتی تیار کریں۔ اس کشتی تیار کرنے کے الٰہی حکم میں کھل کر اعلان کر دیا گیا ہے کہ جو بھی عذاب آئے گا مادی ذرائع سے آیا کرے گا۔ چنانچہ پانی کا سیلاب' آندھی کا طوفان' بجلی اور زلزلہ سب مادی چیزیں ہیں اور ان سے بچاؤ بھی مادی ذرائع ہی کے ساتھ ممکن ہوگا۔ جیسے کہ سیلاب عظیم سے محفوظ رہنے کے لیے مادی چیز کشتی ہی کام دے سکتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے السید نوح سلام علیہ سے کشتی تیار کرائی۔ کسی معجزانہ طریقے سے نوحؑ اور آپ کے ساتھیوں کو محفوظ نہیں رکھا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی اس سنت مبارکہ کے مطابق جو قرآن کریم میں بطور نمونہ پیش کی گئی ہے۔ ہود سلام علیہ سے یقیناً" ایسی پناہ گاہیں بنوائی گئی تھیں جن میں آندھی کا اثر نہ ہو' کیونکہ آپ کی قوم پر ایسی آندھی کا عذاب لایا گیا تھا جو مسلسل سات اور آٹھ دن رات چلتی رہی اور قوم ہود کو ختم کر گئی۔

اسی طرح قوم صالح پر ایسی تیز آواز کا عذاب لایا گیا جس سے آپ کے مخالف تو ختم ہوکر رہ گئے' مگر سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس عذاب سے صالح سلام علیہ اور آپ کے فرمانبرداروں کو کس طرح بچایا گیا؟ اس کا جواب بھی تیاری کشتی نوح کے حکم میں موجود ہے کہ جب طوفان آب میں غرق ہونے سے بچنے کے لیے کشتی بنانا ضروری اور حکم باری تعالیٰ ہے۔ اس طرح موت کے گھاٹ اتار دینے والی تند و تیز آواز سے بچنے کے لئے ایسی ایئر ٹاٹ پناہ گاہیں بنوائی گئی تھیں' جن میں آواز کا گزر ممکن نہ ہو۔

اسی طرح محمد رسول اللہ سلام علیہ جن کی قوم پر چونکہ جنگ کا عذاب نازل ہونے والا تھا۔ اس لئے آپ سلام علیہ اور آپ کے مقدس صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا گیا **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ** ۸/۶۰ دشمن کے مقابلے کے لیے استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت تیار کرتے رہو۔ چنانچہ نبی اکرم سلام علیہ کی فوجی قوت اور صحابہ کرامؓ کے عظیم الشان استقلال ہی کا نتیجہ تھا کہ دشمن بڑی سے بڑی قوت کے ساتھ حملہ آور ہوتا رہا' مگر ہر بار شکست کھا کر لوٹتا رہا۔ اور آخر کار نبی اکرم سلام علیہ کی بے پناہ فوجی قوت ہی کے سامنے معرکہ مکہ معظمہ میں بلا جنگ وجدال ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

برادران اسلام! یاد رکھیئے گا کہ دور حاضر میں کرہ ارض پر اسی نوے کروڑ مسلمانوں کی پسماندگی و درماندگی کی ایک ہی وجہ ہے کہ تیل اور سونے کے بے پناہ ذخائر کے مالک ہوتے ہوئے فوجی قوت کی تیاری' خصوصاً" اسلحہ سازی کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ یہ اس لئے کہ قیامت تک کے اہل اسلام کو متنبہ کرنا تھا کہ یاد رکھو جب بھی زمین میں اقتدار حاصل ہوگا۔ طاقت ہی کیساتھ ہوگا اور وہ قائم بھی اسلحہ اور فوجی استقلال کے ساتھ رہ سکے گا۔

داؤد سلیمان سلام علیہما کے تذکرہ ۳۸/۱۷ میں داؤد کو **ذَا الْاَيْدِ** یعنی داؤد اعظم کہا گیا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آپ کے ہاں لوہے کی فوجی صنعت مقام عروج پر تھی' جسے محاورے کے طور پر یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم نے آپ کے لئے لوہے کو نرم پایا' **وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ** ۳۴/۱۰ اس لئے کہ آپ کو حکم دیدیا گیا تھا **اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ** ۳۴/۱۱ آپ

لوہے سے جنگی اسلحہ بنائیں، خصوصاً لوہے کی زرہیں اور ان کے حلقوں میں جسم کے ہر عضو کے مطابق صحیح صحیح اندازہ رکھا کریں۔

سلیمان سلام علیہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کے ہاں پگھلے ہوئے تانبے کے چشمے بہا کرتے تھے۔ یعنی بڑی بڑی فاؤنڈریوں میں تانبے کے اسلحی پرزہ جات ڈھلا کرتے تھے ۳۴/۱۲۔ بالفاظ دیگر داؤد سلیمان سلام علیہما کی مضبوط حکومتوں کا راز ہمہ وقتی جدید سے جدید اسلحہ کی تیاری تھا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا مقتدر رسل سلام علیہم اس دور کی ترقی کے مطابق ایسے گولہ بار توپخانے کے مالک تھے، جس میں مٹی کے کھنگریالے پتھر استعمال کئے جاتے اور دشمن کو آن واحد میں تہ و بالا کر کے رکھ دیا جاتا تھا۔ یہ ہے از روئے قرآن کریم فوجی تیاری کا نمونہ جو قیامت تک اہل اسلام کے لیے درس اسلحہ سازی کا فریضہ انجام دیتا رہے گا کہ مادی اسباب سے نفرت خلاف اسلام ہے۔ اللہ کے سابقہ جملہ مقتدر رسول جنگی اسلحہ کی تیاری میں قوموں کی صف اول میں سب سے آگے تھے اور غالب تھے۔ اور اس نے اپنے آخری نبی خاتم النبین سلام علیہ کو بھی جدید سے جدید اسلحہ سازی کا حکم دے رکھا تھا ۸/۶۰ جس کے ذریعہ مستقل مزاج صحابہؓ تادم زیست غالب رہے تھے کہ تم مادی اسباب سے پہلوتہی کر کے درماندہ اور پسماندہ نہ ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد نہیں کرتا جو اپنی مدد آپ نہیں کرتے ۴۰/۲۲ اور اپنی مدد آپ یہ ہے کہ ہر موقعہ محل کے مطابق وہ مادی اسباب قبل از وقت تیار کر لئے گئے ہوں جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنی لاریب کتاب میں نازل کر رکھا ہے۔ اور جن کے جملہ ذرائع اس نے اپنی لاریب کتاب کائنات میں مہیا کر رکھے ہیں۔

برادران اسلام! یہ ایک انتہائی تباہ کن المیہ ہے کہ اہل اسلام کو مادی اسباب سے نفرت کی تعلیم دیگر ترقی کے الٰہی راز سے بے خبر کر دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا بیان کردہ ہر واقعہ اپنے اندر اہل اسلام کے علاوہ پوری نوع انسانی کے لئے ترقی کا درس عظیم لئے ہوئے ہے۔ اسی ضمن میں سورہ فیل کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک سرکش حاکم بیت اللہ شریف کو مسمار کرنے کے لئے ہاتھیوں کی فوج لے کر آیا۔ جب کعبہ مکرمہ کے محترم متولی کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا کہ جس کا گھر ہے وہ اس کی خود حفاظت کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی فوج بھیج کر ان سے کنکریاں برسا کر ہاتھیوں کی فوج تباہ کرادی۔

اس واقعہ کے مطابق بات یہ ہے کہ کیا یہ قصہ اسلئے درج قرآن کر دیا گیا ہے کہ اے اہل اسلام جب بھی کوئی سرکش حاکم اللہ کے گھر پر حملہ آور ہوگا، ہم پرندوں کی فوج بھیج دیا کریں گے۔ تم بالکل مطمئن ہو جاؤ۔ تمہیں نہ اسلحہ کی ضرورت ہے نہ فوج کی۔ پھر اگر اس کا جواب اثبات ہی میں دیا جائے تو پھر تاریخ کے مطابق جب عبداللہ بن زبیرؓ نے بیت اللہ شریف میں پناہ لی اور کعبہ معظمہ کی عمارت کو منجنیقوں کے ساتھ گرا دیا۔ تو گیا اس وقت پرندوں کی فوج آئی تھی؟ پھر جسے قبلہ اول کہا جاتا ہے جب اسرائیلی فوج نے اس کے ایک حصے کو آگ لگا دی اور اب وہ بیت المقدس میں تبدیل کر رہا ہے، پورا عالم اسلام اس کے خلاف احتجاج بھی کر رہا ہے اور غلاف کعبہ کو پکڑ کر بیت المقدس کی بازیابی کی دعائیں بھی مانگی جارہی ہیں، کیا کوئی پرندوں کی فوج یہودیوں کو تباہ کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے؟

واضح رہے کہ اس سے پہلے سلطان صلاح الدین رحمتہ اللہ علیہ نے فوجی قوت ہی کیساتھ بیت المقدس کو فتح کیا تھا اور اب بھی فوجی قوت ہی کے ساتھ دشمن کو بیت المقدس کی ہیئت بدلنے سے روکا جاسکتا ہے اور اس سے یہ مسجد واپس بھی فوجی قوت ہی کے ساتھ لی جاسکتی ہے۔ پس سورہ فیل کے ساتھ چسپاں کیا گیا قصہ قرآن کریم کی روشنی میں محل نظر ہے۔ جس پر خالی الذہن ہو کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ اس سورت مقدسہ میں قوم لوط کی تباہی کا عبرت انگیز واقعہ بیان کیا

گیا ہے جس پر سورہ فیل میں آمدہ وہ الفاظ بطور شاہد عادل موجود ہیں جو پیچھے لائی گئی متعدد سورتوں کے حوالوں سے پیش کئے جا چکے ہیں **حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ** سورہ فیل میں قوم لوط کو اصحب الفیل کہا گیا ہے۔ عربی زبان میں فیل الرائے بیوقوف اور موٹی عقل والے آدمی کو کہتے ہیں۔ دیکھئے منتہی الارب ربع صفحہ ۴۳۵۔ نیز دیکھئے مفردات امام راغب مطبوعہ اہل حدیث اکادمی کشمیری بازار لاہور صفحہ ۸۱۹ پر درج ہے۔

رَجُلٌ فِيلُ الرَّأْيِ وَفَالُ الرَّأْيِ۔ کمزور رائے آدمی۔

قوم لوط وہ لوگ تھے کہ السید لوط سلام علیہ کی تبلیغ کے باوجود اس عظیم خباثت پر اڑے رہے کہ ان سے پہلے اس کی مرتکب کوئی قوم نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ مل کر متحدہ طور پر اس فعل بد کو انجام دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم کا جو مستقل اسلوب بیان تصریف آیات ہے' اس کے مطابق سورہ فیل کی تفہیم کے لیے سرفہرست اس چیز کا سمجھنا لازم ہے کہ قرآن کریم کی آخری سورتوں میں انتہائی اختصار کے ساتھ ان قصص کی یاد دلائی گئی ہے جو پیچھے قرآن بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ سورہ فجر میں **أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ** کے وہی الفاظ آئے ہیں جو سورہ فیل میں اصحاب فیل کا واقعہ یاد دلانے کے لئے آئے ہیں۔ دیکھئے ارشاد ہوا ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۝ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ ۶ تا ۸۹/۱۴

(مفہوم) اے رسول! کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ آپ کے رب نے قوم عاد کیساتھ کیا کیا تھا۔ بلند نشانوں والوں اور بلند عمارتوں والوں کے ساتھ۔ جن کی مثل شہروں میں پیدا نہ کئے گئے تھے۔ اور تمہارے رب نے قوم ثمود کے ساتھ کیا کیا تھا جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراش تراش کر گھر بنائے۔ اور آپ کے رب نے لشکروں والے فرعون کے ساتھ کیا کیا تھا' جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی' بلکہ ان میں بہت زیادہ فساد کیا۔ آپ کے رب نے (ان سرکش قوموں کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ) ان سب پر عذاب کا کوڑا چلایا۔ بے شک آپ کا رب (بد عمل قوم و افراد کی) گھات میں ہے۔ (مہلت دینے کے بعد بالآخر عذاب نازل کر دیتا ہے)

دیکھئے! ان آیات مجیدہ میں قوم عاد' قوم ثمود اور لشکروں والے فرعون کے متعلق یاد دلایا گیا ہے کہ غور فرمایئے' ان سرکشوں کے ساتھ آپ کے رب نے کیا سلوک کیا تھا؟ اور خود ہی جواب میں نہایت اختصار کے ساتھ بتا دیا ہے کہ اس نے سب پر عذاب کا کوڑا برسا دیا تھا۔ وہ کسی سرکش قوم کو معاف نہیں کرتا۔ وہ سب کی گھات میں ہے۔ اب غور فرمایئے۔ کہ یہاں صرف عذاب کا کوڑا برسانے کی خبر دی گئی ہے' اس عذاب کے کوڑے کی تفصیل پیچھے سارے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں ان اقوام کے الگ الگ نشان بتا دیئے ہیں کہ قوم عاد' ارم و عماد والی تھی۔ قوم ثمود کا نشان بتایا گیا ہے۔ **جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ** تھی اور فرعون **ذِي الْأَوْتَادِ** تھا۔ اب صاف ظاہر ہے کہ انہی نشانوں **ارم و عماد' جابو الصخر با الواد** اور **ذِي الْأَوْتَاد** کے الفاظ کے حوالوں سے ان قوموں کے حالات قرآن بھر سے دیکھنے اور ان پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اسی طرح سورہ فیل میں قوم لوط کا نام انتہائی ناراضگی کے ساتھ اصحب الفیل رکھا گیا موٹی عقل اور کمزور رائے والے۔ جیسا کہ سورہ الانبیاء میں اس قوم کو بری بدکار قوم کہا گیا ہے (ملاحظہ ہو آیات کریمہ ۷۴)۔ان پر لائے گئے عذاب کے لئے الفاظ لائے گئے۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۱۰۵/۴ کہ وہ' وہ تھے جن پر کھنگریالے پتھر برسائے گئے تھے۔ اور ان کھنگریالے پتھر برسانے والوں کو کہا گیا ہے طَيْرًا اَبَابِيْلَ جس سے قوم طیر کا گروہ مراد ہے۔ ابابیل کا معنی گروہ ہے' یہ کسی پرندے کا نام ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ مفردات امام راغب کے صفحہ نمبر۹ پر درج ہے کہ ابابیل کا واحد اِبَالَةٌ ابیلٌ ہے اور اس کا معنی ہے اونٹوں کا گروہ۔ سورہ فیل میں چونکہ اَبَابِيْل کا لفظ طَيْرًا" پر داخل ہوا ہے۔ اس لئے اس کا معنی ہے طیر کا گروہ۔ اب اگر تصریف آیات قرآنیہ کے ساتھ یہاں حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ' یعنی کھنگریالے پتھر پھینکنے والے پرندے ثابت ہوں۔ توطیر معنی پرندے ہوگا اور اگر قرآن بھر سے حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کو برسانے والا فوجی گروہ ثابت ہو' تو اس سے مراد طیر قوم کا گروہ ہوگا۔ اب چونکہ قرآن مجید کی متعدد سورتوں سے بتکرار ثابت ہو چکا ہے کہ کھنگریالے پتھر قوم لوط پر برسائے گئے تھے اور برسانے والے اللہ کے مقتدر رسولوں کا فوجی دستہ' گروہ تھا اس لئے ثابت ہوا کہ یہاں پرندوں کا گروہ مراد نہیں بلکہ طیر قوم کا فوجی دستہ' گروہ تھا اس لئے ثابت ہوا کہ یہاں پرندوں کا گروہ مراد نہیں بلکہ طیر قوم کا فوجی دستہ مراد ہوگا۔ جیسے کہ مختلف رجمنٹوں کے نام ان کے قبائل یا علاقوں کے نام پر ہوتے ہیں۔ بلوچ رجمنٹ' پنجاب رجمنٹ' مرہٹہ رجمنٹ اور گورکھا رجمنٹ وغیرہ' پس طیرا" ابابیل سے مراد طیر رجمنٹ کا دستہ ہے۔ اہل عرب میں کلبی قبیلہ اور بنو اسد بہت مشہور ہیں۔ وہ اپنے اپنے کسی بزرگ کے کلب اور اسد کے نام پر کلبی اور بنو اسد کہلاتے ہیں۔ اسی طرح دور ابراہیم سلام علیہ میں قبیلہ طیرا اپنے کسی بزرگ کے نام سے مشہور تھا۔ جس کے نام پر قبیلہ طیر کا نام طیر چل رہا تھا۔ اور اس قبیلہ کی رجمنٹ سے دستے کو طیرا" ابابیل کہا گیا۔ اور جس طرح سورہ فجر میں قوم عاد' قوم ثمود اور فرعون کے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ کہ تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ اسی طرح قوم لوط کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ فَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ پھر آپ کے رب نے ان پر طیر قوم کا فوجی دستہ بھیجا' جو ان پر مٹی کے بنے ہوئے کھنگریالے پتھر برساتا تھا۔ پھر اس نے انہیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔

مذکورہ بالا ابتدائی اور تمہیدی وضاحت کے بعد اب پوری سورہ فیل اور تصریف آیات قرآنیہ کے مطابق اس کا مفہوم خالی الذہن ہو کر بغور ملاحظہ فرمائیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ ۱ تا ۱۰۵/۵

(مفہوم) اللہ رحمان و رحیم کے نام کے ساتھ پڑھئے گا۔ (اے رسول!) کیا آپ نے موٹی عقل والی (قوم لوط) پر غور کیا ہے۔ کیا آپ کے رب نے ان کی بری تجویز کو باطل نہیں کر دیا تھا۔ اور کیا ان پر طیر رجمنٹ کا فوجی دستہ نہیں بھیجا تھا۔ جو ان پر مٹی کے پکے ہوئے کھنگروں کے پتھر پھینکتا تھا۔ پھر اس قوم کو روندے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔

عام تراجم نے طَيْرًا اَبَابِيْلَ کا معنی پرندوں کا جھنڈ ہی لیا ہے۔ مگر آگے ان کا جو فعل بتایا گیا ہے تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ اس میں تَرْمِيْهِمْ' رمٰی سے ہے۔ جس کا معنی ہے نشانے پر تیر مارنا۔ تیر مارنا۔ تیر سے مارے ہوئے شکار کو رَمِيَّةٌ کہتے ہیں۔ چونکہ اس مادہ میں نشانہ باندھنے کا تصور موجود ہے' اس لئے رَمْيُ الرَّصَاص کا معنی ہے گولی چلانا۔ رَمْيُ الْحِجَارَةِ مِّنْ سِجِّيْلٍ' یعنی مٹی کے پکے ہوئے کھنگروں کے پتھروں کو نشانہ باندھ کر پھینکنا پرندوں کا کام نہیں' بلکہ یہ کام ماہر نشانہ بازوں کا ہے۔ رَمْيٌ کا معنی نشانہ پر تیر مارنے کے علاوہ گوپیے کے ساتھ نشانے پر پتھر مارنا بھی ہے۔

مگر چونکہ یہاں نشان کندہ کنگرالے پتھروں کے پھینکنے کا ذکر ہے جو مخصوص نشان کندہ سانچوں میں تھاپ کر آگ میں پکائے جاتے تھے۔ اس لئے یہاں گوپے کی بجائے منجنیقوں کے ذریعہ نشانہ باندھ کر پھینکنے کا ذکر ہے۔

ایک ضروری وضاحت ○ یاد رہے کہ قرآن کریم میں نازل کردہ جملہ الفاظ اپنے اپنے مقام پر اس طرح ہیں جیسے کہ انگوٹھی میں نگینہ۔ کوئی لفظ بھرتی کا نہیں اور نہ بلا ضرورت لایا گیا ہے۔ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں قوم لوط کا ذکر بطور تصریف لاکر ہر جگہ **حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ** کے الفاظ بلا مقصد نازل نہیں کئے گئے بلکہ منجنیقوں کے ذریعہ پھینکے جانے کی وضاحت کے لیے لائے گئے ہیں۔ اور اسی طرح **تَرْمِیْھِمْ** کے الفاظ بھی نشانہ باندھ کر پتھر چلانے کے لئے آئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا پوری آیتوں میں جہاں جہاں **حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ** کے پھینکنے کا ذکر آیا ہے کہیں بھی منجنیقوں کا نام موجود نہیں۔ اس کا جواب بالکل سادہ سا ہے کہ جب آپ کہتے ہیں کہ میں نے فائر کیا۔ تو یہ ضروری نہیں کہ آپ بندوق یا ریوالور کا نام لیں۔ سننے والا جانتا ہے کہ فائر یا تو بندوق کے ساتھ کیا جاتا ہے اور یا ریوالور وغیرہ کے ساتھ۔ اور وہ کلام میں بیان کردہ موقعہ محل کے مطابق خود سمجھ لیتا ہے کہ فائر بندوق کا ہے یا ریوالور کا' شکاری بندوق کا ہے یا فوجی بندوق کا۔

اگر بانداز تعمق غور کیا جائے تو سورہ فیل کے روایتی مفہوم سے اہل اسلام میں غیر مسلح رہنے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر بیت اللہ شریف کی حفاظت اپنے ذمہ لے رکھی ہے' جیسے کہ اس نے ہاتھیوں والوں سے اسے محفوظ رکھا۔ اور اسی عقیدہ سے اس نظریہ نے جنم لیا ہے' چونکہ دین اللہ کا ہے' اس لئے اس کی حفاظت بھی اسی کے ذمہ ہے۔ اس طرح آگے بڑھ کر یہ چیز ذہنوں میں راسخ ہوگئی کہ مسلمان اللہ کے ہیں اور اللہ مسلمانوں کا ہے' اس لئے مسلمانوں کی حفاظت بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ جس طرح اس نے چڑیوں سے ہاتھیوں کو مروا دیا تھا۔ اسی طرح ہماری' ہمارے گھروں کی' ہماری مسجدوں کی ہماری حکومت کی بھی وہی حفاظت کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بلاشبہ اہل اسلام کی یہ حالت ہے کہ پچاس ساٹھ حکومتیں اسلامی ہے۔ تیل اور سونے کے ذخیرے بافراط موجود ہیں مگر آج تک کسی ملک میں اسلحہ فیکٹری کا قیام تو گیا' کسی اسلامی ملک میں لوہے کا کارخانہ تک نہیں لگایا گیا۔ صرف پاکستان میں ابھی ابھی لگایا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر چڑیوں سے ہاتھی مروانے کے تصور نے اہل اسلام کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ مسلمانوں کو اسلحہ کی ضرورت ہی نہیں۔ مومن اسلحہ کے بغیر بھی لڑسکتا ہے' حالانکہ اس غیر قرآنی نظریے نے کرہ ارض پر اہل اسلام کو پسماندہ اور درماندہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس کے برعکس سورہ فیل کے صحیح قرآنی مفہوم کے مطابق جو تصریف آیات قرآنیہ کے مستقل الٰہی اسلوب کے مطابق پیش کیا گیا ہے' ہر آن جدید سے جدید اسلحہ تیار کرتے رہنے کا سبق ملتا ہے۔ جس کا حکم محمد رسول اللہ اور آپ کے صحابہؓ کرام کو بالفاظ ذیل دیا گیا تھا۔ اور جو قیامت تک کے لیے اہل اسلام کے نام جاری و ساری ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ ج لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ ج اَللّٰہُ یَعْلَمُھُمْ ج ۸/۶۰ اور (اے صحابہؓ! اور قیامت تک کے مسلمانو!) دشمنوں کے مقابلہ کے لیئے استطاعت بھر زیادہ سے زیادہ ہر آن جدید سے جدید اسلحہ تیار کرتے رہو۔ اور تمہارے ہاں ذرائع رسل و رسائل کی بھی وہ بہتات ہو کہ تم اس فوجی قوت کے ساتھ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو دہلاتے اور لرزاتے رہو۔ (اور تمہارے ظاہر دشمنوں کے سوا) اور بھی ہیں جنہیں تم نہیں جانتے' اللہ انھیں جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ظاہر اور چھپے دشمنوں کی خبر دیکر **اَعِدُّوْا** کا دائمی حکم دیدیا ہے کہ تمہاری اسلحہ فیکٹریوں میں مسلسل دن

رات اسلحہ تیار ہوتے رہنا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ آئے دن نیا اور جدید اسلحہ تیار کرنے کا حکم دیدیا گیا ہے کیونکہ پرانی بندوقوں اور چھوٹی چھوٹی توپوں سے دور مار میزائیلوں والا دشمن کس طرح دبل سکتا ہے۔ امید ہے کہ اہل اسلام خصوصاً اسلامی حکومتیں اسلحہ سازی کی طرف خصوصی رجوع فرمائیں گی۔ **وما علینا الا البلٰغ۔**

ایک آخری اہم سوال ○ اللہ کے رسولوں سلام علیہم اور ابراہیم و لوط سلام علیہما کے مہمانوں کے متعلق آخری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے مقتدر رسل انبیاء ہی تھے۔ تو اس چیز کا کیا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے بیٹوں اور پوتے کی بشارت براہِ راست آپ پر کیوں نازل نہ کر دی' جبکہ السید ابراہیم سلام علیہ خود ایک اولوالعزم نبی تھے۔ اور ان پر زندگی بھر وحی الٰہی کا نزول جاری رہا تھا۔ دوسرے رسولوں کے ذریعہ خوشخبری کیوں بھیجی گئی؟

اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کی اساس پر یہ ہے کہ اس کا ہر کام وقتی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً یعقوب اور یوسف سلام علیہما دونوں نبی تھے۔ مگر یوسف سلام علیہ کے زندہ سلامت اور صاحب اقتدار ہونے کی خبر اللہ تعالیٰ نے آپ کو براہ راست نہ بھیجی۔ بلکہ دوسرے نبی یوسف سلام علیہ کے ذریعہ بھجوائی۔ حالانکہ یعقوب سلام علیہ کم از کم بیس سال سے فراق فرزند میں مضطرب و بے قرار وقت گزار رہے تھے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ یوسف سلام علیہ کے کندھوں پر قیام نظام ربوبیت کی چودہ سالہ ذمہ داری آپڑی تھی۔ جب تک چودہ سال پورے نہ ہو جاتے اور غلے کا بے لوث کنٹرول اہل عالم کے سامنے عملاً" نہ مکمل ہوجاتا ہے' کہ نہ صرف ملک مصر میں آپ نے چودہ سال کے طویل عرصہ میں برابر غلہ مہیا فرمایا' بلکہ دور دراز سے جو قحط زدہ لوگ غلہ لینے آتے' انہیں بھی بلا تمیز ملکی اور غیر ملکی غلہ مہیا کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ جن لوگوں کے پاس غلہ خریدنے کے لیے قیمت موجود نہ ہوتی' انہیں صدقہ کی مد سے غلہ دیا جاتا رہا۔

جب چودہ سال پورے ہوگئے اور نزدیک و دور کے ہر حاجت مند کو یوسف سلام علیہ نے غلہ مہیا بھی کر دیا اور ابھی سٹاک میں گوداموں کے گودام بھی بھرے پڑے تھے تو آپ اس الٰہی امتحان میں سو فیصد نمبروں کے ساتھ پاس ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی یوسف سلام علیہ کی معرفت اپنے نبی یعقوب سلام علیہ کو عہدہ عزیز مصر کی وردی کی قمیض بھجوا کر مطلع کیا کہ آپ کا بیٹا نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ عہدہ عزیز مصر پر فائز رہ کر نظام ربوبیت کے چودہ سالہ کنٹرول کی وہ اہم خدمت بھی انجام دے چکا ہے جسے شاہ مصر کی کابینہ کے گیارہ ستارے اس کا عزیز مصر (وزیر اعظم) اور خود شاہ مصر سمجھنے تک سے قاصر رہے تھے۔ ملک مصر کا آفتاب (شاہ مصر) بلک مصر کا چاند (وزیر اعظم) اور مصر کی کابینہ کے گیارہ ستارے سب کے سب یوسف سلام علیہ کے سامنے سجدہ ریز یعنی (ان کے مطیع) ہو چکے ہیں۔

جس طرح یعقوبؑ نبی کو بیٹے کی زندگی اور کامیابی کی خوشخبری براہ راست بذریعہ وحی نہیں دی گئی تھی اسی طرح ابراہیم سلام علیہ کو دو بیٹوں اور ایک پوتے کی خوشخبری براہ راست نہ دی گئی۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ جناب خلیل نے دعا فرمائی تھی۔ **رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ** ○۱۰۰/۳۷ اے میرے پروردگار مجھے صالحین میں سے ایک بیٹا عطا فرما۔ لیکن ادھر بوڑھے میاں بیوی پر رحمت باری اسقدر جوش میں آئی کہ بیک وقت دو بیٹوں اور ایک پوتے کی خوشخبری کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اب ایک بڑھیا کیلئے ایک بیٹے کی خوشخبری پر تعجب کرنا لازمی امر تھا۔ چنانچہ مائی صاحبہؓ مسکرا پڑیں کہ اب بڑھیا بیٹا جنے گی۔ اس پر ایک اور بیٹے اور ایک پوتے کی بھی عین حیات کی خوشخبری دیدی گئی۔ جس سال خوردہ خاتون کو ایک بیٹے کے جننے پر تعجب تھا' اسے بتایا گیا کہ آپ ایک اور بیٹا بھی جنیں گی اور عین حیات پوتا بھی دیکھیں گی۔ اس پر مائی صاحبہؓ نے فرمایا **يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ط اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ** ۷۲/۱۱ اس پر اپنے رسولوں کے ذریعہ وحی

کی گئی۔ اَتَعۡجَبِیۡنَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَ بَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ ؕ اِنَّہٗ حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ ۷۳/۱۱ اے خاتون! کیا تو اللہ کے قانون پر تعجب کرتی ہے۔ اے ابراہیم کے گھر والو! تم پر اللہ کی رحمت و برکت ہے (تم دونوں میں قوت تولید پیدا کر دینا اللہ کے قانون کے لیے کچھ مشکل نہیں) بلاشبہ اللہ بے حد تعریفوں والا اور بہت بڑی شانوں والا ہے۔

ادھر یعقوب سلام علیہ کے لئے بھی خوشخبری کا معاملہ تھا جو یعقوبؑ کی طرح بالواسطہ دی گئی۔ ادھر یعقوبؑ کا تخمینہ یہ تھا کہ یوسفؑ کی خوشخبری آیا ہی چاہتی ہے۔ چنانچہ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ بالفاظ دیگر آپ خوشخبری کے منتظر بیٹھے تھے کہ خوشخبری آگئی۔ اسی طرح ادھر ابراہیم سلام علیہ ایک فرزند کے لئے دعا کر کے (۳۷/۱۰۰) منتظر تھے کہ دعا یقیناً منظور ہوگئی۔ چنانچہ یہ خوشخبری بھی براہ راست نہیں بلکہ اس طرح بالواسطہ بھیجی گئی کہ آپ نے اہلیہ محترمہ کا تبسم ملاحظہ فرمایا۔ اور اس پر جب ایک اور بیٹے اور ایک پوتے کی مزید خوشخبری دی گئی تو بیوی لگاتار دو بیٹے جننے پر **یٰوَیۡلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوۡزٌ وَّہٰذَا بَعۡلِیۡ شَیۡخًا**" کے الفاظ کہنے میں جو خوشخبری کا کیف مائی صاحبہ کے ذہن میں پیدا ہوا اور ان الفاظ کے سننے میں جو ذہنی سرور ابراہیم سلام علیہ کو میسر آیا تھا وہ براہ راست وحی آنے میں کب میسر آسکتا تھا۔ کیونکہ براہ راست وحی میں نہ مائی صاحبہؓ کے مسکرانے اور نہ کیے بعد دیگر دو بیٹوں کے جننے کی خبر پر میاں بیوی کے بوڑھے ہونے کی شکایت کا لطف آسکتا تھا۔ حضور باری تعالیٰ میں دعا کرنے والے ابراہیم سلام علیہ اپنی مردی طاقت سے بھی بخوبی باخبر تھے' اور اہلیہ محترمہ کے متعلق بھی خوب جانتے تھے' اسی لئے تو دعا فرمائی تھی۔ جو عارضی رکاوٹ موجود تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کے مطابق رفع کر دی اور کیے بعد دیگر دو بیٹوں کی خوشخبری براہ راست نہیں' بلکہ مذکورہ بالا کیف پیدا کرنے کے لئے بالواسطہ بھیجی۔ ادھر قوم لوط کی بد اعمالیوں کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ ان پر کنکروں کے پتھر برسانے کے لیے اپنے مقتدر رسولوں کو بھیجا اور حکم دیا کہ راستے میں ابراہیم سلام علیہ کو دو بیٹوں اور ایک پوتے کی خوشخبری بھی دیتے جانا۔

قوم لوطؑ پر آپ نے بھیجے ہوئے رسولوں کے ذریعہ مٹی کے پکے ہوئے کنکروں کے نشان کندہ پتھروں کو بارش کی طرح برسا کر تباہ کرنے کی خبر دینے کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں قوم شعیب کی بد اعمالیوں اور ان پر لائے گئے عذاب کا ذکر کر کیا گیا ہے۔

وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاہُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ وَّاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ ﴿۸۴﴾

(۸۴) اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو اپنا رسول بنا کر بھیجا۔ انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرو تمہارے لئے اس کے سوا کوئی اور فرمانبرداری کے لائق نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ بیشک میں تمہیں آسودہ حال دیکھتا ہوں اور میں تمہارے ناپ تول کی کمی کی بدولت تمہارے لئے گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

ہر نبی کا پہلا وعظ قوم کو اکیلے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا ہوتا تھا۔ چنانچہ شعیب نے بھی اپنی قوم کو **اعبُدوا اللّٰہ مَالَکُم مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہ** کی تبلیغ فرمائی۔ **اعبدوا اللّٰہ** کا عموی معنی یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو عبادت کا معنی فرمانبرداری کرنا ہے۔ چنانچہ:۔

وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی عبادت یعنی فرمانبرداری ہے جو کوئی ناپ تول میں کمی کرتا ہے وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتا خواہ وہ رات بھر اللہ اللہ حو حق کی ضربیں لگاتا

رہے۔

اِنِّىْ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ کے جملہ میں بخیر کا معنی ہے مالدار' آسودہ حال۔ اس کا لفظی معنی ہے ساتھ خیر کے یعنی خیر والے اور خیر کا معنی سورۃ بقرہ میں بتا دیا گیا ہے مال۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ ۱۸۰/۲ جب تم میں سے کسی پر موت کا وقت آجائے تو اس پر وصیت کرنا فرض کیا گیا ہے اگر اس نے اپنے پیچھے خیر یعنی مال چھوڑا ہو۔

شعیبؑ کی قوم اہل مدین کے مذکورہ بالا حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے تاجر پیشہ لوگ ناپ میں کمی کے ذریعہ مالدار ہو چکے تھے لیکن اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ کے جملہ میں السید شعیبؑ نے بحکم الٰہی ان پر واضح کر دیا کہ جو مال عوام کی جیبیں کاٹ کاٹ کر اکٹھا کیا جائے اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ بالآخر یقیناً ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ اس کی سزا اس جرم کے مرتکب افراد کو گھیر لیتی ہے۔ اگلی دو آیات مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم شعیب ناپ میں کمی کرنے کے ساتھ مومن ہونے کی دعویدار بھی تھی۔ اور صلوۃ موقت کی بھی بڑی پابند تھی۔ آپ نے ان سے کہا۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾

(۸۵) اور اے میری قوم (دو بارہ سن لو) پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے کرو۔ اور لوگوں کی چیزیں (کم ناپ کر اور کم تول کر) کم نہ دیا کرو۔ اور زمین میں فساد پھیلاتے ہوئے آگے نہ بڑھو۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

(۸۶) اگر تم (واقعی) مومن ہو تو تمہارے لئے اللہ کے ہاں باقی رہنے والا (حلال مال) بہتر ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں (میرا کام صرف سمجھانا ہے)۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ قوم شعیب بڑی شدت کے ساتھ مومن ہونے کی دعویدار تھی۔ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ کم ناپنا اور کم تولنا مومنوں کا کام نہیں اگر تم واقعی مومن ہونے کے دعوے میں سچے ہو تو تمہارے لئے اتنا نفع کافی ہے جو پورے ناپ تول کے ذریعہ میسر آئے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی کے ہاں وہی مقبول ہے اور توشہ قیامت کے طور پر اس کے ہاں باقی رہنے والا بھی ہے۔

قوم شعیبؑ نمازی بھی تھی

اگلی آیت مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شعیب سلام علیہ کی قوم کے کم ناپ تول کے عامل لوگ نہ صرف یہ کہ وہ مومن ہونے کے زبانی زبانی دعویدار تھے' بلکہ وہ پکے نمازی بھی تھے۔ شعیبؑ بھی صلوۃ گزار تھے آپ بھی ایک تاجر تھے۔ مگر آپ اپنی صلوۃ کے حکم کے مطابق پورے ناپ اور پورے تول کے ذریعہ خود بھی حلال نفع کماتے تھے اور اپنے ہم پیشہ باقی تاجروں کو بھی پورے ناپ تول کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔

صلوٰۃ اور نماز میں فرق

جیسا کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ نماز کے پڑھنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں یہ ایک روایت کی بنا پر ہے کہ "جب تم رات بھر آگ کا کام کرتے ہو (گناہ کرتے ہو) اور پھر نماز فجر پڑھتے ہو تو وہ تمہیں ٹھنڈا کر دیتی ہے یعنی تمہارے گناہ معاف

کر دیتی ہے اور پھر تم نماز فجر سے نماز ظہر تک آگ کے کام کرتے ہو تو نماز ظہر کے پڑھنے سے تمہارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور پھر نماز عصر تک کے کئے ہوئے گناہ نماز عصر کے پڑھنے سے معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نماز مغرب اور نماز عشاء کے پڑھنے سے بھی۔ اسی طرح قوم شعیب بھی صلوۃ موقت کو آج کل کی نماز میں تبدیل کر چکی تھی۔ جس طرح نماز (پوجا پاٹ) کا تصور یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ---- اس کے برعکس صلوۃ کی ادائیگی کا تقاضہ یہ ہے کہ صلوۃ ادا کرنے والا خود برائیوں اور گناہوں سے رکے اس لئے جب شعیبؑ نے کہا کہ صلوۃ قائم کرو صلوۃ برائیوں اور گناہوں سے روکتی ہے (گناہ بخشواتی نہیں) تو انہوں نے انتہائی حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝

(۸۷) انہوں نے کہا' اے شعیبؑ کیا تیری صلوۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان لوگوں کی اطاعت ترک کر دیں' جن کی ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے۔ اور (اس طرح) ہم وہ عمل چھوڑ دیں جو ہم اپنی مرضی کے مطابق اپنے مالوں میں (کم ناپ تول کے ذریعہ) کرتے ہیں۔ بیشک تو بردبار بھی ہے اور سمجھ دار بھی ہے۔

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ کا لفظی معنی ہے کیا تیری صلوۃ تجھے حکم دیتی ہے۔ اگلی آیت میں آپ دیکھیں گے کہ شعیب سلام علیہ نے قوم کے تاجروں کے اس تصور کی نفی نہیں کی' بلکہ اسے تسلیم کیا ہے۔ کہ صلوۃ واقعی حکم دینے والا فریضہ ہے' جیسے کہ ۲۹/۴۵ میں اللہ کا ارشاد ہے **اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ** بیشک **الصَّلٰوة** بے حیائیوں اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ پس صلوۃ موقت کا جو تصور انبیاء سلام علیہم نے دیا تھا اور جو اس وقت قرآن کریم ۲۹/۴۵ میں محفوظ ہے وہ صرف یہی ہے کہ صلوۃ حکم دیتی ہے کہ ہر قسم کی بے حیائیوں اور ہر قسم کے برے کاموں سے رک جاؤ لیکن آپ کے مخاطب تاجروں نے اپنے آباؤ اجداد سے جو عقیدہ پایا تھا اس کے مطابق صلوۃ موقت کو نماز میں تبدیل کر چکے تھے اور یہ عقیدہ ان کے آباؤ اجداد کو ان کے باطل پیشواؤں نے دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ سوال بھی انتہائی حیرت و تعجب کے ساتھ کیا۔

اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ کہ کیا' ہم ان بزرگوں کی اطاعت چھوڑ دیں' جن کی ہمارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے؟ یہ تصور کہ نماز گناہ بخشوا دیتی ہے' نذریں نیازیں بٹورنے والے پیشواؤں کا پیدا کردہ ہے' چونکہ شعیب سلام علیہ نے ان کے بزرگوں کے دیئے ہوئے اس نظریے کی مخالفت فرمائی' اس لئے انہوں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں سوال کیا کہ کیا اتنے بڑے بڑے بزرگ غلط تھے جنہوں نے نماز کی گوناگوں فضیلتوں میں سے ایک فضیلت یہ بھی بتائی ہے کہ ایک نماز کے بعد دوسرے وقت کی نماز تک کے وقفے میں جو گناہ کئے جاتے ہیں وہ اگلی نماز پڑھنے سے معاف ہو جاتے ہیں تو گویا ان کے لئے ان کے بزرگوں کی مسلمہ بزرگی' اس مبنی بر حقیقت و انصاف نظریہ "کہ صلوۃ گناہ بخشواتی نہیں بلکہ گناہوں سے روکتی ہے" کو تسلیم کرنے میں حائل ہو گئی تھی۔

اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کے الفاظ میں انہوں نے اپنے بزرگوں کی دی ہوئی رعایت کو ترک کرنے پر تعجب ظاہر کیا' کہ ہم جو باستی میں پر مل کی ملاوٹ کر کے مال کماتے ہیں یا کم ناپ تول کے ذریعہ بہت زیادہ نفع حاصل کر لیتے ہیں اسے چھوڑ دیں؟

آخر پر انہوں نے کہا **اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ** کہ اے شعیب آپ بڑے بردبار بھی ہیں اور سمجھ دار بھی

ہیں' کیا آپ اس ظاہر نفع اندوزی کی چھٹی نہیں دے سکتے۔ سمجھ داری اور بردباری تو یہی ہو سکتی ہے کہ جن قدیمی بزرگوں کے دیئے ہوئے تصور کے مطابق ہم لوگ آباؤ اجداد سے اس قدیمی طریقے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرتے آئے ہیں کرتے چلے جائیں۔۔۔۔۔ اس کے جواب میں شعیبؑ نے فرمایا' میں رب تعالیٰ کے سیدھے راستے پر چل رہا ہوں پورا ناپتا ہوں' پورا تولتا ہوں' ملاوٹ نہیں کرتا۔ میرا پروردگار تمہاری نسبت مجھے بہتر رزق عطا فرما رہا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۸۸

(۸۸) شعیبؑ نے فرمایا اے میری قوم کیا تم دیکھتے ہو کہ بیشک میں اپنے رب کی طرف سے دلائل قاطعہ پر ہوں (پورا ناپتا اور پورا تولتا ہوں) اور میرا پروردگار مجھے (تمہاری نسبت) بہتر رزق عطا فرماتا ہے میں ارادہ نہیں رکھتا کہ جس چیز سے تمہیں منع کرتا ہوں' خود اس کی مخالفت کروں۔ میں نہیں ارادہ کرتا مگر حسب استطاعت اصلاح کا ارادہ کرتا ہوں۔ اور میری نہیں توفیق مگر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ میں اِنْ شرطیہ نہیں بلکہ اِنَّ کا مخفف بمعنی بیشک ہے۔ اِنْ بلا ورود اِلَّا برائے تحقیق و تاکید کی بحث پیچھے آیت نمبر ۱۱/۶۳ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ کے الفاظ میں شعیب علیہ السلام نے قوم کو چیلنج کیا کہ دیکھ لو کہ میں اپنے رب کے حکم کے مطابق پورا ناپ تول رکھتے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف سے دلائل قاطعہ پر ہوں۔ دنیا کا کوئی باہوش انسان کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ کم ناپ تول کے ذریعہ عوام کی جیبیں کاٹنا درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا کے الفاظ میں شعیبؑ نے کم ناپنے اور تولنے والوں پر اپنا مشاہدہ پیش کیا تھا کہ دیکھ لو میرا رب مجھے رزق حسنہ دے رہا ہے۔ یعنی ایسا رزق جو حلال بھی ہے اور میری ضرورتیں بھی ساری کی ساری اسی سے پوری ہو رہی ہیں۔ واضح رہے کہ رزق حلال اگرچہ حرام مال کے مقابلے میں مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے مگر جب اسے جائز مقامات پر خرچ کیا جاتا ہے' تو بلاشبہ اس سے سکون قلب بھی میسر آتا ہے اور جائز ضرورتیں بھی سب پوری ہوتی چلی جاتی ہیں اس کے برعکس کم ناپ تول اور ملاوٹ وغیرہ کے ذریعہ حاصل کردہ مال اگرچہ مقدار میں زیادہ ہوتا ہے' مگر چونکہ وہ ناجائز طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے اس لئے وہ ناجائز مقامات پر اسراف بے جا کی نذر ہو جاتا ہے' اس لئے اس سے سکون قلب نصیب نہیں ہوتا۔ اور ضرورتیں بھی اس لئے پوری نہیں کر سکتا کیونکہ نہ اسراف بے جا کسی حدود میں محدود ہو سکتا ہے' اور نہ جائز ضرورتوں کی کوئی حد مقرر ہو سکتی ہے۔

مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ کے جملہ میں شعیبؑ نے قوم سے ارشاد فرمایا کہ میرا یہ ارادہ نہیں کہ میں تمہیں تو کم ناپ تول کے فائدہ بخش کاروبار سے روک دوں اور خود اس میں لگا رہوں۔ انبیاء سلام علیہم کا دائمی شعار یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے خود پہلے نمبر کے فرمانبردار ہوا کرتے تھے۔ جیسے نبی اکرمؐ سلام علیہ کا اقرار قرآن مجید میں موجود و محفوظ ہے **وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ** ۳۹/۲

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ انبیاء سلام علیہم کے ذمہ اصلاح معاشرہ کا کام ہوتا تھا جسے وہ استطاعت بھر انجام دیتے تھے ان کے ذمہ اللہ کا پیغام پہنچانا' اس پر خود عمل کرنا اور جو لوگ ایمان لائیں ان سے

عمل کرانا ہوتا تھا۔ جن انبیاء کے ساتھ صحابہ کی جماعت شامل ہوتی ان کی حکومت قائم ہو جاتی تھی اور حکومتی اثرات کی بدولت پورا معاشرہ اصلاح بد اماں ہو جاتا ورنہ وہ استطاعت سے زیادہ کے مکلف نہیں تھے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں توکل کا معنی ہے بھروسہ کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کا مطلب ہے اس کے قانون پر پورا پورا اعتماد کرکے اس پر صد فیصد عامل ہو جانا۔ کیونکہ اللہ کا قانون کبھی دھوکا نہیں دیتا۔ اس کے قانون کی عملی مخالفت اور زبانی توکل علی اللہ، توکل کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس سے آگے جو **وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ** کے الفاظ آئے ہیں ان میں **انابت الی اللّٰہ** کا یہ مطلب نہیں کہ گردن جھکا کر مراقبے میں بیٹھ جائیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین جاریہ کے ساتھ ساتھ چل کر خلاق عالم کے تنزیلی احکام کے مطابق زندگی گزار دی جائے۔
شعیب سلام علیہ نے اسی چیز پر عمل کیا اور اسی عمل کا اقراری اعلان فرمایا۔ لیکن:

اس عملی اور تبلیغی اعلان کے باوجود قوم نے آپ کی نصیحت پر کان نہ دھرے اور کم ناپ تول سے باز نہ آئے۔ بلکہ شعیبؑ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس پر آپ نے قوم سے کہا کہ تم سابقہ اقوام کی طرح عذاب الٰہی کے خود مستحق نہ ہو جاؤ۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝

(۸۹) (شعیبؑ نے فرمایا) اور اے میری قوم تمہیں میری مخالفت اس چیز کا مجرم نہ کر دے کہ تم پر ویسا ہی عذاب آجائے جو قوم نوحؑ پر آیا تھا، یا قوم ھود یا قوم صالحؑ پر آیا تھا اور قوم لوط تو تم سے کوئی دور نہیں ہے (وہ تو تمہارے قریب کے زمانے میں گزری ہے)

انبیاءؑ کی مخالفت سے عذاب کی آمد لازم ہو جاتی تھی۔ کیونکہ انبیاء کی براہ راست تبلیغ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف اتمام حجت ہو جاتی تھی۔ اور اللہ کے نبیوں کی کھلی پہچان یہ ہوتی تھی کہ وہ قبل نبوت ہی سے معاشرہ کی غلاظتوں سے پاک ہوتے تھے۔ یعنی ان کی قبل نبوت کی زندگی پر کسی کو انگشت نمائی کا موقعہ میسر نہیں آتا تھا۔ شخصی، معاشی اور معاشرتی ہر لحاظ سے وہ عوام ہی کے فرد بن کر رہتے تھے حتیٰ کہ اگر حکومت بھی میسر آجاتی تو پھر بھی ان کی یہ حالت ہوتی تھی کہ عوامی کھانا کھاتے اور سودا سلف خریدنے کے لئے خود بازاروں میں تشریف لے جاتے تھے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق آپ کے مخالفوں کا متعجبانہ قول سورۃ فرقان میں درج ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۲۵/۷ اور انہوں نے کہا یہ کیسا رسول ہے جو عوامی کھانا کھاتا ہے اور سودا سلف خریدنے کے لئے خود بازار جاتا ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ الفرقان میں خود نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے یہ دیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۲۵/۲۰ اور اے رسولؐ ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے اپنے رسولؐ مگر وہ سب کے سب عوامی کھانے کھاتے تھے اور سودا سلف خریدنے کے لئے خود بازاروں میں جاتے تھے۔ اس آیت مجیدہ میں مانافیہ اور **اِلَّا اثبات** کا آیا ہے اور المرسلین میں داؤد اور سلیمان سلام علیہما بھی شامل ہیں، جنہیں عظیم سلطنت میسر تھی، اس حصریہ جملے میں بتایا گیا ہے کہ وہ بھی عوامی کھانا کھاتے تھے اور سودا سلف بھی خود لایا کرتے تھے۔ یعنی سربراہ سلطنت ہوکر بھی عوامی زندگی گزارتے تھے۔ تو اس طرح انبیاءؑ کی آسان ترین پہچان ہوتی تھی ان کی سادہ اور بے لالچ زندگی۔ اس کے باوجود جب قومیں اپنے نبیوں کی مخالفت کرتی تھیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب لازم ہو جاتا تھا۔ یہی چیز شعیب سلام علیہ نے اپنی قوم پر واضح فرمائی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری

مخالفت کی بدولت تم بھی سابقہ اقوام، قوم نوح، قوم ھود، قوم صالح اور قوم لوط کی طرح عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاؤ۔ قوم لوط کے متعلق آپ نے خاص طور پر فرمایا کہ وہ تو ابھی قریب ہی زمانے میں گزری ہے اس کی بستی جو مٹی کے پکے ہوئے نشان کندہ پتھروں کی بارش برسا کر برباد کی گئی تھی، اس کے تو کھنڈرات بھی ابھی تمہارے سامنے موجود ہیں۔ ساتھ ہی آپ نے انہیں عذاب سے محفوظ رہنے کا نسخہ بھی بتا دیا کہ توبہ کرکے باز آجاؤ اور اللہ سے مغفرت طلب کرو۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

(۹۰) اور مغفرت طلب کرو اپنے پروردگار سے پھر اس کے حضور توبہ کرو۔ بیشک میرا پروردگار بے حد مہربان اور محبت کرنیوالا ہے۔

قوم پر آپ کی مشفقانہ نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور کہنے لگے ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ ہم آمدنی سے کس طرح دستکش ہو جائیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے اندر کمزور ہے کیونکہ ہماری طرح ناپ تول میں کمی کرکے زائد کمائی حاصل نہیں کرتا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝۹۱

(۹۱) انہوں نے کہا اے شعیبؑ ہم تیری اکثر باتوں کو جو تو کہتا ہے نہیں سمجھتے۔ اور ہم تجھے اپنے اندر کمزور دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہاں پر تیرے بھائی بند نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو ہم پر غالب نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شعیب سلام علیہ انہیں ہر وقت کم ناپ تول سے روکتے رہتے تھے اس لئے وہ آپ سے اس قدر تنگ آچکے تھے کہ اگر ان کے اور بھائی بندے موجود نہ ہوتے تو انہیں پتھر مار مار کر مار ڈالتے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۹۲

(۹۲) آپ نے فرمایا اے میری قوم کیا میرے بھائی بندوں کا لحاظ تمہارے لئے، اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہے۔ تم نے اسے تو پیٹھ پیچھے ڈال رکھا ہے (لیکن یاد رکھو) میرا پروردگار ان عملوں کو گھیرنیوالا ہے جو تم بجا لاتے ہو۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝۹۳

(۹۳) (آپ نے مزید فرمایا) اے میری قوم (میری طرف سے اتمام حجت ہو چکی اب) تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں تم ضرور جان لوگے کہ کسے رسوا کن عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے (نتیجے کا) تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنیوالا ہوں۔

شعیبؑ اور آپ کی قوم کا باہمی معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ آپ کی سیدھی سادی بات کو بھی جو آپ انہیں کم ناپ تول کے تنگ زباں اور تنگ انسانیت فعل سے منع کرتے تھے، انہوں نے کہہ دیا کہ تیری یہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لوگ سمجھتے ہی نہیں تھے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کس کام سے منع کر رہے ہیں، بلکہ ان کا یہ جواب کہ ہماری سمجھ میں تیری باتیں نہیں آتیں، ان کی انتہائی سرکشی اور اللہ تعالیٰ سے کھلی بغاوت کا مظہر تھا۔ یعنی وہ اپنی حرام نفع اندوزی کے مقابلے پر نہ کسی انسانی اصول کی پروا کرتے تھے، نہ اللہ کے احکام کی اور نہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسولؑ کی۔ اس لئے اب۔

وہ وقت آگیا کہ عذاب الٰہی آیا ہی چاہتا تھا چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں ان پر لائے گئے عذاب کی مختصر سی جھلک دکھائی گئی ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

(۹۴) اور جب ہمارا (عذاب کا) حکم آگیا تو ہم نے شعیبؑ کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت کے ساتھ عذاب سے بچا لیا۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں ایک آواز نے پکڑ لیا پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

(۹۵) گویا کہ وہ اس بستی میں کبھی تھے ہی نہیں۔ خبردار اہل مدین کے لئے (اللہ تعالٰی سے) دوری ہے جس طرح قوم ثمود کو (اللہ سے) دوری ہے۔

سورۃ شعرآء

قوم شعیبؑ کا تذکرہ اعراف، ھود، حجر، شعرآء اور عنکبوت میں بھی آیا ہے۔ سورۃ شعرآء عنکبوت اور اعراف کے حوالے پیش خدمت ہیں۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۝ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۴ تا ۱۷۶)

(مفہوم) بن والوں نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا۔ وہ وقت قابل ذکر ہے جب شعیبؑ نے فرمایا کہ کیا تم اللہ کی مخالفت سے بچتے نہیں۔ بیشک میں تمہاری طرف امانت دار رسول ہوں۔ پس تم اللہ تعالٰی کی مخالفت سے بچو اور میری اطاعت کرو۔ میں تم سے اجر تبلیغ نہیں مانگتا۔ میرا اجر رب العلمین کے ذمہ ہے۔ اپنے ناپ دینے کے پیمانے پورے کرو اور لوگوں کو نقصان دینے والے نہ بنو۔ سیدھے ترازو کیساتھ تولا کرو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کیا کرو۔ اور اس طرح زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اور اس ذات کی مخالفت سے بچو، جس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جس نے ابتدائی مخلوق کو بھی پیدا کیا تھا ــــــ اس کے جواب میں قوم نے کہا۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (۲۶/۱۸۵ تا ۱۸۷) انہوں نے کہا کہ تو فریب خوردہ ہے (تو اللہ کا رسول نہیں) تو ہمارے جیسا ایک بشر ہے۔ ہم نہیں یقین کرتے مگر یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرا دے اس پر شعیبؑ نے ارشاد فرمایا۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ۲۶/۱۸۸ آپ نے فرمایا میرا رب خوب جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔ نتیجہ کے طور پر ارشاد ہوا ہے۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ ۲۶/۱۸۹ انہوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا۔ پھر انہیں چھا جانے والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا، بیشک وہ (بڑے اور نہ ٹلنے والے) دن کا عذاب تھا۔

سورۃ عنکبوت

سورۃ عنکبوت میں ارشاد ہوا ہے وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۲۹/۳۶ اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو اپنا رسول بنا کر بھیجا۔

اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی فرمانبرداری کرو اور قیامت کے دن کی امید رکھو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو--- مگر ہوا یہ --- فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ○ پس انہوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا۔ پھر انہیں زلزلے نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۲۹:۳۷

سورۃ اعراف

سورۃ اعراف میں بھی قوم شعیب کی سرکشی اور ان کا انجام اس طرح بیان ہوا ہے۔ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِن قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا (۷:۸۸) آپ کی قوم کے سردار جنہوں نے تکبر کیا' یہ کہا کہ اے شعیب ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں' اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ اور یا تم سب ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ گے ---- اس سے آگے انہی سرداروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ ○ ۷:۹۰ اور آپ کی قوم کے جن سرداروں نے آپ کی تعلیم کا انکار کیا' انہوں نے اپنے عوام کو کہا کہ اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کی تو تم نقصان اٹھانیوالے ہو جاؤ گے (ہماری پوری قوم تمہیں نقصان پہنچائیگی) لیکن اس سرکش قوم پر اللہ کا عذاب آگیا چنانچہ ارشاد ہوا ہے فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ○ الَّذِينَ كَذَّبُوا شُعَيْبًا كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۷:۹۲ پھر انہیں زلزلے نے پکڑ لیا۔ پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا وہ اس طرح ہو گئے گویا کہ وہ کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔

پیچھے ۱۱/۹۱ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ شعیبؑ کو قوم نے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر یہاں تیرے بھائی بند موجود نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے پتھر مار کر مار ڈالتے اور یہاں ۷:۸۸ میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ قوم کے سرکش و متکبر سرداروں نے دھمکی دی تھی کہ یا تو شعیب اور ان پر ایمان لانیوالے سب لوگ واپس ہمارے پرانے آبائی مذہب میں لوٹ آئیں ورنہ ہم انہیں سب کو اپنی بستی سے نکال دیں گے' ملک بدر کر دیں گے لیکن یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو ضرور ضرور کامیاب کرتا رہے گا۔

كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۵۸:۲۱ اللہ تعالیٰ نے فرض کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور ضرور غالب رہیں گے بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت قوت والا اور بہت بڑھ کر غالب ہے۔ اگرچہ شعیبؑ کے ساتھ بہت تھوڑے اور غریب لوگ شامل ہوئے تھے اور پوری قوم سمیت بڑے بڑے سردار قتل اور ملک بدر کر دینے کی دھمکیاں دے چکے تھے اس طرح بڑے بڑے سرداروں کے مقابلے پر کامیابی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی مگر ۵۸:۲۱ اللہ کے وعدے کے مطابق اللہ کا نبی مع اپنی جماعت کے غالب آیا اور پوری قوم ان کی آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد اور ختم ہو کر رہ گئی۔

سَلَامٌ عَلَىٰ شُعَيْبٍ

عذاب کی تفصیل

اہل مدین کے متعلق اب آخری سوال یہ ہے کہ ان پر لائے گئے عذاب کی شکل کیا تھی جبکہ سورۃ ھود میں آیا ہے وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ کہ ان ظالموں کو ایک زور کی خطرناک آواز نے پکڑ لیا اور سورۃ اعراف اور سورۃ

عنکبوت ۲۹/ ۳۷+۷/ ۹۱ میں **فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ** کے الفاظ آئے ہیں' کہ انہیں زلزلے نے پکڑا تھا۔ جواباً" عرض ہے کہ جب تصریف آیات سے ایک ہی قوم شعیبؑ کے عذاب کے لئے رجفہ بھی آیا ہے۔ اور صیحہ بھی آیا ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ یہ ایک ہی عذاب کی دو صورتیں ہیں یعنی ایسا زلزلہ جس میں زور کی آواز بھی موجود تھی۔ زلزلے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ زمین کا اندرونی لاواجب داخلی طور پر کھولتا ہے تو بعض دفعہ کسی پہاڑ کا کوئی حصہ یکدم پھٹ جاتا ہے اور لاو کے زور کی مقدار کے مطابق چھوٹا بڑا زلزلہ آتا ہے لیکن جب زمین کا لاوا کسی پہاڑ کی چوٹی میں سوراخ کرکے زور سے نکلتا ہے تو زلزلہ بھی آتا ہے اور خوفناک آواز بھی پیدا ہوتی ہے' اہل مدین پر ایسے ہی زلزلہ کا عذاب آیا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ اس عذاب سے شعیبؑ اور آپ کے ساتھیوں کو کس طرح بچایا گیا تھا اس کی تفصیل السید صالح اور ان کے صحابہ کے واقعات کے تحت گزر چکی ہے۔

اس کے بعد موسیٰؑ اور فرعون کا مختصر ذکر بالفاظ ذیل آیا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿٩٦﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ ۖ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ﴿٩٧﴾

(۹۶) اور بیشک ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں اور ظاہر سند (اپنی کتاب) کیساتھ

(۹۷) فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا حکم عقل و فراست پر مبنی نہ تھا۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ فرعون قیامت کے دن آگے آگے ہوگا اور اپنی قوم کو آگ کے کنارے لا کھڑا کرے گا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۖ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ ﴿٩٨﴾ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ﴿٩٩﴾

(۹۸) وہ قیامت کے دن قوم کے آگے آگے ہوگا اور انہیں آگ پر پہنچا رے گا۔ حقیقت یہ ہے وہ پہنچنے کی بہت بری جگہ ہے (وہ کیسی بری منزل ہے)

(۹۹) اور اس دنیا میں بھی اللہ کی بیزاری ان کے پیچھے لگی رہی تھی اور قیامت کے دن بھی (ان پر اللہ کی بیزاری ہوگی) اور بری سزا ہے جو انہیں بدلہ دیا جائیگا۔

لعنت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری۔ اس کی بیزاری اور پھٹکار وغیرہ
رفد کا معنی ہے بخشش اور انعام و اکرام وغیرہ۔ یہاں فرعون اور اس کی پیروی کرنے والوں کی بد اعمالیوں کی سزا کیلئے اسی طرح انعام و اکرام کا لفظ لایا گیا ہے جس طرح برے عمل کرنے والوں کے لئے **بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ** کے الفاظ قرآن کریم میں مستعمل ہیں کہ انہیں درد ناک عذاب کی خوشخبری دیدیجئے۔ ان آیات کریمات میں فرعون اور آل فرعون کے مختصر سے تذکرے اور ان سے دنیا و آخرت میں اپنی بیزاری' پھٹکار اور اخروی عذاب کے اعلان کے بعد ارشاد ہوا ہے:

(۱۰۰) (اے رسول) مذکورہ خبریں بد عملوں کی بستیوں کی ہیں جو ہم آپ پر بیان کرتے ہیں ان میں سے بعض (اپنی بنیادوں پر) کھڑی ہیں بعض اجڑی پڑی ہیں۔

نَقُصُّ کا سہ حرفی مادہ ق۔ ص۔ ص قصص ہے **قَصَّ يَقُصُّ** کا بنیادی معنی ہے اس کے پیچھے پیچھے چلنا جب اس کے

حرف جار علیٰ داخل ہو تو اس کا مفہوم ہوتا ہے کوئی گزرا ہوا واقعہ بیان کرنا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ ماضی کے واقعوں کے بیان کرنے کی صورت میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔

مِنْهَا قَآئِمٌ سے مراد یہ ہے کہ بعض بستیاں جن پر سخت آواز کا عذاب آیا ان کے رہنے والے ختم ہوگئے مگر وہ اپنی بنیادوں پر کھڑی رہیں انہیں بچے کھچے لوگوں نے دوبارہ آباد کر لیا۔

حَصِيدٌ کا سہ حرفی مادہ ح۔ ص۔ د= حصد ہے اس کا بنیادی معنی ہے کھیتی کو کاٹنا یا روند کر برباد کر دینا۔ جب یہ مادہ بستیوں کیلئے آتا ہے تو اس کا مفہوم ہوتا ہے بستیوں کا برباد ہو جانا۔ غرق ہو جانا۔ بعض شہروں' قصبوں یا گاؤں کا اپنی ارد گرد کی سطح زمین سے اونچا ہونا بزبان حال بتاتا ہے کہ وہ بستی عذاب الٰہی کیساتھ اجڑ گئی تھی اور اسی ڈھیر پر دوبارہ آباد ہوئی ہے۔ ہر ملک اور علاقے میں ایسی متعدد بستیاں پائی جاتی ہیں جو پرانی بستی کے ملبے کے ڈھیر پر آباد ہیں ہمارے ملک پنجاب میں سوہدرہ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ بطور مثال موجود ہے کہ جب کسی مکان کی تعمیر کیلئے گہری بنیادیں کھودی جاتی ہیں تو نیچے سے پرانی بستی کی بنیادیں بھی نکلتی ہیں اور غرق شدہ بستی کی مستعملہ چیزیں بھی برآمد ہوتی ہیں۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بستیاں ان میں رہنے والوں کی اپنی ظلم زیادتیوں اور بداعمالیوں کی بدولت تباہ ہوئی تھیں۔ وہ لوگ غیر اللہ سے مدد مرادیں مانگا کرتے تھے مگر انہوں نے ان کی کوئی مدد نہ کی:

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝۱۰۱

(۱۰۱) اور ایسی بستیوں والوں پر ہم نے ظلم نہیں کیا تھا۔ بلکہ انہوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کر لیا تھا جب تیرے رب کے عذاب کا حکم آگیا تو ان کے ٹھہرائے ہوئے مددگار' جن سے وہ اللہ کے سوا مرادیں مانگا کرتے تھے' ان کے کسی کام نہ آئے بلکہ انہوں نے خسارے میں ہی زیادہ کر دیا۔

اٰلِهَتُهُمْ کا لفظی معنی ہے ان کے الٰہ یہاں پر الٰہ کا مفہوم سیاق کلام کے مطابق وہ لوگ ہیں جنہیں ان قوموں نے اللہ کے سوا غیر اللہ کو غیبی مددگار ٹھہرا لیا ہوا تھا۔ کیونکہ ان ٹھہرائے ہوئے الاہوں کی یہ تعریف بتائی گئی ہے جن سے وہ لوگ اللہ کے سوا مرادیں مانگا کرتے تھے۔

يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے الفاظ میں یدعون مضارع حکائی کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ پکارتے تھے غیر اللہ کو اور پکارنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ غیر اللہ سے مدد مرادیں مانگا کرتے تھے۔ چونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہ غائبانہ پکار سن سکتا ہے اور نہ کسی کی غائبانہ مدد کو پہنچ سکتا ہے اس لئے قیامت کے دارالجزا میں انہیں آگ کے عذاب کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے مِنْ دُوْنِ اللہ کے دو معنی ہیں۔ پہلا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے سوا غیر اللہ سے مدد مرادیں مانگا کرتے تھے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ ملا کر ان سے مدد مرادیں مانگا کرتے تھے۔ جیسے کہ نصاریٰ مسیح و مریم کو اللہ کے ساتھ ملا کر تین الٰہ مانتے ہیں اور مسیح کو اللہ کے ساتھ ملا کر اس سے مدد مرادیں طلب کرتے ہیں سورہ مائدہ میں ہے:۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۵/۱۱۶ اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب قیامت کے دن اللہ کہے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں

کو اللہ کے ساتھ ملا کر دو اللہ اور بنا لو۔

اس آیت مجیدہ میں **مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** کا معنی اللہ کے سوا نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ ملا کر ثابت ہوتا ہے پس آیت زیر بحث ۱۰۱/۱۱ میں اہل نار کی یہ تعریف بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کو اللہ کے ساتھ ملا کر ان کے حضور میں دعائیں کیا کرتے یعنی مدد مرادیں مانگا کرتے تھے۔ پس لازم ہے اہل اسلام نہ اللہ کے ساتھ ملا کر اپنے کسی بزرگ سے مرادیں طلب کیا کریں نہ کسی اکیلے سے۔

لَمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ کی تقدیر کلام یہ ہے **لَمَّا جَآءَ اَمْرُ عَذَابِ رَبِّكَ** اور معنی یہ ہے کہ جب تیرے رب کے عذاب کا حکم آگیا تو ان کے ٹھہرائے ہوئے شریک ان کے کسی کام نہ آئے۔

وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ میں لفظ تتبیب کا سہ حرفی مادہ ت ب ب = تب ہے جس کا بنیادی مصدری معنی ہے ٹوٹنا تباہ ہونا۔ ٹوٹا یعنی خسارہ پانا۔ اس جملے میں خبر دی گئی ہے کہ غیر اللہ سے خواہ اللہ کے سوا مرادیں مانگی جائیں یا اللہ کیساتھ ملا کر مانگی جائیں تو دوسری زندگی میں مدد کیلئے پکارنے والوں کو دارالجزا میں فائدہ کی بجائے نقصان میں زیادتی نصیب ہوگی۔ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ جس طرح قوم نوح، قوم ھود، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب اور قوم فرعون کو ان کے جرائم کے بدلے پکڑ لیا گیا تھا اسی طرح جب بھی اللہ تعالیٰ کی پکڑ کسی بھی بستی کے ظالم لوگوں پر آتی ہے تو وہ رسوا کن اور انتہائی سخت ہوتی ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲

(۱۰۲) اور (اے رسولؐ) تیرے رب کی پکڑ ایسی ہے کہ جب وہ کسی بستی والوں کو پکڑتا ہے جبکہ وہ ظالم ہوتے ہیں تو بلاشبہ اس کی پکڑ انتہائی درد ناک اور انتہائی سخت ہوتی ہے۔

قیامت کا دن پوری نوع انسانی کو جمع کرنے اور سب کی حاضری کا دن ہے:۔ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا بیان میں ان لوگوں کے لئے ایک اہم نشانی ہے جو اس دنیا میں عملی طور پر آخرت کے اس دن سے ڈرتے ہیں جو پوری نوع انسانی کے جمع ہونے اور اعمال کی جوابدہی کیلئے حاضری کا دن ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝۱۰۳

(۱۰۳) بیشک مذکورہ بالا بیان میں اس شخص کیلئے ایک اہم نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے (یعنی نیک عمل بجا لاتا ہے) مذکورہ بالا دن اس (اللہ) کے حضور نوع انسانی کو (اعمال کی جوابدہی کیلئے) اکٹھے کئے جانے کا دن ہے اور مذکورہ بالا دن (اس کے حضور) حاضر کئے جانے کا دن ہے۔

يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ کے الفاظ میں قیامت کے دن کے متعلق اعلان کیا گیا ہے کہ اس دن پوری نوع انسانی کو دنیا کی زندگی میں کئے ہوئے اچھے برے اعمال کی جوابدہی اور ان کی جزا سزا کیلئے اکٹھا بھی کر لیا جائے گا اور **ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ** کے الفاظ میں خبر دی گئی ہے انہیں اس کے حضور حاضر بھی کر لیا جائیگا۔

پوری نوع انسانی کی قیامت کی بعثت:۔ قیامت کی بعثت کے متعلق ہر دور میں سوال کیا جاتا رہا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ لاکھوں سال قبل کے مردے جو مٹی میں مل کر مٹی ہو چکے ہیں سب کے سب زندہ کر لئے جائیں گے؟ زمانہ رسالت

کے لوگوں کا یہ سوال معہ جواب قرآن مجید میں متعدد مقامات پر درج ہے صرف چند مقامات بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ○ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً اَوْ حَدِيدًا ○ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۴۹-۵۱/۱۷ اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم جدید پیدائش میں پیدا کئے جائیں گے؟ اے رسول کہہ دیجئے گا کہ خواہ تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ اور یا کوئی ایسی پیدائش ہو جاؤ جو تمہارے ذہنوں میں اس سے بھی بڑی ہو (تو پھر بھی تمہیں دوبارہ پیدا کر لیا جائیگا)

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ○ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۷۸-۷۹/۳۶ کہا کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جب وہ گل سڑ گئی ہوں گی (اے رسول!) کہہ دیجئے گا کہ انہیں دوسری مرتبہ بھی وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔

اِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِينَ ○ وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيمِ ○ وَكَانُوا يَقُولُونَ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ○ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُونَ ○ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِينَ وَالْاٰخِرِينَ ○ لَمَجْمُوعُونَ اِلٰى مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ○ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّونَ الْمُكَذِّبُونَ ○ لَاٰكِلُونَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّومٍ ○ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ○ فَشٰرِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ○ فَشٰرِبُونَ شُرْبَ الْهِيمِ ○ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ○ ۴۵ تا ۵۶/۵۶

(مفہوم) بیشک وہ اس سے پہلے (دنیا میں) اتحصال کرنوانے تھے اور اس عظیم گناہ پر اصرار کرتے تھے اور کہتے تھے کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر اٹھا لئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے باپ دادے بھی اٹھا لئے جائیں گے؟ (اے رسول) کہہ دیجئے گا کہ بیشک پہلے اور پچھلے سب کے سب ایک بتادیئے گئے مقررہ وقت پر اکٹھے کر لئے جائیں گے۔ پھر تم اے جھٹلانے والو! گمراہو! تم ضرور تھوہر کے درخت سے کھاؤ گے پھر اپنے پیٹوں کو اس سے بھروگے پھر اس کے اوپر گرم پانی پیؤ گے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں یہ بدلے کے دن ان کی مہمانی ہوگی۔

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ○ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ○ بَلٰى قٰدِرِينَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ○ ۱-۴/۷۵ شہادت ہے قیامت کے دن کی اور شہادت ہے انسان میں پیدا کئے گئے اس نفس کی جو اسے برائی سے روکتا ہے کیا انسان نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ ہڈیاں تو کیا' ہم تو اس کے ایک ایک پور (Finger tips) کو برابر لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

نتیجہ صریح:۔ آیات مجیدہ مندرجہ بالا میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ=

منکرین قیامت کا تعجب یہ ہے کہ ہم مرکر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ پیدا کر لیا جائے گا؟ سورہ یٰسین ۷۸-۷۹/۳۶ میں آیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جب وہ گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں گی اس کا جواب نبی اکرمؐ سے دلوایا گیا کہ انہیں وہی ذات دوبارہ زندہ کرلے گی جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ سورہ قیامت ۳-۴/۷۵ میں بھی منکرین قیامت کا یہی تعجب پیش کیا گیا ہے کہ کیا ہر ایسے انسان کو یہ گمان ہے کہ ہم ان کی بکھری ہوئی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے اور یہ جواب دیا گیا ہے کہ ہم تو ان کی انگلیوں کی چھوٹی سے چھوٹی نابود شدہ ہڈیوں تک کو زندہ کرکے ان کے پورے پورے کو صحیح سالم کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

سورہ واقعہ ۴۶ تا ۵۰/۵۶ میں بھی منکرین قیامت کا یہی تعجب پیش کیا گیا ہے کہ جب ہم مرجائیں گے پھر سال ہا سال گزر جائیں گے اور ہم مٹی مٹی ہو چکے ہوں گے تو کیا ہم اور ہمارے پہلے باپ دادا سب زندہ کرکے اٹھالئے جائیں گے تو اس کا جواب نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے دلایا گیا کہ ہاں اس مقررہ دن کو قیامت کے نام سے معلوم کرا دیا گیا ہے اگلوں پچھلوں

کی گلی سڑی ہڈیوں کو صحیح سالم کرنے کے بعد اسی جسم کے ساتھ زندہ کرکے اعمال کی جزا سزا کیلئے سب کو اکٹھا کر لیا جائے گا۔
انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ

اس زندگی کے اعمال کی جزا سزا کے تصور سے ہندوؤں تک نے بھی انکار نہیں کیا' کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد نیک لوگوں کو فوراً" کسی آسودہ حال گھرانے میں پیدا کرکے نیا جسم دے دیا جاتا ہے اور پیدا ہوتے ہی ان کے منہ کو سونے کی چمچی لگا دی جاتی ہے اور برے لوگوں کو گدھے' بیل یا بھینسے وغیرہ کی جون میں پیدا کرکے انہیں بوجھ اٹھانے اور گندوں میں جتنے کی سزا دی جاتی ہے اسی طرح اہل اسلام میں بھی قیامت کے متعلق مختلف عقیدے چل رہے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں جو مرگیا اس کی قیامت آگئی اسے فوراً" حضور الہی میں پیش کرکے جزا سزا کا حکم سنا دیا جاتا ہے یعنی ہر مرنے والے کی بعثت فوراً" ہو جاتی ہے اس تصور کا بطلان سورۃ نحل میں بالفاظ ذیل آیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ ۲۰-۲۱/۱۶ اور لوگ جن (مردوں) سے مدد مرادیں مانگتے ہیں انہوں نے کچھ بھی پیدا نہیں کیا بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے تھے وہ مُردے ہیں زندہ نہیں ہیں اور نہ انہیں یہ شعور ہے کہ وہ کب دوبارہ اٹھا لئے جائیں گے۔ یعنی جن مردہ بزرگوں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں ان کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے کہ ان کی ابھی بعثت نہیں ہوئی انہیں ابھی دوبارہ زندہ نہیں کیا گیا بعثت کا ایک مقررہ دن ہے جو معلوم کرا دیا گیا ہے مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۵۰/۵۶ اور اس مقررہ اور معلوم کرادیئے گئے دن ہی کو بعثت کا دن بھی کہا گیا ہے اور قیامت کا دن بھی چنانچہ سورہ مومنون میں نوع انسانی کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے:۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ ۲۳/۱۵-۱۶ پھر (اے نوع انسانی) تم مذکورہ بالا (طریقے سے پیدا ہونے) کے بعد مرجاتے ہو اور پھر اس کے بعد قیامت کے دن تمہیں مبعوث کیا جائے گا۔ دوبارہ اٹھایا جائیگا

پس واضح رہے کہ اگرچہ اس نظریے میں کہ "جو مرگیا اس کی قیامت ہوگئی" جزا سزا کا انکار موجود نہیں لیکن قرآنی الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھنے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہر انسان کی انہی ہڈیوں کو (خواہ گل سڑ کر کالعدم ہو چکی ہوں گی) اکٹھا کیا جائیگا اور انہیں کے ذریعے اس کا پورا پورا یعنی ہر ایک عضو صحیح سالم کرکے ۴/۷۵' اسی جسم کو زندہ کر لیا جائیگا۔ لہٰذا اگر وہ نظریہ ٹھیک ہے کہ جو کوئی مرجاتا ہے اس کے ساتھ اس کے اچھے برے عملوں کے مطابق اچھا برا جسم دیگر زندہ کر لیا جاتا ہے تو قرآن مجید کی قریباً" ایک درجن آیات میں دی گئی خبر کے مطابق گلی سڑی ہڈیوں کو جمع کرنے اور ۴/۷۵ کے مطابق اسی جسم کو صحیح سالم کر لینے کا تکلف کیوں؟ پس مذکورہ نظریہ اگرچہ جزا سزا کے انکار پر مبنی نہیں مگر قرآن مجید کے تکراری اور تاکیدی اعلان کی رو سے مطلقاً غلط ہے۔

یوم قیامت کے متعلق ایک مخصوص وضاحت اور ایک مخصوص اعلان ○ اگلی آیت مجیدہ میں قیامت کے دن اللہ کی عدالت کا ایک مخصوص نشان اور وقوع قیامت کے متعلق ایک ایسا اعلان کر دیا گیا ہے کہ خود اہل اسلام کے کسی بھی مکتب فکر کے ہاں اس کا تصور موجود نہیں ذرا گہری توجہ کیساتھ ملاحظہ فرمائیں۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝ (۱۰۴) اور ہم اسے (قیامت کے دن کو) نہیں پیچھے ڈال رہے مگر صرف مقررہ وقت کیلئے اسمیں تاخیر کر رہے ہیں۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝ (۱۰۵) پھر جس دن وہ مقررہ وقت آجائیگا تو کوئی شخص اس کے حکم کے

بغیر بات نہیں کرے گا پھر ان میں برے بھی ہوں گے اور نیک بھی۔

سورہ النبا میں آیا ہے کہ اس دن انبیاءؑ بھی بغیر حکم باری کلام نہ کریں گے۔ **يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَٰئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا** ۞ ۷۸/۳۸ اس (قیامت کے) دن اللہ کے حضور میں اللہ کی تعلیم پانے والے یعنی اس کے نبیؑ رسولؑ صف باندھے کھڑے ہوں گے لیکن وہ بات نہیں کریں گے مگر جسے رحمان حکم دیگا اور وہ صحیح صحیح بات کرے گا۔ لفظ روح اور ملائکہ کی بحث بلاغ القرآن کے اوراق میں بار بار گزر چکی ہے خصوصاً" ادارہ کے شائع کردہ پمفلٹ "سجدہ ملائکہ بحضور آدم" میں ملاحظہ فرمائیں روح کا ایک قرآنی معنی ہے اللہ تعالیٰ کی تعلیم جو ۱۶/۲ + ۴۰/۱۵ + ۴۲/۵۲ سے ثابت ہے اور روح بمعنی اللہ کی تعلیم پانے والا ۱۷/۱، ۴، ۲۱/۱۹، ۶۶/۱۲ کے مطابق مسیحؑ کیلئے آیا ہے اور ۱۲/۳۱ کے مطابق انبیاءؑ کیلئے ان کی انتہائی پاکبازی کی بدولت ملک کا لفظ بطور مجاز بولا جاتا ہے جیسے کہ یوسفؑ کیلئے زنان مصر کے الفاظ میں لایا گیا ہے: **اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ** ۞ ۱۲/۳۱ اللہ نے اس کی تردید نہیں کی۔

اب قیامت کے متعلق وہ قرآنی اعلان ملاحظہ فرمائیں جو کسی بھی مکتب فکر کے ہاں موجود نہیں۔ اگلی دو آیات انتہائی گہری توجہ کی مستحق ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۞
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۞

(آیات ۱۰۶-۱۰۷) پھر جو بد عمل ہوں گے وہ آگ میں ہوں گے ان کے لئے اس میں چیخنا اور چلانا ہے وہ اس میں اس وقت ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ تیرے پروردگار کی مشیت۔ بیشک (اے رسول) تیرا رب وہی کرتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق ہے۔

زَفِيْر کہتے ہیں گدھے کی آواز کو جب وہ سانس اندر کھینچتا ہے **شَهِيْق** کہتے ہیں اس وقت کی آواز کو جب وہ آواز باہر نکالتا ہے عربی ادب میں یہ دو لفظ اس تکلیف کے وقت بولے جاتے ہیں جب چاروں طرف چیخ و پکار برپا ہو۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کے الفاظ سے عیاں ہے اہل نار، نار میں اس وقت تک ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں۔ قرآن حکیم کا یہ وہ اعلان ہے جو اہل اسلام میں مطلقاً" مفقود ہے اس پر تفصیلی نوٹ اگلی ایت مجیدہ میں آرہا ہے جس میں اہل جنت کے متعلق بھی بالکل یہی الفاظ لائے گئے ہیں کہ وہ بھی جنت میں اس وقت تک ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ میں استثنیٰ بالمشیت ماقبل کی تاکید تام کیلئے آئی ہے اس کی بھی تفصیلی بحث اگلی آیت مجیدہ میں آرہی ہے جس میں اسی جملہ استثنیٰ بالمشیت کو اہل جنت کے ذکر میں دہرایا گیا ہے۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ کا معنی لکھا گیا ہے تیرا رب وہی کرتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق ہے **مَا يُرِيْدُ** کا لفظی معنی ہے "جس کا وہ ارادہ کرتا ہے" سورہ قصص میں اس مادہ **اَرَادَ يُرِيْدُ** کا مفہوم جب یہ بصورت فعل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو اس سے مراد وہ قانون ہوتا ہے جو اس نے ارادہ کئے گئے کام کو پورا کرنے کیلئے خود متعین کر رکھا ہے مثلاً" زمانہ فرعون کے بنی اسرائیل کے متعلق جو اس کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے ارشاد ہوا ہے: **وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۞ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ** ۞ ۲۸/۵-۶ اور ہم نے ارادہ کیا کہ ہم ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں

سر زمین مصر میں فرعون کی طرف سے کمزور کر دیا گیا تھا اور (ہم نے ارادہ کیا) کہ انہیں امام بنائیں یعنی ہم انہیں (سر زمین مصر کا) وارث بنائیں اور انہیں اس زمین میں اقتدار عطا فرمائیں اور ہم فرعون وہامان اور اس کے لشکروں کو وہ کچھ دکھائیں جس سے وہ ڈرتے تھے (کہ ہم سے کہیں حکومت نہ چھن جائے ظالموں کو یہ خوف ہمیشہ دامنگیر رہتا ہے)

اب غور فرمائیں کہ یہاں نُرِیْدُ فعل بصیغہ جمع متکلم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے لیکن یہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ متعینہ قانون ہے جو اس نے کمزوروں پر احسان اور ظالموں سے حکومت چھیننے کا خود مقرر کر رکھا ہے کیونکہ اگر یہاں نرید سے صرف ارادہ بلا قانون مقصود ہو تو ارادہ کرنے کے بعد فوراً بنی اسرائیل کو زمین مصر میں اقتدار مل جاتا اور فرعون سے فوراً حکومت چھین لی جاتی مگر ہوا یہ کہ اس فعل **نرید** پر عمل یہاں سے شروع کیا گیا کہ موسیٰؑ کو پیدا کیا گیا اور ان کی والدہ کو انہیں دریا میں ڈال دینے کا حکم دیا چنانچہ ۵-۲۸/۶ کے بعد عین متصل آیت نمبر۲۸/۷ میں بتا دیا گیا ہے کہ ہمارا ارادہ ہمارے متعینہ قانون کے مطابق ہوتا ہے چنانچہ ہم نے اس کام کو یہاں سے شروع کیا کہ موسیٰؑ کو پیدا کرکے اس وقت کے نبی کے ذریعے ان کے والدہ کو وحی فرمائی۔ **وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى** ۲۸/۷ اس طرح موسیٰؑ کو خود فرعون کے گھر میں پال پوس کر جوان کیا گیا کیوں؟ اس لئے کہ غلام قوموں میں اتنی جرات نہیں ہوتی کہ ظالم حاکم کو ٹوک سکیں یا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنے آسکیں۔ موسیٰ سلام علیہ کو ایک آزاد فضا میں بصورت شہزادہ پالا اور جوان کیا گیا آپ پر عمّالِ حکومت بلکہ خود فرعون کا بھی رعب غالب نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے ہوش سنبھالتے ہی حکومت فرعون پر اعتراض شروع کر دیئے اور مظلوموں کی عملی مدد کرنے لگے حتیٰ کہ بنی اسرائیل پر احسان کرنے کے ارادے کی قانونی صورت پر اس شدت کیساتھ عمل ہو رہا تھا کہ موسیٰؑ نے ایک مظلوم بنی اسرائیل کو ظالم فرعونی سے چھڑاتے ہوئے اسے دھپڑ رسید کیا جس سے وہ مرگیا۔ اب کیا ہوا؟ یہ کہ آپ کو آٹھ دس برس کیلئے مدین میں ملک بدر ہونا پڑا۔ اٹھارا بیس سال کے بعد آپ جوان ہوئے تھے اوپر سے ایک لمبی جلا وطنی کا وقفہ لاحق ہوگیا۔ مدین سے واپس آئے تو نبوت عطا کی گئی اور حکم دیا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور اس سے کہو کہ اگر تو بنی اسرائیل کو ان کے بنیادی حقوق نہیں دیتا تو انہیں میرے ساتھ پر امن ہجرت کی اجازت دیدے۔ مگر اس نے آپ کا مطالبہ قبول نہ کیا اور اس مہم میں مزید کئی برس گزر گئے۔ لیکن ظاہری لفظوں کے مطابق ابھی تک اللہ تعالیٰ کا ارادہ پورا نہ ہوا۔ بالآخر اپنے قانون کے مطابق فرعون پر اپنی تبلیغ کی اتمام حجت تمام کرکے موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی انقلابی جماعت کیساتھ ہجرت کرنے کا حکم دیدیا اور اپنے متعینہ قانون مدوجزر کے ذریعہ موسیٰؑ کو ان کی جماعت سمیت سمندر کی شاخ سے پار کر دیا اور فرعون کو اس کے لشکروں سمیت غرق کرکے **نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ** کی تکمیل تیس چالیس سال کے بعد فرمائی پس آیت نمبر۱۱/۱۰۵ میں **فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ** کا یہ معنی صد فیصد درست ہے کہ اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو اسکے خود متعینہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات ۱۱/۱۰۵ تا ۱۱/۱۰۷ میں واضح ہو چکا ہے کہ بد عمل لوگ اس وقت تک آگ میں ہمیشہ کیلئے رہیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں اگلی آیت میں سعید لوگوں یعنی نیکوکاروں کے متعلق بھی یہی تصور ہے

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

(۱۰۸) اور جو نیکوکار ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے اس میں اس وقت تک رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں ایسا ہی ہوگا تیرے رب کا قانون مشیت یہی ہے اہل جنت پر جنت کی بخشش (مذکورہ وقفہ میں) منقطع نہیں کی جائیگی

مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کا تکرار تاکیدی انتہائی غور طلب ہے جو اس نظریہ کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بری

کرتا ہے کہ موجودہ آسمان اور زمین اللہ تعالیٰ کی طرح ابدی نہیں ہیں اس وقت تک قائم رکھے جائیں گے جب تک کہ اہل نار کی نار میں سزا اور اہل جنت کی جنت میں جزا کا وقفہ پورا ہو جائیگا۔ ان دو تکراری آیات مجیدہ کے مطابق قرآن مجید میں جہاں جہاں اہل نار اور اہل جنت کے لئے **خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا** آیا ہے' وہاں ہر جگہ پر یہ الفاظ محذوف و مقدر مانے جائیں گے۔ **مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ** اور ہر جگہ پر مفہوم اور معنی یہ ہوگا کہ اہل نار' نار میں اور اہل جنت' جنت میں اس وقت کیلئے ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں۔

اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ یہ جملہ ۱۱/۱۰۵ میں بھی آیا ہے اسے قوائد میں استثنیٰ بالمشیت کہتے ہیں اور یہ تاکیدی تام کیلئے آتا ہے اس کی مثال سورہ زمر میں نفخ صور کے ضمن میں آئی ہے:۔ **وَنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ** ۳۹/۶۸ اور صور میں پھونکا جائیگا تو جو جاندار آسمانوں میں ہیں جو جاندار زمین میں ہیں سب مر جائیں گے۔ اس کے بعد آیا ہے **اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ** جو تاکیدی تام کیلئے لایا ہے کیونکہ قیامت کے صور کے وقت کوئی ایک جاندار بھی باقی نہیں رہے گا اس لئے ۳۹/۶۸ میں بھی یہی معنی ہے کہ نفخ صور سے سب کے سب جاندار مرجائیں گے بالکل ایسا ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون مشیت یہی ہے۔

نفخ صور پر جو **مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ** کے الفاظ آئے ہیں اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ قیامت کے نفخ اول میں جاندار سب کے سب ختم ہو جائیں گے زمین و آسمان بدستور قائم رہیں گے۔ اسی چیز کی خبر سورہ الرحمن میں بھی دی گئی ہے **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ** ۵۵/۲۶ زمین کے اوپر جو بھی جاندار ہے سب فنا ہو جانیوالے ہیں۔ زمین و آسمان اس وقت ختم کر دیئے جائیں گے جو ان کی فنا کا وقت مقرر کیا گیا ہے اس کی خبر ان لفظوں میں دی گئی ہے۔ **كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ** ۲۸/۸۸ زمین و آسمان سمیت ہرچیز اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہلاک ہونے والی' ختم ہونے والی ہے۔ دوام و بقا صرف اور صرف ذات باری کیلئے ہے اور کائنات میں محدوثات کا نظام جاری و ساری ہے فافہم و تدبر

واضح رہے کہ جس طرح ۳۹/۶۸ میں نفخ صور کے ضمن میں ثابت ہو چکا ہے کوئی جاندار زندہ نہیں رہیگا۔ سب کے سب مرجائیں گے اور **اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ** تاکید تام ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون مشیت ہی یہی ہے اسی طرح ۱۱/۱۰۷-۱۰۸ میں **مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ** کے بعد جو آیا ہے **اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ**' یہ بھی تاکید تام کیلئے آیا ہے کہ بالکل ایسا ہی ہوگا۔ تیرے رب کا متعین کردہ قانون مشیت یہی ہے کہ آسمانوں اور زمین کو اس وقت تک قائم رکھا جائیگا جب تک اہل نار اور اہل جنت کا وقفہ سزا و جزا باقی ہوگا۔

اسی استثنیٰ بالمشیت کی ایک مثال سورہ اعلیٰ میں آئی ہے جہاں نبی اکرم کو ارشاد ہوا ہے **سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ○ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ** ۸۷/۶-۷ بیشک ہم آپ کو پڑھاتے ہیں پھر آپ بھولتے نہیں بالکل ایسا ہی ہے اللہ تعالیٰ کا قانون مشیت یہی ہے کہ جو کچھ ہم آپ کو پڑھائیں آپ ہرگز ہرگز نہ بھولیں نبی اکرمؐ تنزیلی حافظ قرآن تھے یہاں بھی **اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ** کا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر قرآن کریم نازل کرتا تھا جتنا وہ چاہتا تھا معاذ اللہ' معاذ اللہ اتنا قرآن مجید آپ بھول جایا کرتے تھے' غلط ہے۔

۱۱/۱۰۷-۱۰۸ سے ثابت ہو چکا کہ قیامت کو یہی زمین و آسمان اور یہی نظام شمسی و قمری موجود ہوگا۔ اہل جنت کیلئے جو لمبے سایوں **ظِلًّا ظَلِيْلًا** ۴/۵۷ کی خبر دی گئی ہے اس میں بھی سورج کی موجودگی اس کے طلوع و غروب کی خبر موجود ہے اس کے علاوہ ۱۴/۴۸ میں آیا ہے **يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ** ○ یہ

محاورے کے طور پر آیا ہے کہ قیامت کی عدالت کے وقت موجودہ زمین و آسمان بدل جائیں گے اس زمین و آسمان میں رشوت و سفارش کیساتھ انصاف کا خون کیا جاتا ہے اس وقت اکیلا غالب اللہ حاکم ہوگا اور سب سرکش و جابر بادشاہوں کو اس کے حضور حاضر کرکے سزا دی جائیگی اور مظلوموں کی داد رسی کی جائیگی۔ زمین و آسمان بدل جانے کا محاورہ ہے --- اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے مخالفین کے بارے میں آپ پر واضح کیا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ اپنے باپ دادا کے ٹھہرائے ہوئے الاہوں (باطل مددگار) سے مدد مرادیں مانگتے ہیں۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَاۤءِ ۚ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۚ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

(۱۰۹) پس (اے رسول) یہ لوگ جن کی فرمانبرداری کرتے ہیں آپ ان کے متعلق کسی قسم کے شک میں نہ رہیں' یہ (آپ کے مخالفین) اسی طرح ان کو الہ مانتے ان سے مرادیں مانگتے ہیں جس طرح ان کے باپ دادا ان سے پہلے ان سے مرادیں مانگا کرتے تھے اور ہم انہیں ان کا حصہ (یعنی جزا یا سزا) بغیر کمی کے پورا پورا دینے والے ہیں (۱۱/۱۰۹)

اِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ میں آمدہ ضمیر **هُمْ** میں غیراللہ سے مرادیں مانگنے والے بھی شامل ہیں اور وہ بھی جن سے مرادیں مانگی جاتی تھیں پس اس سے ثابت ہوا کہ لات۔ منات وغیرہ جو بت اہل عرب نے بنائے ہوئے تھے وہ ان کے آباؤ اجداد کے بزرگ تھے ورنہ اگر یہ محض فرضی بت ہوتے تو ان کا جزا سزا کیساتھ کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

نَصِيْبَهُمْ کے الفاظ بھی اس چیز کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اگر وہ لوگ اپنی زندگی میں نیک لوگ تھے اور ان کا حصہ جزا کا تھا تو انہیں جزا دی جائے گی انہیں اپنے الہ' غائبانہ مددگار' ان کے بعد لوگوں نے ان کی تعلیم کے خلاف بنا لیا تھا۔ ان کا حصہ ان کے نیک عملوں کی جزا ہوگا اور انہیں اللہ کے شریک بنانے والوں کا حصہ سزا ہوگا اگر وہ لوگ خود ہی لوگوں کے غائبانہ مددگار بنے ہوئے تھے تو ان کا حصہ بھی سزا ہوگا اور ان سے مرادیں مانگنے والوں کا حصہ بھی سزا ہی ہوگا۔

اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے موسیٰ سلام علیہ کو اپنی کتاب عطا فرمائی تھی لیکن لوگوں نے اس میں بھی قرآن مجید ہی کی طرح اختلاف کیا تھا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۗ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾

(۱۱۰) اور بے شک ہم نے موسیٰ کو اپنی کتاب عطا فرمائی پھر (لوگوں کی طرف سے) اس میں بھی (قرآن کی طرح) اختلاف کیا گیا۔ اور (اے رسول) اگر آپ کے رب کی طرف سے (قیامت کا فیصلہ) پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے درمیان (یہیں) فیصلہ کر دیا جاتا حقیقت یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ اس سے شک میں متردّد تھے۔

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۗ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

(۱۱۱) اور بیشک آپ کا رب ان سب کو ان کے اعمال کی پوری پوری جزا دیگا۔ اور بلاشبہ وہ خوب خوب جاننے والا ہے جو یہ لوگ عمل کرتے ہیں۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان لوگوں کی نافرمانیوں سے پریشان نہ ہوں۔ بلکہ آپ

اور آپ کے ساتھی اسی طرح دین اللہ پر مستحکم رہے گا۔ جس طرح آپ کو اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے:۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

(۱۱۲) پس (اے رسول) آپ اور وہ لوگ جو توبہ کرکے آپ کے ساتھ مل گئے ہیں' اللہ کے دین پر اسی طرح قائم رہو جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور دین اللہ سے باہر نہ نکلو بیشک تم جو بھی عمل کرتے ہو وہ اچھی طرح دیکھنے والا ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے' ان لوگوں کی طرف ہرگز نہ جھکو' جو ظلم کرنے والے ہیں۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(۱۱۳) اور (ایمان والو) ان لوگوں کی طرف نہ جھکنا جنہوں نے ظلم کیا۔ ورنہ تمہیں (ناکامی کی) آگ مس کریگی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار موجود نہیں ہے پھر تم مدد نہیں دیئے جاؤ گے۔

اس سے اگلی آیت مجیدہ میں خاتم النبین رحمت للعلمین کی ذات گرامی کو دائمی حکم دیا گیا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

(۱۱۴) اے (رسول!) ہمیشہ صلوۃ ادا کرتے رہیں دن کی دو طرفوں میں بھی اور رات کے ابتدائی اندھیرے میں بھی' بیشک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ (صلوۃ کی ادائیگی کے) مذکورہ بالا حکم ہی کی نصیحت ہے اللہ کا ذکر کرنیوالوں کیلئے۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

(۱۱۵) اور آپ مستقل مزاج رہیے' بیشک اللہ تعالی توازن قائم کرنیوالوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

صلوۃ کا حکم دائمی ہے ۔ اوپر ۱۱۴/۱۱ میں نبی کریم کی ذات گرامی کو صلوۃ موقت کی باقاعدہ ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے **اَقِمِ الصَّلٰوةَ .... الخ** کا معنی یہ ہے کہ آپ کی زندگی کے آخری وقت تک بلاناغہ صلوۃ ادا کرتے رہیں دن کے دونوں حصوں میں اور رات کی ابتدائی گھڑیوں میں۔ (مسائل صلوۃ موقت کی مکمل بحث ادارہ کے شائع کردہ پمفلٹ "الصلوۃ" میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں اقم الصلوۃ کے الہی حکم کی وضاحت کی جاتی ہے کہ اقم فعل امر میں دوام موجود ہے اسی طرح ۷۸/۱۷ میں بھی نبی اکرمؐ کو اقم الصلوۃ کا دائمی حکم دیا گیا ہے۔ ان دائمی حکموں سے ثابت ہے کہ صلوۃ موقت مومنوں کیلئے تادم مرگ معاف نہیں۔ جب صلوۃ کا وقت آجائے تو فرض ہو جاتی ہے اور رکتی نہیں۔ اس کا مخصوص حکم سورۃ النساء میں بھی دیا گیا ہے:۔ **اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا** ○ ۱۰۳/۴ بیشک صلوۃ موقت مومنوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالی کے فرض کو نہ کوئی ٹالنے والا ہے اور نہ موقوف کرنے والا ہے۔ اسی لئے خود نبی اکرمؐ کو بھی اَقِمِ الصَّلٰوةَ ۱۱۴/۱۱ + ۷۸/۱۷ کے تکراری حکم کیساتھ مخاطب کیا گیا ہے "کہ آپؐ بھی ہمارے صلوۃ موقت کے دائمی حکم کو بدلنے کے مجاز نہیں۔

صلوۃ سفر میں بھی معاف نہیں۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:۔ **حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ**

الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ○ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ ۲/۲۳۸-۲۳۹ تمام صلوٰت کی حفاظت کرو' خصوصاً" درمیانی صلوۃ کی حفاظت کرو۔ پھر اگر تمہیں کوئی خوف لاحق ہو جائے تو اگر تم پیادہ پا سفر کر رہے ہو تو پیدل چلتے ہوئے صلوۃ ادا کر لیا کرو۔ اور اگر تم سواری پر سفر کر رہے ہو تو سواری پر چلتے چلتے صلوۃ ادا کر لیا کرو پھر جب تم امن میں آجاؤ تو پورے آداب و شرائط کے ساتھ اللہ کا ذکر (صلوۃ) کیا کرو جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ جو تم نہیں جانتے تھے۔

ان آیات مجیدہ میں حکم دیا گیا ہے کہ جان کے خوف کے وقت بھی صلوۃ معاف نہیں۔ اگر دوران سفر کسی موذی جانور یا خطرناک دشمن کا خوف لاحق ہو جائے اور صلوۃ کا وقت جا رہا ہو کہ اگر سفر سے ٹھہر کر صلوۃ ادا کریں تو دشمن کا خطرہ ہے اگر منزل پر پہنچ کر صلوۃ ادا کریں تو صلوۃ کا وقت چلا جاتا ہے اس صورت میں حکم دیا گیا ہے کہ پیادہ پا چلتے چلتے بھی صلوۃ ادا کر لیا کریں۔ خبردار صلوۃ ضائع نہ کرنا۔

بستر مرض اور بستر مرگ پر بھی صلوۃ ہرگز معاف نہیں:۔ سورۃ مزمل میں ارشاد ہوا ہے کہ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۷۳/۲۰ اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے بعض (بستر مرض یا مرگ) کے مریض ہوں گے اور دوسرے تم میں سے زمین میں سفر کر رہے ہوں گے' اللہ کا فضل تلاش کر رہے ہوں گے۔ (کاروبار کے سلسلے میں سفر پر ہوں گے) اور دوسرے تم میں سے ایسے ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جنگ کر رہے ہوں گے۔ پس صلوۃ کسی بھی حالت میں معاف نہیں۔پڑھا کرو اس (قرآن) میں سے اور صلوۃ ہمیشہ ادا کرتے رہا کرو۔

ان آیات کریمات میں بتایا گیا ہے کہ صلوۃ نہ کاروباری مسافر کو معاف ہے نہ بیمار کو' خواہ وہ بستر مرض پر ہو یا بستر مرگ پر کیونکہ وہ مرض بھی ایک مرض ہی ہوگا جس سے بیمار شفا یاب ہونے کی بجائے موت سے ہم آغوش ہو جائیگا پھر صلوۃ سربکف مجاہدوں کو بھی معاف نہیں جو اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے دین کے دشمنوں سے لڑ رہے ہوں سورۃ نساء میں سربکف مجاہدوں کی صلوۃ کی ادائیگی کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ صلوۃ قصر وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○ ۴/۱۰۱ جب تم (جہاد فی سبیل اللہ کے لئے) زمین میں سفر کرو' تو اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں فتنے میں ڈال دیں گے تو کوئی حرج نہیں کہ تم صلوۃ کو کم کر لیا کرو۔ بے شک کافر تمہارے ظاہر دشمن ہیں۔

میدان جنگ میں صلوۃ باجماعت: میدان جنگ میں جب فوجیں آمنے سامنے پڑی ہوئی ہوں۔ ابھی جنگ شروع نہ ہوئی ہو تو اس وقت کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ فوج دو حصوں میں تقسیم ہو جائے' ایک گروہ اسلحہ اور زرہ بکتر پہنے ہوئے صلوۃ میں کھڑا ہو جائے اور دوسرا گروہ پہرا دیتا رہے اس طرح جب ایک گروہ' دوسرے گروہ کے پہرے میں قیام سے لے کر سجدہ تک ایک رکعت یعنی صلوۃ قصر ادا کرے تو یہ گروہ پہرے پر چلا جائے اور دوسرا گروہ جو پہرہ دے رہا تھا وہ بھی امیر صلوۃ کیساتھ مل کر قیام سے لیکر سجدہ تک صلوۃ قصر ادا کرلے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ..... ۴/۱۰۲ اور اے

رسول! جب آپ خود مجاہدوں میں موجود ہوں تو آپ کی موجودگی میں کسی کو امیر صلوۃ بننے کا حق نہیں۔ آپ خود ان کیلئے صلوۃ کھڑی کیا کریں اور چاہئے کہ مجاہدوں کا ایک گروہ آپ کے ساتھ صلوۃ میں کھڑا ہو جائے تو چاہئے کہ وہ اپنا اسلحہ پہنے رہیں۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو چاہئے کہ وہ تمہارے پیچھے (پہرے پر) چلے جائیں اور دوسرا گروہ آجائے جس نے صلوۃ ادا نہیں کی۔ وہ بھی آپ کے ساتھ (قیام سے سجدہ تک قصر) صلوۃ ادا کرنے اور اپنی زرہیں اور اسلحہ پہنے رہیں۔ اس کے بعد جب جنگ شروع ہو جائے تو اس وقت کیلئے ارشاد ہوا ہے:

کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۴/۱۰۳ پھر جب (جنگ کے وقت کی) صلوۃ کا فیصلہ ہو جائے (یعنی جب جنگ کا فیصلہ ہو جائے) تو کھڑے بیٹھے لیٹے اللہ تعالیٰ کا صرف ذکر کر لیا کرو یعنی جب جنگ شروع ہو جائے تو ارکان صلوۃ (قیام، رکوع، سجدہ) معاف۔ آداب صلوۃ (وضو، طہارت اور قبلہ رخ ہونا) معاف۔ تیمم کرکے اقرار عبودیت معاف نہیں۔ اس عنوان کے آخری جملے میں اتنے لمبے چوڑے تردد کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ سربکف مجاہدوں کیلئے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلتے ہوئے احکام کیوں دیئے گئے ہیں کہ جب تک لڑائی شروع نہ ہوئی ہو اس وقت تک آدھے آدھے مجاہد، آدھے آدھے مجاہدوں کے پہرے میں قصر صلوۃ ادا کر لیا کریں۔ اور جب لڑائی شروع ہو جائے تو صلوۃ کا وقت آنے پر حسب حالات کھڑے، بیٹھے اور لیٹے صرف اللہ کا ذکر کر لیا کرو۔ یہ سارا تردد اسلئے ہے کہ **اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا** ○ ۴/۱۰۳ بیشک صلوۃ موقت مومنوں پر مقررہ اوقات پر فرض کر دی گئی ہے پس صلوۃ کے متعلق مومنوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لینا چاہیے کہ جب تک ہوش و حواس قائم ہوں صلوۃ معاف نہیں حتیٰ کہ بستر مرگ پر بھی لیٹے لیٹے ادا کی جائیگی **ما علینا الا البلغ**

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ○ اس جملہ کا لفظی معنی یہ ہے: بیشک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ جملہ صلوٰۃ موقت کے ضمن میں آیا ہے جس سے یہ تصور سامنے آتا ہے کہ صلوٰۃ بھی ایک نیکی ہے اور صلوٰۃ ادا کرنے والے کی برائیوں کو لے جاتی ہے۔ واضح رہے کہ نیکی اسے کہتے ہیں جس سے دوسروں کا بھلا ہو۔ اگر صلوۃ موقت کو صرف اس کی ظاہری ادائیگی تک محدود رکھا جائے تو اس کی قرآنی غرض پوری نہیں ہوتی۔ سورۃ عنکبوت میں صلوۃ کے متعلق ارشاد ہوا ہے: **اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ** (۲۹/۴۵) اور (اے رسول) پڑھئے کتاب میں سے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہے اور صلوۃ کو ہمیشہ ادا کرتے رہئے۔ بیشک صلوۃ موقت بے حیائیوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے روکتی ہے اور البتہ اللہ کی نصیحت سب سے بڑی چیز ہے۔ (اور تم لوگ اگر نافرمانیوں سے باز نہ آئے تو سمجھ لو کہ تم نے اللہ کی نصیحت کو قبول نہیں کیا۔) اور اللہ جانتا ہے کہ جو تم بناوٹ بناتے ہو (یعنی دکھاوے کی صلوۃ پڑھتے ہو۔ اور نیکیوں کی طرف آتے نہیں ہو) جب تک نیکیاں کرو گے نہیں، اس وقت تک وہ برائیوں کو لے کس طرح جائیں گی؟ وہ برائیوں پر غالب کس طرح آسکیں گی؟

دکھاوے کی صلوۃ ...... سورہ ماعون میں دکھاوے کی صلوۃ پڑھنے والوں، یعنی نیکیوں سے دور رہ کر صرف صلوۃ موقت ادا کرنے والوں کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ در اصل اللہ کے دین کو جھٹلاتے ہیں اور نیکیاں یعنی اصل دین بتایا گیا ہے رزق کے سرچشموں کو اس طرح کھلے رکھنا کہ ہر ضرورت مند کو حسب ضرورت اور باآسانی میسر آتا رہے دیکھئے ارشاد باری ہے: **اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۞ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۞ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۞**

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ○ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ○
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ○ اے مخاطب کیا تو نے غور کیا؟ تجھے غور کرنا چاہئے اس شخص پر جو دین کو جھٹلاتا ہے پس وہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین (یعنی جس کا کاروبار ساکن ہوگیا) کے کھانے کی (کسی کو) ترغیب نہیں دیتا۔ پس خرابی ہے ایسے مصلین کیلئے جو اپنی صلوۃ سے غافل ہیں اور وہ صلوۃ دکھاوے کی ادا کرتے اور (عوام کو رزق کے) چشموں سے منع کرتے ہیں (۱۱/۱۱۴) میں صلوۃ موقت کے ضمن میں جن نیکیوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ برائیوں کو لے جاتی ہیں ان کی تفصیل اوپر سورۃ ماعون میں دضاحتاً" بیان کر دی گئی ہے کہ یتیموں' یعنی بے سہارا اور بے ٹھکانا لوگوں کو سہارا اور ٹھکانا دینا نیکی ہے اور صلوۃ موقت کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔ اور ساتھ ہی بتا دیا گیا ہے کہ مساکین کے لئے کھانے کا انتظام کرنا نیکی ہے اور تقاضائے صلوۃ میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔

"مسکین" کا مادہ س۔ک۔ن= سکن سے ہے جس کا بنیادی معنی چلتے چلتے رک جانا' ساکن ہو جانا ہے۔ جس شخص کو کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے کہ اس کا کاروبار ساکن ہو جائے' رک جائے۔ اس طرح اس کی آمدنی تو رک جائے گی مگر اس کے اہل و عیال کا خرچ جس میں سرفہرست بچوں کی شکم پری ہے' یہ ضرورت کبھی رک نہیں سکتی۔ اسلئے اسلامی معاشرہ میں ایسے حادثات کے واقع ہونے کے فوراً" بعد پہلے نمبر پر اس امر کا اہتمام ضروری ہے کہ خود مسکین اور اس کے بال بچوں کے کھانے کا انتظام کیا جائے۔ اور اس کے بعد اس کے رکے ہوئے کاروبار کی گاڑی کو متحرک کرنا لازم ہے۔ یتیموں کو سہارا اور ٹھکانہ دینا اور مسکینوں کے کھانے کا اہتمام کرنا ایسی نیکیاں ہیں جو برائیوں کو لے جاتی ہیں' کھا جاتی ہیں۔ جو لوگ صلوۃ ادا کرتے ہیں مگر ان نیکیوں سے دور رہتے ہیں ان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی صلوۃ سے بے خبر ہیں۔ ان کی روش یہ ہے کہ ان کی صلوۃ تو دکھاوے کی ہے اور وہ رزق کے سرچشموں پر قابض ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔ یعنی عوامی ضروریات جو بہتے چشموں کی طرح ہر ایک کو میسر آنی چاہئیں۔ ان پر بند باندھ دیتے ہیں۔ سورہ مدثر میں آیا ہے کہ اہل جہنم اپنے جہنمی ہونے کی وجہ بتائیں گے لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○ ہم مصلین نہیں تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

پس ثابت ہوا کہ صلوۃ کی ادائیگی بھی لازم ہے' مگر صلوۃ اور مسکین کو کھانا کھلانے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور یہی وہ نیکیاں ہیں جو برائیوں کو کھا جاتی ہیں اور معاشرہ جنت بدوش ہو جاتا ہے۔

آیات ماقبل میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ ایک مخصوص انداز میں نیکیوں کا حکم دیا گیا ہے اور متصلہ اگلی آیت میں بھی ایک اور انداز میں ارشاد ہوا ہے کہ پچھلی قوموں میں بہت کم لوگ فساد کو روکنے والے ہوئے تھے:۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

(۱۱۶) پھر کیوں نہ ہوئے تم سے پہلی نسلوں کے لوگ (انبیاء کی) بقیہ تعلیم والے' جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے منع کرتے۔ مگر کچھ تھوڑے سے لوگ تھے جنہیں ہم نے (عذاب سے) بچا لیا (جو لوگوں کو روکتے رہے) اور جو لوگ ظالم تھے وہ اسی چیز کے پیچھے پڑے رہے جو وہ اس (دنیا) میں آسائش دیئے گئے تھے اور وہ مجرم تھے۔

أُولُوْا بَقِيَّةٍ کا لفظی معنی ہے بقیہ والے اور اس کا مفہوم ہے اس تعلیم والے جو انبیاء کرام دیئے جاتے رہے تھے۔ ایسے لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو برائیوں سے روکتے رہیں۔ اگرچہ انبیاء کرام کے تشریف لے جانے کے بعد معاشرہ بگڑ جاتا تھا مگر جو لوگ سابقہ نبی کی تعلیم پر قائم ہوتے تھے ان کا فرض بتایا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو الہی تعلیم سے آگاہ کریں اور

برے کاموں سے منع کرتے رہیں۔

اِلَّا قَلِيْلًا کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو سابقہ نبی کی تعلیم کو جانتے ہوئے لوگوں کو حقیقی تعلیم ربانی سے آگاہ کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ معاشرہ کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ تھوڑے لوگ جو حقائق سے آگاہ بھی کرتے ہیں اور غلط کاریوں سے منع بھی کرتے ہیں' ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ لوگ انہیں سر پھرے اور دیوانے قرار دیتے ہیں۔ جیسے کہ آج کے دور میں جو سرکاری ملازم خواہ وہ اعلیٰ پوسٹ پر ہو یا ادنیٰ پر' اگر رشوت نہیں لیتا تو اسے کہا جاتا ہے کہ اس کا دماغ کریک ہے' یہ پاگل ہے۔

وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا کے الفاظ میں ظالموں کی ایک صفت اتراف بتائی گئی ہے اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ مشقت نہ کرنا' آسائش میں رہنا اور دوسرا معنی ہے بار بار نافرمانی کرنا۔ اس جملہ میں ظالموں کی روش بیان کی گئی ہے کہ وہ لوگ اس چیز کے پیچھے لگے رہتے ہیں جس سے انہیں آسائش میسر آتی ہے یعنی خود محنت مشقت کرنا نہیں پڑتی۔ یہ ہے استحصال' کہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑانا۔ اس کے ضمن میں جاگیرداری' زمینداری' سرمایہ داری اور کارخانہ داری وغیرہ آتی ہے' جن میں یہ لوگ مزدوروں کے پسینے کی کمائی پر عیش اڑاتے ہیں اور مزدوروں کو صرف نان جویں میسر آتی ہے۔ اگر انہیں اس سے روکا جائے یا یہ کہا جائے کہ مزدوروں کی اجرتیں بڑھا کر اتنی تو کر دو کہ وہ گزر بسر تو آسانی سے کر سکیں' تو ہرگز کان نہیں دھرتے بلکہ **وَاتَّبَعَ ...... مَآ اُتْرِفُوْا** پر قائم رہتے یعنی استیصالی اور استحصالی نظام پر سختی سے جمے رہتے ہیں۔

وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ کے الفاظ میں اتراف کی اتباع کرنیوالوں کو مجرم قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ ایسا شخص خواہ کتنا ہی تقویٰ شعار مشہور ہو مگر پرائی کمائی پر پلنے کو میزان الٰہی میں قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتراف یعنی سہل انگاری' محنت سے جی چرانے اور دوسروں کی محنت کا ماحصل بٹورنے کو فساد قرار دیا ہے۔ جیسے کہ آیت بالا میں بھی **يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ** کے الفاظ میں اتراف کو فساد بتایا گیا ہے۔ اور اگلی آیت مجیدہ میں بھی اس کی ضد اصلاح بتائی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ تمہارا رب ایسا نہیں ہے کہ کسی بستی والوں کو اس حالت میں ہلاک کر دے کہ وہ اصلاح کرنیوالے ہوں' یعنی سہل انگاری کی بجائے محنت و مشقت کے عادی ہوں۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾	اور اے (رسول!) آپ کا رب ایسا نہیں کہ کسی بستی والوں کو اس حالت میں ہلاک کر دے کہ وہ معاشرہ کی اصلاح کرنیوالے ہوں (۱۱:۱۱۷)

اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ کے الفاظ میں وضاحتاً اعلان کر دیا گیا ہے کہ مصلحون کیلئے اللہ تعالیٰ کا قانون ہلاکت نہیں ہے۔ مصلحون کی ضد ہے مفسدون' اسلئے کھل کر ثابت ہو چکا کہ مفسدون کیلئے اللہ تعالیٰ کا قانون ہلاکت و عذاب ہے۔ اب فساد کی بہت سی صورتوں میں سے ایک اہم شق بتائی گئی ہے' اتراف یعنی سہل انگاری' آسائش پسندی یعنی خود محنت نہ کرنا اور دوسروں کی محنت پر عیش کرنا۔

سورۃ قصص میں فرعون کو مفسد قرار دیتے ہوئے اس کا جرم یہ بتایا گیا تھا کہ اس نے اپنی رعایا کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا ایک طبقے کو کمزور کر دیا تھا اور ایک کو طاقتور بنا دیا تھا۔ ایک گروہ محنت و مشقت کرتا تھا اور دوسرا گروہ اس کی کمائی کا ماحصل بٹورتا تھا۔

جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ ...... اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ ۲۸/۴ (فرعون نے) اپنی رعایا کے طبقے بنا دیئے تھے' ایک طبقے کو ان میں سے کمزور کر دیا تھا ...... بیشک وہ فسادیوں میں سے تھا۔ یہ کمزور کر دیا گیا طبقہ

قوم بنی اسرائیل تھی۔ جو قوم فرعون کی بیگاری تھی۔ ملک بھر کی محنت و مشقت کے کام وہ کرتے تھے اور فرعونی مترف تھے۔ آسائش پسند اور سہل انگار تھے۔ ان کی کمائی کے ماحصل پر عیش اڑاتے تھے۔ آیت بالا زیر بحث ۱۱/۱۱۷ میں اعلان الٰہی ہے کہ ہلاک اسی کو کیا جاتا ہے جو مصلح نہ ہو یعنی مفسد ہو اور مفسد کی اولین شق ہے' اتراف' استحصال' خود محنت نہ کرنا اور دوسروں کی کمائی سے سامان عیش حاصل کرنا۔

اعمال کے لحاظ سے انسان فعل مختار ہے ۔ آیت بالا میں اگرچہ اعلان کردیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہلاکت و عذاب بے لگام نہیں ہے کہ بغیر جرم و قصور' قوموں کو ہلاک کر دیا جاتا ہو۔ تاہم ایک عوامی مسئلہ کی وضاحت لازم ہے جو کہا جاتا ہے کہ اللہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ عوامی مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پہلے اسے خود گمراہ کرتا ہے اور پھر خود ہی اسے ہلاک کر دیتا ہے' اور جسے چاہتا ہے' پہلے اسے خود ہی ہدایت دیتا ہے اور پھر خود اسے عذاب سے بچا لیتا ہے۔ اس عوامی عقیدہ کی تردید سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے:۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۱۸/۲۹ (اے رسولؐ) کہہ دیجئے گا کہ حق قرآن کریم تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے۔ پس جو کوئی خود چاہئے اس پر ایمان لائے اور جو کوئی خود چاہے انکار کر دے۔

إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۷۳/۱۹ + ۷۶/۲۹ بیشک یہ (قرآن کریم) ایک نصیحت نامہ ہے جو کوئی خود چاہے (اس نصیحت نامہ کے ذریعے) اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے۔

اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (اے نوع انسانی اچھے یا برے) جیسے عمل تم خود چاہو کرو۔ **مَّنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ** ○ ۴۱/۴۶ جو کوئی خود اصلاح کا کام کرے اس کا اجر اس کی اپنی جان کے لئے ہے۔ اور جو کوئی برائی کرے اس کا وبال اس کی اپنی جان پر ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب (خود برے اعمال کروا کر) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ○ ۱۰/۱۰۸ + ۲۷/۹۲ + ۳۹/۴۱ آیت مندرجہ بالا کا مضمون ان تینوں مقامات پر ایک ہی نازل کیا گیا ہے۔ اہل علم کی توجہ کیلئے عرض کی جاتی ہے کہ ان آیتوں میں انما کلمہ حصر کا تکرار آیا ہے اس لئے آیت کریمہ محکمت ہیں اور ترجمہ میں کسی قسم کا ابہام موجود نہیں۔ ترجمہ و مفہوم پر بنظر غائر توجہ فرمائیں خود نبی اکرمؐ سلام علیہ کی زبان صدق سے اعلان کروایا گیا ہے:۔

(مفہوم) (اے رسول!) کہہ دیجئے گا کہ اے پوری نوع انسانی! بیشک حق (قرآن کریم) تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے۔ پھر جو کوئی اس سے ہدایت حاصل کرتا ہے' سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ وہ خود اپنے لئے ہدایت حاصل کرتا ہے' اور جو کوئی اس سے انکار کرکے گمراہ ہو جاتا ہے۔ سوائے اس کے نہیں کہ وہ خود گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کا وبال اس کی اپنی جان پر ہوگا۔ اور میں تم پر داروغہ نہیں کہ زبردستی راہ راست پر لاؤں۔ اسی چیز کی وضاحت سلسلہ درس کی اگلی آیت میں بھی درج ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ⑪⑧

(۱۱۸) اور اگر تیرا رب زبردستی چاہتا تو (اے رسولؐ) وہ ساری نوع انسانی کو ایک جماعت (مومن نیکوکار) بنا دیتا۔ (لیکن اس نے اپنے قانون مشیت ۴۱/۴۰ + ۱۰/۱۰۸ + ۲۷/۹۲ + ۳۹/۴۱ کے مطابق انسان کو عقیدہ و عمل کے لحاظ سے فعل مختار بنا دیا ہے) حقیقت یہ ہے کہ

اختلاف پسند لوگ (دین حق سے) اختلاف کرنے سے ٹلتے نہیں۔

وَلَوْشَاءَ رَبُّکَ کے الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ زبردستی کرتا تو پوری نوع انسانیت کو ایک مومن اور نیکوکار جماعت بنا دیتا۔ لیکن نافرمان و بدکار لوگوں نے نافرمانی اور بدکاری خود اختیار کی ہے۔ اللہ نے نہیں کروائی۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

(۱۱۹) سوائے اس شخص کے تیرا رب (اپنے قانون مشیت کیمطابق) اس پر رحم کرے اور اس نے انہیں اسی لئے پیدا کیا ہے اور تیرے رب کا قانون پورا ہو چکا ہے کہ میں (اپنے قانون مشیت کے مطابق سب نافرمانوں) جنوں اور انسانوں کیساتھ جہنم بھر دوں گا۔

اِلَّامَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ میں رب تعالیٰ کی مشیت محذوف ہے۔ اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم ہے مگر ہے مشروط۔ جو شخص اپنے عملوں کے ساتھ اس کی رحمت کو دعوت دیتا ہے وہ اس پر رحم کرتا ہے اور جو شخص اپنے عملوں کے ساتھ اس کے غضب کو دعوت دیتا ہے' اس پر اپنا غضب نازل کرتا ہے۔ اس جرات پر برائیاں کرتے چلے جانا کہ اللہ غفور رحیم ہے' یہ عقیدہ از روئے قرآن غلط ہے۔ اس نے حکم دیدیا ہوا ہے کہ برائیوں سے بچو اور نیکیوں میں سبقت حاصل کرو۔ اور جو لوگ نافرنیوں میں بہت دور نکل گئے ہوں ان کے لئے بھی رحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے مگر ذیل کی شرط کے ساتھ۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ۱۱۸-۱۱۹/۱۶ (جو لوگ نافرمانیوں میں دور نکل کر خود غضب الٰہی کے مستحق ہوگئے ہیں) ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر خود ظلم کر لیا ہے۔ پھر تیرا پروردگار ان لوگوں کیلئے جو نادانی کیساتھ برے عمل کرتے ہیں' پھر اگر وہ اس کے بعد توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو بلاشبہ تیرا پروردگار اس کے بعد غفور رحیم ہے۔ المختصر! اللہ تعالیٰ کا رحم مشروط ہے جو توبہ کرنے اور اصلاح کرنیوالوں کیلئے ہے۔ ان لوگوں کیلئے ہرگز نہیں ہے جو زندگی بھر اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے رہیں اور اسی حالت میں مرجائیں۔ عین موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی' جیسے کہ ارشاد باری ہے:۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ ۱۸/۴ اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہے جو برائیاں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت کا وقت آیا تو کہا اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ہی ان کی توبہ قبول ہے جو مرگئے اور کافر ہی رہے۔ ہم نے ان کے لیئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (یہی ہمارا قانون مشیت ہے)

وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ان پر رحم کرے سب سے پہلے تو یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرے ہی نہ۔ **مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○** ۵۱/۵۶ اور میں نے جن و انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری فرمانبرداری کریں (اور میں ان پر رحم کروں) اگر وہ نافرمانی کر چکے ہوں یا کر رہے ہوں تو توبہ کرکے اپنی اصلاح کر لیں ۱۱۹/۱۶ تاکہ ان پر رحم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے رحم کا مستحق ہونے کی یہی دو صورتیں ہیں اور بس۔

وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ کے بعد آیا ہے **وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّکَ** یہاں **تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّکَ** سے مراد ماقبل مذکور قانون الٰہی کی محکمیت ہے کہ اس میں کسی قسم کی سوچ لچک ہرگز موجود نہیں کہ کسی فرد یا قوم پر اس وقت رحم گیا

جائے جب وہ قانون الٰہی کے مطابق رحم کی مستحق نہ ہو۔ اور نہ ہی یہ کہ کسی فرد یا قوم پر اس وقت رحم نہ کیا جائے جب وہ قانون مشیت کے مطابق رحم کی مستحق ہو۔

اَلْجِنَّةِ وَالنَّاس مبدل ہے **لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً** میں آمدہ لفظ الناس کا یعنی جن و انسان الناس ہی کے دو گروہ ہیں۔ بدوی اور مدنی۔ ان دونوں میں سے کسی گروہ کو سادہ لوح یا کم عقل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ بدوی یعنی دیہاتی لوگ مدنی یعنی شہری لوگوں سے کم عقل نہیں ہیں' کیونکہ وہ حصول مال کے سلسلے میں شہریوں کی نسبت کم ہوشیار نہیں ہیں۔ اسی لئے دونوں طبقوں کو بالفاظ ذیل اپنے اپنے اعمال کیمطابق جزا و سزا کے مستحق قرار دیا گیا ہے۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ کا مفہوم بھی **لَوْشَآءَ رَبُّكَ** کے ماتحت مشیت الٰہی کی حدود میں محدود ہے۔ بالفاظ دیگر اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ لفظ اجمعین کے مطابق سب کے سب جن و انسان جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ بلکہ قانون مشیت کی دائمی قید کے مطابق ان سب کے سب جنوں اور انسانوں کو جہنم واصل کیا جائے گا۔ جو اپنے عقائد و اعمال کے لحاظ سے نافرمانوں کی صف میں شمار ہوں گے اور توبہ و اصلاح ۱۶/۱۱۹ کی الٰہی رعایت سے بھی خود محروم رہے ہوں۔

سورہ ہود کی آخری آیات مجیدہ : سورہ ہود ختم ہو رہی ہے اس کے خاتمہ پر نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ اس سورہ مجیدہ میں جن انبیاء کرام کے تذکار نازل کئے گئے ہیں وہ آپ کے ثبات ذہنی کیلئے نازل کئے گئے ہیں تاکہ آپ جان لیں کہ سلسلہ تبلیغ میں صرف آپ کو ہی مصائب و تکالیف کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا بلکہ سب کے سب نبیوں نے اسی طرح بڑی بڑی مشکلات شاقہ کا مقابلہ کیا تھا:۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

(۱۲۰) اور (اے رسول) ہم نے اپنے رسولوں کی خبریں آپ پر بیان کی ہیں تاکہ ہم ان سب کیساتھ آپ کے ذہن کو ثابت کریں اور اس بیان میں آپ کے پاس حق قرآن (سچے واقعات) اور وعظ اور نصیحت نامہ آگیا ہے مومنوں کیلئے۔

نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ کے مطابق اسی سورۃ مجیدہ ہود میں:۔

آیت نمبر ۲۵ تا ۴۹ میں نوح سلام علیہ کے حالات اور آپ کی قوم کی نافرمانیاں بیان کی گئی ہیں۔

آیت نمبر ۵۰ تا ۶۰ میں نبی اکرمؐ کے ثبات قلب کیلئے ہودؑ کے صبر اور ان کی قوم کی سرکشی کا ذکر لایا گیا ہے۔

آیت نمبر ۶۱ تا ۶۸ میں صالحؑ اور قوم ثمود کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

آیت نمبر ۶۹ تا ۷۶ میں ابراہیمؑ کے پاس اللہ کے رسولوں کی آمد اور آپ کو بیٹوں اور پوتے کی خوشخبری کا ذکر ہے۔

آیت نمبر ۷۷ تا ۸۳ میں لوطؑ کی قوم کی نافرمانی اور ان کی تباہی کا ذکر تفصیلاً مذکور ہے۔

آیت نمبر ۸۴ تا ۹۵ میں شعیبؑ اور ان کی نافرمان قوم کا ذکر لایا گیا ہے جس نے آپ کو سنگسار تک کرنے کی دھمکی دیدی تھی۔ مگر اللہ کے عذاب نے انہیں آلیا اور شعیبؑ کامیاب و کامران ہوئے۔

آیت نمبر ۹۶ تا ۹۹ میں موسیٰؑ اور فرعون کے مختصر ذکر میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ فرعون اپنے جاہ و جلال اور اسلحہ و لشکروں کیساتھ غرق کر دیا گیا اور اتنے بڑے طاقتور بادشاہ کے مقابلے پر موسیٰ کو غالب کیا گیا۔ سابقہ انبیاء کے ان حالات میں نبی اکرمؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح سابقہ مخالف قوتیں تباہ ہوئیں اور انبیاء کرام کامیاب و کامران ہوئے اسی طرح آپ

کے مخالف بھی ناکام و نامراد ہو جائیں گے۔ اور یقیناً یقیناً فتح و کامرانی آپ کے قدم چومے گی۔ آپ ثابت قدم رہئے گا۔ اور اسی چیز کی خبر آیت بالا زیر بحث میں **نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ** کے الفاظ میں دی گئی ہے۔

مَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ نہایت غور طلب ہیں۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم ایک نصیحت نامہ ہے مومنوں کیلئے یعنی جو لوگ اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آمدہ نصیحت نامہ ہونے پر ایمان لائیں یہ ان کے لئے ہے۔ واضح رہے کہ اس حقیقت سے انکار کیا نہیں جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب انہی لوگوں کو فائدہ دیتی ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ضابطہ حیات تسلیم کریں اور اس پر عمل کریں۔ نہ ماننے والے' اور عمل نہ کرنے والے اس سے نہ دنیا میں فائدہ حاصل کر سکتے ہیں نہ آخرت میں۔

دعوت عمل:۔ سورہ مجیدہ زیر نظر میں سابقہ انبیاء کے حالات کیساتھ آپ کے اطمینان قلب کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں کو کہہ دیجئے گا کہ اپنے اپنے عقائد و نظریات کے مطابق تم بھی عمل کرتے رہو اور ہم بھی عمل کرتے چلے جاتے ہیں پھر نتیجے کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ خود بخود فیصلہ ہو جائے گا کہ تمہارا عقیدہ و عمل بہتر نتیجہ پیدا کرتا ہے یا ہمارا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

(۱۲۲-۱۲۱) اور (اے رسول) جو لوگ نہیں مانتے آپ ان سے کہہ دیجئے گا کہ تم اپنی جگہ پر عمل کرتے جاؤ اور ہم اپنی جگہ پر عمل کرتے جاتے ہیں اور تم بھی نتیجے کا انتظار کرو اور ہم بھی نتیجے کا انتظار کرتے ہیں (دیکھیں فیصلہ ہمارے حق میں ہوتا ہے یا تمہارے حق میں۔)

غیب کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے:۔ نتیجہ چونکہ غیب میں ہے اسلئے آخری آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے ثبات قلب کیلئے خود آپؐ سے اعلان کروایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کے سب غیبوں کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور ہر کام اس کے متعینہ قوانین کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ آپ اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرتے رہیں اور اسی پر پورا بھروسہ رکھیں:۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(۱۲۳) اور (حقیقت یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور سارے کے سارے کام اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں (یعنی اسی کے قانون کے مطابق سرانجام ہوتے ہیں) آپ اسی کی فرمانبرداری کرتے رہیں اور اس (کے متعینہ قوانین) پر بھروسہ کریں اور آپ کا رب اس سے غافل نہیں ہے جو تم عمل کرتے ہو۔

لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا لفظی معنی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا غیب صرف اللہ کیلئے حالانکہ اللہ تعالیٰ کیلئے تو کوئی چیز غیب ہے نہیں وہ تو سب غیبوں کا جاننے والا ہے اسلئے اس جملہ کا صحیح معنی یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کے غیب کا پورا پورا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے للہ جار مجرور مقدم نے حصر بھی پیدا کیا ہے۔

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سب کام اللہ تعالیٰ کے متعینہ قوانین کے مطابق ہی سرانجام ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ ہرگوشے میں اس کے متعینہ قوانین پر ایمان لانا ہے۔

اللہ پر توکل رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے متعینہ قوانین پر بھروسہ کرکے ان پر عمل شروع کر دیا جائے۔ یہ نہیں کہ عمل اس کے متعینہ قوانین کے خلاف کر رہے ہوں اور منہ پر توکل علی اللہ کا وِرد جاری ہو۔

اسی چیز کی تائید آخری جملے میں کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے غافل نہیں یعنی نتیجہ تمہارے عملوں ہی کا نکلے گا زبانی وِرد کا نہیں اور واضح رہے کہ باری تعالیٰ نے اسی عظیم حقیقت کے اعلان پر سورہ مبارکہ ھود کو ختم کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱۲) سُوْرَۃُ یُوْسُفَ

آیاتھا ۱۱۱ — رکوعاتھا ۱۲

سورۃ یوسف میں السید یوسف کا ذکر جمیل ہے اسلئے اس نے اسی نسبت سے سورہ یوسف نام پایا ہے۔ یہ ۱۱۱ آیتوں پر مشتمل ہے پورے قرآن مجید میں یہی ایک سورہ مجیدہ ہے' جس میں احسن القصص کے نام سے پوری سورت میں از ابتدا تا انتہا ایک ہی احسن واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس کی ابتدائی دو آیتوں میں قرآن کریم کی شان بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد آیت نمبر۳ تا ۱۰۱ میں السید یوسف سلام علیہ کا پورا احسن واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بغیر کسی انقطاع کے مسلسل ۹۹ آیتوں میں بیان ہوا ہے۔ آخری دس آیتوں میں آیت نمبر ۱۰۲ تا ۱۰۴ میں نبی اکرمؐ کی صحیح شان بیان ہوئی ہے۔ آیت نمبر ۱۰۵ تا ۱۰۷' تین آیتوں میں منکرین کی وجہ انکار بیان کی گئی ہے اور اچانک عذاب آجانے سے عدم شعور کی خبردی گئی ہے۔ آیت نمبر ۱۰۸ میں رسول اکرمؐ کو اس اعلان کا حکم دیا گیا ہے کہ "میری سنت یہ ہے کہ میں عقل و بصیرت کی اساس پر اللہ کی طرف بلاتا ہوں" آیت نمبر ۱۰۹-۱۱۰ میں مردوں ہی کو منصب نبوت عطا کرنے کی خبردی گئی ہے اور زمین پر چل پھر کر منکرین کا انجام دیکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول فرض تبلیغ ادا کرتے رہے اور لوگ جھٹلاتے رہے مگر ان سے عذاب نہیں ٹلے گا۔

سورت مجیدہ کی آیت نمبر۱۱۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کریم میں بیان کئے گئے تمام واقعات لوگوں کیلئے اپنے اندر پورا پورا سامان عبرت لئے ہوئے ہیں۔ اور قرآن کریم کی یہ شان ہے کہ یہ کسی انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر افتری نہیں کیا گیا' بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے' جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرنیوالا ہے اور اس قوم کیلئے جو اس پر ایمان لائے' ہر مسئلہ دین کی تفصیل کرنیوالا بھی ہے' ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ سورت مجیدہ شروع بھی قرآن کریم کی تعریف سے ہوئی ہے اور ختم بھی قرآن ہی کی تعریف پر ہوئی ہے۔

ایک اہم نوٹ:۔ عوامی تصور کے مطابق واقعہ یوسف حسن و عشق کی داستان نہیں' نظام ربوبیت کے تحت غلے کے چودہ سالہ کنٹرول کی ایک عظیم مہم تھی۔ جس سے عہدہ برآ ہونا السید یوسف کا ایک عظیم تاریخی کارنامہ تھا۔ آپ نے سات سالہ طویل قحط میں دور دراز کے ضرورت مندوں کو غلہ مہیا فرمایا۔ جو لوگ قیمت ادا کر سکتے انہیں "قیمتاً" دیتے اور جو مساکین قیمت ادا نہ کر سکتے انہیں صدقہ کے طور پر عطا فرماتے رہے۔

اس تاریخی کارنامے کا تذکرہ جمیل' قرآن کریم کی تعریف و توصیف کی مخصوص تمہید کے بعد سورۃ مجیدہ کی ابتدا میں بالفاظ ذیل شروع ہوا ہے:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○ اللہ رحمان و رحیم کے بابرکت نام کے ساتھ پڑھئے گا۔

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ②

۱۔ اے امین آگداز ذہن والے رسولؐ! مذکورہ آیتیں خود بیان کرنیوالی کتاب کی ہیں۔

۲۔ بیشک ہم نے اس (قرآن کو) نازل فرمایا ہے عربی زبان میں پڑھا جانیوالا ہے تاکہ (اسے قرآن پڑھنے والو!) تم سب عقلمند بن جاؤ۔

بسم اللہ شریف میں ہر موقعہ محل کیمطابق فعل محذوف ہوتا ہے یہاں چونکہ سورت مجیدہ کی ابتدا ہے اسلئے اقراء محذوف ہے پڑھیئے گا۔

تِلْكَ اسم اشارہ بعید مونث ہے' جس کا اشارہ سورہ ھود میں نازل کردہ آیات کریمات کی طرف ہے۔

الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ کا معنی خود بیان کرنیوالی کتاب ہے جو اپنے بیان تفسیر اور تشریح کیلئے کسی دوسری کتاب کی محتاج نہیں ہے ۶/۶۵ کیمطابق قرآن کریم کی تبیین اس کی اپنی آیات کریمات کے ذریعہ میسر آتی ہے جو ۲/۱۵۹ کیمطابق خود اس کے اندر موجود ہے۔

اَنْزَلْنٰهُ میں **ہٗ** کا دائمی مرجع قرآن کریم ہے جیسے **اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ** ۹۷/۱ میں بھی **ہٗ** کا مرجع قرآن کریم ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ میں نزول قرآن کی ایک غرض یہ بتائی گئی ہے کہ قرآن کریم کے قاری عقل مند ہو جائیں۔ عقل سے کام لینا اپنا شعار بنا لیں۔ پس یہ کہنا قرآن کریم کے خلاف ہے کہ دینی مسائل میں عقل کو دخل نہیں۔ اگلی آیت مجیدہ بالفاظ ذیل واقعہ یوسف کی تمہیدی آیت ہے:۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ③

(۳) (اے رسولؐ!) ہم آپ پر احسن القصص بیان کرتے ہیں اس کے ساتھ جو ہم نے آپ پر یہ قرآن وحی کیا ہے اور اس سے پہلے آپ (اس واقعہ کی حقیقت سے) بے خبر تھے۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ④

(۴) وہ وقت قابل ذکر ہے جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے' چاند اور سورج مجھے سجدہ کرتے ہیں۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ⑤

(۵) (آپ کے والد السید یعقوبؑ) نے کہا اے میرے بیٹے اپنی خواب اپنے بھائیوں کو نہ بتانا۔ ورنہ وہ تیرے لئے کوئی بری تجویز کریں گے۔ بلاشبہ (نفس) شیطان انسان کا ظاہر دشمن ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑥

(۶) اور اسی طرح تیرا رب تجھے پسند فرمائے گا اور تجھے خوابوں کی تعبیر سکھائے گا۔ اور اپنی نعمت تجھ پر اور آل یعقوب پر اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس نے تیرے دو باپوں ابراہیم اور اسحاق پر اس سے پہلے پوری کی (یعنی نبوت عطا فرمائی) تھی بیشک تیرا رب بڑھ کر علم والا اور بڑھ کر حکمت والا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ ⑦

(۷) بیشک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے واقعات) میں پوچھنے والوں کیلئے (عبرت) کی بہت سی نشانیاں ہیں

اس آیت مجیدہ میں آیت سے مراد عبرت کی نشانیاں ہیں کہ بھائیوں نے محض حسد کی بنا پر اپنے سگے بھائی یوسفؑ کو برسا برس کیلئے مصائب میں گرفتار کردیا مگر یوسفؑ نے برداشت کردہ مصائب کو بھلا کر معاف کر دیا اور انعامات سے نوازا۔ بھائیوں کی تجویز اگلی آیتوں میں ملاحظہ فرمائیں:۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ⑧

(۸) وہ وقت قابل ذکر ہے جب (یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں) کہا بیشک یوسف اور اس کا (چھوٹا) بھائی ہمارے باپ کے نزدیک ہماری نسبت زیادہ پیارے ہیں۔ حالانکہ ہم ایک جماعت ہیں۔ بیشک ہمارا باپ کھلی غلطی پر ہے۔

ضلٰل کا معنی یہاں رائے کی خطا یعنی غلطی ہے۔ گمراہی نہیں۔ اس مادہ کے متعدد معنے ہیں۔ آگے آیت نمبر۷۵ کی تفسیر میں پوری بحث پیش کیجائیگی جہاں ضَلٰل کا معنی جستجو اور تلاش ہے۔ بھائیوں نے باپ پر غلط الزام لگایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بچے جب تک چھوٹے ہوتے ہیں ماں باپ کی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں وہ ان سے پیار کرتے ہیں۔ برادران یوسفؑ اس بات کو بھول گئے تھے کہ جب وہ چھوٹے چھوٹے تھے تو السید یعقوبؑ ان سے بھی اسی طرح پیار کرتے تھے السید یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی کے ساتھ ان کا پیار انوکھا نہیں تھا۔ انہوں نے السید یوسفؑ کے خلاف یہ تجویز کی:۔

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ⑨

(۹) (بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ) یوسفؑ کو قتل کر دو یا اسے کسی دوسرے ملک میں نکال دو۔ تاکہ تمہارے والد کی توجہ تمہارے لئے خالی ہو جائے۔ اس کے بعد تم نیکو کار قوم بن جانا۔

اطرحو کا مادہ ط۔ر۔ح= طرح ہے۔ اس کا بنیادی معنی ہے کسی چیز کو دور پھینک دینا۔

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ⑩

(۱۰) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ اگر تم نے (یوسف) کے متعلق کچھ کرنا ہے تو اسے قتل نہ کرو۔ بلکہ اسے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دو تاکہ اسے کوئی قافلے (والے) لے جائیں۔

غَيَابَتِ کا مادہ غ۔ی۔ب= غیب ہے اس کا بنیادی معنی ہے زمین کی گہرائی' جس میں کوئی چیز چھپ جائے۔

الجُب جنگل کے راستے میں پرانے بے آباد کنوئیں کو کہتے ہیں ۔ بھائیوں میں سے ایک نے یہ مشورہ دیا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو بلکہ کسی ایسے کنوئیں میں ڈال دو جو جنگل کے راستے پر ہو تاکہ کوئی قافلے والے اسے نکال کسی دوسرے ملک میں لے جائیں۔

اگلی آیات مجیدہ ۱۱-۱۲ میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ بالا باہمی تجویز کے بعد برادران یوسفؑ خدمت والا میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:۔

قَالُوا يَا أَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَنَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُ لَنَاصِحُونَ ⑪

(۱۱) (برادران یوسفؑ نے) کہا ابا جان کیا ہے آپ کے لئے کہ "آپ ہم کو یوسف کیلئے امین نہیں جانتے حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں"۔

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا

(۱۲) آپ اسے کل ہمارے ساتھ (جنگل میں) بھیجیں تاکہ خوب کھائے

لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ (پئے) اور خوب کھیلے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

انبیاء سلام علیہم غیب دان نہیں ہوتے اور نہ ہی:۔

السید یعقوبؑ غیب دان تھے کہ آپ جان لیتے کہ ان کے بیٹے جو کھانے پینے اور کھیلنے کودنے کے لئے یوسفؑ کو لے جا رہے ہیں وہ اسے کنوئیں میں پھینکنے کا منصوبہ بنا چکے ہیں اور وہ غلط کہہ رہے ہیں کہ ہم اس کے محافظ ہیں۔ آپ نے ان پر اعتبار کیا اور فرمایا:۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

(۱۳) (السید یعقوبؑ نے) کہا بیشک مجھے یہ چیز غمگین کرتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ۔ اور میں خوف کرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

(۱۴) انہوں نے (جواباً) کہا کہ اگر اسے بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں، پھر تو ہم گھاٹا پانیوالوں سے ہو جائیں گے۔

اس طرح برادران یوسفؑ السید یعقوبؑ سے ملمع سازی کرکے یوسفؑ کو لے گئے مگر جو کچھ کیا اس کی خبر بالفاظ ذیل دی گئی ہے:۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

(۱۵) پھر جب اسے (یوسف کو جنگل میں) لے گئے اور اس امر پر متفق ہوگئے کہ اسے کنوئیں کی گہرائی میں ڈال دیا جائے تو ہم نے اسے وحی فرمائی کہ تو ضرور انہیں ان کے اس (برے) کام کی خبر دے گا اور (ان کی یہ حالت ہوگی کہ) وہ جانتے ہی نہ ہوں گے۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ کے الفاظ میں جو وحی قبل نبوت کا ذکر آیا ہے۔ یہ وحی نبوت نہیں تھی۔ کیونکہ آگے آیت نمبر ۱۲/۲۲ میں خبر دی گئی ہے کہ السید یوسفؑ کو نبوت سے اس وقت نوازا گیا تھا جب آپ جوان ہوگئے تھے۔ **وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا** ۱۲/۲۲ اور وہ جب (یوسفؑ) جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکم و علم (یعنی نبوت) عطا فرمائی۔ لہٰذا وہ وحی جس کا ذکر پیچھے ۱۲/۱۵ میں گزرا ہے کہ جب بھائیوں نے آپ کو کنوئیں میں پھینکا تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ ایک وقت وہ آنے والا ہے کہ آپ انہی جابر بھائیوں کو ان کے اس سلوک یعنی کنوئیں میں پھینکنے کے متعلق خبر دیں گے، لیکن انہیں اس چیز کا شعور نہ ہوگا کہ یہ وہی یوسفؑ ہے جسے ہم نے کنوئیں میں پھینک کر اپنے خیال کے مطابق مار دیا، یا ذلیل کر دیا تھا۔

لفظ وحی کا ایک معنی جی میں ڈالنا بھی ہے اس کیف و منظر کو سمجھنے کیلئے اس حقیقت پر غور کرنا ضروری ہے کہ بھائیوں کا ارادہ السید یوسفؑ کو بالکل ختم کر دینے کا تھا۔ چنانچہ اولین تجویز ۱۲/۹ کے مطابق آپ کو قتل کر دینے کی تھی اور کنوئیں میں پھینکنے کی تجویز آپ کو غلام کی حیثیت سے دور ملک بدر کرکے ذلیل کر دینے کی تھی۔ لیکن جب آپ کو کنوئیں میں پھینکا گیا تو گویا ایسا ہوا کہ آپ کو ایسی خواب یاد آگئی کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج آپ کو سجدہ کرتے ہیں، اس کی تعبیر السید یعقوبؑ نے بتائی تھی **وَكَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَیُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ** ۱۲/۶ اور اسی طرح (یعنی کسی ملک کی کابینہ کے گیارہ ارکان (گیارہ ستاروں کو) اور بادشاہ (اس ملک کے سورج کو) اور وزیر اعظم (اس ملک کے چاند) کو تیرے مطیع کرکے تیرا پروردگار تجھے برگزیدہ کرے گا۔ اور تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم سکھائے گا۔ (یعنی تجھے مذکورہ بالا مرتبہ عظیم، خوابوں کے بہ علم تعبیر کی بدولت میسر آئیگا۔ اس آیت مجیدہ میں **كَذٰلِكَ** کا مشبہ بہ اور مشار الیہ گیارہ

ستاروں اور چاند سورج کا آپ کے مطیع فرمان ہونا ہے۔ جس کی عملی تعبیر شاہ مصر' اس کے وزیر اعظم (عزیز مصر) اور اس کی کابینہ کے ان افراد کا آپ کے مطیع ہو جانا ہے' جو بادشاہ کی خواب کی تعبیر نہ بتا سکے جو صرف السید یوسفؑ نے بتائی۔

السید یعقوبؑ نے خواب کی تعبیر کے دوسرے حصے کی خبران لفظوں میں دی:۔ **وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ** ۱۲/۶ اور اللہ تعالیٰ تجھ پر اور آل یعقوب پر اسی طرح اپنی نعمت پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے تیرے دو باپوں ابراہیم اور اسحاق کو نبوت عطا فرما کر پوری کی تھی۔ (یعنی تجھے منصب نبوت سے بھی سرفراز کیا جائیگا)

تو اس طرح یہ خواب اور اس کی مذکورہ تعبیر جو السید یعقوبؑ اللہ کے پاکیزہ نبی نے بتائی تھی السید یوسفؑ کو یاد آئی۔ اس لئے آپ کو یقین کامل تھا کہ آپ کو نبوت بھی ضرور ضرور عطا کی جائیگی اور آپ اس منصب عظیم پر بھی ضرور پہنچیں گے کہ وزیر اعظم اور بادشاہ سمیت کسی ملک کا پورا حکمران عملہ آپ کے مطیع ہو جائے گا۔ اس یقینی تصور کے مطابق آپ کے ذہن (جی) میں یہ چیز آئی کہ یہ سب بھائی آج میری جان تک کے دشمن بنے ہوئے ہیں' ایک دن میرے پاس آئیں گے' میں انہیں ان کا یہ سلوک جو انہوں نے میرے ساتھ کیا ہے' یاد کراؤں گا۔ مدت دراز گزر چکی ہوگی اور عدم پہچان کی بدولت انہیں شعور تک نہ ہوگا کہ یہ وہی یوسفؑ ہے جسے ہم نے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ یہ جو کچھ آپ کے جی میں آیا' چونکہ عین منشاء الٰہی کے مطابق تھا' اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسے **اَوْحَيْنَآ** کے الفاظ میں اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جیسے کہ جنگ بدر میں جو تیر اندازی نبیؐ نے فرمائی تھی اسے اللہ تعالیٰ نے اس لیے بالفاظ ذیل اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ وہ عین منشاء الٰہی کے مطابق تھی:۔ **وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** ۸/۱۷ اور نہیں تیر پھینکے آپ نے جب آپ نے تیر پھینکے' ولیکن خود اللہ تعالیٰ نے پھینکے تھے۔ اسی آیت مجیدہ میں صحابہؓ کے قتال کو خود اللہ تعالیٰ کا قتال کہا گیا ہے:۔ **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ** ۸/۱۷ پس (اے صحابہؓ!) کافروں کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے قتل کیا۔ بالکل اسی طرح بیعت رضوان چونکہ عین منشاء الٰہی کے مطابق تھی' اس لئے اسے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے:۔ **اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ط يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ** ۴۸/۱۰ بیشک اے رسول جن صحابہ نے آپ کے ساتھ بیعت کی' سوائے اس کے نہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت کی ہے۔ ان کے ہاتھوں پر (آپ کا ہاتھ گویا) اللہ کا ہاتھ تھا۔ پس جس طرح ان اعمال کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اسی طرح السید یوسفؑ کے جی میں جو آیا کہ وہ انہیں ان کا یہ عمل یاد کرائیں گے چونکہ رضاء الٰہی کے مطابق تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے **اَوْحَيْنَآ** کے الفاظ میں اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ یہ ہم نے اس کے جی میں ڈالا تھا۔ کنوئیں میں پھینکنے کے بعد بھائی عشاء کے وقت جھوٹا رونا روتے ہوئے آئے:۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ

(۱۶) اور وہ عشا کے وقت (یعنی غروب آفتاب کے بعد) باپ کے پاس روتے ہوئے آئے کہا اے باپ! ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے گئے اور اپنے اسباب کے پاس یوسفؑ کو چھوڑا' اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اور تو ماننے والا نہیں اور اگرچہ ہم سچے ہی ہوں۔

(۱۸) اور وہ اس (یوسفؑ) کے کرتے پر نقلی خون لگا لائے (السید یعقوب نے) کہا (یہ غلط ہے کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے) بلکہ یہ امر (تم نے

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ﴿۱۸﴾

خود (گھڑ لیا ہے) تمہارے نفسوں نے اسے اچھا کر دکھایا ہے۔ پس اچھا تو صبر ہی ہے اور اللہ ہی سے مدد طلب کرنا ہے' اس پر جو تم بیان کرتے ہو۔

برادران یوسف نے السید یوسفؑ کو تو کنوئیں میں پھینک دیا مگر غروب آفتاب کے بعد جھوٹا رونا روتے ہوئے آئے اور بہانہ یہ بتایا کہ ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے تھے' یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑا تھا' اس طرح ہماری عدم موجودگی میں یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔

کیا بھیڑیئے نے کھانے سے پہلے کرتہ اتروالیا تھا؟۔ بھائی کرتے پر جعلی خون تو لگا لائے اور حضور والد میں پیش بھی کر دیا مگر السید یعقوبؑ کوئی بچے نہیں تھے کہ آپ اتنا بھی نہ جان سکتے تھے کہ اگر یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہوتا تو کرتہ بھی ساتھ ہی کھایا جانا لازم تھا' یہ کیسے ممکن تھا کہ یوسف کو کھانے سے پہلے بھیڑیئے نے آپ کا کرتہ اتروالیا ہو' تاکہ اسے بھائی خون لگا کر حضور والد میں پیش کر دیں۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا کے الفاظ میں السید یعقوبؑ نے بیٹوں کی خود تراشیدہ تجویز عیاں کر دی ہے۔ کہ یوسف کو کھالینا اور اس کے خون آلود کرتے کو چھوڑ دینا بھیڑیئے سے ممکن نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ سارا ڈرامہ تمہارا اپنا تراشیدہ ہے۔ اور خون آلودہ کرتا لا دکھانے کے بہانے کو تمہارے نفسوں نے خوب کر دکھایا ہے۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ کے الفاظ میں سنت انبیاء کے مطابق اس مصیبت کو مستقل مزاجی کیساتھ برداشت کرنے کی خبر دی گئی ہے۔

وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ کے الفاظ میں السید یعقوبؑ نے اپنے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ آپ اس مصیبت میں صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں گے۔ کیونکہ اس ذات مقدس کے سوا کوئی اور نہ غائبانہ مدد کر سکتا ہے اور نہ مصیبتیں دور کر سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر السید یعقوبؑ نے فرمایا (کہ یہ جھوٹ ہے کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے) بلکہ یہ واقعہ تم نے خود گھڑ لیا ہے۔ اور تمہارے نفسوں نے اسے اچھا کر دکھایا ہے۔ پس صبر ہی بہتر ہے۔ (میں مستقل مزاج رہوں گا) اور اس پر اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کرنا ہے جو تم بیان کرتے ہو۔ کیونکہ وہی مشکلات و مصائب کے وقت مدد کر سکتا ہے' وہی مشکل کشا اور وہی مدد گار ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جس کنوئیں میں السید یوسفؑ کو پھینکا گیا تھا' اس کے پاس ایک قافلے والوں نے قیام کیا' انہوں نے اپنا پانی لانے والا آدمی بھیجا اس نے کنوئیں میں ڈول ڈالا تو اسے یوسفؑ کا پتہ چلا۔ انہیں نکال لایا اور اہل قافلہ کو خوشخبری دی کہ یہ ایک غلام ملا ہے' انہوں نے آپ کو بیچنے کے لئے چھپا لیا۔ لیکن چونکہ آپ انہیں مفت مل گئے تھے اس لئے آپ کو مصر میں جاکر چند درہموں کے عوض بیچ دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

(۱۹) اور (وہاں) آیا ایک قافلہ۔ پھر ان (قافلے والوں نے) اپنا پانی لانیوالا (کنوئیں پر) بھیجا۔ پھر اس نے (کنوئیں میں) اپنا ڈول لٹکایا۔ (تو یوسف کو پایا اور) کہا اے خوشخبری یہ ایک لڑکا ہے۔ انہوں نے اسے بیچنے کی چیز (غلام) بنا کر چھپا لیا۔ اور اللہ جانتا ہے وہ (بردہ فروش) جو عمل کرتے ہیں۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ ﴿٢٠﴾

(۲۰) اور انہوں نے اسے (یوسف کو) تھوڑی سی قیمت چند درہموں کے عوض بیچ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے بارے میں بے رغبت تھے۔

وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۚ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢١﴾

(۲۱) اور اس شخص نے جس نے اسے (یوسف کو) مصر میں خریدا' اپنی بیوی کو کہا کہ اسے عزت کی جگہ دینا (اسے عزت سے رکھنا) ہوسکتا ہے یہ ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور مذکورہ بالا طریقے سے ہم نے یوسف کو (مصر کی) زمین میں ٹھکانہ دیا اور تاکہ ہم اسے خوابوں کی تعبیر سکھائیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ کا لفظی معنی یہ ہے کہ اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔ کس میں لٹکایا؟ یہاں کنواں محذوف ہے۔

هٰذَا غُلٰمٌ کے الفاظ سے ماقبل ذیل کا سارا مفہوم محذوف ہے کہ جب اس نے کنوئیں میں ڈول ڈالا تو یوسفؑ نے اپنی کنوئیں میں موجودگی کی اطلاع دینے کیلئے ڈول کو پکڑ لیا۔ جب پانی لانے والے نے یوسفؑ کو دیکھا تو قافلے والوں کو خوشخبری دی کہ اس نے ایک لڑکا پایا ہے۔ اس پر کچھ افراد یوسف کو نکالنے کیلئے آگئے اور آپ کو بحفاظت تمام باہر نکال لیا۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں پہلا یہ کہ یوسف کنوئیں میں کتنا عرصہ رہے اور دوسرا یہ کہ آپ جتنا عرصہ رہے کس طرح رہے ڈوبے کیوں نہ؟ اس ضمن کے پہلے سوال کا جواب تو **وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ** کے الفاظ میں موجود ہے کہ برادران یوسف کے واپس ہونے کے جلدی بعد وہاں قافلہ آگیا۔ کیونکہ اگر **فَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ** ہوتا' یعنی اگر واؤ کی بجائے فا ہوتی تو اس میں کچھ وقفہ متصور ہوسکتا تھا۔ لیکن چونکہ واوَ آئی ہے اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بھائیوں کے واپس ہونے کے فوراً بعد قافلہ آگیا اور انہوں نے پانی لانے والے کو پانی لانے کے لئے بھیج دیا۔ تجارتی قافلے جو ایک ہی راستے پر سے ہمیشہ گزرتے تھے' انہیں معلوم ہوتا تھا کہ فلاں مقام پر پانی کا چشمہ یا کنواں ہے۔ مذکورہ قافلے والوں نے اپنی معلومات کے مطابق مذکورہ کنوئیں پر آکر قیام کیا۔

اس ضمن کا دوسرا یہ سوال کہ آپ جتنی دیر کنوئیں میں رہے' کس طرح رہے ڈوبے کیوں نہ؟ اس کا جواب مشاہدات میں موجود ہے کہ کنوئیں کو صاف کرنے کے لئے' صاف کرنے والے کے ستانے کے لئے کنوئیں میں تھڑی سی بنی ہوئی ہوتی ہے السید یوسفؑ ابھی تھوڑی ہی دیر تھڑی پر ٹھہرے تھے کہ اوپر سے ڈول لٹک پڑا۔ آپ نے اسے پکڑ لیا۔ ڈول والے نے دیکھا کہ یہ ایک حسین و جمیل لڑکا ہے۔ اس پر اس نے قافلے والوں کو خوشخبری دی **يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ**۔ اس پر بہت سے افراد آگئے اور آپ کو بحفاظت تمام نکال لیا گیا۔

اَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ قافلے والوں نے السید یوسفؑ کو بیچنے کیلئے غلام بنا کر چھپا لیا۔ ان کی نیت شروع ہی سے یہ ہوگئی کہ اسے بیچ کر رقم وصول کر لیں گے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ قافلے والے انسانوں کو بیچ کر جو تذلیل انسانیت کرتے ہیں اسے وہ خوب جاننے والا ہے۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ کے الفاظ میں فعل ماضی جمع شَرَوْا کے فاعل برادران یوسف نہیں ہیں' جن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے السید یوسف کو بہت تھوڑی قیمت یعنی چند درہموں کے عوض بیچ دیا۔

وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ کے الفاظ میں قافلے والوں ہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ السید یوسف کی بحیثیت غلام کوئی بھاری قیمت حاصل کرنے کے ضمن میں بے رغبت تھے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ انہیں یہ غلام مفت ہاتھ آیا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ دیکھتے تھے یہ کوئی خاندانی لڑکا ہے۔ اگر اس کے وارث پہنچ گئے تو لڑکا بھی ہاتھ سے چلا جائے گا اور کسی سزا کے بھی مستحق ٹھہریں گے۔ اس لئے تھوڑی قیمت وصول کرکے اپنے آپ کو مذکورہ خطرے سے آزاد کر لیا۔

قَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ .... الخ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ السید یوسفؑ شہر مصر میں بکے تھے۔ اور خریدنے والا آپ کو گھر لے گیا اور اپنی بیوی کو کہا کہ اسے باعزت طریقے سے رکھنا۔ قرآنی الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ برادران یوسفؑ کا السید یوسف کو چند کھوٹے درہموں کے عوض بیچ دینے کا جو قصہ روایتی تفاسیر میں درج ہے غلط ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے جو أَسَرُّوهُ بِضَاعَةً کے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قافلے والوں نے السید یوسفؑ کو بیچنے کا مال یعنی غلام بنا کر چھپا لیا تھا۔ اس کی تردید نہیں کی کہ اس کے باوجود برادران یوسفؑ نے انہیں ڈھونڈھ نکالا اور بھاگا ہوا غلام بتا کر بیچ دیا۔ نیز یہ فرضی قصہ اسلئے بھی غلط ہے کہ قرآن کریم نے السید یوسفؑ کے صرف ایک ہی مرتبہ بکنے کی خبر دی ہے اس لئے دو مرتبہ بکنے کے خبر صحیح نہیں نیز:۔

اگرچہ برادرانِ یوسفؑ نے السید یوسفؑ کیساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا کہ ابا جان کو ورغلا کر بھائی کو جنگل میں لے گئے اور کنوئیں میں پھینک دیا۔ لیکن آپ کو بیچ ڈالنے کے فعل کو' جو قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا' ان کے ذمہ لگانا قرین انصاف بھی نہیں اور قرآن کریم کے خلاف بھی ہے۔ پس اس ضمن میں تمام روایاتی قصے مطلقاً" غلط ہیں کہ السید یوسفؑ کی فروخت کے لئے شہر مصر میں منادی کروی گئی تھی' اسلئے بہت سے لوگ آپ کو خریدنے کے لئے آگئے حتیٰ کہ ایک بڑھیا بھی ایک سوت کی اَنّی لے کر آپ کو خریدنے کے لئے آگئی۔ یہ سب کچھ روایتی تفاسیر کی عجوبہ پسندی کا مظہر ہے۔ قرآنی حقیقت صرف یہی ہے کہ قافلے والوں نے السید یوسف کو پاتے ہی غلام بنا کر چھپا لیا۔ اور سیدھے مصر پہنچ کر آپ کو بے رغبتی کیساتھ یعنی معمولی قیمت پر بیچ دیا۔

عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ السید یوسفؑ کو خریدنے والا بے اولاد تھا' اس نے اس خیال سے آپ کو خریدا تھا کہ آپ کو بیٹا بنالے گا۔ لیکن ہوا یہ ہے کہ جب السید یوسفؑ جوان ہوئے تو اس کی بیوی آپ پر فریفتہ ہوگئی (تفصیل آگے آرہی ہے)

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ کے الفاظ میں آمدہ لفظ مَكَّنَّا کا مفہوم یہاں پر باعزت ٹھکانہ دینے کا ہے اس کے سہ حرفی مادہ م۔ ک۔ ن' مکن کا بنیادی معنی مکان یعنی باعزت ٹھکانے کا میسر آنا بھی ہے اور حکومت کا میسر آنا بھی۔ چنانچہ جب السید یوسف حکومت مصر کے سیاہ و سفید کے مالک ہوئے تو وہاں بھی یہی باب تفعیل آیا ہے وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۱۲/۵۶ اور اسی طرح ہم نے یوسفؑ کو مصر کی زمین میں ملکی اقتدار عطا فرمایا (وہ ملک بھر میں دورے کرتے تھے اور) جہاں چاہتے تھے مقام کرتے تھے۔ آیت بالا زیر بحث میں السید یوسفؑ کو ملک مصر میں اولین باعزت مقام ملنے کی خبر دی گئی ہے۔

لِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ السید یوسفؑ کو باعزت ٹھکانہ عطا کرنے کی غرض یہ

تھی کہ آپ کو خوابوں کی تعبیر کا علم سکھایا جائے۔ اس سے مراد نبوت کا عطا کیا جانا ہے چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں خبر دی گئی ہے کہ جب آپ جوان ہوگئے تو آپ کو حکم اور علم دیا گیا۔ یعنی آپ کو شرف نبوت سے نوازا گیا۔ (تفصیل آگے آرہی ہے)

وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ کے الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کے کام میں کوئی دخل انداز نہیں ہوسکتا' وہ اپنے کام میں غالب ہے۔ یہاں اس چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ برادران یوسفؑ نے السید یوسف کو ختم کرنے کے لئے کتنی تگ و دو کی' مگر اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تو ان کی قتل یوسف کی تجویز کو خود انہی کے ایک بھائی کے ذریعہ رو کرا دیا۔ پھر ان کے کنوئیں میں پھینکنے کے بعد انہیں کنوئیں کے اندر بھی محفوظ رکھا اور بحفاظت تمام نکلوا کر اور دور شہر مصر کے وزیر اعظم (عزیز مصر) کے گھر میں باعزت ٹھکانہ عطا فرما دیا۔

السید یوسف جوان ہوگئے اور آپ کو خلعت نبوت سے نواز دیا گیا:۔ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ مصر میں انتہائی باعزت طریقے سے پلتے ہوئے یوسف جوان ہوگئے۔ اور آپ کو خالقِ مطلق نے اپنے قانون مشیت کے مطابق بے راہ نوع انسانی کی ہدایت کیلئے منصب نبوت سے سرفراز فرمایا:۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۲۲

(۲۲) پھر جب وہ (السید یوسفؑ) اپنی جوانی کو پہنچ گئے تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا۔ اور اسی طرح ہم توازن قائم کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔

عطاء حکم و علم ایک قرآنی اصطلاح ہے جو عطا نبوت کیلئے استعمال ہوتی ہے:۔ سورہ انبیاء ۷۴/ ۲۱ میں السید لوط کے متعلق ارشاد ہوا ہے **وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا** اور لوط کو ہم نے حکم و علم عطا فرمایا یعنی خلعت نبوت سے نوازا۔ اسی طرح ۷۵ تا ۷۹/۲۱ میں نوح' داؤد اور سلیمان سلام علیہم کا ذکر کرنے کے بعد ۷۹/۲۱ میں ارشاد ہوا ہے **وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا** اور ہم نے ان سب کو حکم اور علم عطا فرمایا منصب نبوت سے سرفراز کیا۔ نیز آیت بالا زیر بحث ۲۲/۱۲ ہی کے الفاظ السید موسیٰؑ کیلئے بھی ۱۴/۲۸ میں آئے ہیں **وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ** اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچا اور منصب نبوت پر پورا ہوا تو ہم نے اسے حکم و علم یعنی نبوت عطا فرمائی اسی طرح ہم توازن قائم کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ کے ۲۲/۱۲ + ۱۴/۲۸ کے تکرار سے ثابت ہوتا ہے کہ سب کے سب نبی قبل نبوت ہی معاشرے میں توازن قائم کرنے کے قابل قدر عمل کے عامل تھے۔ کوئی ایک نبی بھی ایسا نہیں تھا جو قبل نبوت ہی معاشرے کے عدم توازن کو دور کرنے کیلئے سرگرم عمل نہ ہوتا۔ واضح رہے کہ عطاء حکم سے مراد ہے وحی الٰہی کیساتھ فیصلے کرنے کا منصب اور علم سے مراد ہے وحی الٰہی' یعنی ایسا علم جس کے صد فیصد صحیح اور غیر مشکوک ہونے میں معمولی سی بھی گنجائش موجود نہ ہو۔

زن عزیز کی نیت میں فتور آگیا:۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے السید یوسفؑ کو نبوت عطا فرمائی اور ادھر زن عزیز مصر۔ جس کے پاس آپ رہتے تھے' کی نیت بگڑ گئی۔ وہ آپ کے شباب اور حسن و جمال پر بہ ہزار جان فریفتہ ہوگئی اور ایک دن دروازے بند کرکے حسن و جمال کے حضور میں اپنی فریفتگی کا اظہار کرتے ہوئے اور آپ کو جنسی خیانت کی دعوت دیتے ہوئے اپنا آپ پیش کر دیا۔ پھر کیا ہوا' اس نقشے کو الفاظ الٰہی میں ملاحظہ فرمائیں:۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

(۲۳) اور اس عورت نے جس کے گھر میں وہ السید یوسفؑ رہتے تھے' آپ کو ان کی جان سے پھسلانا چاہا اور دروازے بند کر لئے اور کہا آ' تیرے واسطے (ہوں میں) آپ نے فرمایا اللہ کی پناہ! میرے رب نے میرے مقام کو بہت احسن کیا ہے۔ (میں ایسا آدمی نہیں ہوں) بیشک شان یہ ہے کہ ظالم (جنسی خیانت کرنوالے) کامیاب نہیں ہوتے۔

رَاوَدَتْهُ میں مادہ ۔ ر۔و۔د کا بنیادی معنی ہے کسی چیز کی طلب میں نرمی اور منت و سماجت کے ساتھ کوشش کرنا۔ وہ عورت آپ کی شبانہ روز خدمت کرتی تھی لیکن اس کا ہر عمل طلب مراد کی طرف ایک ایک قدم تھا۔ بالآخر ایک دن دروازے بند کرکے اپنی خواہش نہایت نرمی اور منت و سماجت کیساتھ پیش کر دی۔

هَيْتَ لَكَ میں لفظ هَيْتَ کا معنی ہے آ۔ اور **لَكَ** جار مجرور کا لفظ معنی ہے واسطے تیرے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ میں تیرے واسطے ہوں۔ تجھ پر بہ ہزار جان فریفتہ اور قربان و نثار ہوں۔ یعنی وہ انتہائی نرمی اور سماجت کے ساتھ اپنے برے ارادے کی تکمیل کی خواہاں ہوئی ۔ مگر۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ آپ نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے وقفہ کیلئے بھی تردد نہ فرمایا اور فوراً" ارشاد فرمایا اللہ کی پناہ۔

اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ میرے رب نے میرے ٹھکانے کو بہت اچھا کیا ہے۔ لفظ مثویٰ کا معنی رہنے کی جگہ یعنی ٹھکانہ بھی ہے اور ذاتی مقام بھی ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کا بلند مقام عطا فرمایا تھا۔ ان الفاظ میں آپ نے اپنے مقام نبوت کی نشاندہی فرمائی تھی۔ اگر یہاں رہنے کا ٹھکانہ مراد لیا جائے تو یہ شان نبوت کے منافی ہے کہ آپ نے زن عزیز کے برے ارادے کی تکمیل اس لئے نہ کی کہ کہیں ظاہر ہونے پر آپ سے آپ کا ٹھکانہ نہ چھن جائے۔ بلکہ آپ نے **هَيْتَ لَكَ** کے جواب میں معا معاذ اللہ کہا اور ساتھ ہی اپنی نبوت کے مقام بلند کی خبر دیدی کہ میرے پروردگار نے تو مجھے پوری انسانیت کو برائیوں سے روکنے کیلئے مبعوث فرمایا ہے تو مجھ سے برائی کی طلب گار ہوئی ہے۔

ظٰلِمُوْنَ ظالم کی جمع ہے۔ اس کا سہ حرفی مادہ ظ۔ل۔م ظلم ہے اس کا بنیادی معنی ہے اندھیرا' **وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ** قمری مہینے کی آخری تین راتوں کو **ظلم** کہتے ہیں اور سخت اندھیری رات کو **ظلم** کہا جاتا ہے۔ ہر ناروا کام جو اندھیر گردی کے ضمن میں آتا ہے اسے ظلم کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ۳۱/۱۳ میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ جنسی خیانت بھی چونکہ ایک عظیم ناروا فعل ہے اسلئے آیت بالا ۱۲/۲۳ میں اسے بھی ظلم بتایا اور جنسی خیانت کرنوالے بدکاروں کو ظالم قرار دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ کے نبی رسول ہر قسم کے ظلم سے پاک منزہ تھے۔

ایک اہم غلط فہمی:۔ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ عورت نے تو بدکاری کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ السید یوسف نے ہرگز ارادہ نہ کیا' اگر آپ نے اپنے پروردگار کی نبوت کی روشنی نہ دیکھی ہوتی تو ہوسکتا تھا کہ آپ بھی ارادہ کر لیتے۔ لیکن روایتی تفاسیر نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ زن عزیز نے بھی ارادہ کر لیا اور معاذ اللہ مگر یوسفؑ نے بھی کر لیا۔ مگر باز اس طرح سے رہے کہ آپ کو بروقت برہان دکھائے گئے۔ یہ ناشدنی اور ناگفتنی تصور روایتی تفاسیر نے آیت ذیل سے پیش کیا ہے آیت مجیدہ کے الفاظ اور حقائق قرآنیہ کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

(۲۴) اور بیشک بیشک اس عورت نے اس (یوسف) کیساتھ برائی کا

وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصۡرِفَ عَنۡهُ السُّوۡٓءَ وَالۡفَحۡشَآءَ اِنَّهٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۲۴﴾

اور البتہ تحقیق اس عورت نے اس (یوسف) کو برائی پر آمادہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس (یوسف نے) اس عورت سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا ۱۲/۲۵ اگر اس نے اپنے رب کی طرف سے (نبوت کی) روشنی نہ دیکھی ہوتی (تو ہوسکتا تھا کہ شاید پھسل جاتا) ایسا ہی ہوا تاکہ ہم (اس کے بھاگ جانے سے) برائی اور بے حیائی کو اس سے پھرا ہوا پاتے۔ بیشک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھا۔

وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا میں آمدہ دونوں افعال:۔

هَمَّتۡ اور **هَمَّ** کے مفعول الگ الگ محذوف ہیں۔ **هَمَّتۡ بِهٖ** کا مفعول آیت ماسبق ۱۲/۲۳ میں آمدہ الفاظ **رَاوَدَتۡهُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ** سے عیاں ہے السید یوسف کو برائی پر آمادہ کرنے کا ارادہ اور **هَمَّ بِهَا** کا مفعول اگلی متصلہ آیت مجیدہ ۱۲/۲۵ میں **وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ** کے الفاظ سے عیاں ہے' اس عورت سے بھاگ جانے کا ارادہ۔ پس اس جملہ **وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا** کا مختصر لفظوں میں ترجمہ یہ ہے:۔ اور البتہ تحقیق اس عورت نے اس (یوسف) کو برائی پر آمادہ کرنے کا ارادہ کیا مگر اس (السید یوسفؑ نے) اس عورت سے بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔ دونوں کا الگ الگ ارادہ ان کے الگ الگ شخصی مقام کے مطابق تھا۔ **فافهموا وتدبّروا۔**

انتہائی قابل غور:۔ **بُرۡهَانَ رَبِّهٖ** کا ذکر ماقبل آیت مجیدہ ۱۲/۲۲ میں گزر چکا ہے نبوت کی روشنی دیکھنا۔ **وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا** پھر جب وہ جوان ہوگیا تو اسے ہم نے حکم و علم (یعنی نبوت) عطا فرمائی۔ یہ نبوتِ الٰہی کی روشنی تھی جس کو **بُرۡهَانَ رَبِّهٖ** کہا گیا ہے۔ نیز واضح رہے کہ **وَلَقَدۡ هَمَّتۡ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا** کے بعد جیم کا وقف ہے۔ یعنی یہاں تک ایک بات ختم ہوئی۔ آگے دوسری بات یہ شروع ہوتی ہے **لَوۡلَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡهَانَ رَبِّهٖ** یہ جملہ شرطیہ ہے جس کی یہ جزا محذوف ہے۔ کہ اگر اس نے نبوت کی روشنی نہ دیکھی ہوتی (تو ہوسکتا تھا کہ شاید پھسل جاتا)۔ شرط موجود اور جزا محذوف کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں جیسے کہ ۱۳/۳۱ میں شرط موجود اور جزا محذوف ہے **وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُيِّرَتۡ بِهِ الۡجِبَالُ اَوۡ قُطِّعَتۡ بِهِ الۡاَرۡضُ اَوۡ كُلِّمَ بِهِ الۡمَوۡتٰى** اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا جس کے ساتھ پہاڑ چلائے جاسکتے یا زمین کی مسافت طے کی جاسکتی یا اس کے ساتھ مردوں سے باتیں کی جاسکتیں' اس شرط موجود کی جزا محذوف یہ ہے تو اس قرآن کے ساتھ بھی ایسا ہوسکتا۔ چونکہ دنیا بھر میں ایسی کوئی پڑھنے کی چیز موجود ہی نہیں جس کے پڑھنے سے فرق عادت چیزیں عمل میں آسکیں' اسلئے اس قرآن سے بھی ایسا نہیں ہوسکتا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ **بُرۡهَانَ رَبِّهٖ** کیا تھا جس کی بدولت آپ ایک بہت بڑے امتحان میں صد فیصد کامیاب و کامران ہوئے۔ اس کا ذکر ماقبل ۱۲/۲۲ میں گزر چکا ہے **وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا** اور جب وہ جوان ہوگیا تو ہم نے اسے حکم و علم عطا فرمایا۔ نور نبوت سے منور کر دیا۔ اس کے برعکس روایتی تفاسیر میں انتہائی ناگفتنی تصورات پیش کیے گئے ہیں۔ جیسے کہ مشہور و معروف تفسیر موضح القرآن نشر کردہ شیخ برکت علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور کے صفحہ ۲۳۴ پر لکھا ہے کہ جب زن عزیز کو اپنے مطلب میں کامیابی نہ ہوئی تو۔ زلیخا نے تکیے تلے سے خنجر نکالا اور کہا اگر تو میری بات نہیں مانتا تو میں اپنا گلا کاٹتی ہوں۔ یہ کہا اور خنجر حلق پر رکھ ہی دیا السید یوسفؑ نے دیکھا کہ اب بڑی خرابی ہوئی۔ ہاتھ زلیخا کا پکڑ لیا اور کہا جلدی نہ کر' جو تو کہیگی سو کروں گا' اور ناچار ہوئے۔ سامنے وہاں ایک پردہ لٹکتا تھا۔ السید یوسف نے پوچھا کہ اے زلیخا اس پردے کے پیچھے کیا ہے۔ اس نے کہا ایک مورت ہے کہ جس کی میں پوجا کیا کرتی ہوں۔ اس وقت شرم سے اس کے آگے

پردہ ڈال دیا ہے جو اس کام پر اس کی نظر نہ پڑے۔ یوسف علیہ السلام نے دل میں خوف کیا اللہ تعالیٰ سے کہ اس کو بت سے جو نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ بولتا ہے شرم آئی اور مجھ کو اپنے رب سے جو دانا بینا جاننے والا سب وقت سب کے حال کا ہے' میں ایسے اللہ سے کیوں نہ شرماؤں۔

بالفاظ دیگر اگر السید یوسفؑ اس پردے کو نہ دیکھتے تو معاذ اللہ! معاذ اللہ باز نہ آتے۔ تفسیر قاضی نور محمد صاحب کے صفحہ ۵۰۴ پر لکھا ہے:۔ قصد مخالفت کا اس کے کرنا یعنی صورت السید یعقوبؑ کی دانتوں تلے انگلی دبائے ہوئے نظر آگئی یا نور عصمت الہی اور لمعہ نبوت یوسفی تھا کہ حائل ہوگیا درمیان یوسفؑ کے اور اس چیز کے کہ موجب غضب الہی تھی یا سقف خانہ پر **لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا** لکھا دیکھا۔ دیوار پر دیکھا جو برابران کے تھی دیکھتے تھے دیکھا تو **لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا** لکھا دیکھا۔ دوسری دیوار پر جو نظر کی تو **اِنَّ عَلَيْكَ لَحٰفِظِيْنَ** لکھا پایا (بیشک ہم تیری حفاظت کرنیوالے ہیں) تیسری دیوار پر جو نگاہ گئی تو **وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ** مسطور تھا (کہ ڈرو اس دن سے جس میں تم نے اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے) چوتھی دیوار پر جو نظر پڑی تو **يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ** لکھا دیکھا (کہ اللہ تعالیٰ نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور اسے بھی جو تم اپنے ذہنوں میں چھپاتے ہو) جو سر اٹھایا تو **اِنَّنِىْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى** لکھا پایا (کہ بیشک وہ تم دونوں کے ساتھ ہے سنتا ہے اور دیکھتا ہے)۔ چھت پر جو ان کی نظر پڑی تو صورت یعقوب یا صورت عزیز کی دیکھی کہ اشارت بھاگنے کی کرتے تھے۔

دیکھا آپ نے کہ اس طویل تحریر میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ السید یوسفؑ کو برائی سے بچانے کے لئے کتنی چیزیں دکھائی گئی تھیں۔ بالفاظ دیگر اگر ایسا نہ کیا جاتا تو معاذ اللہ معاذ اللہ السید یوسف باز نہ آتے۔ ان تحریروں سے شان یوسفی بلاوجہ داغدار ہوتی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں موجود ہے کہ جونہی زن عزیز نے اپنا برا ارادہ ظاہر کیا تو السید یوسفؑ نے بلا توقف فوراً" ارشاد فرمایا معاذ اللہ! للہ کی پناہ! پھر قرآن کہتا ہے کہ زن عزیز نے برائی کا ارادہ کیا مگر السید نے معاً" بھاگ جانے کا ارادہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس قرآنی بیان ہی میں شان یوسفی محفوظ ہے کہ پورے جوانی اور جنسی طاقت سے معمور ہونے کے باوجود آپ عزیز کی بیوی کے فریب میں نہ آئے اور فوراً" بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس کے برعکس اگر آپ کو برائی سے بچانے کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا تسلیم کیا جائے کہ آپ کے والد السید یعقوبؑ کی تصویر دکھائی گئی دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے کہ بیٹا یہ کام نہ کرنا۔ پھر دیواروں اور چھت پر لکھا ہوا دکھایا گیا کہ زنا کے قریب نہ جا اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے وہ آنکھوں تک کی خیانت کو بھی جانتا ہے۔ پھر عزیز مصر کی تصویر دکھائی گئی جس نے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ اگر اتنے بڑے اہتمام کے بعد السید یوسف برائی سے بچے تھے تو صاف ظاہر ہے کہ روایتی تفاسیر نے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عظیم اہتمام نہ کئے جاتے تو السید یوسفؑ معاذ اللہ معاذ اللہ برائی سے نہ بچ سکتے تھے۔ لیکن واضح رہے کہ ۱۲/۲۴ میں اس واقعہ کے ابتدا ہی میں بتا دیا ہے کہ جب زن عزیز نے بدکاری کی دعوت دی تو آپ نے فوراً" جواب دیا معاذ اللہ ! اللہ کی پناہ پھر بتایا گیا ہے کہ اس عورت نے برائی کا ارادہ کیا مگر السید یوسفؑ نے بھاگ جانے کا ارادہ فرمایا اور آیت مجیدہ کے اخیر پر اعلان کیا گیا ہے **اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ** بیشک وہ یوسف ہمارے خالص بندوں میں سے تھا۔ اور خالص کی تعریف معاذ اللہ کے الفاظ ۱۲/۲۳ میں کر دی گئی ہے کہ آپ نے ایک ہزارویں سیکنڈ کے لئے بھی برائی کی طرف جھکنے کا خیال نہیں فرمایا تھا۔ پس ثابت ہوا روایتی تفاسیر کا مذکورہ سارا قصہ خود تراشیدہ ہے۔

یہ سب کچھ افترٰی محض ہے:۔ آیت مجیدہ کے قرآنی الفاظ سے بلاشبہ السید یوسفؑ کے خالص عمل میں کسی ملاوٹ کا

تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ الفاظ قرآنیہ کی حاکیت کو قائم رکھتے ہوئے بلاشبہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ عورت نے دروازہ بند کرکے آپ کو برائی کی دعوت دی۔ مگر آپ نے فوراً" معاذ اللہ کہا اور اس سے بھاگ جانے کا ارادہ فرمایا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر واضح رہے کہ روایتی تفاسیر کا یہ قصہ مطلقاً" افتریٰ محض ہے کہ زن عزیز نے تکیے تلے سے خنجر نکالا اور اپنے حلق پر رکھ دیا اور کہا کہ اگر تو نہیں مانتا تو میں اپنا گلا کاٹتی ہوں۔ اس پر آپ نے اس سے برائی کا وعدہ کر لیا معاذ اللہ! استغفراللہ! پھر اس افتریٰ کی اساس پر جو کچھ بھی پیش کیا گیا ہے سب کا سب افتریٰ محض ہے۔ بلاشبہ السید یوسف آیت قرآنیہ یعنی ارشاد الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے مخالص بندے تھے۔ اگر بالفرض زن عزیز نے خودکشی کی دھمکی دی بھی ہو تو آپ پھر بھی بدکاری کی طرف جھکنے والے ہرگز ہرگز نہیں تھے۔

كَذٰلِكَ کے الفاظ بھی مذکورہ بالا وضاحت کی تائید کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا تھا جو بیان کیا گیا ہے کہ السید یوسف نے بدکاری کی دعوت پر فوراً" معاذ اللہ کہا' وہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ **كَذٰلِكَ** میں کاف حرف تشبیہ ہے اور **ذٰلِكَ** اسم اشارہ مذکر بعید ہے جو مذکورہ بالا کے لئے آتا ہے۔ پس **كَذٰلِكَ** کے الفاظ میں انتہائی تائیدی انداز میں ارشاد ہوا ہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہی ہوا کہ السید یوسفؑ نے معاذ اللہ کہہ کر بدکاری کی دعوت دینے والی عورت سے بھاگ جانے کا ارادہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ بالفاظ دیگر **كَذٰلِكَ** کے تائیدی الفاظ میں بھی السید یوسفؑ کے خلوص پر مہر تصدیق موجود ہے۔

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ کے الفاظ میں جو **نَصْرِفَ** فعل مضارع جمع متکلم آیا ہے' اس میں خاصہ وجدان ہے۔ سابقہ قرآنی وضاحت کے مطابق اللہ کے خالص بندے السید یوسفؑ نے برائی کے ارادے کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی اپنے قریبؑ نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ اسلئے فعل **نَصْرِفَ** کے خاصہ وجدان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے السید یوسفؑ کے کامل مکمل اور بے پناہ خلوص کی بدولت برائی اور بے حیائی کو آپ سے پھرا ہوا پایا تھا' اور اپنے پاس آئی ہوئی برائی اور بے حیائی کو خود السید یوسفؑ نے اپنے پاس سے پھیر دیا تھا ---- ہوسکتا ہے **نَصْرِفَ** فعل ثلاثی مجرد کے متعلق آپ کے ذہن میں یہ اعتراض کروٹیں لے رہا ہو کہ اہل قواعد نے افعال ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان تسلیم نہیں کیا۔ اس کے لئے ادارہ کی شائع کردہ تفسیر القرآن بالقرآن جلد اول کے دیباچہ کے صفحہ ۱۰۵ پر عنوان افعال ثلاثی مجرد کا خاصہ وجدان بغور ملاحظہ فرمائیں قرآن کریم اپنی قواعد بھی خود پیش کرتا ہے۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ کا معنی اور مفہوم یہ ہے "مذکورہ بالا کی مثل ہی ہوا تھا تاکہ ہم السید یوسفؑ کے بے پناہ خلوص کی بدولت برائی اور بے حیائی کو اس سے پھرا ہوا پائیں۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ کا جملہ روایتی بہتانات کی تردید اور آپ کی عصمت کی حفاظت کیلئے حصار عظیم ہے۔ یہ جملہ **ان** حرف تاکیدیہ سے شروع ہوتا ہے جو آپ کے خلوص کے خلاف کسی معمولی سے معمولی گنجائش تک کو بھی ختم کرنے کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس تاکیدیہ اعلان الٰہی کے خلاف السید یوسفؑ کے خلوص میں معمولی ساشگاف پیدا کرنا بھی قرآنی اسلوب بیان اور عصمت انبیاء سے بے خبری کی دلیل ہے۔

آیت مجیدہ ماقبل ۱۲/۲۴ میں **وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا** کی قرآنی تفسیر میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ زن عزیز نے آپ کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا اور آپ نے اس سے بھاگ جانے کا ارادہ فرمایا۔ اسی چیز کی تصدیق اگلی عین متصلہ آیت مجیدہ میں کی گئی ہے کہ السید یوسفؑ نے اس عورت سے جو بھاگ جانے کا ارادہ کیا تھا اس کے مطابق بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن وہ

عورت بھی جنسی جنون کی مستی میں آپ کے پیچھے بھاگی اور آپ کی قمیض کو پیچھے سے کھینچ کر پھاڑ ڈالا' آپ اسے ہمیشہ کیلئے بھاگ جانے کا ارادہ کر چکے تھے مگر باہر دروازے پر مذکورہ عورت کا شوہر عزیز مصر آپہنچا چنانچہ ارشاد باری ہے:۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوٓءًا إِلَّآ أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾

(۲۵) اور وہ دونوں دروازے کی طرف بھاگے (آگے الیسد یوسفؑ تھے اور پیچھے زن عزیز تھی۔ اس نے پیچھے سے ان کی قمیض کھینچی) اور ان کی قمیض کو پھاڑ دیا۔ اور دونوں نے دروازے پر اس عورت کے شوہر (عزیز مصر) کو پایا۔ عورت نے (مکّارانہ انداز سے) کہا اس کی کیا سزا ہے جو تیری بیوی کیساتھ برائی کا ارادہ کرے۔ سوائے اس کے کہ یا تو وہ قید کر دیا جائے یا اسے درد ناک سزا دی جائے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ میں چونکہ واؤ آئی ہے فا نہیں آئی اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ الیسد یوسفؑ بھاگنے کا ارادہ کرنے کے بعد فوراً بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ کے پیچھے زن مذکورہ بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔ اسلئے تقدیر کلام یہ ہے:۔ **وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا ---- وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ** اور مفہوم یہ ہے:۔ اور بلاشبہ اس عورت نے الیسد یوسفؑ کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا مگر آپ نے بھاگ جانے کا ارادہ فرمایا---- اور آپ دروازے کی طرف دوڑے۔ پیچھے وہ بھی بھاگی۔ (آپ کی قمیض کھینچی اور) ان کی قمیض کو پیچھے کی طرف سے پھاڑ کر خود ہی یہ ثبوت مہیا کر دیا کہ:۔ الیسد یوسفؑ کی پیچھے کی طرف کی چاک دامانی قیامت تک کیلئے آپ کی پاک دامانی کی دلیل بن گئی۔ جو لوح فلک پر سورج کی کرنوں کیساتھ لکھی ہوئی قیامت تک جگمگ جگمگ کرتی رہیگی۔

وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ادھر جب وہ دونوں آگے پیچھے بھاگتے ہوئے الیسد یوسفؑ کی تاریخی قمیض کو پھاڑ پھڑوا کر دروازے پر پہنچے تو اتفاق ایسا ہوا کہ ادھر سے عزیز مصر یعنی اس عورت کا شوہر بھی دروازے پر پہنچ گیا۔ پھر کیا ہوا؟

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوٓءٌ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اپنا آپ پیش کرکے **هَيْتَ لَكَ** کی دعوت دینے والی نے مکارانہ طور پر شوہر سے کہا کہ اس شخص کی کیا سزا ہے جو تیری بیوی کیساتھ برائی کا ارادہ کرے۔ اور خود ہی سزا بھی تجویز کر دی کہ یا اسے قید کر دینا چاہئے یا اسے کوئی درد ناک سزا دی جانی چاہئے۔ وہیں اس عورت کے خاندان سے بھی ایک شخص پہنچ گیا۔ الیسد یوسفؑ نے اس کے سامنے یہ بیان دیا کہ برائی کی دعوت اس عورت نے دی مگر میں بھاگ کھڑا ہوا۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾

(۲۶) (الیسد یوسفؑ نے) کہا اس عورت نے مجھ کو میری جان سے پھسلانا چاہا۔ اور ایک (مشاہداتی) گواہ نے گواہی دی جو اس عورت کے خاندان کا آدمی تھا کہ اگر اس (یوسفؑ) کی قمیض آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو یہ عورت سچی ہے اور وہ (یوسفؑ) جھوٹوں میں سے ہے۔

وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾

(۲۷) اور اگر اس (یوسفؑ) کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس عورت نے جھوٹ بولا ہے اور وہ (یوسفؑ) سچوں میں سے ہے۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ

(۲۸) پھر جب اس نے دیکھا کہ (یوسفؑ) کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو

مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

کہا کہ یہ تمہاری (عورتوں کی) بری تجویز ہے۔ بیشک تمہاری تجویز بہت بڑی ہے۔

شَهِدَ شَاهِدٌ میں آمدہ لفظ لفظ **شَاهِدٌ** کا معنی ہے گواہ۔ مخبر۔
واضح رہے کہ عموماً گواہ اسے کہتے ہیں جو موقعہ پر موجود ہو۔ تو اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کیا وہ شخص بند دروازوں کے اندر موجود تھا؟ اس کا صاف جواب ہے' ہرگز نہیں۔ تو ان حالات میں قرآن کریم نے اسے شاہد کیوں کہا ہے؟ اس کا جواب خود اس کی گواہی کے الفاظ میں موجود ہیں کہ اگر السید یوسفؑ کی قمیض آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت سچی ہے کہ دست درازی یوسفؑ نے کی ہے اور عورت نے اپنی حفاظت کرتے ہوئے اس کی قمیض پھاڑ دی ہے۔ اور اگر قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو عورت جھوٹی ہے' دست درازی اس کی ہے' یوسفؑ اپنی عصمت بچانے کیلئے بھاگے ہیں اور اسی عورت نے انہیں پیچھے سے کھینچ کر ان کی قمیض پھاڑ ڈالی ہے۔ ایسے گواہوں کو مشاہداتی گواہ کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ سانپ کی لکیر دیکھ کر ایک شخص کہتا ہے کہ یقیناً یہاں سے سانپ گزرا ہے۔ یا کسی جگہ پر شیر کے پنجوں کے نشان دیکھ کر ایک مشاہداتی گواہ کہتا ہے یہاں سے شیر کا گزر ہوا ہے۔

روایتی تفاسیر موضح القرآن میں لکھا ہے کہ کمرے میں ایک چار ماہ کا بچہ تھا جس نے یہ گواہی دی تھی۔ چار ماہ کے بچے کو نہ شعور ہوتا ہے نہ وہ بولتا ہے اور نہ ہی کسی بھی قانون میں چار ماہ کے بچے کی گواہی قابل قبول ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعہ کی اصل گواہ السید یوسفؑ کی پیچھے سے پھٹی ہوئی قمیض تھی جو بزبان حال گواہی دے رہی تھی کہ دست درازی عورت کی ہے' السید یوسفؑ کی نہیں۔ چنانچہ اسی قمیض کی گواہی پر ایک مشاہداتی شاہد نے صحیح صحیح گواہی دی۔ اور کہا کہ عورتو! یہ تمہاری بری تجویزوں میں سے ایک بری تجویز ہے۔ اس مشاہداتی گواہ نے السید یوسفؑ کو کہا کہ (آپ اس کے گھر میں رہتے ہیں) اس کی اس حرکت سے درگزر کریں اور اس عورت کو کہا کہ اپنے گناہ کے بدلے اللہ کے حضور استغفار کر بیشک اس معاملہ میں تو ہی خطا کار ہے:۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

(۲۹) (اس مشاہداتی گواہ نے السید یوسف کو کہا) اے یوسف! اس معاملہ سے درگزر کریں اور (اس عورت کو کہا کہ) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ۔ بیشک تو خطاروں میں سے ہے۔

یہ آیت مجیدہ پچھلی آیت ہی کا بقیہ ہے اس میں پچھلی آیت مجیدہ **قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ** میں آمدہ فعل **قَالَ** کا عمل بدستور جاری ہے۔ چنانچہ **يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا** کا فاعل یعنی ان الفاظ کا متکلم وہی مشاہداتی شاہد ہے' جس نے مشاہداتی گواہی بھی دی اور فیصلہ بھی دیدیا کہ اس معاملہ میں عورت خطا کار ہے۔ اور چونکہ یہ کسی عدالت میں گواہی نہیں ہو رہی تھی بلکہ ایک خانگی امر تھا۔ اسلئے اس نے السید یوسف کو درگزر کرنے کی ہدایت کی اور اسے یعنی عورت کو خطا کار ٹھہرا کر اسے معافی مانگنے کی ہدایت کی۔

قرآن کریم نے اس عورت کو زن عزیز کے نام سے متعارف کرا دیا ہے۔ اسکا نام بھی قرآن کریم میں نہیں آیا۔ البتہ روایتی تفاسیر میں اس کا نام زلیخا بتایا جاتا ہے۔ اس عورت کے متعلق روایتی تفاسیر میں یہاں تک تو قرآن کریم کے مطابق آیا ہے کہ اس نے بالآخر السید یوسف کو قید کرا دیا۔ لیکن جو روایات میں آیا ہے کہ قید کرانے کے بعد پھر آپ کو قید خانے میں جاکر ملتی رہی اور انجام کار جب السید یوسف ملک مصر کے سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے تو اتنے میں یہ عورت بوڑھی اور اندھی

ہوگئی۔ ایک دن آپ کی سواری کو روک کر اپنا تعارف پیش کیا کہ میں زلیخا ہوں' آپ نے فرمایا مانگ کیا مانگتی ہے۔ اس نے عرض کیا پہلے تو مجھے آنکھیں ملیں کہ آپ کے جمال بے مثال کا نظارہ کر سکوں۔ چنانچہ آپ کی دعا سے اسے آنکھیں مل گئیں۔ اس نے آپ کو دیکھا اور تسکین حاصل کی۔

دوسری مانگ اس نے یہ کی کہ میری جوانی لوٹ آئے۔ آپ کی دعا سے وہ دیکھتے دیکھتے جوان ہوگئی حتی کہ کمر جو کمان کی طرح خمیدہ ہوگئی تھی فوراً" تیر کی طرح سیدھی ہوگئی۔ تیسری طلب اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے کہا آپ میرے ساتھ نکاح کر کے مجھے اپنی بیوی بنا لیں چنانچہ وہ آپ کی بیوی یعنی حرم رسول بن گئی یہ سب کچھ محل نظر ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے اسے **اِمْرَاَتُ الْعَزِیْزِ** ۱۲/۵۱ کے نام سے متعارف کیا ہے اور ۱۲/۵۱ ہی میں اس کا یہ اقرار درج ہے کہ میں نے ہی السید یوسفؑ کو پھسلانے کی کوشش کی تھی' آپ سچے ہیں۔ اس اقرار کے بعد قرآن مجید میں اس کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ مذکورہ بالا روایتی چیستانیات سے قرآن کریم صد فیصد بری ہے۔

ایک ضروری نوٹ:۔ واضح رہے کہ پچھلے صفحہ پر ہم نے اس روایتی قصہ کا انکار کیا ہے یعنی زن عزیز کیساتھ السید یوسفؑ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ قرآن کریم کا بیان کردہ واقعہ ہے۔ جو السید یوسف کو زن عزیز کیساتھ پیش آیا کہ وہ بدکاری کے ارادہ سے آپ کو اندر لے گئی۔ دروازہ بند کر لیا اور بد عملی کی دعوت دی تو السید یوسف برے فعل سے بچنے کیلئے بھاگ کھڑے ہوئے تو آپ کو پیچھے سے کھینچا اور آپ کی قمیض پھاڑ ڈالی۔ تو اس طرح جس عورت کے متعلق السید یوسف خوب جانتے تھے کہ اس کا کریکٹر کیسا ہے' پھر اس نے جھوٹ بھی بہت بڑھ چڑھ کر بولا کہ عزیز مصر کی عزت کو برباد کرنے کا اقدام یوسف نے کیا ہے" گویا کہ اس پر تین دفعیں لگتی ہیں۔ پہلی یہ کہ السید یوسفؑ کو بدکاری کی دعوت دی۔ دوسری یہ کہ جھوٹ بولا اور تیسری یہ کہ پاک باز یوسف پر دست درازی کا بہتان لگایا۔ تو اس طرح ایک نبی کی شان کے خلاف ہے کہ ایسی عورت نے نکاح کرے۔ نیز قرآن کریم میں اس نکاح کا نہ ذکر ہے نہ اشارہ نہ کنایہ۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی اسی چیز کی تائید کی ہے۔ چنانچہ آپ نے تفہیم القرآن کے ضمن میں اپنے تصنیف کردہ کتابچہ بنام تفہیم القرآن سورہ یوسفؑ نشر کردہ مکتبہ تعمیر انسانیت موچیدروازہ لاہور کے صفحہ ۲۰-۲۱ پر لکھا ہے:۔

تالمود میں (تالمود یہودیوں کی روایتوں کی کتاب ہے) اس عورت کا نام زلیخا لکھا ہے اور یہیں سے یہ نام مسلمانوں کی روایات میں مشہور ہوا۔ مگر یہ جو ہمارے ہاں عام شہرت ہے کہ بعد میں اس عورت سے یوسفؑ کا نکاح ہوا' اس کی کوئی اصل نہیں ہے' نہ قرآن مجید میں اور نہ اسرائیلی تاریخ میں حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کے مرتبے سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جس کی بدچلنی کا اسے ذاتی تجربہ ہو چکا ہو۔

اسی کتابچہ کے صفحہ ۶۶-۶۷ پر مودودی صاحب لفظ عزیز مصر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہاں لفظ "عزیز" یوسفؑ کیلئے جو استعمال ہوا ہے' صرف اس کی بنا پر مفسرین نے قیاس کر لیا یوسفؑ اسی منصب پر مامور ہوئے تھے جس پر اس سے پہلے زلیخا کا شوہر مامور تھا۔ پھر اس پر مزید قیاسات کی عمارت کھڑی کر لی گئی کہ سابق عزیز مصر مر گیا تھا۔ یوسفؑ اس کی جگہ مقرر کیئے گئے ۔ زلیخا از سر نو معجزے کے ذریعہ سے جوان کی گئیں اور شاہ مصر نے اس سے یوسفؑ کا نکاح کر دیا۔ حد یہ ہے کہ شب عروسی میں یوسفؑ اور زلیخا کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ کس ذریعہ سے ہمارے مفسرین کو پہنچ گئیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں سراسر وہم ہیں۔ رہا زلیخا کا یوسفؑ سے نکاح' تو اس افسانے کی بنیاد صرف یہ ہے کہ بائیبل اور تالمود میں فوطیفرع کی بیٹی آسناتھ سے ان کے نکاح کی روایت بیان کی گئی ہے۔ اور زلیخا کے شوہر کا نام

فوطیفار تھا۔ یہ چیزیں اسرائیلی روایات سے نقل در نقل ہوتی ہوئی مفسرین تک پہنچیں' اور جیسے کہ زبانی افواہوں کا قاعدہ ہے' فوطیفرع باآسانی فوطیفلد بن گیا۔ بٹی کی جگہ بیوی کو مل گئی اور اس کی بیوی لامحالہ زلیخا ہی تھی"۔ لہٰذا اس سے یوسفؑ کا نکاح کرنے کیلئے فوطیفار کو مار دیا گیا۔ اور اس طرح (عوامی قصہ) "یوسفؑ زلیخا" کی تصنیف مکمل ہوگئی۔ بحمداللہ کہ ناموس رسالت کی حفاظت میں اور لوگ بھی ہمارے ہم نوا ہیں۔

اگلی آیات مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ شہر کی وہ عورتیں جو زنِ عزیز کے مذاق کی تھیں۔ جب (زنِ عزیز سے متعلق) انہوں نے سنا کہ زنِ عزیز غلام پر فریفتہ ہوگئی ہے لیکن اسے اپنے دامِ حسن میں پھنسا نہیں سکی تو انہوں نے طعنے کے طور پر کہا کہ اس نے یوسف کو پھنسانے کیلئے غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس پر زنِ عزیز نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ وہ حسن و شباب کیساتھ خوب بن سنور کر آئیں۔ اس نے انہیں تکیہ بردار مسندوں پر بٹھایا اور یوسفؑ کو ان کے کمرے میں بلایا۔ آپ نیچی نگاہیں کیئے ہوئے تشریف لائے۔ زنانِ مصر نے یوسفؑ کو بیباک نگاہوں کیساتھ خوب خوب دیکھا اور دیکھتی رہیں' مگر آپ نے ان کی طرف نگاہ تک نہ اٹھائی۔ اس پر وہ بیساختہ پکار اٹھیں کہ یہ بشر نہیں' کوئی باوقار ملک ہے چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَن نَّفْسِهِ ۖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۖ إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

(۳۰) اور کہا شہر کی عورتوں نے کہ عزیز (مصر) کی بیوی نے اپنے نوجوان غلام کو اس کے ارادے سے پھسلانا چاہا (مگر وہ پھسلا نہیں سکی) بیشک (اس غلام کی) محبت اس کے ذہن کی گہرائی میں اتر گئی ہے۔ بیشک ہم اسے (غلام کو پھنسانے میں) کھلے غلط راہ پر دیکھتی ہیں۔

یہاں قال سے ماقبل یہ چیزیں محذوف ہے کہ جب اس کی قماش کی شہر کی عورتوں نے زنِ عزیز کا واقعہ سنا تو انہوں نے کہا:۔

فتی ہر نوجوان چیز کو کہتے ہیں۔ ماقبل چونکہ غلام کی محبت کا ذکر ہے اسلئے یہاں **فَتٰهَا** کا معنی ہے اس کا نوجوان خوبصورت غلام۔

شَغَفَهَا حُبًّا میں شغف کا معنی ہے دل کا پردہ۔ اسلئے یہاں اس کا یہ معنی ہے کہ محبت اس کے دل (ذہن) کی گہرائی میں اتر گئی ہے۔

لَنَرٰهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کا یہ مفہوم غلط ہے کہ شہر کی عورتوں نے زنِ عزیز کے مذکورہ فعل کو زنِ عزیز کی گمراہی قرار دیا بلکہ جیسے کہ ۱۲/۵۱ میں آگے آرہا ہے کہ جب شاہ مصر نے اپنی خواب کو عملی جامہ پہنانے کیلئے یوسفؑ کو قید خانے سے بلایا تو آپ نے فرمایا کہ پہلے مجھ پر لگائے گئے الزام کا فیصلہ کرو۔ پھر میں جیل سے باہر آؤں گا۔ چنانچہ شہر کی مذکورہ عورتوں سمیت زنِ عزیز کو حاضر عدالت کیا گیا۔ اور ان عورتوں سے پوچھا گیا کہ جب تم سب نے یوسف کو اس کے ارادے سے پھسلانے کی کوشش کی اس وقت تمہاری کیا مہم تھی۔ تو شہر کی مذکورہ عورتوں نے کہا:۔ **حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوْٓءٍ** ۝ ۵۱/۱۲ اللہ پاک ہے' ہم نے یوسف میں کوئی عیب نہیں پایا۔ یہ عورتیں یوسف کو پھنسانے میں زنِ عزیز کی مددگار بن کر آئیں تھیں۔ ورنہ جب بادشاہ نے کہا کہ جب تم سب نے یوسف کو پھسلانے کا ارادہ کیا تو اس وقت تمہاری کیا مہم تھی۔ اس پر اگر وہ پاکباز عورتیں ہوتیں تو یہ کہتیں کہ یوسف کو پھسلانے کا جرم زنِ عزیز نے کیا تھا ہم نے نہیں کیا تھا۔ اسلئے **لَنَرٰهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ** کا معنی یہی ہے کہ ہم دیکھتی ہیں کہ زنِ عزیز نے یوسف کو پھسلانے کیلئے غلط طریقہ اختیار کیا تھا۔ ورنہ وہ انکار کیوں کرتا۔

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب ان کی اس تجویز کو زن عزیز نے سنا تو یہ اہتمام کیا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿٣١﴾

(۳۱) پھر جب اس (زن عزیز) نے ان کی خفیہ تجویز کے متعلق سنا تو انہیں بلا بھیجا اور (ان کی تجویز کے مطابق) ان کے لئے تکیہ بردار مسندیں تیار کیں اور انہیں ہر ایک کو (آرام دہ) مسکن دیا۔ اور (بنی سنوری حسین عورتوں کی مجلس میں یوسف کو) کہا کہ ان کے سامنے آجا۔ پھر جب انہوں نے اسے دیکھا (یوسفؑ نے ان کی طرف بالکل نہ دیکھا) تو انہوں نے یوسف کو بہت بڑا نیکو کار پایا۔ اور (انہیں برائی پر آمادہ کرنے کی طاقت قطع کر لی۔ مایوس ہوگئیں اور بیساختہ) بول اٹھیں کہ اللہ پاک ہے یہ انسان نہیں۔ یہ تو کوئی بزرگ ملک ہے۔

۱۔ **مَكْرِهِنَّ** میں مکر کا معنی لغت عرب کے مطابق ہے خفیہ تجویز۔ اور وہ تھی بنی سنوری عورتوں کے طائفہ میں یوسف کو بلانا تاکہ آپ ایک سے ایک حسین و جمیل عورتوں کی آراستہ مجلس میں مبہوت ہوکر حسن کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کر دیں۔ زن عزیز نے ان کی تجویز کے مطابق ہر قسم کے سامانِ آرائش سے سجے ہوئے ایک کمرے میں انہیں تکیہ بردار مسندوں پر بٹھایا اور یوسف کو ان کے سامنے کر دیا۔ مگر آپؑ نے عورتوں کی طرف دیکھا تک نہ۔

۲۔ **مُتَّكَأً** ظرف مکان مادہ وکا سے ہے جس کا مصدری معنی ہے ٹیک لگانا **اتَوَكَّوا عَلَيْهَا** ۱۸/۲۰ **أَعْتَدَتْ مُتَّكَأً** کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ زن عزیز نے ان کے لئے خاص اہتمام کیساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے کی مسندیں تیار کریں۔

۳۔ **سِكِّينًا** کا مادہ س۔ک۔ن سکن ہے۔ اسی سے لفظ سکون ہے۔ یہاں سکینا کا معنی آرام دہ مسکن ہے جو **متکا** کے بدل کے طور پر آیا ہے۔ یہاں **سِكِّينًا** سے مراد چھریاں نہیں۔ چھریوں کیساتھ ہاتھ کاٹ لینے کا تصور افسانوی مبالغہ آرائی ہے جس کا قصہ یوسف کیساتھ کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ یہ حسن و عشق کا افسانہ نہیں بلکہ غلے کے چودہ سالہ کنٹرول کی صد فیصد سچا واقعہ ہے۔

۴۔ **فَلَمَّا رَأَيْنَهُ** کے بعد **وَلَمْ يَرَاهُنَّ** کے الفاظ محذوف ہیں اور مفہوم یہ ہے کہ جب ان تمام عورتوں نے یوسف کو دیکھا اور (یوسفؑ نے) انہیں ہرگز نہ دیکھا تو وہ اپنی مہم میں ناکام ہوگئیں اور اسے بہت عظیم باوقار نیکو کار انسان پایا۔

۵۔ **أَكْبَرْنَهُ** میں **أَكْبَرْنَ** فعل مزید فیہ ہے جس کے خاصہ وجدان کے مطابق معنی یہ ہے کہ انہوں نے اسے بہت بڑا آدمی پایا۔

۶۔ **قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ** کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ دیئے یا زخمی کر لئے۔ بلکہ یہاں مفہوم یہ ہے کہ اپنے حسن و جمال کی جس طاقت کیساتھ یوسفؑ کو برائی پر آمادہ کرنے آئی تھیں، اسے قطع کر بیٹھیں، پورا زور لگا لیا مگر جس مہم کیلئے آئی تھیں اس میں ناکام ہو گئیں۔ عربی ادب میں ید بمعنی طاقت اور زور بھی ہے اور قطع بمعنی ختم کر لینا بھی ہے۔

۷۔ **حَاشَ لِلَّهِ** ایک عربی محاورہ ہے جس کا معنی ہے اللہ پاک ہے۔ بعض دفعہ قسم کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے بمعنی اللہ پاک کی قسم ہے۔ ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کی منکر نہیں تھیں۔ بلکہ وہ پوری قوم اللہ کو مانتی تھی۔ بعد میں وہ قوم یوسفؑ کی نبوت پر بھی ایمان لے آئی اور یہاں تک ان کی گرویدہ ہوگئی کہ آپ کی وفات کے بعد انہیں

آخری رسول قرار دیدیا۔ وہ کہتے تھے **لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا** ۳۴/۴۰

۸۔ **مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ** کے الفاظ وہ ہیں جو زنانِ مصر' یوسفؑ کے بے مثال بلند کریکٹر کو آنکھوں سے دیکھ کر بیساختہ پکار اٹھی تھیں کہ یہ بشر نہیں' انسان نہیں' یہ تو کوئی بلند مرتبہ ملک ہے' اس میں بشری تقاضے موجود ہی نہیں۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جب زنانِ مصر نے یوسفؑ کی پاکبازی کو حلفاً تسلیم کر لیا تو زن عزیز نے کہا یہ ہے وہ غلام جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی ہو کہ میں اسے پھسلا نہیں سکی۔ چنانچہ اس کے متعلق ارشاد باری یہ ہے:۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ؕ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝

(۳۲) زن عزیز نے (زنانِ مصر کو) کہا کہ یہ ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم نے مجھے ملامت کی ہے۔ اور بیشک میں نے اسے اس کے نیک ارادے سے پھسلایا مگر اس نے اپنی عصمت محفوظ رکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو حکم میں اسے دیتی ہوں' اگر اس نے وہ کام نہ کیا تو یہ ضرور ضرور قید کر دیا جائیگا۔ اور ضرور ذلیلوں میں سے ہو جائیگا۔

اس آیت مجیدہ میں یوسفؑ کی عصمت اور آپ کے بلند کریکٹر کا اس اعلیٰ انداز سے اعلان فرمایا گیا ہے کہ زن عزیز نے یوسفؑ کو زنانِ مصر کے سامنے دھمکی دی اور قید و بند اور ذلت و رسوائی سے ڈرانے کی کوشش کی کہ اگر میری ناجائز خواہش کو پورا نہ کرے گا تو قیدی بنا کر ذلیل کر دیا جائیگا۔ در اصل بتایا یہ گیا ہے کہ ایک زن عزیز ہی نہیں بلکہ شہر کی حسین و جمیل عورتوں کا ایک مکار گروہ بھی انہیں ان کے مقام بلند سے ہلا نہ سکا۔ **سَلٰمٌ عَلٰى يُوْسُفَ**۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ زن عزیز کی کھلی دھمکی کے جواب میں یوسفؑ نے اپنے پروردگار کے حضور میں دعا فرمائی کہ اے میرے پروردگار جس فعلِ بد کی طرف مجھے یہ تمام عورتیں بلاتی ہیں' اس کی نسبت میں قید خانے کو پسند کرتا ہوں۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

(۳۳) یوسفؑ نے (حضور الٰہی میں) عرض کیا اے میرے پروردگار جس چیز کی طرف مجھے یہ سب عورتیں بلاتی ہیں' اس کی نسبت میں قید خانے کو پسند کرتا ہوں۔ اور اگر تو ان کی اس تجویز کو مجھ سے پھیر نہ دے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔ اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔

۱۔ **اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ** کے الفاظ کس طرح عصمتِ یوسفی کے مظہر ہیں کہ وہ فعل جو از روئے دین بھی حرام ہے اور ازروئے انسانیت بھی ناروا ہے' اگرچہ وہ انسانی تقاضوں میں سے ایک تقاضا بھی ہے اور مردوں کی ایک عظیم کمزوری بھی ہے مگر یوسفؑ نہ صرف یہ کہ اس کے بدلے قید خانے جیسی ذلت کو قبول کرتے ہیں' مگر ساتھ ہی حضور الٰہی میں دعا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ اگر تو ان بدکار عورتوں کی بری تجویز کو مجھ سے پھیر نہ دے اور ٹال نہ دے تو یہ اتنی بڑی آزمائش ہے کہ تیری مدد کے بغیر میرے پھسل جانے کا خوف ہے اگلی آیت مجیدہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف کی دعا قبول فرمائی اور آپ کے عظیم عزمِ صمیم کی بدولت آپ کی مدد فرمائی **وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ** ۴۰/۲۲ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرے۔

۲۔ **یَدْعُوْنَنِیْ** جمع مضارع معروف کا صیغہ ہے' جس سے ثابت ہوا کہ ان عورتوں کے مذکورہ اجتماع کی غرض السید یوسف کو متفقہ طور پر ان کے نیک ارادے سے پھسلانا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ حسین وجمیل' بنی ٹھنی عورتوں کا ایک عظیم گروہ بھی آپ کو آپ کے مقام بلند سے نہ ہلا سکا۔ **سَلَامٌ عَلٰی یُوْسُفَ**۔

۳۔ **کَیْدَهُنَّ** مرکب اضافی میں **کَیْدَ** مضاف کا مضاف الیہ **هُنَّ** ضمیر جمع مئونث آئی ہے جو مذکورہ تمام عورتوں کی طرف پھرتی ہے۔ اس مرکب اضافی سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ زنان مصر' یوسف کو پھسلانے کے لئے زن عزیز کی معاون و مددگار بن کر آئیں تھیں۔ لیکن ان کی تمام تجویزیں عزم یوسفی کی مضبوط چٹان کیساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔

۴۔ **اصب** کے مصدری معنے ہیں کسی چیز کی طرف کھچا چلا جانا۔ جنسی خواہش کا یہی خاصہ ہے کہ مرد اس کی طرف کھچ جاتا ہے۔ مگر یوسفؑ اس جنسی امتحان میں صد فیصد نمبروں کیساتھ پاس ہوئے' جب زن عزیز نے دروازہ بند کرکے اپنا آپ پیش کر دیا تو بھاگ کھڑے ہوئے اور پیچھے سے قمیص پھڑوالی' اور جب بنی ٹھنی زنان مصر نے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق آپ کو گھیرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ان کی طرف نگاہ تک اٹھا کر نہ دیکھا اور انہیں ان کی مہم میں نہ صرف یہ کہ ناکام کر دیا۔ بلکہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مایوس کرکے رکھ دیا۔ **سَلٰمٌ عَلٰی یُوْسُفَ هُوَ مِنْ عِبَادِاللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ**۔

پچھلی آیت نمبر ۳۳ میں جو یوسف کی اس دعا کا ذکر گزرا ہے **وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ** اور (اے میرے پروردگار) اگر تو نے ان عورتوں کی بُری تجویز کو مجھ سے پھیر نہ دیا تو میں ان کی طرف کھچ جاؤں گا۔ اسس دعا کے متعلق اگلی آیت مجیدہ میں خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور ان کی بری تجویز کو آپ سے پھیر دیا۔

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ کَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾

(۳۴) پس اس کے (یوسف کے) رب نے ان عورتوں کی بری تجویز کو (خود اسکے عزم صمیم کی بدولت) اس سے پھیر دیا۔ بیشک وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِیْنٍ ﴿۳۵﴾

(۳۵) پھر جب ان پر (زن عزیز کے خاندان پر اس کے جھوٹ کی) نشانیاں ظاہر ہو گئیں تو (بدنامی کو چھپانے کیلئے) انہوں نے یوسف کو کچھ عرصہ کیلئے قید کر دیا۔

ا۔ یوسف کو قید کرنے کی دو وجہیں تھیں ایک تو یہ کہ بات شہر میں پھیل گئی تھی' اسلئے آپ کو قید نہ کرتے تو زن عزیز بدنام ہوتی تھی۔ اور دوسری یہ کہ وہ اپنے برے ارادے کی تکمیل کیلئے بدستور کوشاں تھی' اسلئے یوسفؑ کو اس سے علیحدہ کرنا ضروری تھا۔ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے:۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْکُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىکَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۳۶﴾

(۳۶) اور اس (یوسفؑ) کیساتھ قید خانے میں دو نوجوان داخل ہوئے ان میں سے ایک نے (آپ کو) کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑتا ہوں۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔ اس میں سے پرندے کھاتے ہیں۔ آپ ہم کو اس کی تعبیر بتایئے۔ بیشک ہم آپ کو احسان کرنیوالوں میں سے دیکھتے ہیں۔

اس کے جواب میں آپ نے انہیں تعبیر بتانے سے پہلے ذیل کے الفاظ میں وحدتِ باری کی تبلیغ فرمائی اور بعد میں ان کے خوابوں کی الگ الگ تعبیر بتائی:۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ۚ إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿۳۷﴾

(۳۷) یوسفؑ نے فرمایا کہ نہیں آئیگا وہ کھانا تمہارے پاس جو تمہیں دیا جاتا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ تمہارے پاس آئے' میں تم کو تعبیریں بتا دوں گا۔ یہ اسلئے ہے کہ مجھے میرے رب نے علم دیا ہے۔ بیشک میں نے اس قوم کا مذہب چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ وہی انکار کرنے والے ہیں۔ آخرت کا

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَا أَنْ نُشْرِكَ بِاللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۳۸﴾

(۳۸) اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم' اسحاق اور یعقوب کے دین کی اتباع کی ہے۔ ہمارے لئے یہ لائق نہیں کہ ہم اللہ کیساتھ کسی بھی چیز کو شریک کریں۔ مذکورہ بالا ہم پر اور لوگوں پر اللہ کا فضل ہے اور لیکن اکثر لوگ (اپنے پروردگار کی نعمتوں کا) شکر نہیں کرتے۔

اس آیت مجیدہ میں تبلیغ کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ جس شخص کو کوئی ذاتی مطلب ہو' وہ مطلب براری کیلئے غور سے سنتا ہے' جیسے کہ قید خانے کے مذکورہ بالا دونوں قیدیوں کو تعبیریں معلوم کرنے کا مطلب تھا۔ یوسفؑ نے اس چیز کیخلاف تبلیغ فرمائی کہ لوگ کچھ نام خود رکھ کر اللہ کیساتھ شریک کرتے ہیں:۔

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾

(۳۹) (یوسف نے فرمایا) اے میرے قید خانے کے دو ساتھیو' کیا الگ الگ مرادیں دینے والے بہتر ہیں یا ایک اکیلا اللہ جو سب پر غالب ہے۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

(۴۰) تم لوگ نہیں حکم مانتے اللہ کیساتھ شریک کرکے مگر وہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے خود رکھ لئے ہیں' جن کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ نہیں ہے حکم مگر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اسی نے حکم دیا ہے کہ اسکے سوا کسی کی فرمانبرداری نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے (اللہ کیساتھ اور مرادیں دینے والے بنا رکھے ہیں)

اس آیت مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیساتھ کچھ لوگوں کے نام رکھ لینا کہ فلاں حاجت روا ہے' فلاں دستگیر ہے' قوموں کی پرانی روش ہے۔ یہ قید خانے کے دو ساتھی اسی قسم کے تھے اور اس عقیدے کو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ مانتے تھے۔ آپ نے وضاحت فرمائی کہ یہ نام تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے خود رکھ لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ میں نفی اثبات کے حصر کیساتھ بتایا گیا ہے کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے' اور یہی سیدھا دین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا گیا ہے کہ اس حقیقت کو اکثر لوگ

نہیں جانتے۔ لوگوں کی اکثریت اللہ کے حکم میں اور اس کے اختیارات میں اپنے نام رکھے ہوئے افراد کو شریک کر لیتے ہیں۔
اس تبلیغ کے بعد یوسفؑ نے ان کی خوابوں کی تعبیر بتائی:۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

(۴۱) اے میرے قید خانے کے دو ساتھیو! تم میں سے ایک اپنے بادشاہ کو شراب پلائیگا (بادشاہ کا ساقی بنے گا) اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائیگا۔ پھر اس کے سر سے پرندے کھائیں گے۔ فیصلہ ہو چکا جو تم نے مجھ سے پوچھا ہے۔

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

(۴۲) ان دونوں میں سے جس کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ وہ قید سے رہا ہو جائیگا (یوسف نے) اسے کہا کہ اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کرنا (کہ بے گناہ قید ہے) لیکن اسے نسیان نے اس کے بادشاہ سے ذکر کرنا بھلا دیا۔ اور آپ کئی سال قید خانے میں رہے۔

جو شخص بادشاہ کا ساقی بننے والا تھا۔ یوسفؑ نے اسے یہ کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ یوسف نامی ایک شخص بے گناہ قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا کچھ انسداد کرے۔ مگر ہوا یہ کہ اسے بادشاہ سے آپ کا ذکر یاد نہ رہا۔ اس طرح یوسفؑ کئی سال قید خانے میں رہے۔ یہاں **فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ** کے الفاظ میں **الشَّيْطٰن** سے مراد نسیان ہے۔ یعنی وہ دماغی کمزوری جس کی بدولت کوئی بات ذہن سے کئی کئی سال تک کے لئے اتر جاتی ہے۔ اور اس کے بعد کسی واقعہ پر اچانک یاد آجاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کئی سال گزرنے کے بعد بادشاہ کو ایک خواب آئی' جس کی تعبیر بتانے سے شاہِ مصر کی کابینہ کے دانشور بھی قاصر رہے اور ملک کے دوسرے تمام علماء فضلا بھی تعبیر نہ بتا سکے۔ تو بادشاہ کے مذکورہ ساقی کو یاد آیا کہ قید خانے میں ہم دو قیدیوں کو یوسف نامی قیدی نے ہماری خوابوں کی الگ الگ تعبیریں بتائی تھیں جو صد فیصد صحیح ہوئی تھیں۔ اس لئے اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں آپ کی خواب کی تعبیر لاتا ہوں بادشاہ کی خواب یہ تھی:۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

(۴۳) بادشاہ نے کہا بیشک میں (خواب میں) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں موٹی ہیں' انہیں سات دبلی گائیں کھاتی ہیں اور میں (خواب میں دیکھتا ہوں سات سٹے گندم کے سبز اور دوسرے سات خشک رہیں۔ اے (میری کابینہ کے) سردارو' اگر تم خواب کی تعبیر بتانے والے ہو تو میری خواب کی تعبیر بتاؤ۔

لیکن ہوا یہ کہ ان کی سمجھ میں اس خواب کی تعبیر نہ آسکی اور انہوں نے انتہائی سوچ بچار کے بعد بادشاہ کو یہ جواب دیا:۔

قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

(۴۴) (درباریوں نے) کہا یہ پریشان خوابیں ہیں۔ اور ہم ایسی پریشان خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے۔

اَضْغَاث ضِغث کی جمع ہے' جس کا معنی ہے کسی چیز کو غلط ملط کر دینا۔ اس لئے یہ لفظ پریشان خوابوں کیلئے آتا ہے۔ اس کے ساتھ آیا ہے احلام' جو حُلم کی جمع ہے' اس کا بنیادی معنی ہے نفس کو قابو میں رکھنا۔ یہ لفظ بھی پریشان خوابوں کیلئے مستعمل ہے۔ عربی ادب میں ان خوابوں کو رؤیا کہتے ہیں جن کی تعبیر ہو' اور جو خوابیں دماغ میں معدہ کے بخارات پہنچنے پر آتی

ہیں انہیں احلام کہتے ہیں۔ چونکہ کابینہ کے سردار بادشاہ کی خواب کی تعبیر نہ جان سکے' اسلئے انہوں نے اسے احلام کہہ دیا کہ یہ ان خوابوں میں سے ہے جن کی تعبیر نہیں ہوتی۔ لیکن بادشاہ اسے رؤیا کہتا ہے کہ یہ پریشان خواب نہیں یعنی' احلام میں سے نہیں بلکہ یہ تعبیروالی خواب ہے' رؤیا میں سے ہے۔

اس پر بادشاہ کے ساقی کو السید یوسف یاد آگئے۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھے بھیجو' میں آپ کے لئے خواب کی صحیح تعبیر لاتا ہوں:۔

وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُم بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ۝٤٥

(۴۵) اور اس شخص نے کہا جو (قید خانے کے قیدیوں میں سے) رہا ہوا تھا۔ اور اس نے بہت مدت کے بعد (یوسف کو) یاد کیا' کہ میں تمہیں خواب کی تعبیر کی خبر لا دیتا ہوں۔ تم مجھے (یوسف کے پاس) بھیجو۔

۱۔ وَادَّكَرَ در اصل وَاذْكَرَ ہے۔ عربی زبان کے مطابق قرآن مجید میں ذال بصورت دال بھی آئی ہے ۵۴/۴۰-۳۲-۲۲-۱۷

۲۔ یہاں اُمَّة بمعنی مدت ہے۔ قرآن مجید میں اس کا معنی جماعت بھی ہے ۲/۲۱۳ راستہ بھی ہے ۴۳/۲۳

جب بادشاہ کے ساقی نے اسے خواب کی تعبیر لانے کی امید دلائی تو اس نے اسے یوسفؑ کی خدمت میں بھیجا' اس نے آپ سے عرض کیا:۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَّعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ۝٤٦

(۴۶) (بادشاہ کے ساقی نے کہا) اے یوسف! اے بڑھ کر سچے! ہمیں تعبیر بتایئے اس میں کہ سات گائیں موٹی ہیں انہیں کھاتی ہیں سات دبلی گائیں۔ اور سات سٹے ہرے ہیں اور دوسرے (سات) خشک ہیں۔ تاکہ میں لوگوں کی طرف واپس جاؤں (اور انہیں صحیح تعبیر بتاؤں) تاکہ وہ جانیں (کہ بادشاہ کی خواب کی تعبیر کیا ہے)

یوسفؑ نے خواب سنتے ہی تعبیر بتا دی۔ کیونکہ آپ کو ۱۲/۲۲+۶ کی (اللہ کی) سند کے مطابق خوابوں کی تعبیر خود اللہ تعالیٰ نے سکھائی تھی:۔

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ۝٤٧

(۴۷) (یوسف نے کہا) کہ تم (بہت زیادہ) زراعت کرو سات سال مسلسل پھر جو فصل کاٹو اسے خوشوں ہی میں رہنے دو۔ سوائے تھوڑی سی کے جو تم کھاؤ گے۔

تَزْرَعُوْنَ فعل مضارع ہے جس کا معنی ہے کہ تم سات سال زراعت کرو گے۔ مگر یہاں خبر بمعنی اَمر ہے کہ خوب زراعت کرو۔

دَاْبًا کے لفظ میں تسلسل اور استمرار پایا جاتا ہے جیسے کہ سورہ ابراہیم میں آیا ہے **وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ** ۱۴/۳۳ اور تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا ہے' یعنی انہیں تمہارے کام میں لگا دیا ہے کہ وہ (اپنے اپنے مقررہ مدار پر) مسلسل چل رہے ہیں۔ پس یوسفؑ نے خواب کی تعبیر کے طور پر حکم دیا کہ سات سال کیلئے پورے تسلسل کے ساتھ بہت زیادہ فصلیں پیدا کرو۔

فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْبُلِهٖ کا مفہوم یہ ہے کہ سات سال کی فصل کو اسکے خوشوں یعنی سٹوں کے اندر رہنے دو۔ وہ چودہ

سال تک کیلئے محفوظ رہیگی خراب نہیں ہوگی۔ سٹوں کے اندر' گندم کو اللہ تعالیٰ' ایئر ٹائٹ پیکنگ کردیتا ہے' جس میں چونکہ ہوا داخل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اگر سٹوں کو گندم کے پودوں سے اتار کر سکھا لیا جائے تو گندم کم از کم چودہ سال تک کے لئے خراب نہیں ہوتی۔ جیساکہ یوسفؑ نے خود تجربہ کرکے دکھا دیا تھا۔ آپؑ نے خواب کا دوسرا خطرناک حصہ یہ بتایا کہ:۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ﴿۴۸﴾

(۴۸) (یوسفؑ نے مزید فرمایا کہ) مذکورہ بالا سات سالوں کے بعد پھر سات سال سخت آئیں گے (جن میں بارشیں نہیں ہوں گی' غلہ پیدا نہ ہوگا) وہ سات سال اس غلے کو کھا جائیں گے جو تم ان کے لئے جمع کرو گے۔ سوائے تھوڑے سے (غلے کے) جو تم بچا لو گے۔

سَبْعٌ شِدَادٌ سے مراد وہ سخت سال ہیں' جن میں بارشیں نہیں ہوں گی۔ یہاں بارشوں کے نہ ہونے کا ذکر موجود نہیں' **مگر اگلی** آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان سخت سالوں کے گزرنے کے بعد اگلے (آٹھویں) سال میں خوب بارشیں ہوں گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان سخت سالوں میں مون سون ہواؤں کا رخ بدل جائیگا اس لئے بارشیں نہیں ہوں گی۔

يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ کا لفظی معنی یہ ہے کہ وہ سخت سال اس غلے کو کھا جائیں گے جو تم ان کے لئے جمع کرو گے۔ غلہ کو انسان اور مویشی ہی کھاتے ہیں' مگر خواب کے کیف و منظر کی رعایت سے کہ سات دبلی گائیں موٹی سات گائیوں کو کھا رہی ہیں' السید یوسفؑ نے فرمایا کہ سات دبلے خشک سال موٹے سات سالوں کے غلے کو کھا جائیں گے۔

إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ کے الفاظ میں إِلَّا کی استثنیٰ نہایت اہم ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ قحط کے سالوں میں جو تم جمع کردہ غلہ کھاؤ گے' اس سے بھی کچھ نہ کچھ تھوڑا بہت ضرور بچا لینا۔ کیونکہ سرفہرست تو بس اندازی ہی زندہ رہنے کا ایک اہم راز ہے پھر قحط کے سات سالوں کے بعد آٹھویں سال میں جب غلہ پیدا کرنا ہوگا تو لازماً" بیج کے لئے فاضل گندم کی ضرورت پڑے گی۔ اور ساتھ ہی اس سال میں بھی نئی فصل کے آنے تک کے لئے پورے عوام کو غلے کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے تاکید کر دی کہ سارے کا سارا غلہ ختم نہ کر دینا۔ بیج کیلئے بھی بچا لینا اور نئی فصل کے آنے تک کیلئے بھی محفوظ کر لینا۔ چنانچہ قحط کے سات سالوں سے نپٹنے اور غلے کو دانشمندانہ کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کرنے کی مخصوص ہدایت کرنے کے بعد یوسفؑ نے خاتمہ قحط سے اگلے سال کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ﴿۴۹﴾

(۴۹) (آپؑ نے فرمایا قحط کے سات سال گزر جانے پر) اس کے بعد اگلا سال ایسا آئے گا کہ اس میں لوگوں پر مینہ برسایا جائیگا اور اس میں لوگ (پھلوں کے) رس نچوڑیں گے۔

فِيهِ يَعْصِرُونَ خوشحالی کی خبر ہے کہ اس میں خوب بارشیں برسنے پر غلہ اور اناج بھی عام ہو جائیگا اور باغوں میں پھل بھی بکثرت پیدا ہوں گے۔ اور لوگ پھلوں کے رس (جوس) نچوڑ نچوڑ کر پئیں گے۔ عصر کا مطلق معنی جوس نچوڑنا ہے۔

جب بادشاہ کے ساقی نے یوسفؑ سے واپس آکر بادشاہ کو اس کی خواب کی تعبیر اور چودہ پندرہ سالہ طویل پروگرام پیش کیا تو اسے یقین ہوگیا اس کی خواب کی تعبیر واقعتہ یہی ہے۔ اس پر اس نے حکم دیا کہ ایسے عظیم دانشور منصوبہ ساز (ہائی سکیم) کو میرے پاس لاؤ۔ مگر یوسفؑ نے اس وقت تک قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا جب تک کہ ان پر لگائے گئے الزام کی عادلانہ اور منصفانہ تحقیق کرکے انہیں اس الزام سے بری نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں یہ سب کچھ بالفاظ ذیل مذکور ہے:۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۰

(۵۰) بادشاہ نے کہا کہ اسے (یوسف کو جس نے خواب کی تعبیر اور چودہ سالہ پروگرام مرتب کیا ہے) میرے پاس لاؤ پھر جب یوسف کے پاس بادشاہ کا بھیجا ہوا پہنچا تو آپ نے فرمایا اپنے بادشاہ کے پاس واپس لوٹ جا۔ پھر اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے (مجھے بدکاری پر آمادہ کرنے کی) قوت ختم کر دی تھی۔ بیشک میرا رب ان کی بری تجویز کو خوب خوب جاننے والا ہے۔

یہاں **اَلرَّسُوْل** سے مراد اللہ کا رسول نہیں' بلکہ السید یوسف کے پاس بادشاہ کا بھیجا ہوا آدمی مراد ہے۔ الرسول میں الف لام عوض مضاف ہے یعنی **رَسُوْلُ الْمَلِكِ** رسول کا معنی ہے بھیجا ہوا۔ پس یہاں الرسول کا معنی ہے بادشاہ کا بھیجا ہوا۔

قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ کے الفاظ میں رب کا معنی بادشاہ ہے۔ کیونکہ بادشاہ اپنے عوام کی ربوبیت کا ذمہ وار ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ رزق کیساتھ عوام کی ربوبیت کا فرض ادا کرتا ہے۔ رب العلمین صرف وہ ہے جس نے کائنات میں ہر نوع کی ضروریات رزق کے پیدا کرنے اور اس میں آئے دن اضافہ کرتے چلے جانے کے کائناتی قوانین اور مادی اسباب مہیا کر رکھے ہیں' نیز فصلوں اور پھلوں کو پکانے کیلئے سورج کی عظیم بھٹی دہکا رکھی ہے۔

اَلّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ کے الفاظ میں یوسف نے جیل کے اندر بیٹھے ہوئے شاہ مصر پر واضح کر دیا کہ مجھ پر جونسا الزام لگا کر قید میں ڈال دیا گیا ہے' اس میں میں صد فیصد بری ہوں میری مقابل عورتیں' ملزم نہیں' بلکہ مجرم ہیں' جنہوں نے مجھے بدکاری پر آمادہ کرنے کیلئے پوری طاقت لگائی اور اسے ختم کر بیٹھیں۔

زنِ عزیز سمیت سب مجرم عورتوں کو حاضر عدالت کر لیا گیا:۔ جب بادشاہ کو یوسف کا مذکورہ پیغام پہنچا تو اس نے ان کے مقدمے کی فائل منگا کر اس پر خود نظر ثانی کا فریضہ انجام دیا۔ مقررہ تاریخ پر زنِ عزیز سمیت تمام مجرم عورتوں کو بھی حاضر عدالت کر لیا گیا اور مقدمہ کی پیروی کیلئے یوسف کو بھی بلا لیا گیا۔ آپ بھی کیس کی پیروی کے لئے تشریف لے آئے۔ چنانچہ شاہ مصر نے مجرم عورتوں پر خود سوال کیا۔ اس کے لئے قرآن کریم کے الفاظ ذیل ملاحظہ فرمائیں:۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱

(۵۱) بادشاہ نے مذکورہ عورتوں سے کہا کہ جب تم نے یوسف کو اس کے نیک ارادے سے پھسلانے کی کوشش کی' اس وقت تمہاری مہم کیا تھی' سب نے (یک زبان ہو کر) کہا اللہ پاک ہے' ہم نے اس (یوسف) میں کوئی برائی نہیں پائی۔ زنِ عزیز نے کہا کہ اب حق کھل (کر عیاں ہو) گیا ہے۔ میں نے اسے اس کے ارادے سے پھسلانا چاہا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ سچوں میں سے ہے۔

اس طرح سرِ عدالت زنِ عزیز سمیت مذکورہ عورتوں نے اپنے جرم کا اقرار کیا اور یوسفؑ کو خود اپنے بیانوں میں برائی کے الزام سے بری کیا اور آپ کی صد فیصد پاکبازی کا اعلان کیا' اس پر یوسفؑ نے فرمایا کہ میں نے اس مقدمہ کے غلط فیصلے پر نظر ثانی اسلئے کرائی ہے تاکہ ثابت ہو جائے کہ میں نے عزیزِ مصر کی غیر حاضری میں اس کے گھر میں اس کی خیانت نہیں کی۔ قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں:۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝۵۲

(۵۲) (یوسفؑ نے ارشاد فرمایا کہ) میں نے اس مقدمے پر نظر ثانی اسلئے کرائی ہے تاکہ (عزیز مصر جان لے کہ میں نے اس کی غیر حاضری میں اس کی خیانت نہیں کی' حقیقت یہ ہے کہ اللہ خائنوں کی تجویز کامیاب نہیں کرتا۔

زن عزیز اس سے پہلے تو اپنے آپ کو اپنے کئے ہوئے جرم سے بری قرار دیتی تھی' مگر اب خود ذیل کا اعلان کیا:۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۳

(۵۳) اور (زن عزیز نے مزید کہا اب) میں اپنے آپ کو (حسب سابق) بری قرار نہیں دیتی۔ بلاشبہ نفس امارہ برائی کا حکم کرنیوالا ہے (میں نے نفس امارہ کے حکم پر برائی کا ارادہ کیا تھا) سوائے اس کے جو میرا رب رحم کرے۔ بیشک میرا رب بچاؤ دینے والا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں بچاؤ عطا فرماتا ہے جو اپنے اعمال کے ذریعہ خود بچاؤ چاہتے ہیں یوسفؑ نے اپنے عمل کیساتھ زن عزیز سے بھاگ کر عملی بچاؤ چاہا انہیں بچاؤ مل گیا۔ زن عزیز اور مذکورہ زنان مصر نے اپنے عمل کے ساتھ بچاؤ نہ چاہا اسلئے نہ دیا گیا۔ سورہ انعام میں آیا ہے **لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** ۶/۱۲۸ ان کے رب کے قانون کی رو سے تو ان کے لئے سلامتی ہی کا گھر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کا مددگار ہے ان عملوں کے ساتھ جو یہ خود بجا لاتے ہیں۔

المختصر! جب مقدمہ پر نظر ثانی ہوچکی۔ یوسفؑ کو آپ پر لگائے گئے الزام سے بری کر دیا گیا۔ آپ مقدمے کی پیروی کرکے واپس قید خانے چلے گئے۔ اس کے بعد شاہ مصر نے اپنی خواب اور اس کی تعبیر کے چودہ سالہ لمبے پروگرام پر بھی غور کیا اور اپنی کابینہ کے افراد پر بھی نگاہ دوڑائی' اسے ان میں کوئی فرد اس چودہ سالہ لمبے پروگرام کو انجام دینے والا دکھائی نہ دیا اس لئے اس نے یوسفؑ ہی کو اس عظیم پروگرام کی انجام دہی کے قابل جانتے ہوئے اس کے لئے آپ ہی کو بلایا۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں خبر دی گئی ہے:۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝۵۴

(۵۴) اور شاہ مصر نے (کابینہ کے سرداروں سے) کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ تاکہ میں اسے اپنے لئے خالص کر لوں (یعنی اپنے اختیارات اسے سونپ دوں۔ آپ تشریف لے آئے) پھر جب وہ ان سے مخاطب ہوا تو کہا کہ تو ہمارے ہاں منصب امانت پر فائز کردہ میرے تکمل اختیارات کا امین ہے۔

اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ کے الفاظ میں **اَسْتَخْلِصْهُ** بمعنی **اَسْتَخِيْرُهٗ** ہے یعنی میں اپنے اختیارات اس کے حوالے کروں اسے اپنا وزیر اعظم بنا لوں۔ کیونکہ آگے ۱۲/۷۸ میں یوسفؑ کیلئے عزیز مصر کے الفاظ آئے ہیں۔

لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ کے الفاظ میں مکین کا معنی ہے متمکن کردہ' فائز کردہ۔ اور لدینا کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم سب یعنی بادشاہ اور پوری کابینہ کے متفقہ فیصلے کے مطابق آپ منصب امانت و وزارت پر فائز کردہ ہیں۔ اور امین سے مراد یہ ہے کہ یہ مکمل اختیارات آپ کو امین مان کر سونپے گئے ہیں کہ ہم نے اپنے میں سے آپ کو اس امانت کا اہل پایا ہے۔ پس **لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ** کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ شاہ مصر چودہ سال کیلئے آپ کے حق میں دستبردار ہوگیا اور پوری

کابینہ آپ کے ماتحت ہوگئی۔ لیکن چونکہ اس چودہ سالہ پروگرام پر عمل در آمد کرنے کیلئے ملکی خزانے پر بھی آپ کا مکمل کنٹرول لازمی تھا اس لئے آپ نے ارشاد فرمایا:۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝۵۵

(۵۵) یوسفؑ نے) فرمایا ملک مصر کے تمام خزانے میرے کنٹرول میں دیدے بیشک میں بڑھ کر حفاظت کرنیوالا بھی ہوں اور (ان کے جائز مصرف کو) بڑھ کر جاننے والا بھی ہوں۔

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ سے مراد یہ ہے کہ آپ نے شاہ مصر کو کہا کہ ارض مصر کے تمام خزانے اس طرح میرے کنٹرول میں دیدے کہ غلے کے چودہ سال کنٹرول کو عملی جامہ پہنانے کیلئے خزانوں کا امین یعنی خزانچی میں ہی ہوں۔ جب چاہوں اور جہاں چاہوں بلا شرکت غیر خرچ کروں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اوپر **اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ** کے شاہی فیصلے اور **اِنَّکَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَکِیْنٌ اَمِیْنٌ** کے شاہی اعلان میں آپ کو پورے شاہی اختیارات حوالے کر دیئے گئے تھے۔ نیز ملکی خزانوں اور خزانچی سمیت پوری کابینہ بھی آپ کے ماتحت کر دی گئی تھی تو پھر آپ نے خاص طور پر خزانوں کے مکمل کنٹرول کا الگ مطالبہ کیوں فرمایا۔ اس کا جواب زیر عمل کنٹرول پر غور کرنے سے سامنے آتا ہے کہ مکمل سات سال تک ملکی خزانوں کے منہ بہتے **چشموں** کے دھارے کی طرح کھولے رکھنے کی ضرورت تھی۔ نتیجہ سات سال کے بعد نکلنے والا تھا کہ کیا واقعی سات برس کے بعد جو سات سالہ قحط نمودار ہونیوالا تھا اس پر کنٹرول ہوا ہے یا نہیں؟ کیا زائد سات آٹھ سال کیلئے غلہ جمع ہوا ہے یا نہیں؟ کیا سات سال کے عرصے میں غلہ ضائع تو نہیں ہوگیا۔ کیا اسے چوہے اور گھن تو نہیں کھا گئے۔ سات سالہ انتظار کے لئے جس صبرو تحمل کی ضرورت تھی' جن افراد کے اختیارات پر زد پڑی تھی جو یوسفؑ کو سونپ دیئے گئے تھے' ان میں سے خزانچی کا عہدہ نہایت اہم تھا۔ اگر وہ سات سال میں کسی بھی وقت پر روک بن سکتا تو معمولی سی رکاوٹ بھی غلے کے عظیم پروگرام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اس لئے یوسفؑ کی بصیرت کاملہ نے چودہ سالہ کنٹرول کو سنبھالنے سے پہلے ہی اس خطرے کا انسداد فرما لیا۔ چنانچہ ملکی خزانوں کا بلا شرکت غیرے مختار کل بھی آپ ہی کو بنا دیا گیا۔ اس طرح آپ کو ان کی بے مثال اہلیت وقابلیت کے مطابق ملک مصر کے سیاہ و سفید کا مالک بنانے کی خبر بالفاظ ذیل دی گئی ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۭ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۶

(۵۶) اور مذکورہ بالا طریقے سے ہم نے یوسف کو پورے ملک مصر پر متمکن کر دیا۔ (اس کے سیاہ و سفید کا مختار بنا دیا) وہ مقام کرتا تھا اس زمین میں جہاں چاہتا تھا۔ یہ اس کی مخصوص قابلیت کے مطابق ہماری رحمت کے ساتھ اس کا حصہ تھا۔ ہم جسے بھی یہ حصہ دیتے ہیں اپنے قانون مشیت کے مطابق دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

کَذٰلِکَ میں کاف حرف تشبیہ ہے اور ذلک اشارہ مذکر بعید ہے بمعنی مذکورہ بالا۔ اس اشارہ بعید میں یوسف کی پوری سابقہ زندگی کی پاکبازی اور صحیح روی کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔

مَکَّنَّا کا سہ حرفی مادہ م۔ ک۔ ن مکن ہے اس کا بنیادی معنی ہے صاحب مکان ہونا' جہاں اس کے اختیارات میں کوئی دخیل نہ ہو۔ جیسے کہ ہر صاحب مکان اپنے مکان میں خود مختار ہوتا ہے کہ اسے جس نقشے کا چاہے گرا کر بنالے۔ یہاں **مَکَّنَّا** کا مصدری معنی ہے آپ کو پورے ملک مصر کا اقتدار عطا کرنا' اس کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دینا ہے۔

یہاں الارض کی الف لام دو فائدے دیتی ہے' ایک تو یہ کہ یہ عہدی ذکری بھی ہے جس سے مراد ہے ارض مصر۔ نیز یہ استغراق کیلئے بھی ہے' یعنی پوری سرزمین مصر' یوسفؑ کے اقتدار میں دے دی گئی تھی۔ **مَكَّنَّا** کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ مگر پیچھے آپ دیکھ چکے ہیں کہ اختیارات تو شاہ مصر نے آپ کو تفویض کئے تھے۔ اس کے ضمن میں اس قرآنی حقیقت کو ہمیشہ نگاہ میں رکھیئے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کی منشا اور اس کے نازل کردہ ضابطے کے مطابق ہوتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے' جیسے کہ جنگ بدر میں نبی اکرمؐ نے جو تیر اندازی فرمائی تھی اسے اللہ تعالیٰ نے بالفاظ ذیل اپنی طرف منسوب فرمایا ہے **وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ** ۸/۱۷ اے رسول! آپ نے جو تیر اندازی فرمائی تھی وہ آپ نے نہیں کی تھی بلکہ وہ خود اللہ نے کی تھی۔ اسی طرح اس جنگ میں جو صحابہ کرام نے دشمنوں کو قتل کیا' اسے بھی اللہ نے بالفاظ ذیل اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ **فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ** ۸/۱۷ پھر اے صحابہؓ! کافروں کو تم نے نہیں بلکہ ہم نے قتل کیا تھا۔ پس اسی طرح چونکہ السید یوسف کو آپ کی اہلیت کے مطابق ملک مصر کا اقتدار شاہ مصر کی طرف سے سونپا جانا عین قانونِ مشیت کے مطابق تھا کہ ایک عظیم منصب اس کے اہل کو سونپا گیا' اسلئے اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔

يَتَبَوَّأُ مِنْهَا فعل مضارع ہے جس کا لفظی معنیٰ ہے یوسف ٹھکانہ کرتا ہے' مقام کرتا ہے اس مصر کی سرزمین میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو یوسفؑ کے زمانے کی بات ہو رہی ہے' یہ تو ماضی کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے۔ اب اس وقت تو یوسفؑ نہ ملک مصر میں صاحب اقتدار ہیں اور نہ ملک مصر میں جہاں چاہتے ہیں مقام کرتے ہیں۔ اسلئے چونکہ **يَتَبَوَّأُ** مضارع حکائی ہے جو آپ کی حکایت بیان کرتے ہوئے آیا ہے۔ اسلئے گرائمر کے قاعدے کے مطابق یہاں ماضی کا فائدہ دیتا ہے یوسفؑ جہاں چاہتے تھے سرزمین مصر میں ٹھکانہ پکڑتے' مقام کرتے تھے۔ واضح رہے کہ یَتَبَوَّأُ کے لفظ میں یہ جتایا گیا ہے' چونکہ آپ کا فریضہ چودہ سال کی ملکی ضروریات کے مطابق غلہ پیدا کرنا مقرر ہوا' اسلئے آپ نے پوری سرزمین مصر کے دورے شروع کر دیئے۔ تاکہ زمین کا کوئی حصہ بغیر کاشت یعنی بنجر نہ رہے' زمین کے چپے چپے پر آپ نے گندم کاشت کرنے کا اہتمام فرمایا۔ اس سلسلے میں آپ کو اپنے دوروں کے درمیان جہاں ٹھہرنا ہوتا' وہاں آپ مقام فرماتے تاکہ اپنی نگرانی میں غلہ کی فی ایکڑ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ اور اس کے تسلسل میں کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہ ہونے پائے۔

حَيْثُ يَشَاءُ میں بھی یشاء فعل مضارع حکائی ہے۔ اس کا بصورت مضارع یہ معنیٰ لیا جانا غلط ہے کہ آپ زمانہ حال میں جہاں چاہتے ہیں مقام کرتے ہیں۔ بلکہ اس کا معنیٰ بصورت ماضی لیا جانا ضروری ہے کہ یوسفؑ اپنے دوروں کے درمیان زمانہ ماضی میں جہاں چاہتے تھے سرزمین مصر میں مقام کیا کرتے تھے۔

نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا میں نصیب کا معنیٰ ہے حصّہ۔ اور حصہ ہوتا ہے حصّے کے حقدار کا۔ کسی نااہل کو کوئی ذمہ داری نہیں سونپی جانی چاہئے۔ چونکہ یوسفؑ اس منصب عظیم کے پورے پورے اہل تھے۔ اسلئے اللہ کی رحمت سے آپ کو اس منصب پر فائز کر دیا گیا۔

مَنْ نَشَاءُ کے الفاظ میں نَشَاءَ کے لفظ میں اللہ تعالیٰ کا قانون مشیت بتایا گیا ہے جو **بِرَحْمَتِنَا** کے بعد آیا ہے اور مفہوم یہ ہے کہ مشیت الٰہی یہی ہے کہ اگر کوئی منصب قانون مشیت کے مطابق اس کے اہل کو سونپا جائے تو وہ اللہ کی رحمت ہوتا ہے اور اگر کسی نااہل کو سونپ دیا جائے تو وہی زحمت بن جاتا ہے۔ جیسے کہ سرزمین مصر کا مذکورہ کنٹرول کسی نااہل کو سونپ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ خزانے بھی ضائع ہو جاتے اور ایام قحط میں مصر اور اردگرد کی آبادی بھی قحط کی بھینٹ چڑھ

چڑھ جاتی۔

لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ کے الفاظ میں یوسف کی اس سے پہلی ساری زندگی کو توازن بدوش ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کو بچپن ہی میں خواب آئی تھی کہ ملک مصر کا بادشاہ (سورج) مصر کا وزیر اعظم (مصر کا چاند) اور مصر کی کابینہ کے سردار (گیارہ ستارے) آپ کو سجدہ کرتے ہیں۔ یعنی سب کے سب آپ کے تابع فرماں ہوگئے ہیں۔ یہ تھی یوسفؑ کی بچپن کی خواب کی عملی تعبیر۔ **سَلٰمٌ عَلٰی یوسف**۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو زمین مصر میں مکمل اختیارات عطا فرمائے۔ اور آپ نے زمین کے چپے چپے کو زیر کاشت لانے کیلئے دورے شروع کئے سات سال میں چودہ پندرہ سالوں کیلئے بالافراط غلہ جمع کر دیا۔ اس کے بعد قحط کے سات سال شروع ہو گئے اور بیرون ملک سے بھی قحط زدہ لوگ آنے شروع ہوگئے۔ جن میں آپ کے بھائی بھی غلہ لینے آگئے۔ اگلی آیت میں یوسفؑ کی محنت کا انجام بتایا گیا ہے:۔

وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَةِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾

(۵۷) اور یقیناً بہتر انجام واسطے ان لوگوں کے ہے جو ایمان لائیں اور اللہ تعالیٰ کے ضابطہ کی مخالفت سے بچتے رہیں۔

وَجَآءَ اِخۡوَةُ یُوۡسُفَ فَدَخَلُوۡا عَلَیۡهِ فَعَرَفَهُمۡ وَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ﴿۵۸﴾

(۵۸) اور یوسف کے بھائی (غلہ لینے) آئے۔ پھر وہ اس کے پیش ہوئے۔ پھر اس نے انہیں پہچان لیا۔ مگر وہ آپ کو نہ پہچان سکے۔

جَآءَ کے بعد فا کیساتھ آیا ہے **فَدَخَلُوۡا عَلَیۡهِ** یہاں فا ترتیب و تراخی کیلئے آئی ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو برادران یوسف غلہ لینے مصر شہر میں آئے اور پھر اس کمرے میں آپ کے پیش ہوئے' جس میں آپؑ بیٹھے تھے' تشریف فرما ہوتے تھے۔ یہاں محاورۂ عرب کے مطابق دخل علیہ کے مصدری معنی ہے اس جگہ جانا جہاں یوسفؑ موجود تھے۔ ثابت ہوتا ہے کہ یہ آپ کا مخصوص کمرہ تھا' جہاں غلے کے خریدار آپ کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ غرض یہ تھی کہ غلے کے حقدار تو تھے قحط زدہ لوگ۔ وہ لوگ ہرگز حقدار نہیں تھے جو مرکز سے غلہ لے جائیں اور قحط زدہ افراد کے ہاتھ دگنی چوگنی قیمت پر بیچیں۔ اس لئے غلے کی منظوری حاصل کرنے کیلئے ہر کسی کو آپ کے سامنے پیش ہونا ہوتا تھا۔ چنانچہ اوپر بتایا گیا ہے کہ مصر پہنچنے کے بعد غلہ حاصل کرنے کی منظوری لینے کیلئے یوسفؑ کے سامنے پیش ہوئے یوسفؑ نے انہیں پہچان لیا مگر وہ آپ کو نہ پہچان سکے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق یوسف کا اس بلند مقام پر پہنچنے کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آپ نے فی کس ایک پیمانہ غلہ (یعنی ایک اونٹ کے بوجھ) کی منظوری دے دی۔ اور جب غلہ بھروایا تو انہیں کہا کہ اگلی بار اپنے اس بھائی کو ہمراہ لانا جو آپ کے باپ سے (سگا) ہے۔ کیا تم دیکھتے ہو کہ میں (فی کس) پورا پیمانہ دیتا ہوں اور میں بہتر مہمانی کرنے والا بھی ہوں۔ پھر اگر تم اسے اپنے ہمراہ نہ لائے' تو تمہارے لئے میرے ہاں کوئی پیمانہ نہ ہوگا۔ میرے پاس نہ آنا:۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمۡ بِجَهَازِهِمۡ قَالَ ائۡتُوۡنِیۡ بِاَخٍ لَّكُمۡ مِّنۡ اَبِیۡكُمۡ ۚ اَلَا تَرَوۡنَ اَنِّیۡۤ اُوۡفِی الۡكَیۡلَ وَاَنَا خَیۡرُ الۡمُنۡزِلِیۡنَ ﴿۵۹﴾

(۵۹) اور جب (یوسفؑ) نے ان کا سامان تیار کروایا تو انہیں کہا کہ (اگلی مرتبہ) اپنے اس بھائی کو جو تمہارے باپ سے (سگا) ہے' میرے پاس لانا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں (فی کس) پورا ناپ دیتا اور بہتر مہمان نواز ہوں۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَاۡتُوۡنِیۡ بِهٖ فَلَا كَیۡلَ لَكُمۡ عِنۡدِیۡ وَلَا تَقۡرَبُوۡنِ ﴿۶۰﴾

(۶۰) پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو میرے پاس تمہارے لئے

کوئی پیمانہ نہ ہوگا اور تم میرے پاس نہ آنا۔

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

(۶۱) (آپ کے بھائیوں نے جواب میں کہا) ہم اسکے باپ کو اس پر ضرور راضی کر لیں گے۔ اور ہم ایسا کرنے والے ہیں (ایسا کرتے ہیں)

اس سے پہلے انہوں نے یوسف کو ان کے ساتھ جنگل میں بھیجنے کیلئے باپ کو راضی کر لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ چھوٹے بھائی کو بھیجنے پر بھی ہم اپنے باپ کو راضی کر لیں گے۔ اس سے اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ یوسفؑ نے بھائیوں کے اسباب میں ان کی وہ رقم واپس رکھوا دی جو انہوں نے غلے کی قیمت کے طور پر ادا کی تھی۔ تاکہ وہ جلدی لوٹ آئیں:۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ ﴿۶۲﴾

(۶۲) آپ نے اپنے کارندوں کو کہا کہ ان کی ادا کردہ غلے کی رقم ان کی بوریوں میں رکھ دو۔ تاکہ جب اپنے اہل کے پاس جائیں تو اسے پہچان لیں تاکہ واپس آجائیں۔

غلے کی رقم واپس کر دینے کی دو غرضیں تھیں۔ پہلی یہ کہ بھائیوں کے جلدی لوٹ آنے پر دیر نہ لگنے پائے کہ اگلی بار کے غلے کی قیمت مہیا اور اکٹھی کرنے میں جو وقت لگ سکتا تھا وہ بچ جائے۔ اور دوسری غرض السید یعقوبؑ کے لئے ایک لمحہ فکر یہ مہیا کرنا تھا کہ یہ کون ہے ہمارا عزیز جس نے غلے کی بوریاں بھی بھر کر بھیج دی ہیں اور قیمت بھی واپس کر دی ہے۔ جب کہ اگلی آیت مجیدہ کے مطابق آپ کے بیٹے' آپ کو اس چیز کی بھی خبر دینے والے تھے کہ انہیں عزیز مصر کی طرف سے روک دیا گیا ہے کہ جب تک اپنے بھائی کو جو تمہارے باپ سے سگا ہے ہمراہ نہ لائے تو میری طرف مت آنا' تمہیں اس کے لائے بغیر غلہ نہیں ملے گا۔ یہ کون ہے جو غلے کی قیمت واپس کر کے ان کے سوتیلے اور یوسف کے سگے بھائی کو اپنے پاس منگا رہا ہے؟

ایک اہم اعتراض کا جواب:۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس اعتراض کا جواب دینا ضروری ہے کہ یوسفؑ تو مصر کے مال خزانوں کے امین تھے۔ کیا انہوں نے اپنے بھائیوں کو غلے کی قیمت واپس کر کے امانت میں خیانت نہیں کی تھی؟ اس کا جواب یوسفؑ کی شان امانت داری کے مطابق یہ ہے کہ یقینا یقینا آپ نے بھائیوں کو واپس کردہ غلے کی قیمت شاہی خزانے میں اپنی گرہ سے جمع کرا دی تھی۔ بصورت دیگر آپ اپنے اس وعدہ کے مخالف ثابت ہوتے ہیں جو آپ نے خزانوں کے کنٹرول کا مطالبہ کرتے وقت کیا تھا **اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ** ۱۲/۵۵ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود یوسف کو **اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ** ۱۲/۲۴ کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے' اس لئے یہ چیز محذوف ہے کہ آپ نے اپنے بھائیوں کو واپس کردہ رقم کو اپنی جیب سے ادا کر کے ملکی خزانے میں جمع کرا دیا تھا۔ الغرض! جب برادران یوسف واپس گھر آئے تو بوریوں میں سے رقم تو بعد میں برآمد ہوئی پہلے انہوں نے گھر پہنچتے ہی ابا جان سے کہا:۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

(۶۳) پھر جب وہ واپس ابا جان کے پاس آئے تو کہا کہ اے ہمارے والد غلے کا پیمانہ ہم سے روک دیا گیا ہے۔ (اس لئے غلے کے حصول کیلئے) ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیجے تاکہ پیمانہ لائیں اور بیشک ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

آیت بالا میں یہ الفاظ محذوف ہیں کہ عزیز مصر نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ جب تک ہم اپنے باپ سے سگے بھائی کو ہمراہ

نہ لائیں۔ اس وقت تک ہم پر مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ کا حکم نافذ رہیگا۔ لیکن جب برادران یوسفؑ نے اپنے چھوٹے بھائی کو ان کے ساتھ بھیجنے کو کہا تو یعقوبؑ نے فرمایا کیا اس سے پہلے میں نے اس کے بھائی کے بارے میں تمہیں امین نہ جانا تھا' کہ اب بھی اسی طرح تمہیں اس کا امین' حفاظت کرنے والے باور کروں۔ لیکن بہتر محافظ تو صرف اللہ تعالی ہے:۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

(۶۴) یعقوبؑ نے (بیٹوں سے کہا) کیا میں اسی طرح تمہیں اس کے بارے میں امین جانوں جس طرح میں نے اس سے پہلے اس کے بھائی کے بارے میں تمہیں امین جانا تھا۔ پس اللہ بہتر محافظ ہے (میں اس پر بھروسہ کرتا ہوں) اور وہ رحم کرنیوالوں میں بہتر رحم کرنیوالا ہے۔

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ کے الفاظ پر یعقوبؑ نے یوسفؑ کے چھوٹے بھائی کو اس کے بڑے بھائیوں کیساتھ مصر بھیجنا منظور کر لیا۔ اس کے بعد جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو غلے کی رقم لوٹائی ہوئی پائی:۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

(۶۵) اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنی پونجی اپنی طرف لوٹائی گئی پائی۔ انہوں نے کہا کہ ابا جان ہمیں اور کیا چاہئے یہ ہے ہماری پونجی جو ہماری طرف لوٹا دی گئی ہے۔ ہم اپنے اہل کیلئے غلہ بھی لے آئیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے۔ اور ایک اونٹ کا بوجھ غلہ بھی زیادہ لے آئیں گے۔ غلے کا مذکورہ پیمانہ آسان ہو جائیگا۔

غلے کی قیمت کی واپسی پر انہوں نے خوشی سے کہا ہمیں اور کیا چاہئے۔

نَمِيْرُ' مَارَ يَمِيْرُ سے جمع متکلم فعل مضارع معروف ہے۔ اس کا مصدر میر معنی ہے غلہ لانا۔ پونجی کے واپس آ جانے پر خوش ہوکر کہا کہ اپنے اہل و عیال کیلئے غلہ لانا آسان ہوگیا ہے۔

اور چھوٹے بھائی کے ساتھ جانے سے چونکہ ایک فرد کا اضافہ ہو جانا تھا۔ اس کے متعلق کہا کہ ایک کیل یعنی ایک اونٹ کا بوجھ بھر غلے کا مزید حصول ہو جائیگا۔ کیونکہ یوسفؑ کے ہاں فی کس ایک اونٹ کا بوجھ غلہ مقرر تھا۔ لیکن اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ یعقوبؑ نے فرمایا کہ میں تمہارے چھوٹے بھائی کو اس وقت تک نہیں بھیجوں گا جب تک واپس لانے کا پکا وعدہ نہ کرو:۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

(۶۶) (یعقوبؑ نے) کہا میں اسے تمہارے ساتھ اس وقت تک ہرگز نہ بھیجوں گا جب تک تم مجھے اللہ کا پکا عہد نہ دو کہ تم اسے ضرور میرے پاس لے آؤگے۔ سوائے اس کے تم سب گھر جاؤ۔ پھر جب انہوں نے اپنا عہد دے دیا تو آپ نے فرمایا جو ہم کہتے ہیں اس پر اللہ تعالی کارساز ہے۔

یعقوبؑ نے ظاہری اسباب کا پورا پورا اہتمام فرمایا کہ ایک چھوٹے بیٹے کو بڑے بیٹوں کی حفاظت میں دے دیا اور ان سے اللہ تعالی کا عہد لیا اور پھر اپنے اس عمل پر اللہ تعالی کو کارساز ٹھہرایا۔ بالفاظ دیگر ظاہری اسباب کو نظرانداز کر دینا اصل دین اور سنت انبیاء کے خلاف ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ یعقوبؑ نے جب اس مرتبہ بیٹوں کو مصر روانہ کیا تو ہدایت فرمائی کہ تم سب اکٹھے

ہوکر ایک ہی دروازے سے شہر مصر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ الگ الگ دروازوں سے ایک ایک داخل ہونا۔ اس پر بعض مفسروں نے کہا ہے کہ یہ اس لئے فرمایا کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ نظر کیا اکیلے کو نہیں لگتی۔ مگر نظر لگنے کا تصور مطلقاً محل نظر ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ آپؑ نے بیٹوں کو الگ الگ داخل ہونے کو کیوں کہا؟ اس کا جواب آیت نمبر ۶۸ میں آیا ہے **اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ** بے شک وہ شخص صاحب علم تھا کیونکہ ہم نے اسے سکھایا تھا۔ یہ سوچ صرف یعقوبؑ کی تھی کہ غلے کی قیمت واپس کرنے والا کون ہے' جسے یہ بھی معلوم ہے کہ پیچھے ان کا باپ سے ایک سگا بھائی موجود ہے جسے وہ انتہائی تاکید کے ساتھ اپنے پاس بلا رہا ہے۔ یہ یوسفؑ ہی ہو سکتا ہے۔ پھر آپؑ کے سامنے وہ خواب بھی تھی جس کے مطابق یوسفؑ ایک بلند مقام پر پہنچنے والے تھے۔ اس لئے الگ دروازوں سے داخل ہونے کی ہدایت اس لئے فرمائی کہ مصر پہنچ کر یوسفؑ کا سگا بھائی اپنے سوتیلے بھائیوں سے الگ ہو جائے اور ان سے الگ اکیلا اپنے بھائی سے ملے۔ چنانچہ ہدایت فرمائی:۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۶۷

(۶۷) اور یعقوبؑ نے فرمایا کہ اے میرے بیٹو! تم سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا' بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا' اور میں اللہ کے مقابلے پر تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ نہیں ہے حکم مگر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے' میں نے اسی کے (قانون) پر بھروسہ کیا ہے۔ پس چاہئے کہ بھروسہ کرنے والے اسی کے قانون پر بھروسہ کیا کریں۔

چونکہ چھوٹے بیٹے کو بڑے بیٹوں سے الگ کرنے کا غلط نتیجہ بھی نکل سکتا تھا اس لئے فرمایا کہ میں قانون باری تعالیٰ کے مقابلے پر تمہارے کام نہیں آسکتا۔ ہو سکتا تھا کہ چھوٹا بھائی بے خبری میں کسی حادثے کا شکار ہو جاتا" مگر یعقوبؑ کی تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۸ ؏

(۶۸) اور جب وہ اس طرح داخل ہوئے جیسے کہ انہیں ان کے باپ نے حکم دیا تھا۔ (اس طرح چھوٹا بھائی اکیلا بھائی کو جا ملا) یعقوبؑ اللہ کے قانون کے مقابلے پر کسی کام نہ آسکتے تھے۔ (اور نہ تھا یہ مگر) یعقوبؑ کا ذاتی علمی فرض تھا جو انہوں نے پورا کر دیا۔ اور بے شک وہ صاحب علم تھے کیوں کہ انہیں علم ہم نے سکھایا تھا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہاں **اِلَّا عاطفہ** معنی اور ہے **اِلَّا عاطفہ** کی مثالی آیت مجیدہ ۱۰-۱۱/۲۷ میں دیکھئے۔

حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ کے الفاظ میں **حَاجَةً** کا معنی یعقوبؑ کی ذاتی خواہش نہیں بلکہ آپؑ کا علمی فریضہ تھا۔ کیونکہ ان معنوں کی تائید **اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ** کے الفاظ میں موجود ہے کہ آپؑ نے جو ہدایت فرمائی تھی وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وہ علم کے مطابق تھی جو آپؑ کی ذاتی خواہش ہی نہیں تھی بلکہ آپؑ کا علمی فریضہ تھا جو آپؑ نے ادا کر دیا۔ آپؑ کو یقین تھا کہ عزیز مصر یوسفؑ ہے۔ انہیں غلہ کی قیمت واپس کرنے اور اپنے سگے بھائی کو اپنے پاس بلانے کی تاکید سے یقین ہوگیا تھا کہ عزیز مصر یوسفؑ ہی ہے جس نے رقم بھی واپس کر دی اور اپنے سگے بھائی کو اپنے پاس بتاکید بلایا ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتا دیا گیا ہے کہ جب یوسفؑ کے بھائی الگ الگ دروازوں سے آپ کے پاس اکیلے اکیلے پہنچے تو آپ نے اپنے سگے بھائی کو اپنے پاس ٹھکانہ دیا اور کہا کہ میں تیرا بھائی ہوں پس تو اس چیز پر افسوس نہ کر جو تیری ماں سے

سوتیلے بھائی تیرے ساتھ سلوک کرتے چلے آئے ہیں اور کرتے چلے جا رہے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

(۶۹) اور جب (یوسف کے بھائی) یوسفؑ کے پاس آئے (پہلے چھوٹا بھائی اکیلا آیا) تو آپ نے اپنے (سگے) بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ میں بیشک میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں۔ پس تو اس پر افسوس نہ کر یہ (سوتیلے) بھائی جو کرتے چلے آرہے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بھائی سے دوران سفر بھی انہوں نے اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ جس کی اس نے یوسفؑ سے شکایت کی اسلئے انہوں نے اسے تسلی دی کہ جو سلوک یہ کر رہے ہیں اس پر افسوس نہ کر۔

اس سے اگلی آیات مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جب انکا سامان تیار کیا گیا تو بھائیوں میں سے ایک نے چھوٹے بھائی کی بوری میں پانی پینے کا سرکاری پیالہ رکھ دیا۔ اس پر جب انکا قافلہ روانہ ہوا تو شاہی کارندوں نے پانی پینے کا پیالہ گم پایا تو ایک پکارنے والے نے پکارا کہ او قافلے والو! بیشک تم چور ہو۔ وہ رک گئے اور مڑ کر پوچھا کہ کیا گم ہوگیا ہے؟۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾

(۷۰) اور جب ان کا سامان تیار کروایا تو ایک (بھائی نے سرکاری پیانہ چھوٹے بھائی کی بوری میں رکھ دیا)۔ پھر (جب ان کا قافلہ روانہ ہوا اور غلہ ناپنے کا سرکاری پیانہ گم پایا گیا) تو ایک پکارنے والے نے پکارا کہ او قافلے والو تم چور ہو۔

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾

(۷۱) انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ تم کیا گم پاتے ہو۔

جَعَلَ السِّقَايَةَ جو ضمیر فاعل ھو مستتر ہے' مفسرین کرام نے اسے یوسفؑ کی طرف پھیر کر یہ تصور اخذ کیا ہے کہ چھوٹے بھائی کی بوری میں شاہی پیالہ یوسفؑ نے رکھوایا تھا۔ حالانکہ ایک تو یہ امر قابل قبول نہیں کہ اللہ کا پاک نبی ایسا عمل کرے کہ خود گناہ کا کام کرکے دوسروں کے ذمے لگائے اور ان کے نام پر سر عام الزام لگوائے کہ تم چور ہو اور اسی طرح سورہ النساء کی آیت ذیل کا مصداق بنے:۔

وَمَن يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ○ ۴/۱۱۲ اور جو شخص خود خطا یا گناہ کا کام کرے پھر اپنے آپ کو بری کرکے کسی دوسرے پر اس کا الزام لگائے تو بلا شبہ اس نے ظاہر بہتان لگایا اور ظاہر گناہ کیا۔ چونکہ یوسفؑ خود پیالہ چھپا کر اور خود بھائیوں کے چور ہونے کا اعلان کروا کر ۴/۱۱۲ کے مصداق ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتے اسلئے ہم نے جعل میں مستتر ضمیر **ھُوَ** کو بھائیوں میں سے کس کی طرف پھیرا ہے۔ اس امر پر کہ چھوٹے بھائی کی بوری میں پیالہ چھپانا یوسفؑ کا کام نہیں تھا بلکہ آپ کے بھائیوں کا کام تھا اس پر سات دلیلیں قاطعہ اسی سورہ یوسف میں موجود ہیں' جن کا تفصیلی بیان اس سے اگلی آیت مجیدہ نمبر۷۶ کے جملہ **كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ** کی تفسیر القرآن بالقرآن میں پیش کیا جائیگا افسوس ہے کہ روایتی تفاسیر نے اللہ تعالیٰ کے پاک نبیوں پر طرح طرح کے الزام لگا رکھے ہیں' جن میں سے یوسفؑ پر مذکورہ بہتان بھی ایک الزام ہے۔

قَالُوا وَأَقْبَلُوا کا معنی لکھا گیا ہے کہ انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ یہاں فا نہیں واؤ آئی ہے۔ اگر فا ہوتی تو ترتیب و تراخی تصور کی جاسکتی۔ چونکہ واؤ آئی ہے اسلئے اسکا یہ معنی نہیں ہے کہ انہوں نے یہ کہا کہ تمہارا کیا گم ہوگیا ہے اور بعد میں پکارنے والوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ بلکہ پہلے مڑ کر متوجہ ہوئے اور پھر کہا کہ تمہارا کیا گم ہوگیا ہے۔ اس پر اگلی

آیت میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ پانی پینے کا پیالہ گم ہوگیا ہے۔ جو کوئی لائے' اسے ایک اونٹ کا غلہ انعام دیا جائیگا۔

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

(۷۲) انہوں نے کہا ہم غلہ ناپنے کا شاہی سرکاری پیانہ نہیں پاتے۔ اور جو شخص اسے لائے۔ اس کے لئے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) انعام ہے۔ اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

جو چیز گم ہوئی اس کے لئے پیچھے آیت نمبر۷۰ میں **اَلسِّقَايَةَ** کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے پینے کا پیالہ یا کٹورا۔ مگر یہاں اسی کے لئے صواع الملک کا لفظ آیا ہے جس کا معنی ہے بادشاہ کا پیانہ۔ ایک ہی چیز کو چونکہ پانی پینے کا برتن بھی کہا ہے اور اسی کو پیانہ بھی کہا گیا ہے۔ اسلئے ثابت ہوتا ہے کہ وہ چیز غلہ ناپنے کا پیانہ تھا ٹوپہ وغیرہ' اور اس سے وقتاً" فوقتاً" پانی پینے کا کام بھی لے لیا کرتے تھے۔ نیز صواع الملک میں جو اضافت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سرکاری پیانہ تھا۔ بات تو بالکل سیدھی سی ہے' مگر روایتی تفسیروں نے السقایہ اور صواع کے متعلق ذیل کا عجیب و غریب تصور پیدا کیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے شاہ رفیع الدین کا ترجمہ مطبع نامی گرامی کریمی بمبئی کا چھپا ہوا کھلا پڑا ہے' جس کے حاشیے پر تفسیر موضح القرآن کے ماتحت السقایہ اور صواع الملک کے متعلق لکھا ہے:۔ "باسن بادشاہ کے پینے کا چاندی کا اس کی پیاس پر مپا تھا" یا اناج ناپنے کا اور گھوڑے اس میں پانی پیتے تھے" اس اقتباس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں' قارئین کرام خود سمجھ سکتے ہیں کہ چوری تو ہوئی تھی ایک چیز۔ کیا وہ بادشاہ کے پانی پینے کا باسن (کٹورا۔ پیالہ) بھی تھا اور اناج ناپنے کا پیانہ بھی تھا اور وہ گھوڑوں کے پانی پینے کا ٹب یا بانٹی وغیرہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ العجب! ثم العجب!

جب برادران یوسفؑ کو چور کہہ کر پکارا گیا اور انہیں پتہ چلا کہ سرکاری پیانہ چوری ہوگیا ہے تو انہوں نے قسمیں کھا کر کہا:۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

(۷۳) برادران یوسف نے کہا کہ اللہ کی قسم بیشک تم جانتے ہو کہ ہم سرزمین مصر میں فساد کرنے کیلئے نہیں آئے۔ اور نہ ہی ہم چور ہیں۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

(۷۴) انہوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے ہوئے تو اس کی (یعنی چوری کی) کیا سزا ہوسکتی ہے۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

(۷۵) (برادران یوسفؑ نے) کہا کہ جس کی بوری میں (مال مسروقہ) پایا جائے اس کی سزا وہی شخص آپ ہے (یعنی اسے قید کر لیا جائے) ہم (شریعت ابراہیمی میں) چوروں کو یہی سزا دیتے ہیں۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ کے الفاظ میں عیاں ہے کہ شریعت ابراہیمی میں چور کی سزا چوری کی مقدار کے مطابق عرصہ کیلئے قید کرنا ہے۔ اور چونکہ ۱۳/۴۲ کی آیت ذیل سے ثابت ہے کہ نبی اکرمؐ کو بھی وہی شریعت دی گئی ہے جو نوح' موسیٰ' اور عیسیٰ سمیت ابراہیم کو دی گئی تھی' اسلئے شریعت محمدی میں بھی چور کی سزا قید کرنا ہے ہاتھ کاٹنا نہیں:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ۱۳/۴۲ ایمان والو! (اللہ نے) تمہارے لئے اسی دین کی شرع کر دی ہے جس کا حکم نوحؑ کو دیا تھا اور یہ وہی دین

معہ شرع ہے جو ہم نے (اے رسول!) آپ کی طرف وحی فرمایا ہے۔ اور یہ وہی دین معہ شرع ہے جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ موسیٰؑ عیسیٰؑ کو دیا تھا۔ سورہ مائدہ میں جو چور اور چورنی کے متعلق **فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا** آیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر اپنے مقام پر گزر چکی ہے کہ وہاں قطع بمعنی روک دینا ہے کہ ان کے ہاتھ روک دو۔ انہیں بند کر دو۔ اور قطع بمعنی روکنا سورہ عنکبوت ۲۹/۲۹ میں قوم لوط کے متعلق آیا ہے کہ رسول لوطؑ نے انہیں کہا **اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ**۔ کیا تم وہ ہو جو جنسی تسکین کیلئے مردوں کے پاس آتے ہو اور مسافروں کو لوٹنے کیلئے راستہ روکتے ہو۔

جب برادران یوسفؑ نے چور کی سزا خود قید کرنا بتا دی۔ اور چونکہ وہ مسافر تھے اس لئے ان کیلئے انہی کے دین کی سزا طے ہوئی۔ اس کے بعد ان کی بوریوں کی تلاشی شروع ہوئی۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ بڑے بھائیوں نے پہلے اپنی بوریوں کی تلاشی دی؛ یعنی تلاشی بڑے بھائیوں سے شروع ہوئی:۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ۭ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

(۷۶) پس (تلاشی لینے والے نے تلاشی) اس کے چھوٹے بھائی کے شلیتے سے پہلے ان (بڑے بھائیوں کے) شلیتوں سے شروع کی۔ پھر اس (مال مسروقہ) کو اس کے بھائی کے شلیتہ سے نکالا (بھائیوں نے کہا) اسی طرح ہم نے یوسف کیلئے بھی بری تجویز کی تھی۔ اور (یوسف) اس قابل نہیں تھا کہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو گرفتار کرسکے' مگر اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ہم بلند کرتے ہیں درجے جس کے اپنے قانون مشیت کے مطابق ہی بلند کرتے ہیں۔ اور ہر صاحب علم کے اوپر ایک علم والا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

(۷۷) انہوں (برادران یوسفؑ) نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو ضرور اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف) نے بھی چوری کی تھی۔ اس پر یوسف نے اسے اپنے جی میں چھپا لیا اور (ان پر) ظاہر نہ کیا (کہ تم جھوٹ بول رہے ہو) کہا کہ تم اصلیت کے لحاظ سے ہی برے لوگ ہو' اور اللہ جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو (کہ سراسر غلط بہتان لگا رہے ہو)

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ۔ اس جملہ کا معنی یہ ہے "مذکورہ بالا طریقے سے ہم نے یوسف کیلئے تجویز کی تھی۔" روایتی تفاسیر میں اس جملے کو اللہ کا قول قرار دیا گیا ہے اور یہ نظریہ قائم کرلیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کو حکم دیا کہ اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کیلئے اس کی بوری میں شاہی پیمانہ رکھ دے اور اپنے بھائیوں سے چور کی سزا قید کرنے کا اقرار لے لے۔ اس طرح پہلے تو اپنے بھائیوں پر **اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ** کا سرعام جھوٹا الزام لگا دے۔ اور پھر اپنا رکھا ہوا شاہی پیمانہ خود برآمد کرکے بیگناہ کو چور بنا کر اسے اپنے پاس رکھ لے۔ بالفاظ دیگر روایات کا تصور یہ ہے کہ یوسف چاہتے تھے کہ اپنے سگے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا فریب کارانہ تجویز سکھائی اور اس طرح جب یوسفؑ نے اپنے بھائی کو سرعام چور بنا کر اپنے پاس رکھ لیا تو اس کے بعد فرمایا **كَذٰلِكَ كِدْنَا**

لِیُوْسُفَ۔ مگر ہم نے اس جملے کو برادران یوسف کا قول قرار دیا ہے کہ پہلے تو ان میں سے ایک نے چھوٹے بھائی کے شلیتے میں شاہی پیانہ چھپا دیا پھر جب سرکاری پیانہ برآمد ہوگیا اور ان کے چھوٹے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا تو انہوں نے کہا کہ اسی طرح ہم نے یوسف کیلئے بھی ایسی ہی تجویز کی تھی۔ ہمارے اس نظریہ کی تائید کیلئے اسی سورہ یوسف میں سات ناقابل انکار دلائل موجود ہیں۔ نمبروار اور بالتفصیل ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ **پہلی دلیل** یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی رسول نہ جھوٹ بولتے تھے اور نہ ہیرا پھیری اور مکروفریب کیا کرتے تھے۔ چنانچہ خود محترم یوسفؑ کے متعلق ارشاد ہوا ہے **اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ** ۱۲/۲۴ بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

۲۔ **دوسری دلیل** یہ ہے کہ بھائیوں کے سامان میں خود چوری پیانہ چھپا کر پھر یہ اعلان کرنا **اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ** محترم یوسفؑ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے کا کام ہرگز نہیں ہوسکتا تھا' بلکہ بھائیوں کا ہوسکتا تھا' جو اس سے پہلے خود یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینکنے کے جرم عظیم کا ارتکاب کر چکے تھے۔

۳۔ **تیسری دلیل** یہ ہے کہ جب بھائیوں نے کہا **اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ** تو اس پر اگر یوسفؑ نے خود پیانہ چھپایا تھا تو آپ اس وقت بھائیوں کو **اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا** نہ کہتے۔ مگر چونکہ اللہ کے نبی نے انہیں اس وقت **شَرٌّ مَّكَانًا** فرمایا تھا اس سے ثابت ہوا کہ چھوٹے بھائی کو چور بنانے والے وہ تھے نہ کہ یوسف علیہ السلام

۴۔ **چوتھی دلیل** یہ ہے کہ جب بھائیوں نے یوسفؑ کی خدمت میں عرض کیا اے عزیز مصر اس کا باپ بہت بوڑھا ہے۔ تو اس کی بجائے ہم میں سے ایک کو گرفتار کر لے **اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ** تو اس پر آپؑ نے فرمایا **مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ** ۱۲/۷۹ اللہ کی پناہ اس سے کہ ہم گرفتار کریں سوائے اس کے کسی اور کو جس کے پاس سے ہم نے مال برآمد کیا ہے۔ پس اگر یوسفؑ نے خود پیانہ بھائی کے شلیتے میں رکھا یا رکھوایا تھا تو آپ کا یہ کہنا یقیناً جھوٹ بھی تھا اور خلوص کے خلاف بھی۔ مگر چونکہ آپ ۱۲/۲۴ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے تھے اسلئے یہ جھوٹ اور افتراء آپ کا فعل نہیں تھا بلکہ برادران یوسف کا فعل تھا جو اس سے پہلے بھی ایسی بری تجویز کو عملی جامہ پہنا چکے تھے۔

۵۔ **پانچویں دلیل** یہ ہے کہ جب برادران یوسفؑ اپنے چھوٹے بھائی کو رہا کرانے سے مایوس ہوکر الگ بیٹھ کر صلاح مشورہ کرنے لگے تو وہی بڑا بھائی جو یوسفؑ کو قتل کرنے کی بری تجویز کے خلاف تھا۔ وہ ان کی مذکورہ تجویز کے بھی خلاف تھا' اس نے ان سے کہا:۔ **قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ** ۱۲/۸۰ ان میں سے بڑے نے کہا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے تم سے (چھوٹے بھائی کو واپس لانے کا) اللہ تعالیٰ کا پکا وعدہ لیا تھا۔ (مگر تم باز نہیں آئے اور تمہیں یاد ہے کہ) تم نے اس سے پہلے یوسفؑ کیساتھ کونسی کمی کی تھی۔ (اگر میں آڑے نہ آتا تو تم تو اسے جان سے مار ڈالنے کے در پے تھے) پس خود برادران یوسف کے بڑے بھائی کے الفاظ سے بھی کھل کر ثابت ہو چکا کہ چھوٹے بھائی کے شلیتے میں پیانہ چھپا کر اور اسے چور بنا کر گرفتار کرانیوالے برادران یوسف تھے' یہ فعل ان کا تھا' اور یوسفؑ کا ہرگز ہرگز نہیں تھا۔

۶۔ **چھٹی دلیل** یہ ہے کہ جب بڑے بھائی نے کہا میں تو سرزمین مصر سے چھوٹے بھائی کو ساتھ لئے بغیر باپ کے پاس نہیں

جاؤں گا تم جاؤ اور جھوٹ بولو کہ ابا جان! آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اس لئے گرفتار ہوگیا ہے۔ مگر باقی بھائی جب یعقوبؑ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اسلئے گرفتار کر لیا گیا ہے تو یعقوبؑ نے جو ان کی شرارتوں سے واقف تھے وہی الفاظ دہرائے جو اس وقت فرمائے تھے جب وہ یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینک کر آپ کے پاس آئے اور جھوٹ بولا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ یعقوبؑ نے اس وقت بھی فرمایا تھا **قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ** ۱۲/۱۸ یعقوبؑ نے فرمایا کہ (بات یوں نہیں' یوسفؑ کو بھیڑیا نہیں کھا گیا) بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لئے تمہارے برے عمل کو اچھا کر دکھایا ہے۔ اسی طرح جب برادران یوسفؑ نے چھوٹے بھائی کو چور بنا کر اور گرفتار کراکر باپ کے سامنے یہ جھوٹ بولا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے تو آپؑ نے اس وقت بھی یہی فرمایا! **قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ط فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ** ۱۲/۸۳ آپ نے فرمایا کہ (بات یوں نہیں میرے بیٹے نے چوری نہیں کی) بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے برے عمل کو تمہارے لئے اچھا کر دکھایا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے سچے نبی یعقوبؑ کے الفاظ کے مطابق جس طرح یوسفؑ کو بھیڑیا نہیں کھا گیا تھا بلکہ اس میں خود برادران یوسف کی اپنی شرارت تھی جسے ان کے نفسوں نے چھپا کر اور بھیڑیے کے سر تھوپ کر برے فعل کو ان کے لئے اچھا کر دکھایا تھا۔ اسی طرح چھوٹے بھائی کے معاملے میں بھی خود برادرانِ یوسف ہی قصور وار تھے' ان کے چھوٹے بھائی نے چوری نہیں کی تھی بلکہ ان کے نفسوں نے ان کے برے عمل کو چھپایا اور اسے چھوٹے بھائی کے سر تھوپ کر ان کے لئے اچھا کر دکھا دیا تھا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ پیمانہ چھپانا بھی بھائیوں کا فعل تھا یوسفؑ کا فعل نہیں تھا اور ان کا یہ فعل بھی ان کے پہلے فعل کے برابر کا تھا کہ یوسفؑ کو انہوں نے کنوئیں میں پھینکا اور اس کے بھائی کو قید خانے میں پھینک دیا۔

۷۔ **ساتویں دلیل** یہ ہے کہ جب برادران یوسف تیسری مرتبہ مصر گئے اور یوسفؑ سے غلہ صدقے کے طور پر مانگا تو یوسفؑ نے ان سے پوچھا **هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ** ۱۲/۸۹ کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسفؑ کیساتھ اور اس کے بھائی کیساتھ کیا کیا تھا؟ جب تم جہالت کے کام کیا کرتے تھے۔ اس پر انہوں نے جان لیا کہ یہ تو وہی یوسفؑ ہی عزیز مصر ہے جسے ہم نے کنوئیں میں پھینک دیا تھا اور اس کے بھائی کو چور بنا کر قید خانے میں ڈال دینے کا ارتکاب کیا تھا۔ اس پر انہوں نے کہا **قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ط قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ** ۱۲/۹۰ برادران یوسف نے کہا گیا تو ہی یوسفؑ ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ برادران یوسف نے اپنے دونوں جرموں کا اقرار ان لفظوں میں کیا:۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ۱۲/۹۱ انہوں نے کہا اللہ کی قسم بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور بلاشبہ ہم (آپ کے اور آپ کے بھائی دونوں کے معاملے میں) خطا کار ہیں۔

یہ ہیں بھائی کے تھیلے میں یوسفؑ کی طرف سے پیمانہ رکھنے' یا رکھوانے کے الزام کی برءت کی سات ناقابل انکار دلیلیں جو یکے بعد دیگر خود سورہ یوسفؑ کے اندر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن حکیم جملہ انبیاء کرام کی تعظیم و تکریم اور طہارت کردار کے دلائل قاطعہ سے بھرا پڑا ہے' جن میں سے اگر ذیل کی صرف ایک ہی دلیل نگاہوں کے سامنے ہو تو نہ صرف یوسفؑ پر چوری پیمانہ رکھوانے کا الزام لگانے کی جرات ہوسکتی ہے اور نہ باقی انبیاء پر جو روایتی تفاسیر نے الزام لگائے ہیں' ان کے نقل در نقل کرتے چلے جانے کا عمل جاری رہ سکتا ہے:۔

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۲۱/۲۶-۲۷ بلکہ (اللہ کے سارے کے

سارے نبی رسول اسکے) واجب التکریم بندے تھے۔ وہ بات میں بھی اللہ تعالیٰ سے آگے نہیں بڑھتے تھے اور وہ ہر عمل اللہ کے حکم کے مطابق کرتے تھے۔ اب آیت نمبر۷۶ کے ضمن میں مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

قانون مشیت:۔ مَاكَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۱۲/۷۶ کے الفاظ میں دو مرتبہ قانون مشیت کی استثنٰے آئی ہے۔ پہلی یہ کہ یوسفؑ اس قابل نہیں تھے کہ مصر کے ملکی قانون کے مطابق کسی غیر ملکی باشندے کو اپنے پاس رکھ سکتے۔ مگر قانون مشیت کے مطابق انہوں نے اپنے بھائی کو اس طرح رکھ لیا کہ خود بھائیوں نے اس کے شلیتے میں شاہی پیمانہ چھپا دیا اور خود ہی چوری کی ابراہیمی سزا قید کرنے کی وضاحت کر دی۔ اس طرح دھوکے فریب کے ساتھ نہیں، بلکہ قانونی رعایت کے مطابق آپ نے بھائی کو گرفتار کرکے رکھ لیا۔ مشیت الٰہی یہ ہے کہ برادران یوسفؑ نے جب یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینکا تو اللہ کی کوئی قوت آڑے نہ آئی اور یوسفؑ کنوئیں میں ڈال دئے گئے۔ مگر اللہ کا قانونِ رضا یہ ہے کہ کوئی بھی ناروا کام ہرگز نہ کیا جائے۔

لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ یوسفؑ کا کنوئیں میں پھینکا جانا ہی اس امر کا اولین سبب نہیں بنا تھا کہ آپ مصر میں پہنچے اور بالآخر عزیز مصر کے منصب عظیم پر پہنچ گئے۔ لیکن اگرچہ کنوئیں میں پھینکے جانے کے سبب ہی سے آپ عزیز مصر کے منصب عظیم پر فائز ہوئے تھے، مگر بھائیوں کا کنوئیں میں پھینکنا جرم ہی قرار دیا جائیگا، اسے کبھی بھی اچھا شمار نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح کہا جاسکتا ہے کہ اگر یوسفؑ پر بدکاری کا الزام نہ لگایا جاتا تو نہ آپ قید خانے میں پہنچتے، نہ وہاں دوقیدیوں کو خوابوں کی تعبیریں بتاتے، نہ ان میں سے ایک جو زندہ رہا تھا، وہ بادشاہ کو آپ کی خبر دیتا، نہ آپ بادشاہ کو اس کی خواب کی تعبیر بتاتے اور نہ وہ آپ کو اپنا وزیر اعظم (عزیز مصر) قرار دیتا۔ اگرچہ ان تمام اسباب کا ابتدائی سبب آپ پر بدکاری کا الزام لگایا جانا ثابت ہوتا ہے، لیکن قانون الٰہی کے مطابق کسی پر بدکاری کا الزام لگانا کبھی بھی جائز و روا قرار نہیں دیا جاسکتا، اگرچہ اس کا آخری نتیجہ ملزم کے حق میں کیسا ہی اچھا برآمد ہو۔ اسی طرح اگرچہ برادران یوسف کا چھوٹے بھائی کے شلیتے میں پیمانہ چھپانے کا نتیجہ یوسف اور خود چھوٹے بھائی کیلئے بہتر ثابت ہوا تھا، لیکن کسی کے سامان میں کوئی چیز چھپا کر اور اسے چور بنا کر گرفتار کروا دینا بھی کبھی جائز وروا اقرار نہیں دیا جاسکتا۔

اسی استثنٰے بالمشیت کا دوسرا حصہ ہے **نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ** جس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم جس کے درجے بلند کرتے ہیں اپنے قانون مشیت کے مطابق ہی بلند کرتے ہیں۔ نتیجہ اعمال ہی کا نکلتا ہے۔ یوسفؑ سابق عزیز مصر کے گھر میں برسوں رہے، وہیں جوان ہوئے مگر انتہائی پاکیزہ زندگی گزاری، حتیٰ کہ خود زن عزیز نے گناہ کی دعوت دی مگر اس عظیم ترین آزمائش میں بھی کامیاب رہے۔ قید خانے میں ڈالے گئے تو پھر بھی ثابت قدم رہے۔ خوابوں کی تعبیریں صحیح صحیح بتائیں اور جب آپ کو چودہ پندرہ سالہ غلے کے کنٹرول کا فریضہ سونپا گیا تو انتہائی جاں نشانی اور انتھک محنت کیساتھ کام کیا، ادھر برادران یوسف نے اتنے طویل عرصے تک والد بزرگوار کو اسی دھوکے میں رکھا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ اس تقابل کردار کا نتیجہ یہ ہوا کہ عظیم و طویل قحط سالی کے دور میں، یوسفؑ غلہ تقسیم کرنے پر فائز ہوئے اور آپ کو کنوئیں میں پھینکنے والوں کو آپ کے حضور غلہ حاصل کرنے کیلئے حاضر دربار ہونا پڑا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم بلا کسی قاعدے قانون کے جس کے چاہتے ہیں اس کے درجے بلند کرتے ہیں یوسفؑ کے درجے قانونِ مشیت کے مطابق ہی بلند ہوئے تھے، بلا قانون نہیں طالوت کو سپہ سالاری عطا کرنے کے بعد ۲/۲۴۷ میں ارشاد ہوا **اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ** بیشک اللہ تعالیٰ نے

طالوت کو تمہارے مقابلے پر اسلئے پسند فرمایا ہے کہ اسے علم اور جسم دونوں میں تم سے افضل پایا ہے۔ اور اس کے بعد ارشاد ہوا ہے:۔ **وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ** ۲/۲۴۷ اللہ تعالیٰ جسے سپہ سالاری عطا کرتا ہے اپنے قانون مشیت کے مطابق ہی عطا فرماتا ہے۔ طالوت کو اسلئے سپہ سالاری عطا کی گئی کہ اس منصب کیلئے علم و جسم کا ہونا لازم ہے۔

برادران یوسف نے یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی دونوں کیلئے اللہ کے قانون رضا کیخلاف الگ الگ بری تجویزیں کیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون مشیت کے مطابق ان کا نتیجہ اچھے سے اچھا عطا فرمایا۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ عرصہ کتنا لگا؟ کم از کم پچیس تیس سال۔ اگر انسان نیکو کاری اور راستبازی کیساتھ اللہ تعالیٰ کے قوانین اپنا کر عمل کرتے ہوئے اس کے قوانین مشیت کے ست رفتار نتیجے کا انتظار پوری راستبازی اور نیکو کاری کیساتھ کرے تو اللہ تعالیٰ کا قانون مشیت فرعونِ یوسفؑ سے اس کے شاہی اختیارات اس کی زندگی ہی میں یوسفؑ کے قدموں میں ڈلوا دیتا ہے اور فرعونِ موسیٰ کی موسیٰؑ کی زندگی ہی میں اس کی آنکھوں کے سامنے اسے، اس کے لاؤ لشکر سمیت غرق کرکے دکھا دیتا ہے۔

رجوع الی المقصود:۔ اب آیئے پھر آیت نمبر۷۷ کی طرف جس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ جب برادران یوسفؑ نے چھوٹے بھائی کے تھیلے میں پیمانہ چھپا دیا۔ اور جب تلاشی پر اس کے تھیلے سے مالِ مسروقہ برآمد ہوگیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے یوسفؑ سے عرض کیا:۔

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۷۸

(۷۸) برادرانِ یوسفؑ نے کہا اے عزیز مصر بلا شبہ اس کا باپ بڑا بوڑھا ہے۔ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو گرفتار کر لیں۔ بیشک ہم آپ کو احسان کرنیوالوں میں سے دیکھتے ہیں۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۝۷۹

(۷۹) یوسفؑ نے فرمایا اللہ کی پناہ اس سے کہ ہم اس کے سوا کسی اور کو گرفتار کر لیں، جس کے پاس سے ہم نے اپنا مال مسروقہ برآمد کیا ہے۔

اس طرح جب برادران یوسفؑ اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ والد کے پاس لے جانے سے مایوس ہوگئے تو الگ جگہ پر جا بیٹھے:۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۗ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸۰

(۸۰) پھر جب وہ (چھوٹے بھائی کو رہا کروا کر والد کے پاس اپنے ساتھ لے جانے سے مایوس ہوگئے تو) الگ جگہ پر مشورہ کرنے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ان کے بڑے بھائی نے کہا، کیا تم جانتے نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے (چھوٹے بھائی کو واپس لانے کا) اللہ کا پکا عہد لیا تھا۔ (لیکن تم باز نہیں آئے اور تمہیں یاد ہے کہ) تم نے اس سے پہلے یوسفؑ کے بارے میں کون سی کسر باقی رکھی تھی (اگر میں آڑے نہ آتا تو تم تو اسے جان سے مار ڈالنے پر تلے ہوئے تھے) پس میں سرزمین مصر سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا، جب تک کہ مجھے ابا جان اجازت نہ دیں یا اللہ تعالیٰ مجھے حکم کرے۔ وہ بہتر حکم کرنے والا ہے۔

ارْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

(۸۱) (اس نے مزید کہا کہ) تم اپنے ابا جان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ اے میرے ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور ہم گواہ نہیں ہیں (کہ اس نے چوری کی ہے یا اس کے ذمہ لگائی گئی ہے) ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا ہمیں علم ہوا ہے اور ہم غیب جاننے والے نہیں۔

(۸۲) آپ اس بستی سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے یا اس قافلے سے دریافت کرلیں جس میں ہم آئے ہیں (کہ مال مسروقہ شاہی پیمانہ اس کے تھیلے سے برآمد ہوا ہے) اور بیشک ہم اپنے بیان میں سچے ہیں۔

اس طرح جب بڑے بھائی کے سوا باقی بھائی مصر سے چل کر والد بزرگوار کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے آپ اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے تصدیق کرلیں جس میں ہم آئے ہیں کہ ہم سچے ہیں کہ واقعی چھوٹے بھائی کے تھیلے سے شاہی پیمانہ برآمد ہوا تھا۔ لیکن یعقوبؑ نے ان پر ہرگز اعتبار نہ کیا اور وہی الفاظ دہرائے جو اس وقت فرمائے تھے، جب وہ یوسفؑ کو کنوئیں میں پھینک کر آئے اور یہ کہا تھا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں آپ کا جواب درج ہے:۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

(۸۳) یعقوب نے فرمایا کہ (بات یوں نہیں یعنی میرے بیٹے نے چوری نہیں کی) بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے برے عمل کو اچھا کر دکھایا ہے۔ مجھے تو احسن طریقے سے صبر کرنا ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو (یوسف سمیت) میرے پاس لے آئے۔ بلاشبہ وہ بڑھ کر جاننے والا اور بڑھ کر حکمت والا ہے۔

قرآن کریم کا اسلوب محذوف:۔ قرآن کریم کا ایک مخصوص انداز بیان محذوفات کا ہے کہ بعض عبارتیں محذوف یعنی Under Stood ہوتی ہیں۔ جیسے کہ اوپر والی آیت مجیدہ میں ایک لمبی عبارت محذوف ہے۔ اس آیت سے آیت ماقبل میں بڑا بھائی باقی بھائیوں کو کہتا ہے کہ میں چھوٹے بھائی کو ساتھ لئے بغیر ابا جان کی خدمت میں نہیں جاؤں گا۔ "تم اپنے والد کے پاس جاؤ اور کہو کہ اے ہمارے ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے۔ آپ اس بستی سے پوچھ لیں جس میں ہم تھے اور یا اس قافلے سے تصدیق کرالیں۔ جس میں ہم آئے ہیں۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا ہم گواہ نہیں تھے اور نہ ہم غائب جانتے ہیں۔ ہم اپنے بیان میں سچے ہیں":۔

الٹی واؤن کے درمیان کی لمبی عبارت وہ ہے جو بڑے بھائی نے چھوٹے بھائیوں سے مصر میں کہی تھی کہ ابا جان کے پاس جاکر یوں کہو۔ لیکن آیت نمبر۸۲ کے آخری الفاظ پر بڑے بھائی کا کلام **اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ** پر ختم ہوتا ہے جو اس نے مصر میں کہا تھا اور آیت نمبر ۸۳ کے ابتدائی الفاظ یعقوبؑ کا جواب ہیں **بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا**۔ بالفاظ دیگر آیت نمبر۸۲ اور ۸۳ کے درمیان الٹی واؤن والی یہ ساری عبارت محذوف ہے کہ چھوٹے بھائی بڑے بھائی سے ہدایت لیکر منزل بمنزل والد بزرگوار کے پاس پہنچے اور کہا **يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ** .... **الخ** اور والد نے جواب دیا **بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ** ....

التع

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا" کی مکمل بحث پیچھے تفصیلاً" گزر چکی ہے کہ ان الفاظ میں یعقوب نے بیٹوں کے اس بیان کو جھوٹ قرار دیا تھا کہ یوسف" کو بھیڑیا کھا گیا ہے اور ان کے اس بیان کو بھی بالکل اسی طرح کا جھوٹ قرار دیا جو انہوں نے کہا کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے۔ وہ بھی تمہاری اپنی بری تجویز تھی اور یہ بھی تمہاری ہی بری تجویز ہے۔

عَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا" کے جملہ میں "جمیعا" کا لفظ انتہائی اہم ہے یعقوب" نے فرمایا کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ (یوسف" کے بیوی بچوں سمیت) سب کو میرے پاس لے آئے' آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ عزیز مصر یوسف" ہے۔ وہ عنقریب اپنے بچوں' اپنے چھوٹے بھائی اور سب سے بڑے بھائی سمیت میرے پاس آنے ہی والا ہے۔ ان کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا یوسف" کو چونکہ قحط زدہ لوگوں کی اہم خدمت تقسیم غلہ کی مصروفیت کی بدولت والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہونے کی فرصت نہیں تھی۔ اسلئے جب یہ بھائی تیسری مرتبہ مصر گئے تو یوسف" نے ان پر اپنا آپ ظاہر کر دیا اور فرمایا کہ (اہا اور اماں حضور سمیت) اپنے پورے اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ ۹۳/۱۲۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ جب بیٹوں نے چھوٹے بھائی کے چوری کرنے کی غلط خبر سنائی تو اس کی فوراً" تردید کرنے کے بعد یعقوب" نے ان سے منہ موڑ لیا اور یوسف" کی فوری ملاقات کی امید میں اسے اس طرح یاد کیا کہ گویا ان کی آنکھیں چمک اٹھیں:۔

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٨٤﴾

(۸۴) اور یعقوب" نے (بیٹوں کو جھٹلانے کے بعد) ان سے منہ موڑ لیا اور (امید افزا انداز میں) کہا اے افسوس یوسف" پر' حالانکہ (مصر کے حالات کے مطابق) ان کی دونوں آنکھیں غم سے (نکل کر) چمک اٹھیں۔ پس وہ غم کو ضبط کرنیوالے تھے۔

مصر کے سابقہ حالات کے مطابق یعقوب" کو یقین کامل تھا کہ عزیز مصر یوسف" ہیں اور وہاں کے تازہ حالات کے مطابق کہ اب یعقوب" کے دونوں چھوٹے بیٹے بھی ان سے جدا ہیں اور سب سے بڑا بھائی بھی وہیں ہے' اسلئے اب انہیں یقین واثق تھا۔ کہ اب ان کا بیٹا یوسف" (عزیز مصر) زیادہ دیر انہیں غم و فراق میں مبتلا نہیں رکھے گا۔ اس لئے جلدی ملاقات کی امید کی خوشی میں ان کی آنکھیں بحر غم سے نکل کر چمک اٹھیں کہ اب طویل جدائی کی گھڑیاں ختم ہونے ہی والی ہیں۔

اَبْيَضَّتْ کا سہ حرفی مادہ ب۔ی۔ض= بیض ہے جس کا معنی سفید ہونا چمک اٹھنا ہے۔ علماء روایات یدِ بیضاء کا معنی لیتے ہیں چمکتا ہوا ہاتھ۔ مگر افسوس ہے کہ روایتی تفاسیر میں ابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ کا معنی یہ لے لیا گیا ہے کہ یعقوب" کی آنکھیں غم کیساتھ سفید ہوگئی تھیں یعنی آپ یوسف" کے غم میں روتے روتے اندھے ہوگئے تھے۔ یہ تصور مطلقاً" غلط ہے کیونکہ یعقوب" اللہ تعالیٰ کے نبی رسول تھے' آپ کا فریضہ تبلیغ دین تھا کہ دن رات روتے رہنا؟ پھر قرآن کریم نے ان کی تعریف میں کہا ہے فَهُوَ كَظِيمٌ کہ وہ غم کو ضبط کرنیوالے تھے نہ کہ غم میں ڈوب کر اور بقول روایات مسلسل چالیس سال تک روتے رو کر فریضہ نبوت کو ترک کر دیا تھا۔ کیا كَظِيمٌ کے تقاضے یہی ہیں؟ پھر آپ نے یوسف" کی جدائی پر بھی فرمایا تھا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ اور چھوٹے بیٹے کی جدائی کی خبر پر بھی فرمایا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ۔ کیا رو رو کر اندھے ہوجانا صبر جمیل ہے۔ مقام تعجب ہے کہ روایات نے یعقوب" کو مقام نبوت تک سے گرا دیا ہے۔

فی الحقیقت اس وقت صورت حال یہ تھی کہ یعقوبؑ خود یوسفؑ کی آمد کے یا ان کی طرف سے آمدہ مصدقہ خبر کی آمد کے منتظر تھے۔ آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ اب ان کا بیٹا یوسفؑ (عزیز مصر) خود آیا چاہتا ہے اور یا اس کی طرف سے بھیجی ہوئی خبر آیا ہی چاہتی ہے اسلئے اس جان بخش تصور کی خوشی میں ان کی آنکھیں چمک اٹھیں مگر ان کے **یَاَسَفٰی عَلٰی یُوسُفَ** کہنے پر آپ کے نادان بیٹوں نے آپ سے کہا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

(۸۵) یعقوب کے بیٹوں نے کہا کہ آپ یوسف کا ذکر اس وقت تک کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یا تو مضمحل ہو جائیں گے اور یا ہلاک ہو جائیں گے۔

حَرَضًا کا ۔ حرفی مادہ ہے ح ۔ ر ۔ ض= حرض جس کا بنیادی معنی ہے کمزور ہو جانا، نڈھال ہو جانا، غم میں گھل جانا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یعقوبؑ نے غم یوسفؑ کو اپنے اوپر مسلط نہیں کر لیا تھا۔ پدری تقاضے کے مطابق بیٹے کی جدائی کا صدمہ تو ایک فطری امر تھا، لیکن نہ آپ مضمحل ہوگئے تھے، نہ نڈھال اور نہ غم میں گھل گھل کر کمزور ہوگئے تھے۔ بلکہ فریضہ نبوت کی ادائیگی کیلئے تقاضائے عمر کے مطابق نہ آپ کو کمزور کہا جاسکتا تھا نہ لاغر۔ روایتی تفاسیر کا دیا ہوا تصور یہاں آمدہ لفظ حرضا کے مطابق بھی صد فیصد غلط ہے کہ آپ یوسف کے غم میں رو رو کر اندھے، کمزور، لاغر اور مضمحل ہوگئے تھے۔ ایسی حالت میں آپ کے فریضہ نبوت کا کیا بنا ہوگا؟ العیاذ باللہ !

جب نادان بیٹوں نے **حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ** کا طعنہ دیا تو یعقوبؑ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

(۸۶) یعقوبؑ نے فرمایا کہ میں اپنے (فطری) صدمہ اور غم کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرتا ہوں اور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

بثی میں یائے نسبتی ہے اور بث کا معنی ہے وہ صدمہ جو فطری طور پر لازم ہو جاتا ہے جیسے کہ باپ کیلئے بیٹے کی جدائی کا صدمہ فطری اور لازمی چیز ہے۔ اور اسی صدمے پر آپ نے فرمایا تھا **فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ**۔ پس میں احسن طریقے سے صبر کروں گا۔ اسے مستقل مزاجی کیساتھ برداشت کروں گا۔ کار فریضہ نبوت میں اس صدمے سے ذرہ بھر فرق بھی ہرگز ہرگز نہیں آنے دوں گا۔

یعقوبؑ کی طرف سے **وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** کے الفاظ میں دیا گیا جواب ببانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ آپ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت کے مطابق مصر سے آنیوالی خبروں اور مشاہدات سے جان لیا تھا کہ عزیز مصر انکا نور نظر یوسف ہی ہے، جس نے بھائیوں کو غلہ بھی دیا اور غلے کی قیمت بھی واپس کر دی۔ پھر وہ یوسف ہی تو ہے جس نے اپنے بھائیوں پر پابندی لگا دی کہ دوسری مرتبہ اپنے باپ سے سگے بھائی کو ہمراہ لائے بغیر تمہیں غلہ نہیں دیا جائیگا۔ اور وہ یوسف ہی ہے جس کے لئے قانون مشیت باری تعالیٰ نے اس کے بھائی کو اس کے پاس روک دینے کے سامان کر دیئے۔ اور اس پر جب سب سے بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو ساتھ لئے بغیر ابا حضور کے سامنے حاضر ہونے سے انکار کر دیا تو اب یوسفؑ کے واسطے مزید عرصہ کیلئے اپنے آپ کو چھپائے رکھنے اور ابا حضور کو تین بیٹوں کی جدائی کے غم میں مبتلا رکھنے کا جواز باقی نہیں تھا۔ اسلئے آپ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت کے مطابق اعلان فرمایا کہ جو کچھ میں اللہ سے جانتا ہوں تم ہرگز نہیں جانتے۔ اب صدمۂ فراق

کی انتہا ہو چکی ہے' اب انتظار کرنے کی گھڑیاں ختم ہونے ہی والی ہیں۔ اس لئے آپ نے بیٹوں کو حکم دیا کہ جاؤ یوسفؑ اور اس کے بھائی کا پتہ لگاؤ' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

(۸۷) اے میرے بیٹو! (مصر جاؤ) اور یوسف اور اس کے بھائی کو جانو اور پاؤ' اور اللہ کی وسیع رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ۔ بیشک اللہ کی وسیع رحمت سے نہیں مایوس ہوتے مگر جو (ان کی وسعت رحمت کا) انکار کرنے والے ہیں۔

روح کا لفظ وسعت کیلئے آتا ہے۔ یہاں وسیع رحمت مراد ہے۔ **تَحَسَّسُوْا حَسَّ** سے باب تفعل ہے حاسّہ سے۔ اس کا سہ حرفی مادہ ح۔ س۔ س ہے جس کا معنی کسی چیز کو جان لینا بھی ہے اور اسے پالینا بھی ہے یہاں دونوں مراد ہیں۔ یعقوبؑ کی پیغمبرانہ بصیرت کے مطابق اس مرتبہ مصر جانے پر یوسفؑ اپنا آپ ظاہر کر دیں گے۔ چنانچہ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا کہ بھائیوں کے اب آنے پر یوسفؑ نے ان پر اپنا آپ ظاہر کر دیا۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾

(۸۸) (ابا حضور کے حکم پر جب برادران یوسفؑ تیسری مرتبہ) ان کے پاس آئے تو کہا کہ اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے اہل کو (قحط کی) تکلیف پہنچی ہے اور ہم تھوڑی سی رقم لیکر آئے ہیں۔ مگر آپ ہمیں پورا ناپ عطا فرمایئے اور ہمیں صدقہ دیجئے بیشک اللہ تعالیٰ صدقہ (خیرات) کرنے والوں کو اچھا بدلہ دیتا ہے۔

اس پر یوسفؑ نے ذیل کا سوال کیا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

(۸۹) یوسفؑ نے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی سے کیا سلوک کیا تھا' جب تم جہالت کے کام کرتے تھے۔

یوسفؑ کے اس سوال پر بھائیوں نے اپنے والد کے حکم کے مطابق یوسفؑ کو پالیا اور ان کے سوال کے جواب میں کہا۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

(۹۰) انہوں نے کہا کیا بیشک تو' تو ہی یوسف ہے؟ آپ نے فرمایا (ہاں) میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے۔ بیشک شان یہ ہے کہ جو کوئی قوانین الٰہی کی مخالفت سے بچتا ہے اور اس پر استقامت کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ توازن قائم رکھنے والوں کے اعمال کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

پیچھے آیت نمبر ۸۷ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یعقوبؑ نے بیٹوں کو حکم دیا تھا کہ میرے بیٹو مصر جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو جانو اور پاؤ **فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ** اس پر جب وہ مصر آکر عزیز مصر کے پاس غلے کی درخواست لیکر گئے تو آپ نے سوال کیا کہ تمہیں یاد ہے کہ جب تم جاہل تھے اس وقت تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کیساتھ کیا سلوک کیا تھا' اس پر انہوں نے ابا حضور کے حکم کے مطابق یوسف کو جان لیا اور پالیا اور کہا کیا تو ہی یوسف ہے۔ اس پر آپ نے صرف یہ نہ کہا کہ میں ہی یوسف ہوں۔ بلکہ آپ نے فرمایا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے' یہاں پر یہ قابل ملاحظہ

فرمائیں کہ یعقوبؑ نے حکم دیا تھا کہ جاؤ اور فَتَحَسَّسُوْ يُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اس کے مقابلے پر یوسفؑ نے بھائیوں کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا تو ہی یوسف ہے یہ سوال صرف آپ کے متعلق تھا مگر آپ نے فرمایا اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا اَخِیْ میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ یعنی آپ نے فرمایا کہ ابا حضور کے حکم کے مطابق صرف یوسفؑ ہی کو نہ پاؤ' بلکہ اس کے بھائی کو بھی واپس پاؤ' جس کے حاصل کرنے کیلئے تم اپنے ایک بھائی کو رہن رکھتے تھے۔ یعقوبؑ کی طرف سے بیٹوں کو یوسف اور اس کے بھائی دونوں کو پانے کے حکم سے ثابت ہے کہ یعقوب نے جان لیا تھا کہ دونوں بھائی اکٹھے ہو چکے ہیں۔ ایک ہی جگہ پر ساتھ ساتھ ہیں۔ آپ نے فَتَحَسَّسُوْ کے حکم میں بیٹوں کو یہ سب کچھ بتا دیا اور جتا دیا تھا۔

یہاں ایک چیز اور قابل غور ہے کہ یعقوبؑ نے تو صرف عزیز مصر کے حالات سن کر درجنوں میل دور کنعان میں بیٹھے ہوئے جان لیا کہ عزیز مصر یوسفؑ ہے مگر برادران یوسفؑ یوسف کے پاس جاکر اور رو برو گفتگو کرنے کے باوجود بھی حقیقت حال کو کیوں نہ جان سکے؟ اس کا جواب بالکل سیدھا سا ہے کہ ذہن میں جو غلط بات راسخ ہو چکی ہو وہ حقیقت تک پہنچ جانے کے باوجود حقیقت کو پہچاننے کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو جاتی ہے' بھائیوں کے اذہان میں یہ غلط بات راسخ ہو چکی تھی کہ یوسف' جس کی تیس چالیس برس سے کوئی خبر تک نہیں پہنچی مرچکا ہے۔ اس لئے انہوں نے یوسفؑ کو اس وقت پہچانا جب انہوں نے ان کی وہ بات ان سے پوچھی جو انہوں نے مصر میں کسی کو بتائی ہی نہ تھی۔ اس طرح جب انہیں یوسفؑ نے ان کے اس سلوک کی خبر دی جو انہوں نے یوسفؑ اور اس کے بھائی دونوں کیساتھ الگ الگ کیا تھا تو ان لفظوں میں اقرار جرم کیا۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ﴿۹۱﴾

(۹۱) انہوں نے کہا' اللہ کی قسم بیشک بیشک اللہ تعالیٰ نے ہمارے مقابلے پر آپ کو فضیلت دی ہے اور بیشک ہم (اپنے دونوں بھائیوں کے معاملے میں) خطا کار اور قصور وار ہیں

جب بھائیوں نے اِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ کے مختصر سے لفظوں میں اپنی خطاؤں کا اقرار کر لیا تو یوسفؑ نے بھی مختصر سے لفظوں میں معافی کا اعلان کر دیا۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

(۹۲) یوسفؑ نے فرمایا آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں (میں نے تمہیں معاف کیا) اللہ بھی تمہیں معاف کرے گا۔ اور وہ رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنیوالا ہے۔

غور فرمائیے کہ۔ یوسفؑ نے پیغمبرانہ شان کیساتھ اعلان معافی فرمایا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو اٹھ اٹھ کر گلے پڑتا' منہ سے جھاگ نکل رہی ہوتی اور کیا کیا کچھ نہ کہتا۔ سَلٰمٌ عَلٰى يُوْسُفَ الصَّابِرِ الْحَلِيْمِ۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے کا مسئلہ بھی حل کر دیا گیا ہے کہ جس کا قصور کیا ہو۔ وہ معاف کر دے تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ جس کا قصور کیا ہے اس سے معافی طلب کرو۔ اگر وہ معاف کر دیگا تو اللہ بھی معاف کر دیگا۔

اس طرح یعقوبؑ کے بیٹوں کی ایک لمبی عداوت کا خاتمہ اس احسن طریقے سے ہوا کہ چند لفظوں میں خطا کار بھائیوں نے اقرار خطا کر لیا اور چند ہی لفظوں میں یوسفؑ نے انہیں معاف کر دیا۔

جب برسوں کے بچھڑے ہوئے بھائی گلے مل گئے تو اب یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور والدہ ماجدہ کے درد فرقت کو ختم کرنا تھا۔ اس کے لئے لازم تو یہ تھا کہ بیٹا خود چل کر خدمتِ والدین میں پہنچتا۔ لیکن چونکہ یوسفؑ کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے

قحط زدہ افراد کو غلہ بہم پہنچانے کی مخصوص خدمت سونپ رکھی تھی اسلئے آپ نے اپنے بھائیوں کو کہا کہ والدین سمیت اپنے پورے خاندان کو میرے پاس یہاں مصر میں لے آؤ۔ اور والد بزرگوار کے اس یقین کی تصدیق کیلئے کہ عزیز مصر یوسفؑ ہی ہے' آپ نے وزارت عظمٰی کی وردی والی قمیض بھیج دی جس پر اس منصب عظمٰی کے نشان کندہ تھے اور جس قمیض کے کندھوں پر سلطنت مصر کے اس عظیم ترین منصب کے پھول چمک رہے تھے اور جس قمیض کی پاکٹ پر اعزازی تمغے آویزاں تھے۔ چنانچہ اس کے بعد اگلی آیتِ مجیدہ میں باری تعالیٰ رب العزت نے اس مفہوم کو ذیل کے الفاظ میں نازل فرمایا ہے:۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹۳

(۹۳) (یوسفؑ نے بھائیوں کو کہا کہ) یہ میری (وردی) کی قمیض لے جاؤ اور اسے میرے والد کے سامنے پیش کرو۔ وہ آئیں گے میرے پاس پورے یقین کیساتھ۔ اور اپنے سارے کنبے کو میرے پاس لے آؤ۔

اس سورت مجیدہ میں یوسفؑ کی تین قمیضوں کا ذکر آیا ہے:۔

پہلی قمیض وہ تھی جو بھائی نقلی خون کیساتھ رنگ کر لے آئے تھے۔ جو آپ کی زندگی کی دلیل ٹھہری اور یعقوبؑ کو یقین ہو گیا کہ یوسفؑ زندہ ہے' بھیڑیا نہیں کھا گیا۔ کیونکہ بھیڑیے کسی کو کھانے سے پہلے قمیض اتروا نہیں لیا کرتے۔ دوسری قمیض وہ تھی جسے زن عزیز نے اس وقت پیچھے سے کھینچ کر پھاڑ دیا' جب اس نے آپ کو بدکاری کی دعوت دی اور آپ اس کے برے ارادے سے بچنے کیلئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ قمیض یوسفؑ کی پاکبازی کی دلیل ٹھہری۔ اور تیسری قمیض یہ تھی جو یوسفؑ نے اپنے والد ماجد کی خدمت میں بھیجی تھی تاکہ ان کے اس یقین کی تصدیق ہو جائے جو عزیز مصر کے متعلق آچکا تھا کہ عزیز مصر یوسفؑ ہی ہے یہ قمیض آپ کی حکومت کی دلیل بن کر آئی تھی۔

فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس قمیض کو میرے والد کے چہرے پر ڈال دو۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اسے میرے ابا حضور کے سامنے پیش کرو۔ تاکہ جب وہ اسے دیکھیں تو ان کے یقین کی تصدیق ہو جائے کہ آپ کے ذہن میں جو بار بار یہ خیال آتا تھا کہ یہ کون ہے جس نے میرے بیٹوں کو غلے کی قیمت واپس کر دی ہے اور اپنے چھوٹے بھائی کو لانے کی اتنی تاکید کر رہا ہے کہ اگر تم اسے نہ لائے تو میرے پاس دوبارہ مت آنا' اس کے لائے بغیر تمہیں غلہ نہیں ملے گا' یہ یوسفؑ ہی ہو سکتا ہے۔ آپ کے اس یقین کی راہ میں جو چیز حائل ہوتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ یوسفؑ اور عزیز مصر؟ ابا حضور! اس رکاوٹ کو بھی رفع کر لیجئے اور اپنی آنکھوں سے یوسفؑ کی وزارت عظمٰی کی وردی کی کھلی نشانی دیکھ لیجئے۔

يَاْتِ بَصِيْرًا کے الفاظ سے روایتی تفاسیر نے اس غلط تصور کے مطابق کہ یعقوبؑ فرقت یوسفؑ میں دن رات روتے رہتے تھے' بعض نے لکھا ہے کہ مسلسل چالیس سال روتے رہنے کی وجہ سے آپ اندھے ہو گئے' اس لئے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ یوسفؑ نے بھائیوں کو کہا یہ میری قمیض لے جاؤ' ابا حضور کے چہرے پر ڈالدو' اس کی برکت سے ان کی بینائی آنکلی آپ اندھے ہیں بینا ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ چیز قوانین الٰہی کے خلاف ہے کہ کسی اندھے کے چہرے پر کسی بزرگ کی قمیض ڈال دی جائے تو وہ بینا ہو جائے ایسی قمیض تو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھنی چاہیے تھے' تاکہ دنیا بھر کے اندھے بینا ہو جایا کرتے۔ پھر اسے اگر کسی بزرگ کی برکت تسلیم کی جائے تو یوسفؑ سے بزرگ تر خود یعقوبؑ تھے' جو نہ صرف یہ کہ نبی بھی تھے بلکہ ایک نبی یوسفؑ کے باپ بھی تھے اور ایک نبی اسحاقؑ کے بیٹے اور ایک نبی ابراہیمؑ کے پوتے بھی تھے۔

لفظ **بَصِيْرًا** کا سہ حرفی مادہ ب۔ ص۔ ر بصر ہے جس کا معنی دیکھنا بھی ہے اور جاننا' یقین کرنا بھی ہے۔ یہ مادہ بصیرت

اور بصارت یعنی قوتِ ادراک اور قوتِ بصارت دونوں کیلئے مستعمل ہے۔ چنانچہ عربی ادب میں رَجُلٌ بَصِیْرٌ کا معنی دیکھنے والا آدمی بھی ہے اور صاحب ادراک دانشور بھی ہے اسی لئے مبصر اس شخص کو کہتے ہیں جو صاحب عقل و شعور ہو۔ پس یہاں آیت زیر بحث میں یَاْتِ بَصِیْرًا کا یہ معنی ہے کہ ابا حضور میری وزارت عظمٰی کی وردی والی مخصوص نشانات و امتیازات سے مزین قمیض کو دیکھ کر بصیر ہو جائیں گے۔ ان کے اس یقین میں کہ عزیز مصر یوسفؑ ہے' حائل ہونیوالی یہ شک بھی دور ہو جائیگی کہ یوسفؑ مسافر' اور عزیزِ مصر؟ حالات کے مطابق ادھر السید یعقوبؑ کو بھی یقین ہو چکا تھا کہ موجودہ عزیز مصر یوسفؑ ہی ہے اور ادھر یوسفؑ کو بھی یقین ہو چکا تھا کہ ابا حضور سابقہ واقعات کی بدولت جان چکے ہیں کہ عزیز مصر ان کا نور نظر یوسفؑ ہے۔ درمیان میں جو عدم امکان کہ یہ صورت حائل ہوتی تھی کہ یوسفؑ تو مصر میں یقیناً ایک مسافر کی حیثیت رکھتا ہے' کیا واقعی' وہ واقعی وزارت عظمٰی کے منصب پر فائز ہو چکا ہے اس شک کو خود وزارت عظمٰی والی وردی کی قمیض نے دور کر دیا۔ اور اس نے آپ کے غائبانہ یقین کی تصدیق کر دی۔

اگلی آیت مجیدہ میں اسی بصیرت یعقوبی کا اظہار کیا گیا ہے کہ:۔

جب یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو تیسری مرتبہ مصر بھیجا اور فرمایا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ کہ مصر میں جاؤ اور یوسفؑ اور اس کے بھائی دونوں کو پاؤ۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ پر موجود ہیں۔ تو اب جوں جوں دن گزر رہے تھے آپ اندازہ فرماتے چلے جا رہے تھے کہ اب میرے بیٹے مصر کے قریب پہنچ چکے ہیں' اب وہ سب یوسفؑ اور اس کے چھوٹے بھائی کے پاس داخل ہو چکے ہیں۔ اب ان کی گفتگو ہو رہی ہے اور اب میرے بیٹوں کا قافلہ واپس روانہ ہونے والا ہے۔ آپ کا اندازہ تھا کہ اس مرتبہ یا تو یوسفؑ اپنے بھائیوں کے ساتھ خود آئے گا اور یا کوئی اپنی نشانی بھیجے گا۔ واضح رہے کہ یعقوبؑ کا ہر اندازہ بالکل صحیح ہے' کیونکہ آپ اس سے پہلے دو مرتبہ بیٹوں کو مصر روانہ کر چکے تھے اور آپ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کتنے دنوں میں مصر پہنچ رہے تھے اور کتنے دنوں کے بعد وہاں سے روانہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جب ادھر برادران یوسفؑ کا قافلہ مصر سے روانہ ہوا تو ادھر السید یعقوبؑ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب یوسف یا یوسفؑ کی کوئی نشانی مصر سے روانہ ہو چکی ہے۔ اس کا اظہار بالفاظ ذیل موجود ہے:۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

(۹۴) اور جب مصر سے برادران یوسفؑ کا) قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ نے کہا کہ بیشک میں ضرور یوسفؑ کی خوشبو پاتا ہوں (اس کا غلبہ پاتاہوں) اگرچہ تم مجھے غلط انداز ہی کیوں نہ ٹھہراؤ۔

لفظ ریح کا مطلق معنی صرف ہوا ہے خوشبو اور بدبو کو بھی ریح یا رائحہ کہا جاتا ہے۔ لفظ ریح کا مجازی معنی غلبہ' اور قوت بھی ہے۔ ۸/۴۶ میں آیا ہے وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ اور ایمان والو آپس میں جھگڑو مت ورنہ تم پست ہمت جاؤ گے اور تمہاری ہوا یعنی قوت جاتی رہیگی۔ اردو زبان میں بھی یہ محاورہ مستعمل ہے کہ ورنہ تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی۔ پس آیت زیر بحث میں لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ کا مجازی معنی غلبہ بھی یوسفؑ کے وقتی حالات کے مطابق صحیح ہو سکتا ہے کہ یعقوبؑ نے اندازہ لگایا کہ یوسفؑ اپنے چودہ سالہ غلے کے کنٹرول کی بدولت پورے مصر پر بھی غالب ہو چکا ہے اور اپنے بھائیوں پر بھی فضیلت حاصل کر چکا ہے۔ نیز عربی میں ریح بمعنی خبر بھی مستعمل ہے۔ اسلئے اس کا ایک معنی یہ بھی صحیح ہے کہ میں یوسفؑ کی خبر پاتا ہوں' خبر پانیوالا ہوں۔

تُفَنِّدُوْنِ میں آمدہ سہ حرفی مادہ ف۔ ن۔ د۔ فند کا معنی ہے اندازے یا رائے کا کمزور ہونا۔ اور یہاں باب تفعیل سے

تفنید کا معنی ہے غلط اندازہ یا غلط رائے کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنا۔ **لَوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ** کے الفاظ میں یعقوبؑ نے اردگرد والوں پر واضح کیا کہ میں بالکل صحیح انداز پر ہوں اگرچہ تم مجھے غلط انداز ہی کیوں نہ ٹھہراؤ۔ لیکن اس پر حاضرین نے برادرانِ یوسف کی اس غلط خبر کے مطابق کہ یوسفؑ کو تو بھیڑیا کھا چکا ہے' یہ جواب دیا کہ آپ یوسفؑ کی بہت پرانی تلاش میں ہیں:۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ﴿۹۵﴾　(۹۵) ان (سننے والوں نے) کہا' بلاشبہ آپ (یوسفؑ کی) اپنی پرانی تلاش میں ہیں۔

اس موقعہ پر قالوا کے فاعل برادرانِ یوسفؑ نہیں تھے۔ کیونکہ وہ تو سب کے سب مصر سے روانہ ہونے والے قافلے میں تھے۔ مذکورہ بالا جواب دینے والے عوام ہی ہوسکتے تھے جنہوں نے برادرانِ یوسفؑ کے کہنے پر اعتبار کرکے مان رکھا تھا کہ یوسفؑ زندہ نہیں' اسے بھیڑیا کھا گیا تھا۔

لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ میں آمدہ لفظ ضلل کا معنی گمراہی بھی ہے اور تلاش بھی ہے۔ یہاں اس کا معنی تلاش ہے گمراہی نہیں۔ کیونکہ یہ جواب دینے والے یعقوبؑ پر ایمان لانیوالے مومن تھے جنہوں نے مشہور غلط خبر کے مطابق آپ کو یوسف کا پرانا متلاشی کہا تھا گمراہ نہیں کہا تھا۔ اسی طرح ۷/۹۳ میں نبی اکرمؐ کے متعلق بھی آیا ہے **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى** اور آپ کو ہدایت کا متلاشی پایا پھر ہدایت کر دی۔ اب ادھر کنعان میں یہ حالات تھے اور ادھر مصر سے چلا ہوا قافلہ منزل بمنزل یعقوبؑ کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ حتیٰ کہ قافلہ آپہنچا اور یوسفؑ کا وہ بھائی جسے انہوں نے قمیض سونپ کر اپا حضور کی خدمت میں خوشخبری دینے کیلئے بشیر قرار دیا تھا وہ خدمت عالیہ' والد بزرگوار میں حاضر ہوا۔ اور یوسف کی بھیجی ہوئی قمیض پیش کی' اس وقت باقی سب بھائی بھی اس کے ساتھ موجود تھے۔ اس قمیض کو دیکھ کر یعقوبؑ کا یقین کامل ہوگیا کہ جس عزیز مصر کو میں یوسفؑ یقین کرتا تھا وہ واقعی یوسفؑ ہے' اس پر آپ نے اپنے بیٹوں کو فرمایا کہ کیا میں نہیں کہتا تھا کہ جو کچھ میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں تم نہیں جانتے:۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾　(۹۶) پھر جب خوشخبری دینے والا (قمیض لیکر) آیا۔ اس نے اسے آپ کے سامنے پیش کیا تو وہ (یعقوبؑ پھر سے) یقین کرنیوالے پائے گئے۔ آپ نے (بیٹوں کو) کہا کیا میں تمہیں یہ نہیں کہتا تھا کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

اَلْبَشِیْرُ کے متعلق جو روایتی تفاسیر میں آیا ہے کہ یہ برادرانِ یوسفؑ سے الگ بشیر نامی کوئی شخص تھا۔ یہ تصور از روئے قرآن حکیم غلط ہے۔ کیونکہ ۱۲/۹۳ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یوسفؑ نے اپنے بھائیوں ہی کو کہا تھا **اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا** یہ میری قمیض لے جاؤ۔ یہ حکم بصیغہ جمع آیا ہے اور یہاں حضورِ والد بزرگوار میں پیش کرنیوالا بصیغہ واحد بیان ہوا ہے اور اسے البشیر کہا گیا ہے۔ یہ برادرانِ یوسفؑ کا نمائندہ ہے۔ اور یقیناً یہ سب سے بڑا بھائی تھا' جس نے اس وقت خدمت والد میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا تھا جب چھوٹا بھائی گرفتار ہوگیا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک مجھے میرے والد خود نہ بلائیں اور یا اللہ مجھے حکم نہ دے۔ تو اب جب اللہ تعالیٰ نے ایسے خوشگوار حالات پیدا کرکے اسے ابا جان کو یوسف کی خوشخبری دینے والا البشیر بنا دیا تو پھر حضورِ والد میں حاضر ہوا۔ چونکہ یہ سب سے بڑا تھا اسلئے سب بھائیوں کا نمائندہ بھی یہی تھا۔ اور منصب بشارت کے قابل بھی صرف یہی ہوسکتا تھا' کیونکہ یہی تھا جس نے یوسفؑ کی

جان بچالی تھی۔ جب کہ باقی بھائی قتل یوسفؑ کے مشورہ پر متفق ہوگئے تھے۔ اور یہی وہ بھائی تھا جو یوسفؑ کے چھوٹے بھائی کے شکنجے میں بیانہ چھپانے کے مشورہ سے الگ تھا۔ پس یہی منصب بشارت کے قابل تھا اور اسی نے حضورِ والد میں اپنا چھوٹا بھائی بھی لاکر حاضر کر دیا اور یوسف کی قمیض بھی پیش کر کے نہ صرف یہ کہ یوسف کی زندگی کی خوشخبری دی بلکہ ان کے سلطنت مصر کے منصب وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کی نشانی' مخصوص اعزازی تمغوں سے مزین قمیض بھی پیش کر دی۔

فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ' کا معنی لکھا گیا ہے کہ یعقوبؑ یقین کرنیوالے پائے گئے۔ لفظ **بَصِیْرًا**" کی بحث تو پیچھے گزر چکی ہے کہ اس کا معنی ازروئے عربی ادب یقین کرنا بھی ہے۔ باقی رہا **فَارْتَدَّ** میں آمدہ سہ حرفی مادہ ۔ر۔د۔د رد جس کا معنی لوٹ آنا ہے۔ اور جس سے روایتی تفاسیر نے دلیل دی ہے کہ یعقوبؑ پہلے بینا تھے' مگر اندھے ہوگئے تھے اور پھر دوبارہ بینا ہوگئے' مگر **بَصِیْرًا**" کی بحث میں یہ امر سامنے لایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ نبی کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے محبت میں مستغرق ہوکر چالیس سال تک کیلئے روتے روتے آنکھیں ضائع کر دی ہوں اور کار نبوت سے غافل ہو چکے ہوں۔ رہا لفظ **فَارْتَدَّ** کا سوال' یہ باب افتعال ہے جس کے خاصہ وجدان کے مطابق پایا جانا معنی صحیح ہے اور چونکہ آپ کو پہلے ہی یقین تھا کہ عزیز مصر یوسفؑ ہے مگر جب اس کی وردی کی قمیض آگئی تو عدم امکان کے جتنے بھی شک شے تھے سب دور ہوگئے اور آپ کو اپنے یقین پر پھر سے یقین ہوگیا۔

اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کے جملے میں **اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ** کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں' کیونکہ آپ اپنے قیاس یقینی کیلئے **اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** کے الفاظ لائے ہیں۔ جب بیٹے پہلی مرتبہ غلہ لائے تو غلہ کی قیمت کے لوٹائے جانے اور ان کے چھوٹے بھائی کو اگلی مرتبہ ضرور ہمراہ لانے کی ایسی تاکید کرنے پر' کہ اس کے بغیر غلہ نہیں ملے گا' یعقوبؑ کا یقینی قیاس تھا کہ ایسے اقدام کرنیوالا صرف یوسفؑ ہی ہوسکتا ہے۔ نیز اس سے پہلے جب بیٹے یوسفؑ کا خون بھرا کرتہ لائے اور کہا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے' اس وقت بھی یعقوبؑ کا قیاس یقینی تھا کہ ان کی یہ خبر جھوٹی ہے کیونکہ بھیڑیے کسی کو کھانے سے پہلے کرتہ اتروا نہیں لیا کرتے۔ بعض قیاس ظنی ہوتے ہیں مثلاً" برادران یوسفؑ کا یہ قیاس تھا کہ جب تیس چالیس سال سے یوسفؑ کی کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی وہ مرچکا ہے۔ اور بعض قیاس یقینی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ یعقوبؑ کے قیاسات کہ جس طرح آپ کے سامنے خون بھرا کرتہ لایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ تمہارے نفسوں نے بات گھڑلی ہے **بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ** اور اسی طرح جب بیٹوں نے مصر سے دوسری مرتبہ لوٹ کر آنے پر کہا کہ ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے تو اس وقت بھی آپ نے بھی جملہ دہرایا تھا **بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ** یہ بات تمہارے اپنے نفسوں نے گھڑلی ہے اور تمہارے لئے اسے مزین کر دیا ہے میں تو نہایت اچھے طریقے سے صبر کروں گا۔ اس صدمے کا مقابلہ بھی مستقل مزاجی کیساتھ کرتا رہوں گا۔

الغرض زیر بحث امر یہ ہے کہ یہ سب کچھ یعقوبؑ نے جانا تھا اپنے قیاسات یقینی کے ذریعہ مگر انہیں آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرکے فرمایا کہ میں نے جو کچھ جانا ہے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم قیافہ کے مطابق جانا ہے۔ مگر اسے آپ نے وحی قرار نہیں دیا۔ اس سے یہ امر ثابت ہوا کہ انبیاء کرام چونکہ عوامی سطح کے افراد نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ وہ انتہائی پاکیزہ انسان تھے۔ حسد' بغض' کینہ وغیرہ کے عوارض سے بالکل پاک و منزہ تھے۔ اسلئے ان کے قیاس یقینی یقینا یعقوبؑ کے قیاسات کی طرح بالکل صحیح ہوتے تھے۔ وہ انہیں وحی قرار نہیں دیتے تھے مگر اسے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا علم قرار دیتے تھے۔ خود نبی اکرمؐ کا ایک واقعہ ۶۶/۳ میں درج ہے کہ آپ نے ایک راز کی بات اپنی ایک بیوی کو بتائی' مگر اس نے دوسری بیوی کو بتا

دی۔ اس پر آپؐ نے دوسری بیوی کے آثار و قرائن سے جان لیا کہ آپ کا راز اس تک پہنچ چکا ہے۔ آپ نے پہلی بیوی کو کہا کہ تونے راز میری دوسری بیوی کو بتا دیا ہے۔ اس نے پوچھا آپ کو کس نے بتایا ہے تو آپ نے فرمایا **نَبَّانِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ** مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔ آپ نے بھی یہ اپنے قیاس یقینی کے ذریعہ ہی جانا تھا۔ آپ کو وحی نہیں کی گئی تھی۔

اسی طرح شکاری لوگ جو شکاری جانوروں کو سدھاتے ہیں' ان کے اس سدھانے کے علم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ۵/۴ میں ارشاد ہوا ہے **وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ** اور جو تم زخم دینے والے' شکاری جانوروں کو اسی طرح سدھاتے ہو' جس طرح تم کو اللہ نے علم دیا ہے۔ یہ شکاری جانوروں کو سدھانے کا علم بذریعہ وحی نہیں دیا گیا بلکہ نوع انسانی کی جبلت میں رکھ دیا گیا ہے کہ وہ سب کے سب جانوروں کو' حتیٰ کہ شیروں اور ہاتھیوں تک کو بھی سدھا لیتا ہے۔ اس علم کو بھی قرآن کریم نے اللہ کا دیا ہوا علم کہا ہے۔ اسی طرح۔

کاتب عرائض نویس جو عوام کے آپس کے لین دین کی رسیدات اور اشٹامپ وغیرہ لکھتے ہیں اسے بھی ۲/۲۸۲ میں الفاظ ذیل میں اللہ کا سکھایا ہوا علم قرار دیا گیا ہے:۔ **وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ** اور چاہئے کہ کاتب تمہارے درمیان (تمہارے لین دین کی رسیدیں) عدل کیساتھ لکھے اور کاتب اسی طرح لکھنے سے انکار نہ کرے' جس طرح اسے اللہ نے لکھنا سکھایا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کاتب عرائض نویس رسیدات لکھنا استاد سے سیکھتے ہیں اور ان کا عدل کے ساتھ لکھنا پرانے استادوں اور دانشوروں نے ایجاد کیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ چیز بھی نوع انسانی کی جبلت میں رکھ دی گئی ہے اس لئے اسے بھی قرآن کریم نے اللہ کا دیا ہوا علم کہا ہے جو وحی جبلی ہے وحی تنزیلی نہیں۔

وحی جبلی:۔ وحی جبلی کی کھلی مثال اللہ تعالیٰ نے سورہ نحل میں بالفاظ ذیل پیش کر رکھی ہے:۔ **وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ** ۱۶/۶۸-۶۹ اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو (جبلی) وحی فرمائی ہے کہ تو پہاڑوں' درختوں اور لوگوں کے بنائے ہوئے چھجوں میں گھر بنایا کر' پھر تمام میووں میں سے کھایا کر اور اپنے رب کے وحی کردہ جبلی راستوں پر فرمانبردار ہو کر چلتی رہ۔ ان (مکھیوں) کے پیٹوں سے مختلف رنگوں کا مشروب (شہد) نکلتا ہے اس میں لوگوں کیلئے بیماریوں کی شفا ہے۔

پس وحی جبلی کو ذہن میں رکھئے اور یعقوبؑ کے ان قیاسات یقینی' جنہیں آپ نے **اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** کے الفاظ میں وحی تنزیلی کی خبر نہیں دی تھی' بلکہ وحی جبلی کے متعلق فرمایا تھا کہ بیٹو! جو کچھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اس طرح جب برادران یوسفؑ کے جرائم بے نقاب ہوگئے تو انہوں نے عرض کیا:۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـــِٕيْنَ ۝ (۹۷) (بیٹوں نے) کہا یا ابا جان ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی سزا سے بچاؤ طلب کریں۔ بلاشبہ ہم خطا کار ہیں۔

استغفر کا سہ حرفی مادہ غ۔ ف۔ ر= غفر ہے جس کا بنیادی معنی ہے بچاؤ اور استغفار کا معنی ہے بچاؤ طلب کرنا۔ جب بیٹوں کا قصور ثابت ہوگیا تو انہوں نے والد بزرگوار سے عرض کیا کہ آپ ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی سزا سے بچاؤ طلب کریں۔ استغفار کا مسئلہ تفسیر القرآن بالقرآن جلد دوم کے صفحہ ۲۶۲۔ ۲۶۳ پر تفصیلاً گزر چکا ہے کہ جرم کی سزا سے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے کہ جس کا جرم کیا گیا ہو' یا تو اس کا مال اسے واپس کیا جائے اور یا اس سے اپنا جرم معاف کرا لیا

جائے۔ یہ نہیں کہ جس کا جرم کیا ہو اس سے تو گناہ معاف نہ کرائیں' اور تسبیح لیکر بیٹھ جائیں اور استغفراللہ ربی کا ورد شروع کر دیں۔ اس طرح یہاں پر جو بیٹوں نے کہا ہے کہ ابا جان ہمارے لئے ہمارے جرائم کی سزا سے بچاؤ طلب کریں اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ اَسْتَغْفِرُ لِبَنِیَّ کا ورد فرمائیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بیٹوں نے قصور کیا تھا' باپ کا اور بھائی کا اس لئے قانون باری تعالیٰ کے مطابق انہیں اپنا قصور معاف کروانا تھا بھائی سے بھی اور باپ سے بھی۔

جیسا کہ آیت نمبر ۱۲/۹۱ میں گزر چکا ہے کہ بھائیوں نے یوسفؑ سے اپنے قصور کی معافی بھی انہی الفاظ میں مانگی تھی اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ بیشک ہم خطا کار ہیں۔ اس پر یوسفؑ کے جوابی الفاظ نہایت غور طلب ہیں قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ۔ یوسفؑ نے فرمایا (میں نے تمہیں معاف کیا) آج تمہارے ذمہ میری طرف سے کوئی الزام نہیں۔ جب میں نے معاف کر دیا ہے تو چونکہ قصور تم نے میرا کیا تھا' جب میں نے معاف کر دیا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں معاف کر دے گا۔

اسی طرح انہوں نے والد بزرگوار کا بھی قصور کیا تھا۔ ان سے بھی انہی لفظوں میں معافی طلب کی کہ ابا جان ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی سزا سے بچاؤ طلب کریں بیشک ہم خطا کار ہیں یوسفؑ نے تو فوراً معاف کر دیا تھا اور ساتھ ہی کہہ دیا تھا کہ اللہ بھی تمہیں سزا سے بچاؤ عطا فرمائیگا۔ لیکن یعقوبؑ کو چونکہ ایک لمبے عرصے تک ایذا دیتے رہے تھے ایک تو یہ کہ دھوکا دیکر یوسفؑ کو لے گئے اور کنوئیں میں پھینک کر یہ کہہ دیا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اور پھر جب آپ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت اور وحی جلی کے مطابق فرمایا کہ یوسفؑ زندہ ہے اور جب آپ اس کے لمبے انتظار میں مبتلا ہوگئے تو عرصہ دراز تک کیلئے ان کی تکذیب کرتے رہے کہ یوسفؑ زندہ نہیں ہے اسے تو بھیڑیا کھا گیا تھا' آپ اس کی فضول انتظار میں مبتلا ہیں' اس لئے چونکہ یعقوبؑ کے بیٹوں کی طویل ایذا رسانی کا جو رنج تھا' وہ ایسا نہیں تھا کہ بیٹوں کی معافی طلبی پر انہیں فوراً معاف کر دیتے' اس لئے آپ نے معافی دینے میں توقف فرمایا اور وعدہ کیا میں تمہارے لئے ضرور بچاؤ طلب کروں گا' یعنی جب تمہارے طویل ایذا رسانی کا صدمہ دور ہو جائے گا تو میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ اور جب میں تمہیں معاف کروں گا تو پھر ہی تمہیں اللہ تعالیٰ بھی معاف کرے گا۔ بالفاظ دیگر یعقوبؑ کا معاف کرنا ہی بیٹوں کے لئے آپ کی طرف سے استغفار تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

(۹۸) یعقوبؑ نے فرمایا کہ میں تمہارے لئے تمہارے گناہوں کی سزا سے (ابھی نہیں) بعد میں بچاؤ طلب کروں گا۔ (جب میں معاف کروں گا تو اللہ بھی معاف کر دے گا) بیشک وہ بچاؤ عطا فرمانیوالا مہربان ہے۔

واضح رہے کہ جب بیٹوں نے باپ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور باپ نے معافی دینے کا وعدہ فرمایا۔ اس کے بعد کے بہت سے واقعات محذوف ہیں کہ جب یعقوبؑ کو جو جو تکلیفیں بیٹوں نے دی تھیں' ایک طرف وہ آپ کو بار بار یاد آتی تھیں۔ مگر دوسری طرف یہ خوشخبری کہ عزیزِ مصر ان کا بیٹا یوسفؑ ہے اور سلطنتِ مصر کے سیاہ و سفید کا مالک و مختار بھی ہے۔ اس نے آپ کو پورے خاندان سمیت شام سے نقل مکانی کرکے مصر میں آباد ہونے کی دعوت بھی دیدی ہے۔ اس طرح آپ نے بیٹوں کی دی ہوئی ایذائیں بھلا کر انہیں معاف فرما دیا یعنی ان کیلئے اپنے رب سے معافی کی درخواست کر دی کہ بارالہا! ان نادانوں نے مجھے لمبے عرصے تک ایذا پہنچائی ہے' چونکہ میں نے معاف کر دیا ہے اسلئے تو بھی ان پر رحمت فرما اور انہیں ان کے جرائم کی سزا سے بچالے۔ تو ہی تو بچاؤ عطا فرمانے والا مہربان ہے۔

اس طرح جب یعقوبؑ کے بیٹوں کی خطا کاریوں کی داستان ختم ہوگئی۔ اور خاندانِ یعقوبؑ میں ہر طرف خوشی اور مسرت کی بہارِ جانفزا کا دَور شروع ہوگیا تو اب خاندانِ یعقوبؑ نے' جو ملک مصر میں خوشگواریوں اور شادابیوں سے ہم کنار ہوکر اور وہاں خوب پھل پھول کر بنی اسرائیل کہلانیوالے تھے' دیہات سے نقل مکانی کر دی اور آپ کا پورا خاندان کنعان سے چل کر منزل بمنزل شہر مصر جا پہنچا۔ ان پورے واقعات کو حذف کرنے کے بعد ------ اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد ہوا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ إِن شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ ﴿٩٩﴾

(۹۹) پھر جب (خاندان یعقوبؑ کے جملہ افراد) یوسفؑ کے پاس پہنچے تو آپ نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا کہ (اے خاندان یعقوب) اگر اللہ نے چاہا (یعنی قانونِ مشیت کے مطابق) مصر میں با اَمن داخل ہو جاؤ (یعنی تمہیں قانون کے مطابق مصر کے شہری حقوق کیساتھ داخل کیا جا رہا ہے)

اُدْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ کو جب اٰمِنِیْنَ کیساتھ ملا کر غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ یوسفؑ چونکہ شاہِ مصر کے ممتاز' عزیزِ مصر اور ملک کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ اسلئے انہوں نے خاندانِ یعقوبؑ کو مصر میں باقاعدہ مصری قانون کے مطابق داخل کیا تھا۔ کیونکہ غیر قانونی داخلہ تو امن کا ضامن ہو نہیں سکتا۔ ملکی اور غیر ملکی کے حقوق سوائے ایک اسلامی سلطنت کے برابر قرار نہیں دیے جاتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یوسفؑ نے مصری قانون میں امن کے ضامن غیر ملکیوں کے لئے مصر میں آباد ہونے اور باقاعدہ شہری حقوق پا لینے کی دفعہ شامل کرنے کے بعد ہی خاندان یعقوبؑ کو نقل مکانی کی دعوت دی تھی۔ اسی طرح جب یوسفؑ امن کی پوری قانونی محافظت کا پورا اہتمام کر چکے تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں انشاء اللہ کہنے کا کیا مقام ہے؟ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ کے الفاظ میں قانونِ مشیت کی شرط موجود ہے اور قانونِ مشیت یہ ہے کہ امن کے حقدار وہی لوگ ہوتے ہیں جو ملکی قوانین کی نگہداشت کریں۔ پس آیت بالا میں یوسفؑ نے اپنے بھائیوں پر یہ امر عیاں کر دیا کہ میں نے تمہیں پوری قانونی محافظت میں پوری طرح پُر امن طریقے سے مصر میں داخل کر دیا ہے۔ اس سے آگے بھی قانون کی نگہداشت ہی کے ذریعہ تم لوگ یہاں امن کے ساتھ رہ سکو گے۔ یعنی امن کے لئے قانونِ مشیت کی نگہداشت ضروری ہے۔ ------ اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے۔

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿١٠٠﴾

(۱۰۰) اور (یوسفؑ نے) اپنے والدین کو اونچے تخت پر بٹھایا اور وہ سب اس کے (یعنی یوسفؑ کے ترمیمی قانون کے) ماتحت ہوگئے اور (یوسفؑ نے) کہا کہ اے میرے ابا جان! یہ میری (موجودہ حالت) میرے پہلی والی خواب کی تعبیر ہے۔ بیشک میرے رب نے اسے سچ کر دیا ہے اور بیشک اس نے مجھ پر احسان کیا جب اس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ کو دیہات سے (شہر میں) لے آیا۔ پیچھے اس کے کہ نفس امارہ (شیطان) نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان عداوت ڈال دی۔ بیشک میرا رب اپنے قانون مشیت کے مطابق بہت بڑھ کر باریک بین ہے۔ بیشک وہ بڑھ کر علم والا اور بڑھ کر حکمت والا ہے۔

رَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ کے الفاظ سے عیاں ہے کہ یوسف سلام علیہ نے اپنے والدین کی بہت عزت افزائی کی۔

اونچی جگہ پر بٹھایا اور خود ادب کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوگیا۔ علاوہ ازیں أَبَوَيْهِ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یوسفؑ اور
آپ کی ماں سے سگے بھائی دونوں کی ماں زندہ تھی۔ قرآن کریم کی اس شہادت کے مطابق یہ روایتی تصور غلط ثابت ہوتا ہے
کہ آپ کی والدہ فوت ہو چکی تھی۔ مشہور یہ ہے کہ یوسفؑ کے چھوٹے بھائی کا نام بن یامین تھا اور بن یامین اسے کہتے ہیں
جس کے پیدا ہوتے ہی اس کی ماں مرجائے۔ اللہ جانے روایات میں ایسے تصورات کہاں سے آجاتے ہیں جو کھلی قرآنی مخالفت
کے حامل ہوں۔

خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا کا یہ روایتی مفہوم قرآن کریم کی مرکزی تعلیم ہی کے خلاف ہے کہ والدین اور گیارہ بھائی السید
یوسفؑ کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ کیونکہ سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ اس کے سوا کسی اور کے لئے سجدہ
کی گنجائش تک موجود نہیں۔ ارشاد باری ہے:۔ **لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ**
۴۱/۳۷ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو سجدہ کرو۔ بلکہ سجدہ اسے کرو جس نے ان سب کو پیدا فرمایا ہے۔ یہاں **خَرُّوْا**
بمعنی اس قانون کے ماتحت ہوگئے مراد ہے جو یوسفؑ نے سابقہ قانون مصر میں ترمیم کرکے غیر ملکیوں کو مصر میں آباد کرنے
کے لئے ملکی قانون میں شامل کیا تھا کہ یہ لوگ امن کے ساتھ رہیں گے۔ قانون کی پوری اطاعت کریں گے اور کسی قسم کا
فساد ہرگز نہیں کریں گے۔ انہوں نے اسے تسلیم کیا اور قانون کے ماتحت ہوگئے جو یوسفؑ نے بنایا تھا۔

هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ کے جملہ میں هذا کا مشار الیہ ما غاب کو تخت پر بٹھانا نہیں ہے بلکہ خواب میں سورج'
چاند اور گیارہ ستاروں کے یوسفؑ کو سجدہ کرنے کی تعبیر یوسفؑ کی موجودہ حالت تھی کہ ملک مصر کا سورج (بادشاہ) ملک مصر کا
چاند وزیر اعظم اور سلطنت مصر کی کابینہ کے سارے امراء (گیارہ ستارے) یوسفؑ کے سامنے فرمانبردار ہو چکے تھے۔ سب کے
سب ان کے حق میں اپنے اپنے اختیارات سے دستبردار ہو چکے تھے۔ یہ ان کے سجدہ کی عملی تعبیر تھی۔

قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا سے مراد یہ ہے کہ میرے پروردگار نے میری خواب کی تعبیر کو سچا کر دیا ہے' یہ نہیں کہ سچ
مچ کے حقیقی سورج' چاند اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ خواب کو سچا کرنا خواب کی تعبیر کو عملاً کر دکھانا ہے۔ اسی
طرح قرآن کریم میں مذکور جملہ خوابوں کو سچ کر دکھانے سے حالت خواب کو سچ کر دکھانا نہیں ہے بلکہ خواب کی تعبیر کو سچ کر
دکھانا ہے۔ مثلاً ابراہیمؑ کے متعلق جو ۳۷/۱۰۴-۱۰۵ میں ہے **وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا**۔ اس کا معنی
بھی یہ ہے اور ہم نے پکارا کہ اے ابراہیم! بیشک تو نے خواب کی تعبیر کو سچ کر دکھایا ہے۔ یعنی تو نے اپنے بیٹے کو اپنے سے
الگ کرکے بیت الحرام کی آبادی کیلئے شام کے سرسبز علاقے سے نکال کر مکہ معظمہ کی تپتی ہوئی ریت میں لا آباد کیا ہے۔
ان کی خواب کی تعبیر ۱۴/۳۷ میں مذکور ہے **رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ** ابراہیمؑ نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی اولاد کے ایک حصے کو غیر ذی زرع
وادی مکہ **معظمہ** میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس لا آباد کیا ہے تاکہ یہ اس عالمی مرکز میں مرکزی اجتماعی نظام قائم
کریں۔

اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ کے الفاظ میں یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور اپنے بھائیوں پر اس امر کی وضاحت فرمائی
کہ یہ وہی ملکِ مصر ہے جس کا میں آج مختار کل اور اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہوں' شاہِ مصر سے لیکر اس کا وزیر اعظم' اور
جملہ افرادِ کابینہ سمیت پورا ملک میرے تابع فرمان ہے' لیکن ایک وقت وہ بھی تھا کہ میں اسی ملک کے جیل خانے میں ایک
مجرم قیدی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ مگر میرے پروردگار نے مجھ پر وہ احسان خاص فرمایا کہ مجھے اس الزام سے بھی باعزت طور پر

بری کیا' جو مجھ پر لگا کر قید میں ڈال دیا گیا تھا۔ اللہ نے مجھے ایک قیدی کے مقام سے اٹھا کر ملکِ مصر کے مختار عام کے عظیم ترین مقام پر فائز کر دیا۔ جب بادشاہ نے مجھے مختار عام بننے کی دعوت دی تو میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ پہلے ان عورتوں کو بلایا جائے جنہوں نے مجھ پر جنسی خیانت کے ارادہ کا الزام لگایا تھا اور میری پوزیشن صاف کی جائے کہ کیا میں مجرم ہوں یا مجھے سالہا سال کے لئے بے گناہ قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ چنانچہ میرے کیس کو شاہِ مصر نے خود سنا' جب زن عزیز سمیت مقدمہ کی ساری عورتوں نے اپنا قصور تسلیم' اور میرے بریت کا اقرار کیا۔ تو اس کے بعد میں قید خانے سے باہر آیا' شاہ مصر نے خزانوں سمیت سارے اختیارات مجھے سونپ دیئے اور اس طرح کل کا قیدی آج کا عزیزِ مصر کہلایا ابا حضور!

وَجَآءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ کے الفاظ میں یوسفؑ نے اس واقعہ کو بھی اپنے رب کا احسان عظیم کہا جو خاندان یعقوب کو اللہ تعالیٰ کے بدری (دیہاتی) زندگی سے نکال کر شہری زندگی میں منتقل کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شہری زندگی میں ہر قسم کی آسانیاں میسر ہوتی ہیں۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ شہروں میں زندگی کی جملہ سہولتوں کے علاوہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے موقعے بھی باآسانی میسر آتے ہیں۔ دیہات کے رہنے والوں کو ضروریات زندگی کے حصول کیلئے آئے دن شہروں کا رخ کرنا پڑتا ہے اور اعلیٰ تعلیم تو خصوصی طور پر شہروں ہی میں میسر آتی ہے۔

اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ کے الفاظ انتہائی غور طلب ہیں۔ جن کے لفظی ترجمہ سے یہ تاثر ملتا ہے کہ براوران یوسفؑ نے جو سلوک یوسفؑ کے ساتھ کیا' جس کے نتیجے میں والد بزرگوار کو بھی بیٹے کی ایک لمبی جدائی کا لمبا صدمہ برداشت کرنا پڑا' یہ سب کچھ شیطان نے کیا تھا۔ بھائیوں کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر بھائیوں کو یوسفؑ سے جو ان کو [illegible] شرمساری کے ساتھ معافی کیوں مانگنی پڑی' جب کہ قصور سارے کا سارا شیطان کا تھا۔

بلاغ القرآن کے صفحات میں پیشتر ازیں بارہا وضاحت کی جا چکی ہے' خصوصاً" ادارہ کے پمفلٹ سجدہ ملائکہ بحضور آدم میں پوری شرح و بسط کے ساتھ تصریح کر دی گئی ہے کہ انسان کو برائی کی دعوت دینے والا اس کا اپنا نفس امارہ ہے جو خود ہر کسی کے اندر موجود ہے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر برائیوں سے روکنے اور نیکیوں کی ترغیب دینے والا نفس لوامہ بھی رکھ دیا ہے۔ یہ دونوں طاقتیں ہر انسان کے اندر موجود ہیں۔ ایک برائی کا حکم کرتی ہے اور دوسری برائیوں سے روکتی ہے فیصلہ ہر انسان نے خود کرنا ہوتا ہے کہ وہ برائی کر گزرے یا اس سے بچ جائے۔ صورت حال یہ نہیں ہے کہ برائیوں سے روکنے والا تو ایک ہی ہے نفس لوامہ اور برائیوں کا حکم دینے والے دو ہیں' ایک ہر انسان کے اندر کا نفس امارہ اور دوسرا شیطان ملعون' جسے روایاتی تفاسیر کے مطابق خود اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کیساتھ لگا دیا ہے۔ اگر یہ روایاتی تصور صحیح ہے کہ برائیوں کا حکم دینے والے دو ہیں اور برائیوں سے روکنے والا بیچارہ اکیلا ہے تو پھر تو اللہ تعالیٰ عادل نہیں ٹھہرتا' جس نے معاذ اللہ یہ بے انصافی پوری نوع انسانی کے ساتھ خود کر رکھی ہے۔

واضح رہے کہ اسی سورہ یوسفؑ کی آیت نمبر ۵۳ میں اِنَّ کی تاکید کیساتھ اعلان کر دیا گیا ہے **اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ** ۱۲/۵۳ بلاشبہ نفس امارہ ہی برائیوں کا حکم کرنے والا ہے۔ حقیقت قرآنیہ یہ ہے کہ ابلیس ایک قوت ہے جو برائی کا حکم دیتی ہے اور شیطان وہ شخص ہوتا ہے جس پر ابلیسیت غالب آجائے۔ آیت بالا میں نفس امارہ ہی کو شیطان کہا گیا ہے۔ نفس امارہ ہی نے براوران یوسفؑ کے اذہان میں یہ غلط تصور پیدا کیا کہ والد بزرگوار یوسفؑ کیساتھ ہم سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ حالانکہ جب وہ سب فرداً" فرداً" چھوٹی عمر میں تھے تو والد بزرگوار کی محبت اس وقت ان کے ساتھ بھی الگ الگ ویسی ہی تھی جو چھوٹی عمر کے یوسفؑ اور اس کے بھائی کیساتھ تھی۔ پھر نفس امارہ کے پیدا کردہ مذکورہ تصور نے جو جو گل کھلائے ہیں ..

آپ کے سامنے ہیں کہ پہلے تو قتلِ یوسفؑ کا منصوبہ بنایا' جس سے صرف بڑے بھائی نے باز رکھا۔ پھر کنوئیں میں پھینکنے پر متفق ہوئے اور پھینک دیا۔ پھر نفس امارہ ہی نے تجویز بتائی کہ ابا حضور سے یہ کہہ دو کہ ہم ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے' باہمی دوڑ میں دور نکل گئے۔ اسباب کے پاس یوسفؑ کو بٹھایا ہوا تھا اسے بھیڑیا کھا گیا ہے۔ دیکھئے یہ اس کا خون آلود کرتہ ہے۔ نفس امارہ ہی نے تجویز بتائی کہ کرتے کو جعلی خون کے ساتھ رنگ لو۔ یہ سب کارستانی ان کے نفسِ امارہ ہی کی تھی اور جب ابا حضور کے پیش ہوکر جھوٹ بولا تو اللہ کے پاکیزہ نبی یعقوبؑ نے بھی ان کے نفسوں کی شرارت ہی قرار دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا نہیں کھا گیا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۱۲/۱۸ بلکہ تمہارے نفسوں (نفس امارہ) نے تمہارے لئے اس تجویز کو خوبصورت بنا کر پیش کر دیا ہے۔ نفس امارہ اور شیطان کی مبسوط بحث کیلئے (سجدہ ملائکہ بحضور آدم) ملاحظہ فرمائیں۔

إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دائمی قانونِ مشیت کے مطابق بہت باریک بین بھی' اور صاحب علم و حکمت بھی ہے۔ یوسفؑ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ مشیت دیکھ رہا تھا کہ ایک بیگناہ کو جیل میں دھکیلا جا رہا ہے مگر قانون مشیت کے خلاف جیل میں ڈالنے والوں کے ہاتھ نہیں توڑ دیئے گئے تھے۔ حالانکہ اسکا قانون رضا اس وقت بھی یہی تھا کہ ایسا ناروا عمل نہیں کیا جانا چاہیے۔

إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ کے الفاظ سے عیاں ہو رہا ہے کہ وہ انتہائی باریک بین ذات مقدس جانتی تھی کہ بیگناہ کو قید میں ڈالا جا رہا ہے' وہ العلیم جانتا تھا کہ یہی وہ شخصیت ہے جو پورے ملک مصر کو سات سال عظیم قحط کے عذاب سے بچائیگی۔ شاہ مصر اور اس کے جملہ امراء وزراء اسی کے حق میں سب کے سب اپنے اپنے اختیارات سے دست بردار ہو جائیں گے' سلطنت مصر کے خزانوں کی چابیاں اس کے قدموں میں ڈال دی جائیں گی اور اسی قیدی کو ملک مصر کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا جائیگا۔ اگلی آیت میں السید یوسفؑ کہتے ہیں:۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴿۱۰۱﴾

(۱۰۱) (یوسفؑ نے حضور الٰہی میں عرض کیا) اے میرے پالنے والے بیشک تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی ہے۔ اور بیشک تو ہی نے مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی ہے (جو میری حکومت کا ذریعہ بنا) تو آسمانوں اور زمین کو پہلی مرتبہ پیدا کرنیوالا ہے۔ دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا خیر خواہ اور مددگار ہے۔ مجھے مسلمان ماریو اور مجھے اصلاح کرنیوالوں کیساتھ رکھیو۔

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ کے معطوف معطوف علیہ میں مخصوص ربط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا تھا' وہی آپ کی حکومت کا ذریعہ بنا۔ بادشاہ کو جو خواب آئی کہ سات دبلی گائیں سات موٹی گائیوں کو کھا گئی ہیں اور ساتھ ہی سات سٹے ہرے ہیں اور سات خشک۔ اس خواب کی تعبیر بتانا کوئی آسان کام نہ تھا شاہِ مصر کے جملہ دانشور اور مدبر و مفکر اس کی تعبیر بتانے سے عاجز آگئے۔ مگر یہ یوسفؑ کی پیغمبرانہ بصیرت تھی جس نے سات موٹی گائیوں کو سات سالہ بارشوں والے قرار دیا اور سات دبلی گائیوں کو سات خشک سال بتایا اور سات سٹے ہرے اور سات خشک سے سات سال غلے کی فراوانی والے اور سات سال غلے سے خالی بتا کر' سات سالہ قحط کی خبر دیدی۔ شاہ مصر نے یوسفؑ کی بتائی ہوئی تعبیر پر صد فیصد اعتبار کرکے سب کچھ آپ کے حوالے کر

دیا کہ چودہ پندرہ سالہ غلے کے اسٹاک کا اہتمام کرنیوالا اسے اپنے افراد میں سے کوئی نظر نہ آیا۔ چنانچہ آپ نے پہلے سات سال میں دن رات کام کرکے پندرہ سولہ سال کیلئے اتنا وافر غلہ جمع کیا کہ ملک مصر کے علاوہ دور دراز کے قحط زدہ لوگ بھی آپ سے غلہ حاصل کرتے رہے۔ یوسفؑ نے اس ساری کارگزاری کو اللہ تعالیٰ کی عطا مخصوص قرار دیا:۔

اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ کے الفاظ میں یوسفؑ نے صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا مدد گار و کارساز بتایا ہے' آپ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی جتنی فراوانی و ارزانی ہوئی اسے آپ نے اپنے کسی مردہ یا زندہ بزرگ کی خیروبرکت نہیں بتایا' نہ اسے اپنے زندہ بزرگ یعقوبؑ کی طرف منسوب کیا نہ اپنے مردہ بزرگوں مثلاً" اسحاقؑ" اسماعیلؑ اور ابراہیم سلام علیہ کی طرف منسوب فرمایا۔ وحدانیت تلاش کرنی ہو تو انبیاءؑ کے قرآنی حالات میں ملے گی۔ یوسفؑ' کے زندہ بزرگ یعقوبؑ کی حالت تو یہ تھی کہ خود اپنے آپ کو بیٹوں کی ایذا رسانی سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ اور مردہ بزرگوں کو تعلیم یوسفؑ کے سامنے تھی کہ ابراہیمؑ 'کو ابراہیمؑ حنیف اسلئے کہا گیا ہے کہ آپ ہر طرف سے کٹ کر خالص اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا پروردگار کار ساز اور مدد گار مانتے تھے یوسفؑ نے بھی انہی کی سنت مبارکہ کے مطابق خالص اللہ تعالیٰ کو اپنا کار ساز قرار دیا۔

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا کے الفاظ میں یوسفؑ نے حضور الٰہی میں اقرار کیا کہ آپ مصر کے سیاہ و سفید کے مالک ہونے یعنی حکومت کے میسر آنے کے باوجود مرتے دم تک کیلئے مسلمان یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بنے رہیں گے۔ بلاغ القرآن کے صفحات میں بارہا وضاحت کی جا چکی ہے کہ دعا در اصل اپنے آپ کو عمل کی تحریک ہوتی ہے اس وقت جب یوسفؑ کو حکومت میسر آچکی تھی تو آپ کیلئے **تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا** کی دعا و تحریک کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ کیونکہ مال و دولت اور ملکی اختیارات کی فراوانی ایسی چیزیں ہیں جو حکمران طبقے کو ان کے فرائض منصبی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری سے غافل کر دیتی ہیں۔ لہذا یہ چیزیں یوسفؑ عزیز مصر کے ذہن میں ہروقت موجود تھیں۔

وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ کے الفاظ سے یہ مطلب اخذ کرنا بالکل غلط ہے کہ اس سے پہلے آپ کا صالحین کیساتھ الحاق نہیں تھا۔ اسلئے آپ نے الحاق کی دعا فرمائی تھی۔ مگر غور طلب یہ امر ہے کہ جس مصلح اعظم نے چودہ پندرہ سالہ غلے کا کامیاب کنٹرول کر دکھایا' کیا وہ صالح نہیں تھا؟ تھا اور یقیناً صالح تھا' اس لئے **وَاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ** کا معنی لکھا گیا ہے کہ مجھے صالحین کیساتھ شامل رکھیو۔ اور فلسفہ دعا کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ نے اقرار فرمایا کہ حکومت میسر آنے کے باوجود آپ مرتے دم تک کیلئے عملی طور پر مسلمان بھی رہیں گے اور صالحین کیساتھ اپنا الحاق بھی قائم رکھیں گے۔

واضح رہے کہ آیت نمبر۱۰۱ تک یوسفؑ کا بیان ختم ہوا' جس میں یوسفؑ کے متعدد شاہکار کردار بیان ہوئے ہیں۔ پہلا یہ کہ سابق عزیز مصر کے گھر برسوں رہے مگر نہایت پاکیزہ زندگی بسر کی حتی کہ زن عزیز نے بدکاری کی دعوت دی تو اس عظیم آزمائش میں پورے کامیاب ہوئے۔ اس کے برے ارادے سے بچنے کیلئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس نے پیچھے سے پکڑ کر آپ کی قمیص پھاڑ ڈالی۔ آپ کی یہ چاک دامانی قیامت تک کیلئے آپ کی پاک دامانی کی دلیل ٹھہری۔ لیکن آپ کو بے گناہ قید میں ڈال دیا گیا۔ قید خانے میں آپنے اپنے دو ساتھیوں کی خوابوں کی تعبیر بتائی۔ ان میں سے ایک رہا ہوکر بادشاہ کا ملازم ہوا جب بادشاہ کو سات گائیوں دبلی اور سات موٹی والی خواب آئی تو اس خواب کی تعبیر مصر کا کوئی دانشور نہ بتا سکا۔ آپ نے اس کی تعبیر بتادی۔ جس میں سات سالہ قحط کی خبر تھی' جس کے انسداد کیلئے چودہ پندرہ سال کیلئے غلہ پیدا کرنا اور جمع کرنا تھا۔ بادشاہ کو اپنے وزیر اعظم سمیت کابینہ کا کوئی آدمی ایسا نظر نہ آیا جو اتنی بڑی مہم کو سرانجام دے سکتا۔ بادشاہ نے آپ ہی کو اس مہم کے انجام دینے کی دعوت دی' آپ نے فرمایا کہ خزانے کی چابیوں سمیت سارے اختیارات مجھے سونپ دو۔ اس پر بادشاہ

سمیت امراء کابینہ یوسفؑ کے حق میں اختیارات سے دست بردار ہوگئے۔ آپ نے سات سالوں میں پندرہ سالوں کی ضرورت کے مطابق غلہ پیدا کیا اور اسے وسیع و عریض بارکوں اور گوداموں میں جمع کیا۔ یہ آپ کا ایک عظیم شاہکار کارنامہ ہے کہ آپ نے نہ صرف ملک مصر کی قحط زدہ مخلوق الٰہی کو سات سال کے طویل عرصہ میں غلہ مہیا کیا بلکہ دوسرے ہمسایہ ملکوں کو لکھو کھہا قحط زدہ خاندانوں کو بھی قحط کی آفت سے بچا لیا۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں السید یوسف کی ایسی شاہکار مہم کی مثال موجود نہیں۔

پھر یوسفؑ کا ایک شاہکار کارنامہ جو سورہ یوسف میں بیان ہوا ہے یہ ہے کہ آپ نے بھائیوں کو جو آپ کے قتل کے در پے تھے۔ جنہوں نے اندھیرے کنوئیں میں پھینکنے کا بہیمانہ جرم کیا تھا۔ جب انہوں نے مختصر لفظوں میں اقرار جرم کیا تو آپ نے فوراً معاف کر دیا۔ نہ صرف یہ' بلکہ ان کی مصر میں آباد کاری کیلئے غیر ملکیوں کے مصر میں آباد کرنے کی دفعہ قانون مصر میں شامل کرکے انہیں مصر میں شہری حقوق کیساتھ آباد کرکے مصر کے شہری بنا دیا۔

اسکے بعد سورہ یوسف کی آخری دس آیتیں باقی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص انداز کیساتھ شرک کی تردید فرمائی ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

(۱۰۲) مذکورہ بالا (آیتیں) غیب کی خبریں ہیں جو ہم نے آپ پر وحی فرمائی ہیں۔ اور (اے رسول!) آپ اس وقت ان (برادران یوسفؑ) کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ اپنی تجویز پر اکٹھے ہوئے تھے اور (نہ آپ اس وقت ان کے پاس تھے جب وہ (یوسفؑ کے خلاف) بری تجویز کر رہے تھے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ کے الفاظ میں اس امر کی خبر دی گئی ہے کہ نبی اکرم غیب دان نہیں تھے۔ نہ ذاتی نہ عطائی۔ اللہ کے سوا کسی اور کو غیب دان ماننا شرک ہے ۶/۵۹ میں اعلان کر دیا گیا ہے:۔ **وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ** اور غیب کی چابیاں صرف اللہ کے پاس ہیں۔ اس کے سوا کوئی بھی غیب کو ہرگز نہیں جانتا۔ اس محکم آیت مجیدہ کے باوجود سورہ جن کی آیت ذیل سے اللہ کے رسولوں کو غیب دان مانا جاتا ہے:۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ۲۶۔۲۷/۷۲ اللہ عٰلِم الغیب ہے۔ پھر وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر اپنے رسولوں پر ---- یہ آیت متشابہ ہے۔ اس سے جو شبہ پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر غیب ظاہر کر دیا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے آیت زیر بحث ۱۲/۱۰۲ میں رفع کر دیا ہے کہ یوسفؑ کے مندرجہ بالا واقعہ کو آپ نہیں جانتے تھے یہ آپ کے لئے غیب تھا۔ اس غیب کو سورہ یوسف میں آپ پر وحی کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورہ آل عمران میں مریمؑ کی کفالت سے متعلق بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:۔ **ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ** ○ ۳/۴۴ مذکورہ بالا آیتیں غیب کی خبریں ہیں جو ہم نے آپ پر وحی فرمائی ہیں۔ اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ دستخط کر رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے گا۔ اور آپ اس وقت بھی ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ آپس میں کفالت مریمؑ کے بارے میں جھگڑ رہے تھے ---- ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ واقعہ مریم آپ کیلئے غیب تھا۔ آپ کو معلوم نہیں تھا مندرجہ بالا آیتوں میں آپ پر یہ غیب کی خبر بھی وحی کر دی گئی تھی۔

واضح رہے کہ ۶/۵۹ میں آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ غیب کو اللہ کے سوا ہرگز کوئی نہیں جانتا۔ ۲۶۔۲۷/۷۲ میں جو خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے غیب کو رسولوں پر ظاہر کرتا ہے۔ اس متشابہ آیت کی وضاحت ۱۰۲/۱۲ + ۴۴/۳ کی محکم آیتوں میں کر دی گئی ہے کہ قرآن مجید میں جو واقعات بیان کئے گئے وہ نبی اکرمؐ کیلئے غیب تھے۔ آپ پر وحی فرما دیئے گئے ہیں۔ رسولوں کے عدم علم غائب کی دلیلِ قاطعہ خود واقعہ یوسف میں موجود ہے کہ یعقوبؑ اللہ کے پاکیزہ رسول تھے' اگر آپ غیب جانتے ہوتے تو مدت مدید کے لئے غم و فراقِ یوسف میں مبتلا نہ رہتے۔

نُوْحِيْهِ فعل مضارع چونکہ مضارع حکائی ہے' اسلئے اس کا معنی بصورت ماضی لکھا گیا ہے کہ ہم نے آپ پر وحی کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یوسف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اخیر پر ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے یہ سچی خبریں آپ پر وحی کی ہیں۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ میں اس شرک کی بھی نفی کر دی گئی ہے جو نبی اکرمؐ کو حاضر ناظر جانا جاتا ہے۔ یہاں کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ آپ حاضر ناظر نہیں ہیں۔ نہ آپ اس وقت برادران یوسفؑ کے پاس موجود تھے جب وہ قتل یوسف کی مہم کیلئے اکٹھے ہوئے تھے اور نہ آپ اس وقت ان کے پاس موجود تھے جب وہ بری تجویز کر رہے تھے۔ اسی طرح واقعہ مریم میں جو اوپر گزر چکا ہے یہ ارشاد ہوا ہے:۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ ---- وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○ ۴۴/۳ اور اے رسولؐ آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب ہیکلوں والے دستخط دے رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کریگا اور نہ آپ اس وقت ان کے پاس موجود تھے جب وہ آپس میں کفالت مریم کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔

نبی اکرمؐ کو غیب دان اور حاضر ناظر ماننے کے دو شرکوں کی تردید کرنے کے بعد اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے ارشاد ہوا ہے:۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

(۱۰۳) اور (اے رسولؐ!) اگرچہ آپ (کتنی بھی) حرص کریں مگر لوگوں کی اکثریت مومن ہونیوالی نہیں ہیں۔

اگلی آیت مجیدہ میں محمد رسول اللہ کی شان دیانت و امانت کی سند اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص انداز میں بیان فرمائی ہے:۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

(۱۰۴) اور (اے رسولؐ) آپ اس قدر امین ہیں کہ آپ اس تبلیغ قرآن پر لوگوں سے کوئی اجر نہیں مانگتے۔ (یہ اسلئے کہ) یہ قرآن کریم پورے جہان والوں کیلئے ایک نصیحت نامہ ہے (نصیحت کرنے کی کوئی اجرت نہیں ہوتی)

اگلی آیت مجیدہ میں عوام کی حالت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عالمینی کی بہت سی نشانیاں کائنات میں بکھری پڑی ہیں۔ لوگ ان سے گزرتے رہتے ہیں مگر ان سے نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اعراض کر جاتے ہیں:۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

(۱۰۵) اور آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی کتنی نشانیاں موجود ہیں۔ جن پر سے لوگ گزرتے رہتے ہیں مگر وہ ان سے اعراض کر جاتے ہیں (ان پر غور و فکر نہیں کرتے۔)

هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ کے الفاظ میں عوام الناس کی روش بتائی گئی ہے کہ نہ وہ آسمانی مظاہرِ قدرت پر غور کرتے ہیں

اور نہ نیچی نشاناتِ الہیہ پر غور کرتے ہیں۔ ان پر سے بے توجہی کیساتھ گزر جاتے ہیں یہ انسان کی بے بصیرتی کا عالم ہے۔

واضح رہے کہ آسمانوں اور زمین کی ایک ایک چیز درسِ وجودِ باری بھی دیتی ہے اور پروردگار کے نظامِ ربوبیت کی خبر بھی دیتی ہے۔ مثلاً" آسمانی مظاہر میں سورج اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نشانی ہے کہ دن بھر سامنے رہتا ہے۔ لوگ بچشم خویش دیکھتے ہیں کہ سورج گرمی اور روشنی دیتا ہے۔ اس کے بغیر نہ کسی جاندار کی زندگی ہی قائم رہ سکتی ہے اور نہ انسانی غذا کی کوئی چیز پھل' اناج' سبزیاں وغیرہ پیدا ہوسکتی ہیں اور نہ پک سکتی ہیں۔ پھر سورج ہی اللہ تعالیٰ کی وہ نشانی ہے جس سے دن رات بنتے ہیں۔ زمین کا جونسا حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو اس سے اوجھل ہوتا ہے وہاں رات ہوتی ہے۔

درختوں کی مثال:۔ مظاہرِ فلکی میں چاند وہ آیتِ الہٰی ہے جس کی ٹھنڈی کرنوں سے پھلوں' اناجوں اور غلوں میں بیج پڑتا ہے فصلیں اور پھلدار درخت بار آور ہوتے ہیں زمین پر ہزاروں کار آمد جڑی بوٹیاں ہیں جن میں انسانی صحت کو برقرار رکھنے اور دفعیہ امراض کیلئے شفا موجود ہے مگر انسان انہیں روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ نظام ربوبیت کی بہترین مثال زمین کے ہر حصے میں موجود درختوں میں محفوظ ہے۔ جن پر سے انسان انتہائی لاپرواہی سے گزر جاتے ہیں ہر درخت کے ذیل کے لازمی حصے ہیں:۔

جڑیں' تنا' ٹہنے ٹہنیاں' شاخیں' پتے اور پھل' جڑیں درخت کی نشوونما کیلئے زمین میں سے غذا حاصل کرتی ہیں۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا حصہ اپنے اندر جذب کرتی ہیں جتنی انہیں ضرورت ہے۔ باقی ساری غذا پورے درخت میں مساویانہ تقسیم کیلئے تنے کو دیدیتی ہیں۔ اس کے بعد تنہ (Trunk) جڑوں سے حاصل کی گئی غذا اپنے آپ پر صرف اتنی خرچ کرتا ہے جتنی ضرورت ہوتی ہے اور باقی اپنے سے کمزور ٹہنوں کو بالافراط منتقل کر دیتا ہے اور اس سے زائد غذا کا اپنے اندر ذخیرہ محفوظ رکھتا ہے۔ ٹہنوں میں سے ہر ٹہنا اپنی ضرورت سے زائد خوراک اپنے سے کمزور ٹہنیوں کو دیتا ہے اور ہر ٹہنی اپنے سے کمزور شاخوں کو اور شاخیں اپنے سے کمزور پتوں کو منتقل کر دیتی ہیں پتے اپنی حسب ضرورت غذا خود استعمال کرتے ہیں اور باقی غذا پھلوں کو دے دیتے ہیں اور ساتھ ہی پھلوں پر سایہ بھی کرتے ہیں اور انہیں گرمی سے بچانے کیلئے پنکھا بھی کرتے رہتے ہیں درخت کے خاندان میں جو قدرتی نظام ربوبیت قائم ہے۔ اس میں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اس خاندان کا ہر فرد غذا حاصل کرکے اپنے آپ پر صرف اتنی استعمال کرتا ہے جتنی اسے ضرورت ہے باقی اپنے سے کمزوروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ کسی بھی مقام پر کوئی فروخیانت نہیں کرتا تاکہ اس سے کمزور حصہ اپنے حق ربوبیت سے محروم نہ رہ جائے۔ نوع انسانی اللہ تعالیٰ کی اس آیت درختوں پر سے شبانہ روز گزرتے رہتے ہیں مگر غور نہیں کرتے' اپنے سے کمزوروں کے حقوق خود کھا جاتے ہیں اور کمزور بیچارے کمزور سے کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ہر راستے میں درخت سروقد کھڑے ہر وقت درس ربوبیت دیتے چلے آرہے ہیں۔

انسانی جسم کی مثال:۔ آیات الہٰی کے ضمن میں سورہ حٰم سجدہ میں آیا ہے **سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ** ۵۳/۴۱ یقیناً ہم اپنی آیتیں آفاق میں اور خود ان کی جانوں میں دکھاتے ہیں۔ آفاق میں سے اوپر درخت کی مثال نظامِ ربوبیت عالمینی کے ضمن میں پیش کی جاچکی ہے۔ اب خود انسانی جسم کی مثال ملاحظہ فرمایئے کہ کس طرح خود اس کے اندر نظام ربوبیت عامہ موجود و محفوظ ہے۔ انسان جو بھی خوراک کھاتا ہے' معدے کی ہنڈیا اسے پکا کر اور ہضم کرکے اس کا فضلہ الگ کر دیتی ہے اور جوہر الگ۔ فضلہ دبر کے راستے خارج ہوجاتا ہے اور جوہر کا خون بن کر جگر کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ جگر اسے

صاف کرکے دل کو دے دیتا ہے اور دل اسے سر کے بالوں سے لیکر پیروں کے ناخنوں تک جسم کے ہر حصے کو مساویانہ انداز کے ساتھ ایک ایک عضو کو ہر آن پہنچاتا رہتا ہے۔ کبھی نہیں ہوا کہ اگر دل تندرست ہے تو اس نے جسم کے کسی حصے کو اس کے حق ربوبیت سے محروم کر دیا ہو۔ پس آیت زیر بحث ۱۰۵/۱۲ میں آسمانوں اور زمین میں اللہ کی آیات' مظاہرِ قدرت پر غور کرنے کی تاکید کی گئی اور اس کی کائناتی آیات مقدسات پر سے بے توجہی کیساتھ گزر جانے سے منع کر دیا گیا ہے۔ کاش نوع آدم اللہ کی کائناتی آیاتِ کریمات پر غور کرکے درس عبرت حاصل کرتی رہے۔

اگلی آیت مجیدہ کا تعلق اوپر آیت نمبر ۱۰۳/۱۲ کیساتھ ہے جس میں نبی اکرمؐ کو کہا گیا ہے کہ اگر آپ بڑی حرص بھی کریں تو لوگوں کی اکثریت تنزیلی ضابطہ حیات قرآن کریم پر ایمان لانیوالی نہیں ہے۔ اگلی آیت میں ایمان لانیوالوں کی اکثریت کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ اکثریت کی حالت یہ ہے کہ وہ ایمان تو لاتے ہیں مگر زمانہ جہالت کے شرک نہیں چھوڑتے:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٦﴾

(۱۰۶) اور لوگوں کی اکثریت نہیں ایمان لاتے ساتھ اللہ کے مگر وہ (ایمان لانے کے باوجود) مشرک ہی ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے باوجود مشرک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات یا اس کے حکم میں کسی غیر اللہ کو شریک کر لیا جاتا ہے مثلاً" قرآن مجید نے اعلان کر رکھا ہے **وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ** ۵۹/۶ غیب کی چابیاں صرف اللہ کے پاس ہیں۔ غیب کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ——— اس اعلانِ باری تعالیٰ کے خلاف کسی انسان کو غیب دان ماننا۔ نیز ارشاد باری ہے **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ** ۴۰/۱۲ نہیں ہے حکم کسی کا مگر حکم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ہے ——— اس الٰہی فیصلے کے باوجود بزرگوں یا نبیوں کو اس کے حکم میں شریک کر لینا شرک فی الحکم ہے۔ یاد رہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لانیوالا' ایمان لانے کے بعد جب تک بالکل خالی الذہن نہ ہو جائے اور اس کے بعد جب تک صرف قرآنی احکام کو ذہن میں جگہ نہ دیدے' اس وقت تک شرک سے پاک نہیں ہو سکتا۔ بصورت دیگر آیتِ بالا ۱۰۶/۱۲ کا مصداق اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے باوجود مشرک رہتا ہے۔ العیاذ باللہ! ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ کیا وہ اللہ کے عذاب سے نڈر ہوگئے ہیں:۔

أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِنْ عَذَابِ اللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿١٠٧﴾

(۱۰۷) اور کیا پھر (یہ شرک کرنیوالے) نڈر ہوگئے ہیں کہ ان پر اللہ کا عذاب آجائے اور یا ان پر اچانک عذاب کی گھڑی آپہنچے اور وہ جانتے ہی نہ ہوں (کہ عذاب آنیوالا ہے۔)

نبی اکرمؐ کی سنتِ مبارکہ:۔ اگلی آیت مجیدہ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے مبارک الفاظ کے ساتھ خود رسول مقبول' خاتم النبیین رحمتہ اللعٰلمین کی زبانِ مبارک سے بے عقلی کے شرک سے بیزاری کو اپنا طریقہ' راستہ اور سنت قرار دینے کا اعلان کروا دیا ہے کہ آپ کی پاک سنتِ مبارکہ ہر کام کو عقل کے ساتھ کرنا تھی:۔

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٨﴾

(۱۰۸) (اے رسولؐ!) اعلان کر دیجئے گا کہ میرا راستہ (میری سنت مبارکہ) یہ ہے کہ میں لوگوں کو عقل کی اساس پر اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں اور جو میرا تبع ہے' وہ بھی عقل کی اساس پر اللہ کی طرف بلائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا اللہ (بے عقلی کے کاموں سے) پاک ہے اور میں (بے عقلی کے کام کرنیوالے)

مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اس آیت مجیدہ میں ایک غیر محسوس شرک کی خبر دی گئی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں ہے۔ اس کے ضمن میں عرض ہے کہ اگر مذہب نامی چیز اللہ کے دین سے' جو قرآن مجید میں محفوظ ہے' کوئی الگ چیز ہے تو پھر ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں تو نہ ہوتا رہے۔ مگر اللہ کا دین جو محمد رسول اللہ لیکر آئے تھے وہ تو پورے کا پورا صرف عقل کی اساس پر قائم ہے اور عقل کی اساس پر ہی دعوت الی اللہ دینا اللہ کے آخری نبی کی سنت مبارکہ تھی۔

قرآن کریم صرف عقلمندوں کو مخاطب کرتا ہے:۔ عقل کی اہمیت کیلئے قرآن کریم کی ورق گردانی فرمائیں اور تصریف آیات کے ذریعہ صحیح نتیجے پر پہنچیں کہ اللہ کا دین اور اس کا نازل کردہ قرآن کریم عقل کے مطابق ہے یا مخالف؟ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ غرضِ نزولِ قرآن ہی بتاتا ہے کہ تم عقلمند بن جاؤ۔ اسی سورہ یوسفؑ کے شروع ہی میں آپ ارشادِ الٰہی ملاحظہ فرما چکے ہیں:۔ **اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** ○ ۲/۱۲ بیشک ہم نے اسے (قرآن حکیم کو) عربی زبان میں نازل فرمایا ہے (اس کی غرضِ نزول یہ ہے) کہ تم عقلمند بن جاؤ پھر اللہ تعالیٰ عقل مندوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے:۔

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۲/۵۹ عقلمندو! قرآنی حقائق سے عبرت حاصل کرو -- دیکھئے! یہ نہیں فرمایا کہ بے وقوفو! عبرت حاصل کرو ---- اسی طرح قومی زندگی کا راز بیان کرتے ہوئے عقلمندوں کو مخاطب کیا گیا ہے:۔

وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ۲/۱۷۹ اے عقلمندو! تمہارے لئے دشمن سے بدلہ لینے ہی میں زندگی ہے ---- تو بتایئے! کیا اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کو مخاطب کرنے کے بعد انہیں عقل کی بات بتائی ہے یا بے وقوفی اور بے عقلی کی؟ زندہ قوم بننا عقلمندوں کا کام ہے بے وقوفوں کا نہیں۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن کریم میں بے وقوفوں کو مخاطب نہیں کیا' جو جانتے ہی نہیں کہ انفرادی زندگی اور اجتماعی قومی زندگی میں کیا فرق ہے؟

عقل کے تین دروازے ہیں جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ ڈنگروں سے بھی بدتر ہیں:۔ علم کے دروازے تین ہیں: آنکھیں' کان اور دماغ۔ سورہ اعراف میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عطا فرمودہ ان نعمتوں سے کام نہیں لیتے وہ ڈنگروں جیسے ہیں' بلکہ وہ ان سے بھی بدتر ہیں:۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۷/۱۷۹ ان کے پاس ہمارے دیئے دماغ ہیں' وہ ان کے ساتھ تفقہ نہیں کرتے۔ ان کے پاس ہماری دی ہوئی آنکھیں ہیں وہ ان کے ساتھ دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس ہمارے دیئے ہوئے کان ہیں وہ ان کے ساتھ سنتے نہیں۔ (وہ لوگ دماغ سے تو کام لیتے ہی نہیں۔ نیز دیکھی کو ان دیکھی اور سنی کو ان سنی کر دیتے ہیں۔) وہ لوگ ڈنگروں جیسے ہیں' بلکہ ان سے بھی بدتر۔

بے عقلی کو دین کی اساس قرار دینا' انسانیت تک سے بعید ہے۔ کیونکہ کسی بھی بات کو پرکھنے کیلئے عقل کے سوا اور کونسی کسوٹی ہے جس پر رگڑ کر کھرایا کھوٹا اور صحیح یا غلط قرار دیا جاسکے۔ آیت بالا ۱۲/۱۰۸ میں سبحان اللہ کے جملے میں اللہ تعالیٰ کو بے عقلی کے کاموں سے پاک قرار دیا گیا ہے اور **وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** کے الفاظ میں بے عقلی کے کاموں کو شرک قرار دے کر نبی اکرمؐ سے اس غیر محسوس شرک سے بھی صد فیصد پاک ہونے کا اعلان کرا دیا ہے جن لوگوں کے متعلق

اوپر ۷/۱۷۹ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ وہ کانوں اور آنکھوں کے ہوتے ہوئے سنتے اور دیکھتے نہیں' عقل کے ہوتے ہوئے اس سے کام نہیں لیتے۔ انہی کے متعلق سورہ ملک میں بتایا گیا ہے کہ جب قیامت کو انہیں جہنم رسید کر دیا جائیگا تو خازن ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی آج کے دن سے آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا۔ وہ کہیں گے آیا تھا۔ لیکن ہم نے اسے یہ کہہ کر جھٹلا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ نازل نہیں کیا' تم قیامت سے آگاہ کرنے والو! بہت بڑی گمراہی میں ہو ۶۷/۸-۹۔ اس سے آگے وہ کہیں گے:۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ مَاكُنَّافِىْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۶۷/۱۰ وہ کہیں گے اگر ہم سنتے (یعنی سنی ان سنی نہ کر دیتے) اور عقل سے کام لیتے (غورو فکر کرتے) تو آج اہل جہنم میں سے نہ ہو جاتے۔

برادران عزیز! قرآن کریم اور کس طرح عقل کی اہمیت کو اجاگر کرے؟ افسوس ہے ہم پر کہ ہم بدستور کہتے چلے آرہے ہیں' بلکہ رٹ لگاتے چلے جا رہے ہیں کہ مذہب کو عقل کیساتھ کوئی تعلق نہیں۔ عقل کی اہمیت پر قرآن مجید میں مختلف الفاظ کیساتھ زور دیا ہے۔ مثلاً"

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ= پھر تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے؟ یہ جملہ یکے بعد دیگر ذیل کے بارہ مقامات پر آیا ہے= ۲/۴۴ + ۳/۶۵ + ۶/۳۲ + ۷/۱۶۹ + ۱۰/۱۶ + ۱۱/۵۱ + ۱۲/۱۰۹ + ۲۱/۶۷ + ۲۸/۶۰ + ۳۷/۱۳۸

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ= (قرآن کریم کی غرض نزول یہ ہے) تاکہ عقل سے کام لیا کرو ---- یہ جملہ مبارکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید میں یکے بعد دیگر ذیل کے چھ مقامات پر نازل کیا گیا ہے:۔ ۲/۷۳ + ۶/۱۵۱ + ۱۲/۲ + ۴۰/۶۷ + ۲۴/۶۱ + ۴۳/۳

وَلَقَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ اور بلاشبہ ہم نے اپنی آیتوں کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے تاکہ تم عقل سے کام لیا کرو ---- یہ مفہوم ذیل کے تین مقامات پر آیا ہے:۔ ۳/۱۱۸ + ۲۴/۶۱ + ۵۷/۷۔

اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ= پھر تم کیوں عقل سے کام لینے والے نہیں بنے؟ (قرآن کریم کو سننے کے بعد تو تمہیں عقل والے بن جانا چاہئے تھا)۔ دیکھا آپ نے کہ قرآن کریم کس قدر شدت کیساتھ عقل سے کام لینے پر زور دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا الگ الگ انسانوں کی عقلیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس کے لئے آپ کے تین دروازے قرآن کریم کی رو سے 'دماغ' آنکھیں اور کان پچھلے صفحہ پر الگ بغلی سرخی میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بھری کائنات میں باقی تمام نوعوں پر انسان کی فضیلت کا نشان ہی یہ بتایا ہے:۔

وَهُوَ الَّذِىْٓ اَنْشَاَلَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۲۳/۷۸ اور وہ اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات ہے جس نے تمہارے لئے کان' آنکھیں اور دماغ پیدا فرمایا ہے ---- عقل و علم کے انہی تین دروازوں سے پورا پورا کام لینے کی مزید تاکید سورہ بنی اسرائیل میں بالفاظ ذیل کی گئی ہے اور قیامت کی باز پرس کے متعلق بتا دیا گیا ہے کہ قیامت کو پوچھا جائیگا کہ تم نے ہمارے دیئے ہوئے ان عقل کے ذرائع سے کیوں کام نہ لیا؟ دیکھئے! ارشاد باری ہے:۔

وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" ۱۷/۳۶ اور تو اس کے پیچھے نہ لگ جا' جس کا تجھے علم نہیں (علم کے تین ذریعے ہیں) بلاشبہ کان' آنکھ اور دماغ وہ چیزیں ہیں کہ ان سب کے متعلق قیامت کو پوچھا جائیگا (کہ تم نے ان عقل کے ذرائع سے کیوں کام نہ لیا)

یہاں تک تو یہ ثابت ہو چکا ہے کہ از روئے قرآن کریم عقل سے کام لینا اولین انسانی فریضہ ہے۔ اور عقل کے ذرائع

ہیں کان، آنکھ اور دماغ۔ پھر جہاں کہیں عقل کے یہ آلے غلطی کھا جائیں اور انسانوں کی عقلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس پر کائناتی مشاہدات کی تائید حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ پیچھے آپ اسی سورہ یوسفؑ کی آیت نمبر۱۰۵ ملاحظہ فرما چکے ہیں وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ○ ۱۰۵/۱۲ اور آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی کتنی نشانیاں ہیں جن پر سے لوگ بے توجہی کیساتھ گزر جاتے ہیں اور وہ ان سے اعراض کرتے ہیں (ان پر غور نہیں کرتے) پس جہاں عقلیں مختلف ہو جائیں وہاں مشاہداتِ عالم کو ان پر حکم مقرر کیا گیا ہے کہ عقل وہ صحیح ہے جس کی مشاہدات عالم تائید کریں۔

اب صرف ایک سوال باقی رہ گیا ہے کہ مشاہداتِ کائنات کو کیوں حکم قرار دیا گیا ہے؟ یہ اسلئے کہ ارشاد باری ہے کہ آسمانوں اور زمین کو بالحق پیدا کیا گیا ہے:۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۳/۱۶ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالحق پیدا فرمایا ہے پس جہاں کہیں اختلاف پیدا ہو وہاں حق وہ ہوگا جس کی تائید اللہ تعالیٰ کے بالحق پیدا کردہ مشاہدات عالم کریں۔

عقل و بصیرت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ہم دُور نکل آئے ہیں۔ اس وقتِ زیر بحث ہے سورہ بقرہ کی آیت مجیدہ ۱۰۸/۱۲ جس میں خود نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے اللہ تعالیٰ نے بالفاظ وحی اعلان کرا دیا ہے کہ "میرا راستہ" میرا طریقہ یعنی میری سنت مبارکہ یہ ہے کہ میں عقل و بصیرت کی اساس پر لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ بے عقلی سے پاک ہے اور میں بے عقلی کو دعوت کی اساس قرار دینے والے مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ان الفاظ مبارکہ اور ان کی وہ لمبی تصریح جو پیچھے تقریباً چار صفحوں پر پھیل گئی ہے، اس سے ثابت ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ خود عقل و بصیرت کو پسند کرتا ہے، اس نے عقل و بصیرت پر بے حد زور دیا اور بے عقلوں کو ڈنگروں سے بدتر قرار دیا ہے اور سیدنا خاتم النبیین ورحمۃ للعٰلمین کی ہر سنت مبارکہ یعنی آپ کے ہر عمل کا عقل و بصیرت کی اساس پر قائم ہونا بتایا ہے۔ اسلئے اگر یہ رٹ لگائی جائے کہ مذہب کا عقل کیساتھ کوئی تعلق نہیں تو اس کا یہی مطلب ہوگا کہ نوعِ انسانی کے اپنے بنائے ہوئے مذہب کا تو واقعی عقل کیساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کی اساس ازروئے قرآن، صرف اور صرف عقل و بصیرت ہی پر قائم ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے خبر دی گئی ہے کہ آپ سے پہلے بھی مختلف بستیوں میں بستی والوں میں سے ہی بہت سے رسول بھیجے گئے تھے مگر وہ سب مرد تھے۔ کسی عورت کو نبیہ نہیں بنایا گیا تھا۔ پھر لوگ زمین میں چل پھر کر کیوں نہیں دیکھتے کہ ان سے پہلے نافرمان لوگوں کا کیا انجام ہوا تھا۔ اور اچھا انجام تو ان لوگوں کیلئے ہے جو ضابطہ الٰہی کی مخالفت سے بچنے والے ہیں:۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٠٩﴾

(۱۰۹) اور (اے رسولؐ) نہیں بھیجے ہم نے آپ سے پہلے (کوئی رسول) مگر وہ ضرور بستی والوں میں سے (نیکوکار) مرد ہی ہوتے ہیں جنہیں ہم وحی کرتے تھے۔ کیا پھر وہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے کیوں نہیں۔ پھر تاکہ وہ دیکھیں کہ ان سے پہلے کے (نافرمانوں) کا کیا انجام ہوا تھا۔ اور آخرت کا گھر (یعنی اچھا انجام) تو ان لوگوں کیلئے ہے جو (ہمارے نازل کردہ ضابطے کی مخالفت سے) بچتے ہیں۔ پھر تم لوگ کیوں عقل سے کام نہیں لیتے

اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ کے الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت پر صرف مردوں کو فائز فرمایا تھا' کسی بھی عورت کو نبیہ نہیں بنایا گیا تھا۔ یہ اس صنف کیساتھ نا انصافی نہیں' بلکہ عورت کی صنف ہی ایسی ہے کہ وہ ہر مہینے میں آٹھ دن کیلئے بصورت ماہواری کورس بیمار ہوتی ہے۔ پھر اس کے صنفی تقاضے یہ ہیں کہ اسے تین ماہ کیلئے حمل خفیف اٹھانا ہوتا ہے اور چھ ماہ کیلئے حم ثقیل کا بوجھ اٹھائے پھرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وضع حمل کے خطرناک مرحلے سے گزر کر ایامِ نفاس گزارنے ہوتے ہیں اور پھر دو سال کیلئے بچے کو دودھ پلانے کا فریضہ بھی عورت ہی کا ہے۔ اسلئے اسے ان گونا گوں صنفی ذمہ داریوں کی بدولت فریضہ نبوت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ عورت کی عظمت شان اس کی ان ذمہ داریوں سے عیاں ہے' جنہیں کوئی مرد ہرگز ہرگز اٹھا ہی نہیں سکتا۔

مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ ہر نبی جس بستی میں مبعوث کیا جاتا تھا' وہ اس بستی والوں ہی کا ایک ایسا فرد محترم ہوتا تھا جس کے اہلِ بستی بچپن سے لیکر اس کی بعثت کے دن تک کے حالات سے خود واقف ہوتے تھے کہ کیا یہ جھوٹا تو نہیں' دھوکے فریب کا عادی تو نہیں۔ یہ دستور اہل بستی کیلئے اتمام حجت کے طور پر مقرر کیا گیا تھا تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم تو مدعیِ نبوت کو جانتے ہی نہیں کہ وہ کیسے خاندان میں سے ہے' اس کا بچپن اور جوانی کیسی تھی۔ دوسرے مقام پر نبی اکرم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اہل مکہ آپ کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان لفظوں سے پوری طرح کھل کر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام علم و حکمت کی اساس پر مبنی ہوتا ہے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کے الفاظ میں زمین میں چل پھر کر ان لوگوں کا انجام دیکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ جنہوں نے ضابطہِ الٰہی کی مخالفت کی۔ اپنے لئے محلات بناتے رہے اور عوام کیلئے جھونپڑیوں تک کی ضرورت سے غفلت کا عملی ثبوت بہم پہنچا گئے۔ اپنے لئے تو قسم قسم کے ناشتے' نہار' عصرانے اور عشائیے کا اہتمام کرتے رہے مگر عوام کو اپنے تنخواہ دار علماء سے دو وقت کی سوکھی روٹی پر خوش رہنے کی تلقین کرواتے رہے۔ آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جن شیش محلوں کو عروس نو کی صورت میں رنگا رنگ بلّور کے ساتھ مزین کیا گیا تھا آج وہاں الّو بول رہے ہیں۔ جن لوگوں سے یہ شیش محل بنوائے گئے تھے ان میں سے اکثریت کو کچے کوٹھے بھی شاید ہی میسر ہوتے تھے۔ اور جس قسم کے کھانے وہ شیش محلوں والے کھاتے تھے عوام بچارے تو ان کے ناموں تک سے بھی ناآشنا ہوتے تھے۔ مرغ بٹیر بریاں' مرغ بٹیر بریانی' تیتر بریاں اور تیتر بریانی اور مرغ سیخ' ماہی سیخ' بٹیر سیخ اور تیتر سیخ کے علاوہ قورمہ اور شاہی کباب وغیرہ کے ناموں سے وہ کب آشنا تھے۔

اس ضمن میں ایک حقیقت ثابتہ یہ ہے کہ پورے کرہ ارض پر جتنے بھی وسیع و عریض اور سربفلک محلات موجود پائے جاتے ہیں' جہاں آج چیل کووں کا بسیرا پایا جاتا اور الووں کی بولیاں سنی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک عمارت بھی اللہ تعالیٰ کے کسی نبی رسول کی بنوائی ہوئی نہیں ہے حالانکہ داؤد' سلیمان' ذوالقرنین' عیسیٰ مسیح اور محمد سلام علیہم اللہ کے نبی ہونے کے ساتھ ساتھ زمین کے بعض حصوں کے حکمران اور مالک و مختار بھی تھے۔ قرآن حکیم میں یوسفؑ کے متعلق یہ خبر موجود ہے کہ آپ ملک مصر کے سیاہ' سفید کے مالک و مختار تھے اور زندگی کے آخری دم تک اس منصب اقتدار پر فائز رہے اور یہ چیز بھی درج قرآن ہے کہ آپنے سات سالوں میں چودہ پندرہ سال کی ضرورت کے مطابق غلہ پیدا کیا اور قحط کے سات آٹھ سالوں میں ہر قحط زدہ فرد' خاندان' بستی اور علاقے کو غلہ تقسیم بھی کیا۔ مگر یہ چیز ہرگز قرآن بھر میں نہیں ملے گی کہ اس عظیم آزمائش میں صد فیصد کامیاب ہونے کی خوشی میں کوئی یادگار مینار بنوایا ہو۔ یا اتنے بڑے کامیاب تاریخی فرد ہوتے ہوئے اپنے لئے عوام سے الگ کوئی متمیز آرام گاہ ہی تعمیر کرائی ہو۔ یا۔۔

حکمرانی کی حالت میں عوام سے الگ زرق برق لباس پہننا اور عوام سے الگ رہائش کیلئے محلات بنانا سنت فرعون ہے۔ سنت رسول ہرگز نہیں۔ کسی ایک نبی نے بھی ہرگز ایسا نہیں کیا۔ بلکہ وہ حکمرانوں اور قومی سرداروں کو منصفانہ مساوات انسانی کی تبلیغ کرتے تھے۔ مگر ہوتا یہ کہ نہ صرف حکمران اور قومی سردار ہی نبیوں کے مخالف اور دشمن ہو جایا کرتے' بلکہ ان کے زیر اثر عوام بھی شدت کیساتھ مخالفت پر اتر آتے اور انبیاء سلام علیہم عوام سے مایوس ہو جاتے۔ اور نتیجہ یہ کہ اللہ کی مدد آجاتی' اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اس کے ساتھیوں (صحابہؓ) سے ہجرت کروا کر مجرم قوم سے الگ کرکے نبی کے مخالفوں کو ہلاک کر دیتا تھا۔ اگلی آیت مجیدہ میں آیا ہے:۔

حَتّٰۤی اِذَا اسْتَایْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾

(۱۱۰) (اللہ کے نبی اللہ کا پیغام پہنچاتے مگر لوگ شدید انکار اور مخالفت کرتے) حتیٰ کہ اللہ کے رسول لوگوں سے مایوس ہو جاتے اور انہیں یقین ہو جاتا کہ وہ جھٹلا دیئے گئے ہیں اس پر ہماری مدد آجاتی تھی۔ پھر ہم جسے بھی نجات دیتے تھے' اپنے قانون مشیت کے مطابق ہی دیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا عذاب مجرم قوم سے ہرگز نہیں ٹلتا۔

حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا کی مثال سورہ قمر میں چند نبیوں کے متعلق بالفاظ ذیل آئی۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ ○ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۹-۱۰/۵۴ پس ان سے پہلے قوم نوح نے ہمارے بندے (نوح) کو جھٹلایا اور کہا کہ یہ پاگل ہے پھر اسے ڈانٹا گیا۔ پھر اس نے اپنے رب سے دعا کی کہ بیشک میں مغلوب ہوگیا ہوں تو میری مدد فرما۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر طوفان کا عذاب نازل کیا اور نوحؑ کو آپ کے ساتھیوں سمیت کشتی کے ذریعہ بچا لیا اور جھٹلانیوالوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے غرق کرکے ختم کر دیا۔ اس سے آگے:۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ○ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ○ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ○ ۱۸-۱۹/۵۴ قوم عاد نے (ہودؑ کو) جھٹلایا۔ پھر میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا۔ ہم نے ان پر ایک منحوس دن میں مسلسل چلنے والی سخت آندھی بھیجی۔ وہ لوگوں کو اکھاڑ کر اس طرح پھینکتی تھی گویا کہ وہ کھجور کے اکھڑے ہوئے تنے ہیں ----- اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہودؑ اور آپ کے ساتھیوں کو پناہ گاہوں کے ذریعہ بچا لیا اور جھٹلانے والوں کو ہود کی زندگی ہی میں ختم کر دیا ----- اس سے آگے ہے:۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ○ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ○ ءَاُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ○ ۲۳ تا ۵۴/۲۵ ----- اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ ۵۴/۳۱ قوم ثمود نے (صالحؑ کو) جھٹلایا۔ پھر انہوں نے کہا۔ کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی کریں پھر تو ہم گمراہی اور عذاب میں ہوں گے۔ کیا ہم میں سے اس (صالحؑ) پر نصیحت نامہ (اللہ کی کتاب) اتری ہے۔ بلکہ وہ (صالحؑ) تو جھوٹا اور خود پسند ہے ----- بیشک ہم نے ان پر یکبارگی ایک چیخ کا عذاب بھیجا۔ (صالحؑ کو ان کے ساتھیوں (صحابہ) سمیت ہجرت کروا کر بچا لیا۔ اور جھٹلانے والوں کو ان کی زندگی میں ختم کر دیا) پس وہ باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح چورا چورا ہوگئے۔ اس سے آگے ہے:۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ○ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ ○ ۴۱-۵۴/۴۲

اور بلاشبہ فرعون والوں کے پاس بھی برے عملوں کی بری سزا سے آگاہ کرنے آئے' انہوں نے ہماری سب نشانیوں کو جھٹلایا۔ پھر ہم نے انہیں ایسے ہی پکڑا' جیسے کہ غالب طاقت والے کا پکڑنا ہوتا ہے ---- قوم فرعون کی طرف موسیٰ اور ہارون کو بھیجا گیا تھا۔ ان کے مقابلے پر فرعون جیسا صاحب اقتدار جابر بادشاہ تھا۔ اسے سمندر میں غرق کر دیا گیا اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی گرفت **اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ** کے انتہائی موزوں الفاظ لائے گئے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے آپ کو بڑا صاحب اقتدار سمجھتا تھا اسلئے ارشاد ہوا ہے کہ اسکے ساتھ اس جیسا ہی سلوک کیا گیا کہ اسے اسکے لشکروں سمیت موسیٰؑ کی آنکھوں کے سامنے غرق کر کے اس کی بڑائی کو خاک میں ملا دیا۔ سورہ مجادلہ میں اعلان عام کر دیا گیا ہے:۔ **كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ** ۵۸/۲۱ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (فرض کر دیا ہے) کہ ضرور ضرور میں اور میرے رسول غالب رہیں گے۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ قوت والا غالب ہے ---- اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق سب کے سب نبی رسول غالب آئے خواہ مقابلے پر فرعون جیسا جابر و مقتدر بادشاہ بھی کیوں نہ ہوا۔

فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ کی تفصیل **وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ** نے کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ انجام کار اسکا بھیجا ہوا عذاب مجرموں پر آتا ہے' غیر مجرموں پر نہیں آتا۔ اللہ کا عذاب ان مجرموں سے ہرگز نہیں ٹلتا جو نہ اقرار جرم کریں اور نہ جس آدمی کا جرم کیا ہو اس سے معافی مانگیں۔ پیچھے ۱۲/۹۱ میں برادرانِ یوسف کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انہوں نے **اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ** کے الفاظ سے یوسف کے سامنے اقرار جرم کر کے معافی مانگی۔ اور اسی طرح ۹۷/۱۲ میں آیا ہے کہ انہوں نے **اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ** ہی کے الفاظ میں والد بزرگوار کے سامنے اقرار جرم کیا اور ان سے معافی مانگی۔ یوسفؑ نے فوراً معاف کر دیا اور کہا **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** آج میری طرف سے تم پر کوئی الزام باقی نہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ اگر کوئی مجرم قوم بھی اقرار جرم کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر معافی مانگ لے تو اللہ تعالیٰ قوموں کو بھی معاف کر دیتا ہے' جیسے کہ قوم یونس کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا' عذاب بھی ٹال دیا تھا ۱۰/۹۸ میں آیا ہے:۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۱۰/۹۸ پھر کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ اسکے رہنے والے ایمان لے آتے پھر اسے اس کا ایمان لانا فائدہ دیتا مگر قومِ یونس ایسی تھی کہ جب جب وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ان کی دنیا کی زندگی میں عذاب ٹال دیا اور انہیں ایک مدت تک فائدہ دیا۔

سورہ یوسف کی آخری آیت مجیدہ:۔ سورہ یوسف کی آخری آیت مجیدہ میں یوسفؑ اور برادرانِ یوسفؑ کے واقعات اور سابقہ انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات میں جو اوپر بیان ہوئے ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ ان واقعات میں عقلمندوں کیلئے درس عبرت ہے۔ نیز آیت میں قرآن کریم کے متعلق اعلان کیا گیا ہے کہ یہ کوئی گھڑی ہوئی حدیث نہیں ہے۔ بلکہ یہ سابق کتبِ الٰہیہ کی تصدیق کرتا ہے اور ایمان لانیوالوں کیلئے ہر چیز کی تفصیل بھی کرتا ہے اور ہدایت رحمت بھی ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

(۱۱۱) بیشک ان (برادرانِ یوسفؑ اور سابقہ انبیاء و اقوام کے واقعات میں عقلمندوں کیلئے درسِ عبرت ہے۔ (یہ قرآن) کوئی گھڑی ہوئی حدیث نہیں اور لیکن (یہ ان الٰہی کتابوں کی) تصدیق کرنیوالا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ نیز یہ ہر چیز (یعنی ہر مسئلہ دین) کی تفصیل کرنے والا ہے۔ اور ان لوگوں کیلئے جو (اس کے اعلان کفایت پر) ایمان

لائیں مکمل ہدایت بھی ہے اور مکمل رحمت بھی ہے۔

فِیْ قَصَصِهِمْ میں **هِمْ** ضمیر برادران یوسفؑ کی طرف بھی پھرتی ہے اور آیت ماقبل میں مذکور اُلرُّسُل اور ان کی قوموں کی طرف بھی پھرتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یہ واقعات دل بہلاوے کیلئے قصہ خوانی کے انداز میں بیان نہیں کئے گئے بلکہ ان میں درس عبرت ہے۔ یوسفؑ پر بھائیوں نے بڑے مظالم توڑے ذہنی لحاظ سے انہیں ختم کر چکے ہوئے تھے۔ یوسفؑ نے ان کے ابتدائی اقدام کی بدولت بہت سے مصائب برداشت کئے لیکن انجام یہ ہوا کہ وہ یوسف ہی کے محتاج ہوئے لیکن جب انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کرکے معافی مانگ لی تو یوسفؑ نے فوراً" معاف کرکے اپنی آخری فتح کا ثبوت پیش کر دیا۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ بعض حدیثیں خود گھڑ کر اللہ کے ذمہ لگائی ہوئی ہوتی ہیں۔ مگر قرآن کریم ایسی کتاب ہرگز نہیں' بلکہ یہ اللہ تعالٰی کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اسی لئے سابقہ منزل من اللہ کتابوں کی تصدیق بھی کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ کتاب موسٰی میں سے یہودیوں نے جزوں کی جزیں نکال دی ہوئی ہیں ۶/۹۱۔

وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ کے الفاظ میں تین چیزوں کی خبر دی گئی ہے' پہلی یہ کہ قرآن کریم ہر چیز کی تفصیل بھی خود بیان کرتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ یہ مکمل ہدایت بھی ہے اور مکمل رحمت بھی ہے۔ اور تیسری چیز یہ کہ قرآن کریم مفصل مکمل اور ہدایت و رحمت ان لوگوں کیلئے ہے جو اس کے مفصل' مکمل اور ہدایت و رحمت ہونے پر ایمان لاتے ہیں۔

اس کے مکمل و مفصل ہونے کے دلائل سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ ذیل میں کفایتِ قرآن کے ضمن میں تین تقابلی آیاتِ مجیدہ پیش خدمت ہیں:۔

۱۔ اللہ کافی ہے:۔ **اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ** ۳۹/۳۶ کیا اللہ اپنے بندے کیلئے کافی نہیں (یقیناً کافی ہے)

۲۔ رسول کافی ہے:۔ **وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا** ۳۴/۲۸ اور (اے رسول!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر قیامت تک کی نوع انسانی کیلئے کافی بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے (آپ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں)

۳۔ قرآن کافی ہے:۔ **اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ** ۲۹/۵۱ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اپنی اکلوتی کتاب نازل کر دی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے (یقیناً کافی ہے)

اب غور فرمائیں کہ جب اللہ تعالٰی کی کفایت کے بعد کسی اور ہستی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور رسولِ مقبولؐ کی کفایت کے بعد قیامت تک کیلئے کسی اور نبی کی ضرورت نہیں ہے تو قرآن کی کفایت کے بعد کسی اور کتاب کی ضرورت کس طرح تسلیم کی جاسکتی ہے۔ پس قرآن کریم کی ہدایت کے بعد کسی اور ہدایت کی ضرورت بھی باقی نہیں۔ اور قرآن کریم کے رحمت ہونے پر خود نبی اکرمؐ کی ذات گرامی شاہد ہے کہ آپ کو کہا گیا ہے۔ **وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ** ۲۱/۱۰۷ اور اے رسول! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ جب آپ کو قانونِ رحمت' قرآن کریم عطا کیا گیا تو آپ مجسم رحمت بن گئے۔ قرآن کریم کو متعدد مقامات پر رحمت بھی کہا گیا ہے ہر چیز کو خود کھول کھول کر بیان کرنے والا بھی کہا گیا ہے۔ **وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ** ۱۶/۸۹ اور ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی ہے جو اس کے احکام پر عمل کرنیوالوں کیلئے ہدایت بھی ہے' رحمت بھی ہے اور بشارت بھی ہے۔

(نوٹ) واضح رہے کہ سورہ یوسفؑ کو پہلی تین آیتوں میں بھی قرآن کریم کی تعریف سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی آخری آیت میں اس کا خاتمہ بھی قرآن کریم کی تعریف پر ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

(۱۳) سُوْرَةُ الرَّعْدِ

سورہ الرعد ۴۳ آیتوں پر مشتمل ہے۔ یہ سورت مجیدہ الرعد کے نام سے اسلئے موسوم ہے کہ اس میں الرعد یعنی کڑک کا ذکر آیا ہے جو بارش کا ایک حصہ ہے۔ قرآن کریم کو باری تعالیٰ نے بارہا بارش کیساتھ تشبیہ دی ہے' کیونکہ جس طرح بارش سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے' اسی طرح قرآنی تعلیم کیساتھ مردہ اذہان زندہ ہو جاتے ہیں جس طرح بارش میں کڑک ہے' اسی طرح قرآن کریم میں بد عملوں اور نافرمانوں کیلئے وعید عذاب کی کڑک ہے۔ جس طرح بارش سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو کائناتی قوانین باری تعالیٰ کے مطابق زمین میں ہل چلا کر بہترین اور صحتمند بیج ڈالتے ہیں' بے عملوں کو بارش سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا' جو یا تو اپنے کھیتوں میں کچھ نہیں بوتے' اور یا ناقص اور برا بیج بو دیتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی تعلیم سے بھی ان لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے' جو اپنے ذہنوں میں صحیح اور صحتمند عقیدے کا بیج بوتے ہیں۔ سورہ الرعد میں اسی چیز کو مختلف مثالوں کیساتھ سمجھایا گیا ہے۔

اس سورت مجیدہ کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کے کائناتی قوانین کے غیر متبدل ہونے پر سورج اور چاند کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے کہ یہ دو بڑے ستارے جو ہر شخص کو شبانہ روز دکھائی دیتے ہیں' یہ اپنے پیدا کرنیوالے کے مقرر کردہ مداروں پر مسلسل چل رہے ہیں' قانون الٰہی کی ذرہ بھر بھی نافرمانی نہیں کرتے۔ مگر ساتھ ہی بتا دیا گیا ہے کہ آخر الا مریہ بھی ختم کر دیئے جائیں گے۔ یہ ایک مقررہ میعاد تک کیلئے موجود ہیں اس کے بعد فنا کر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح پوری کائنات جو لا انتہا بلندیوں اور فراخیوں پر مشتمل ہے' سب کی سب ختم کر دی جائیگی۔ بالفاظ دیگر ہر چیز ہلاک و فناہ ہونے والی ہے' بقا اور دوام صرف اور صرف ذات باری کو ہے جو ازلی بھی ہے اور ابدی' اس کے متعلق یہ تصور کہ اس کی زندگی کی ابتدا تو ہے' انتہا نہیں ہے' یعنی زندگی آگے ہی چلتی جائیگی' غلط ہے۔ اس سورۃ مجیدہ میں اس کا کھل کر اعلان کر دیا گیا ہے۔

جیسے کہ قرآن کریم نے اس چیز پر بے حد زور دیا ہے کہ حضرت انسان کی موت کے بعد دوبارہ قیامت کو اسے زندہ کرکے اس کی زندگی کے اعمال کی جوابدہی کیلئے حضور الٰہی میں حاضر کر لیا جائے گا۔ اس سورہ مجیدہ میں بھی منکرین قیامت کا قول پیش کیا گیا ہے کہ وہ جب مرنے' اور عرصۂ دراز گزارنے کے بعد مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا وہ دوبارہ زندہ کر لئے جائیں گے۔ بالفاظ دیگر اس چیز پر زور دیا گیا ہے کہ حضرت انسان اس زندگی کو کھیل تماشوں میں ضائع نہ کرے' اور اسے بد اعمالیوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں نہ گزار دے' اس کے مرنے کے بعد خواہ لاکھوں برس گزر جائیں اور یہ مٹی میں مٹی ہوکر نابود بھی سمجھا جائے' تو پھر بھی اسے زندہ کر لیا جائیگا اور اسے اس کے اچھے عملوں کی جزا بھی ضرور ضرور دی جائیگی اور اس کے برے عملوں کی سزا بھی ضرور ضرور دی جائیگی۔

اس سورہ مبارکہ میں یہ بھی کھل کر بتا دیا گیا ہے کہ جو کوئی گمراہ ہوتا ہے' خود ہوتا ہے اور ہدایت وہی پاتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس باطل عقیدے کی بھی تردید کر دی گئی ہے جو غلط العام مشہور ہے کہ اللہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہ کر دے۔ العیاذ باللہ!

نیز اس سورت پاک میں اس چیز کی بھی نفی کر دی گئی ہے' جو کہا جاتا ہے کہ ایک کالا علم ہے اس کے ساتھ زمین کی مسافت طے کر لی جاتی ہے یا اس کے ساتھ دیواریں چلائی جاسکتی ہیں اور یا مردوں سے باتیں کی جاسکتی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس

عقیدے کو بھی غلط اقرار دے دیا گیا ہے کہ جو کام اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین پر عمل کرنے سے سرانجام ہوتے ہیں' وہ محض زبان سے کچھ اوٹ پٹانگ الفاظ ادا کرنے سے ادا ہو جاتے ہیں۔

اس سورہ مجیدہ کی مخصوص خوبی یہ ہے کہ اس کی ابتدا میں بھی کائناتی قوانین باری تعالیٰ کے اٹل ہونے کی تاکید کی گئی ہے' اور اس کے آخیر پر بھی نبی اکرمؐ کی رسالت کا گواہ ہر اس شخص کو بتایا گیا ہے جو کتاب کائنات کا علم رکھتا ہے' کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی فعلی کتاب' صحیفہ فطرت میں ہو رہا ہے چونکہ وہی کچھ اس کتاب میں درج ہے جسے یہ مدعی نبوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ بتاتا ہے' لہذا یہ کتاب اسی ذات مقدس کی طرف سے ہے' جس نے اس کائنات' صحیفہ فطرت کو پیدا کیا ہے۔ پس میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ کتاب بھی سچی ہے اور اس کا لانے والا رسولؐ بھی سچا ہے۔ زیر نظر سورت مبارکہ ان پاک سورتوں میں سے ہے جن کی ابتدا میں نبی اکرمؐ کو حروف مقطعات کیساتھ مخاطب کیا گیا ہے' بغور ملاحظہ فرمائیں:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ رحمان و رحیم کے نام اور صفات کے پیش نظر اس سورہ الرعد کو شروع کرتے ہیں۔

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

(۱) اے امین! لین القلب! مرسل! اللہ تعالیٰ کے ہر قانون کے سامنے جھکنے والے! مذکورہ بالا (سورہ یوسف کی) آیتیں ہماری لاریب کتاب کی حق ہیں نیز جو کچھ بھی آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے حق ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے۔

بلاغ القرآن کے صفحات میں بارہا وضاحت کی جا چکی ہے کہ حروف مقطعات نبی اکرمؐ کے وہ القاب گرامی ہیں جن کیساتھ باری تعالیٰ نے آپ کو مخاطب فرمایا ہے۔ پوری تفصیل کیلئے ادارہ بلاغ القرآن کی شائع کردہ تفسیر القرآن بالقرآن جلد اول کا دیباچہ ملاحظہ فرمائیں یا ادارہ کا شائع کردہ پمفلٹ "حروف مقطعات کی مکمل بحث" کا مطالعہ کریں۔ یہاں الف سے امین مراد ہے' لام سے' لین القلب' گداز ذہن والا' میم سے مرسل اور را سے راکع یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین تنزیلی اور تکوینی' سب کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا بھی ہے اور صلوٰۃ موقت کے اندر رکوع کرنے والا بھی ہے۔

تِلْكَ اسم اشارہ بعید مونث ہے جس کا مشار الیہ سورہ یوسف کی آیات کریمات ہیں۔

الْكِتٰبِ پر الف لام لا کر قرآن کریم کو خاص اپنی کتاب کہا گیا ہے جس کی مسلمہ تعریف لاریب فیہ ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ جو کچھ سورہ یوسف میں نازل کیا گیا ہے وہ بھی حق ہے' اور اس کے علاوہ پورے قرآن بھر میں جو کچھ بھی آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ بھی حق ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس حقیقت پر ایمان نہیں لاتی کہ حق صرف اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیتیں ہیں' ان کے سوا کوئی چیز حق نہیں ہے' خواہ وہ روایات کی صورت میں اللہ کے کسی ایک پاک نبی رسول کی طرف بھی منسوب کی گئی ہوں۔ کیونکہ حق کی نشانی اور شرط بیان ہوئی ہے **وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ۔** یعنی جو کچھ تیرے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے' جو تیرے رب کی طرف سے نازل نہیں ہوا وہ حق نہیں ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات مقدسہ بصورت مظاہر فطرت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝

(۲) اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کر رکھا ہے جنہیں تم دیکھتے ہو (یعنی آسمانی کرہ جات غیر مرئی ستونوں پر قائم ہیں) پھر وہ اللہ اپنی حکومت پر قائم ہے (یعنی پورا کنٹرول کئے ہوئے ہے) اور اس نے سورج اور چاند (جیسے تمام ستاروں) کو کام پر لگا دیا ہے۔ سب کے سب نام رکھی ہوئی مدت تک کیلئے (اپنے اپنے مدار پر) چل رہے ہیں۔ وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور اپنی آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کے حضور حاضر ہونے پر یقین کرو۔

بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ آسمانی کرہ جات ان ستونوں پر قائم نہیں ہیں' جنہیں تم دیکھتے ہو یعنی چھتوں اور برآمدوں وغیرہ کے ستون جو دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں **السموٰات** سے مراد ساوی کرہ جات ہیں۔ جو اس طرح دکھائی دیتے ہیں کہ وہ مرئی ستونوں کے بغیر قائم ہیں۔ ان کی تفسیر ۴۲/۵ میں بالفاظ ذیل کی گئی ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ۴۲/۵ قریب ہے کہ آسمانی کرہ جات پھٹ (کر گر) پڑیں حالانکہ (یہ اس لئے نہیں گرتے کہ اللہ تعالیٰ کی مخفی قوتیں اپنے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہی ہیں' اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔ اور وہ بچاؤ طلب کرتی ہیں ہر جاندار کے لئے جو زمین میں ہے۔ بلا شبہ اللہ بچاؤ عطا فرمانے والا مہربان ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی مخفی قوتوں پر غور فرمائیں۔

جہاں تک سائنسی معلومات کے مطابق اب تک ثابت ہو سکا ہے' ساوی کرہ جات کے غیر مرئی ستونوں میں اولین ستون ہر کرے کی داخلی قوت ثقل ہے کہ ہر کرہ اپنی قوت ثقل کے دائرے کے اندر محدود رہے۔ اور اس کے بعد دوسرا ستون ہے وہ خلا جو باری تعالیٰ ہر دو کروں کے درمیان قائم کر دیا ہے۔ چاند کی طرف سفر کرتے ہوئے ہوابازوں کو سب سے پہلے زمین کی کشش ثقل سے واسطہ پڑا۔ مگر جب اس کی حد ختم ہو گئی تو آگے خلائی منطقے میں داخل ہوئے جہاں کسی بھی کرّے کی کشش موجود نہیں' چنانچہ وہاں پہنچ کر وزن ختم ہو گیا۔ اس خلا کے بعد پھر چاند کی کشش ثقل میں پہنچے۔ المختصر اللہ تعالیٰ نے ساوی کروں کے درمیان کشش ثقل اور خلائی منطقوں کے وہ غیر مرئی ستون قائم رکھے ہیں جو ان ستونوں سے مختلف ہیں' جنہیں ہم اپنے چھتوں اور برآمدوں کے نیچے دیکھتے ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کا معنی بلاغ القرآن کے صفحات میں بارہا لکھا جا چکا ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مادی جسم ہے اور نہ اس کے بیٹھنے کا کوئی تخت ہے۔ عرش کا معنی عربی ادب میں سلطنت' حکومت ہے اور **ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ** کے معنی یہ ہے کہ وہ اپنی وسیع و عریض علاوہ رفیع و عظیم سلطنت پر پورا پورا کنٹرول کئے ہوئے ہے۔

سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ پر الف لام جنسی ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اس قسم کے تمام ستارے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ انہیں اپنے اپنے کام پر لگا دیا گیا ہے اور وہ سب نوع انسانی کی خدمت کر رہے ہیں اور نوع انسانی قوانین فطرت کے مطابق ان سب سے ان کی ساخت کے مطابق اپنی خدمت کے کام لے سکتی ہے۔

كُلٌّ يَّجْرِيْ کا مفہوم یہ ہے کہ سورج چاند اور اسی قسم کے تمام ستارے اپنے اپنے مدار پر مسلسل چل رہے ہیں۔
لِاَجَلٍ مُّسَمًّى کے الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ سورج چاند وغیرہ کی ایک میعاد مقرر کر دی گئی ہے اور اس میعاد کا نام رکھ دیا گیا ہے **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ** ۲۸/۸۸ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس کے سوا ہر چیز اپنے وقت پر ہلاک ہو رہی ہے اور ہو جانے والی ہے۔ سورج چاند ستارے بھی اللہ تعالیٰ کی مقررہ میعاد تک (**لِاَجَلٍ مُّسَمًّى**) اپنے اپنے مدار پر رواں رہیں گے۔ اور اجل مسمی کے آنے پر ہلاک کر دیئے جائیں گے' ختم کر دیئے جائیں گے۔
يُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے الفاظ مبارک میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہر کام کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی تھی اور اب بھی خود اکیلا تدبیر فرماتا چلا جا رہا ہے' نہ اس کا کوئی مشیر ہے نہ شریک کار ہے۔
بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ کے جملہ مبارکہ میں لقاء رب کے الفاظ انتہائی اہم ہیں۔ لقاء کا معنی ملنا اور ملاقات کرنا بھی ہے۔ اور سامنے پیش ہونا بھی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ جہاں جہاں بھی قرآن مجید میں لقاء اللہ' لقاء رب اور لقاء نا وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں' وہاں قیامت کے دن حضور الٰہی میں اس دنیا کی زندگی کے نیک و بد اعمال کی جوابدہی مراد ہے۔ قیامت کے دن ہی کے متعلق سورہ زمر میں آیا ہے کہ نافرمانوں جہنمیوں کو کہا جائیگا:
اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ط ۳۹/۷۱
کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے اللہ کے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر تمہارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمہیں اس (قیامت کے) دن کی ملاقات (حضور الٰہی میں اعمال کی جوابدہی) سے ڈراتے تھے۔ اس طرح سورہ کہف میں لقاء رب کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔
فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۱۸/۱۱۰ اس آیت مجیدہ میں بھی لقاء رب کا مرکب اضافی آیا ہے جس کا مفہوم' آیت مبارکہ کے سیدھے سادھے ترجمہ سے عیاں ہے' حضور الٰہی میں اعمال کی جوابدہی کیلئے حاضر ہونا۔ دیکھئے' سلیس ترجمہ یہ ہے۔ پھر جو شخص کہ اپنے رب کی ملاقات (یعنی اس کے حضور میں اعمال کی جوابدہی) کی امید رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اعمال صالح بجا لائے اور اپنے رب کی (عبادت) یعنی اس کی فرمانبرداری میں کسی ایک کو بھی شریک نہ کرے۔ پس لقاء اللہ کا صحیح مفہوم تو یہی ہے جو خود قرآن کریم نے تصریف آیات کے اپنے واضح اسلوب کے ذریعہ واضح کر دیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لقاء اللہ کے یہ غلط معنی لئے جاتے ہیں کہ قیامت کو اللہ کا دیدار ہوگا حالانکہ ۶/۱۰۳ میں اللہ تعالیٰ نے خود اعلان کر دیا ہے کہ اسے کوئی آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ **لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ**○ ۶/۱۰۳ اس آیت مجیدہ میں فعل تدرک کا فاعل الابصار لا کر یہ وضاحت کر دی گئی ہے۔
نہ اسے کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ اسے کوئی عقل پا سکتی ہے۔ وہ تمام آنکھوں کو دیکھتا بھی ہے اور تمام عقلوں کو پاتا بھی ہے۔ کیونکہ وہ انتہائی باریک بین بھی ہے اور انتہائی باخبر بھی ہے۔ اپنے ساتھیوں کے اصرار پر موسیٰؑ نے حضور الٰہی میں عرض کر دیا **رَبِّ اَرِنِيْ** اے میرے رب! مجھے اپنا آپ دکھا۔ لیکن جواب ملا **لَنْ تَرٰىنِيْ** ۷/۱۴۳ تو مجھے کبھی نہیں دیکھے گا واضح رہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو دیکھا ہے وہ ایک تو ۶/۱۰۳ کے الٰہی اعلان کی تکذیب کرتے ہیں' جو اس نے اعلان کر رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی آنکھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اور دوسرا یہ کہ وہ لوگ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی موسیٰ سلام علیہ سے بلند درجے کے حامل ثابت کرتے ہیں کہ موسیٰؑ کو تو جواب ملا کہ تو مجھے کبھی بھی نہیں دیکھ سکے گا' مگر

ہم موسیٰؑ سے افضل ہیں' ہم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے اور بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو دیکھا بھی ہے اور ہم دکھا بھی سکتے ہیں۔ یہ لاف زنی از روئے قرآن کریم فراڈ محض ہے۔ بلکہ یہ انسان اور اللہ کے درمیان جو حقیقی تعلق ہے' لوگوں کو اس سے برگشتہ کرنے کی ایک خطرناک سازش ہے۔ واضح رہے کہ انسان اور اللہ تعالیٰ کا تعلق صرف عابد و معبود کا ہے۔

انسان عابد اور اللہ تعالیٰ معبود ہے' یعنی انسان بندہ ہے اور اللہ آقا ہے۔ بندے کا کام ہے اپنے آقا کا حکم ماننا۔ زیر بحث آیت کے آخری جملے میں اسی چیز پر زور دیا گیا ہے **يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ** ۝ ۱۳/۲ وہ اللہ اپنی آیتوں کو خود کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کے حضور میں اپنے اعمال کی جوابدہی پر پورا پورا یقین رکھو۔ اگلی آیت مجیدہ میں باری تعالیٰ کی مزید صفات حمیدہ و عظیمہ مزید مشاہداتِ عالم یعنی مظاہر فطرت کی صورت میں پیش کی گئی ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳

(۳) اور وہی (اللہ ہی) ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے۔ اور ہر قسم کے میووں کے جوڑے اس (زمین میں) بنائے وہ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے۔ بلاشبہ مذکورہ بالا بیان میں اس قوم کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں (عبرت حاصل کرنے کو) جو (ان مظاہر فطرت پر) غور کرنے والے ہیں۔

مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا کے الفاظ میں مظاہر قدرت پر غور کرنے والوں کیلئے سب سے پہلی چیز زمین کا پھیلاؤ' پہاڑوں کا قیام اور دریاؤں کا بہاؤ پیش کیا گیا ہے۔ یہ تینوں چیزیں طبعی جغرافیہ سے متعلق ہیں۔ مفکرین وہ لوگ ہیں جو اس پر غور و فکر کرتے ہیں کہ زمین کا پھیلاؤ کس طرح ظہور پذیر ہوا۔ ہموار زمین سے ملحقہ سطح مرتفع کس طرح نمودار ہوئی اور پھر زمین پر پہاڑ کس طرح پیدا ہوئے' جن کی سربفلک چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ پھر زمین پر دریاؤں کا بہاؤ مظاہر فطرت پر غور کرنے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نشانیاں ہیں۔

ان الفاظ میں نوع انسانی کو مظاہر قدرت پر مسلسل غورو فکر کرنے کی تاکیدی دعوت دی گئی ہے' جس سے معلوم کر لیا گیا ہے کہ ہموار زمین کھیتی باڑی کیلئے پیدا کی گئی ہے۔ سطح مرتفع پر مشتمل علاقوں میں قدرتی ڈیموں کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ اور پہاڑوں کے اندر سونا' چاندی' تانبہ' لوہا' قلعی سیسہ اور کوئلہ وغیرہ کے ذخیرے خزانوں کی صورت میں محفوظ پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ گواہ ہے کہ مظاہر قدرت پر غورو تفکر کرنے والی قومیں اپنے غورو فکر کی بدولت ہموار زمین سے ہر موسم میں دو دو فصلیں حاصل کر رہی ہیں۔ سطح مرتفع میں سو سو مربع میل کی وسعت کے ڈیم تعمیر کر رہی ہیں اور پہاڑوں کے بطن سے سونا' چاندی' لوہا' کوئلہ وغیرہ کے بے پناہ خزانے حاصل کر رہی ہیں اس کے علاوہ قدرتی خزانوں میں دریاؤں کا خصوصی ذکر بھی آیا ہے۔ یہ غورو فکر ہی کا نتیجہ ہے کہ سونا پیدا کرنیوالی بنجر زمینیں دریاؤں کے پانی ہی کیساتھ سیراب کی جاتی ہیں' یعنی دریاؤں سے نہریں اور نہروں سے راجباہ اور کھال نکال کر دور افتادہ زمین کے بطن سے سونا اگلوایا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم غورو فکر اور عمل کرنے کے لئے ہے' محض ثواب تلاوت کیلئے نہیں۔

زمین' پہاڑوں اور دریاؤں پر غور کرنے کے بعد **وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ** کے الفاظ میں اس چیز پر دعوت تفکر دی گئی ہے کہ زمین میں پہاڑوں اور دریاؤں کی مدد سے جتنے بھی میوے پیدا ہوتے ہیں' سب جوڑا جوڑا پیدا

ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہ غیر متبدل قانون ہے کہ اس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ سورہ یاسین میں ارشاد ہوا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ○ ۳۶/۳۶

پاک ہے وہ ذات ہر قسم کے عیوب و نقائص سے جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے جو زمین پیدا کرتی ہے۔ اور خود انہیں (نوع انسانی) کو بھی جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ اور ہر اس چیز کو بھی جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے جسے یہ لوگ ابھی جانتے بھی نہیں۔

آیت زیر نظر میں ثمرات کے متعلق **جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ** کے الفاظ میں اس اصول کی خبر دی گئی ہے کہ اگر فصلوں اور پھلوں کی افزائش کیلئے جوڑے کے الہی اصول پر عمل کیا جائے تو خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے' جیسے کہ مادہ کھجور کے درخت میں نر کھجور کے گابھے لگانے سے کھجوروں کی فصل بہت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔

یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ کے الفاظ میں مظاہر قدرت پر غور کرنے والوں کیلئے اس چیز پر دعوت تفکر دی گئی ہے۔ کہ رات دن کے دائمی تغیر پر غور کرو کہ کس عظیم نظام کے ماتحت دن کی روشنی پر رات کو اندھیرا غالب آجاتا ہے اور اسی کے برعکس کس طرح رات کا اندھیرا پھٹ کر دن نمودار ہوتا ہے۔ یہی وہ دعوت تفکر ہے جس پر عمل کرنے سے اس سربستہ راز پر سے پردہ اٹھ چکا ہے کہ زمین کی محوری گردش سے دن رات پیدا ہوتے ہیں' سورج کے سامنے کا زمینی حصہ جب اوٹ میں چلا جاتا ہے وہاں دن کی روشنی پر رات کا اندھیرا غالب آجاتا ہے اور اوٹ والا حصہ جب سورج کے سامنے آتا ہے تو رات کے اندھیرے پر روشنی غالب آجاتی ہے۔ اگلی آیت مجیدہ میں عقلمندوں کیلئے غور و فکر کے مزید ارضی نشانات بیان کئے گئے ہیں:۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ④

(۴) اور زمین میں ٹکڑے ہیں (زمین کے) پاس پاس اور باغات ہیں انگوروں کے اور کھیت ہیں اور کھجور کے درخت ہیں ایک جڑ سے کئی کئی نکلے ہوئے اور الگ الگ جڑوں سے نکلے ہوئے۔ وہ سب کے سب ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم نے بعض پر ذائقے میں فضیلت دی ہے۔ یعنی ایک سے ایک افضل ہے۔ بلاشبہ اس بیان میں عقلمندوں کیلئے غور و فکر کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

اس آیت مجیدہ میں یہ امر قابل غور بتایا گیا ہے کہ زمین کے قطعات آپس میں ملے ہوئے ایک دوسری کیساتھ ساتھ موجود ہیں مگر ان کے خواص الگ الگ ہوتے ہیں۔ کھجوروں اور انگوروں کے باغ اور مختلف فصلوں کے کھیت اگرچہ ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں مگر ہر ایک کا ذائقہ الگ الگ اور ایک سے ایک افضل ہوتا ہے۔ کھجوروں کا مزہ اپنے مقام پر اور انگوروں کا ذائقہ اپنی جگہ پر افضل ہے۔ یہی حال کھیت کی فصلوں کا ہے کہ گندم' چاول' چنے' مونگ' ماش وغیرہ سب اپنی اپنی جگہ پر ذائقے اور مزے میں ایک دوسرے سے افضل ہیں۔ فصلوں اور پھلوں کا ناقص ہو جانا' نوع انسانی کی اپنی محنت میں کمی کی بدولت ہوتا ہے۔

ایک ہی زمین اور ایک ہی پانی کی عجیب و غریب مثال یہ ہے کہ گنے اور مرچ کے کھیت ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں مگر بیج کے خواص کی بدولت ہے کہ گنے میں مٹھاس جمع ہوتی چلی جاتی ہے اور مرچ میں کڑواہٹ۔ اس بیان میں بھی عقلمندوں کے لئے مظاہر قدرت کے بہت سے نشانات موجود ہیں۔ اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کے مخالفین کا قول باندازِ ذیل بیان ہوا ہے:۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۵

(۵) پھر (اے رسولؐ) اگر آپ (لوگوں کے انکار پر) تعجب کرتے ہیں تو (غور فرمایئے کہ) ان کا یہ قول بڑا عجیب ہے کہ کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئی تخلیق میں پیدا کئے جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا اور یہ وہی لوگ ہیں جن کی گردنوں میں (تقلید کے) طوق پڑے ہیں اور وہی لوگ آگ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

مدتوں کے مرے ہوئے انسانوں کا مرکر مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا کفار کو بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ ایمان کی پانچ شقیں ہیں ایمان باللہ' ایمان بالملائکہ' ایمان بالرسل' ایمان بالکتب اور ایمان بالقیامت یعنی مرنے کے بعد اس دنیا کی زندگی میں کئے گئے اعمال کی جوابدہی کیلئے دوبارہ پیدا کیا جانا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ کے الفاظ میں خبردی گئی ہے کہ قیامت کے منکر وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے رب کے یعنی اس کے نظام ربوبیت کے منکر ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو عوام کا استحصال کرکے پرائی محنت کے ماحصل پر عیش اڑاتے ہیں۔

انہیں ہزار سمجھایا جائے کہ نوع انسانی ایک ہی جماعت ہے اور ہر فرد کا پیدائشی حق ہے کہ اسے ضروریات زندگی متوازن انداز میں میسر آتی رہیں۔ مگر وہ اپنے بزرگوں کی تقلید کے پٹے پہنے ہوئے ہوتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ یہ معاشی اونچ نیچ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ ان کے اس آبائی عقیدے کو **اَلْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ** کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس آبائی عقیدے کو طوق کی صورت میں اپنی گردنوں میں ڈال رکھا تھا کہ جتنا چاہیں عوام کا استحصال کرلیں' قیامت کا عقیدہ ہی ناقابل قبول ہے کہ مرنے کے بعد مٹی میں مٹی ہو جانے کے باوجود دوبارہ کس طرح زندہ کیا جاسکتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ سے مراد اخروی ناکامی و نامرادی ہے۔ النار الجنۃ کی ضد ہے جنت میں ٹھنڈے سائے' ٹھنڈے پانی اور ضروریات زندگی کی فراوانی ہوگی اور النار میں گرم سائے' گرم پانی اور ضروریات زندگی کا فقدان ہوگا۔ جنت میں انگور' انار وغیرہ قسم کے میوے ہوں گے اور النار میں تھوہر کی قسم کے کڑوے کھانے ہوں گے جو حلق سے نہ اتر سکیں گے۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ سے مراد ہے اس وقت تک اس میں ہمیشہ رہیں گے' جب تک زمین و آسمان قائم ہیں ۱۰۷-۱۰۸/۱۱ میں پیچھے اس کی وضاحت گزر چکی ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی ذات صرف باری تعالیٰ کی ہے نہ زمین و آسمان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والے اور نہ انسان ہی دوبارہ زندہ ہونے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۶

(۶) اور (اے رسولؐ) یہ لوگ آپ سے بھلائی (الٰہی نعمتوں) کی بجائے برائی (عذاب) کیلئے جلدی کرتے ہیں۔ اور بیشک ان سے پہلے لوگوں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ بیشک تیرا رب لوگوں کیلئے ان کے ظلم (نافرمانی) کے باوجود بچاؤ عطا فرمانے والا ہے۔ اور تیرا رب جرائم کی سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

اس آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کی نافرمانیوں کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ بچاؤ کیلئے مہلت دیتا ہے لیکن جب اتمام

حجت کے بعد اس کا عذاب آجاتا ہے تو سزا دینے میں بہت سخت ہے۔ اگلی آیت مجیدہ میں مذکورہ لوگوں ہی کے متعلق مزید خبر دی گئی ہے:۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴿٧﴾

(۷) اور وہ کہتے ہیں جنہوں نے (ضابطہ الٰہی کا) انکار کیا کہ اس پر کیوں کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے نازل نہیں کی گئی۔ سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ آپ لوگوں کو ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اور ہر قوم کے کیلئے (ہماری طرف سے) ایک راہ دکھانے والا ہے۔

اس امر کی بارہا وضاحت کی جا چکی ہے کہ ۹۰ تا ۱۷/۹۳ میں آیا ہے کہ نبی اکرمؐ سے آپ کی قوم نے متعدد معجزے طلب کئے مگر آپ نے فرمایا **هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا**"۔ میں تو بشر رسول ہوں۔ اور ۱۹۔۳۰/۲۴ میں اللہ تعالٰی نے مشاہدات عالم ہی کو اپنی آیات (معجزات) قرار دیا ہے کہ اللہ تعالٰی کا معجزہ ہے۔ کہ پہلے اس نے نوع انسانی کو زمین میں سے پیدا کیا' پھر اس کی افزائش نسل نطفہ سے ٹھہرائی۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اس کا معجزہ ہے۔ بجلی کی چمک اور آسمان سے بارش برسانا اس کا معجزہ ہے۔ آسمانوں کا اور زمین کا اللہ کے قانون کے مطابق اپنے مدار پر قائم رہ کر محوِ گردش رہنا اس کا معجزہ ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم کی رو سے مشاہدات عالم' مظاہر فطرت کی ہر چیز اللہ کا معجزہ ہے لیکن نبی اکرم سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ آپ اس کے خلاف کرکے دکھایئے۔ مگر جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ تو لوگوں کو ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اور اسی طرح کے ایک ہادی ہیں' جس طرح ہر قوم کے لئے ایک ہادی بھیجا گیا تھا۔

اگلی آیت میں اس امر کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ رحم مادر سے جو بچے اصل حالت سے کم یا زیادہ حالت میں پیدا ہوتے ہیں' نہ یہ کسی کی بد دعا کا اثر ہوتا ہے اور نہ کسی تعویذ اور دم وغیرہ کی بدولت ہوتا ہے' بلکہ رحم مادر میں بعض ایسے واقع ہو جاتے ہیں کہ بیمار رحم بچے کے بعض اعضاء کی پوری نشوونما نہیں کر پاتے۔ مثلاً" ٹیڑھے پیروں والے بچے پیدا کرتے ہیں یا بعض دفعہ سر کے ساتھ زائد گوشت کا لوتھڑا لٹکتا ہوا پایا جاتا ہے یا چھوٹے سر والا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ جسے شاہ دولہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ رحمی بیماری کی بدولت ہوتا ہے۔ ایسی ماؤں کے رحم کا علاج کیا جانا ضروری ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

اللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ أُنثَىٰ وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۖ وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ ﴿٨﴾

(۸) اللہ جانتا ہے جو ہر مونث حمل اٹھاتی ہے اور (وہ جانتا ہے) جو مونثوں کے رحم (بچے کی نشوونما میں) کمی کر دیتے ہیں اور جو کچھ زیادتی کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ہاں ہر چیز اس کی مقررہ مقدار (قانون) کے مطابق عمل میں آتی ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ﴿٩﴾

(۹) وہ جاننے والا ہے ہر اس چیز کو (جو تمہارے لئے) غائب ہے یا حاضر ہے۔ وہ بہت بڑا ہے۔ اور وہ بہت عالیشان ہے۔

سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَن جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ﴿١٠﴾

(۱۰) برابر ہے تم میں سے جو کوئی چھپ کر بات کرے یا اسے پکار کر کہے اور جو کوئی رات (کے اندھیرے میں) چھپا ہوا ہو اور یا وہ دن (کی روشنی میں چل رہا ہو) (اس کے لئے سب برابر ہیں)

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۤءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪

(۱۱) واسطے (ہر شخص کے ہیں پیچھے پیچھے آنیوالیاں' اس کے آگے اور پیچھے اس کے (اعمال کو) محفوظ کرتے ہیں وہ اللہ کے قانون کے مطابق بیشک اللہ تعالیٰ نہیں حالت تبدیل کرتا کسی قوم کی' جب تک کہ وہ لوگ (اپنی اچھی یا بری) حالت کو خود تبدیل نہ کریں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم (کی بد اعمالیوں کی بدولت) اس کے لئے برائی کا ارادہ کرے تو پھر اس کے زوال کو کوئی روک نہیں سکتا۔ ان کے لئے اس کے سوا کوئی مدد گار نہیں۔

مُعَقِّبٰتٌ کا سہ حرفی مادہ ع-ق-ب = عقب ہے اور معقّب کا معنی ہے پیچھے پیچھے آنیوالا۔ اور اس کی مونث ہے معقبہ اور معقبات اس کی جمع ہے بمعنی پیچھے پیچھے آنے والیاں۔ یہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخفی قوتیں ہیں جو ہر انسان کے اعمال کو خود اس کی اپنے ذہن کی تختی (لوح) پر لکھی جاتی ہیں۔ انہی کے لئے یہاں **يَحْفَظُوْنَهٗ** بصیغہ جمع مذکر آیا ہے کہ وہ ان کے اعمال کو لکھ کر محفوظ کرتے ہیں۔ نیز ۱۰-۱۱/۸۲ میں انہی کے متعلق آیا ہے:۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ اور بیشک تم پر مسلط ہیں تمہارے اعمال محفوظ کرنے والے معزز لکھنے والے ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں انہی اعمالناموں کے متعلق بتایا گیا ہے۔ **وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ○ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا** ○ ۱۳-۱۴/۱۷ اور ہم نے ہر انسان کا عمال نامہ اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے۔ اور ہم اس کے لئے اسے قیامت کے دن کھلی کتاب کی صورت میں اس کے سامنے پیش کریں گے (اور اسے کہا جائیگا کہ) اپنی کتاب (اپنے اعمال نامے) کو خود پڑھ لے۔ آج کے دن تیرے اعمال کے حساب کے لئے (یہ تیرا اپنا اعمال نامہ) کافی ہے۔

آیت زیر بحث ۱۱/۱۳ میں **يَحْفَظُوْنَهٗ** آیا ہے اور ۱۰/۸۲ میں **لَحٰفِظِيْنَ** آیا ہے۔ ان الفاظ سے بعض مترجمین نے یہ معنی لیا ہے کہ ملائکہ ہر شخص کے آگے پیچھے رہتے اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ بقول مترجمین ہر انسان کے آگے پیچھے محافظ ملائکہ موجود بھی ہوتے ہیں اور ان کی موجودگی میں ہی حادثات کا وقوع ہوتا رہتا ہے' کسی کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے اور کسی کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے۔ حالانکہ خود الفاظ قرآنیہ کی حاکیت اور تصریف آیات کی مدد سے آیات بالا میں حفاظت سے لوگوں کی جسمانی حفاظت مراد نہیں بلکہ ان کے اعمال کو اعمال ناموں میں محفوظ کرنا یعنی لکھنا مراد ہے۔

يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ کے الفاظ میں **مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ** سے مراد اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے مطابق ہے۔ جس کی تفصیل اوپر ۱۳-۱۴/۱۷ میں گزر چکی ہے کہ ہر شخص کا اعمال نامہ لکھی ہوئی کتاب کی صورت میں ہر شخص کی گردن میں لٹکا دیا گیا ہے' جسے آج بھی ہر شخص باآسانی پڑھ سکتا ہے' خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا مطلق ان پڑھ ہو۔ اور قیامت کے دن تو **فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ** ۲۲/۵۰ کے مطابق اس کی نظر بہت تیز ہو جائیگی۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی نمایاں الفاظ کے ساتھ لکھا ہوا پائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے جملہ مبارکہ میں قوموں کے عروج و زوال کو خود ان کے اپنے اعمال کیساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے کہ جو قومیں قعر مذلت میں جا گرتی ہے وہ اپنی ہی بد اعمالیوں کی بدولت شکست خوردہ

اور ذلیل و خوار ہو جاتی ہیں اور جو قومیں عروج کے بام ثریا پر پہنچ جاتی ہیں وہ بھی اپنے اچھے اعمال کی بدولت مقام بلند کو پالیتی ہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کا کسی قوم کے ساتھ کوئی بیر ہے کہ اسے بلا وجہ زوال پذیر کر دے اور نہ کسی قوم کے ساتھ خصوصی محبت ہے کہ اسے بلاوجہ بام عروج پر پہنچا دے۔

نمبر۴ **وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَّ لَهُ** کے جملہ مبارکہ میں یہ تصور محذوف ہے کہ جب کوئی قوم زوال کی راہ پر خود گامزن ہو جاتی ہے تو پھر جب اللہ تعالیٰ اس کے اپنے عملوں کی بدولت اس کے لئے برائی کا' یعنی زوال کا ارادہ کرتا ہے تو پھر اس کے زوال کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس سے آگے زوال یافتہ قوم کے لئے ارشاد فرمایا ہے:۔ **وَمَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَالٍ** ان الفاظ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ان کے لئے اللہ کے سوا کوئی مدد گار نہیں۔ لیکن مفہوم یہ ہے کہ زوال یافتہ قوم اس وقت تک اس ذلت سے نہیں نکل سکتی جب تک اللہ تعالیٰ کو اپنا مدد گار نہ بنا لے۔ یعنی اس کے اس قانون پر عامل ہو جائے جو خود اس نے زوال سے نکلنے کے لئے مقرر کر رکھا ہے کہ قوم کا ہر فرد فوجی سپاہی بنے اور اجتماعی طور پر زیادہ سے زیادہ فوجی قوت مہیا کی جائے ۸/۶۰

اگلی آیت مجیدہ میں پھر مظاہر فطرت کی طرف رخ کرکے رب العلمین کی تعریف ایک خصوصی انداز میں لائی گئی ہے:۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿١٢﴾ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَن يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ﴿١٣﴾

(۱۲) وہی (اللہ ہی) ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے خوف کی حالت میں اور طمع کی حالت میں۔ اور چلاتا ہے بھاری بادلوں کو

(۱۳) اور اپنا فرض منصبی ادا کرتی ہے گرج اس کی حمد کیساتھ عملاً" اور خصوصاً" اس کی تمام مخفی قوتیں اس کے خوف کیساتھ اپنے اپنے فرائض منصبی ادا کر رہی ہیں اور وہ اللہ بھیجتا ہے بجلیاں پھر وہ انہیں پہنچاتا ہے جسے اپنے قانون مشیت کے مطابق چاہتا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ سخت قوت والا ہے۔

آج سے چودہ سو سال پیشتر بجلی کے متعلق بتا دیا گیا تھا کہ بجلی میں صرف خوف ہی نہیں بلکہ اس میں طمع یعنی فائدے بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے قانون فطرت کے مطابق پانی کے سمندروں جیسے بھاری بادلوں کو ہوا کے کندھوں پر سوار کرکے چلاتا ہے۔

يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ کے الفاظ **يُسَبِّحُ** کا یہ معنی ہے کہ یہ جملہ کائناتی قوتیں اپنے اپنے فرض منصبی نہایت خوش اسلوبی کیساتھ ادا کر رہی ہیں۔

وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ کے جملہ مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ لوگ اس اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں جس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مذکورہ مہیب و شدید قوتیں شبانہ روز مصروف عمل ہیں اور جو شدید المحال ہے' جو سخت قوت والا ہے' جس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔

اگلی آیت مجیدہ میں بتایا گیا ہے اپنی مشکلات میں صرف اللہ ہی کا پکارنا صحیح ہے' لوگ جنہیں اس کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز نہیں دے سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ بڑھائے کہ پانی اس کے منہ میں آجائے مگر وہ اس طرح کبھی بھی اس کے منہ میں آنیوالا نہیں ہے۔ کافروں کی پکار جو غیر اللہ سے مانگتے ہیں' سراسر گمراہی ہی گمراہی ہے:۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾

(۱۴) سچی پکار صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ اور جو اللہ کے سوا غیروں سے مرادیں مانگتے ہیں وہ ان کے لئے ان کی دعا کو کچھ بھی قبول نہیں کرتے سوائے مانند اس شخص کے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہوتا ہے' اس لئے کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ حالانکہ وہ (اس کے منہ تک خود بخود) پہنچنے والا نہیں ہے اور نہیں ہے کافروں کی پکار (غیر اللہ سے) مگر وہ گمراہی ہی میں ہے۔

(۱۵) اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی جاندار ہیں سب اللہ کی فرمانبرداری کر رہے ہیں خوشی کیساتھ اور ناخوشی کیساتھ اور ان کے سائے صبح کے وقت اور پچھلے پہر فرمانبرداری کرتے ہیں (یعنی صبح کے وقت ان کے سائے مغرب کی طرف ہوتے ہیں اور پچھلے پہر مشرق کی طرف)۔

آسمانوں اور زمین کا ہر جاندار اللہ کے حضور سجدہ ریز ہے' اس کا مفہوم یہ ہے کہ سب اس جبلی حکم الہٰی کے ماتحت مصروف عمل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ودیعت فرمایا ہے۔ اس پر **طوعاًوّ کرھًا** کی قید لگا دی گئی ہے۔ ہر جاندار کسی ایک جبلت پر پیدا کیا گیا ہے۔ مثلاً" گھوڑا دوڑنے کے لئے اور گدھا بوجھ اٹھانے کے لئے ہے دیکھئے یہ اگر خوشی سے اپنا فرض ادا نہیں کرتے تو ڈنڈوں اور چھانٹوں کے ساتھ ہانکے جاتے ہیں۔ ہر جاندار حضرت انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا گیا ہے جسے وہ طوعا" اور کرھا انجام دے رہا ہے خوشی کے ساتھ یا ناخوشی کے ساتھ۔

ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ کے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ صرف وہ ہی اللہ کے فرمانبروار نہیں بلکہ سورج جیسا عظیم کرہ بھی اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہے کہ جس مدار پر اسے اللہ تعالیٰ نے چلا دیا ہے وہ اسی پر بدستور چلتا چلا آرہا ہے۔ جس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ ہر جاندار سمیت ہر چیز کا سایہ صبح کے وقت یعنی قبل دوپہر مغرب کی طرف ہوتا ہے اور بعد دوپہر مشرق کی طرف ہو جاتا ہے اگلی آیت مجیدہ میں نبی اکرمؐ کو حکم ہوا ہے کہ غیر اللہ کو پکارنے والوں سے ذیل کا سوال کریں اور خود ہی ذیل کا جواب دیں:۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِیْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَیْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

(۱۶) کہہ دیجئے (اے رسولؐ) کون ہے آسمانوں اور زمین کی مخلوق کا رب (رزق کا سامان مہیا کرنیوالا) خود ہی فرما دیجئے' اللہ اللہ ان سے پوچھئے کیا تم نے اللہ کے سوا کوئی اور مدد گار بنا لئے ہیں جو خود اپنی جانوں کیلئے بھی نہ کسی نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے۔ (مزید) پوچھئے! کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہیں۔ یا کیا اندھیرا اور روشنی برابر ہیں۔ کیا ٹھہرا لئے ہیں انہوں نے واسطے اللہ کے شریک کہ انہوں نے اس (اللہ) کی مخلوق جیسی مخلوق پیدا کی ہے۔ پھر ان پر (ان کے شریکوں کی مخلوق) مشتبہ ہوگئی ہے۔ کہہ دیجئے (اے رسول! کہ) اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور اکیلا ہے وہ قوت والا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی مخلوق کا سامان ربوبیت مہیا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لوگوں نے جو اس کے سوا اور اپنے مددگار اور مرادیں دینے والے ٹھہرا لئے ہیں وہ اپنی جانوں کیلئے بھی کسی نفع اور نقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

مشکل وقت میں مددگار وہی ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔ جو لوگ پیدا نہیں کرتے' نہ وہ مددگار ہوسکتے ہیں اور نہ غائبانہ مدد کر سکتے ہیں۔ آیت مجیدہ میں استفہامیہ انداز میں بتایا گیا ہے کہ کیا لوگوں کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے کوئی مخلوق پیدا کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں خلط ملط ہوگئی ہے سورہ حج ۷۳-۷۴/۲۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ لوگوں کو ٹھہرائے ہوئے مددگار' اگر سب کے سب مل کر بھی کوشش کریں تو ایک مکھی تک نہیں بنا سکتے۔ بلکہ مکھی جو ان سے چھین کر لے جاتی ہے۔ وہ اس سے واپس بھی نہیں لے سکتے۔ اگلی آیت میں مزید ارشاد ہوا ہے:۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿۱۷﴾

(۱۷) وہ (اللہ تعالیٰ) آسمان سے پانی نازل کرتا ہے پھر اس سے ندیاں بہ نکلتی ہیں اپنے اندازے کے مطابق۔ پھر سیلاب' جھاگ اوپر لاتا ہے۔ اور جسے زیور یا دوسرے سامان بنانے کیلئے آگ میں تپاتے ہیں اسی طرح (وہ بھی جھاگ کو اوپر اٹھا دیتا ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ حق اور باطل کو بیان کرتا ہے۔ پھر جو جھاگ ہے وہ (بیکار ہوتا) رائیگاں جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کیلئے فائدہ مند ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے۔ (سیلاب کے پانی کی جھاگ ضائع جاتی اور پانی کھیتوں کو سیراب کرنے لئے ڈیموں' دریاؤں اور نہروں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ مثالیں بیان کرتا ہے۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾

(۱۸) بھلائی ہے واسطے ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے رب کی بات مانی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اس کی بات نہ مانی' اگر ان کے پاس وہ پوری دولت ہو جو زمین میں ہے ساری اور اس جتنی اور بھی ہو' وہ اسے فدیہ میں دیں کہ (ان کی نجات ہو جائے) وہ' وہ لوگ ہیں کہ ان کا برا حساب ہوگا (ان کا نتیجہ غلط نکلے گا) اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ بری جگہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ ماننے کا نتیجہ اس قدر برا بتایا گیا ہے کہ اگر وہ زمین بھر کی اور اس کی مثل مزید دولت بھی فدیہ میں دیں تو پھر بھی جہنم رسید کئے جائیں گے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مانتے ہیں ان کا نتیجہ اچھا ہوگا اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں بامراد اور کامیاب و کامران ہوں گے۔ اگلی آیات کریمات میں انہی فرمانبرداروں کو اللہ کا عہد پورا کرنے والے قرار دیا گیا ہے۔

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

(۱۹) کیا پھر جو شخص جانتا ہو کہ (اے رسولؐ) آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ برحق ہے۔ کیا وہ اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہے سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ نصیحت صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

(۲۰) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اللہ کیساتھ کیا ہوا عہد پورا کرتے ہیں اور وہ پکے عہد کو توڑتے نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾

(۲۱) اور یہ وہی لوگ ہیں جو ان چیزوں کو ملاتے ہیں جن کے ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں (نیک عمل بجا لاتے ہیں) اور برے حساب سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

(۲۲) اور یہی وہ لوگ ہیں جو مستقل مزاج رہے اور اپنے رب کی رضا تلاش کی (نظام ربوبیت قائم کیا) یعنی اجتماعی نظام قائم کیا اور (اس کے استحکام کیلئے) اس مال میں جو ہم نے انہیں دیا پوشیدہ خرچ کیا اور ظاہر بھی۔ اور وہ برائی کو نیکی کیساتھ دور کرتے ہیں یہی وہ ہیں کہ ان کا آخری گھر اچھا ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

(۲۳) وہ باغات ہوں گے۔ وہ ان میں داخل ہوں گے اور ان کے آباؤ اور ان کی بیویاں اور ان کی اولاد بھی جنہوں نے اصلاح کے کام کئے۔ ان پر ہر دروازے سے نیک لوگ داخل ہوں گے۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

(۲۴) (وہ انہیں کہیں گے) سلٰم علیکم (تم پر سلامتی ہو' اسلئے کہ تم مستقل مزاج رہے۔ پس ان کا آخرت کا گھر اچھا ہے۔

اگلی آیات کریمات میں ان کے بر خلاف اللہ کیساتھ کئے گئے پکے عہد کو توڑنے والوں کے متعلق بالفاظ ذیل ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

(۲۵) اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کئے گئے عہد کو اسے پکا کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان چیزوں کو قطع کر دیتے ہیں جن کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں ملایا جائے اور وہ زمین میں فساد کرتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے لئے (اللہ تعالیٰ کی) لعنت ہے اور ان کے لئے آخرت کا برا گھر ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ کے جملہ مبارکہ میں ان لوگوں کا ذکر لایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ پکا عہد کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ اور:۔

اور انہی لوگوں کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے: **وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ**۔ اور وہ ان چیزوں کو منقطع کر دیتے ہیں جن کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کا باہم وصل کیا جائے۔

ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔ **اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ** یہ وہ لوگ ہیں کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لئے آخرت کا برا گھر ہے۔ واضح رہے کہ انہی لوگوں کے متعلق جو باری تعالیٰ کے ساتھ پکا وعدہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان چیزوں کو منقطع کر دیتے ہیں جن کا باہم ملانے کا حکم دیا گیا ہے' سورہ بقرہ کی آیت نمبر

۲۶-۲۷ میں ارشاد ہوا ہے:-

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ ۲۶-۲۷/۲ اللہ تعالیٰ اس (قرآن) کیساتھ گمراہ پاتا ہے بہتوں کو اور ہدایت یافتہ پاتا ہے بہتوں کو اور وہ گمراہ نہیں پاتا مگر فاسقوں (اللہ کی حدیں پھاندنے والوں) کو جو اللہ کے ساتھ پکا عہد کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان چیزوں کو منقطع کر دیتے ہیں جن کو باہم وصل کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کیساتھ کیا گیا پکا عہد:- قرآن مجید کی قاری اس کی پہلی سورت مجیدہ فاتحہ شریف ہی میں اللہ تعالیٰ کیساتھ پکا عہد کرتے ہیں:- **اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ** ۴/۱ (اے اللہ) ہم صرف تیری ہی فرمانبرداری کریں گے اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگیں گے۔ لیکن اس پکے عہد کو توڑنے کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ کے سوا غیراللہ کی فرمانبرداری کی جائے اور غیراللہ سے مدد مانگی جائے۔

عبادت و استعانت کا وصل کرنے کا حکم:- وہ کونسی چیزیں ہیں جن کا باہم وصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس آیت مجیدہ ۴/۱ میں موجود ہے کہ عبادت و استعانت میں وصل کیا جائے یعنی جس ذات کی عبادت کی جائے اسی سے مدد مرادیں مانگی جائیں۔ اس وصل کے انقطاع کی عملی صورت یہ ہے کہ صلوٰۃ موقت تو پڑھی جائے اللہ کی اور مرادیں مانگی جائیں زندہ یا مردہ بزرگوں سے۔ العیاذ باللہ! ایسے لوگوں کے متعلق ۲۵/۳ میں **لَهُمُ اللَّعْنَةُ** کی خبر دی گئی ہے اور ۲/۲۶ میں انہیں گمراہ اور فاسق قرار دینے کیساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کے ساتھ گمراہ ہو جاتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے گئے پکے عہد کو قرآن کی سند کے ساتھ توڑتے یعنی غیراللہ سے مدد مرادیں مانگتے ہیں۔ اور عبادت و استعانت کے وصل کا جو حکم دیا گیا ہے اسے قرآنی سند کے ساتھ منقطع کرتے ہیں یعنی صلوٰۃ موقت اللہ کی پڑھتے ہیں اور مدد مرادیں غیراللہ سے مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کا یہی حکم ہے۔ العیاذ باللہ!

اگلی آیت مبارکہ میں مساوی و متوازن تقسیم رزق کے الٰہی قانون کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ فساد کی جڑ رزق کی غیر متوازن تقسیم ہی ہے۔ لیکن بتایا گیا ہے کہ لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہوتے ہیں کہ انہیں ناجائز طریقوں کیساتھ زیادہ سے زیادہ مال اکٹھا کرنے کی عام اجازت ہو۔ دیکھئے ارشاد ہوا ہے:-

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

(۲۶) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو یا تو فراخ رزق دیتا ہے سب کے سب کو یا اندازے کا دیتا ہے سب کے سب کو جو (ایسا نظام قائم کرکے) خود چاہتے ہیں (کہ اگر ملک میں وافر رزق موجود ہو تو سب کو وافر ملے اور اگر اندازے کا ہو تو سب کو اندازے کا ملے) مگر لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہیں حالانکہ آخرت کے مقابلے پر دنیا کی زندگی صرف چند روزہ سامان زیست ہے۔

(**لِمَنْ يَّشَآءُ** میں مَنْ جمع کیلئے آیا ہے اور **يَشَآءُ** کا فاعل من ہے)

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ کے جملہ مبارکہ کی بحث کو انتہائی توجہ کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔ کیونکہ عام تراجم میں اس کا یہ معنی لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بافراط رزق عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ رزق دیتا

ہے۔ اس آیت مجیدہ کا یہ مفہوم قرآن کریم کی مرکزی تعلیم' ربوبیت عالمینی اور اللہ کی کتاب لاریب کی اولین آیت مجیدہ الحمد للہ رب العالمین کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ بلا تمیز اعلیٰ و ادنیٰ سب کی ربوبیت کا سامان مہیا کرنے والا ہے۔ نیز مذکورہ روایتی ترجمہ اللہ تعالیٰ کو غیر عادل بلکہ ظالم ٹھہراتا ہے کہ اس نے کسی کو رزق وافر دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے اور کسی کا بلا وجہ رزق تنگ کرنے کا اعلان فرما دیا ہے۔ پھر اس جملہ مبارکہ میں جو **يَبْسُطُ الرِّزْقَ** کے مقابلے پر **يَقْدِرُ** آیا ہے۔ **يَقْدِرُ** کا لفظی معنی اندازے کے مطابق دینا ثابت ہے۔ اس کا معنی رزق کو تنگ کر دینا مراد لینا' عربی ادب کا خون کرنے کے مصداق بھی ہے اور انسان کے پیدائشی بنیادی حقوق کے غصب کے جرم عظیم کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کا کھلا ارتکاب ہے۔

حقیقت حال یہ ہے۔ ○ انسانی ضروریات زندگی کو اللہ تعالیٰ نے مستقر اور متاع کے دو حصوں میں تقسیم فرمایا ہے اور سورہ بقرہ اور اعراف میں دو جگہ پر نوع انسانی کی ابتدائی پیدائش کا ذکر کرکے اس کے پیدائشی بنیادی حقوق کا اعلان بالفاظ ذیل کر دیا۔

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ○ ۲/۳۶ + ۷/۲۴ اور (اے نوع انسانی!) تیرا بنیادی پیدائشی حق ہے کہ تجھے مرتے دم تک کیلئے اسی زمین میں رہنے کو بلا کرایہ مکان میسر ہو اور ضروریات زندگی خوراک' لباس' علاج اور تعلیم کا باقاعدہ اور مسلسل انتظام قائم ہو ---- بلاغ القرآن کے صفحات میں بار بار وضاحت کی جا چکی ہے کہ ہر فرد انسانی کی بنیادی ضروریات زندگی خوراک' لباس' علاج اور تعلیم کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہے جیسے کہ امیرالمومنین عمرؓ کے یہ تاریخی الفاظ بھی اس پر بطور سند موجود ہیں کہ اگر دریائے دجلہ کے کنارے پر کوئی کتیا بھی بھوکی رہ گئی تو قیامت کو مجھ سے پوچھا جائیگا کیوں بھوکی رہی؟

جملہ مبارکہ **اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ** کا جو معنی ہم نے لکھا ہے اس کی وضاحت تصریف آیات اور سیاق و سباق کلام کی تصدیق کے ساتھ پیش خدمت ہے' بغور ملاحظہ فرمائیں۔ واضح رہے کہ جملہ مبارکہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر نازل کیا گیا ہے۔ جن میں سے چند مقامات پیش خدمت ہیں:۔

سورہ شوریٰ میں اصولاً" بیان فرمایا ہے:۔ **لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** ○ ۴۲/۱۲ واسطے اللہ ہی کے ہیں چابیاں آسمانوں کی اور زمین کی۔ وہ اس گروہ کو جو خود چاہتا ہے (یعنی جو اللہ کے قانون مشیت کے مطابق متوازن نظام قائم کرتا ہے) یا تو سب کو وافر رزق عطا فرماتا ہے اور یا اندازے کا (تنگ اور ناہموار رزق نہیں دیتا) بلا شبہ وہ ہر چیز کا پورا پورا اور صحیح صحیح علم رکھنے والا ہے۔ (وہ جانتا ہے کہ نوع انسانی میں رزق کے مساوی نظام کے بغیر امن قائم نہیں رہ سکتا ہے)

واضح رہے کہ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ ہر ریاست میں ایسا نظام قائم ہو کہ اگر ملک میں وافر رزق موجود ہے تو ہر فرد ریاست کو وافر رزق دیا جائے اور اگر اندازے کا رزق موجود ہے تو اندازے کا رزق دیا جائے۔ نہ تو تنگ رزق دیا جائے اور نہ عدم توازن ہو کہ ارباب حکومت کو تو رزق با افراط دیا جا رہا ہو اور عوام کو رزق کی تنگی میں مبتلا کر دیا جائے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ تقسیم رزق مرکزی حکومت کے ذمہ ہے۔ چنانچہ سلیمانؑ کو عطاء حکومت کے بعد ارشاد ہوا ہے **هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ** ○ ۳۸/۳۹ اے سلیمان! یہ (حکومت) ہماری بے حساب بخشش ہے۔ (اب یہ تمہارے ذمہ ہے کہ) آپ عوام پر احسان کریں (مساوی تقسیم رزق کریں) یا (اپنے خاندان اور ملازم عملے کیلئے) روک لیں۔ سلیمانؑ نے مساویانہ تقسیم رزق کا نظام قائم کیا۔

اسی طرح سورہ قصص میں فرعون کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اس نے حکومت کی عطاء بے حساب کے بعد ملکی اور غیر ملکی کی تقسیم قائم کرکے بنی اسرائیل کو ان کے بنیادی حقوقِ ربوبیت سے محروم کر دیا تھا۔ **اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا** " **يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ** ۲۸/۴ بیشک فرعون نے اپنے ملک میں سرکشی اختیار کی اور اپنے ملک میں بسنے والوں کے طبقے بنا دیئے۔ ایک طبقے (بنی اسرائیل) کو کمزور کر دیا ---- ان قرآنی دلائل قاطعہ کے مطابق ثابت ہوا کہ مرکزی حکومت کے ذمہ ہے کہ وہ عوام کو ایک سطح پر رکھے اور سب کو ضروریات زندگی مساویانہ انداز میں بہم پہنچائے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے، عوام کے بعض کو نوازے اور بعض کو محروم ربوبیت کر دے تو یہ مرکزی حکومت کا فعل ہے اللہ تعالیٰ کا نہیں۔ مساویانہ تقسیم رزق نبوی نظام ہے اور ناہموار تقسیم رزق فرعونی تقسیم ہے۔

۲ سورہ قصص ہی میں قارون کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے غدار قوم تھا جو حکومت کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل یعنی اپنی قوم کے ساتھ غداری کرکے ان کے استحصال میں حکومت کا ٹاؤٹ بنا ہوا تھا۔ حکومت نے اسے اس قدر مال و دولت سے سرفراز کر رکھا تھا کہ جب وہ رزق برق لباس پہن کر نکلتا تو لوگ رشک کرتے ۷۷-۲۸/۷۸ لیکن جو لوگ صاحب علم تھے انہوں نے کہا کہ تباہی ہے تمہارے لئے جو رشک کرتے ہو۔ اللہ کا قانون بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ بالآخر جب قارون پر عذاب الٰہی آیا اور اسے اس کے گھر سمیت زمین میں غرق کر دیا گیا تو جو لوگ کل تک اس پر رشک کرتے تھے کہنے لگے:۔ **وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ج لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ط وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ** ○ ۲۸/۸۲ افسوس ہے تجھ (قارون) پر بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ان کو رزق فراخ دیتا ہے یا اندازے کا جو خود (اس کے قانون پر عمل کرکے) خود چاہتے ہیں۔ افسوس ہے تجھ (قارون) پر، بیشک شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو کامیاب نہیں کرتا۔

غور فرمائیں! یہاں قارون کے ذکر میں بھی **اِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ** آیا ہے۔ اگر اس کا یہ معنی صحیح ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے رزق فراخ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے تو اس کے مطابق اس نے قارون کو خود ہی اپنے ضابطے کا کافر ٹھہرا کر غرق کیوں کر دیا؟ اس سے ثابت ہوا کہ روایتی ترجمہ غلط ہے اور صحیح ترجمہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اسی گروہ کو یا فراخ رزق دیتا ہے اور یا اندازے کا، جو خود ضابطہ الٰہی پر عمل کرکے ایسا نظام قائم کرتے ہیں کہ اگر ملک میں رزق فراخ موجود ہے تو سب کے سب کو فراخ رزق ملے اور اگر ملک میں اندازے کا رزق ہے تو سب کے سب کو اندازے کا رزق ملے۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ملک میں رزق ہی کم ہو تو پھر ضابطہ الٰہی کے مطابق غلے کا ملک میں مہیا کرنا سربراہ مملکت کا فرض ہے چنانچہ دورِ یوسفی میں شاہِ مصر کو اپنے فرض منصبی کا اس قدر خیال تھا کہ خواب میں بھی اسے اسی چیز کا فکر رہتا تھا کہ ملک میں غلے کی کمی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس کے فرض منصبی کی پابندی ہی کا نتیجہ تھا کہ اسی خواب میں بتا دیا گیا کہ سات سال خوب بارشیں ہوں گی اور پھر سات سال خشک سالی ہوگی۔ اس لئے پہلے سات سالوں میں چودہ پندرہ سالوں کیلئے غلہ پیدا کرکے جمع کر لو۔ چنانچہ اس فرض شناس بادشاہ نے چودہ پندرہ سالوں کیلئے غلہ پیدا کروایا اور اس اہم مہم کی تکمیل یوسفؑ کے دست مبارک سے انجام پائی۔ جو سربراہِ سلطنت اپنے اس فرض سے غافل ہو، اس کی حکومت کا تختہ فوراً الٹ جاتا ہے اور کوئی فرض شناس سربراہ برسرِ اقتدار آجاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب پاکستان غلے میں خود کفیل نہیں تھا تو حکومت غیر ممالک سے گندم منگا کر ملک میں غلے کے ذخیرے مہیا کیا کرتی تھی۔

غلہ مہیا کرنے کی ذمہ داری کے بعد مرکزی حکومت کا فرض منصبی ہے کہ تقسیم رزق اور تقسیم ضروریات زندگی کا ایسا نظام قائم کرے کہ اگر ملک میں فراخ رزق موجود ہے اور فراخ ضروریات زندگی موجود ہیں تو ملک کے ایک ایک بشر کو فراخ رزق اور فراخ ضروریات زندگی ملتی رہیں اور اگر اندازے کا رزق یا اندازے کی ضروریات زندگی موجود ہیں تو سب کے سب افراد مملکت کو اندازے کا رزق اور اندازے کی ضروریات زندگی ملا کریں۔

۳ سورہ سبا میں آیت زیر بحث دو مرتبہ آئی ہے:۔ **وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ○ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○** ۳۴/۳۹ تا ۳۴

(مفہوم) اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں اپنا کوئی نذیر (نبی رسول کہ اس نے نظام ربوبیت کی دعوت دی) مگر اس بستی کے استحصال کرنیوالوں نے کہا کہ جس چیز کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو' ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے کہا کہ ہم مال اولاد میں کثرت میں ہیں (باقی لوگ ہم میں سے مال اور اولاد میں کمزور ہیں) اس لئے ہم کو عذاب نہیں دیا جائیگا۔ آپ کہہ دیں کہ (تمہارا مال غریبوں کے استحصال کا نتیجہ ہے) میرا پروردگار اپنے قانون مشیت کے مطابق اپنے بندوں میں سے انہیں (جو خود متوازن نظام قائم کر کے "عملاً" چاہتے ہیں) یا تو بافراط رزق عطا کرتا ہے سب کو یا اندازے کا رزق دیتا ہے سب کو اور نوع انسانی کی اکثریت اس الہی حقیقت کو نہیں جانتی اور استحصال کے ذریعہ جمع کردہ تمہارے مال اور اس حرام مال کی پروردہ اولاد ایسی نہیں ہے کہ وہ تمہیں ہمارے (اللہ کے) قریب کر دے' سوائے اس کے (ہمارے قریب وہ ہو سکتے ہیں) جو نظام ربوبیت پر ایمان لائیں اور اسے بروئے کار لانے کے لیے اصلاحی کام کریں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے ان کے عملوں کی دوگنا جزا ہے اور وہ بالا خانوں میں با امن محفوظ ہوں گے اور جو لوگ ہماری آیتوں کو عاجز کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ عذاب میں حاضر کئے جائیں گے۔ آپ دوبارہ فرما دیجئے گا کہ میرا پروردگار اپنے قانون مشیت کے مطابق اپنے بندوں میں سے انہیں (جو خود متوازن نظام قائم کر کے "عملاً" چاہتے ہیں) یا تو بالافراط رزق عطا فرماتا ہے سب کے سب کو' اور یا اندازے کا رزق دیتا ہے سب کے سب کو اور (ایسے نظام کے قائم کرنے میں) تم جو کچھ خرچ کرو گے تو وہ اللہ اس کا بدلہ دیگا اور وہ بہتر رزق دینے والا ہے۔

ان آیات مجیدہ میں استحصالی مال داروں کے مالوں کو مال حرام قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ نہیں بتایا اور رسولؐ مقبول سے دو مرتبہ آیت مجیدہ زیر بحث کا اعلان کرایا ہے کہ وہ مال جو متوازن نظام کے قیام کے ذریعہ تمہیں میسر آئے جس میں کمی بیشی کی تمیز موجود نہ ہو' سب کو ایک جیسا میسر آئے اسے اللہ تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ قرار دیا ہے اور دو مرتبہ کے اعلان کے ذریعہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قانون مشیت یہ ہے کہ تم ایسا نظام قائم کرو جس میں وافر رزق ملے تو سب کو اور یا اندازے کا ملے تو سب کو رزق کی تنگی کا الہی نظام میں تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔

سورہ روم میں بھی آیت زیر بحث آئی۔ اس کے پیش کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا اعلان ذیل ملاحظہ فرمائیں:۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ط ۷/۱۵۶ اور میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے۔ چنانچہ وسعت رحمت کے مطابق سورہ روم میں ارشاد ہوا ہے:**وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا** ط **وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ اِذَا هُمْ**

يَعْقِلُوْنَ ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

۳۶۔۳۷/۳۰ اور جب نوع انسانی کو (اپنے قانون مشیت کے مطابق) رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ اور جب اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت کی بدولت انہیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو اچانک نا امید ہو جاتے ہیں۔ کیا انہوں نے غور نہیں کیا (یعنی انہیں غور کرنا چاہئے کہ آنیوالے مصائب کے خطرات سے بچنے کے لئے) اللہ تعالیٰ (اپنے قانون مشیت کے مطابق) ان لوگوں کو یا تو وافر رزق دیتے ہیں سب کے سب کو یا اندازے کا رزق دیتے ہیں سب کے سب کو جو (نظام ربوبیت قائم کرکے) خود چاہتے ہیں۔ بیشک اس بیان میں ماننے والوں کیلئے عبرت حاصل کرنے کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

دیکھا آپ نے! کہ انفرادی نظام میں آئے دن جن خطرات کے ورود کا خوف لاحق ہوتا ہے کہ ذرا سی لغزش ہوئی تو کوئی نہ کوئی مصیبت آجائے گی' اس کا حل بتا دیا گیا ہے کہ ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جس میں رزق کا مسئلہ سرفہرست ہو کہ وافر ملے تو سب کے سب کو اور اندازے کا ملے تو سب کے سب کو۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے' مثلاً" کسی غلطی سے وہ لمبا بیمار ہو جائے اور یا وہ ایسی بلندی سے گر پڑے کہ جسم چکنا چور ہو جائے اور سال بھر کیلئے ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے تو سال بھر کے علاج کا اور اہل خاندان کی ضروریات زندگی کا خرچ کہاں سے پورا ہو۔ اس کا اور اسی قسم کے ہزار ہا مصائب ناگہانی کا حل اللہ تعالیٰ نے ایسے اجتماعی نظام کے ذریعہ دے دیا ہے کہ مذکورہ بالا مصائب کے وقت فرد مذکور کو' نہ اپنے علاج کے خرچ کی فکر ہوگی اور نہ اپنے اہل و عیال کی ضروریات زندگی کا غم ہوگا۔ یہ سب کچھ **اِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ** کے اعلان عام میں بیان کر دیا گیا ہے۔

سورہ بنی اسرائیل میں یہ جملہ مبارکہ اس ذکر کے ضمن میں لایا گیا ہے کہ انفرادی نظام میں ہر قدم پھونک کر رکھنا ہوتا ہے۔ روز مرہ کے خرچ یا شادی بیاہ کے خرچ کے وقت اگر کنجوسی کرے تو پھر بھی بدنامی ہوتی ہے اور اگر فضول خرچی کرے تو پھر بھی ندامت اٹھانا پڑتی ہے کہ قرض خواہ ہر وقت دروازہ کھٹکھٹاتے رہتے ہیں اور سرعام بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:۔ **وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ط اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ○**

۲۹۔۳۰/۱۷ اور تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں بندھا ہوا نہ رکھ (یعنی کنجوس نہ بن) اور نہ اپنے ہاتھ کو کھول دے بالکل کھول دینا (یعنی فضول خرچی بھی نہ کرنا) ورنہ تو ملامت کیا گیا اور حسرت و افسوس کرتا ہوا پایا جائیگا۔ (ان مشکلات کا حل یہ ہے کہ) بلاشبہ تیرا پروردگار (اپنے قانون مشیت کے مطابق) انہیں کھلا رزق دیتا ہے سب کے سب کو' یا اندازے کا رزق دیتا ہے سب کے سب کو' جو متوازن نظام قائم کرکے خود ایسے نظام کو عملاً" چاہتے ہیں۔ بیشک (اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ اسلئے کیا ہے کہ) وہ اپنے بندوں کی جبلت اور ان پر آنے والے حالات سے بہت بڑھ کر خبردار بھی ہے اور بہت بڑھ کر صاحب بصیرت بھی ہے۔ (وہ جو فیصلہ کرتا ہے ٹھیک فیصلہ کرتا ہے)

دیکھئے! اگر حقیقت یہ ہو جو روایتی ترجمہ سے ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انفرادی طور پر جسے چاہتا ہے وافر رزق عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو پھر اس نصیحت کے کیا معنی کہ نہ تو کنجوس بن اور نہ فضول خرچ ورنہ تو ملامت کردہ اور افسوس کرتا ہوا رہ جائیگا۔ کیونکہ اگر بلا سبب اللہ تعالیٰ کسی کا رزق کھلا کر دے اور کسی کو تنگ' تو پھر وہ شخص جس کا رزق اللہ تعالیٰ نے کھلا کر دیا ہے اگر وہ فضول خرچی کرے تو اس کا اثر اللہ کے کھلے رزق پر کیا پڑ سکتا ہے جس نے کھلا ہی رہنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ اوپر پیش کردہ پانچوں آیات کریمات میں دیکھ چکے ہیں کہ روایتی ترجمہ کسی ایک

مقام پر بھی فٹ نہیں آتا کہ اگر اللہ تعالٰی جس کا چاہتا ہے رزق کھلا کر دیتا ہے تو انسان کی خوبی کیا اور اگر اللہ ہی جس کا چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے تو اس کا قصور کیا۔ ہم لوگ ایک نکھٹو اور قمار باز شخص کو کیوں ملامت کرتے ہیں' تو نکما اور نکھٹو ہے اسلئے بھوکا مرتا ہے اوپر دی گئی پانچویں آیات مبارکہ سے ثابت ہے کہ آیت زیر بحث کا روایتی معنی صد فیصد غلط ہے اور تصریف آیات کے ذریعہ اللہ تعالٰی کی کتاب کا اپنا فیصلہ صد فیصد ٹھیک ہے کہ جو لوگ خود متوازن نظام قائم کرتے ہیں اللہ تعالٰی انہیں یا تو وافر رزق دیتا ہے اور یا اندازے کا تنگ رزق دینا اللہ کی شان کے صد فیصد منافی ہے۔

واضح ہے کہ اللہ تعالٰی کے عطاء رزق کے مختلف انداز ہیں۔ مثلاً" سورہ عنکبوت میں ارشاد ہوا ہے:۔ **وَكَأَيِّن مِّن دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ** ○ ۲۹/۶۰ اور بہت سے جاندار ایسے ہیں جو اپنا رزق (اپنے ساتھ) اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ تعالٰی انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی اور وہ خوب خوب سننے والا اور خوب خوب جاننے والا ہے۔

دیکھئے! انسان کے سوا باقی سب جانداروں کی حالت یہ ہے کہ رزق سب کو ملتا ہے۔ لیکن نہ وہ ہل چلاتے ہیں نہ فصلیں بوتے ہیں۔ تو پس آیت بالا ۲۹/۶۰ کے مطابق اللہ تعالٰی کے عطاء رزق کے مختلف انداز ثابت ہوئے کہ باقی جانداروں کا رزق یا تو خود رو ہے کہ اللہ کے قانون کے مطابق خود بخود پیدا ہوتا ہے اور یا ان کے لئے بھی انسان ہی فصلیں اور چارہ بوتا پھر جو جاندار آزاد ہیں وہ اگر پرندے ہیں تو اڑ کر خوراک تلاش کرتے ہیں۔ اللہ تعالٰی ان کے گھونسلوں میں انہیں خوراک نہیں پہنچاتا۔ اور اسی طرح چوپائے چرندے آزاد ہیں ان کا رزق اللہ تعالٰی نے جنگل کی وسیع و عریض چراگاہوں میں پھیلا دیا ہے' انہیں بھی اللہ تعالٰی ان کے کچھاروں ٹھکانوں میں رزق نہیں پہنچاتا' بلکہ انہیں خود جنگل میں پہنچ کر چراگاہوں سے خود گھاس چرنا ہوتی ہے۔ اور آزاد چوپائے درندے ہیں انہیں بھی شکار کی خود تلاش کرنا ہوتا ہے۔ خود شکار کرنا اور کھانا ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا حصول رزق کے ہر انداز کو اللہ تعالٰی نے اپنی طرف منسوب کرکے ارشاد فرمایا ہے **اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ**۔ اللہ تعالٰی ان سب کو بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی دیتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ جنگل کے جن چرندوں یا درندوں اور فضا کے جن پرندوں کو انسان اپنے کھونٹے پر باندھ لیتا ہے۔ اور پنجرے میں بند کر دیتا ہے تو اب ان کا رزق خود کھونٹے پر باندھنے والے یا پنجرے میں بند کرنے والے کے ذمہ آجاتا ہے۔ اگر کوئی کھونٹے پر باندھنے والا کبھی کسی وجہ سے چارہ دینا بھول جائے تو چارپایہ کھونٹے پر بندھا بھوکا مرجائے گا' اسے اللہ رزق نہیں دیگا۔ اسی طرح اگر کسی نے پنجرے میں بند کئے ہوئے طوطا مینا یا تیتر بٹیر کو خوراک نہیں دی تو وہ پنجرے میں بند بھوکے مر جائیں گے۔ اللہ انہیں رزق نہیں دیگا۔ اس اصول کو ۱۱/۶ میں الفاظ ذیل بیان کیا گیا ہے:۔

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ○ ۱۱/۶ اور زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں ہے مگر اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے۔ وہ جانتا ہے ہر جاندار کی جائے رہائش کو بھی اور اس کے سونپے جانے کے مقام کو بھی۔ یہ ہر چیز کتاب کائنات میں موجود ہے۔ جب کوئی چرندہ یا درندہ جنگل میں ہوتا ہے اس وقت تک اس کا مستقر جنگل اور رزق بھی جنگل ہی میں موجود ہوتا ہے' جسے وہ خود تلاش کرکے حاصل کرتا ہے۔ مگر جب کوئی انسان اسے جنگل سے لاکر اپنے کھونٹے پر باندھ دیتا ہے تو وہ اس کا مستودع ہے۔ یعنی جس کو وہ سونپا گیا ہے' جس کے وہ حوالے ہوا ہے۔ اوپر پیش کی گئی آیت مجیدہ ۲۹/۶۰ کے جملہ **اللَّهُ يَرْزُقُهَا** ہی کی ایک صورت **مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا** بھی ہے۔ اوپر دی گئی آیت مجیدہ ۲۹/۶۰ میں جو اعلان کیا گیا ہے **اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ** کہ اللہ تعالٰی ہر

جاندار کو بھی اس کے مخصوص انداز کے مطابق رزق عطا فرماتا ہے اور تمہیں بھی تمہارے مخصوص انداز کے مطابق رزق دیتا ہے۔ اس پر جو مشاہدات کی رو سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں میں سے بعض انسانوں کو بے پناہ وافر رزق میسر ہے اور بعض کو فاقوں تک کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ ایسے سوالوں کا جواب قریب ہی دے دیتا ہے۔ چنانچہ قریب ہی ۲۹/۶۲ ارشاد ہوا ہے:۔

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَیَقْدِرُ لَہٗ ط اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ○ ۲۹/۶۲ اللہ ہی جو اپنے بندوں میں سے (اس منظم گروہ) کو بالافراط رزق عطا کرتا ہے سب کے سب کو اور یا اندازے کا رزق دیتا ہے سب کے سب کو جو اجتماعی نظام قائم کرکے خود چاہتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب خوب جاننے والا ہے (وہ خوب جانتا ہے کہ نوع انسانی میں رزق کی تنگی انفرادی خود غرضانہ نظام سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآنی نظام ربوبیت میں یا تو ہر فرد ریاست کو وافر رزق میسر آتا ہے اور یا اندازے کا۔ یعنی اگر ملک میں وافر رزق موجود ہے تو سب کو وافر رزق ملے گا اور اگر ملک میں اندازے کا رزق موجود ہے تو سب کو اندازے کا ملے گا۔ تنگ رزق قرآن کریم کی اولین آیت مجیدہ الحمد اللہ رب العالمین کی مخالفت اور اللہ تعالیٰ کی رب العالمینی کی توہین ہے۔ معاذ اللہ! استغفراللہ!

آیت زیر بحث' سورہ زمر میں بانداز ذیل آئی ہے۔ بغور ملاحظہ فرمائیں:۔ **فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰہُ نِعْمَۃً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ ط بَلْ ھِیَ فِتْنَۃٌ وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ○** ۳۹/۴۹ **قَدْ قَالَھَا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ○** ۳۹/۵۰ **فَاَصَابَھُمْ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوْا ط وَالَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ ھٰٓؤُلَآءِ سَیُصِیْبُھُمْ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوْا وَمَا ھُمْ بِمُعْجِزِیْنَ○** ۳۹/۵۱ **اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ○** ۳۹/۵۲

ان آیات کریمات کا مفہوم مرض کرنے سے پہلے مختصر تمہید پیش خدمت ہے:۔

اجتماعی نظام کی ضد ہے انفرادی نظام' جس میں ہر شخص ذاتی مفاد کیلئے دیوانہ وار بھاگ رہا ہوتا ہے۔ ہر شخص دوسرے کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ حاصل کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ اس طرح جب ذاتی مفاد پرستی کی زد میں آکر کسی کو کوئی تکلیف' خصوصاً" مالی بدحالی (رزق کی تنگی) کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اللہ سے دعائیں مانگتا ہے۔ مگر پھر جب اللہ تعالیٰ اپنی شانِ ربوبیت کے مطابق اسے نعمتیں عطا فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ میں نے اپنی علمیّت کی بدولت حاصل کی ہیں چنانچہ مفہوم ملاحظہ فرمائیں:۔

(مفہوم) پس جب انسان کو (انفرادی نظام میں) کوئی تکلیف (بدحالی' رزق کی تنگی) پہنچتی ہے تو ہمارے حضور دعا کرتا ہے۔ پھر جب ہم (اپنی شان رب العلمینی کے مطابق) اسے اپنی نعمت (رزق کی فراوانی) عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ میرے ذاتی علم کی بدولت ہے۔ (یوں نہیں) بلکہ یہ تصور ایک فتنہ ہے اور لیکن ان کی اکثریت (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ بیشک ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ لیکن جو کسب انہوں نے کیا' اس نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ پھر جو عمل انہوں نے کیا اس کی بدولت انہیں بدحالیاں (تنگ دستیاں) پہنچیں۔ اور جو ظلم ان لوگوں نے کیا ہے اس کی برائیاں (بدحالیاں) ان کو بھی ضرور پہنچیں گی۔ اور وہ اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں (وہ اللہ کی مرتب کردہ سزا سے بچ نہیں سکتے) کیا ان لوگوں نے جانا نہیں؟ (یعنی انہیں جاننا چاہئے کہ مالی بدحالیوں' رزق کی تنگی کا حل یہ ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو یا تو فراخ رزق دیتا ہے سب کے سب کو' اور یا اندازے کا رزق دیتا ہے سب کے سب کو جو ایسا نظام قائم کرکے) خود چاہتے ہیں (کہ اگر ملک میں وافر رزق موجود ہو تو سب کو وافر رزق ملے اور اگر اندازے کا موجود ہو تو سب کے سب کو اندازے کا رزق ملتا رہے)

بلاشبہ اس بیان میں ان لوگوں کیلئے عبرت کی بہت سے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں (اس حقیقت پر کہ ہر فرد معاشرہ کو مساوی و متوازن رزق کا حق حاصل ہے ۶/۳۶ + ۷/۲۴)

ایک لمحہ فکریہ ○ پیچھے آیت مجیدہ ۳۰/۳۷ میں بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ **اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ** ط کے بعد آیا ہے **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ** ○ ۳۰/۳۷ اور یہاں آیت نمبر ۳۹/۵۲ میں بھی **اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ** کے بعد آیا ہے **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ** ○ ۳۹/۵۲

دیکھئے! ان دونوں آیات مجیدہ میں **اَوَلَمْ یَرَوْا** اور **اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا** آیا ہے بمعنی کیا لوگوں نے غور نہیں کیا اور کیا لوگوں نے جانا نہیں، یعنی لوگوں کو غور کرنا اور جاننا چاہئے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ یا تو وافر رزق عطا فرماتا ہے اور یا اندازے کا (تنگ رزق اللہ نہیں دیتا) اور اس کے بعد دونوں آیتوں میں ایک ہی جملہ لایا گیا ہے **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ** ۳۰/۳۷ + ۳۹/۵۲ بلاشبہ مذکورہ بالا بیان میں ایمان لانے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز پر ایمان لانے والوں کیلئے بہت سی نشانیاں ہیں؟ کیا اس چیز پر ایمان لانا ہے جو روایتی تراجم نے تصور پیش کیا ہے **یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ** کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے۔ تنگ کر دیتا ہے العیاذ باللہ !

واضح رہے کہ رزق کی تنگی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا وہ جرم عظیم ہے اور وہ جرات بیباک ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ آیت مجیدہ ۲۸/۴ کے حوالہ سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ کسی کا رزق تنگ کر دینا اللہ تعالیٰ کے سرکش و نافرمان فرعون کا عمل تھا اور ایسا کرنے والے سب اپنے اپنے وقت کے فرعون ہیں۔ نیز ۳۸/۳۹ کے حوالہ سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ عوام کے رزق کی ذمہ داری صدر مملکت پر ہوتی ہے سلیمانؑ کو عطاء حکومت کے بعد ارشاد ہوا۔ **ھٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ** ○ ۳۸/۳۹ یہ عطاء حکومت ہماری بے حساب بخشش ہے اب آپ کے اختیار میں ہے کہ توازن قائم کرکے احسان کریں یا رزق کے سرچشموں کو جو آپ کے اختیارات میں دیئے گئے ہیں انہیں اپنے لئے اور اپنے عملہ حکومت کیلئے روک لیں۔ انہی اختیارات کا فرعون نے غلط استعمال کیا اور اپنی قوم قبطیوں پر رزق کے دروازے کھول دیئے اور بنی اسرائیل کو ملک میں بیگاری بنا کر ان کا رزق تنگ کر دیا۔ انہیں صرف اتنی خوراک دی جاتی تھی کہ وہ اگلے دن کی محنت و مشقت کے لئے زندہ رہ سکیں۔ پس انہی اپنے عطا کردہ اختیارات کے صحیح استعمال کو مذکورہ بالا جملہ مبارکہ میں ظاہر کیا ہے۔ **اِنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ** بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو یا تو فراخ رزق دیتا ہے سب کے سب کو یا اندازے کا رزق دیتا ہے سب کے سب کو، جو (ایسا نظام قائم کرکے) خود چاہتے ہیں (کہ اگر ملک میں وافر رزق موجود ہو تو سب کے سب کو وافر رزق ملے اور اگر اندازے کا ہو تو سب کے سب کو اندازے کا رزق ملتا رہے۔

یَرْزُقُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ میں آمدہ خط کشیدہ **واوٗ** بمعنی **اَوْ** ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شان ربوبیت کے مطابق تقسیم رزق کے دو ہی انداز ہیں یا تو فراخ ہو سب کے سب کیلئے اور یا اندازے کے مطابق ہو سب کے سب کے لئے۔

وَفَرِحُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ آخرت کی زندگی کو بھلا کر دنیا کی زندگی پر خوش ہوتے ہیں کہ انہیں دنیا میں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جائز و ناجائز طریقے سے جس طرح چاہیں اپنی ہی نوع کے حقوق ربوبیت پر ڈاکے ڈالتے رہیں۔ اور کمزوروں کا استحصال کرتے چلے جائیں، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ اس جملے میں خط کشیدہ لفظ فی کا معنی ہے بمقابلہ۔ اور متاع کیساتھ لفظ **قَلِيْلٌ** محذوف ہے۔ اور **حَيٰوةُ الدُّنْيَا** کی تعریف چند روزہ ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ لوگ جس دنیا کی زندگی پر خوش ہیں' وہ تو چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا سامان زیست ہے اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے پر بہت کم اور بہت بے مایہ و بے وقعت ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے قانون مشیت کے مطابق اجتماعی نظام قائم کریں گے ان کے ہر ایک فرد کو دنیا میں زندگی بھر یا تو وافر رزق ملتا رہے گا اور یا اندازے کا ہر سربراہ ریاست کا اولین فرض منصبی یہ ہے کہ ملک میں ملک کی آبادی کے مطابق یا تو وافر رزق مہیا کرے اور یا اندازے کا۔ ہر دور کے مطابق متوازن تقسیم کا انتظام اس کے ذمہ ہے۔

سورہ رعد کی اگلی آیت مجیدہ میں زمانہ رسالت محمدی کے کافروں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اس مدعی رسالت پر کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی' جس کو دیکھ کر ہر شخص ہدایت پالے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی قسم کی نشانی (معجزات) نازل نہیں کرتا' بلکہ وہ اپنے ضابطہ حیات میں واضح دلائل نازل کر دیتا ہے اور اسے گمراہ ٹھہراتا ہے جو خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور اسے ہدایت یافتہ قرار دیتا ہے جو خود اپنے خالق و مالک کی طرف از خود رجوع کرتا ہے:۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿٢٧﴾	(۲۷) اور کافر کہتے ہیں کہ اس (مدعی نبوت) پر کوئی نشانی کیوں اس کے رب کی طرف سے نہیں نازل کی گئی (جسے دیکھ کر لوگ ایمان لے آئیں) آپ کہہ دیجئے گا (اے رسولؐ) کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے گمراہ ہوا پاتا ہے جو خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور وہ اسے اپنی طرف ہدایت یافتہ ٹھہراتا ہے جو خود اس کی طرف جھکتا ہے۔

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ سے کفار مکہ کی مراد یہ تھی کہ کوئی معجزہ (خارق عادت عمل) آپ پر نازل ہو۔ سورہ فرقان میں انہی کا قول درج ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ڈرانے والا فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا' یا اس کو کوئی خزانہ عطا کر دیا جاتا اور یا اس کا باغ ہوتا جس میں سے وہ کھاتا ۷-۸/۲۵ سورہ بنی اسرائیل میں کفار مکہ کا مطالبہ بالفاظ ذیل درج ہے:۔

(ترجمہ) "اور کافر کہتے ہیں کہ ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے کہ آپ زمین میں سے چشمہ جاری کرکے دکھا دیں۔ یا آپ کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ لگ جائے اور اس میں نہریں بہہ نکلیں۔ یا آپ اپنے زعم کے مطابق ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دیں اور یا اللہ اور ملائکہ ہمارے سامنے آجائیں۔ یا آپ کا گھر سونے کا ہو جائے۔ یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں پھر ہم آپ کے آسمان پر چڑھ جانے پر ایمان نہیں لائیں گے' یہاں تک کہ آپ آسمان سے لکھی ہوئی کتاب لے آئیں جسے ہم پڑھ لیں ۹۰ تا ۹۳/۱۷ کافروں کے ان تمام مطالبات کے جواب میں ارشاد ہوا ہے:۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ ۹۳/۱۷ کہہ دیجئے گا اے رسولؐ کہ میرا پروردگار ایسے تصورات سے پاک ہے (کہ یہ چیزیں بغیر اسباب کے بنا دے وہ صاحب قدرت اپنے قانون کے خلاف نہیں کرتا ۲۹/۵۰) اور میں تو بشر رسول ہوں (یہ چیزیں میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں)

اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ کا یہ معنی مطلقاً" غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے غور طلب یہ امر ہے کہ روایتی تراجم کے مطابق اگر اس کا یہ معنی صحیح ہو کہ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے تو پھر اس نے اپنی کتابیں اور رسول کیوں بھیجے تھے۔ یضل باب تفصیل سے ہے کہ خاصہ وجدان کے مطابق **اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ** کا معنی ہے یہ کہ اللہ تعالیٰ گمراہ پاتا ہے ہدایت و گمراہی انسان خود اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنا ہدایت نامہ قرآن کریم نازل کر دیا ہے جو کوئی خود چاہے اس سے خود ہدایت پائے اور جو خود چاہے

گمراہ ہو جائے۔ سورہ کہف میں ارشاد ہوا ہے:۔
وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۱۸/۲۹ اور اے رسولؐ! کہہ دیجئے گا کہ حق (قرآن کریم) تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے۔ پس جو کوئی خود چاہے اس پر ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کر دے (یعنی خود قرآن کریم پر ایمان لا کر خود ہدایت پائے اور خود اس کا انکار کر کے خود گمراہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو زبردستی گمراہ کرتا ہے اور نہ زبردستی ہدایت دیتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ میں **يشاء** کا فاعل **منْ** ہے اور مفہوم یہ ہے کہ جو شخص خود گمراہ ہونا چاہتا ہے ۱۸/۲۹ اللہ اسے گمراہ ہوا ہوا پاتا ہے۔ گمراہ کرتا نہیں۔
يَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ میں کھل کر بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ اسے پاتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتا ہے اور جب وہ خود ہدایت پر پختہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ہدایت یافتہ قرار دے دیتا ہے۔

لمحہ فکریہ۔ واضح رہے کہ ہدایت و گمراہی کے ضمن میں بھی روایتی تصور انتہائی خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ العیاذ باللہ! سورہ یونس میں آیا ہے:۔**قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ج فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ج وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ج وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ** ○ ۱۰/۱۰۸ اے رسولؐ! کہہ دیجئے گا کہ اے نوع انسانی! بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق (قرآن حکیم) آگیا ہے پس جو کوئی اس سے خود ہدایت حاصل کرے تو سوائے اس کے نہیں کہ وہ اپنے آپ کیلئے ہدایت پائے گا۔ اور جو کوئی خود گمراہ ہو جائے اس کا وبال اس کی اپنی جان پر ہوگا اور میں تمہارا ضامن نہیں ہوں۔ بالکل یہی الفاظ سورہ زمر ۳۹/۴۱ میں آئے ہیں۔ اس کے خلاف مفہوم جن آیات سے برآمد ہوتا ہے وہ متشابہت ہیں ان کا مفہوم مذکورہ بالا محکمات کے ماتحت رکھنا لازم ہے۔ مثلاً" آیت ذیل کا مفہوم قابل غور ہے:۔
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ○ ۳۹/۲۳ یہاں بھی **يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ** میں **يَشَآءُ** کا فاعل **مَنْ** ہے اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ اسے ہدایت یافتہ پاتا ہے جو خود ہدایت چاہتا ہے اور **وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ** کا مفہوم یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ (اس کی سرکشی کی بدولت) گمراہ قرار دے دے **فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ** اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ یہاں پر گمراہی کی خبر دی گئی ہے۔ ایک تو وہ ہے کہ کوئی شخص خود گمراہ ہوتا ہے اسے اس وقت اللہ تعالیٰ گمراہ ہوا ہوا پاتا ہے گمراہ کرتا نہیں۔ اور دوسری یہ ہے پھر جب وہ اللہ تعالیٰ کی سرکشی اور نافرمانی میں اس قدر حد سے بڑھ جاتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ گمراہ ٹھہرا دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ ایسے شخص کو کوئی ہدایت پر لانے والا نہیں ہوتا۔ اسے کوئی ہدایت پر نہیں لاسکتا۔ آیت زیر بحث کا آخری جملہ ہے **يَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ۔** اللہ تعالیٰ اسے ہدایت یافتہ ٹھہراتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے' اس کی طرف رجوع رہتا ہے۔ اگلی آیت مجیدہ میں انہی لوگوں کی تعریف کی گئی ہے:۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۗ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

(۲۸) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان کے اذہان اللہ کے ذکر (قرآن کریم) کے ساتھ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ خبردار! (بگوش ہوش سن لو کہ) اللہ کے ذکر قرآن کریم ہی کے ساتھ اذہان اطمینان حاصل کرتے ہیں (اس ضابطہ حیات کے سوا کوئی اور ضابطہ ہے ہی نہیں' جس سے ذہنی

سکون حاصل ہو سکے)

ذکر اللہ سے مراد قرآن کریم ہے سورہ حجر میں ارشاد ہوا ہے۔ **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ○** ۹/ ۱۵ بیشک اپنے نصیحت نامہ قرآن کریم کو ہم ہی نے نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس نصیحت نامے کی حفاظت کرنے والے ہیں (اس کی کوئی زیر زبر نہیں تبدیل کر سکتا۔ ذکر کا لفظی معنی نصیحت بھی ہے اور نصیحت نامہ بھی ہے۔ یہ ذکر جو نازل کیا گیا ہے' صرف اور صرف قرآن کریم ہے اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کے الفاظ میں ذہنی اطمینان کی خبر دی گئی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ قرآن کریم وہ متوازن ضابطہ حیات ہے جو ہر کسی کی ضروریات زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سکون قلوب اور اطمینان قلب' تب ہی نصیب ہو سکتا ہے جب انسان ضروریات زندگی کی فکر سے آزاد ہو جائے اگلی آیت میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝

(۲۹) جو لوگ ایمان لائیں اور اصلاح معاشرہ کے کام کریں ان کے لئے خوشحالی اور اچھا ٹھکانہ ہے۔

طُوْبٰى کا معنی ہے رزق کی خوشحالی' یعنی یا تو وافر رزق اور یا اندازے کا۔ وہ لوگ رزق کی تنگی سے مطلقاً" بچے رہتے ہیں۔

حُسْنُ مَاٰبٍ کا معنی ہے اچھا ٹھکانہ۔ یعنی جہاں ضروریات زندگی مسلسل ملتی رہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ضابطہ حیات پر عمل کرکے اجتماعی نظام قائم کرنے ہی سے ملتی ہیں۔ اور اسی ضابطہ حیات پر عمل کرنے سے اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝

(۳۰) اور اسی طرح (اے رسولؐ) ہم نے آپ کو ایک امت کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا ہے۔ بیشک اس امت سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں۔ (آپ کو اسلئے بھیجا گیا ہے کہ) آپ ان لوگوں پر وہ کتاب تلاوت فرمائیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ رحمان کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے گا کہ وہ رحمان ہی میرا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی اور فرمانبرداری کے قابل نہیں ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے۔

مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کے منکر نہیں تھے۔ ۸/۳۲ میں ان کا قول درج ہے **وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ** اور جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ یہ قرآن تیری طرف سے حق ہے تو (ہمارے انکار کی بدولت) تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ آیت بالا ۱۳/۳۰ میں بتایا گیا ہے کہ وہ رحمان کے منکر تھے۔ رحمان کا معنی ہے مفت نعمتیں دینے والا۔ قرآن کریم بھی ایک مفت کی نعمت ہے۔ رحمان کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ **اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ○** ۱-۲/۵۵ مفت نعمتیں دینے والے نے قرآن سکھایا۔

ان لوگوں سے کہہ دو کہ اس کے سوا کوئی اور الٰہ قابل عبادت نہیں ہے میرا اسی ذات پر اعتماد اور بھروسہ ہے اور اس کی طرف میرا ٹھکانہ ہے نتائج اعمال کا وہی سرچشمہ ہے حکمران ہے اک وہی باقی بتان آزری۔

آیت نمبر۳۱ میں بتایا گیا ہے۔ کہ اللہ کا ہر کام اپنے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہی طے پاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۗ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۗ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۗ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

(۳۱) اور اگر قرآن ایسا ہوتا۔ کہ اس سے پہاڑ چلائے جاتے۔ یا اس سے زمین کی مسافت طے ہو جاتی۔ یا اس سے مردوں سے باتیں کی جاتیں۔ (تو قرآن سے بھی ایسا ہو سکتا) بلکہ یہ سب کام اللہ کے امر (قانون) کے مطابق ہوتے ہیں۔ کیا یہ ایمان والوں نے جان نہیں لیا۔ کہ اگر اللہ کی مشیت (قانون) ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو (زبردستی) ہدایت دیتا۔ اور یہ کافر تو ہمیشہ ہی اس حالت میں رہتے ہیں۔ کہ ان پر کوئی نہ کوئی مصیبت آتی رہتی ہے۔ یا ان کی بستی کے قریب (مصیبت) نازل ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے۔ بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ میں **لَوْ** حرف شرط ہے۔ جس کی جزاء محذوف ہے۔ جس کا قرینہ صرف **بل اللّٰہ الامر** میں موجود ہے۔ یعنی ایسا ہرگز ہرگز نہیں۔

اس کا جواب سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا۔ تو اس قرآن میں ضرور ایسی آیت ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم کے سواء کوئی اور وحی ہدایت نازل نہیں ہوئی کہ دوسری بات اس کتاب میں تلاش کرلی جائے۔ اللہ کی کتاب مکمل و اکمل ہے اور ہر مسئلہ کی پوری پوری وضاحت کرنے والی ہے۔ اس میں عقل و بصیرت کے خلاف کوئی بھی بات نہیں ہے اس لئے عقل والوں کو دعوت قرآن دے کر کوئی چھو منتر یا کوئی وظیفہ یا چلہ کشی کا سبق نہیں دیا گیا۔ عالم اسباب میں اللہ نے تو تسخیر کائنات کا حکم دے دیا ہے۔ انسان مادی ترقی کرکے ایسے وسائل پیدا کرلے جس سے پہاڑ ہٹ جائیں۔ زمین کی مسافت طے ہو جائے۔ ایسا ہونا اللہ کے قانون کے عین مطابق ہے اس لئے جواب کو چھوڑ دیا ہے۔ یعنی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے یعنی اس میں چھو منتر والی کوئی بات نہیں ہے یہ تو علم و عمل کی کتاب ہے۔ جو انقلاب آور ہے اور مکمل انسانیت کے لئے اللہ کی طرف سے دستور حیات ہے جس کے نتائج اٹل اور محکم ہیں۔ ہر قسم کے عملی نتائج اللہ ہی کے قانون کے مطابق سامنے آئیں گے۔

دوسرے مقام پر آیا ہے **لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط** (۵۹/۲۱) اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے (وہ پہاڑ عقل و شعور رکھتا) تو ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ کے خوف سے ٹکڑے ہوتا۔ اور پھٹ جاتا۔

یا کوئی آیت پڑھ کر پھونک دیا جاتا۔ اور مسافت طے ہو جاتی۔ قرآن حکیم میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ زمین کی مسافت تو مادی ذریعے سے طے ہوگی۔ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے یا زمین کی مسافت طے کرنے میں جو مصیبتیں آئیں گی۔ ان کو اللہ کے مادی قانون سے رفع کیا جائے گا۔ اور وہ مادی وسائل ہوں گے۔ جس سے پہاڑوں کو کاٹ کر راستے بنائے جائیں گے اور زمین سے سڑکیں اور ریل کا نظام خود اس بات کی تشریح ہے کہ مسافت کس طرح طے ہوتی ہے۔

كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى کے الفاظ میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی آیت نازل نہیں کی۔ کہ جس کے پڑھنے سے مردہ زندہ ہو جائے اور اس سے باتیں کی جائیں۔ یاد رہے کہ مردہ کی دو اقسام ہیں (۱) طبعی (۲) روحانی۔

طبعی مردوں کے لئے فرمایا کہ وہ اللہ کے قانون کے مطابق یوم الدین کو اپنے اعمال کا جواب دینے کے لئے اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے وہ یوم حشر سے پہلے زندہ نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی طبعی زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ کوئی آیت ایسی نہیں کہ جس کی تلاوت سے وہ مردے زندہ ہو سکیں۔

روحانی وہ مردے جو زندہ تو ہوتے ہیں۔ مگر زندگی نہیں ہوتی۔ **اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ** (۲ ۱۱/۶) آیا اس کی طرح جو مردہ تھا۔ اور ہم نے اس کو زندگی دی۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ **اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ**۔ اے ایمان والو! اللہ کا رسول تم کو بلائے اس لئے کہ تم کو زندگی دے۔ زندہ تو وہ ہیں جو چلتے پھرتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ اور کام کاج کرتے ہیں۔ مگر ان کو زندگی کے لئے بلایا گیا ہے۔ یعنی آؤ اس لئے کہ تم کو وہ اصول بتائے جائیں کہ تم زندہ قوموں میں شامل ہو جاؤ۔ وہ قوم جو غلامی میں دبی ہو زندہ ہو کر دوسروں پر غالب آجائے۔ اس کا راز صرف قرآن حکیم پر عمل ہے۔ اگر تم طاقت پیدا کرو گے۔ تو غالب ہو جاؤ گے۔ قرآن مجید کی بارگاہ میں غلبہ' طاقت اور یکجہتی میں ہے۔

مطلب یہ ہوا۔ کہ جو طبعی مردے ہیں۔ وہ تو اللہ کے قانون کے مطابق قیامت کے دن تک زندہ نہیں ہوں گے۔ لہذا اس قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں۔ کہ جس سے مردوں سے باتیں کی جاسکتی ہیں۔

"**الْاَمْرُ جَمِيْعًا**" کے جملہ مبارک میں بتایا گیا کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے امر (قانون) کے مطابق ہوتا ہے۔ جس میں کسی کو کوئی دخل نہیں۔ وہ اللہ اپنے قانون محکم کے ساتھ اپنے اختیارات استعمال کرتا ہے۔ اس کے قانون کے مطابق پہاڑوں کو چلانا اور زمین کی مسافت طے کرنا۔ یہ سب کچھ صرف مادی وسائل سے ہی ہوسکے گا۔ صرف آیت قرآنیہ پڑھنے۔ ورد وظائف یا چلہ کشی کے شعبدہ سے ہرگز نہ ہوگا۔ عالم اسباب میں یہ انقلابات تو اللہ کے امر کے مطابق ہی وقوع پذیر ہوں گے۔ **اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ** ط خلق و امر میں اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے کوئی فرد محترم بھی اس کے نظام محکم میں شریک نہیں۔

کیا مومنوں نے اللہ کی کتاب کو تسلیم کرکے یہ جان نہیں لیا۔ کہ مادی ترقی سے یہ سب ہوسکے گا۔ مگر اس کے بغیر نہیں۔ وہ اس سے ناامید نہیں ہیں۔ اگر اللہ کے قانون میں یہ ہوتا۔ کہ انسان کو ایک ہی نہج پر پیدا کیا جاتا۔ اور وہ دوسرے حیوانات کی طرح اپنی زندگی بسر کرتا۔ اور وہ اس کے حکم کے خلاف کچھ نہ کر پاتا۔ تو پھر جزا و سزا اور یوم الدین کا کیا مطلب ہوتا۔ کیونکہ انسان کو پیدا کرکے اس کو کھلی چھٹی دی گئی ہے۔ کہ جو وہ چاہتا ہے۔ اس دنیا میں عمل کرے۔ مگر اس کی زندگی پر کچھ پابندی لگائی گئی ہے۔ کہ جو کچھ وہ کرے گا۔ تو لازمی طور پر اپنے عمل کا خود بخود جواب وہ ہوگا۔ مگر دوسری مخلوق میں ایسی بات نہیں ہے۔ لہذا اس کے لئے راہ دکھانے کے لئے خارجی طور پر ایک کتاب کا ہونا ضروری تھا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی شکل میں بواسطہ رسول مقبول سلام علیہ عطا فرما دیا ہے۔

رجوع الی المطلب۔ اگر اللہ کے قانون میں ایسا ہوتا۔ تو جبلی طور پر اس کو ایک نہج پر پیدا کیا جاتا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح زندگی بسر کیا کرتا۔ مجبور محض ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے وہ ذی عقل بااختیار ہے۔ **اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ** جو چاہو تم عمل کرو۔ **وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ** ط

جو لوگ کفر کرتے ہیں۔ اس کے بدلے ان کو مصیبت آتی ہے۔ یہ ان کے لئے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے چونکہ حضرت انسان نے خود ایسا نظام کار وضع کر لیا ہے کہ جس کی بدولت دنیا میں اسے امن نصیب نہیں۔ اسے سکون قلب کی نعمت میسر نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے اعمال کی خود سزا پاتا ہے۔ بلکہ وہ مصیبت نہ صرف اسے بلکہ ارد گرد کے لوگوں کو بھی اپنی

لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اس میں کسی کا لحاظ نہیں ہوتا۔ کیونکہ گندی روش زندگی کا ہمنوا رہنا بھی بذات خود جرم ہے۔ چونکہ انسان انسان کے لئے جو بھی قانون مرتب کرے گا۔ نتیجۃً غلط ثابت ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے خود قانون نازل کیا ہے۔ تاکہ اس پر عمل کیا جائے اور بھرپور نتائج حاصل کئے جائیں۔

یہاں تک کہ اللہ کا قانون پورا ہو جائے۔ اور وہ وعدہ جو اللہ نے مومنوں کے ساتھ کیا ہے۔ پورا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ** (القرآن)

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے غلبے کا وعدہ کیا ہے مگر وہ مشروط ہے اگر تم اللہ کے ساتھ کئے گئے وعدے پورے کرو گے۔ تو میں بھی اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ اگر تم نے اللہ کا قانون چھوڑ دیا۔ تو میں بھی تمہاری مدد نہیں کروں گا۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے بیان میں یہ بتایا گیا۔ کہ تم میرے وعدے پورے کرو گے۔ تو میں تم کو غلبہ دوں گا۔ **اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ** ط (۲/۴۰)

نکہ بازگشت:۔ اور اگر قرآن کریم کی تعلیم ایسی ہوتی۔ کہ اسی کی آیات تلاوت کرنے سے پہاڑ حرکت میں آتے اور چل پڑتے۔ یا اس کے پڑھنے سے زمین کی مسافت طے ہو جاتی۔ یا مردوں سے باتیں کی جاسکتیں۔ تو قرآن مجید سے بھی ایسا ہو سکتا تھا۔ مگر ایسا مشاہدہ نہیں۔ کیونکہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے مستقل قوانین کے تحت سرانجام پاتا ہے۔ ایمان والوں کو جان لینا چاہئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا۔ ہدایت کا راستہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہے خواہ کوئی ہدایت قبول کرے یا ہدایت کا انکار کر دے۔ انکار کرنے والوں کی بد اعمالیوں کی وجہ سے بطور تنبیہ کوئی نہ کوئی مصیبت آتی رہتی ہے۔ پھر ایسا ہوتا ہے۔ کہ ان کی مسلسل نافرمانیوں کی بدولت قرب و جوار کے علاقے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق عذاب الٰہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہر کام کے نتیجہ کا وقت مقرر ہے اور جب قانون مہلت گزر جاتا ہے۔ تو پھر اللہ کے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی۔ اور عذاب الٰہی ان لوگوں کو ان کے اعمال کی بدولت گھیر لیتا ہے۔

۱۔ قرآن کریم میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے۔ کہ جس کے پڑھنے سے پہاڑوں کو چلایا جاسکے۔

۲۔ قرآن کریم ایسی خلاف عقل تعلیم سے منزہ ہے کہ جس کی آیات پڑھنے سے زمین کی مسافت طے ہو جائے۔

۳۔ قرآن حکیم میں ہرگز ایسی آیات نہیں ہیں۔ کہ جن کی تلاوت سے مردے زندہ ہو جائیں۔ اور ان سے باتیں ہو سکیں۔

۴۔ ہر کام اللہ تعالیٰ کے مقررہ اور مستقل قوانین کے مطابق پورا ہوتا ہے۔

۵۔ یہ بات ہر ایک پر واضح ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا۔ "ہر شخص خود ہدایت حاصل کرتا ہے" **وَاللّٰہُ یَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ** ط

۶۔ قرآن حکیم کے احکام کی خلاف ورزی سے انسانوں کو کوئی نہ کوئی مصیبت گھیرے رکھتی ہے۔

۷۔ لوگوں کی بداعمالیوں کی انتہا ہو جانے پر آس پاس کے علاقے بھی عذاب الٰہی سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

۸۔ قانون مہلت گزر جانے کے بعد مکافات عمل پورا ہو کر رہتا ہے۔ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ** (۱۳/۳۱) بے شک اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

اگلی آیت مجیدہ میں منکرین حق کے اعمال اور ان کے نتائج کی خبر ان الفاظ میں دی گئی ہے۔ کہ ایسے لوگ ہمیشہ سے اللہ کے رسولوں کا تمسخر اڑاتے رہے ہیں۔ جو بالآخر کیفر کردار کو پہنچے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

(۳۲) اور تم سے پہلے بھی رسولوں کی ساتھ تمسخر ہوتے رہے ہیں۔ پس میں نے انکار کرنے والوں کیلئے املاء کرایا۔ پھر (بوجہ مسلسل بدعملی) میں نے انہیں پکڑا۔ تو ان کے لئے ہمارا عذاب کیسا رہا۔ (آثار قدیمہ کے کھنڈرات منہ بولتی تصویریں موجود ہیں)

۱۔ اِسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ کے الفاظ میں رب کریم نے کافروں کا عمل درج کیا ہے۔ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوٓا أَيْدِيَهُمْ فِيٓ أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوٓا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهِ وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَنَآ إِلَيْهِ مُرِيبٍ (۱۴/۹) "جب ان (منکرین) کے پاس رسل روشن نشان لیکر آئے تو انہوں نے ان کی بات نہ مانی اور کہا جس تعلیم کیساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے اس کا تو ہم انکار کر چکے ہیں اور جس بات کی طرف ہمیں بلاتے ہو اس کے متعلق تو ہم شک میں ہیں" : یعنی وہ لوگ یوم الدین کا انکار کرتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کہ "آیا ہم اکیلے اللہ کے حکم کی اطاعت کریں؟ اور اسی سے مدد مانگیں؟ اور یا ہمیں ایک دن اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اسی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے" پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اور آپ کے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک ہے۔ مگر اللہ کا قانون مہلت ان کو وقت مہیا کرتا ہے کہ تمہیں جو عمل کرنا ہے کر لو اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ط (۴۱/۴۰) تم جیسے چاہو عمل کرو۔ بلاشبہ وہ (اللہ) تمہارے اعمال سے واقف ہے۔

پھر جب ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ تو دنیا کی کوئی طاقت اللہ کے عذاب سے انہیں نجات نہیں دلا سکتی۔ جیسے کہ قرآن حکیم نے قوم ہود' قوم نوح' قوم صالح کا ذکر کیا ہے۔ کہ کس طرح ان پر عذاب آیا ہے۔

سورۂ کہف میں انبیاء کرام اور ان کے پیغام کی تکذیب کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے:۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوٓا آيَاتِي وَمَآ أُنْذِرُوا هُزُوًا (۱۸/۵۶)

ہم رسولوں کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور منکرین حق جھوٹ کے بل بوتے پر ان سے مزاحمت کرتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی تدابیر سے حق کو مٹا دیں۔ اور اپنے اس طرز عمل سے میری آیات اور میرے انداز کو ہنسی کا نشانہ بنا لیا۔

لیکن حق تعالیٰ انبیائے کرامؑ کے مشن کو استحکام بخشتے ہیں۔ اور منکرین کی تدابیر کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

اے اللہ کے رسولؐ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپؐ ان کی گستاخیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا کام جاری رکھیں۔ یہ لوگ اپنا انجام کار ضرور پاکر رہیں گے۔

۲۔ فَأَمْلَيْتُ تو میں نے منکرین حق کے لئے (مکافات عمل کا بدلہ پانے کے لئے) اپنے قانون میں املا کرایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے قوانین کا انکار کرنے والے ضرور بر ضرور سزا پائیں گے۔ وہ عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتے۔

اگلی آیت مجیدہ میں ان لوگوں کی خبر دی گئی ہے۔ کہ کچھ لوگ خود نام رکھ کر اور پھر من گھڑت قصے ان سے چسپاں کرکے اللہ کے شریک ٹھہرا لیتے ہیں یہ اعمال ان کو آراستہ نظر آتے ہیں۔ ان خود ساختہ اعمال کی وجہ سے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روک رکھتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو محفوظ کرتا جا رہا ہے وہ اپنے نتائج ضرور بر ضرور بھگتیں گے۔

أَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ

(۳۳) تو کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ (اللہ) نگہبان ہے ہر اس شخص کے اعمال پر جو وہ کرتا ہے۔ اور انہوں نے اللہ کے شریک بنا لئے ہیں۔

سَمُّوۡهُمۡ ؕ اَمۡ تُنَبِّـئُوۡنَهٗ بِمَا لَا يَعۡلَمُ فِى الۡاَرۡضِ اَمۡ بِظَاهِرٍ مِّنَ الۡقَوۡلِ ؕ بَلۡ زُيِّنَ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مَكۡرُهُمۡ وَصُدُّوۡا عَنِ السَّبِيۡلِ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ ۞

(اے مخاطب) تو ان سے کہہ دے۔ (آیا) ان شرکاء کے نام تم نے خود رکھ لیئے ہیں۔ یا تم (اللہ کو) کرۂ ارض کی وہ خبر دیتے ہو۔ جسے وہ نہیں جانتا۔ یا یہ تمہاری ظاہری (منہ کی) بات ہے بلکہ منکرین کی تجویزیں ان کو آراستہ نظر آتی ہیں۔ اور انہوں نے (اپنے عمل سے) لوگوں کو سبیل ہدایت سے روک رکھا ہے۔ اور جسے (اس کے بداعمال کے باعث) اللہ گمراہ ٹھہرائے پس اسے کوئی بھی ہدایت نہیں کر سکتا۔

قَآئِمٌ سے مراد ایسا شاہد ہے۔ جو ہر شخص کے اعمال کا نگران ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا و سزا مرتب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے۔ کہ وہ کسی شخص کے اعمال ضائع نہیں کرتا۔ کیا یہ لوگ اللہ کے لئے شریک ٹھہراتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے۔ کہ تم ان شرکاء کے نام لے کر ان کے متعلق جس چیز کی خبر دیتے ہو وہ تمہارے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ یہ تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ تم نے کبھی خود غور نہیں کیا۔

جو لوگ محض جذبات کی وجہ سے عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور خود غلط راستہ پر بضد رہتے ہیں۔ وہ کبھی بھی صراط مستقیم پر نہیں آسکتے۔

اگلی آیت مجیدہ میں ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے خود گمراہ ہو جائیں۔ وہ دنیا و آخرت میں مصائب و آلام کا شکار رہتے ہیں۔

لَهُمۡ عَذَابٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّاقٍ ۞

(۳۴) ان لوگوں کے لئے اس دنیا کی زندگی میں بھی تباہی اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ انہیں اللہ (کے قانون مکافات) سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ (یعنی ہر شخص کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔)

(۳۴) اس آیت مبارکہ میں قانون الٰہیہ کے باغی افراد کے اعمال کے نتائج کی خبر دی گئی ہے۔ کہ ان کے لئے اپنے ان بد اعمال کے بدلے میں تباہی اور بربادی ہے۔ جو انہوں نے عقل و فکر سے دور رہ کر کیئے۔ اور جزاء کے دن اس سے بھی بڑھ کر عذاب ہوگا۔ جس میں کوئی جی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی بلکہ ہر مجرم فرد سے باز پرس ہوگی۔ اور ہر شخص کو اپنے اعمال کی لکھی ہوئی کتاب کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ ارشاد ربانی ہے۔ **وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـئًا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ط** (۲/۱۲۳)

یہ اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے جو تبدیل نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کا ہر وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ **اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ ط** (۱۳/۳۱)

اگلی آیت مجیدہ میں اخروی جنت کا نقشہ ایک مثال کے ذریعہ یوں پیش کیا گیا ہے۔

مَثَلُ الۡجَـنَّةِ الَّتِىۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ اُكُلُهَا

(۳۵) اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے والوں کے لئے وعدہ کی گئی جنت کی مثال یوں ہے کہ ایک باغ ہو۔ جس کی سطح پر نہریں بہتی ہوں اور (پانی کا معقول انتظام ہو۔ جس کی وجہ سے) وہ ہمیشہ پھل دیتا ہو۔

دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝۳۵

اس کی آسائشیں مستقل ہوں۔ مذکورہ بالا نعمتیں اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کا نتیجہ ہوگا۔ اور انکار کرنے والوں کا انجام آگ (بد حالی) ہوگی۔

۱۔ **اُكُلُهَا دَآئِمٌ** سے مراد ایسے پودے جو ہمیشہ پھل دیتے ہوں۔ خشک سالی اور خزاں کے اثرات سے محفوظ ہوں۔ جس کی وضاحت دوسرے مقام پر یوں آئی ہے۔

تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۵) (مفہوم) وہ اپنے رب کے قانون سے ہر وقت میوہ دیتا ہے۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں بات کی وضاحت سے خبر دی گئی ہے۔ کہ متقین کے لئے وقتی طور پر نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے اپنے رب سے اپنے بہتر اعمال کے بدلہ میں خوشحالی حاصل رہے گی۔ جو کبھی ختم نہ ہوگی۔

سورہ محمد ۴۷/۱۵ میں اس عنوان کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ جس کی وضاحت اپنے مقام پر آئے گی۔

اگلی آیت مجیدہ میں مومنوں اور کافروں کا عمل بتایا گیا ہے۔ اور محمد رسول اللہ سلام علیہ کو حکم ہوا کہ آپ مستقل مزاجی سے اپنے مشن پر قائم رہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝۳۶

(۳۶) اور جن کو ہم نے الکتاب (قرآن حکیم) دی ہے۔ وہ اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ جو تیری طرف نازل ہوا۔ اور کچھ جماعتیں اس کا انکار کر دیتی ہیں۔ اے رسولؐ ان منکرین حق سے کہہ دو۔ کہ مجھے صرف یہی حکم دیا گیا ہے۔ کہ میں اللہ کا ہر لحاظ سے فرمانبردار ہوں۔ اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کروں۔ اور اسی اکیلے اللہ تعالی کی دعوت دوں۔ کیونکہ میرا ٹھکانہ اس اللہ کی طرف ہے (اسی کے سامنے حاضر ہونا ہے)

يَفْرَحُوْنَ کا مادہ ف۔ ر۔ ح۔ فرح ہے۔ جس کا بنیادی معنی ہے خوش ہونا۔ مومن اللہ تعالی کی لاریب کتاب قرآن مجید سے خوش ہیں۔ کہ جس میں زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا احسن حل دیا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا: **لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا** ط (۳/۱۶۴) (مفہوم) بے شک اللہ تعالی نے اپنا نبی مبعوث فرما کر مومنوں پر احسان کیا ہے۔ اور اس احسان سے مومن خوش ہیں۔

اُمِرْتُ کے الفاظ میں محمد رسول اللہ سلام علیہ کو حکم دیا گیا ہے۔ آپ اعلان کر دیں اور ان بیانیہ لاکر تصریح کر دی۔ کہ میں صرف اللہ تعالی کے احکام کی تکمیل کرتا ہوں اور اس کا شریک نہیں ٹھہراتا۔ یعنی اللہ تعالی کے سواہ کسی اور کے حکم کو دین میں شامل کرنا شرک فی الحکم ہے۔ جو میرا مشن نہیں ہے۔

۲۔ **اِلَيْهِ اَدْعُوْا** کے الفاظ میں وضاحت کی گئی ہے۔ کہ میں صرف اکیلے اللہ کی دعوت دیتا ہوں۔ کیونکہ عقل و بصیرت کا یہی تقاضا ہے بلکہ مشاہدات گواہ ہیں۔ کہ اس کائنات میں اللہ کے سواہ کسی دوسرے کے عمل کو دخل نہیں ہے۔ قرآن کریم کے دوسرے مقام پر نبی اکرم کا قول درج ہے بحکم ربانی ہوا کہ آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ میں اللہ کی دعوت عقل و بصیرت سے دیتا ہوں۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط (۱۲/۱۰۸)

یعنی میرا اور مجھے ماننے والوں کا طریقہ دعوت الی اللہ علی وجہ البصیرت ہے۔ اور صرف اس قرآن حکیم پر عمل کرنا ہی میرا راستہ ہے۔

کیونکہ اس میں کوئی مسئلہ بھی عقل و بصیرت کے خلاف نہیں۔

اگلی آیت مبارکہ میں خبردار کیا گیا ہے۔ کہ علم و حکم (قرآن) جو کہ عربی زبان میں نازل فرمایا ہے اس قرآن کریم کے آجانے کے بعد جس شخص نے بھی اس کے احکام کی مخالفت کی۔ اسے مکافات عمل سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝

(۳۷) اور اس طرح ہم نے اپنے حکم (قرآن) کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ اور اگر آپؐ علم قرآن کے بعد ان (منکرین) کی خواہشات کے پیچھے چلے۔ تو اللہ کے قانون کے مقابلہ میں نہ تو تمہارا کوئی مدد گار ہوگا۔ اور نہ کوئی بچانے والا۔

اَهْوَاۗءَهُمْ کے الفاظ میں منکرین حق و صداقت کی وہ خواہشات اور طور طریقے ہیں۔ جن سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی لازم آتی ہو۔

۲۔ **الْعِلْمِ** کا معنی ہم نے علم قرآن لکھا ہے۔ جس کی تائید اللہ تعالیٰ نے اپنی لاریب کتاب میں خود کر دی ہے۔ سورہ الرحمٰن میں فرمایا: **اَلرَّحْمٰنُ ط عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** (۵۵/۱-۲) (مفہوم) رحمٰن گواہ ہے کہ اس نے اپنے رسول کو صرف قرآن کا ہی علم دیا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں وضاحت فرما دی ہے۔ کہ اے رسولؐ آپ کی طرح پہلے انبیاء و رسلؑ بھی صاحب ازواج اور صاحب اولاد تھے۔ اور کسی رسولؑ کو بھی اللہ کے احکام کے سواء خلاف عقل تعلیم نہیں ملی۔ آپ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھیں۔ کیونکہ ہر کام کے نتیجہ کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝

(۳۸) اور (اے رسول مقبولؐ) تحقیق ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے تھے۔ اور کسی رسولؑ نے بھی اللہ کے اذن (قانون) کے خلاف کوئی نشانی (یعنی معجزہ) پیش نہیں کی۔ اور ان کی بیویاں اور اولاد بھی تھی۔ ہر کام کے نتیجہ کا وقت مقرر ہے۔

اس آیت مجیدہ میں رسول اکرمؐ کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو انبیاء و رسولؑ آپ سے پہلے آئے تھے۔ وہ سب تمہاری طرح کے انسان تھے اور ان کے بھی بیوی بچے تھے۔ کھاتے پیتے تھے اور دنیاوی معاشرتی کام کرتے تھے۔ ان کے اختیار میں اللہ کا قانون نہیں تھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام انبیائے کرام اس اکیلے اللہ کے احکام کے تابع تھے۔

انبیائے کرام کے برخلاف وہ لوگ جو احکام الٰہیہ کی مخالفت اور نافرمانی کرتے۔ تو جب قانون مہلت پورا ہو جاتا۔ تو (قوانین ربانی کے مطابق) گرفت کا وقت آجاتا۔ منکرین مسلسل نافرمانی اور طغیانی کی حالت میں یوں کہتے۔ **وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ط** (۶/۳۷)

(مفہوم) اور وہ انکار کرنے والے کہتے۔ کہ تو کیوں نہیں اپنے رب کے عذاب (جس کے متعلق تو ہمیں ڈراتا رہتا ہے) کو لے آتا۔ اے اللہ کے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ وہ عذاب (جس کی تم دعوت دیتے ہو) اللہ تعالیٰ اپنے قانون محکم کے مطابق ہی لاتا ہے۔ اس کے کلمات (قوانین) بدلا نہیں کرتے۔ جب کسی منکر قوم کا پیمانہ ظلم بھر جاتا ہے تو عذاب آجاتا ہے۔ یہ مکافات عمل کا اٹل نتیجہ ہوتا ہے مگر اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو اس طرف (مکافات عمل کے لئے قانون مہلت کی طرف) غور نہیں کرتے۔

نگہ بازگشت:۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے لئے انبیاء کرام سلام علیہم بھیجے۔ مفاد پرست افراد نے اپنی بد عملی سے انبیاء کرام کی تکذیب کی معاشرہ میں اسلاف کی اتباع کی۔ اندھی عقیدت اور جذبات کی وجہ سے عقل و فکر سے کام نہ لیا۔ نور ہدایت سے منہ موڑا اور شرک فی الذات والصفات کے مرتکب ہوئے۔ زندگی بھر غلط روش سے مکافات عمل کو جھٹلایا۔ اور صراط مستقیم قبول نہ کیا۔ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ اب تک ان کی تباہ شدہ بستیاں ہر دیدہ عبرت کے لئے موجود ہیں۔ انبیاء کرام سلام علیہم کو بذریعہ ہجرت بچا لیا گیا۔ اور ان کے مشن کو تائید و نصرت سے نوازا گیا۔

مومنین اور کفار کو اپنے اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ کیا گیا۔ پھر جنت اور جہنم کی مثالوں سے تنبیہ کی گئی۔ نبی اکرم سلام علیہ کو اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا حکم ہوا۔ اور بتایا گیا۔ کہ ضابطۂ ہدایت عربی زبان میں نازل ہو چکا ہے۔ صرف احکام الٰہیہ کی اتباع کریں۔ منکرین کی ہرگز اتباع نہ کرنا۔ سابقہ انبیاء کرام سلام علیہم بھی تمہاری طرح کے انسان ہی تھے۔ کھاتے پیتے۔ معاشرہ میں صاحب اولاد بھی تھے۔ جس طرح ان کے لئے اتباع الٰہی ناگزیر تھی۔ مخالفت کا اختیار نہ تھا۔ اسی طرح آپ بھی زندگی بھر ہدایت الٰہی پر عمل کرنے کے لئے مامور ہیں۔ بھرپور نتائج وقفہ مہلت کے مطابق ظہور پذیر ہوں گے۔

لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)

اگلی آیت مجیدہ میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ قوموں کا عروج و زوال اللہ کے مستقل قانون جاریہ کے مطابق ہوتا رہتا ہے جس قوم کے اعمال اللہ کے قانون عروج کے مطابق ہوں گے وہ قوم عروج اور ترقی پائے گی اور جس قوم کے اعمال قانون زوال کے مطابق ہوں گے تو وہ قوم پسماندہ اور ذلیل و خوار رہے گی۔

يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِندَهُ أُمُّ الْكِتَابِ ﴿٣٩﴾

(۳۹) اللہ تعالیٰ اپنی مشیت (قانون) کے مطابق قوموں کو مٹا دیتا ہے۔ یا ثابت قدم (باقی) رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی لاریب کتاب کے مطابق ہوتا ہے۔

قومیں اللہ تعالیٰ کے قانون محکم کے مطابق مٹ جاتی ہیں۔ یا زندہ رہتی ہیں۔ یعنی جب کوئی قوم خود طاقت ور اور متحد ہو کر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور اپنا غلبہ قائم رکھنے کے لئے مسلسل کوشش کرتی ہے۔ تو وہ قائم رہتی ہے۔ جب بعد میں آنے والے قانون قوت اور اتحاد کو ختم کر دیتے ہیں۔ (کاہل اور غافل ایک دوسرے انسانوں کی کمائی پر پلنے اور مترفین کے زمرہ میں رہ کر پورے بد عمل بن جاتے ہیں۔ تو زوال کا شکار ہو جاتے ہیں) تو قوم اپنے برے اعمال کے نتیجہ میں دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ **إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ** (مفہوم) بے شک اللہ تعالیٰ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا۔ جو خود نہ بدلے۔

أُمُّ الْكِتَابِ یعنی کائنات جو کہ کھلی آیت (کتاب) کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ جس میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں بھری پڑی ہیں۔ مشاہدات گواہ ہیں (کہ ان قوموں کے عروج اور زوال کائناتی قوانین کے مطابق ہوئے) جس قوم کے اعمال عروج والے ہوئے۔ وہ قوم دنیا میں ترقی یافتہ اقوام کی صف میں آکھڑی ہوئی۔ اور جس قوم کے اعمال پستی والے ہوئے وہ قوم زوال پذیر ہوئی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور ہے۔

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل پہ گامزن محبوب فطرت ہے

(اقبالؒ)

قرآن کریم میں دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یوں آئی ہے:۔
وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ط اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴۲/۲۴) (مفہوم) "اور اللہ تعالیٰ باطل (احکام الٰہیہ کی نافرمانی کرنے والوں) کو مٹا دیتا ہے۔ اور حق پرستوں (فرمانبرداروں) کو قوانین الٰہی پر عمل کرنے سے ثابت (زندہ قوموں میں شمار) کر دیتا ہے۔ یعنی ہر کسی کو اپنے اعمال کے مطابق بدلہ ملتا ہے۔ یقیناً وہ ذات ہر کسی کے سینے کے راز کو جانتی ہے۔ اور یہ نظام کائنات انہی قوانین کے تحت چل رہا ہے"۔

اگلی آیت مجیدہ میں جناب محمد رسول اللہ سلام علیہ کو مخاطب کرکے ارشاد ہوا۔ کہ آپ نتائج کو بالا طاق رکھتے ہوئے اپنے پر امن پروگرام کو جاری رکھیں۔ کیونکہ ہر شخص کے اعمال کا حساب لینا اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

(۴۰) اور (اے رسول) اگر ہم تجھے بعض چیزیں (تمہاری زندگی میں پوری کر دیں) دکھا دیں۔ یا تجھے وفات دے دیں جو وعدے تمہاری زندگی میں پورے نہیں ہوئے (وہ بھی ضرور پورے ہوکر رہیں گے) کیونکہ حق تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا (۴۸/۱۴)

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا۔ اے اللہ کے رسولؐ منکرین حق کے ضمن میں جو بھی وعدے فرمائے ہیں۔ وہ ہر حال میں پورے ہو کر رہیں گے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض وعدے تمہاری زندگی میں ہی پورے ہو جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ تکمیل وعدہ سے پہلے ہی آپ وفات پا جائیں۔ آپ ہرگز خیال میں نہ لائیں۔ کہ نتائج کب برآمد ہوں گے۔ آپ کا کام صرف کتاب اللہ کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ باقی کام اللہ کے قانون پر موقوف ہے۔ کہ مہلت پوری ہو جائے اور لوگوں کے درمیان فیصلے ہو جائیں (کیونکہ حساب لینا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ یعنی ہر شخص کے اعمال کا حساب اللہ تعالیٰ کے قانون محکم کے مطابق ہوتا چلا جائے گا۔)

اگلی آیت مجیدہ میں نفس مضمون ربوبیت عامہ کا انکار کرنے والوں کو خبردار کیا جا رہا ہے۔ کہ حالات حاضرہ کا بغور جائزہ تو لو۔ کہیں مکافات عمل کا نتیجہ نہ پالو۔ کیونکہ قوانین الٰہی اٹل ہوتے ہیں۔ اور ان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ تم لوگ نتائج کا جلد مشاہدہ کر لوگے۔ ارشاد ہوا:۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

(۴۱) کیا انہیں نظر نہیں آیا۔ کہ ہم ان پر (قانون ربوبیت کی مخالفت کی وجہ سے) زمین تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ معاملہ کرنے والا ہے۔ اور کوئی انسان اللہ کے فیصلہ کو رد کرنے والا نہیں ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔

نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا: یعنی اسلامی قوانین کی بدولت لوگوں کی انفرادی مفاد پرستیاں ختم ہو جائیں گی۔ قوم کے سرداروں سے زمین چھن کر بنی نوع انسان کے استعمال میں آجائے گی ان نافرمانوں پر اللہ تعالیٰ کی زمین تنگ ہوتی جائے گی۔ دوسرے مقام پر اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہوا۔ **اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ط** (۲۱/۴۴) کیا وہ نہیں دیکھتے (انہیں غور کرنا چاہئے) کہ زمین ان کے لئے تنگ ہو رہی ہے۔ کیا (ربوبیت عامہ) کا انکار کرکے یہ لوگ غلبہ پانے والے ہیں؟ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات عمل یقیناً پورا ہوکر رہے گا۔ اور مسلسل ربوبیت عامہ کی مخالفت پر یہ لوگ مغلوب ہو جائیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اور دنیا میں کوئی طاقت اللہ

تعالیٰ کے فیصلوں کو ٹال نہیں سکتی۔ اور نہ ہی رد کر سکتی ہے۔ وہ (اللہ تعالیٰ) محاسبہ کرنے کی پوری طاقت رکھتا ہے منکرین ربوبیت عامہ کی بداعمالیاں جب حدود کو چھونا شروع کر دیتی ہیں۔ تو ان کے اعمال کے نتیجہ کا وقت آجاتا ہے۔ اور پھر اللہ کا قانون ساتھ ہی ان کا محاسبہ شروع کر دیتا ہے۔ اور ان کو زمین میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ دنیا میں صرف ان کا نام باقی رہ جاتا ہے۔

وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ط اللہ تعالیٰ ہر ایک کا بہت جلد حساب چکانے والا ہے جملہ **سَرِيْعُ الْحِسَابِ** سے مفسرین نے عذاب قبر مراد لیا ہے۔ جو حقائق کے برعکس ہے چونکہ کسی بھی شخص کے مرنے کے بعد قیامت سے پہلے اس کو زندگی ملنا ثابت نہیں ہے۔ اس لئے یہ عقیدہ غلط ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی شخص کے مرنے سے لے کر اس کے دوبارہ قیامت کو زندہ ہونے تک ہزار ہا سال کا عرصہ اس کے لئے ایک لمحہ کے برابر ہوگا۔ لہٰذا جونہی وہ آنکھ کھولے گا۔ حساب ہوتا دیکھ لے گا۔ اسی کو سریع الحساب کہا گیا ہے۔

اگلی آیت کریمہ میں محمد رسول سلام علیہ پر واضح کر دیا گیا۔ کہ منکرین حق و صداقت آپ سلام علیہ سے پہلے بھی انبیاء کرام سلام علیہم کے ساتھ بری تجویزیں کرتے رہے ہیں۔ تاکہ ان کی آواز دب جائے۔ ان کی من مانیاں بدستور جاری رہیں۔ مگر ہوا یہ کہ وہی منکر لوگ ناکام ہوئے ارشاد ربانی ہوا:۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ۚ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۗ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

(۴۲) (اے مخاطب) ان سے پہلے بھی لوگوں نے بری تجویزیں کیں۔ مگر ان تمام تدابیر کا نتیجہ اللہ کے (قانون کے) مطابق ہی برآمد ہوا۔ وہ ذات باری جانتا ہے۔ ہر شخص کے عمل کو جو بھی وہ کرتا ہے اور انکار کرنے والوں کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ کہ انجام کار کس کا اچھا ہے۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کے جملہ مبارکہ میں سابقہ منکر اقوام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کہ اے رسول! پہلے لوگوں نے بھی بری تجویزیں کیں۔ کہ حق تعالیٰ کے فیصلے نافذ نہ ہونے پائیں۔ مگر امر اللہ پورا ہو کر رہا۔ اور مخالف قومیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ ان کا کوئی مصنوعی سہارا کوئی دوست اور کوئی ولی کام نہ آیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون مشیت پر قادر ہے۔ لہٰذا جو کوئی اچھا کام کرے گا۔ اس کا نتیجہ بہتر برآمد ہوگا۔ اور جس کا کام برا ہوگا۔ برا نتیجہ پالے گا۔ **مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ط** (۴۱/۴۶) پروردگار عالم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا۔

اگلی آیت مجیدہ میں اس امر کی خبر دی گئی ہے۔ کہ منکرین نے آپ کی رسالت کا انکار کیا۔ تو آپ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں اللہ اور کائناتی مشاہدات کو پیش کیا۔ فرمایا:۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۗ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

(۴۳) اور (نظام ربوبیت) کا انکار کرنے والے کہتے ہیں۔ کہ (اے مخاطب) تو اللہ کا رسول نہیں ہے۔ (یہ نظام ربوبیت رسولوں نے پیش نہیں کیا) اس رسولؐ ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ (اللہ کے قانون) کی شہادت کافی ہے۔ اور ہر وہ شخص بھی میری گواہی دے گا۔ جو اس کتاب (کائنات) کا علم رکھتا ہوگا۔

لَسْتَ مُرْسَلًا ۔ منکرین رسالت کے انکار کی دو وجوہات ہیں:۔

خاندانی دشمنی ○ نظام ربوبیت سے بغاوت۔

خاندانی دشمنی:۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم سلام علیہ کے دو بیٹے تھے اسماعیل سلام علیہ اور اسحاق سلام علیہ۔

اسماعیل سلام علیہ جو کہ اپنے والد محترم ابراہیم سلام علیہ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے آباد ہوئے۔ اور دوسرے فرزند اسحاق سلام علیہ اپنے شہر میں تبلیغ کا کام سرانجام دیتے رہے۔ اور بنی اسحاق سے "رسل و نبوت کا سلسلہ چلتا رہا۔ مگر دوسری طرف بنی اسماعیل سے مدت تک کوئی نبی رسول مبعوث نہ ہوا۔ لہٰذا بنی اسرائیل نے بنی اسماعیل سے اپنے آپ کو افضل قرار دے لیا۔ اور اپنے منہ سے اللہ کے پیارے بن بیٹھے۔ ادھر مکہ مکرمہ میں جب محمد رسول اللہ نے نبوت کا اعلان کیا۔ تو ان کو یہ بات ناگوار گزری۔ کہ آخرالزمان نبی سلام علیہ تو اللہ کے وعدہ کے مطابق بنی اسماعیل میں آگیا ہے۔ لہٰذا اپنی انا اور افضلیت کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے کہا۔ کہ تو تو رسول ہی نہیں۔ **لَسْتَ مُرْسَلًا**"۔ کیونکہ یہ حق نبوت تو بنی اسحاق کا ہے اور تم اسماعیل سلام علیہ کی اولاد سے ہو۔ لہٰذا ہم تمہیں رسول نہیں مانتے۔ اس خاندانی دشمنی اور انا کی بدولت اللہ تعالیٰ کے آخری رسول سلام علیہ کا بھی انکار کر دیا۔ جس کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

نظام ربوبیت سے بغاوت:۔ جناب محمد رسول سلام علیہ سے دوسری وجہ انکار نظام ربوبیت عامہ کی بغاوت سے ہوئی۔ چونکہ ان کے مصنوعی عقائد کے مطابق معاشرتی اونچ نیچ (ناہمواری) اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ اور ان عقائد کو مقدر (تقدیر) کے غلط مفہوم سے ثابت کرتے ہوئے ناہموار معاشرہ کی انفرادی مفاد پرستیوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے متوازن نظام ربوبیت عامہ کے پیغام کا انکار کر دیا۔ اور کہا اے رسولؐ ہمارے اس انکار پر اللہ تعالیٰ کے جس عذاب کا وعدہ دیتے ہوئے دھمکیاں دیتے ہو۔ تو وہ عذاب جلد ہی کیوں نہیں لے آتے۔ یعنی جب کوئی انکار کرے۔ تو ذرا" آسمان سے پتھروں کی بارش ہو۔ اور وہ تباہ ہو جائے۔ یا تیرے ساتھ کوئی ملک موجود ہو۔ جو لوگوں کو تیری صداقت کا یقین دلاتا رہے (۲۱/ ۲۵ + ۶/۸)۔

اللہ کے رسول سلام علیہ نے جواب دیا۔ کہ اللہ کے قوانین میں ایسا نہیں ہے۔ ہر کام کے نتیجہ کے لئے وقت مقرر ہوتا ہے۔ میں تم سے اس بات میں جھگڑا نہیں کرتا۔ میں تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق عمل کرتا جاؤں گا۔ اور تم بھی جو چاہو۔ عمل کرتے جاؤ۔ **اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ**۔

انجام کار کس کا بہتر ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات عمل سے ظاہر ہو جائے گا۔

عِلْمُ الْكِتَابِ۔ کا معنی ہم نے کائناتی علم لکھا ہے۔ چونکہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی قولی کتاب ہے۔ اور کائنات اس کی فعلی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قولی کتاب کی شہادت اس فعلی کتاب سے پیش کی ہے۔ جناب محمد رسول سلام علیہ کو حکم ہوا۔ کہ آپ اعلان فرما دیجئے۔ کہ میں بھی سابقہ انبیاء کرام سلام علیہم کی طرح بشری رسول ہوں۔ اور میری دعوت بھی عقل و بصیرت پر مبنی ہے۔ نہ سابقہ انبیاء کرام نے کوئی کام خلاف عقل کیا ہے اور نہ ہی مجھ سے اور نہ ہی تجھ سے ایسی امید ہو سکتی۔ میری دعوت الی اللہ ہر عقل مند اور صاحب بصیرت شخص کے لئے ہے۔ ہر وہ شخص جو عقل و بصیرت سے اس کائنات کے بارے میں کچھ علم رکھتا ہو۔ وہ بھی میرے اس مقام نبوت کی تصدیق کرے گا۔ اور میری اس لائی ہوئی لاریب۔ کتاب مبین قرآن حکیم کو حق ثابت کرے گا۔ سورہ رعد اختتام پذیر ہوئی۔